DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.





[illegible]



ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

مارچ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ۵ ———————— شمارہ ۲۳

جنرل ایڈیٹر
جے، این زتشی
ناظم اطلاعات حکومت جموں وکشمیر

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے ———————— سالانہ: چھ روپے

☆

پیرزادہ محمد سعید پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر لالہ رخ پبلی کیشنز سرینگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

سرورق :- مولانا ابوالکلام آزاد

مارچ اپریل ۶۰

تعمیر

زاوئیے

چالو مالی سال دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل کا سال بھی ہے۔ اس منصوبے کو سُرخروئی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ تیسرے پانچ سالہ پلان کی ترتیب و تشکیل کا اہم مرحلہ بھی طے کیا جا رہا ہے۔ تیسرا پانچ سالہ منصوبہ کُل ہند پیمانے پر سوشلسٹ طرز کا سماج قائم کرنے کے سلسلے میں ایک فیصلہ کُن سنگِ میل ہوگا اور اسی لئے اب سارا زور بھاری صنعتوں کے قیام اور استحکام پر صرف کیا جا رہا ہے۔ ریاستی پیمانے پر اس منصوبے کے رنگ و رُوپ کا اندازہ کرنے کے لئے وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد کے اُن ارشادات پر نظر کر لینا کافی ہے جو اُنہوں نے صوبۂ جموں کے حالیہ دَورے میں ظاہر کئے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس منصوبے کا ایک خاص مقصد ریاست میں صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کر دینا ہوگا۔ اس غرض کے لئے سب سے ضروری بات برقی قوت کی مزید پیداوار ہے۔ چنانچہ تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کا خاص مقصد برقی قوت کی موجودہ پیداوار کو ۸۰ ہزار کلو واٹ تک پہنچا دینا ہے۔ اُن کا یہ ارشاد کہ جموں کو جلد ہی ریلوے لائن کے ذریعے پٹھان کوٹ سے ملایا جائے گا، کافی اطمینان بخش ہے کیونکہ ریلوے لائن سے دُوری ہمارے بہت سے مسائل اور مشکلات کی بنیادی وجہ ہے۔

اپریل کا مہینہ ریاست کی ثقافتی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس مہینے میں کشمیر کے اُفق سے طلوع ہونے والی تین عظیم ادبی شخصیتوں کی برسی کے دن آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی مقبولیت اور محبوبیت اب برصغیر کی حدود سے نکل کر عالمی میراث بن چکی ہے اور جب اس پس منظر میں ہمیں اُن کے کشمیری الاصل ہونے اور کشمیر سے اُن کی گہری محبت کی بات یاد آتی ہے تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے مسرت کا مقام ہے کہ اس سال بھی انجمن ترقیِ اُردو کے اہتمام سے سرینگر میں یہ دن منایا گیا۔ حضرت مہجور کی وفات کو بھی اسی مہینے کی ۹ تاریخ کو آٹھ سال بیت گئے۔ مگر اُن کا دیو قامت ادبی پیکر اب بھی ہماری شاعری کے ایوان میں قندیلیں روشن کر رہا ہے۔ حیرت ہے کہ ۹-اپریل کے دِن کسی ادبی انجمن نے بھی اُن کی یاد تازہ کرنے کے لئے کسی تقریب کا اہتمام نہیں کیا اور یہ تقریب لے دیکر ریڈیو کشمیر سرینگر کے خاص پروگرام تک محدود ہو کر رہ گئی۔ جدید کشمیری شاعری کے پیشرو عبدالاحد آزاد بھی اپریل ۱۹۴۸ء میں ہماری ادبی محفل کو سُونا بنا کر چلے گئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس جوان مرگ نقاد، شاعر اور مؤرخ کی یاد تازہ کرنے کا خیال بھی کسی کو نہیں آیا۔ اور یہ دِن بھی ہماری تغافل شعاری کی نذر ہو گیا۔ میں رسُوم کی پابندی کی وکالت نہیں کر رہا ہوں مگر یہ علامتی تقریبات منا کر ہم اپنے ادبی ماضی کے احترام کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ہماری ثقافتی انجمنیں اور ادیب ایسے مواقع کو نظر انداز کرنے سے احتراز کریں گے!

اس شمارے میں "آدم چہ عجب ذات" سے پیدا شدہ ادبی مباحثے کے سلسلے میں شمیم احمد شمیمؔ کا طویل مقالہ پیش کیا جا رہا ہے۔ رحمان راہیؔ کے اعتراضات کے جواب میں اُن کا مقالہ کس حد تک قائل کرتا ہے، اس کا فیصلہ قارئین اور ادبی حلقے ہی کر سکتے ہیں، مگر اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی ماننا پڑتا ہے کہ اس مقالے میں پہلی بار اُن فرسودہ اور پِٹے پِٹائے تنقیدی کلیوں کا حدود توڑنے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں ہر ایرے غیرے کی زبان سے بار بار سُن کر کان پک گئے ہیں اور جن کی وجہ سے ہماری تنقید کا تخلیقی کردار تقریباً مفقود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس طرح سے بعض ایسے عقدے سُلجھ گئے ہیں جن کی پہلے کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی تھی۔ شمیمؔ صاحب نے بڑی باریک بینی سے کام لے کر ہمارے ادبی نظریے کی اس کوتاہی کی جانب اشارہ کیا ہے کہ تنقید کرتے ہوئے ہم اپنے یہاں رومانوی تحریک کے عدمِ وجود اور اس سے پیدا شدہ مسائل کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتے۔ اُنہوں نے جُرأت کا مظاہرہ کر کے ہماری تنقید کی یک طرفگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ مقالہ "آدم چہ عجب ذات" کا ادبی مقام متعین کرنے کے سلسلے میں ہی ایک اہم مضمون نہیں ہے بلکہ کشمیری تنقید کو بلاغت کی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے سلسلے میں ایک تخلیقی کاوش ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی میدان میں خود شمیمؔ صاحب کے لئے ایک اہم کارنامے کی حیثیت

تعمیر

ماسٹ اپریل ۱۹۶۰ء

کوئے نشاط

خطۂ کشمیر اے لالہ رُخوں کی انجمن — کیف و مستی شعر و نغمہ رنگ و نکہت کے چمن
جنتِ دُنیا دیارِ مہوشاں کوئے نشاط — زندگی کو تُو نے بخشا زندگی کا بانکپن
تیرے گلشن میں سلیقے سے بہارِ بے زوال — سج گئی ہے ہر شجر کی شاخ یُوں جیسے دُلہن
جیسے عاشق کی جبینِ شوق پائے دوست پر — چومتی ہے یُوں ترے ماتھے کو سُورج کی کِرن
آبشاروں کا تری آغوش میں حُسنِ خرام — جس طرح اِک ماہرِ فن مطرب ہو نغمہ زن
تیرے دامن میں ہے شالامار ایسا میکدہ — جس کے نظارے کی مے کھوتی ہے مستی کی تھکن
گود میں تیری ہے یُوں دریائے جہلم جس طرح — ہو رَواں آغوش میں تخیّل کی نہرِ لبن
تیری راتیں کیف افزا تیرے دِن عشرت بدوش — لے جہاں گُل رخاں اے حُسنِ فطرت کے چمن
ترا دامن خُلد موضعِ مصوّر کیوں نہ ہو — اے نگارِ زندگی زہرہ جبینوں کے وطن
شاعروں کی جنتِ افکار فردوسِ خیال — تری نسبت نے بڑھایا اعتبارِ حُسنِ فن
زعفران زاروں ہی تک محدود رعنائی نہیں — آئینہ ہیں حُسنِ منظر کا ترے کوہ و دمن
تُو امانت دارِ حُسنِ جاوداں کیونکر نہ ہو — رقص کرتی ہیں بہاریں جب چمن اندر چمن
تری خوش بختی مُسلّم ہے مگر کچھ روز سے — دیکھتے ہیں ہم ترے معصوم ماتھے پر شکن
کِس لئے مغموم ہے تُو اے ارم زارِ جہاں — کم نہ ہونے دیں گے ہم ترے گلستاں کی پھبن
رونقیں تری بچانے کے لئے یہ یاد رکھ — جائیں گے ہنستے ہوئے ہم خُود سوئے دار و رسن

شمعِ بزمِ رنگ و نکہت تِرے پروانے ہیں ہم
ہوش ہو جس کی جِلو میں ایسے دیوانے ہیں ہم

جناب بخشی غلام محمد
وزیر اعظم جموں و کشمیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ — چند یادیں

جب مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لیا جاتا ہے تو یادوں کا ایک کاروان نگاہوں کے سامنے سے گذرنے لگتا ہے۔ میرا ان کا تعارف ان کی تحریروں کے ذریعہ سے ہوا۔ یہ "الہلال" و "البلاغ" کا دور تھا۔ میں نوجوانی کی ابتدائی منزلوں میں قدم رکھ چکا تھا اور دل میں حوصلے اور اُمنگیں اُبھر رہی تھیں۔ دماغ ریاست کے اقتصادی اور سیاسی حالات اور اسی کے ساتھ بیکار کے توہمات سے خود بخود اُلجھ رہا تھا کہ "الہلال" اور "البلاغ" کی تحریروں نے میری فطرت کو اور جھنجھوڑ ڈالا۔ اور میرے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ بھر دیا۔ اس طرح میرے لئے سیاسیات میں مولانا کی حیثیت معلمِ اوّل کی ہے۔

"الہلال" اور "البلاغ" کی تحریروں کے علاوہ میں مولانا کی اُن تحریری معرکہ آرائیوں سے بھی بے حد متاثر ہوا تھا جو مولانا نے علی پور جیل والے مقدمے میں دیا تھا۔ اور جو "قولِ فیصل" کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں شائع بھی ہوا تھا۔ مجھے آج بھی ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مولانا اپنی شخصیت کے پورے جلال و جمال کے ساتھ علی پور سنٹرل جیل میں عدالت کے سامنے اپنا بیان دے رہے ہوں اور عدالت کی کرسی ہی نہیں بلکہ حکومت کی بنیادیں تھر تھرا رہی ہوں۔ مجھے اس نوجوانی کے جوش میں ایسا محسوس ہوا کہ مولانا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ یہی پکار رہا ہو۔ یہی الفاظ میرے کانوں میں گونجتے۔ اور میرے دل میں ارتعاش پیدا کرتے رہے۔ اُس وقت ریاست میں کوئی باقاعدہ اور منظم تحریک نہیں چل رہی تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اس وقت بھی یہاں پہنچ چکا تھا اور چند لوگوں نے قومی کام بھی شروع کر دیا تھا۔ میں اس بات کا کھلے دل سے اقرار کروں گا کہ میرے کان اسی آواز پر لگے تھے جو علی پور جیل سے بلند ہو کر ہمالیہ کی سربلند چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں بھی سودیشی کھدر اور چرخے کا پرچارک بن گیا۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۳۸ء میں ہم نے کشمیر میں جلوس بھی نکالا اور خود مجھے اس کی پاداش میں بھی سزا بھگتنا پڑی۔ مولانا آزاد نے مجھ میں جرأتِ عمل پیدا کر دی تھی جس نے کبھی خوف و ہراس کو پاس نہ آنے دیا۔

۱۹۴۸ء میں پہلے لاہور میں اور اس کے بعد کراچی میں مجھے حضرت مولانا کو قریب سے دیکھنے کا دست برس ہوتے اور باتیں کرنے کا بھی موقع ملا۔ میرے ذہن نے مولانا کا جو تصور قائم کیا تھا، بالکل ویسا ہی پایا۔ ان کی تحریروں کا سارا جاہ و جلال ان کی عظیم شخصیت میں بھی سمایا ہوا تھا۔ وہ کشمیر کے بارے میں یہاں کے عوام اور تحریک کے بارے میں تھوڑی دیر سوالات کرتے رہے اور ہم لوگ جو کچھ کر رہے تھے اُس پر پسندیدگی کا اظہار کرتے رہے۔ اس وقت بھی وہ یہی کہتے تھے کہ اصل مسئلہ عوام کی بہبود کا ہے۔

اگرچہ اُس وقت ریاست میں کوئی منظم تحریک نہیں تھی لیکن فضا میں کچھ حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اس نے مسلم کانفرنس کی شکل اختیار کی۔ یہ ایک غیر متوقع موڑ تھا۔ لیکن اُسی وقت نہیں بلکہ بعد میں جب کبھی ملاقات ہوتی اور ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں تو مولانا یہی فرماتے کہ اصل سوال سیاسی اور اقتصادی آزادی کا ہے۔ تحریک کو کسی ایک فرقے سے موسوم کرنا غلط ہے۔ ہماری سیاست نے مسلم کانفرنس سے نیشنل کانفرنس تک جو سفر طے کیا اور جس عزم و ارادہ سے قومی تحریک کا ایک اہم جزو بن گئی۔ اس میں مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ دو ہستیاں نہ ہوتیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری تحریک کتنے دنوں اور بھٹکتی رہتی!

کراچی میں قومی نمائش کے سلسلہ میں ہماری ریاست کا بھی ایک اسٹال تھا۔ میں نے گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا صاحب کے ہاتھ کافی چیزیں بھیجیں۔ مولانا مرحوم نے ہمارے اسٹال سے خاص طور پر دلچسپی لی اور اسٹال کا معائنہ کر کے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اس سال پہلی بار ہمارے ساتھ کشمیر سے کچھ مستورات بھی گئی تھیں۔ ہماری ریاست معاشی اعتبار سے بھی کافی پس ماندہ تھی۔ مولانا یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ہم معاشرتی پس ماندگی اور توہمات سے آزاد ہو رہے ہیں اور عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ آزادی کی تحریک میں اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے رہی ہیں—

سنہ۱۹۵۱ء کی اس پہلی ملاقات میں، میں نے یہ محسوس کر لیا کہ مولانا جس بات سے دلچسپی لیتے ہیں، اس کے تمام جزئیات کا علم حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ مجھ سے یا کسی اور کشمیری سے ملتے یا ہمارے اسٹال کی چیزوں کو دیکھتے تو فوراً ہی کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بات چیز نکلتی۔ اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ مولانا کی معلومات معمولی سنی سنائی باتوں سے بہت آگے ہیں۔

مولانا مرحوم بڑے مردم شناس تھے۔ وہ ایک نظر میں لوگوں کو پرکھ لیتے تھے اور جو رائے قائم کر لیتے، اس میں اٹل ہوتے تھے۔ لیکن جس کو وہ پہچان لیتے اس پر کڑی نظر بھی رکھتے تھے اور معمولی سے معمولی تبدیلی بھی ان کی نگاہوں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ لیکن یہاں میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا آزاد رائے کے سخت ضرور تھے لیکن دوسروں کے مشورے بھی قبول کر لیا کرتے تھے۔ جب میں خدا مولانا مرحوم کے قریب آ گیا تو اکثر میں نے ان کی رائے کے خلاف رائے دے دی ہے اور مولانا نے نہایت ہی خندہ پیشانی اور شفقت سے مجھ سے کہا کہ "تم یہ ٹھیک کہتے ہو۔" لیکن کچھ اصولی باتیں ایسی ضرور تھیں جن پر اُن کا عقیدہ غیر متزلزل تھا۔ مثلاً وہ اشتراکی طرزِ فکر کو دُرست سمجھتے ہوئے بھی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے طریق کار اور کمیونزم کے خاص اصولوں کو ناپسند کرتے تھے۔ سرمایہ داری کو از کارِ رفتہ اور مضرت رساں نظام تصور کرتے تھے۔ اسی طرح وہ فرقہ واریت کو سب سے بڑا جرم جانتے تھے اور فرقہ پرست سیاست دان کو کسی قیمت پر بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ لیکن مولانا مرحوم کی مخالفت ہمیشہ اصولی ہوتی تھی اور وہ کبھی ذاتیات پر نہیں اُترتے تھے۔ انہوں نے اخلاق اور کردار کی بلندی کو ہمیشہ سب سے بڑا اور اصلی اصول سمجھا اور اسی پر عمل کیا۔ جن لوگوں نے انہیں طرح طرح سے ستایا، بدنام کیا، گالیاں دیں، بُرا بھلا کہا، اُن کے خلاف بھی مولانا آزاد مرحوم نے کبھی ایک بے جا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ مولانا مرحوم بہت کم آمیز تھے، گوشہ گیری کے شائق تھے اور لوگوں سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ یہ کلیتاً دُرست نہیں ہے۔ وہ زیادہ ملنے جلنے کے قائل تو نہیں تھے، لیکن پھر بھی اُن کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اور اس میں سبھی لوگ شامل تھے۔ صاحبانِ جبہ و دستار بھی تھے، اربابِ قلم بھی تھے۔ سیاست دان بھی تھے، امرأ بھی تھے، رندانِ بھی تھے، زاہد بھی تھے اور آزاد رو بھی، خدا پرست بھی تھے اور منکرینِ خدا بھی۔ وہ سب لوگوں سے ملتے اور ہر طبقے کے مسائل سے باخبر رہتے تھے۔

اُن کی چائے اور سگریٹ نوشی تو مشہور تھی اور دونوں چیزوں سے میری تواضع ہوتی اور پورے اہتمام سے خاطر ہوتی۔ چائے اور سگریٹ ہی نہیں بلکہ کھانے کے معاملے میں بھی مولانا مرحوم کا ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ وہ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ ویسے وہ سادگی پسند تھے اور سادہ سادہ غذائیں بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ سادہ سے سادہ غذا بھی خوش سلیقی سے تیار ہوتی تھی اور ذائقہ بہترین ہو۔ یہی حال لباس کا بھی تھا اور ان کے وضع قطع میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ کپڑے کے انتخاب میں بھی ان کے فن کارانہ ذوق کی صاف جھلک نظر آتی تھی۔ کُتب بینی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ایک بار انہیں معلوم ہوا کہ کشمیر میں تصوّف پر کچھ کمیاب کتابیں موجود ہیں، ان کی فراہمی کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ میں نے یہ کتابیں مہیا کیں۔ اور جب دوبارہ ان سے ملنے گیا تو وہ کتابیں اُن کی نظر سے گُذر چکی تھیں اور وہ اب ان کتابوں کے معانی و مفہوم سے متعلق اس طرح گہر بار تھے جیسے وہ ابھی ابھی کتابوں کے مطالعہ سے فارغ ہوئے ہوں۔ طالب علموں، اداروں اور حاجت مندوں کی امداد بھی وہ بڑے رازدارانہ طریقہ پر کرتے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی تھی کہ انہوں نے کس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اکثر لوگ ان سے اس طرح مستفید ہوئے ہیں لیکن خود مولانا مرحوم نے کبھی اشارتاً یا کنایتاً بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

وہ اظہارِ رائے کے معاملے میں بھی بے باک اور آزاد تھے۔ کانگرس کی مجلس عاملہ ہو یا کابینہ کا اجلاس، وہ ہر جگہ اپنی بے لوث رائے دیتے تھے۔ رائے دیتے وقت انہوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ اُن کے دوسرے رفیق اُن کی رائے سے متفق ہوں گے یا نہیں۔ وہ اپنی رائے آزادی سے دیتے تھے اور پھر جو فیصلہ جمہوری طریقہ سے ہوتا تھا اُس پر صدقِ دِل سے کاربند ہو جاتے تھے، گویا انہوں نے کبھی اختلافِ رائے کیا ہی نہ ہو۔ ان سے بڑے جمہوریت پسند شاید ہی گذرے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، شری سبھاش چندر بوس، سب ہی ان کی رائے کی قدر کرتے تھے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مولانا مرحوم شاید انگریزی سے ناواقف تھے، لیکن یہ غلط ہے۔ مولانا انگریزی ادب و فلسفہ کا علم رکھتے تھے۔ کانگرس کے اہم سیاسی ریزولیوشنوں میں وہ معنی خیز تبدیلیاں کر دیا کرتے تھے اور بڑے بڑے انگریزی دانوں کو یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ مولانا کی ترمیم مناسب ہے۔

غرض مولانا مرحوم ایک فرد نہیں، ایک ادارہ تھے۔ ان کی ہستی کے کئی پہلو تھے۔ یہ رنگا رنگی بوقلمونی بار بار دیکھنے میں کب آتی ہے!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(سرینگر سے براڈکاسٹ)

بادۂ کہن

ناطق گلاوٹھی

مِلا دامن اجل کا بے تکلف جانِ زار آئی
مصیبت ہو گیا تھا جامۂ ہستی اُتار آئی

بدل دی دِل کی دُنیا کھُل کے دُنیا کی حقیقت نے
مجھے آج اپنے رونے پر ہنسی بے اختیار آئی

سبھی کچھ تھا مگر دیکھا تو کیا تھا، کچھ نہ تھا گھر میں
وہ جب آئے تو اپنی یاد مجھ کو بار بار آئی

گھِرے اہلِ غرض میں آمدِ سامانِ راحت سے
وہی ظالم مصیبت، جو ہمیں تھی ناگوار، آئی

خِرد کا کچھ نشاں مِلتا نہیں ہستی کی بستی میں
مری دیوانگی اِک ایک گھر جا کر پکار آئی

مری وحشت سے چکر میں پڑی رفتار ہستی کی
مرے نقشِ قدم پر گردشِ لیل و نہار آئی

فراہم ہو گیا سامان یُوں بھی بزمِ عشرت کا
عنایت مُفت کی مُطرب نے ہم پر مے اُدھار آئی

جنونِ فتنہ ساماں نے کسی کے کی ہے گُلکاری
چمن کی سیر کرنے کو چلو ناطق بہار آئی

سراج لکھنوی

حیات بن تو گئی قسمت آزمانے سے
جو منچلے تھے وہ ٹکرا گئے زمانے سے

چمن میں پھُول برستے ہیں آشیانے سے
یہ رسم ہے مرے صیاد کے زمانے سے

شکستِ دِل سے ہی حُسنِ شکست پیدا ہے
یہ شیشہ ٹوٹ گیا کِس کے مُسکرانے سے

بس اب تو عالمِ پسماندگی ہے اور ہم ہیں
خوشا نصیب جب آگے تھے ہم زمانے سے

قفس کی قید میں بھی تازگیِ غم ہے وہی
کہ جیسے آج ہی بچھڑے ہیں آشیانے سے

بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
پڑا ہے کام بدلتے ہوئے زمانے سے

یہ سچ ہے تجزیہ رنگ و بُو بھی ہم نے کیا
قفس ہی اب تو بہتر ہے آشیانے سے

چراغ کر لئے روشن خلوصِ سجدہ نے
جبیں جھُکی تھی کہ لو اُٹھی آستانے سے

سراج دِل کی لگی جاں گداز ہوتی ہے
یہ شعلہ وہ ہے جو بجھتا نہیں بجھانے سے

شمیم احمد شمیم

"آدم چھُ عجب ذات"

(کشمیری ادب میں رومانوی رُجحانات)

"تعمیر" (نومبر، دسمبر ۱۹۵۹ء) میں اختر محی الدین کے ایک کشمیری افسانے "آدم چھُ عجب ذات" کی اشاعت نے یہاں کے ادبی حلقوں میں ایک ہل چل پیدا کر دی ہے۔ اختر کے کسی افسانے پر آج تک اتنی لے دے نہیں ہوئی ہے بلکہ کشمیری زبان کے کسی افسانے پر آج تک اتنی متضاد، مختلف اور متفرق رائیں قائم نہیں ہوئی ہیں۔ ادبی مجلسوں، نجی گفتگو اور ادیبوں کی غیر رسمی محفلوں میں یہ افسانہ گذشتہ چار مہینوں سے بحث و تمحیص کا موضوع بنا ہوا ہے اور ابھی تک کچھ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ "آدم چھُ عجب ذات" کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے کشمیری افسانے کی صف میں جگہ دی جائے یا نہیں ——— بعض ادبی مقبول نے افسانے کو طنز اور تمسخر کا نشانہ بنا کر اس پر سنجیدگی سے بحث کرنے سے گریز کیا۔ کچھ "ترقی پسند" اختر پر رجعت، گریز اور فرار کے الزامات عائد کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے اور چند "خدا دوست" بزرگوں نے اختر کے اس افسانے کو فلسفۂ تصوف کی تفسیر سمجھ کر مصنف کے حق میں دُعائے خیر کی۔ مدیرِ "تعمیر" نے "آدم چھُ عجب ذات" کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ——— "اختر کے اس افسانے کے متعلق صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی، جب کہ کشمیری افسانے کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئی، وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جب کشمیری افسانہ پختگی کی بہت بہت منزلیں طے کر چکا ہوگا، اُس وقت بھی "آدم چھُ عجب ذات" کشمیری زبان کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے بے باک حسن نے اسے اختر کے فن کا سنگِ میل بنا دیا ہے۔" ("تعمیر" نومبر دسمبر ۱۹۵۹ء) علی محمد لون نے اسے اختر کے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے ("انڈین لٹریچر") نور محمد بٹ نے کہانی کے کرداروں کو غیر فطری قرار دے کر اُن تضادات کی طرف اشارہ کیا ہے جو دو مرکزی کرداروں کے نظریات اور ان کے کرداروں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے موضوع کی خوبصورتی کو سراہنے کے باوجود تکنیک اور پیشکش کی کمزوریوں پر زور دیا ہے ("خدمت" ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ء) سری دینا ناتھ نادم نے ایک نجی گفتگو میں "آدم چھُ عجب ذات" پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اختر حقیقت سے گریز کر کے طلسمات میں کھو گیا ہے۔ امین کامل افسانے میں افسانہ نگار کی شخصیت تلاش کرتے کرتے مایوس ہو گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ "اختر کا نقطۂ حسن غیر صحت مند اور ماورائی ہے ——— " غرض کشمیری ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر اہلِ رائے نے افسانے میں دلچسپی کا اظہار کر کے اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں اسے کشمیری زبان اور ادب کے لئے ایک نیک شگون سمجھتا ہوں۔ اختر کے افسانے پر جس ضبط و توازن اور سنجیدگی سے تنقید ہوئی ہے یا ہو رہی ہے اُس سے کشمیری زبان میں تنقید کی اہمیت واضح ہو گئی ہے۔

مجموعی اعتبار سے اختر کے اس افسانے پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی ہے۔ علی محمد لون اور محمد یوسف ٹینگ کے تعریفی جملوں کے سوا کسی اور صاحب نے "آدم چھُ عجب ذات" کو نہ کشمیری زبان کا بہترین افسانہ مانا ہے اور نہ اختر کا اپنا افسانے کے موضوع، تکنیک، زبان اور پیش کش سبھی عناصر پر اعتراضات ہوئے ہیں اور ان اعتراضات کو جناب رحمان راہی نے ایڈیٹر "تعمیر" کے نام ایک خط نما مقالے میں بڑی خوبصورتی سے سمیٹا ہے ("تعمیر" جنوری فروری ۱۹۶۰ء) راہی صاحب نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے افسانے کے موضوع، کرداروں، تکنیک اور اس کی زبان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر اُس خامی کی طرف اشارہ کیا ہے جو بقول ان کے افسانے کی ناکامی کا باعث بنی ہے اور جس پر گذشتہ چار مہینوں سے کافی لے دے ہوئی ہے، اس اعتبار سے راہی صاحب کے مقالے کو ان اعتراضات کا خلاصہ بھی سمجھنا چاہیئے اور حاصل بھی، جو کشمیری ادب کے اہلِ ذوق قارئین نے افسانے پر کئے ہیں۔ میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دینے سے قبل جناب راہی صاحب کو ان کے سنجیدہ تنقیدی مطالعے کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔ کشمیری زبان میں یہ پہلا تنقیدی مطالعہ ہے جو زبان اور اسلوب کے لحاظ سے کشمیری تنقید

کا اوّلین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ راہیؔ صاحب کے تنقیدی نظریات سے شدید اختلافات کے باوجود میں ان کے استدلال اور طرزِ بیان کی کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ان کی اس کاوش نے کشمیری زبان میں تنقید لکھنے کی طرح ڈال دی ہے۔

راہیؔ صاحب کے اعتراضات اور ان کے سیاق و سباق کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اخترؔ کی کہانی "آدم چھُہ عجب ذات" کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جائے تاکہ وہ لوگ، جو کشمیری زبان سے ناواقفیت کی بنا پر یہ کہانی نہ پڑھ سکتے ہوں، بحث کی اصلیت اور اعتراضات کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔

رمضانا ایک ہانجی کا لڑکا ہے۔ اس کی تعلیم واجبی ہے۔ وہ کشمیر سے باہر جاکر دُنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک پنجرے میں قید ہے۔ اُسے حیرت ہوتی ہے کہ ہزاروں میل سے لوگ کشمیر کیوں آتے ہیں، یہاں کیا رکھا ہے؟ دوسری عالم گیر جنگ میں اُسے رنگروٹ بننے کا موقع ملتا ہے اور وہ فوج میں بھرتی ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ چار سال تک کئی ممالک میں جنگی محاذوں پر کام کرتا ہے۔ اس دوران میں وہ جب کبھی باپ کو خط لکھتا ہے تو یہی لکھتا ہے کہ کشمیر جیسی خوبصورت جگہ میں نے کہیں نہیں دیکھی، باقی ساری دُنیا ایک ویرانے سے کم نہیں! چار سال کے بعد جنگ کے خاتمے پر رمضانا واپس کشمیر لوٹا تو اس کی ساری شخصیت بدلی ہوئی تھی۔ اس کے باپ ملہ سُبحان کو یُوں محسوس ہوا کہ رمضانا کے "دماغ" کو "کچھ" ہوگیا ہے۔ وہ اس "کچھ" کی تشریح یا تفسیر نہ کر سکتا تھا، لیکن اُسے یہ احساس ضرور ہوگیا کہ "کچھ" ہوگیا ہے — رمضانا کا یہ حال تھا کہ وہ صُبح و شام ایک عجب کیفیت میں رہتا تھا، اُسے کشمیر کے پہاڑوں، یہاں کے سبزے اور جھیلوں سے ایک والہانہ عشق ہوگیا۔ وہ کہتا کہ "عرب، عراق اور مصر کے ریگستان بےجان ہیں، کشمیر کی مٹی میں زندگی ہے"، وہ وہاں کے لوگوں کی تنگ دِلی، وہاں کی فیکٹریوں اور پختہ سڑکوں کی بے رحمی کا ذکر کرتا، جنگ کی ہولناکیوں اور زندگی کی ارزانی کا ذکر کرتا — اور اسی کے ساتھ کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی اور یہاں کی حیات آفریں فضاؤں کا بھی ذکر کرتا وہ دِن بھر شکارے میں بیٹھ کر جھیل ڈل میں پانی پر پہاڑوں اور درختوں کے عکس کو دیکھتا رہتا۔ پتوں پر شبنم اور پانی کے تیرتے ہوئے قطروں کو دیکھتا رہتا — ڈل میں تیرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے پیچھے بھاگتا رہتا — رمضانا کی ان حرکتوں سے سب لوگوں نے یہی سمجھا کہ رمضانا پاگل ہوگیا ہے۔ ملہ سُبحان کو بھی رمضانا کے پاگل پن کا یقین ہوگیا۔ رمضانا اپنے باپ کو ڈل، پہاڑوں اور سبزے کی خوبصورتی کا احساس دِلانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ اس کا باپ اس حُسن اور اس خوبصورتی سے متاثر کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے کئی بار اُسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے سکے، اس کے سینے کے اندر جو تلاطم تھا اُسے بیان کرنے کے لئے زبان کی ضرورت تھی۔ رمضانا کے پاس یہ زبان نہ تھی! وہ اشاروں سے سب کچھ سمجھانا چاہتا تھا، لیکن ملہ سُبحان یہ اشارے کیونکر سمجھتا — ملہ سُبحان رمضانا کو پاگل سمجھ کر اُس سے مایوس ہوگیا، تعویذ گنڈے سے بھی کام نہ چل سکا۔ تو اس نے اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر ایک دِن ڈل یخ بستہ ہوگیا، درختوں کے پتے زرد ہو ہو کر گرے، سبزہ سُوکھ کر پژمردہ ہوگیا اور رمضانا نے باحسرت و یاس ملہ سُبحان سے پُوچھا۔ "وہ سب کیا ہوا؟ وہ سبزہ؟ وہ پانی؟" ملہ سُبحان نے رمضانا کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "سرما کو ختم ہونے دو، سب کچھ لوٹ آئے گا۔" لیکن رمضانا کی بے چین رُوح کیونکر انتظار کر سکتی تھی۔ سرما کی منحوس سرد مہری وہ کیونکر قبول کر سکتا تھا۔ اور پھر ایک صبح کو رمضانا کی لاش ڈل کے یخ بستہ پانی میں پائی گئی!

اس کے کئی سال بعد کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز دوشیزہ ملہ سُبحان کے ہاؤس بوٹ "بٹر فلائی" میں آکر رہنے لگی۔ یہ میم صاحب دِن بھر مصوری میں مشغول رہتیں۔ یا انگریزی شاعری کی کوئی کتاب اُونچے سُروں میں پڑھتی رہتی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی طالب علم تھیں اور انگریزی شاعروں میں ورڈز ورتھ اس کا محبوب شاعر تھا۔ ورڈز ورتھ، چونکہ پہاڑوں، مرغزاروں اور فطرت کی کرشمہ سازیوں کا شاعر ہے، اسی لئے میم صاحب کو بہت مرغوب تھا۔ میم صاحب بھی پہاڑوں اور مرغزاروں کی تصویریں بنایا کرتی۔ وہ ڈل میں تیرتے ہوئے پتوں پر پانی کے قطروں کی تصویریں بناتی اور جب کبھی ملہ سُبحان اُس سے پُوچھتا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں بناتی ہے تو میم صاحب کہتی کہ "میری ان تصویروں سے اُن لوگوں میں حُسن کا احساس پیدا ہوگا جو یہ سب کچھ یہاں آکر نہیں دیکھ سکتے — " ملہ سُبحان جاننا چاہتا تھا کہ حُسن کا احساس پیدا ہونے سے کیا ہوگا؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ میم صاحب بہت کچھ سمجھانے کے باوجود بھی ملہ سُبحان کو کچھ نہ سمجھا سکی۔ ملہ سُبحان کو بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اے کاش! آج رمضانا زندہ ہوتا تو وہ یہ سب باتیں سمجھ سکتا!

ایک دِن میم صاحب ملہ سُبحان کو ساتھ لے کر شالیمار باغ گئی۔ دِن بھر شالیمار میں تصویریں بنا کر جب وہ باہر آئی تو اس نے شالیمار باغ کے پیچھے والے پہاڑ کی اُونچی چوٹی پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چار و ناچار ملہ سُبحان اس کے

ساکت ہو گیا۔ میم صاحب ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی بلندیوں کی طرف پھلانگ رہی تھی۔ آخر کار چوٹی کے قریب پہنچ کر اس نے ملا شبحان کو کہا کہ وہ ایزل لگا دے ——— ملا شبحان نے ایزل لگا دیا، لیکن میم صاحب کی نگاہیں خلاؤں میں کھو گئیں۔ وہ جیسے بڑے انہماک سے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کر رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور شفق کا لالہ زار دور پہاڑوں پر پھوٹ رہا تھا۔ برف پوش چوٹیوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں ——— نیرنگیٔ فطرت کا وہ شاہکار تخلیق ہو رہا تھا جس نے میم صاحب کو مبہوت کر دیا، میم صاحب کی مسرت کو حیرت میں بدل دیا۔ وہ ایزل کے پاس آ کر اس تصویر کو رنگوں کے امتزاج سے کاغذ پر منتقل کرنے لگی — وہ رُک گئی! وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ اس وسیع اور اتھاہ حسن کو ان رنگوں میں سمیٹ سکتی ہے۔ فن کار اپنے فن سے حسن کی تکمیل کرتا ہے، مگر یہ وسعت، یہ سلیقہ اور یہ حسن؟ کیا وہ اس میں کسی قسم کا اضافہ کر سکتی ہے؟ نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے کی کوشش بھی اس حسن کی توہین ہوگی۔ وہ سوچتے سوچتے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس سارے پھیلے ہوئے حسن کا ایک حصہ ہے، اس کا ایک جزو ہے اور اگر وہ ذرا بھی حرکت کرے تو اس حسن کا سارا میزان سلیقہ اور ترتیب درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔ میم صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر ملا شبحان نے اُسے "میم صاحب" کہہ کر پکارا۔ میم صاحب کو اپنے وجود کا احساس ہوا اور وہ اپنے سے یوں ہم کلام ہوئی — "افسوس کہ اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، یہاں ورڈز ورتھ اور وان گاگ بھی نہیں پہنچ سکتے" ملا شبحان کو رمضانا یاد آیا ——— اُدھر میم صاحب خود کلامی میں مصروف تھی۔ "دو ہی راستے ہیں، یا تو یہ سارا حسن سمیٹ کر اپنی روح کے ساتھ ہم آغوش کیا جائے یا اپنی روح کو آزاد کر کے اس سارے حسن میں تحلیل کر دیا جائے ———"

میم صاحب نے دور پہاڑوں کی ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملا شبحان سے پوچھا کہ اس چوٹی پر کوئی روح ہوگی؟ ملا شبحان نے کہا کہ وہاں پر تو نہیں، ہاں کوہِ سلیمان کی چوٹی پر ایک روح ضرور ہے، میرے بیٹے رمضانا کی روح ——— اور اس کے بعد اس نے میم صاحب کو رمضانا کی ساری روداد سنائی۔ اور میم صاحب کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی بہت بڑی مشکل حل ہو گئی ہے۔ جسم کے پنجرے سے روح کو آزاد کر کے اس سارے حسن میں تحلیل کرنا ہی زندگی ہے۔ میم صاحب نے چوٹی کی بلندی سے چھلانگ مار کر اپنی روح کو قفسِ عنصری سے آزاد کر دیا۔ ——— میم صاحب کی موت نے ملا شبحان کے لئے کسی بڑے عقدے کا حل پیش کر دیا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ آج ساری حقیقت کھل گئی (آج بات کا شل نکل گیا) اس نے یہ کہہ کر جج کو سب کچھ سمجھانا چاہا کہ آج بات کا شل "نکل گیا"، مگر جج کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس لئے ملا شبحان کو ساری روداد سنانا پڑی۔ ملا شبحان کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ رمضانا، میم صاحب اور وہ خود ایک سلسلے کی کڑی ہیں، وہ یہ فیصلہ نہ کر پاتا تھا کہ میم صاحب اس کی بیوی ہے، بہو ہے یا اس کی اپنی بیٹی!

میں نے ذرا تفصیل سے افسانے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ "آدم چہ عجب خساست" میں پلاٹ کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی ماحول اور فضا کو، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ افسانہ پلاٹ سے نہیں بلکہ ماحول اور فضا (Atmosphere) سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی لئے افسانے کا لُبِّ لباب پیش کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں کہ میں پڑھنے والوں کو افسانے کے موضوع اور اس کے کرداروں کی نفسیات کی باریکیوں سے آشنا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں گا کیونکہ اس قسم کے افسانے میں جزئیات اپنے اختصار کے باوجود غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں اور کہانی کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مجھے ان جزئیات کو نظر انداز کرنا پڑا ہے بہرکیف اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میں کوشش کروں گا کہ اس فضا اور ان جزئیات کو بھی پیش کر سکوں، جن سے افسانے میں ایک لطیف کیفیت اور غیر معمولی تاثر پیدا ہوا ہے۔

"آدم چہ عجب خساست" کے ناقدین اور معترضین نے اپنے تجزیے کی ساری عمارت ایک غلط بنیاد پر قائم کی ہے اور جب "خشتِ اوّل" ہی کج ہو تو "دیوار کی کجی" ایک منطقی نتیجہ بن جاتی ہے۔ شاعری، ناول، تنقید اور ڈرامے کی طرح افسانوں کو بھی موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے شاعری کو غزل، مثنوی اور قصیدہ کے علاوہ کلاسیکل، رومانوی اور تصوّف کی شاعری کے مختلف عنوانوں کے تحت بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ناول کو بھی سیاسی، تاریخی اور رومانی ناول کہا جاتا ہے، تنقید کے لئے بھی تاثراتی تنقید اور سائنسی تنقید کی دو مختلف اصطلاحیں وجود میں آ گئی ہیں۔ ڈرامے کی تقسیم بھی موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح افسانے کو بھی اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر نفسیاتی، رومانی یا اصلاحی کہا جا سکتا ہے جس طرح ایک تاریخی ناول کو اصلاحی ناول کے معیاروں پر جانچنے سے غلط نتائج برآمد ہوں گے۔ اسی طرح ایک رومانوی افسانے کو حقیقت نگاری کے مقررہ معیاروں پر پرکھنے سے

گمراہ کُن نتائج اخذ کیے جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سائنسی تنقید کی اساس عقلیت، توازن اور پختہ سماجی شعور پر ہے، لیکن ہر صنفِ ادب کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اور اس مزاج کی اصلیت اور اس کے عناصرِ ترکیبی اور اس کی کیفیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نقاد اپنے شعور کو فن کار کے شعور سے ہم آہنگ کر دے ــــــ اور اپنے نظریے کو فن کار کی نظر سے ہم آغوش کر دے۔

ــــــ جناب رحمان راہی نے "آدم چھُ عجب ذات" کے تجزیے میں یہی بنیادی غلطی کی ہے۔ انہوں نے ایک رومانوی افسانے کو مروّجہ حقیقت نگاری کے اصولِ نقد پر پرکھ کر اپنے نظریات کو اختر کی "نظر" پر مسلّط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے "آدم چھُ عجب ذات" کے مطالعے میں اہلِ نقد نے یہی ٹھوکر کھائی ہے ــــــ "آدم چھُ عجب ذات" کے رومانوی کردار کو کشمیری زبان کے اہلِ نظر اور صاحبُ الرائے نقادوں نے کیونکر نظر انداز کیا۔ یہ سمجھنے کے لئے کشمیری ادب کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر کرنا ضروری ہے، لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رومانیت سے میری مُراد کیا ہے؟

لغوی اعتبار سے رومان، عشق و محبّت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن ادب میں رومانیت کی اصطلاح ایک تحریک، اندازِ فکر اور ایک مخصوص دَور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انگریزی اور اُردو ادب میں رومانوی تحریک کلاسیکیت کے مروّجہ ضابطوں اور اصولوں کے خلاف احتجاج کے طور پر پیدا ہوئی۔ رومانوی ادیبوں نے عقلیت، توازن، تقلید اور میانہ روی کی بُنیادی قدروں کو اپنے پاؤں کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنے کی کوشش کی۔ وہ بنے بنائے سانچوں کو توڑ کر فضا میں پرواز کرنے لگے، ان کے نزدیک انسانی جذبات کو عقل کے تابع بنا کر مطلق اصولوں پر کاربند رہنا انسان کی خودی اور اس کی عظمت کے منافی تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے رومانوی ادیبوں کے اندازِ فکر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ "رومانوی ادیب کے نزدیک عقل محض چیزوں کی ظاہری شکل و صورت اور ترتیب سمجھنے میں مدد دیتی ہے لیکن ان کی ماہیت تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ہمیں ان میں ماورائی حقیقت کا پرتو نہیں دکھاتی، جو ان کے اندر ایک نئی تابناکی پیدا کرتی ہے۔ اس کے نزدیک عقل چراغِ راہ گذر سے زیادہ نہیں اور جذبات اور وجدان ہی وہ آگ پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اُجالوں سے رُوشناس کرتی ہے۔ عقل کی رسائی محض حقیقت کے ایک جُزو تک ہوتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اس کے اصول و ضوابط بناتی ہے۔ حُسن کو قاعدوں اور زاویوں میں اسیر کرتی ہے اور اصل رُوح کو فراموش کر دیتی ہے۔" (اُردو ادب میں رومانوی تحریک) اسی اندازِ فکر نے ادب میں ایک پُوری تحریک کو جنم دیا اور بعض دیو قامت ادبی شخصیتیں بڑی مدّت تک رومانیت کی زُلفِ گرہ گیر کی اسیر رہیں۔ "رومانیت" کا عنصر یُوں تو ہر ادیب کی ادبی تخلیقات میں موجود ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی، جو رومانوی تحریک سے قبل یا بعد گذرے ہیں، اپنی پروازِ فکر میں کبھی نہ کبھی رومانویت کی فضاؤں میں آنکلے ہیں، لیکن ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے یُورپ میں یہ تحریک انقلابِ فرانس کے دَور میں ہی منظم ہو گئی۔ اور اُردو میں اس کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اُردو ادب میں رومانوی تحریک کے علم برداروں میں اقبالؔ کے ساتھ ساتھ ابوالکلام آزادؔ، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، اخترؔ شیرانی، نیازؔ فتح پوری، حفیظؔ جالندھری اور جوشؔ ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔ ان سب کے ہاں فضا میں پرواز کرنے کی شدید خواہش، مروّجہ دستوروں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کشمکش، بنے بنائے سانچوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کا جذبہ، فطرت سے بے پناہ اور والہانہ عشق کی کیفیت اور جنس کا ایک ماورائی تصوّر ملے گا! ڈاکٹر محمد حسن نے رومانوی ادیبوں کے رُجحانات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جذباتی آسُودگی کی خواہش انہیں تصوّرات کی دُنیا میں محو کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ ایک ماورائی دُھند میں کھو جاتے ہیں اور ستاروں پر اتنی دیر نظریں جماتے ہیں کہ کرۂ ارضی فراموش ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے شکنجوں سے تنگ آ کر نیچر کی پرستش کرتے ہیں اور سادگی اور معصومیت کے گیت گاتے ہیں، جہاں انسان کی پرداخت تمام تر عقل اور علم کے نہیں، فطرت اور جذبات کے ہاتھ میں ہو ــــــ" کم و بیش اور کسی نہ کسی رنگ میں یہی رُجحان آپ کو ہر رومانوی ادیب اور شاعر کے ہاں نظر آئے گا۔

ادب میں رومانوی تحریک کی تاریخ اور تجزیہ اس وقت میرا موضوع نہیں۔ لیکن اس کا سرسری سا ذکر کرنا اس مرحلے پر میرے لئے ناگزیر ہو گیا ہے، اس لئے کہ "آدم چھُ عجب ذات" کے رومانوی کردار کو واضح کرنے کے لئے یہ بیان بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ کشمیری ادب کے نقادوں نے اس افسانے کو حقیقت نگاری کے مروّجہ اصولِ نقد اور معیار پر پرکھ کر کچھ گمراہ کُن فتوے صادر کر دئے ہیں۔ اختر کا زیرِ بحث افسانہ چونکہ کشمیری زبان کا پہلا عظیم رومانوی افسانہ ہے، اس لئے اس کے تجزیے میں سب نقادوں نے یہ بُنیادی غلطی کی ہے۔ یہ اجتماعی فروگذاشت ادبی رومانیت کی تحریک اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ کشمیری ادب کی تاریخ میں رومانویت بہ حیثیت تحریک

یا مکتبۂ فکر کے کبھی نہیں اُبھری ہے۔ انگریزی ادب کی طرح اُردو میں بھی کلاسکیت رومانویت اور حقیقت نگاری کی تحریکیں ایک دوسرے کے ردِّ عمل کے طور پر پیدا ہوتی رہیں۔ کشمیری ادب کے کلاسیکی دَور پر اُردو سے زیادہ فارسی زبان کا اثر نمایاں ہے۔ اس دَور کے متقدمین رسول میر، محمود گامی، وہاب کھار، مقبول کرالہ واری اور ان کے ہم عصر شعرا پر اُردو کے مقابلے میں فارسی کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ مہجور کی ابتدائی شاعری میں بھی فارسیت کا یہ غلبہ واضح طور نظر آئے گا ـــــ لیکن ان کے ہاں رفتہ رفتہ زبان فارسی کے اثر سے آزاد ہو کر نکھرنے لگی اور کشمیری زبان نے براہِ راست اُردو ادب کی تحریکات سے متاثر ہونا شروع کر دیا۔ دَورِ قدما کے شعرا چونکہ اُردو زبان سے ناواقف تھے، اس لئے ان کے لئے اُردو ادب کے رُجحانات سے متاثر ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ فارسی ادب کے رُجحانات اور تحریکات سے تاثر قبول کرنے کا اس لئے سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ ایران اور کشمیر کے درمیان براہِ راست کوئی ثقافتی تعلق قائم نہیں تھا، اسی لئے کشمیری شاعری کا کلاسیکی دَور، جو رسول میر سے مہجور تک پھیلا ہوا ہے، کسی بڑی تبدیلی، غیر معمولی رُجحان یا کسی منظم ادبی تحریک کے نشو و نما کے لئے موزوں اور ساز گار نہیں تھا۔ مہجور کے ہاں سب سے پہلے تبدیلی کا یہ احساس واضح طور پر اُبھرتا ہے۔ مہجور چونکہ اُردو سے خاصی واقفیت رکھتے تھے، اس لئے ان کے ہاں اُردو کے ادبی رُجحانات کا اثر بھی نظر آئے گا۔ یہ اثر ان کے ہم عصر آزاد کے ہاں زیادہ واضح صورت میں نظر آتا ہے۔ تحریک حُریت کے آغاز سے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان ایک گہرا ربط اور تعلق پیدا ہو گیا تھا اور اس طرح ہندوستان کی سیاسی تحریکوں، ادبی میلانات اور اس نوع کی دوسری تبدیلیوں نے کشمیری عوام اور یہاں کے فن کاروں کو براہِ راست متاثر کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ترقی پسند مصنفین کے قیام سے اُردو ادب میں رومانوی تحریک کا اثر کم ہو کر حقیقت نگاری کا ادبی نظریہ مقبول ہو رہا تھا۔ مہجور اور آزاد کے ہاں رومانویت کا عنصر ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس رومانویت کی جڑیں آپ کو اسی زمین میں نظر آئیں گی، وہ ستاروں پر نظریں ضرور جماتے ہیں، لیکن اتنی دیر نہیں کہ کرۂ ارض کو فراموش کر دیں۔ ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا بڑا ہی حسین سنگم نظر آئے گا۔ مہجور کے مقابلے میں آزاد کے ہاں انقلابی رومانیت کے عناصر زیادہ واضح اور ٹھوس شکل میں ملتے ہیں، کیونکہ وہ اقبال سے بے حد متاثر تھے، لیکن تحریک حریت کشمیر سے وابستگی اور قربت کی بنا پر وُہ خالص رومانوی شاعر ہونے سے بچ گئے۔ اور اس طرح کشمیری ادب میں رومانویت بحیثیتِ تحریک کے پروان نہیں چڑھ سکی ـــ جب اُردو ادب میں رومانویت کا زور تھا، ہمارے ہاں کے شاعر کلاسیکی روایات سے گہری وابستگی اور اُردو کی ادبی تحریکات اور رُجحانات سے ناواقفیت کی بنا پر رومانویت سے متاثر نہیں ہو سکے۔ اور جب کشمیری شاعروں نے براہِ راست اُردو کی ادبی تحریکات سے متاثر ہونا شروع کیا تو اُردو میں رومانویت کا زور ختم ہو کر حقیقت نگاری کا مکتبۂ فکر ایک تحریک بن کر اُردو ادب پر چھا گیا تھا، اس لئے کشمیری ادب میں رومانیت ایک طرزِ فکر یا تحریک کی صورت میں کبھی ظاہر نہیں ہوئی۔ مہجور اور آزاد کی حقیقت پسند رومانیت کا اثر شاید کچھ دیر قائم رہتا، لیکن اکتوبر ۴۷ء۱۹ میں قبائلی حملے نے انقلابی حقیقت پسندی کے رُجحانات کو فروغ دیا؛ اور مارکسی حقیقت نگاری ہمارے ادب کا "دستورِ اساسی" بن کر رہ گئی۔ دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، امین کامل، نور محمد روشن، غلام نبی فراق سے لے کر پریم ناتھ پردیسی اور مولانا محمد سعید مسعودی تک رجز گانے میں مشغول ہو گئے۔ انگریزی اور اُردو ادب کی روایات اور تاریخ کے برعکس کشمیری ادب میں صرف کلاسیکیت اور حقیقت نگاری کے نظریات کو ہی فروغ ملا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۹ء میں اختر کے رومانوی افسانے نے کشمیر کے صائب الرائے نقادوں اور اہلِ نظر فن کاروں کو "پریشان" کر دیا ہے کہ اس افسانے کو کیونکر افسانہ کہیں اور اس کے موضوع، اسلوب اور کرداروں کے ساتھ کیا "سلوک" کیا جائے۔ رومانوی ادب کی روایات اور تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر انہوں نے اس افسانے کو حقیقت نگاری (اور غیر شعوری طور ان کے ذہن اب بھی مارکسی حقیقت نگاری کے طلسم میں اسیر ہیں) کے زاویوں سے پرکھ کر اسے ایک مبہم اور نابالغ تصور قرار دیا؛ اس کے کرداروں کو غیر فطری اور مخبوط الحواس قرار دیا۔ اختر کے نظریۂ فن اور حُسن کو غیر صحت مند قرار دیا ـــــ میں ان ناقدوں کے خلوص پر شبہ کرنے کی جُرأت نہیں کروں گا، لیکن ان کے تاریخی شعور پر اعتماد کرنے میں تامّل ضرور کروں گا!

میرے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جانا چاہیئے کہ میں ادبی رومانیت کا دِل دادہ ہوں یا یہ کہ میں رومانوی تحریک اور ادیبوں کا پرستار ہوں یا میں کشمیری ادب میں رومانوی مکتبۂ فکر کو فروغ دینے کا خواہش مند ہوں۔ میں نے صرف کشمیری ادب میں رومانوی تحریک کے عدم وجود کا تاریخی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ جس طرح قصیدے کو غزل اور داستان

امیر حمزہ کو منشی پریم چند کے ناولوں کے معیار سے پرکھنے کی کوشش غلط اور گمراہ کن نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک رومانوی افسانے کو منطق، عقلیت اور وکیلانہ استدلال کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ رومانوی ادب کی کچھ اپنی روایات ہیں اور اسے جانچنے کے لئے ان روایات سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ میں ذاتی طور پر ادب میں رومانویت کے رُجحان کو مستحسن نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اعلیٰ ادب رومان اور حقیقت کا سنگم ہوتا ہے۔ نِری رومانیت یا نِری حقیقت نگاری بجائے خود ادب نہیں بن سکتی۔ لیکن "آدم چھُ عجب ذات" کے پس منظر، اس کے موضوع اور اس کے اسلوب میں ایک ایسی دِل کشی ہے کہ اپنے رومانوی کردار کے باوجود میں اسے اختر کے بہترین افسانوں میں شمار کرتے ہوئے ہر لحاظ سے ایک کامیاب افسانہ تصوّر کرتا ہوں۔ اختر کی رومانیت میں تخیل کی پرواز ضرور ہے لیکن یہ پرواز ہمیں خلاؤں میں نہیں لے جاتی بلکہ گہرائیوں میں دیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ ستاروں کی جانب تو دیکھتے ہیں، لیکن اتنی دیر تک نہیں کہ کرّہ ارض کو فراموش کر دیں۔ اگر "آدم چھُ عجب ذات" کے ناقدین ادب میں رومانوی رُجحانات کی ترویج کے خلاف آواز بلند کرتے تو شاید میں بہت دُور تک ان کے ہمراہ جاتا، لیکن انہوں نے افسانے کے کرداروں کو منطق، عقلیت اور نفسیات کے اُن میکانکی اصولوں سے جانچنے کی کوشش کی ہے جن پر دُنیا کا کوئی ادب پارہ اپنی "ادبیت" کو محفوظ نہیں پائے گا۔

بعض دوست یہ اعتراض کریں گے (اور ستم ظریفی یہ کہ نقّادوں میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا ہے) کہ کلاسیکیت سے رومانویت کی طرف پرواز کرنے کی تو توجیہہ کی جا سکتی ہے لیکن حقیقت نگاری سے لوٹ کر رومانویت کو اپنانے میں کیا تُک ہے، کیا یہ فن کار کی ترقیٔ معکوس نہیں؟ اس اعتراض میں کچھ وزن ضرور ہے، اسی لئے میں اس "ترقیٔ معکوس" کے تاریخی اسباب پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے رومانویت کو اُس اصول پرستی، عقلیت اور میانہ روی کے خلاف صاعقہ بردوش بغاوت قرار دیا ہے جس نے زندگی اور حُسن کو چند گِنے چُنے محدود دائروں میں اسیر کر لیا تھا۔ کلاسیکیت عقلیت کا نشان تھی، جذبات کو یہاں ثانوی اور بعض حالات میں کوئی حیثیت ہی حاصل نہ تھی۔ رومانوی ادیبوں نے عقل کی اس آمریت کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کی ــــــ رومانیت اسی طاقت ور اَنا اور زبردست خودی کی مظہر ہے جو پُرانے مسلّمات کو ردّ کرتی ہے اور دُنیا کو اپنے جذب و شوق کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔" (اُردو ادب میں رومانوی تحریک)۔ جس طرح کلاسیکیت کا بُت توڑنے کے لئے رومانوی "سر فروشوں" نے اپنا خون دیا تھا، اسی طرح رومانوی "ہوابازوں" کو زمین پر اُتارنے کے لئے حقیقت پسندوں نے بھی ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ رومانوی بغاوت جو عقلیت اور اصول پرستی کا ردِّ عمل تھی، بہت جلد بے راہ روی اور بے اصولی کا مظہر بن گئی اور اسی لئے حقیقت نگاروں کو منظم ہو کر پھر زندگی اور ادب کے کچھ ضابطے، اصول اور راہیں متعین کرنا پڑیں۔ اتفاق سے زندگی اور ادب کے یہ ضابطے متعیّن کرنے کا کام مارکسی حقیقت نگاروں کے ہاتھوں میں پڑ گیا ــــ اور ان آئین سازوں نے، جو مارکسی زیادہ تھے اور حقیقت نگار کم، ادب اور زندگی کے وہ وہ آداب مقرر کئے کہ زندگی سِمٹ کر "ضابطۂ فوج داری" ہو کر رہ گئی۔ اس ضابطے کا کشمیری ادب اور کشمیری ادیبوں کی زندگی پر ۱۹۴۷ء کے بعد جس شدّت سے اطلاق ہوا، شاید ہی مُلک کے کسی اور حصّے میں ہوا ہو۔ ادب میں افادیت، سماجی پس منظر، عقلیت اور توازن کا مطالبہ اس طور سے ہونے لگا کہ ادب، ادب نہیں، بلکہ چند مخصوص آداب کے التزام کا نام ہو کر رہ گیا۔ عوامی ادب کے نام پر ادیبوں سے وہ وہ تقاضے ہونے لگے کہ ادیب کی آزادی، انفرادیت اور شخصیت دب کر رہ گئی۔ ۱۹۵۲ء کے بعد کلچرل کانگریس کے نام سے ایک نیم سرکاری انجمن وجود میں آئی اور ادبی احتساب کا کام زیادہ منظم طور ہونے لگا۔ کلچرل کانگریس سے گہری وابستگی کی بنا پر مجھے معلوم ہے کہ کس طرح ادیبوں کی ایک پوری نسل کو مارکسی نظریات کا تابع بنا کر ان کی انفرادیت کو مجروح کر دیا گیا۔ جب کبھی کوئی شاعر یا افسانہ نگار اپنی تخلیق پیش کرتا تو اس پر اس انداز سے تنقید ہوتی ـــــ "کیا اس میں افادیت ہے یا نہیں؟ کیا یہ ادب پارہ سماج کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس میں مزدور طبقے کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے؟ کیا اس کے کردار (meaningful) ہیں یا نہیں؟ کیا اس کے سبھی رُجحانات صحت مند ہیں؟ اس میں سرمایہ داری کے موجودہ استحصالی نظام کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ ہے یا نہیں؟ کیا یہ ادب برائے زندگی کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے یا نہیں؟" ـــــــ اس نوعیت کی تنقیدی جراحی کے بعد محتسبوں کی طرف سے یہ فیصلہ صادر ہوتا تھا کہ یہ ادبی تخلیق صحت مند ہے یا غیر صحت مند۔ ظاہر ہے کہ ان پابندیوں کا التزام کرتے ہوئے فن کار کو کتنی مرتبہ اپنی رُوح کو مجروح کرنا پڑتا تھا ــــــ یہ ادبی محتسب کون

تھے جو اس منصب پر ہم سب فائز تھے۔ دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، عزیز ہارون، اختر محی الدین اور پران ناتھ جلالی سے لے کر اکبر لداخی تک سب لوگ ادب برائے زندگی کی روایات کو سینے سے لگائے زندگی کا "تحفظ" کر رہے تھے۔ میں نے بارہا ادیبوں پر اس قسم کے تنقیدی حملے کئے ہیں۔ (میں نے اُن دِنوں غالب کی شاعری کو فضولیات کا پلندہ ثابت کرنے کے لئے ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا) اور جن سرکشوں نے ادب اور زندگی کے ان محافظوں کے تئیں اپنے ماتھے پر شکن لائی کر ان کے خلاف "ایوانِ بالا" میں شکایت کی جاتی اور وُہ عنایتوں سے محروم کر دئے جاتے! زندگی پھر چند خانوں میں بٹ کر محدود ہو گئی تھی۔ ادب ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح خالص افادی ہو کر رہ گیا تھا۔ ادیب "حقیقت نگاری" کے جھانسے میں آ کر مارکسی مُبلّغ ہو کر رہ گئے ——— اور یہ صورتِ حال بہت دیر تک قائم رہی!

رفتہ رفتہ "حقیقت نگاری" کا طلسم ٹُوٹنے لگا۔ اس مخصوص عقلیت اور پابندیِ آداب کے خلاف بغاوت کے آثار نمُودار ہو گئے جس نے زندگی کو "بحرِ بیکراں تھے" "جوئے کم آب" بنا دیا تھا۔ کلچرل کانگرس ٹُوٹ گئی۔ رحمان راہی، امین کامل اور اختر محی الدین بھی Non Muslim made ہو گئے۔ بظاہر ادیبوں کا شیرازہ بکھر گیا، لیکن در حقیقت ان کی زنجیریں کٹ گئیں ـــ حقیقت پسندی کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا ہو گیا اور شاعروں کے ہاں یہ ردِ عمل ایک لطیف رومانویت کی شکل اختیار کر گیا۔ راہی، کامل، فراق اور خود نادم کے ہاں یہ رومانیت ایک مخصوص لب و لہجے کے ساتھ نظر آئے گی۔ ان کے ہاں کی رومانیت بغاوت کی شکل میں نہیں بلکہ ایک فطری ردِ عمل کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہے اور یہ ردِ عمل اُس نظامِ فکر کے خلاف ہے جس نے ادیبوں کو سیاسی مُبلغوں کے طور پر استعمال کر کے اُن کی شخصیت اور آزادی کو غصب کرنا چاہا۔ کشمیری نثر کی تاریخ بہت مختصر ہے اور ابھی تک نثر کی ایک ہی صنف یعنی صرف افسانہ ہی معرضِ وجود میں آیا ہے اور اس کا سہرا اختر محی الدین کے ہی سر رہے گا کہ اس نے افسانے کی صنف کو سنجیدگی سے اپنا کر کشمیری ادب میں کچھ قابلِ قدر اضافے کئے۔ "آدم چہ عجب ذات" اسی بغاوت کا بے باک ترجمان ہے جو بنے بنائے مفروضوں اور نظریاتی کلیوں کے خلاف ایک عرصے سے شعوری اور غیر شعوری طور کشمیری فن کاروں میں پرورش پا رہی ہے۔ انسانی ذہن اور نفسیات کی گتھیوں کو حل کرنے کے لئے جو میکانکی فارمولے مرتب کئے گئے ہیں اُن کے کثرتِ استعمال نے ان فارمولوں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ "آدم چہ عجب ذات" دراصل ان غلطیوں کا اعتراف ہی نہیں، ان نظریوں کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ سماجیات، عمرانیات اور اقتصادیات کے اصول مُسلّم، لیکن یہ "زندگی کرنے" کے گر ہیں، بجائے خود زندگی نہیں ہیں۔ انسانی زندگی کا معمّہ اس سے کہیں زیادہ پُراسرار، پیچیدہ اور حیرت انگیز ہے، جتنا اقتصادیات کے ماہرین اور فلسفی سمجھتے ہیں، اور اس "محشرِ خیال آدمی" کو سمجھنے کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، یہ صحیح ہے کہ خارجی حالات اس کے ذہن، اس کی نفسیات، اس کے خیالات اور اس کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک ادھوری حقیقت ہے ——— اس کی زندگی کو مکمل طور سمجھنے کے لئے اس داخلی دُنیا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اپنے اندر بڑی حقیقتیں پوشیدہ رکھتی ہے ——— خارجی دُنیا پر ہم نے اتنی توجہ صرف کی ہے کہ ہم اس داخلی دُنیا کے وجود سے مُنکر ہو کر رہ گئے ہیں، فرد کی شخصیت اور اس کی انفرادیت ہر حال میں سماج کے اجتماعی کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اپنا وجود نہیں کھوتی۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سال ہا سال کی Regimentation کے اثرات مختصر سے وقفے میں زائل نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ اب بھی بیشتر نقادوں اور ادیبوں کے ذہن پر غیر شعوری طور پر وہی اصولِ نقد اور ادبی معیار سوار ہیں جن سے وہ بظاہر اختلاف کرتے ہیں۔

"آدم چہ عجب ذات" پر رحمان راہی کا تنقیدی مقالہ اُسی ذہنیت اور اُسی "ضابطۂ فوج داری" کی پیداوار ہے، جس کے خلاف اختر کا افسانہ ایک فن کارانہ صدائے احتجاج ہے۔ رحمان راہی کے اعتراضات کا جواب دینے سے قبل میں افسانے کی تعریف میں اُن چند بیانات کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ افسانے میں انہیں کس چیز کی تلاش تھی اور انہیں کیوں مایوسی ہوئی ہے۔

افسانے کی تکنیک کے متعلق ارشاد ہے:۔

"افسانے کی سب سے بڑی دِل کشی اس کی ہیئت ہے۔ یہ ہیئت اتنی پختہ ... ... ہے کہ لامحالہ اختر کی اُستادی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ہیئت میں اس قدر توازن ہے کہ افسانے میں جو دُنیا اُبھرتی ہے، پڑھنے والا بیک وقت اس کے چاروں طرف دیکھ سکتا ہے۔ افسانے کا Suspense قریب قریب آخر تک برقرار رہتا ہے۔"

زبان کے متعلق راہی صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے :-

" زبان کا رنگ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے، بعض نازک مقامات پر افسانہ نگار نے زبان کے ساتھ ساتھ ہیئت کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی ہے... ... "

کردار نگاری کے متعلق فرماتے ہیں :-

" رمضانا کے مقابلے میں میم صاحب کا کردار بہت ہی معقول ہے... رمضانا کا نفسیاتی تجزیہ بجائے خود قابلِ تعریف ہے... .... یہاں اختر کی نگاہ بڑی گہرائیوں میں جھانکتی ہے... ... اختر کا مشاہدہ بھی مجموعی اعتبار سے بہت صحیح اور باریک ہے۔ "

... ... اور آخر میں افسانے کے متعلق رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ یہ سب چیزیں مل جل کر افسانے کو ایک طلسم بنا دیتی ہیں۔ "

ہیئت، زبان، کردار نگاری اور مشاہدے کے متعلق راہی صاحب کی یہ آراء ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے یہ دیکھیں کہ ان کے اعتراضات کی حقیقت کیا ہے!

سب سے پہلے موضوع کا سوال ہے، پیشتر اس کے کہ موضوع کی صحت مندی یا اس کے نظریاتی پہلو پر غور کیا جائے۔ اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ " آدم چہ عجب ذات " کا موضوع کیا ہے۔ راہی صاحب کا خیال ہے کہ افسانے کا موضوع "حسنِ فطرت ــــ انسان (یا فن کار) اور اظہارت کے تین اشاروں سے واضح ہو سکتا ہے، ان کے نزدیک افسانے کا مرکزی نقطہ حسنِ فطرت اور اس کے تئیں انسان کا ردِ عمل ہے، کیونکہ اپنی ساری بحث کی عمارت انہوں نے اسی خیال اور موضوع کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حسنِ فطرت کے تئیں انسان یا فن کار کے ردِ عمل کا یہ تاثر نہ صرف مبہم بلکہ ایک نابالغ تصور ہے ــــــ راہی صاحب نے " آدم چہ عجب ذات " کے طلسم میں کھو کر موضوع کا صحیح تعین کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرے نزدیک افسانے کا موضوع " آدم چہ عجب ذات " یعنی " انسان " ہے۔ حسنِ فطرت صرف اسی موضوع یا Theme کو پیش کرنے کے لئے ایک ذریعے Medium کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور افسانہ نگار نے اس بنیادی موضوع کو واضح کرنے کے لئے انسان کے احساسِ جمال اور اس کے جذبۂ محبت کا سہارا لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر افسانہ نگار نے اپنے نقطۂ نظر یا موضوع کو واضح کرنے کے لئے انسان کے جذبۂ نفرت یا اس کے اندر پوشیدہ بہیمیت کو بھی اُجاگر کیا ہوتا، جب بھی افسانے کا موضوع نفرت یا بہیمیت نہیں بلکہ " انسان " ہوتا ــــــ سوال یہ ہے کہ اختر کہنا کیا چاہتا ہے؟ میرے خیال میں اختر نے افسانے کے عنوان میں اس سوال کا واضح جواب دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے میں عنوان کو بڑی Significance حاصل ہے اور اگر اختر کی ذہانت اور اس کے شعور پر اعتماد کیا جائے تو فوراً اس بات کا احساس ہوگا کہ افسانے کا عنوان، اس کا موضوع بھی ہے اور راہی صاحب کے بہت سے سوالات کا جواب بھی! اختر زندگی میں عقلیت، توازن، میانہ روی اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو کئی زاویوں سے دیکھتا ہے۔ وہ کچھ بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر انسانی زندگی کا معمہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتصادیات، سماجیات، نفسیات اور اخلاقیات کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں انسانی ذہن اور زندگی ایک مربوط نظام کے تحت رواں دواں ہے، لیکن وہ نظریات پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ بڑی گہری نظر بھی رکھتا ہے وہ فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے کچھ ایسے بھی رازہائے سربستہ نظر آتے ہیں کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے " آدم چہ عجب ذات "! (انسان بھی کیا عجیب شے ہے!) اختر کا یہ تحیر اس کے ذہن میں ایک صحت مند تشکیک پیدا کر دیتا ہے اور یہ تشکیک اُسے رومانیت کی طرف لے جاتی ہے اور زندگی کے متعلق اس کے " سائنٹفک " نظریے میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اُسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی تا عدود، کلیوں اور فارمولوں میں نہیں سما سکتی، اس کی وسعتوں، اس کے تنوع اور رنگا رنگی کا احاطہ صرف فلسفہ اور منطق ہی نہیں کر سکتے۔ جدلیات زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس کے اسرار سے پردہ اُٹھانا اس کے بس کا روگ نہیں ــــ اور اس حد تک " آدم چہ عجب ذات " میں اختر کے نظریۂ فن اور زندگی کا سُراغ ملتا ہے لیکن راہی صاحب نے اختر کے نظریۂ فن، حسن اور زندگی کو رمضانا اور میم صاحب کی شخصیتوں میں تلاش کر کے اختر کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس حد تک ایک فن کار کی تخلیق میں اس کی شخصیت اور اس کے نظریات کو تلاش کیا جا سکتا ہے؟ راہی صاحب نے جس انداز سے اختر کے نظریات کی تلاش میں میم صاحب اور رمضانا کے کردار کو کھنگالا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ

ان کے نزدیک افسانے کا ہر کردار اپنے خالق کا "پبلسٹی آفیسر" ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے اصلاحی ناول فن کا ابتدا ہیں، انتہا نہیں۔ اپنی شخصیت اور اپنے پیغام کو اوروں تک پہنچانے کے لئے "اصغری" کا رُوپ دھارنا ہی کافی نہیں۔ "اکبری" کا جامہ بھی زیبِ تن کرنا پڑتا ہے۔ زندگی اب اتنی "سادہ و معصوم" نہیں کہ اسے آسانی کے ساتھ اصغری اور اکبری کے دو خانوں میں بانٹ دیا جائے۔ یہ اتنی "پُرکار" ہوگئی ہے کہ فن کار کو اپنی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے اپنے فن پاروں میں بکھیر دینا پڑتا ہے۔ راہی صاحب نے رمضانا اور میم صاحب کے کرداروں کو اختر کا نمائندہ سمجھ کر اختر کے نظریات کو غیر صحت مند قرار دیا ہے۔

راہی صاحب کا یہ تنقیدی نظریہ بجائے خود بہت ہی غیر صحت مند اور غیر ادبی ہے۔ افسانے اور ناول میں کردار فن کار کی تخلیق کے باوجود اپنی ایک انفرادیت، شخصیت اور کردار رکھتے ہیں۔ آپ فن کار سے یہ سوال نہیں کرسکتے کہ فلاں کردار نے ایسی بات کیوں کہی؟ فلاں کردار نے اس طرح کا طرزِ عمل کیوں روا رکھا؟ فلاں کردار کا نظریہ کیوں غیر صحت مند ہے؟ فلاں کردار نے اُس چیز سے کیوں محبت نہیں کی اور اُس چیز سے کیونکر کی؟ نقاد تھانے دار نہیں ہوتا ہے۔ وہ فن کار کے تجربات، اس کی مسرتوں اور اس کی حسرتوں میں شریک ہوکر اُس ذہنی انبساط کو عام کردیتا ہے جو اس کی تخلیق میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ راہی صاحب نے تنقید نہیں کی ہے، تھانے داری کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ رمضانا اور میم صاحب کے کردار ہمارے ذہن پر کوئی نقش چھوڑ دیتے ہیں یا نہیں؟ وہ اس سارے ماحول سے ہم آہنگ ہیں جو افسانے میں پیش کیا گیا ہے؟ ان کا اپنا کوئی وجود ہے یا وہ صرف فن کار کے اشاروں پر ناچتے ہیں؟ راہی صاحب نے رمضانا کے کردار پر تفصیلی بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے ہاں توازن اور تناسب نہیں، اور وہ نارمل نہیں بلکہ جنونی ہے!

ان کے اعتراضات پر بحث کرنے سے پہلے میں ان سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا زندگی میں توازن اور تناسب ہے؟ کیا ہم سب نارمل انسان ہیں؟ اور کیا ہماری زندگی میں وہ اعتدال، توازن اور تسکین ہے جس کا وہ رمضانا سے تقاضا کرتے ہیں؟

راہی صاحب سب سے پہلے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا رمضانا حسنِ فطرت کا دِل دادہ ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اُسے کس چیز یا تجربے نے حسن شناسی اور اس پر مرمٹنے کی یہ غیر معمولی حس عطا کی؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ رمضانا میں فطرت کے حسن سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی ایک عام آدمی میں ہوتی ہے۔ وہ چونکہ کشمیر کی خوبصورت وادی میں پیدا ہوا ہے اور پیدائش سے ہی بلند پہاڑوں اور گہری نیلی جھیلوں سے مانوس ہے، اس لئے ان کے حسن کا احساس اُسے اُس طور پر نہیں ہوتا جس طرح یوروپ یا میدانوں سے آئے ہوئے کسی سیاح کو ہوسکتا ہے۔ جھیل ڈل، نشاط باغ اور کوہِ سلیمان کی چوٹی چونکہ سب کچھ اس کے ماحول اور اس کی دُنیا کا ایک حصہ ہیں، اس لئے اسے ان کے وجود کا احساس بھی نہیں ہوسکتا، لیکن رمضانا کے کردار میں ہمیں جو بات سب سے پہلے متاثر کرتی ہے وہ ہے اس کی رومانیت ——— ایک عام آدمی ہونے کے باوجود اس میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے "غیر معمولی" بنا دیتی ہے اور یہ خصوصیت ہے اس کا Romanticism۔ اختر اس کا تعارف یوں کرتے ہیں:-

"رمضانا پانچ چھ جماعتیں پڑھ چکا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ چار پہاڑوں کے درمیان جھیل ڈل کے پانی میں قید کردیا گیا ہو۔ اُسے یہ سوچ کر ہنسی آتی تھی کہ یہ انگریز لوگ یہاں کیا کچھ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ یہاں دھرا کیا ہے؟ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں ڈل، اُسے کشمیر ایک پنجرہ نظر آتا تھا جس میں وہ گرفتار ہوگیا ہو۔"

رمضانا کی نفسیات کا یہ پہلو اس کے کردار کی تشکیل میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ابتدا سے ہی ایک Romantic کردار کی حیثیت سے متعارف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات اس کی انتہا پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی رُوح میں کوئی خلش اور بے چینی نمایاں ہے، وہ اپنے ماحول سے مطمئن ہونے کے باوجود اضطرار اور اضطراب کا شکار ہے۔ وہ ایک پرندے کی طرح اپنے آپ کو پہاڑوں کی چار دیواری میں مقید محسوس کرتا ہے۔ اس کا اندازِ فکر ایک عام اور نارمل آدمی کا سا نہیں ہے۔ اختر یہیں سے ہمیں ذہنی طور اس کی Abnormal فطرت کو ایک بُنیادی حقیقت تسلیم کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ رمضانا حسنِ فطرت کا اتنا ہی دِل دادہ ہے جتنا کہ سجان یا اس قبیل کا کوئی فرد ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے کردار کو سمجھنے کے لئے اس کے Romanticism کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ رہا سوال کہ اُسے کس چیز یا تجربے نے حسن شناسی اور اس پر مر مٹنے کی یہ غیر معمولی حس عطا کی؟ سو اس کا جواب افسانے میں موجود

ہے اور اس کی طرف خود راہیؔ صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ "تو گویا دگرگونی اور جنگی ماحول نے رمضانؔ کے ذہن میں تلاطم پیدا کیا۔ "جنگی ماحول نے رمضان کے ذہن میں تلاطم پیدا کرنے میں اپنا حصہ ضرور ادا کیا، لیکن اس طوفان کی ماہیت اور حقیقت سمجھنے کے لئے کچھ اور چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا ادراک بھی ضروری ہے۔

Great tales of fantasy and imagination کے تعارف میں Philip Van Doren Stern نے لکھا ہے:۔

"The most memorable moments are not necessarily those which were most Crucial, little happenings also leave their mark. But one thing all these dearly recalled moments share together — they were close to what poets write about; they had to do with love, s ecstacy, nature's beauty, death's pain."

رمضاناؔ کے ذہنی تلاطم میں جنگی ماحول نے جو حصہ ادا کیا ہے خود رمضاناؔ نے اس کا اظہار یُوں کیا ہے:۔

"وہاں کی پختہ سڑکیں، فیکٹریاں اور ریلیں بڑی بے رحم ہیں، جیسے بے جان لوہے نے انگڑائی لی ہو اور ساری دُنیا پر اپنے سرد وجود کو پھیلا دیا ہو ——— وہاں کے لوگوں کے دِل لوہے نے ٹھنڈے کر دئے ہیں، جنگ کرنا، بے وطن ہو جانا، کھو جانا اور مرنا ایک ہی بات ہے۔"

رمضاناؔ Romantic تھا۔ جنگ کے رومانی تصوّر نے اُسے کھینچ لیا تھا۔ جنگ کی حقیقت نے اس کی رومانیت کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ برنارڈ شا کے Arms and the man کی ہیروئن کی طرح جنگ کو جوانمردی، بہادری اور Adventure کے مترادف سمجھتا تھا۔ لیکن محاذِ جنگ پر اس کے حسین تصوّرات کا آبگینہ چور چور ہو گیا۔ وہ پہلی مرتبہ کشمیر سے باہر نکلا تھا۔ بیرونی دُنیا کا جو رومانی تصوّر اس کے ذہن میں تھا اُسے جنگ کی حقیقت نے مسخ کر دیا تھا۔ اُسے اپنے گھر اور اپنے وطن کی یاد ستانے لگی۔ اپنے Nostalgia کا اظہار رمضاناؔ نے باپ کے نام اپنے خطوط میں اس طرح کیا ہے:۔

"میں خیریت سے ہوں۔ کشمیر جیسی اور کوئی جگہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ باقی دُنیا ویرانہ اور بنجر ہے۔"

چار سال بعد اپنے وطن لوٹ کر رمضاناؔ ان احساسات کو یُوں پیش کرتا ہے:۔

"جنگ میں میں بھی مارا جاتا۔ مگر کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین میرے پاؤں چُومتی تھی۔ کشمیر کے سبزہ زار میری آنکھوں میں تراوت اور ٹھنڈک پیدا کرتے۔ میرا دھیان اسی طرف لگا رہتا۔ میں کشمیر کی یاد میں بے کل رہا کرتا۔ اسی لئے میں مرا نہیں، اسی لئے میں کھو نہیں گیا۔"

Nostalgia سے پیدا شدہ یہ جذبات انتہائی فطری ہیں۔ پُورے چار سال رمضاناؔ ان جذبات کو اپنے سینے میں جوان کرتا رہا؛ اور رفتہ رفتہ ان کی شدت جنُوں کا رنگ اختیار کر گئی۔ وہی رمضاناؔ، جو اُونچے اُونچے پہاڑوں اور ڈل کو قید خانے اور پنجرے سے تعبیر کرتا تھا، اب اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ محبت اس کے اندر موجود تھی؛ لیکن اس کے وجود کا احساس اُسے جب ہی ہُوا جب وہ اس "زِنداں" سے دُور چلا گیا۔ یہ فطرت کا مسلّمہ اصول ہے کہ جب تک کوئی چیز ہمیں حاصل رہتی ہے، ہم اس کی قدر و قیمت تو کیا، اس کے وجود کا احساس بھی نہیں کر پاتے، لیکن جُوں ہی یہ چیز ہم سے چھِن جائے ہمیں فوراً اس کے وجود کا احساس ہو جاتا ہے۔ ماں کے دِل میں اپنے بیٹے کی محبت پُوری شدت اور گہرائی کے ساتھ موجود ہوتی ہے، لیکن روزمرہ زندگی میں نہ ہی ماں کو، اور نہ ہی بیٹے کو اس محبت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بیٹے کی عارضی جُدائی کا صدمہ بھی اس محبت کو "تلاطم" بنا کر ہمیں اس کا احساس دِلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح "عراق، مصر اور عرب کے ریگستانوں" نے رمضاناؔ کو کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین کا احساس دِلایا ——— راہیؔ صاحب نے اس "نئے" احساس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس حِس کی ہیئت اور اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں۔ یہ احساسِ جمال کی شدّت ہے یا حُبِّ وطن؟ جنگ سے نفرت اور پُر امن زندگی گذارنے کی خواہش ہے یا گھر سے محبّت کا احساس؟ یا صنعتی دُنیا دیکھ کر ڈل کے خاموش ماحول سے پیار ——— میں سمجھتا ہوں کہ رمضاناؔ کے ذہنی تغیّر اور تلاطم میں ان سب عناصر نے ضرور حصہ لیا ہے۔

لیکن ان عناصر کو الگ الگ کر کے اس کیفیت کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا جو رمضانا کے ذہن میں پیدا تو دورانِ جنگ میں ہو گئی تھی، لیکن نمایاں اپنے گھر آ کر ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ رمضانا کے دِل میں ان جذبات کا پیدا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا ماں کے دِل میں اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کی محبت کا طوفان اُمڈنا! جس طرح ماں کے جذبات کی نفسیاتی، مادی، سماجی اور اخلاقی توجیہات ضرور ہو سکتی ہیں اسی طرح رمضانا کی کیفیت کی بھی بہت سی تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بنیادی حقیقت یہ ہوگی کہ گھر کی دُوری نے اس کے اندر Nostalgia کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جسے حُبِ وطن کہنا کافی ہوگا اور نہ احساسِ جمال کی شدت اور اس فطری کیفیت کو رمضانا کی رومانیت نے جنون کی سرحدوں سے ملا دیا! اس کیفیت پر حُبِ وطن یا احساسِ جمال کی تیزی کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ خود راہی صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:-

"اکثر موقعوں پر رمضانا محض حسنِ فطرت پر فریفتہ نظر آتا ہے اور وہ بھی اس حسن کے ایک پہلو پر!"

راہی صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ رمضانا کے ہاں کوئی تسلسل، قطعیت یا توازن کیوں نہیں ہے۔ وہ گھر لوٹ کر یہاں کے سبزہ زاروں، پہاڑوں اور جھیل ڈل پر اس والہانہ انداز سے کیوں فریفتہ ہوتا ہے ــــ رمضانا کے کردار کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ رمضانا کے ہاں ایسی تسلسل یا توازن کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی بے چین رُوح، اس کی سیمابی فطرت اور اس کی رومانیت اُسے کیونکر عقلیت، استدلال اور میانہ روی کا پابند ہونے دے گی۔ Abnormal تو بہرحال Romanticists ہوا کرتے ہیں، ان سے نارمل زندگی گذارنے کی توقع بجائے خود ایک بہت بڑی Abnormality ہے۔ Arnold Hauser نے تو اپنی تازہ ترین کتاب The Philosophy of Art History میں Neurotic اور Romanticist کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ Romanticist حقیقت کی دُنیا سے پرواز کر کے نعم البدل کے طور پر ایک اور دُنیا آباد کرتا ہے۔ رمضانا نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر ایک نئی دُنیا آباد کرلی ہے، جہاں وہ حسنِ فطرت کے چند مظاہر کی پرستش کرتا ہے۔ ہم اپنی دُنیا کی حقیقتوں سے اس کی قدروں کو نہیں جانچ سکتے۔ اس کے کردار کا تجزیہ کرنے اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کی دُنیا کی حقیقتوں سے انکار کرنے کی بجائے ان حقیقتوں سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ راہی صاحب اس سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ رمضانا سے مایوس ہو کر اسے مخبوط الحواس اور جنونی قرار دیتے ہیں۔

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب کو ایک اعتراض یہ ہے کہ رمضانا پر وجد و حال کی یہ کیفیت اتنی دیر کیونکر طاری رہی۔ ان کا کہنا ہے کہ دُنیا میں بے شمار شاعروں اور ادیبوں کے لئے فیضان (Inspiration) کے مواقع آتے رہے ہیں۔ مگر رمضانا کے اس فیضانِ مسلسل کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے ــــ راہی صاحب اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ لوگوں کا رمضانا کو پاگل قرار دینا صحیح تو نہیں تھا!

جہاں تک رمضانا کی مجذوبی کیفیت کا تعلق ہے، میں نہیں جانتا کہ راہی صاحب حکمت اور نفسیات کے کن اصولوں کی روشنی میں اس کے لئے کسی مخصوص وقت کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے وجود میں جو ذہنی اور جذباتی تغیر واقع ہوا ہے، اس کے محرکات کیا ہیں اور اس میں کتنی شدت ہے؟ میں نے ایک جگہ کہا ہے کہ رمضانا کا یہ تغیر اس کی بے پناہ رومانویت کا مظہر ہے اور اس کے محرکات اگرچہ وہ خارجی اسباب ہیں جو چار سال تک اُسے متاثر کرتے رہے، لیکن اس "تغیر" کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے کردار کو مختلف حصوں یا Periods میں تقسیم کرنے کی بجائے ایک مسلسل عمل کی شکل میں دیکھنا ضروری ہے۔ رمضانا پر بقول راہی صاحب "وجد و حال" کی یہ کیفیت آغازِ بہار سے موسم سرما کے وسط تک طاری رہتی ہے۔ راہی صاحب اس "عرصے" کو نفسیات اور معقولیت کے اعتبار سے غلط سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ "نفسیات اور عقلیت" کی رُو سے تو اس کیفیت کا پیدا ہو جانا ہی راہی صاحب کے نزدیک غلط ہے، اس لئے اس کے وقفے (Time Period) کا تعین بھی نفسیات اور عقلیت کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ راہی صاحب لیلیٰ مجنوں کے قصے کو منطق اور فلسفے کے ترازو پر نہیں تولیں گے تو میں اُن سے یہ پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ قیس پر لیلیٰ کے عشق میں جنون کی کیفیت کتنی دیر قائم رہی اور کیا قیس پر اتنی دیر کے لئے جذب و جنون کی یہ کیفیت طاری رہنا عقلِ انسانی قبول کرتی ہے؟ راہی صاحب کہیں گے کہ میں دُور کی کوڑی لایا، فطرت سے عشق اور لیلیٰ سے عشق تو دو مختلف جذبے

ہیں، ان میں تو کوئی مماثلت ہی نہیں ——— میں کہوں گا کہ یہ دونوں جذبے ایک ہیں اور ان میں گہری مماثلت ہی نہیں بلکہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بہرکیف میں ایک اور مثال سے اپنا مقصد واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے ایک پٹھان نوجوان کے متعلق سُنا ہے کہ وہ جب دو تین سَو سال قبل کشمیر آیا تو اس کی نگاہ ایک مرتبہ جھیل ڈل پر تیرتے ہوئے پتوں کے اُوپر پانی کے قطروں پر پڑی۔ ان کی چمک دمک اور خوبصورتی نے اُسے اتنا متاثر کیا کہ وہ انہیں موتی کے دانے سمجھا۔ اس کے بعد اس نے سارا موسم بہار اور موسم گرما ان ہی موتیوں کو جمع کرنے میں صرف کرلیا۔ وہ باپ سے ہزاروں روپے منگوا کر اسی "شغل" میں صرف کرتا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ پٹھان جوان اس کے بعد کشمیر سے نہیں گیا۔ وہ یہیں مرا، اور اس کی قبر بھی یہیں موجود ہے۔ عام لوگ اسے میاں ڈل کے نام سے یاد کرتے ہیں ——— میں اس واقعے کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس واقعے کو میں نے ایک لوک کہانی کے رُوپ میں بارہا سُنا ہے۔ سُنانے والے اور سُننے والے، جن میں میری طرح آپ بھی شامل ہیں، سبھی میاں ڈل کے وجود پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہم میں سے آج تک کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ میاں ڈل اتنی دیر اس حسین "مغالطے" میں کیونکر مُبتلا رہے؟ انہوں نے اتنا روپیہ اس بے سُود مشغلے میں کیوں صرف کیا؟ لیکن اسی قسم کے سوالات راہی صاحب نے رمضانا کے بارے میں کئے ہیں۔ انہوں نے خوُد اس بات کا اعتراف کیا ہے اور اگر وہ اعتراف نہ بھی کرتے، جب بھی یہ حقیقت قائم رہتی کہ شیکسپیئر کے شہرہ آفاق کردار ہیملٹ پر ایک مخصوص کیفیت اتنی دیر قائم رہی کہ بعض لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ راہی صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ رمضانا کو لوگوں کا پاگل کہنا صحیح تو نہیں تھا؛ بھلا اس میں جھجک کی کیا بات ہے۔ راہی صاحب رمضانا کو پاگل کیوں نہیں کہتے، مجھے تو یُوں محسوس ہو رہا ہے کہ اُسے پاگل قرار نہ دینے میں جیسے وہ اختر، ملک سبحان اور خود رمضانا پر احسان کر رہے ہوں۔ رمضانا کا جذب و شوق اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ کوئی اُسے نارمل کردار سمجھ ہی نہیں سکتا اور پھر اختر نے کہیں اپنے پڑھنے والوں سے یہ وعدہ تو نہیں لیا ہے کہ وہ رمضانا کو Abnormal کردار سمجھنے کی بجائے ایک ذی ہوش اور متوازن شخصیت تصوّر کرلیں گے؛ میرا خیال ہے کہ خود اختر کے ذہن میں بھی رمضانا کا تصوّر ایک مجذوب اور Abnormal کردار کا ہے۔ میں خود اُسے ایک بے حد Abnormal کردار سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کے کردار اور ذہن کی کئی گتھیاں سُلجھائی ہی نہیں جاسکتیں ——— میں سمجھتا ہوں کہ رمضانا بالکل اسی طرح پاگل ہے جس طرح قیس، ہیملٹ اور "میاں ڈل" پاگل تھے۔ رمضانا کو پاگل کہنے کی بجائے میں Abnormal اس لئے کہتا ہوں کہ پڑھنے والے کو اس کے ساتھ ایک ذہنی قربت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ رمضانا کی ذہنی کیفیت پر رحم کھانے کی بجائے اس میں شریک ہوجاتا ہے۔ وہ بہت دُور تک رمضانا کا ہم سفر ہوجاتا ہے۔ کردار سے قاری کی یہ گہری وابستگی اختر کا کمالِ فن بھی ہے اور رمضانا کو پاگل قرار دینے میں ایک بہت بڑی رُکاوٹ بھی ——— میرا خیال ہے کہ خود راہی صاحب بھی رمضانا کو پاگل قرار دینے میں اس لئے ہچکچاتے ہیں کہ رمضانا کو پاگل تصوّر کرکے وہ کیونکر اپنے آپ کو ذی ہوش سمجھیں گے؟

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب اپنے پُورے مقالے میں یُوں بحث کرتے ہیں کہ جیسے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ اس قسم کے کردار کا وجود عقلی اور عملی لحاظ سے ممکن ہی نہیں اور یہ کہ اس کے کردار میں بڑے تضادات موجود ہیں۔ ان کی اس منطق کا جواب یُوں بھی دیا جاسکتا تھا کہ کیا ادب العالیہ کے سبھی کردار عقلی اور عملی معیاروں پر پُورے اُترتے ہیں اور کیا ان کرداروں میں کوئی تضاد، کوئی کشمکش کوئی Abnormality نہیں ہے، لیکن اس طرح بحث کا دائرہ بہت محدود ہوجاتا اور مجھے وہ چند گرہیں کھولنے کی کوشش سے محروم ہونا پڑتا جو راہی صاحب اور اُن سے اتفاق کرنے والے نقادوں کے ذہن میں ادبی تنقید کے سلسلے میں موجود ہیں ——— اپنی منطق اور عقلیت کی بُنیاد پر رمضانا پر ایک وار یُوں کرتے ہیں :۔ "کیا جمالیاتی اور نفسیاتی اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ رمضانا، جو

یہ غیر معمولی اور مُسلسل حُسن شناسی" کا دَم بھرتا ہے، ہمیں اپنے احساس اور جذبات کا اظہار نہ کرسکتا۔"

اس کے بعد انہوں نے تاریخ اور تجربے کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی جمالیاتی حِس کس کس طرح اظہار کے پیراہن میں نمُودار ہوتی ہے ——— رمضانا کی اس "بے زبانی" کا نفسیاتی تجزیہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی کرسکتا ہے۔ جو ہمیں یہ بتائے کہ باوجود کوشش اور کاوش کے رمضانا وہ جذبات کیوں بیان نہیں کرسکتا تھا جو اس کے دِل میں حُسنِ فطرت کے مشاہدے سے پیدا ہوتے تھے۔ لیکن میں جس حد تک اس گتھی کو اپنے طور سُلجھا سکا ہوں وہ یُوں ہے :۔ رمضانا

کے دِل میں پہاڑوں، جھیلوں اور سبزہ زاروں سے والہانہ عشق کی کیفیت اس کی جمالیاتی حِس میں "اضافے" کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شدت کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ اور یہ والہانہ پن حُسن شناسی سے زیادہ اس کی رومانیت کی پیداوار ہے۔ رمضانا کی والہانہ کیفیت کو اس لحاظ سے اس کے سُلجھے ہوئے ذوقِ جمال سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے جس لحاظ سے راہی نے اُسے غیر معمولی حُسن شناسی کہا ہے بلکہ میں تو اس جذب و جنوں کو حُسن شناسی کی بجائے Nostalgia کی پیداوار سمجھتا ہوں ــــ اور اس کی حُسن شناسی کو اس جذب و شوق کا ایک پیکر سمجھتا ہوں جو رمضانا کی رومانویت نے اپنی آسودگی اور اپنے اظہار کے لئے تراشا ہے۔

عام طور پر ہمارے سبھی قوائے ذہنی، جسمانی اعضا کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔ ایک مخصوص عمر میں ہمارا ذہن ایک خاص سطح پر رہتا ہے۔ عالمِ شباب میں ہمارے جذبات میں ایک غیر معمولی تموّج پیدا ہوجاتا ہے۔ بڑھاپے میں ہمارے قوائے جسمانی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہمارے خیالات میں ایک پژمردگی یا تھکن کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ یہ سارا عمل ایک اوسط آدمی کی زندگی پر حاوی رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی قاعدۂ کُلیہ سے استثنیٰ بھی پایا جاتا ہے۔ بچپن میں ہی کسی کے ذہن میں پختگی کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں، کبھی کبھی کم سِنی میں ہی وہ جنسی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں جنہیں عالمِ شباب میں پیدا ہوجانا چاہیئے تھا، یا یہ کہ جسمانی لحاظ سے تو آدمی بڑھتا رہتا ہے، لیکن ذہنی طور سے وہ نابالغ ہی رہتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اِردگرد کی دُنیا میں کئی مِل سکتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس سائینٹفک دَور میں ذہنی بلوغت کے سامان اس قدر میسّر ہیں کہ جسمانی نشوونما کی رفتار ذہنی بلوغت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب فرض کیجئے کہ ایک بچے میں جنسی جذبہ "مقررہ وقت" سے پہلے بیدار ہوجاتا ہے، چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے وہ ابھی بچہ ہے، اس لئے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اُسے الفاظ نہیں ملتے، ایسی حالت میں یہ بچہ کیا کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ اپنی محدود قوّتِ اظہار سے ہم یہ جذبات واضح کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر اس کی زبان یا اس کے اظہار کو نہ سمجھ سکے تو اس کی ساری نفسیات اور اس کا سارا وجود "مقررہ" اور "معینہ" راستوں پر سفر نہیں کرسکے گا ــــ اور اس کے ذہن کے اندر عجیب تضادات پیدا ہوں گے جو اس کے سارے کردار کو متاثر کریں گے۔ رمضانا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس کی تعلیم بس واجبی ہے۔ وہ بچپن سے ہی ایک نامعلوم رومانیت کا شکار ہے۔ اگر اس رومانیت کی تہذیب ہو پاتی تو شاید وہ شاعر ہوجاتا، یا مصوّر بنتا یا کسی لیلےٰ کے عشق میں گرفتار ہوکر مجنوں بنتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے جذبات اور اس کی رومانیت کو نشوونما اور اظہار کا کوئی ذریعہ میسّر نہ ہوسکا! گھر سے دُوری اور جنگی ماحول نے اس رومانیت کو اسی طرح بیدار کیا جس طرح چقماق میں کسی چیز کے ساتھ ٹکرانے سے آگ پیدا ہوجاتی ہے۔ چقماق کی طرح رمضانا کے اندر رومانیت کی آگ موجود تھی۔ لیکن گھر کی یاد اور جنگی ماحول کی رگڑ نے اسے شعلے میں بدل دیا۔ یہ جذبہ بتدریج ارتقا کے طور پر جوان نہیں ہوا بلکہ ایک "اتفاقی رگڑ" سے یک لخت شدید ہوگیا۔ سائنس کی اصطلاح میں اسے Precociosity کہا جاتا ہے۔ اب رومانوی جذبہ تو شدید ہوگیا، لیکن قوّتِ اظہار کو وہ نشوونما نہیں مِل سکی جو جذبات کے اس تلاطم اور سیلِ بے پایاں کو اپنے اندر سمیٹ سکتی۔ نتیجہ یہ کہ جب شدّتِ جذبات سے مغلوب ہوکر رمضانا ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی گویائی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور وہ اُن اشاروں میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا باپ تک اس کو پاگل سمجھنے لگتا ہے۔ اگر رمضانا کی رومانیت کو اظہار کا سہارا مِلتا تو وہ شعر کہتا یا میم صاحب کی طرح مصوّر بن جاتا! لیکن اس کا المیہ تو یہی ہے کہ وہ اس طوفان کو الفاظ یا اظہار کے کسی پیرائے میں گرفتار نہیں کر پاتا ــــ وہ اشاروں ہی اشاروں میں باپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"دیکھو ابّا ــــ وہ دیکھو! وہ ابر کا ٹکڑا! جیسے میری رُوح پرواز کررہی ہو۔ ابّا! ابّا! ہرموکھ کی چوٹی پر سونے کا دستار بندھا ہے نا؟ "نا" مت کہو ابّا!"

جب جذبات کی لہریں ٹکرا ٹکرا کر اس کے سینے میں قیامت بپا کرتی تھیں، تو وہ باپ سے کہتا:-

"ابّا! میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ میں تمہیں بتا دیتا، لیکن میرے پاس زبان نہیں ہے۔"

دُور پہاڑوں کی طرف اشارہ کرکے وہ کہتا ــــ "وہ دیکھو، وہ۔" اور اس کے بعد عجزِ بیان کے احساس سے خاموش ہوجاتا!

راہی صاحب کہتے ہیں کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سانحہ مہجورؔ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، آپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہوگا۔ ہر فن کار اور حساس آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مہجورؔ نے کہا ہے ؎

ڈلہ لارہ وُچھکہ، خال دِنہ ہئے، وارہ وُچھ ہے رہی

گگرِ زِیؤ مینہ گیُم اوٗشہ وِوٗتھم دِدرایہ وسنے گیاہ

آنسوؤں کی زبان سمجھنے والے تو بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن جب یہ حالت ہوتی ہوگی تو کیا ہوتا ہوگا۔

ع دُنیتھ لولہٕ گفتار ژِیٖرٕ ستے عار اَنہٕ ہے
ژیٖرٕ دٕلیشتھ مینہ زِیؤ چھم کلان ٹاٹھہ یادو

راہی صاحب کہتے ہیں کہ "ابّا! میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، میں تم سے کہنا لیکن کہہ نہیں سکتا ہوں!" کے فقرے بے معنی ہیں اور وہ جھلا کر اسے اختر کے "ہاتھ کی صفائی" قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ رمضانا کا یہ احساس کہانی ہے اور کہانی کی روح بھی —— یہ اختر کے ہاتھ کی صفائی نہیں ہے، رمضانا کے روح کی گہرائی ہے جس میں جھانکنے کے لئے عصمتِ قلب ونظر کا ہونا ضروری ہے!

اس کے بعد راہی صاحب نے رمضانا کے انجام پر کچھ دلچسپ اعتراضات کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر رمضانا واقعی حسنِ فطرت کا دِل دادہ تھا تو یہ حسن کا احساس اُسے "سراپا مسرت" کا پیکر بنا دیتا۔ لیکن سرما کے شروع ہوتے ہی وہ کیوں افسردہ ہو جاتا ہے؟ وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کیوں کرنے لگتا ہے؟ وہ سرما کو ظالم اور غاصب کیوں کہتا ہے؟ اور راہی صاحب اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رمضانا مجموعی لحاظ سے حسنِ فطرت کا دِل دادہ نہیں تھا، وہ زیادہ سے زیادہ موسمِ بہار اور خزاں پر فریفتہ تھا، یعنی فطرت کے ایک یا دو رنگوں کا شیدائی تھا اور بقولِ ان کے اگر یہ سب نتیجے درست ہیں تو پھر یہ فیصلہ صادر کرنا پڑے گا کہ رمضانا حسنِ فطرت کا صحیح شعور نہیں رکھتا تھا —— اپنے اس فیصلے کی تائید میں وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ دلیلیں دیتے ہیں :-

(۱) اگر اُسے حسنِ فطرت کا صحیح شعور ہوتا تو اسے سرما کے حسن کی نیرنگیوں کا بھی احساس ہوتا۔

(۲) سرما کے آغاز سے اُسے ہر موکھ کی پہاڑی پر سونے کا دستار کیوں نظر آتا تھا اور سرما کے شروع ہوتے ہی اس کی آنکھیں اس کے حسن کے احساس سے محروم کیوں ہو گئیں؟

اس کے بعد راہی صاحب بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات کے سہارے موسمِ سرما کا حسن بیان کر کے رمضانا کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان بھی بہم کرتے ہیں۔

میں نے راہی صاحب کے ان اعتراضات کو "دلچسپ" کہا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان میں تفریح کا کافی سامان موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ راہی صاحب کے ان اعتراضات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ رمضانا کی حسن شناسی سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ خود راہی صاحب کی حسن شناسی سے!

سوال یہ ہے کہ راہی صاحب نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا ہے کہ اختر نے رمضانا کو ایک آئیڈیل حسن شناس کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہانی کے کس فقرے اور کس کردار کی زبانی یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رمضانا کے احساسات، جذبات اور نظریات کو صحت مند اور آئیڈیل تسلیم کیا جائے۔ اختر نے ابتدا سے لے کر اس کے انجام تک اس کی ایک نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ اس کی صحت مندی یا غیر صحت مندی کا فیصلہ کرنا نہ اختر کا کام تھا اور نہ اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے اگر راہی صاحب بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رمضانا حسنِ فطرت کا صحیح شعور اور ادراک نہیں رکھتا تھا تو اس سے نہ رمضانا کو مایوسی ہوگی نہ اختر کو اور نہ مجھے —— یہ تحقیق کر کے راہی صاحب نے صرف اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

اعتراضات کے جس حصے کو میں "دلچسپ" سمجھتا ہوں، اس میں وہ سوالات ہیں جو راہی صاحب نے خود رمضانا سے کئے ہیں! مثلاً یہ کہ وہ صرف موسمِ بہار اور خزاں کا شیدائی کیوں تھا؟ یا یہ کہ اُسے موسمِ سرما میں کوئی حسن کیوں نظر نہیں آیا، یا یہ کہ اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ موسمِ سرما دراصل بہار کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ کیٹس کی طرح اُسے سرما کا حسن نظر کیوں نہیں آیا، یا شیلے کی طرح اس نے سرما کو بہار کا پیغامبر کیوں نہیں سمجھا؟

میں ان اعتراضات کا جواب یوں دیتا ہوں کہ رمضانا نہ شیلے تھا اور نہ کیٹس، وہ نہ رحمان راہی تھا اور نہ شمیم احمد شمیم! وہ رمضانا تھا۔ وہ فلسفی نہیں تھا، ایک مانجی کا لڑکا تھا۔ وہ ان معنوں میں "فلسفۂ جمالیات" کا ماہر نہیں تھا جن معنوں میں جناب راہی صاحب اُسے سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے رمضانا سے جو "ذاتی قسم" کے سوالات کئے ہیں، اگر یہی سوالات ہر ادبی تخلیق کے خالق اور اس کے کرداروں سے کئے جائیں تو ادبی تنقید میں بڑی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ مثلاً اگر شرشار سے پوچھا جائے کہ اس کے "خوجی" نے اتنی ساری حماقتیں کیوں کیں اور آزاد سے یہ پوچھا جائے کہ وہ ساری عمر آوارہ گردی کیوں کرتا

رہا، جب کہ وہ کوئی معقول کام بھی کر سکتا تھا۔
مثلاً یہ پوچھا جائے کہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں اس کے کردار پاگل کیوں ہیں اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پوچھا جائے کہ وہ کوئی عقل مندی کی بات کرنے کی بجائے اناپ شناپ کیوں بکتا رہتا ہے؟ آخر محی الدین سے پوچھا جائے کہ "دند دزُن" میں گلو چچا بریّت چار کے ہاں سے ہانڈی کیوں چُراتا ہے اور پھر گلو چچا کی اُس حرکت کو اخلاقی معیاروں سے جانچ کر یہ فیصلہ صادر کر دیا جائے کہ وہ بد اخلاق اور چور ہے اور پھر اُس سے اپنی حرکت کا جواز پوچھا جائے اور آخر میں قیس سے یہ پوچھا جائے کہ تم نے لیلیٰ جیسی کالی کلوٹی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنی ساری زندگی کیوں تباہ کی تو بڑا لطف آ جائے !

راہی صاحب نے قریب قریب اسی نوعیت کے سوالات اختر، رمضانا اور میم صاحب سے کئے ہیں۔ رمضانا جب "وحشتِ دل" سے گھبرا کر خودکشی کرتا ہے تو راہی صاحب یہ پوچھتے ہیں کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟ کیا اس کے نزدیک محبوب سے ہمیشہ ہم آغوش ہونا ہی اصلِ محبت ہے۔ انہیں رمضانا کی اُس خواہش پر بھی اعتراض ہے جس کا اظہار وہ مرنے سے پہلے اپنے باپ سے کرتا ہے۔ رمضانا باپ سے کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو تختِ سلیمان پر دفن کر کے میری آنکھیں ڈل کی جانب کر دینا ——" راہی صاحب اس "معصوم خواہش" کو عقلیت کی کسوٹی پر پرکھ کر بے معنی اور لغو قرار دیتے ہیں۔

میں ان تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب دے کر اس مقالے کو قابلِ اعتراض حد تک طویل نہیں کر دینا چاہتا، لیکن ایک شاعر کی زبان سے اس قسم کے غیر شاعرانہ سوالات سُن کر پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔

رمضانا کو بہار اور موسمِ خزاں سے والہانہ عشق ہو گیا تھا، اُس سے یہ پوچھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے کہ وہ موسمِ سرما کو کیوں "چاہ" نہ سکا۔ جذبۂ عشق کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے آزاد ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ بقول شاعر ــ "درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست!" میں رمضانا کی وکالت نہیں کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے یہ احساسات آپ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

"راہی صاحب! آپ بجا کہتے ہیں کہ سرما میں اپنا حسن ہوتا ہے۔ موسمِ سرما کی چاندنی میں بڑی دِل کشی ہے۔ آپ کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ موسمِ سرما کے بعد ہی موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے، لیکن بہار کی رعنائیوں اور خزاں کی رنگینیوں کی گرفت مجھ پر اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے آپ کو اس سے آزاد نہ کر سکا۔ میں زندگی کے شباب پر کچھ اس انداز سے مر مٹا تھا کہ مجھے بڑھاپے کی سنجیدگی میں کوئی دِل کشی نظر نہیں آئی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ مجھے خودکشی نہیں کرنا چاہیئے تھا، لیکن کیا کیجئے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی وہی کچھ کرتے جو میں نے کیا اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو وہی کچھ کہتا جو آپ کہتے ہیں۔" ———

قطع نظر اس کے کہ رمضانا کو سرما کے حُسن کا احساس کرنا چاہیئے تھا یا نہیں سرما میں واقعی کوئی دِل کشی ہے یا نہیں —— میں ایک بات کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس اظہار سے رمضانا کے کردار کی یہ گرہ کھولنے میں امداد مل سکتی ہے کہ اس نے سرما کو ظالم اور غاصب کیوں تصوّر کیا ——

راہی صاحب نے، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، زبان اور تشبیہات کے طلسم سے ہمارے اور رمضانا کے اندر سرما کے حُسن، اس کی خوبصورتی، اس کے جلال اور جمال کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سرما کے اس حُسن کا احساس سرمائی کھیلوں کے دلدادہ اُن سیاحوں کو ہو سکتا ہے جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جاڑے کے دنوں میں یہاں آتے ہیں یا جناب رحمان راہی جیسے حساس شاعر کو !

کشمیر کے ایک عام آدمی کو جاڑے میں کوئی حُسن نظر نہیں آتا۔ کشمیر کا کسان اور یہاں کے محنت کش عوام موسمِ سرما سے نفرت کرتے ہیں، ان کے لئے جاڑا ایک قہرِ الٰہی سے کم نہیں ہے۔ جاڑے کے خلاف ہمارے جذبات اتنے شدید ہیں کہ "آج بھی" ونزہ چھ گندہ" جیسی مثالیں ہماری روزمرہ زندگی میں بہت عام ہیں۔ موسمِ سرما اور برف باری کے خلاف احتجاج کے یہ جذبات ہمارے لوک ادب اور ہماری نفسیات کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ کشمیر کی غربت، افلاس، اقتصادی بدحالی اور معاشی پس ماندگی کی جتنی ذمہ داری موسمِ سرما پر ہے، اتنی شاید ہی کسی اور پر ہو۔ سال ہا سال سے کشمیری کسان اور مزدور موسمِ سرما کے آغاز سے ہی اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر "پنجاب" کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے موسمِ سرما میں اس شاعرانہ حُسن کی تلاش بے سود ہے جس کی طرف راہی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ راہی صاحب نے موسمِ سرما میں جو حُسن دیکھا ہے وہ سرینگر کلب میں بیٹھے ہوئے ایک ایسے سیاح کی نظر سے دیکھا ہے جو ہزاروں میل دُور کا سفر طے کر کے برف پوش پہاڑیوں اور گرتی ہوئی برف دیکھنے کے لئے آیا ہو۔ لیکن اس حُسن سے محظوظ ہونے سے پہلے کمرے میں شکاری جلا کر کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہو۔ رمضانا ایک عام آدمی تھا، وہ نہ سیاح تھا اور نہ راہی صاحب کی طرح

شاعر۔ اُسے اگر سرما میں کوئی دل کشی نظر نہیں آئی تو اُس پر غصہ کرنے کی بجائے اُس سے ہمدردی کرنے کی ضرورت ہے۔

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب نے جسم اور رُوح کے باہمی رشتے کے نقطۂ نظر سے جو بحث کی ہے، میں اس پر کچھ نہیں کہوں گا۔ راہی صاحب نے رمضانا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے تصورات اور اعتقادات صحیح نہیں ہیں۔ جسم اور رُوح لازم و ملزوم ہیں اور ان کا الگ الگ کوئی وجود نہیں۔ اسے کاش! رمضانا فلسفی یا شاعر ہوتا، جب وہ خودکشی کرنے کی بجائے یا تو فلسفۂ جمالیات پر کوئی کتاب لکھتا یا راہی صاحب کی طرح شعر کہتا ——

راہی صاحب نے رمضانا کے کردار کو ایک مبہم اور نابالغ تصوّر قرار دے کر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ یہ انسان کے دِل میں شادمانی اور کشادگی کی بجائے افسردگی اور تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ راہی صاحب نے جس نقطۂ نظر سے اس کے کردار پر بحث کی ہے اُس سے ان کے نتائج کی توثیق ہوتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ خود راہی صاحب کے نقطۂ نظر سے دِل میں افسردگی اور تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رمضان کے کِردار سے دِل میں وہ خلش بیدار ہوتی ہے جس کے بارے میں شیلی نے کہا ہے

our Sweetest Songs are those that tell of Saddest thought.

راہی صاحب نے میم صاحب کے کردار کو رمضانا کے مقابلے میں بہت حد تک معقول اور جان دار قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ولایت میں پیدا ہونے، وہیں پرورش پانے، کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے طالب علم ہونے اور مصوّر ہونے کے ناطے اس کے حسنِ فطرت پر فریفتہ ہونے میں بڑی معقولیت اور جواز ہے۔ میم صاحب کے کردار پر "معقولیت" کا یہ فتویٰ صادر کرنے کے بعد راہی صاحب نے اس پر اس نوعیت کے اعتراضات کئے ہیں جن کا شکار وہ رمضانا کو بنا چکے ہیں۔ میم صاحب کے تجزیے میں بھی راہی صاحب نے اس کے کردار کا تجزیہ کرنے سے زیادہ اپنی "معقولیت" پر زیادہ زور دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ولایت سے تعلق رکھنے اور کیمبرج یونیورسٹی کی طالب علم ہونے کے باوجود ورڈز ورتھ کو ٹھیک سے نہیں سمجھ پائی ہے۔ راہی صاحب نے بڑی محنت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسنِ فطرت کے متعلق میم صاحب کا نظریہ غلط اور غیر صحت مند ہے!

راہی صاحب کے اعتراضات کا جواب دینے سے قبل میں میم صاحب کے کردار کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ میم صاحب کا کِردار رمضانا کے مقابلے میں کمزور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کا مرکزی کردار رمضانا ہے اور میم صاحب کا کردار صرف رمضانا کے کردار کو اُبھارنے اور اس کے اُن جذبات، احساسات اور کیفیات کو سمجھانے کی ایک کوشش ہے جو رمضانا اپنے عجزِ بیان کی وجہ سے ملہ سبحان اور پڑھنے والوں کو اپنی زندگی میں نہیں سمجھا جا سکا۔

حُسنِ فطرت کے متعلق میم صاحب کے ردِعمل اور اس کے تاثرات کو سُن کر ملہ سبحان کو ہمیشہ رمضانا کی یاد آتی اور اُسے یہی احساس ہوتا کہ میم صاحب ایسی ہی باتیں کر رہی ہے جو رمضانا کرتا، مگر کر نہ سکتا تھا۔ اُسے اس بات کا یقین تھا کہ رمضانا کو دراصل یہی کچھ کہنا تھا جو میم صاحب کہہ رہی ہے۔ اُسے یُوں محسوس ہوتا کہ جیسے آج رمضانا یہی باتیں کہنے کے لئے پہاڑ پر آیا ہو —— اس لحاظ سے میم صاحب اور ملہ سبحان کا کردار دونوں ہی کہانی کے مرکزی کردار رمضانا کی شخصیت کو اُبھارنے اور واضح کرنے کے لئے تراشے گئے ہیں۔ رمضانا کا کردار میم صاحب کے وجود کے بغیر بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے اور یہ بات میم صاحب کے کردار کے متعلق کہی جا سکتی ہے اور نہ ملہ سبحان کے بارے میں! میم صاحب کو رمضانا کے کردار اور اس کی شخصیت کا تسلسل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان دونوں کرداروں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں حُسنِ فطرت کے شیدائی ہیں اور دونوں خودکشی کر کے اپنی رُوح کو جسم کی قید سے آزاد کرتے ہیں۔ لیکن اس مماثلت (Similarities) کے باوجود رمضانا اور میم صاحب کو "ایک" کہنا غلط ہوگا۔ رمضانا کے حُسنِ فطرت پر وارفتہ ہونے کے محرکات کچھ اور ہیں اور میم صاحب کی فریفتگی کے اسباب کچھ اور ہیں۔ رمضانا کی نفسیات پر میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ میم صاحب کی "حُسن شناسی" ایک Sophisticated اور تعلیم یافتہ خاتون کے احساسِ جمال کی تربیت یافتہ شکل ہے۔ میم صاحب اور رمضانا کی حُسن شناسی میں ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ ہے ان دونوں کی رومانیت! میم صاحب حُسن سے مسحور ہو کر اس کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جیسا کہ راہی صاحب نے کہا ان کے دیوانہ پن میں ایک معقولیت پائی جاتی ہے۔ اور اس معقولیت کی وجہ یہ ہے کہ میم صاحب کے ذوقِ جمال کو ورڈز ورتھ، وان گاگ اور کیمبرج یونیورسٹی کے ماحول میں تربیت اور تہذیب کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ اُس کی فطری رومانیت نے اُس کی حُسن شناسی کو حُسنِ فطرت پر مرکوز کر دیا۔ وہ اپنے تاثرات اور محسوسات

کو تصویروں کے ذریعے بیان کرتی اور ورڈز ورتھ کی شاعری پڑھ کر اپنی ذہنی تسکین کا سامان بہم کرتی۔ اس کے ہاں جمالیات کا ایک واضح تصور ہے اور وہ ملٹسجان سے یہ کہتی ہے کہ حسن کا احساس ہی انسان کو انسان بنا دیتا ہے! ورنہ ایک جانور اور انسان میں کیا فرق ہے۔ رمضانا کے ذوقِ جمال میں نہ یہ شائستگی ہے اور نہ تہذیب۔ اس کے ہاں جمالیات کا نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ میم صاحب کی طرح کوئی بلند آدرش! میم صاحب اور رمضانا کے کردار کا یہ نمایاں فرق ان کی موت سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ رمضانا اس لئے مرتا ہے کہ موسم سرما نے بہار اور خزاں کا حسن لوٹ لیا، میم صاحب اس لئے مرتی ہے کہ یہ حسن اس قدر وافر اور وسیع ہے کہ اس کا ذہن اور وجود اسے سمیٹنے کے لئے ناکافی ہے۔ رمضانا وہ منظر کئی بار دیکھ چکا تھا، جسے دیکھ کر میم صاحب "سراپا حیرت" بن کر رہ گئی۔ میم صاحب موسم بہار اور خزاں کے بعد موسم سرما کا کئی بار استقبال کر چکی تھیں۔ ان دونوں کی زندگی کا بظاہر ایک ہی محور ہے، لیکن ان کی موت کی راہیں بالکل مختلف ہیں۔ میم صاحب کا یہ سوچنا کہ "فن کار اپنے فن سے حسن کو مکمل کر دیتا ہے، خام کو پختہ بنا دیتا ہے، مگر یہ وسعت، یہ سلیقہ، یہ حسن ——— کیا وہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتی ہے؟ نہیں، نہیں! اس حسن کو رنگوں میں سمیٹنا حسن کی توہین ہوگی ———" نظریاتی طور صحیح ہے یا نہیں، میں اس پر بحث نہیں کرونگا، لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ قدرت کی نیرنگیاں، فطرت کی سحر کاریاں اور انسانی ذہن کی گہرائیاں کبھی کبھی فن کار کو ایک ایسی منزل پر ضرور کھڑا کر دیتی ہیں جہاں اُسے اپنی گویائی اور اپنے اظہار کی قوت پر شک ہونے لگتا ہے۔ میم صاحب نے ولایت کی صبحیں بھی دیکھی ہوں گی اور شامیں بھی۔ وہ ان سے ضرور متاثر ہوئی ہوں گی، اس کے پاس محسوس کرنے اور اظہار کرنے کی ایک مخصوص قوت بھی موجود تھی، لیکن جب اس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جس نے اس کے رُوح کی اُن گہرائیوں میں ایک لطیف ارتعاش پیدا کر لیا جہاں اظہار اور بیان کے پَر جلتے ہیں تو اس کا یہ سوچنا نظریاتی اور منطقی لحاظ سے غلط ہو، تو ہو، ایک فطری ردِ عمل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر ورڈز ورتھ جیسا عظیم فن کار اس نظارے کو دیکھتا تو وہ ایک شاہکار نظم کی تخلیق کرتا۔ لیکن میم صاحب ورڈز ورتھ کی شیدائی تھی، ورڈز ورتھ نہیں تھی۔ اس کا یہ بیان کہ وہ رنگوں سے وہی کچھ کرتی ہے جو ورڈز ورتھ الفاظ سے کرتا رہا ——— اس حد تک صحیح ہے کہ ان کا موضوع ایک تھا۔ لیکن جس طور سے ورڈز ورتھ اپنے موضوع کو پیش کر سکا اگر اُس طرح میم صاحب کر سکتی تو نہ وُہ پریشان ہوتی اور نہ خودکشی کا ارتکاب کرتی ——— ہو سکتا ہے کہ میم صاحب کے پاس حسنِ فطرت سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت تھی جتنی ورڈز ورتھ کے پاس تھی۔ ہو سکتا ہے کہ فطرت کے حسین مناظر دیکھ کر اُس پر بھی وہی دیوانگی طاری ہوتی ہو جس نے ورڈز ورتھ سے اپنی شاہکار نظمیں کہلوائیں۔ لیکن کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی طالب علم ہونے کے باوجود اس کے پاس اظہار اور بیان کی وہ قوت نہیں تھی جو ورڈز ورتھ کے پاس تھی۔ اسی لئے اس منزل پر پہنچ کر وہ ورڈز ورتھ سے زیادہ رمضانا کے قریب ہو جاتی ہے اور اس سے قربت سے کبھی کبھی یہ دھوکا لگتا ہے کہ وہ رمضانا کی شخصیت اور کردار کا ایک تسلسل (Continuity) ہے۔ رمضانا کے "دیوانہ پن" اور میم صاحب کی "پریشانی" میں جو عنصر مشترک ہے وہ ایک جذبے تجربے اور کیفیت کے اظہار کے لئے کوئی ذریعہ نہ ملنا ———

رمضانا کے دِل میں جو جذبات پہاڑوں، مرغزاروں اور ڈل کی سطح پر تیرتے ہوئے پتوں کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے اظہار کے لئے اُسے الفاظ نہیں ملتے اور وہ "پاگل" ہو جاتا ہے۔ میم صاحب کے دِل میں ایک حسین ڈھلتی ہوئی شام کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسے کنویس پر منتقل کرنے کے لئے اس کا فن اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس لئے وہ "پریشان" ہو جاتی ہے۔ رمضانا کا "پاگل پن" اور میم صاحب کی "پریشانی" ان کی موت کا سامان کر دیتے ہیں۔ اور ملٹسجان کو میم صاحب کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ اور تعلق محسوس ہوتا ہے اور آخر چپکے سے ہمارے کان میں کہتا ہے کہ "دیکھا انسان کتنی عجیب چیز ہے، رمضانا اس لئے جان دیتا ہے کہ حسن کی وسعتیں محدود ہو گئیں اور میم صاحب اس لئے مر جاتی ہیں کہ حسن کی وسعتیں لا محدود ہو جاتی ہیں ———" وہ ہم سے پوچھتا ہے کہ انسان کی اس بوالعجبی کو کس فارمولے اور نظریے کے تحت سمجھاؤ گے۔ • وہ کوئی حل یا کوئی فارمولا تجویز نہیں کرتا۔ وہ ہمارے ساتھ خود محوِ حیرت ہے۔

میم صاحب سے راہی صاحب کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ حسنِ فطرت کی وسعتوں میں کھو کر پریشان کیوں ہو جاتی ہیں۔ اس کی رُوح کو تو یہ منظر دیکھ کر شادماں ہو جانا چاہیئے تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ حسن سے مسرور ہو کر آدمی ایک منطق یا سیاست دان کی طرح نہیں سوچتا اور اُسے اپنا وجود کھویا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ راہی صاحب مجھے معاف کریں گے کہ وہ لفظِ "پریشان" کے صرف ایک ہی معنی جانتے ہیں جو لغت میں درج ہیں۔ افسانہ نگار نے میم صاحب کی مسرت، حیرت و



کشمیری کلچرل تیلی گیشن کی
۴ سالہ ممبر بے بی سمیتا جس نے
جناب بخشی صاحب، شری سکھاڈیا
چیف منسٹر راجستھان اور پرتھوی
راج کپور سے کتھک کے فن کارانہ
مظاہرے پر داد تحسین حاصل کی۔

کشمیری سازنواز—امیر شاہ
جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا



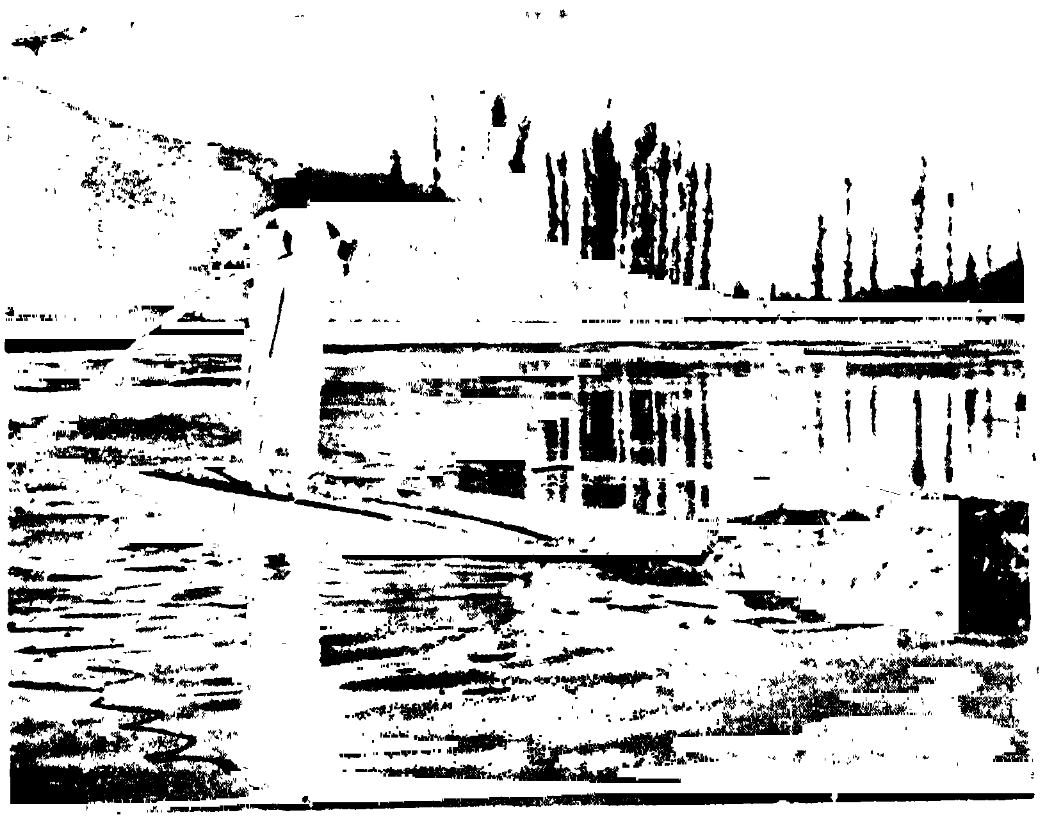


شمیم احمد شمیم—مضمون صفحہ ۸

تبه اس انداز







سے بہار آتی





پیر اصلی انقلاب سپاه آن



استعجاب اور Ecstacy کے لئے پریشان کا لفظ استعمال کیا ہے اور برمحل استعمال کیا ہے۔ یہاں پریشانی کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن معنوں میں یہ شکست، افسردگی، کشمکش اور الجھنوں سے پیدا شدہ ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں یہ اضطرار، بے چینی، مسرت اور جذبات کی اس شدت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو حُسن کی سحر طرازیوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی محبوبہ کو دیکھ کر آپ کے دِل میں جو ہل چل، جو خلش اور بے چینی کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ دراصل مسرت اور فرحت کی پیداوار ہوتی ہے۔ میم صاحب کی پریشانی کی کیفیت کو راہی صاحب نے ان کے کردار اور اس ماحول سے الگ کر کے دیکھا ہے جو اس کا ایک حصہ ہے۔ حُسن کا اثر مختلف ذہنوں اور شخصیتوں پر مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ راہی صاحب کا میم صاحب کی "پریشانی" دیکھ کر ان کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ ان کی رُوح بیمار ہے یا یہ کہ اس نے حُسن دیکھا ہی نہیں —— ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ حُسن دیکھ کر آدمی کھو نہیں جاتا، ایک شاعر، ایک نقاد اور ایک ادیب سے زیادہ ایک ایسے سائنس دان کی رائے معلوم ہوتی ہے جو انسانی ذہن کو جذبات کی بجائے "آلات" سے جانچتا ہے اور اگر واقعی راہی صاحب حُسن کو دیکھ کر کھوتے نہیں تو کہنا پڑے گا ؂

زِ نقصِ تشنہ لبی داں بعقل خویش مناز۔ دِلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

میم صاحب کا تحیّر اور ان کی افسردگی مسرت کی انتہا ہے۔ اس مسرت میں شریک ہونے کے لئے نقاد میں حُسنِ فطرت سے محظوظ ہونے کی اتنی ہی گہری حِس کا ہونا ضروری ہے جتنی میم صاحب میں تھی۔ راہی صاحب جانتے ہیں کہ آنسو، صدمے، غم اور شدید رنج کا اظہار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس وقت کیا کہیں گے جب فرطِ مسرت اور انتہائی شادمانی کے وقت بھی انسان اس کا اظہار آنسو بہا کر کرے۔ کسی بہت ہی حسین عورت کو دیکھ کر میری طرح راہی صاحب پر بھی سنجیدگی اور افسردگی کی کیفیات طاری رہی ہوں گی۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سنجیدگی اور افسردگی کی تہہ میں وہ مسرت اور فرحت پوشیدہ ہے جو زندگی بھی ہے اور زندگی حاصل بھی —— ورڈز ورتھ نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے :-

To me the meanest flower that blows
brings thoughts that often are too deep
for tears.

میم صاحب پر راہی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس نے حُسنِ فطرت میں کھونے کے بعد یہ کیوں کہا —— افسوس! اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، یہاں نہ ورڈز ورتھ پہنچ سکا اور نہ وان گاگ —— راہی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میم صاحب نہ ورڈز ورتھ کو سمجھ سکی تھی اور نہ وان گاگ کو —— میں سمجھتا ہوں کہ میم صاحب ان معنوں میں "فن کار" نہیں تھی جن معنوں میں یہ لفظ ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، وان گاگ اور پکاسو کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ وہ ایک پندرہ سولہ برس کی Sentimental لڑکی ہے جس کے جذبات اور احساسات عنفوانِ شباب کی رومانیت کے مظہر ہیں۔ حُسنِ فطرت کے شدید احساس میں وہ جنسی جذبہ بھی کارفرما ہے جو اس عمر میں ایک بے نام سی خلش کے طور پر ابھرنے لگتا ہے۔ وہ ان ہی معنوں میں فن کار ہے جن معنوں میں اس عمر کی کوئی لڑکی یا لڑکا فن کار ہو سکتا ہے یا جس طرح اس عمر میں شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ یہ زندگی کی وہ منزل ہے جہاں ہر انسان شاعر، افسانہ نگار اور مصوّر ہوتا ہے۔ خیالات اور شعور کی پختگی "جوانی کی اس کشاکش" کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے۔ میم صاحب کے نظریۂ فن اور حُسن پر مسلّم فن کاروں کی طرح بحث کرنا میم صاحب کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور اپنے ساتھ بھی، اس کی رومانویت کا تجزیہ کرنے کے لئے اس کی عمر، اس کے ماحول اور اس کے ذہنی پس منظر کو اپنے ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ اسی طور پر ورڈز ورتھ سے متاثر ہو کر اُسے اپنا محبوب شاعر سمجھتی ہے جس طور پر آج کی نوجوان لڑکیاں فیض یا ساحر لدھیانوی پر فریفتہ ہوتی ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ تو فیض کے کلام کی معنویت، نہ اس کے فکر کی گہرائی اور نہ اس کے تدبر کی اصلیت سمجھتی ہیں اور نہ ساحر کے کلام کی موسیقیت کی صحیح رُوح کو پا سکتی ہیں۔ لیکن ان شاعروں کے ساتھ انہیں ایک جذباتی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے۔ ورڈز ورتھ اور وان گاگ سے میم صاحب کا لگاؤ اسی جذباتی ہم آہنگی کی پیداوار ہے —— اختر نے کہیں بھی میم صاحب کے نظریات یا فلسفے سے اتفاق کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور نہ ہی افسانے سے یہ بات کہیں Suggest ہوتی ہے۔

راہی صاحب نے میم صاحب اور وان گاگ کے جذباتی تعلق کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے وان گاگ کی زندگی کے اُن گوشوں سے بھی "پردہ" سرکایا ہے جہاں ان کے خیال میں ہماری نگاہ نہیں جا سکتی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وان گاگ کے بارے میں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ بہت بڑا مصوّر تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے متعلق کچھ ناول ضرور پڑھے ہیں، لیکن وان گاگ کے نام سے میرے ذہن میں صرف ایک مصوّر کی تصویر آ جاتی ہے اور اس کی ذاتی زندگی کے بارے

میں بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے صرف اس کا فن ہی اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ مجھ میں وان گاگ کے فن سے محظوظ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح راہی صاحب میں بھی نہیں ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ دنیا کے مصوروں میں اُسے ایک عظیم مقام حاصل ہے۔ یہ مقام اُسے کیوں حاصل ہے یہ میں نہیں جانتا —— میم صاحب چونکہ مصوری سے شوق رکھتی ہیں اسلئے وہ غالباً یہ ضرور جانتی ہوں گی کہ وان گاگ بھی حُسنِ فطرت کی تصویر کشی کیا کرتا تھا، وہ وان گاگ کے فن سے متاثر اور مرعوب نظر آتی ہیں اور وان گاگ کا نام لیتے وقت اس کے ذہن میں صرف وان گاگ کے فن کا ہی تصور آتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالب کا نام سُنتے یا لیتے وقت میرے ذہن میں دیوانِ غالب کا ہی تصور رہتا ہے اور غالب کی وظیفہ خواری اور جوئے بازی کا خیال نہیں آتا؛ وان گاگ کے فن کے متعلق راہی صاحب خود کچھ نہیں جانتے وہ اس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف اس کی ذاتی زندگی کے وہ حالات جو آرنلڈ ہاسر نے اپنی کتاب

The Social History of art میں لکھے ہیں نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد فیصلہ دیتے ہیں کہ میم صاحب اور وان گاگ کی حُسن شناسی میں تو کوئی تعلق ہی نہیں —— میں راہی صاحب سے یہ پوچھوں گا کہ جب وہ وان گاگ کی حُسن شناسی کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں ہیں تو پھر میم صاحب کی حُسن شناسی کو اس معیار پر کیوں جانچتے ہیں؟ میم صاحب پر راہی صاحب نے وان گاگ سے ناواقفیت کا الزام تو لگا دیا، لیکن خود ناواقف ہونے کا اعتراف کرنے کے باوجود میم صاحب پر اپنی علمیت کا سکہ جمانے کی کوشش کرنے کے لئے وان گاگ کی حُسن شناسی کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ کر دیا ہے —— میم صاحب نے وان گاگ کی مصوری کو ذہن میں رکھ کر اس کا نام لیا تھا، راہی صاحب نے اس نام کی تحلیلِ نفسی فرما کر میم صاحب کے الجھاؤ کی "وضاحت" کرنی چاہی۔ راہی صاحب اگر افسانے کے سارے کرداروں کو تحلیلِ نفسی کے اسی زاویے سے دیکھتے تو خود اُن کے ذہن کی کئی گرہیں کھل جاتیں!

میم صاحب کے مکالموں کا یہ حصہ جس میں وہ ورڈز ورتھ اور وان گاگ کا نام لے کر یہ کہتی ہیں کہ اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، دراصل اس کی خود کلامی ہے۔ یہاں وہ ملہ سُبحان سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ ان الفاظ سے ہم اس ہنگامے کی ایک جھلک ہی پا سکتے ہیں جو میم صاحب کے ذہن، شعور اور تحت الشعور میں برپا ہے۔ ان الفاظ کو مکمل بیان سمجھ کر ان میں کوئی تسلسل، ربط اور معنویت تلاش کرنا ناممکن نہیں، مشکل ضرور ہے اور ایسا کرنے کے لئے نفسیات کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ یہ الفاظ میم صاحب کے Thought Process کا ایک بے ربط سا اظہار ہیں — ملہ سُبحان کی ذہنی سطح اتنی پست ہے کہ میم صاحب اُس سے ورڈز ورتھ اور وان گاگ کے موضوع پر کھل کر بات کر ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی لئے وہ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہی ساتھ باتیں شروع کر دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان جب اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے تو ان میں وہ اختصار اور اشارات ہوتے ہیں کہ دوسرا آدمی متکلم کی ذہنی کیفیت کو سمجھے بغیر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ ہیملٹ کی خود کلامی کو بھی اگر اس کے ذہنی پس منظر اور اس کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو یہ ایک دفترِ بے معنی نظر آئے گا۔ میم صاحب پر یہ الزام لگانا کہ وہ ورڈز ورتھ اور وان گاگ کو اس طور سے نہیں سمجھی ہیں جس طرح راہی صاحب سمجھے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ٹھیک ہو، لیکن اس الزام کی بنیاد جس تجزیے پر رکھی گئی ہے وہ بجائے خود غلط ہے اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میم صاحب اور راہی صاحب کے طرزِ فکر اور ذہن میں مماثلت ہی نہیں بلکہ یکسانیت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔

راہی صاحب کا کہنا ہے کہ ملہ سُبحان کا جج کے سامنے بار بار یہ فقرہ دُہرانا کہ "آج ہاتھ کا شل نِکل گیا!" بے معنی ہے اور اس سے کسی بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ جہاں تک اس کی معنویت کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر سے اشارے میں ایک کائنات چھپی ہوئی ہے۔ رمضانا کے "دیوانہ پن" اور پھر موت کو ملہ سُبحان نے گوارا کر لیا تھا، رمضانا کی خودکشی کو اس کے دیوانہ پن کا نتیجہ سمجھ کر اس نے اپنے زخموں پر مرہم رکھ لیا تھا لیکن میم صاحب کی آمد سے رمضانا کی موت کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ میم صاحب کی باتوں میں اسے رمضانا کی گونج سنائی دی۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ شاید رمضانا پاگل نہیں تھا، کیونکہ میم صاحب پاگل نہیں ہو سکتی۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ رمضانا وہی سب باتیں کہنا چاہتا تھا جو میم صاحب کہہ رہی ہیں۔ اس نے میم صاحب کے وجود میں اپنے رمضانا کی رُوح اور اس کا عکس دیکھنا شروع کیا۔ میم صاحب اور رمضانا دونوں ہی حُسنِ فطرت کے شیدائی تھے۔ اس بات کا

ملّا سبحان پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ اور پھر رمضانا کی موت کا واقعہ سُن کر جب میم صاحب نے خودکشی کی تو ملّا سبحان سوچنے لگا —— کہ "رمضانا کے مرنے اور پھر میم صاحب کے مرنے میں کوئی گہرا تعلق ہے ۔۔" وہ تعلق کیا تھا، اسے وہ بیان نہیں کرسکتا تھا۔ ملّا سبحان رمضانا کے دیوانہ پن اور میم صاحب کے وجد و حال کو پریوں اور جنوں کی "نظر" سے تعبیر کرتا تھا۔ اس سے اُس کی ضعیف الاعتقادی ظاہر ہوتی ہے۔ قدرتی طور جب اسے رمضانا اور میم صاحب کی موت میں اتنی مماثلت نظر آتی ہے تو وہ اپنے طور سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ میم صاحب اور رمضانا کا آپس میں کوئی گہرا رشتہ ہے۔ یہی نہیں، اُسے اپنا وجود بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتا ہے۔ میم صاحب کی لاش کو گود میں لئے اُسے محسوس ہوا کہ "یہ میری بیوی ہے۔ نہیں! یہ میری بہو ہے۔ نہیں نہیں!! یہ میری بیٹی ہے۔ نہیں نہیں!!! —— آج بات کا شل نکل گیا۔"

آج بات کا شل نکل گیا، یعنی آج یہ عقدہ کھُل گیا، بڑا ہی بلیغ فقرہ ہے۔ اور اس میں ملّا سبحان کا تحیّر، اس کی ضعیف الاعتقادی اور وہ جذبات پوشیدہ ہیں جن کو وہ الفاظ کی شکل نہیں دے سکتا۔ اس مرحلہ پر ملّا سبحان کے جذبات بھی رمضانا اور میم صاحب کی طرح الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتے۔ ملّا سبحان کے اس عجز نے اس اجمال کو وہ تفصیل بخشی ہے کہ پڑھنے والا —— (بہ استثنائے جناب راہی) وہ سب کچھ سمجھتا ہے جو ملّا سبحان کہنا چاہتا تھا، جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ساری داستان سُن کر بھی اگر راہی صاحب اور زنگ صاحب اس فقرے کی معنویت اور اس کے اجمال کی تفصیل سے کچھ نہیں سمجھتے تو اس میں ملّا سبحان سے زیادہ ان کا اپنا قصور ہے۔

مفصل تنقیدی تجزیے کے بعد راہی صاحب نے افسانے کے کرداروں کے متعلق جو رائے دی ہے وہ بڑی اہم اور قابلِ غور ہے۔

"رمضانا کی موت، میم صاحب کا مرنا اور آخر میں ملّا سبحان کی "دیوانگی" یہ سب واقعی عجیب ہے۔ عظیم کردار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ضمیر میں بہار آجاتی ہے۔ اختر کے کرداروں کا انجام دیکھ کر رحم آتا ہے اور دِل تنگ ہوجاتا ہے۔ افسانے کا "آدم" بے شک عجیب (Strange) ہے، لیکن اس کو عجب ذات Wonderful نہیں کہہ سکتے۔"

افسانے کے کرداروں کا انجام دیکھ کر واقعی رحم یا تنگ دِلی کا احساس ہوتا ہے یا نہیں؟ میں اس موضوع پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔ میں نے ان کرداروں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس سے ثابت ہوگا کہ کم ازکم میرے دِل میں رحم یا تنگ دِلی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ رہی یہ بات کہ یہ کردار Strange ہیں Wonderful نہیں ہیں۔ اگر راہی صاحب نے پُورے خلوص اور نیک نیتی سے یہ رائے دی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اختر کے افسانے کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کا موضوع ہی یہی ہے کہ انسان ایک عجیب (Strange) ذات ہے۔ اس افسانے میں اختر انسان کی عظمت پر نہیں بلکہ اس کے Strange ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان، جو زندگی سے اِتنی گہری وابستگی رکھتا ہے، جو ناکامیوں، محرومیوں، پشیمانیوں اور ذلتوں کے باوجود زندگی کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ اتنا عجیب ہے کہ کبھی کبھی موت پر اسے قربان کردیتا ہے۔ مجھے یہ افسانہ راہی صاحب کے اس شعر کی بڑی حسین تفسیر معلوم ہوتا ہے ؎

آدم چہ عجب ذات، دپان مرگ چہ مُشکل
گر شوقِ سنیٹس تقو نہ زدس رثہ تہ حصر وُچھ

یہ زندگی کی رعنائیوں، اس کے تنوع اور اس کی رنگا رنگی کی دلیل ہے کہ اس میں عظیم کرداروں کے ساتھ ساتھ عجیب کردار بھی ملتے ہیں اور اختر نے انسان کی عظمت پر تقریر کرنے کی بجائے ہمیں یہ بتایا ہے کہ زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا، انسانوں کو مشینوں کی طرح Classify نہیں کیا جاسکتا —— فن کار زندگی کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر فیصلہ صادر نہیں کرتا۔ وہ انہیں صرف پیش کرتا ہے اور اس طور پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس زندگی اور ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور پیش کرنے کا یہ عمل اتنا سطحی نہیں ہوتا جتنا بظاہر کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ اختر کے افسانے کے موضوع اور اس کے کرداروں کو آرنلڈ ہاسر کے اس بیان کی روشنی میں جانچنا چاہیئے :-

All art is, Properly speaking, a kind of Donquixotism, an attempt to adjust the world to the claims of an individual who reacts to an intolerable reality with unrealistic ideas. Both the artist and the fool sacrifice the world rather their own demands, or as they Prefer to call them ideals.

تعمیر

شاذ تمکنت

شبِ رفتہ

رات نیندوں کے شبستاں میں چھنا کا سا ہوا
صبح خوابِ شبِ رفتہ کا لہو لائی ہے
دھوپ کرنوں میں پروئے ہوئے شبنم کے نگیں
پرسشِ درد کو چپ چاپ چلی آئی ہے
آنکھ کھلتی ہے تو پلکوں پہ چتا جلتی ہے
سانس چلتی ہے کہ خونِ رگِ حسرت کا بہاؤ
اشک آنکھوں سے ٹپک جائیں تو دامن جل جائے
دل کی دھڑکن ہے کہ صحرا میں چٹختے ہیں الاؤ
میں وہی شعلہ بہ لب، زخم بہ دل، خاک بسر
راندۂ شام و سحر بخیہ گرِ چاکِ جگر
کاسۂ چشمِ تہی کس کو دکھاؤں جا کر
کس سے پوچھوں کہ کہاں لٹ گئے اشکوں کے گہر
خاک ہی خاک ہوں اکسیر پکار اٹھتی ہے
میں فغاں کرتا ہوں تاثیر پکار اٹھتی ہے
روح اک دشتِ ندیدہ ہے مگر پچھلے پہر
کہیں نزدیک سے رونے کی صدا آتی ہے
کانپ کر ڈوبتا ہے صبح کا تارہ جس دم
دور سناٹے میں اک چیخ لرز جاتی ہے

اتنا محروم ہوں تدبیر کے پر جلتے ہیں!
خواب یاد آتے ہیں تعبیر کے پر جلتے ہیں!
میں کہ بھولا نہیں وہ پیکرِ اقرار تمنا
جیسے سرتا بقدم راگنی انسانی ہوئی
جنبشِ لب ہے کہ ترشے ہوئے دل لرزاں ہیں
رقصِ آواز کہ بج اٹھتی ہے چاندی کی ندی
آنکھ جیسے کوئی جینے کی قسم دیتا ہو
گفتگو، جیسے سنوارے کوئی قسمت میری
رخ کہ یونان کے بت گر نے عرق ٹپکا کر
اپنے شہکار کے ماتھے سے ردا سرکا دی
اب بھی احساس میں در آتی ہے صبحِ شبِ دید
اب بھی شعلوں کے نگلنے کا خیال آتا ہے
تنہا تنہا نظر آتا ہوں بھری دنیا میں
آگ سی جیسے کوئی اب بھی پلا جاتا ہے
آج وہ درد وہ انداز کہاں سے لاؤں
پھر سے لٹ جانے کے انداز کہاں سے لاؤں

نریش کمار شاد

ایک خود پرست شاعر

میرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی لکھنوی بلاشک و شبہ اس دَور کے نہایت عظیم غزل گو شعرا میں سے ہیں۔ عظمت کا لفظ اگرچہ اس دَور میں اپنی معنویت کھو چکا ہے اور ہر دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر نے بھی اپنی غلط فہمی یا اپنے ناقدوں کی غلط بخشی کی وجہ سے اس صفت کو اپنا لیا ہے لیکن میرزا کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے پیشِ نظر ان کی عظمت پر شک کرنا ادبی خیانت کے مترادف ہے۔

لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ یہ خیانت ان کی زندگی میں جی بھر کر کی گئی ناقدوں نے ارادی طور پر ان کے شاعرانہ مرتبے سے انحراف کیا اور دِلی طور پر ان کی فکری رفعتوں کے قائل ہوتے ہوئے انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اکثر ہم عصر شعرا ان کی دِل آزاری کا باعث ہوئے اور مقامی اور ہنگامی اختلافات کی وجہ سے انہیں لکھنؤ کو چھوڑنا پڑا۔ تلاشِ معاش کے لئے مختلف شہروں میں کئی دِل گداز مراحل طے کرنے پڑے۔ دُنیا بھر کو انہوں نے اپنا دشمن بنا لیا اور زندگی کی آسودگیاں اپنے اُوپر حرام کر لیں لیکن اپنی غیرت اور خود داری پر حرف نہ آنے دیا۔ ہر چند اس کشاکش اور جد و جہد میں ان کا دِل مجروح ہو گیا لیکن ان کی شاعری کی محراب میں اعتماد اور خود پرستی کے چراغ فروزاں ہو گئے۔ وہ فطرتاً خود دار تھے۔ لیکن زمانے کی بے نیازی اور ناقدری نے ان کی خود داری کو خود پرستی میں منتقل کر دیا۔ ان کا لب و لہجہ بہت زیادہ تلخ و ترش اور تند و تیز ہو گیا۔ اقبالؔ اور دوسرے ہم عصر شعرا کے مُنہ آنا اسی تلخی کا انتقامی ردِعمل ہے اور "خرافاتِ عزیز" اور "غالب شکن" اسی ردِعمل کے ناخوش گوار مظاہر ہیں۔

اُن کی ادبی زندگی میں ان کے حریفوں نے مخالفت اور مخاصمت کے کئی طوفان اُٹھائے۔ اَن گنت فتنے برپا کئے۔ لیکن وہ ان ہنگاموں کو بازیچۂ حقیر

تعمیر

سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے یہی کہتے رہے ؎

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اَب بھی ہے
ہزاروں گُل کھِلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

یا ؎

علاجِ اہلِ حسد زہرخندِ مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

غالبؔ کے بارے میں ان کا رویّہ علمی اور ادبی حلقوں میں خاص طور پر ان کی غیر مقبولیت کا باعث ہوا۔ حالاں کہ ان کا رویّہ انتہائی سخت ہونے کے باوجود اساسی طور پر قطعی غلط نہیں ہے۔ "غالب شکن" لکھ کر انہوں نے غالبؔ ایسے تاریخ ساز شاعر کی حیثیت سے انحراف نہیں کیا بلکہ غالبؔ سے ان کی بیزاری کا دراصل سبب ع

ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں

قسم کے حضرات تھے جن میں بجنوری ایسے غالب پرست پیش پیش تھے جنہوں نے یہ کہہ کر تنقیدی غلو کی انتہا کر دی کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں وید مقدس اور دیوانِ غالب۔

حقیقت میں میرزا خود بھی غالبؔ کے معترف تھے۔ ان کے بعض اپنے اشعار ہی سے اس کا ثبوت مِل جاتا ہے لیکن غالبؔ کی پیروی ان کی خود پرستی کے منافی تھی۔ لکھنؤ میں جہاں ان کی شاعری کی نشو و نما ہوئی انہوں نے وہاں کے اسکول کے روایتی موضوعات سے بھی بغاوت اختیار کی اور دوسرے شعرا کے رنگ میں شعر کہنے کی بجائے اُردو کی غزلیہ شاعری کے آبگینے میں اپنی انفرادیت

کی صہبائے تُند کو اُتارا۔ غالب سے اگر انہیں چڑ تھی تو محض اتنی کہ غالب اور صرف غالب ہی اُردو کے بہت بڑے شاعر نہیں ہیں۔ کہنے والے ان کی خود پرستی کے متعلق کچھ بھی کہیں، لیکن اگر غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو غالب کی زمینوں میں انہوں نے جو شعر کہے ہیں وہ اگر غالب کے اشعار سے بلند نہیں تو اتنے پست بھی نہیں کہ میرزا کو ایک منفرد اور عظیم غزل گو کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہنستا ہے عشق مجھ کو گراں بار دیکھ کر	زندانِ آب و گل میں گرفتار دیکھ کر
شانہ ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے	محوِ طلسم بندیِ اسرار دیکھ کر
پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی	دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
جنسِ وفا نہ تھی کوئی مفلس کا مال تھا	دل ہٹ گیا نگاہِ خریدار دیکھ کر
آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے	اب کیا کہیں گے کافر دیندار دیکھ کر

پسینہ تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا؟
ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر
نگاہِ بے نیازی نے دکھایا راستہ سیدھا
بھٹکتا کوئی کب تک جادۂ شیخ و برہمن پر
خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا
گرفتارِ قفس پر یا گرفتارِ نشیمن پر
شکستِ نشہ و کیفِ ندامت واہ کیا کہنا
بجائے مے ٹپکتا ہے زلالِ اشک دامن پر

فخر ہے خانۂ صیاد میں مہماں ہونا	بے گناہوں کے لئے داخلِ زنداں ہونا
لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے	موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا
لذتِ دردِ سلامت ہے تو آساں نہیں	جان پر کھیل کے آمادۂ درماں ہونا
معنیِ وعدۂ موہوم نے صورت پکڑی	بدگمانوں کو مبارک ہو پشیماں ہونا
سہوِ کاتب سے ہے نام اپنا مسلمان تقی	رنگ لائے گا کسی دن یہ مسلماں ہونا

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چکا تھا یار کا۔ چونکتے ہی حسرتِ دیدار کا دفتر کھلا
اشکِ خوں سے زرد چہرے پہ ہے اک طرفہ بہار
دیکھئے رنگِ جنوں کیسا مرے منہ پر کھلا
بند آنکھیں ہوگئیں بے تاب ہو ہو کر گرے
سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا
صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا
ہاتھ اُلجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ
بیڑیاں کیونکر کٹیں زنداں کا در کیونکر کھلا

دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا۔ محمل نشیں تو رہ گیا محمل نہیں رہا
آہستہ پاؤں رکھیے قیامت نہ کیجیے۔ اب کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا
پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام۔ اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا
تکتے ہیں یاسؔ دور سے منہ آپ کا ہنوز۔ آنکھیں تو رہ گئیں مگر اب دل نہیں رہا

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے۔ کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے
تنگِ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری۔ کون اُٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے
ترکِ مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی۔ صبح تک کیوں دلِ بیمار جگاتا ہے مجھے

بہارِ زندگی ناداں بہارِ جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرامِ جاں کیوں ہو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل
نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پردیسی زباں کیوں ہو
مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ اُمیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضلِ الٰہی ناگہاں کیوں ہو
زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحبِ نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

چلیے ہم طرح کلام کا موازنہ لاحاصل سہی اور ایک لمحے کے لئے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ غالب کے معاملے میں میرزا کا رویّہ مذموم اور انتہا پسندانہ ہے، جب بھی زیادہ سے زیادہ ان پر یہی الزام تو عائد کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک نقاد کی

حیثیت سے درخورِ اعتنا نہیں، لیکن اس صورت میں بھی ان کے کلام سے بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی۔ ان کی تلخ نوائی اور شدّت پسندی ہزار ناگوار سہی، لیکن اس سے ان کی شاعرانہ اہمیّت تو کم نہیں ہوتی۔ انہوں نے اُردو غزل کو جو پُر حوصلہ اور پُر یقین لب و لہجہ عطا کیا ہے وہ اُردو کی غزلیہ شاعری میں ایک اہم باب کا اضافہ کرتا ہے۔ ان کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُردو غزل کو گُل و بُلبل کی نہیں، واقعی جیتی جاگتی زندگی کی شاعری بنا دیا۔ اُن کی انفرادیت کی عظمت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے اشعار کسی بھی ہم عصر شاعر کے کلام میں شامل کر دئے جائیں تو ان کے تیور قطعی طور علیحدہ نظر آئیں گے۔ ان کے ہاں الفاظ کا استعمال، محاوروں کا رکھ رکھاؤ اور اسلوب کی چستی ہی انہیں اپنے ہم عصروں سے ممیّز و ممتاز نہیں کرتی بلکہ ان کی حکیمانہ فکر، جو زندگی اور عمل کا درس دینے کے باوجود کبھی خطابت میں مدغم نہیں ہوتی انہیں دوسرے شاعروں سے جُدا کرتی ہے۔ ان کے کلام کا نُمایاں وصف یہ ہے کہ ان کے اندازِ فکر میں عامیانہ پن اور سطحیت نہیں ہے۔ ان کی شاعری انسانی فطرت کی ترجمان ہے اور قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے بعد انہوں نے ہی اپنے مخصوص رنگ میں فلسفیانہ خیالات کو باقاعدگی، فنی پختگی اور فکری بالیدگی کے ساتھ غزل کے پیکر میں سمویا جیسے

۱ مرے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

۲ سزائے عشق بقدرِ گُناہ ناممکن
یہی بہت ہے کہ برہم مزاجِ یار رہے

۳ اپنے اپنے حال میں اور اپنے اپنے رنگ میں
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پریشانِ بہار
قافلے کا قافلہ مارا ہوائے دہر نے
رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینانِ بہار

۴ اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر لیا
فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

۵ فلک نے بھُول بھلیوں میں ڈال رکھا تھا
ہم ان کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

۶ ناخدا کو نہیں اب تک تہہِ دریا کی خبر
ڈُوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

۷ صبر کرنا سخت مُشکل ہے، تڑپنا سہل ہے
اپنے بس کا کام کرلیتا ہوں آساں دیکھ کر

۸ دُنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں

۹ بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دُعا ہو جائے گا

۱۰ یکساں کبھی کسی کی نہ گذُری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

۱۱ خوشی میں اپنے قدم چُوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری، مُسکرائے ہیں کیا کیا

۱۲ بجُز ارادہ پرستی خدُا کو کیا سمجھے !
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ مِلا

۱۳ نگاہِ حُسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی، پیرہن دریدہ سہی

ایسے باکمال شاعر کا زمانے کے ناروا سلوک سے چڑ کر خودشناسی سے خودسرائی اور خود پرستی کی حد تک پہنچ جانا اس لحاظ سے بھی قابل درگذر ہے کہ ان کی خود پرستی ان کے شعروں میں ایک حیات پرور اور حیات آفریں پیغام بن کر جھلکتی ہے۔ اس خود پرستی کی بھٹی میں تپ کر ان کے شعروں میں وہ مردانہ شکوہ اور بانکپن پیدا ہوا جو ان سے پہلے اس فنی خوبصورتی اور رچاؤ کے ساتھ اگر نایاب نہیں تو بہت کم یاب ضرور تھا۔ ان کی خود پرستی میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ ان کی خود پرستی بیمار خود پرستی نہیں، صحت مند خود پرستی ہے۔ جس کی بُنیاد اندھی اور کھوکھلی رعونت پر نہیں بلکہ سوچی سمجھی اخوّت اور حُریت پر اُستوار ہے۔ تجزیہ و تحلیل کے بعد اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے سینے میں ایک چوٹ کھایا ہوا دردمند دِل تھا جس میں صرف اپنی ذات ہی کا نہیں، پوُری انسانیت کا احترام تھا اور اس دِل کی دھڑکنیں ان کے ایسے اشعار میں واضح طور پر سُنائی دیتی ہیں ؎

سے صد رفیق و صد ہمدم پرشکستہ و دلِ تنگ
داد رائے زیبد بال و پر بمن تنہا

۲ مجھے بھی ناخدا! آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

۳ رہائی کا خیالِ خام ہے یا کان بجتے ہیں
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آوازِ در ہو کر

غزل سی لطیف نازک صنفِ سخن کو انہوں نے معنوی اعتبار سے جو مردانہ مزاج بخشا ہے اس کے لئے ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام عشق و محبت کی پیداوار نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے سانحات و حادثات کا نتیجہ ہے۔ ایسے چند اشعار سے قطع نظر جن میں ماحول کی چیرہ دستی اور حالات کی ناسازگاری نے ان کی خود پرستی میں منفی رجحانات پیدا کر دئے اور انہوں نے ایسے ایسے شعر کہدئیے جو یقیناً ایک عظیم شاعر کی شان کے شایاں نہیں جیسے سے

۱ اندھے جو ذلیل کو سمجھتے ہیں عزیز
شیطاں کو عجب نہیں جو کہہ دیں جبریل

۲ یاس اب ذلیل ہی کو سمجھتے ہیں سب عزیز
کانٹے چمن کے تلتے ہیں پھولوں کے بار میں

۳ لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر
اِک تو اُستادِ یگانہ، دوسرے داماد ہوں

اگرچہ اس قبیل کے اشعار میں وہ شعر بھی مل جاتے ہیں جن میں ان کی ذاتی زندگی کی محرومی اور غریب الوطنی کا کرب جذباتی توازن اور فنی ربط و ضبط کے ساتھ مترشح ہے جیسے سے

۱ مزارِ یاس پہ کرتے ہیں شُکر کے سجدے
دُعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے !

۲ یاس اُمیدِ وفا از لکھنؤ فکرِ محال
شیوہائے ناشُلماں بر نتابد ہر دِلے

۳ زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا، کانٹے گلے کا ہار رہے

۴ شامِ غربت بھی ہے روشن واہ ری یادِ وطن
یاد کیا ہے اِک اندھیرے کا اُجالا دِل میں ہے

۵ لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دِل سے
پلٹ کر اِک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

مجموعی طور پر ان کی خود پرستی جب ان کی خلّاقانہ قوتوں میں اپنا جادو جگاتی ہے تو ایسے ایسے بے بہا جواہر ریزے معرضِ وجود میں آتے ہیں جن کی درخشندگی پر وقت و حالات کی گرد نہیں جم سکتی، جن کے ایک ایک لفظ میں ان کا معنوی کردار جلوہ گر ہے اور جو ان کی سربلند شخصیت کی نہایت دلکش غمازی کرتے ہیں اور اس حقیقت کا روشن ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ان کے محسوسات میں پھول کی پنکھڑی کی نزاکت نہیں بلکہ نشتر کی نوک کی چبھن تھی مثلاً سے صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر تلخ ہو جائے لذتِ بے داد

۲ یگانہ تم بھی ہو بہرے کہ اُف نہیں کرتے
خدا کو کوستے پھرتے ہیں دِل جلے کیونکر

۳ خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے، بھیک نہ مانگ

۴ داورِ حشر ہوشیار، دونوں میں امتیاز رکھ
بندۂ نا اُمید اور بندۂ بے نیاز میں

۵ زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے
یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے !

۶ ہر شام ہوئی صبح کو اِک خوابِ فراموش
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

۷ خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا

۸ شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دِل
غم کھاتے کھاتے مُنہ کا مزہ تک بگڑ گیا

اُلٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

۹ اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

۱۰ مجھے دِل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہوکر راہ پہ آنا نہیں آتا

۱۱ موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دُعا کر چکے، اب ترکِ دُعا کرتے ہیں

۱۲ نہ کترائے نہ بل کھائے تو پھر دھارا کدھر جائے
ارے یہ کیا کہ راہِ راست مُشکل ہوتی جاتی ہے

۱۳ گُناہ گار ہوں، لیکن وہ دِل دیا تُونے
تری جناب میں پہنچوں تو تھرتھری نہ لگے

کیا یہ اشعار اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش نہیں کرتے کہ ان کی خود پرستی کا شرار ان کی کہنہ مشقی، طباعی اور بھرپُور علمیت کے شعلے سے پھُوٹا تھا۔ انہیں زبان و بیان پر پُوری قدرت حاصل تھی اور وہ اپنے گہرے سے گہرے مشاہدے کو نہایت رواں دواں اور بامحاورہ اسلوب میں ڈھالنے کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود پرست تھے، خود فریب نہیں تھے۔ اپنی خود پرستی کا انہیں شعوری طور پر احساس تھا۔ یہی احساس شعر کے لباس میں ان کے یہاں جابجا نظر آتا ہے ؎

۱ کیا بتاؤں کیا ہوں میں، قدرتِ خدا ہوں میں
میری حق پرستی بھی عینِ خود پرستی ہے!

۲ خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاسؔ کس دِن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

۳ زمانے بھر کا مُنہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہے جن کو رنگ و بُوسے رائیگاں ہوکر

۴ زہے معراجِ انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
چڑھایا خود پرستی نے نگاہِ دوست و دُشمن پر

حق تو یہ ہے کہ "بالِ جبریل" کی غزلوں کو چھوڑ کر اس دَور کی غزلوں میں زندگی کی اتنی بھرپُور حرارت، جذبے اور فکر کی اتنی شدّت اور کہیں نہیں ملے گی جسے میرزا نے مرتے دم تک اپنے شعروں میں مرنے نہیں دیا۔ ان کے لب و لہجہ کا شکوہ اور بانکپن عرفی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ انتہائی اذیّت بخش زندگی گذارنے کے باوجود سب سے زیادہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ وہ زندگی سے گریز کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ زندگی کے بے رحم حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے لڑنا جانتے تھے۔ انہوں نے کسی مرحلے پر بھی اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا اور ہر نیا زخم کھا کر یہی کہتے رہے ؎

۱ پڑ چکے بہت پالے، ڈس چکے بہت کالے
مُوذیوں کے موذّی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

۲ دِل طوفان شکن تنہا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ چکے ٹکرا کے ساحل سے

۳ مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دِن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

میرزا کی غزلوں کا لب و لہجہ ہمارا ادبی اور تہذیبی ورثہ ہے۔ ہم نئی نسل کے شاعروں کو ان کے کلام کی تعمیری اور توانا روایات کو اپنانے کے لئے کسی تعصب اور بغض کے بغیر اور غیر متعلقہ امور کو بُھلا کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اُن کے کلام کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ وہ عروض کے ماہر تھے اور اسی مہارت کے اظہار کے لئے یا اپنی خود پرستی اور فضلیت کے جذبے کو تسکین دینے کی خاطر اپنے مخالف عروضیوں کو غلط فہمی میں مُبتلا کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً اپنے بعض اشعار میں انہوں نے دیدہ و دانستہ ایسا زحاف استعمال کیا ہے جو نفسِ مضمون اور ترتیبِ صوت کے اعتبار سے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، جیسے ؎

ہوا پھری افسردہ دِلوں کی رُت بدلی۔ اُبل پڑا ہے پھر رنگ نقشِ باطل کا
یا ہمارا رنگِ سخن یاسؔ کوئی کیا جانے۔ سوائے آتش ہے کون ہم زباں اپنا
، چلے چلو دِلِ آگاہ کے اِشارے پر۔ محال و ممکن سب اس کے اختیار میں ہے

ھنس راج رہبر

دو من چھتیس سیر

مہادیو ہماری بستی کی سب سے مشہور اور ہردل عزیز شخصیت ہے۔ یُوں تو مشہور اور ہردل عزیز آدمی ہر محلے، ہر قصبے اور ہر شہر میں ملتے ہیں لیکن مہادیو کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ ان سب سے مختلف ہے۔ اس کی اپنی ایک خصوصیت ہے جسے میل مُلاقات ہی سے سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اس سے واقفیت پیدا کرنا اور میل مُلاقات بڑھانا ذرا بھی مُشکل نہیں ہے۔ وہ بذاتِ خوُد بڑا ہی ملنسار اور ہنس مُکھ واقع ہوا ہے۔ شاید اس لئے اس کے میل مُلاقاتیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اسے ہندسوں میں بتایا نہیں جاسکتا اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔ اس بستی میں آباد ہونے کے پانچ سات دِن بعد ہی مجھ میں اس میں اتنی گہری شناسائی ہوگئی کہ اب ہم دونوں پکّے دوست ہیں۔ خیالات اور مزاج نہ ملنے کے باوجود بھی دو آدمیوں میں بھی جو بے تکلفی ممکن ہوسکتی ہے وہ ہم میں بھی ہے۔

اس میں اور مجھ میں جو نمایاں فرق ہے اس کا اندازہ یُوں لگایا جاسکتا ہے کہ میں ایک درمیان قد اور نحیف جسم کا مختصر انسان ہوں جب کہ مہادیو اُونچے قد، لمبے چوڑے ڈیل ڈول اور بھاری جسم کا ایک ایسا شخص ہے جو بڑ کے پیڑ کی طرح پھیلتا ہی چلا گیا ہے۔ پھر جسم ہی کی طرح شخصیت بھی خوب پھیلی ہوئی ہے۔ اس شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ اس شخصیت میں وہ خصوصیت کونسی ہے جو ان سب پہلوؤں میں نمایاں ہے اور جس کے باعث وہ اس قدر مشہور اور ہردل عزیز ہے۔ مجھے زیادہ تعجب اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے اس قد کی، کھانے پینے اور سونے تک کی بات بڑے فخر سے کرتا ہے۔

تعبیر

اُس دن مجھے کسی کام سے اس کے ساتھ شہر جانا تھا۔ میں آیا تو وُہ چارپائی پر دراز تھا۔ میں آیا تو اُسے شہر جانے کی بات یاد آئی اور وہ اُٹھ کر تیار ہونے لگا۔

"تمہاری بُش شرٹ پر تو کپڑا کافی زیادہ لگتا ہوگا؟" میں نے اسے کپڑے پہنتے دیکھ کر پُوچھا۔

"ہاں، عام آدمی کی بُش شرٹ سوا دو گز، ڈھائی گز کپڑے میں سِل جاتی ہے جب کہ میری بُش شرٹ کو پُورا پونے چار گز لگتا ہے۔"

اس وقت اس کے چہرے پر جو جذبہ نمایاں ہوا، اُسے دیکھ کر بلا شُبہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ وہ واقعی ایک عام آدمی نہیں ہے۔ اس میں کچھ نہ کچھ خصوصیت اور غیر معمولیت ضرور ہے۔

ایک دن مہادیو سے میری مُلاقات کناٹ پلیس کے ایک ریستوراں میں ہوگئی۔ میں آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے لپک کر مجھے کندھے سے پکڑ لیا اور کہا— "واہ بلدیو جی، آپ جا کدھر رہے ہیں، یہیں بیٹھئے نا؟"

اس کے ساتھ بیٹھنے میں مجھے کیا عذر ہوسکتا تھا۔ میں خوشی سے بیٹھ گیا۔ اور اگر نہ بیٹھنا چاہتا تو بھی بیٹھنا ہی پڑتا۔ بھاگنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

مہادیو دوشا کھا رہا تھا اور چائے پاس رکھی تھی۔ اب اس نے پھر بیرے کو بلایا اور میری طرف پلٹ کر پُوچھا— "بتائیے، آپ کیا کھائیں گے؟"

"دوشا ہی ٹھیک ہے!"

"اچھا بھئی، دو پلیٹ دوشا اور ایک سیٹ چائے جلدی سے لے آؤ—" اس نے بیرے کو آرڈر دیا۔ اور جب بیرا چلا گیا تو آگے رکھی ہوئی پلیٹ کی

طرف اشارہ کرکے پھر کہا — "اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ گستاخی کر لوں؟"

"ہاں، ہاں شوق سے۔ آپ گستاخی جاری رکھیئے۔" میں مسکرایا۔

نیا آرڈر آتے آتے اس نے پہلے آرڈر کا سامان ختم کر دیا۔ بیرے نے خالی پلیٹ سمیٹ کر نئی پلیٹ سامنے رکھی اور ہم دونوں دوشا کھانے لگے۔ اتنے میں جان پہچان کے دو اور آدمی اُدھر آنکلے۔ مہادیو نے اصرار کرکے انہیں بھی اس میز پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بولیئے آپ لوگ کیا کھائیں گے؟" مہادیو نے حسبِ دستور ان سے بھی پُوچھا۔

"ہم صرف چائے پئیں گے۔" جواب ملا۔

"نہیں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ تو لینا ہی پڑے گا!" اور اس نے بیرے کو بُلا کر پھر آرڈر دیا۔ "دیکھو بھئی، چار دوشا اور لے آؤ۔"

"میں تو اور نہیں لوں گا۔" میں نے جھٹ کہا۔

"کیوں، کیوں، کیا بات ہے؟" مہادیو نے میری طرف یُوں دیکھا جیسے میں نے اور دوشا کھانے سے انکار کرکے کوئی گناہ کیا ہو!

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے پاس تو ابھی اسی میں سے بھی آدھا پڑا ہے۔"

"اچھا بھئی، تو پھر تین لے آؤ۔" اس نے بیرے سے کہا۔ اور میری طرف پلٹ کر طنز کیا — "جب آپ لوگ کھا نہیں سکتے تو کام کیا خاک کریں گے!"

اور اس نے بازو اُوپر اُٹھا کر جسم کو بصد فخر پھیلا دیا اور ہم تینوں اس کی طرف دیکھ کر بیک وقت مُسکرائے۔

"اوہو، میں آپ لوگوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔"

ہمیں مُسکراتے دیکھ کر اسے دھیان آیا۔ پہلے اپنے بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص کا تعارف کرایا اور پھر دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "آپ ہیں ہمارے دیس کے مشہور و معروف ادیب شری آنند موہن، جنہوں نے سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔"

"جی ہاں، میں انہیں جانتا ہوں اور آپ نے جو چھ سات کتابیں اب تک لکھی ہیں وہ بھی میں نے پڑھی ہیں۔"

"چھ سات!" مہادیو بھونچکا سا میرا مُنہ دیکھنے لگا۔

"جی ہاں۔ چھ سات۔"

اسے میری بات کا یقین نہیں آیا اور شاید اسی لئے آنند موہن کی طرف پلٹ کر کہا — "کیوں آنند! کیا تم نے واقعی چھ سات کتابیں لکھی ہیں؟"

"جی ہاں۔" آنند نے جواب دیا اور پھر کہا — "اور میرا خیال ہے کہ سینکڑوں لکھ ڈالنے سے کام کی تین چار ہی لکھ لینا کہیں بہتر ہے۔"

ہم تینوں کھِل کھِلا کر ہنسے اور ہمیں ہنستا دیکھ کر مہادیو کو شاید پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالنے کی بات کہہ کر آنند موہن کے جذبات کو مجروح کرتا رہا ہے۔

"اچھا یار، یہ تو بتاؤ کہ ان کے نام کیا ہیں اور ان میں سب سے اچھی کون سی ہے تاکہ میں صرف انہیں کے نام لوں اور آئندہ ایسی گستاخی نہ کروں۔"

لیکن اسے کتابوں کے نام جان لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ بیرا تیسرا آرڈر لے آیا تھا۔ وہ لوگ دوشا کھانے اور میں چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

وہاں سے اُٹھ کر ہم دونوں اکٹھے گھر آئے تو معلوم ہوا کہ بھابی دوپہر سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ صبح کا نکلا اب چار ساڑھے چار بجے لوٹا ہے۔

"کھانا لاؤں؟" بھابی نے پُوچھا۔

"ضرورت تو ہے نہیں۔" مہادیو نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا اور ذرا توقف کے بعد پھر کہا۔ "ساتھ کیا بنا ہے؟"

"مُولی کی سبزی!"

"مُولی!" اس نے بائیں ہاتھ کی مُٹھی بند کرکے انگوٹھے سے ماتھا ٹھونکا سوچا اور پھر کہا — "اچھا لاؤ، تھوڑی سی کھا ہی لیتے ہیں۔"

بھابی نے ایک پلیٹ میں چھ سات روٹیاں اور دوسری میں ڈھیر سی سبزی لاکر مہادیو کے سامنے رکھ دی۔ کیونکہ بیوی اپنے خاوند کو سمجھتی

ہے اور یا پھر ماں بچے کو۔

"مُولی میرا من بھاتا کھاجا ہے۔" مہادیو نے دو تین روٹیاں اور آدھی سبزی صاف کر دینے کے بعد بات شروع کی۔ "اب صرف اس لئے کھا رہا ہوں ورنہ صبح سے اتنا کھایا ہے کہ روٹی کی بالکل ضرورت نہیں۔"

اور پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ سب سے پہلے ایک درجن انڈے کا آملیٹ اور سلائس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد فتح پوری میں مٹن کے چاول کھائے اور دو گلاس لسی پی۔ پھر نئی دہلی پہنچے اور اتنے اتنے بڑے تین دوشے کھائے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اتنا کچھ کھا لینے کے بعد روٹی کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے! یہ تو میں مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کھا رہا ہوں۔"

اور اس نے مُنہ کا ذائقہ بدلنے ہی میں دونوں پلیٹیں صاف کر دیں۔ مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ میں بھی اس کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے لگا ہوں اور کئی بار سوچتا ہوں کہ یہ مہادیو بھی عجیب آدمی ہے۔ کم سے کم وصف کو تعداد میں بدل دینے کا فن اسے خوب آتا ہے اور اس کے بھاری بھر کم جسم میں لطافت یُوں کثافت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جیسے نمک کی کان میں ہر چیز نمک بن جاتی ہے۔ یہ بات سوچتے ہی کچھ واقعات اچانک ذہن میں اُبھر آتے ہیں۔

میں نے ہومیوپیتھی کی چند کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور کچھ دوائیاں بھی گھر پر رکھ چھوڑی ہیں جو میں وقت ضرورت محلے کے لوگوں کو دیتا رہتا ہوں۔ ایک دن جب کوئی عورت اپنے بیمار بچے کو دکھانے آئی تو اتفاق سے مہادیو بھی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ جب وہ عورت دوائی لے کر چلی گئی تو اس نے میری شیشیوں کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر کہا — "یار مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بھی ڈاکٹری کرتے ہو۔ لاؤ مجھے بھی دوائی دو۔"

"شکایت کیا ہے؟"

"شکایت!" وہ ایک منٹ رُکا اور پھر کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "سر میں یہاں کچھ درد رہتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے بدہضمی کی شکایت ہے اور مجھے معلوم تھا کہ مہادیو اس مطلب کے لئے چُورن اور دوسری دوائیوں کا استعمال اکثر کرتا رہتا ہے اور ان کا استعمال اس کثرت سے کرتا ہے کہ چُورن اور دوائیاں بھی اس کی خوراک ہی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔

ہومیوپیتھی کی تو دوائی ہی کتنی ہوتی ہے۔ میں نے ایک شیشی نکالی اور مہادیو کے ڈیل ڈول اور مزاج کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک خوراک سے ڈیوڑھی دوگنی مقدار اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"ابھی کھا لوں؟"

"ہاں، ابھی کھا لو۔"

اس نے دوا پھانک لی۔ جب وہ اچھی طرح حلق کے نیچے اُتر گئی تو اس نے دوبارہ ہاتھ پھیلا کر کہا — "یہ تو میٹھی ہے۔ لاؤ اور دو۔"

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اور ایک اچھی خاصی مقدار میں دوا دوبارہ اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

ایک بار بستی کے کچھ من چلے لوگوں کو یہ بات سوجھی کہ آج کل کلا اور سنسکرتی کی بڑی چرچا ہے۔ ہم بھی آخر اس دیس کے باسی ہیں۔ ہمارا بھی اس کی کلا اور سنسکرتی سے کچھ تعلق ہے۔ اس لئے بستی میں ایک کلا کیندر (آرٹ کا مرکز) کھولا جائے۔ ناٹک، سنگیت اور قوالی کا شاندار پروگرام ہو، جس کا اودگھاٹن (افتتاح) کسی بڑے نیتا سے کروایا جائے۔

جب یہ تجویز مہادیو کے سامنے رکھی گئی تو وہ ایک دم اُچھل پڑا اور بڑے فخر سے بولا — "بڑے نیتا کی کیا بات ہے۔ مہادیو بھی کسی سے چھوٹا نہیں ہے۔ ان ہی لوگوں کے ساتھ کام کرتے عمر گذر گئی ہے۔ کہو تو ایک نہیں دس بُلا دوں۔"

کلا کیندر کا نام "کلا سنگم" رکھا گیا تاکہ نام ہی سے مزاح کا پہلو پیدا ہو۔ بستی کے لکھ پتی کارخانے دار شری گیندا رام سنگم کے صدر، چار پانچ سرکردہ اشخاص نائب صدر اور خود مہادیو سیکرٹری مقرر ہوئے۔ پیسہ اکٹھا ہوا۔ بس اب کیا دیر تھی، سنگیت، ناٹک اور قوالی کا پروگرام طے ہو گیا۔ اودگھاٹن (افتتاح) کے لئے شری ک کو بُلایا گیا جو جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی رہ چکے تھے۔ جو قربانی اور ایثارِ نفس کے لئے مشہور تھے اس بستی میں جو شرنارتھی آباد تھے وہ خاص طور پر ان کے عقیدت کیش تھے۔ اس ناتے انہوں نے افتتاح کی رسم ادا کرنا منظور بھی کر لیا تھا۔

جب اودگھاٹن کا وقت آیا تو مہادیو نے حسب دستور ان کا تعارف، سامعین سے کرانے کے لئے مائک سنبھالا اور اپنی پاٹ دار آواز میں کہنا شروع کیا۔

"ہندوستان ہی کیا، دُنیا میں آج ایسا کون سا شخص ہے جو شری ک کو نہیں جانتا۔ وہ ہماری جنگ آزادی کے ایسے بہادر سپاہی ہیں جنہوں نے اپنے پاؤں کی ایک ہی ٹھوکر سے انگریزوں کو سات سمندر پار پہنچا دیا۔ اور ان ہی پر بات ختم نہیں ہوتی ہے۔ ان کے دادا اور پردادا نے فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے پاؤں بھی اس سرزمین پر جمنے نہ دیئے۔ ان کے بزرگ والا صاحب نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو کبھی بھی کمپنی بہادر کے الفاظ سے خطاب نہیں کیا۔"

"ہش! ہش!!" شری ک نے پریشان حالت میں ہاتھ ہلاتے ہوئے مہادیو کو منع کیا۔ مگر اس نے اس طرف توجہ نہیں دی اور اپنی بات جاری رکھی۔

اس تعارف کے بعد شری ک کو ہار پہنائے گئے۔ سب سے پہلے کلا سنٹر کے صدر، دیگر عہدے داروں اور انتظامیہ کمیٹی کے ممبروں نے ہار پہنائے جن کی مجموعی تعداد چالیس سے کم کیا ہوگی۔ شری ک کی گردن جب ہاروں کے بوجھ سے جھک جاتی تو وہ انہیں اُتار کر الگ رکھ دیتے اور نئے پڑنے شروع ہو جاتے۔

جب انتظامیہ کمیٹی کے ممبر بھی ہار پہنا چکے تو مہادیو نے ان معزز اور ممتاز شہریوں کی فہرست اُٹھائی جنہوں نے اس تقریب کے لئے چندہ دیا تھا اور مائک پر یکے بعد دیگرے ان ناموں کا اعلان شروع کیا:۔

"اب پٹرول پمپ کے شری بدھاوا سنگھ جی ہمارے معزز مہمان کو ہار پہنائیں گے۔"

ہار پہنایا گیا اور ادھر اُدھر سے معمولی تالی بجی۔ کیونکہ تالیاں بجاتے بجاتے سامعین کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

"اور اب ریڈھا یونین کے شری ٹھیلا رام ہار پہنائیں گے۔"

شری ک نے بائیں طرف لگے انبار پر ہار اُتار کر پھر رکھے اور لوگوں نے قہقہہ بلند کیا۔

"بس بھی کرو۔ دیکھ نہیں رہے کہ لوگ اب ہنس رہے ہیں۔" میں نے مہادیو کے کان میں آہستہ سے کہا۔

"بادشاہو ہنسنے دو۔ انہیں ہنسانے ہی کے لئے تو یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔"

اس نے بصد فخر جواب دیا اور ہار پہنانے والوں کی لمبی فہرست میں سے اگلے نام کا اعلان کیا۔

"دو من چھتیس سیر۔" کسی نے پیچھے سے کہا اور میری بغل میں چٹکی لی۔

مُڑ کر دیکھا تو قریب ہی عجب سنگھ بیٹھا تھا۔ وہ ایک معمولی کارکن ہے جو محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے لیکن آنکھ اور بُدھی بڑی تیز ہے پتے کی بات کہنے اور انسان کو سمجھنے کا خاص ملکہ رکھتا ہے۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"ہم انہیں دو من چھتیس سیر کہتے ہیں۔" اس نے مہادیو کی طرف اشارہ کر کے بات کی تشریح کی۔

میری نظر میں درجنوں ٹکٹ اُبھر آئے جنہیں مہادیو نے ایک دن اپنے سامنے ڈھیر کر رکھا تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر ڈائری میں کچھ لکھتا جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وزن کے ٹکٹ ہیں۔" اس نے بصد فخر جواب دیا اور بولا "میں ہر ہفتے اپنا وزن کراتا ہوں اور ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیتا ہوں۔ لیکن ٹکٹ کبھی کبھی کھو بھی جاتے ہیں اس لئے وزن ڈائری میں درج کر رہا ہوں۔"

"دو من ۳۶ سیر۔" میں چونکا۔

"ہاں دو من ۳۶ سیر۔ ہم نے ان کا یہی نام رکھ چھوڑا ہے۔" عجب سنگھ نے مسکراتے ہوئے پھر دہرایا۔

(بقیہ برصفحہ ۹۲)

دو غزلیں

حریف گردشِ دوراں ہے، دیکھیے کیا ہو
تمام خلق پریشاں سی ہے، دیکھیے کیا ہو

ہوائیں کہتی ہیں آمد ہے موسمِ گُل کی
ابھی سے چاک گریباں ہے، دیکھیے کیا ہو

سحابِ زہد شکن کیا اُمنڈ کے آیا ہے
نزاعِ طاعت و عصیاں ہے دیکھیے کیا ہو

وہ عقل جس کے تکبّر کی انتہا ہی نہیں
جنوں سے دست و گریباں ہے دیکھیے کیا ہو

رواں تو جانبِ ساحل ہوئی ہے کشتیٔ عمر
اندھیری رات ہے، طوفاں ہے، دیکھیے کیا ہو

طیور کرتے ہیں تکمیل آشیانے کی
فلک پہ برق بھی خنداں ہے، دیکھیے کیا ہو

بڑھی ہے اور نئی روشنی سے تاریکی
غم و الم میں ہر انساں ہے، دیکھیے کیا ہو

نگاہِ بد سے بچائے خدا مرا گلشن
ہر ایک خار گلستاں ہے، دیکھیے کیا ہو

بشر جنونِ خودی میں خدا کو بھول گیا
جنوں اب اُس کا نگہباں ہے، دیکھیے کیا ہو

کسی کی برقِ تجلّی ہے یا کوئی آفت
خرابِ عالمِ امکاں ہے، دیکھیے کیا ہو

ہنرؔ خلوصِ محبت نے کی تو ہے تاثیر۔ وہ دل ہی دل میں پشیماں ہے، دیکھیے کیا ہو

تعمیر

تارے بھی جھلملانے لگے رات بھی ڈھلی
اپنی ہی داستاں پہ ہمیں نیند آ چلی

آہی رہیں گے خاک پہ جیسے اک آن میں
پچھلے پہر نہ پوچھ ستاروں کی بے کلی

اک حسنِ پردہ دار کا پہروں رہا ہے دھیان
اکثر اندھیری رات میں اک شمع سی جلی

اک شب تو آسماں سے زمیں جا کے مل گئی
لے کر کہاں کہاں نہ گئی دل کی بے کلی

اکثر تو آ گیا ترا دامن بھی ہاتھ میں
اتنی تو دادرس نہ ہوئی تھی تری گلی

شانوں پہ یوں بکھر کے جہاں در جہاں نہ ہو
زلفِ دراز مجھ کو کہاں لے کے تو چلی

اے حسن، خیر پاکیٔ دامانِ عشق کی
اے قربتِ تمام، ہوس اور بڑھ چلی

آسودگیٔ وصل ہی تک تھیں وہ شورشیں
کس کا جنوں، کہاں کا جنوں کیسی بے کلی

تھا ذکر رنگِ پیرہنِ یار کا شہابؔ۔ بادِ صبا چلی، ہوئی روشن کلی کلی!

پروفیسر محب الحسن
ترجمہ :۔ غلام نبی ہاگرو

تاریخ کشمیر کے مآخذ

تاریخ سلاطینِ کشمیر کا ایک باب

نوٹ :۔ میرے پیشِ نظر تاریخ سلاطین کشمیر" کے نام سے —— Kashmir under Sultans تھا کا ترجمہ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ قابل مصنف سے مجھے ترجمہ کرنے کی اجازت مل گئی ہے جس کے لئے میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔ میں اُن تمام اصحاب سے درخواست گذار ہوں جو اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں، مشورہ دیں اور میری مدد کریں۔ وہ مجھے "تعمیر" کے ذریعہ سے اپنے مفید مشوروں سے نوازیں۔ میں ان کرم فرماؤں کا بے حد ممنونِ احسان رہوں گا۔

(غ، ن، ر)

تاریخ کشمیر کے موجودہ مآخذ کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم عہدِ قدیم کے ان معاصر تصانیف کا جائزہ لیں جو اب موجود نہیں ہیں، لیکن بعد کے مؤرخوں نے، جن کی تحریروں سے استفادہ کیا' عہدِ شاہ میر کا ابتدائی دَور تاریخی تحریروں کی حد تک تہی دست نظر آتا ہے۔ یہ سلطان زین العابدین کے عہد سے، جو اچھے ادبی اور فنی زندگی سے عبارت ہے، سنسکرت اور فارسی میں تاریخیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ اسی وجہ سے نوتھو سوما پنڈت نے زین العابدین کی سوانح عمری اور اس کے کارنامے کشمیری میں "جائنا کارتا" کے نام سے لکھے اور یودا بٹ نے اسی موضوع پر کشمیری میں ایک ڈرامہ لکھا۔ اسی طرح ملا احمد اور ملا نادری نے، جو سلطان کے درباری شاعر بھی تھے، اپنی اپنی تاریخ کشمیر فارسی زبان میں لکھیں، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ دونوں کتابیں زمانہ کی دست برد سے نہ بچ سکیں اور نہ ان تاریخوں کا کوئی حصہ باقی ہے جو قاضی ابراہیم نے سلطان فتح شاہ کے دوبارہ عہدِ حکومت سنبھالنے کے بعد لکھیں۔ ان تاریخوں کا بھی یہی حال ہوا جو ملا حسن قاری نے چکوں کے دَور میں لکھیں۔ تاہم اس کتاب اور ملا احمد اور ملا نادری کی تاریخوں سے حیدر ملک، حسن بن علی، محمد معظم اور دوسرے مؤرخوں نے بہت سا مواد لیا۔

ہم محفوظ مآخذوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں :۔

(۱) معاصر سنسکرت تاریخیں :۔ یہ چار تذکروں پر مشتمل ہیں۔ جنہیں جونا راجہ، سری وارا، پرجابٹ اور شکا نے لکھا۔ اس فہرست میں کسمندرا کا "لوپرکاسا" بھی شامل ہے۔

(۲) معاصر فارسی تصانیف —— ان میں مندرجہ ذیل تذکرے شامل ہیں :۔

(الف) تذکرہ ہائے کشمیر (ب) ہندوستان کی تاریخیں

(ج) مغلوں کی تاریخیں (د) وسط ایشیا کی تاریخیں

(ہ) سلاطینِ دہلی کی تاریخیں (س) مشائخ اور صوفیوں کے ملفوظات

(۳) فارسی کی مابعد تاریخیں

(۴) کشمیری ادبیات اور لوک گیت، لوک کہانیاں

(۵) اہلِ یورپ کی لکھی ہوئی تاریخیں

(۶) آثارِ قدیمہ یا کھنڈرات کی شہادت

(۱) معاصر سنسکرت تاریخیں

کلہنا نے اپنی تاریخ "راج ترنگنی" میں ابتدائی زمانہ سے ۱۱۴۹ء —— ۱۱۵۰ء تک کی تاریخ لکھی جو ناراجا نے دو سو سال بعد اس تسلسل کو زین العابدین کے عہد تک جاری رکھا اور کلہنا کی طرح اسے راج ترنگنی کا نام دیا۔ جوناراجا سنسکرت کا عالم تھا اور زین العابدین کے دربار سے وابستہ تھا۔ لیکن اُس نے اپنی یہ تاریخ سری بٹ،

سپرنٹنڈنڈ عدالت[۲] کی فرمائش پر لکھی جو بقول اِسٹین وہ بظاہر کسی ذہنی اُپج سے بہرہ ور نہیں تھا، لیکن درحقیقت بڑے کمالات کا آدمی تھا[۵]۔

جوناراجا کی "راج ترنگنی" زمانۂ قدیم سے سنہ ۱۱۵۰ء سے سنہ ۱۴۵۹ء تک کے لئے تاریخ کشمیر کا محفوظ ماخذ ہے۔ اس نے ۱۱۵۰ء سے کشمیر کی معاشرت اور ریاست سے متعلق مختصر اور شاہ میر کی تخت نشینی کے بارے میں مجمل، لیکن مفید معلومات دئے ہیں۔ اس طرح ان عوامل کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے جن کی وجہ سے کشمیر میں سلاطین نے حکومت قائم کی۔ اس نے ابتدائی سلاطین کے دَور کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ رِنچانا (سُلطان صدرالدین) کے اسلام قبول کرنے اور حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے کشمیر آنے کا تذکرہ سرسری طور پر کیا ہے۔ تاہم سنہ ۱۳۸۹ء اور سنہ ۱۴۵۹ء کے درمیانی دَور کا، جس میں جوناراجا خود زندہ رہا، تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

چونکہ جوناراجا زین العابدین کا درباری تھا، اس لئے اس نے سُلطان کے اوصاف کو مبالغہ آرائی کی حد تک بیان کیا اور اس کی خامیوں سے چشم پوشی کرنے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے وہ سلطان کے باپ سکندر کے بارے میں غیر جانب دار نہ رہ سکا اور اس کے دَورِ حکومت کی خامیوں کا ذمہ دار اس کے وزیر سُہہ بھٹ کو قرار دیا جس کی کوتاہیوں کو اس نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس نے سلطنت کے جو جغرافیائی حدود بتلائے ہیں وہ قابل اعتماد ہیں۔ وہ ہر فرماں روا کی تخت نشینی اور موت کی تاریخیں صحیح لکھتا ہے لیکن مختلف فرماں رواؤں کے عہد کے اہم واقعات کی تاریخیں شاذ و نادر ہی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی خامی ہے جو کشمیر کے سارے ہی تذکروں میں پائی جاتی ہے۔

جوناراجا سنہ ۱۴۵۹ء میں فوت ہوا۔ لیکن اس کے بعد اس کے شاگرد سری وارا نے وہیں سے ابتدا کی، جہاں جوناراجا نے چھوڑا تھا۔ اس نے کتاب کا نام "جینا راج ترنگنی" رکھا۔ سری وارا جوناراجا کی طرح زین العابدین کے دربار سے وابستہ رہا اور سلطان کے بعد حسن شاہ اور محمد شاہ کی ملازمت میں گیا۔ اس تاریخ کی تالیف کے علاوہ اس نے فارسی سے یوسف و زلیخا کا ترجمہ "کتھا کوتُک" کے نام سے سنسکرت میں کیا[۶]۔ عالم فاضل ہونے کے علاوہ وہ شاعر اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی کا ماہر تھا اور حسن شاہ کے عہد حکومت میں شعبۂ رباب ونشاط (موسیقی) کا نگران رہا[۷]۔ سری وارا کی "راج ترنگنی" میں زین العابدین کے بقیہ سالوں، سنہ ۱۴۵۹ء تا سنہ ۱۴۷۷ء کے حالات تفصیل سے دئے ہیں۔ ان کے جانشینوں کے حالات فتح شاہ کے تخت نشین ہونے کے وقت تک (سنہ ۱۴۸۶ء) تک دئے ہیں۔ اس کا یہ کام، جوناراجا کے کام سے کمتر درجہ کا ہے اور اسٹین کے مطابق کلہنا کی کورانہ تقلید ہے جس نے اپنے پیشروؤں کی تقلید دوں کو اس کی کتاب، اصل کتاب معلوم ہونے کے بجائے "راج ترنگنی" کی خوشہ چینی لگتی ہے[۸]۔ اس نے، جیسا کہ خود لکھا ہے "میں نے یہ کام اس لئے کیا تاکہ میں ان (زین العابدین) کے بے شمار احسانات کا کسی حد تک حق ادا کرسکوں اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کیونکہ مجھے ان کے اوصاف بے حد پسند ہیں[۹]۔" وہ جوناراجا کی طرح زین العابدین کی اچھائیوں کو بڑھا چڑھا کر اور اس کی کوتاہیوں کو دَبی زبان سے بیان کرتا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود اس کا یہ کام سراہنے کے قابل ہے، کیونکہ یہ جس دَور سے متعلق ہے، اس کے بارے میں یہ ایک ہی ہم عصر ماخذ ہے۔ اسی وجہ سے بعد کے فارسی لکھنے والوں نے اس سے بے انتہا فائدہ اُٹھایا ہے۔

سری وارا کے مرنے کے بعد پرآجیابٹ نے اپنی تاریخ "راجہ ولی پتاکا" میں، سنہ ۱۴۸۶ء سے سنہ ۱۵۱۲ء تک کے حالات لکھے۔ حالاں کہ یہ سری وارا کے مقابلہ میں کم تر کی تاریخ ہے۔ سلطنت کے جغرافیائی حدود اس نے غلط بتائے ہیں، حقائق کی تاریخی ترتیب اس نے قائم نہیں رکھی ہے۔

چھبیس[۲۶] سال کی تاریخ چونسٹھ (۶۴) اشلوکوں میں بے ترتیبی سے لکھی۔ محمد شاہ اور فتح شاہ کے درمیان تخت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو جھگڑے ہوئے اُسے بالکل ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔

شکا پنڈت جو "پرآجیابٹ" کا شاگرد تھا، اس نے اپنے اہم تذکرہ کا نام کلہنا کی کتاب "راج ترنگنی" ہی کے مطابق رکھا۔ اس میں سنہ ۱۵۱۵ء سے سنہ ۱۵۹۶ء تک کے حالات درج ہیں۔ اس کی یہ کتاب جوناراجا اور سری وارا کی تاریخوں کے پایہ کی نہیں ہے اس نے بھی حدودِ سلطنت غلط بتائے ہیں۔ تاریخ بہت کم لکھی ہے اور تاریخی واقعات کی ترتیب میں بہت اُلٹ پھیر کیا ہے۔ کشمیر میں میرزا حیدر کے حملے اور پھر اس کے فتح کرنے کے بارے میں بہت سرسری تذکرہ کیا ہے۔ "عیدی رینہ" اور "دولت چک" کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو رسہ کشی ہوئی اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اس نے چکوں کی تاریخ اور مُغلوں کے کشمیر کو فتح کرنے کے واقعہ کو بہت اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے

لوکپراکاشا کے بارے میں ایسا لگتا ہے کہ اُسے بہت سارے آدمیوں نے لکھا ہے۔ جس میں کسمندرا (سنہ ۱۰۶۶ء المتوفی) نے بھی ایک حصہ لکھا ہے[۱۰]۔ کتاب کے دوسرے باب، جس میں شاہ جہاں کا تذکرہ آیا ہے اس کے بارے میں اندازہ ہے کہ اُسے سترہویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے[۱۱]۔ بوہلر نے اس کتاب کو ایک

تاریخی قاموس سمجھا[11] ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک طرح کا کشکول ہے جس میں ہر طرح کی معلومات ایک جگہ جمع کی گئی ہیں[12]۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور انتظامِ حکومت کے بارے میں لکھا گیا ہے[13]۔ اس کی زبان شستہ اور منجھی ہوئی نہیں ہے۔ مؤلف نے سنسکرت، فارسی اور کشمیری زبان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ "لوکپرکاش" چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مؤلف نے چار بڑی ذاتوں اور ساٹھ چھوٹی ذاتوں کے نام گنائے ہیں۔ حکومت کے عہدے داروں اور وزیروں کے خطابات بتائے ہیں[15]۔ دوسرے حصے میں ہُنڈیاں، تحریریں، تجارتی معاہدے اور سرکاری احکام اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ حصہ سب سے بڑا اور اہم ہے[16]۔ تاہم کسمندرا کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا اسد خان کے زمانے سے ہوئی اور سترھویں صدی عیسوی میں تکمیل کو پہنچی۔ تیسرا حصہ کسی ایک ہی موضوع سے متعلق نہیں ہے، جیسا کہ پہلے اور دوسرے حصے کا امتیاز ہے۔ بلکہ مختلف قسم کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں مچھلیوں کی مختلف قسموں، جانوروں، چوہوں، نمک، سونے کے زیورات اور سونے کے سکوں کے مترادف الفاظ دئے گئے ہیں۔ مؤلف نے مہابھارت کے اشعار نقل کئے ہیں۔ پیشواؤں اور پروہتوں پر طنز کیا ہے[17]۔ اس کا چوتھا حصہ "کالستون" پر طنز سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں ان اہلِ قلم مصنفین اتباع اور ان برہمنوں پر فقرے کسے گئے ہیں جو مسلمان ہوئے تھے۔ اس نے اس میں کشمیر کے اضلاع کی فہرست بھی دی ہے[18]۔

اس طرح "لوکپرکاش" میں کشمیر کی معاشرت اور انتظامِ حکومت سے متعلق بہت سا مفید اور قابلِ غور مواد یکجا جمع کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خامی اور مشکل یہ ہے کہ اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے کہ اس کے مختلف حصے کب لکھے گئے ہیں اور کس کے نتیجۂ فکر ہیں۔ پروفیسر اے ویبر نے اس کے اقتباسات "انڈسچو اسٹڈین" عدد ۱۸ صفحہ ۲۸۹ — ۴۱۲ میں شائع کئے ہیں اور اس سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

معاصر فارسی تحریریں

(الف) تذکرہ ہائے کشمیر

فارسی زبان میں موجود محفوظ تاریخیں مغلوں کے کشمیر کو فتح کرنے کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ سوائے سید علی کی تاریخ کشمیر کے، جو یوسف شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی تھی[19]۔ اس کے باوجود وہ تاریخیں بہت اہم ہیں، کیونکہ ان کے لکھنے والوں نے اپنا بچپن اور اپنی نوجوانی کے زمانہ میں خاندان شاہ میر اور چک خاندان کی سطوت و تعمیر

شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس لئے جو کچھ لکھا ہے وہ یا تو عینی شہادت کی بنا پر لکھا یا ایسی تحریروں سے استفادہ کیا جو اب دست یاب نہیں ہیں۔

سید علی کی تاریخ کشمیر یوسف شاہ کے دورِ تک کی تاریخ ہے۔ کتاب کا مؤلف بیہقی سید تھا اور مادری سلسلۂ نسب کے ذریعہ سے شاہ میر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ماں سلطان نازک شاہ کی بہن تھی۔ اس کا باپ سید محمد تھا جس نے میرزا حیدر کو کشمیر کے جنگلوں کے سلسلہ میں بہت اہم خدمات انجام دیں۔ اور اس آخری جنگ میں بھی حصہ لیا جس میں میرزا حیدر کی موت واقع ہوئی۔

سید علی کی تاریخ کشمیر کے مسودے نایاب ہیں، لیکن میں نے اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے جو ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ نے حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ بدنصیبی سے یہ مسودہ سرِ آغاز بہت ہی ناقص ہے اور اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس میں کشمیر کی تاریخ کا بیان کس عہد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مسودہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جب شہاب الدین کے دور میں تاج الدین سرینگر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اُنہیں ایران سے حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا تھا، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی مراجعت کشمیر کے لئے حالات موزوں ہیں یا نہیں۔ اس میں تاج الدین کے بیٹے سید حسین کے متعلق جس نے شہاب الدین کی ملازمت اختیار کی تھی، کی یلغار و تسخیر کے متعلق بڑی عجیب اور غلط باتیں لکھی گئی ہیں، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے نہ صرف دہلی، آگرہ اور لاہور کو فتح کیا بلکہ ایران، بدخشاں، کابل اور بیرونِ مُلک کے دیگر بہت سے مقامات کو بھی تسخیر کر لیا۔ اس کے بعد مؤلف نے حضرت سید علی ہمدانی رح اور ان کے فرزند حضرت سید محمد رح کی اُن کوششوں کا تذکرہ کیا ہے جو اُنہوں نے وادیِ کشمیر میں اسلام کو عام کرنے کے سلسلے میں کیں اور ساتھ ہی ساتھ ان تعلقات کو بھی ظاہر کیا ہے، جو باپ بیٹے کو قطب الدین اور سکندر سے تھے۔ غیر مسلم رعایا سے سکندر کے سلوک پر اس نے روشنی ڈالی ہے، لیکن اس کے دور کے سیاسی واقعات نہیں بتائے ہیں۔ تاہم زین العابدین اور حسن شاہ کے دورِ حکومت کی تاریخ قدرے تفصیل سے لکھی ہے۔ اگرچہ حیدر شاہ کے دورِ حکومت، محمد شاہ اور فتح شاہ کے درمیان تخت نشینی کے جھگڑے کو صرف چند سطور میں سرسری طور پر لکھا ہے۔ شاید اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جس میں کشمیر میں میرزا حیدر کی کارگذاریاں بیان کی گئی ہیں۔ کیونکہ ان واقعات کو مؤلف نے ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھا ہے۔ چکوں کے دورِ حکومت کو قریباً قریباً نظر انداز کر دیا ہے۔ سوائے

اُس نزاع کے نتیجے جو یوسف شاہ میرزا اور لوہچا [illegible] دینے لے [illegible] میں ہوا۔ اور جسے مختصر سے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں ان مشائخ اور درویشوں کی سیر و ملفوظات لکھی گئی ہیں جنہوں نے سلاطینِ کشمیر کے زمانہ میں کمال حاصل کیا۔ کشمیر کی سیاسی تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت ہی اہم ہے کیونکہ یہ فارسی میں تاریخ کی پہلی کتاب ہے جو ابھی تک موجود ہے۔ اور قاضی ابراہیم کی "تاریخِ کشمیر" اور اُن دوسری تاریخوں پر مبنی ہے جو اب دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ کتاب کا امتیاز اس میں پوشیدہ ہے کہ مصنف کشمیر میں میرزا حیدر کی حکومت اور اس کی موت کی عینی شہادت پیش کرتا ہے۔ لیکن کتاب واقعات کی تاریخی ترتیب معلوم کرنے اور جغرافیائی حالات جاننے کے سلسلے میں زیادہ اہم نہیں ہے۔

کسی نامعلوم مؤلف کی قلم سے "تاریخِ کشمیر" کے نام سے ایک کتاب ملتی ہے جو ابتدا سے شمس الدین ثانی کے دور تک کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی تاریخوں کو اصل مان کر لکھی ہوئی کتابوں میں سے تاریخِ کشمیر کے سلسلے میں یہ پہلی مفصل کتاب ہے، جسے ۱۵۹۰ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۵۲۹ء کی تاریخ، جیسا کہ اس کے بارے میں آدم نے کیٹلاگ میں اس کے متعلق لکھا ہے، مفقود ہے۔ محمد شاہ، فتح شاہ اور کشمیر پر میرزا حیدر کے حملے کے واقعات کو چھوڑ کر اس کتاب میں مسلسل واقعات نہیں ملتے ہیں۔ اس میں حضرت سید علی ہمدانی رحمہ کے وادی میں آنے کے واقعہ کا بھی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، حالاں کہ ان کا آنا وادی کی معاشرت اور مذہبی زندگی کے باب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ حیدر شاہ کی موت کے بعد کے واقعات کتاب میں بے ترتیبی سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ غیر معتبر ہونے کے باوجود پوری کتاب اہم مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ واقعات تفصیل سے درج ہیں جن کا تذکرہ "بہارستانِ شاہی" تاریخ از حیدر ملک اور دوسری فارسی تاریخوں میں نہیں ملتے ہیں۔ میں نے سکول آف اینڈ اسٹارٹس بلیو تھک واقع موان چین سے استفادہ کیا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے، کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔

"بہارستانِ شاہی" کسی نامعلوم مؤرخ کے قلم سے رِان چانا (سلطان صدر الدین) کی تخت نشینی سے لے کر ۱۶۱۴ء تک کی تاریخ ہے۔ کشمیر میں قبل اسلام کی تاریخ چند صفحات تک ہی محدود ہے۔ مؤلف کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ شیعہ تھا اور بیہقی شیعوں کا ملازم تھا؛

کیونکہ وہ ان کی پارسائی، ہمت و جرأت اور ان کی فیاضی بیان کرتے ہوئے تعریفوں کے پُل باندھتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کے لئے سنسکرت میں جون راجا اور سری ور اور فارسی میں مُلا احمد، مُلا نادری، قاضی ابراہیم اور حسن قاری سے استفادہ کیا ہے۔ خاندانِ شاہ میر کے آخری تاج داروں اور چکوں کے دور کے حالات اس نے یا تو اپنے مشاہدہ کی بنا پر لکھے ہیں یا بزرگوں سے معلوم کرنے کے بعد قلم بند کئے ہیں۔

"بہارستانِ شاہی" مرصع زبان میں لکھی گئی ہے۔ بعض اوقات ہجری تاریخوں کے ساتھ لوکِکا تاریخیں بھی درج ہیں۔ خاندانِ شاہ میر کی تاریخ حسن شاہ کے زمانہ تک بہت مختصر بیان کی گئی ہے۔ قطب الدین کے خلاف لوہارا کی بغاوت، ملکہ تورہ کی شاہی اور زین العابدین کے دور کی خانہ جنگی جیسے اہم واقعات نظر انداز کر دئے ہیں۔ حیدر شاہ کے حالات چند جملوں میں لکھے گئے ہیں اور حسن شاہ کے دورِ حکومت کے سیاسی واقعات سرے سے بیان ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ تاہم محمد شاہ اور اس کے بعد کے دور کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب میں مُغلوں کے تسخیرِ کشمیر کے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب مغل تاریخوں پر ایک معلومات افزا تکملہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی صحت و صداقت جانچنے کا اچھا پیمانہ ہے۔ یہ ایک ہی ایسی تاریخ ہے جس میں یوسف شاہ اور یعقوب شاہ کے حالاتِ زندگی اور ان کی موت کی تفصیل بیان کی گئی ہے جب کہ یہ دونوں جلاوطن کر دئے گئے تھے۔ اس طرح اپنی تمام خامیوں کے باوصف "بہارستانِ شاہی" ایک اہم تاریخی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخِ کشمیر از حسن بن علی کشمیری ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں ابتدا سے لے کر ۱۶۱۶ء تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب جلال الدین ملک محمد ناجی[۲۱] کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کا بہت خواہش مند تھا۔ حسن بن علی کے وہی مآخذ ہیں جو "بہارستانِ شاہی" کے ہیں اور اس میں بھی وہی خامیاں نظر آتی ہیں جو "بہارستانِ شاہی" میں ملتی ہیں۔ خاندانِ شاہ میر کے آخری سلطانوں اور چکوں کی تاریخ کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یعقوب شاہ کے اکبر اعظم کی اطاعت قبول کرنے کی طرف صرف ایک سرسری اشارہ کیا ہے۔ تاہم اس نے سلاطینِ کشمیر کی تاریخ حسن شاہ کے دور کے آخر تک بہت تفصیل

تعمیر

سے بتائی ہے۔ اس وجہ سے کتاب زبردست اہمیت کی حامل ہے۔

فارسی زبان کی سب سے مشہور کتاب حسن ملک کے بیٹے حیدر ملک کی ہے۔ جس کی جائے پیدائش چاڈورا ہے، جہاں وہ مسند نشین تھے۔ وہ رام چندر کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھتا ہے جو سہادیو کے زمانہ میں کمانڈر انچیف رہا۔ اس کے خاندان نے سلاطینِ دہلی کے عہد میں اہم رول ادا کیا۔ اس نے خود بھی حسین شاہ کے لئے یوسف شاہ چک کی خدمات چھبیس (۲۶) سال تک انجام دیں۔ مغلوں کے فتحِ کشمیر کے بعد جلا وطنی میں اس کا ساتھ دیا۔ وہ یوسف شاہ کے دوش بدوش لڑا، جسے اکبر اعظم نے باغی افراد کو زیر کرنے پر مامور کیا تھا۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے یوسف خان کو بنگال میں ایک جاگیر عطا کی اور اُسے قطب الدین کے ہمراہ شیر افگن کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ شیر افگن کے مارے جانے کے بعد حیدر ملک نے اس کی بیوہ مہر النسا کو، جو بعد میں نور جہاں کہلائی، اپنے مکان میں پناہ دی۔ یوسف خان کے انتقال کے بعد حیدر ملک نے جہانگیر کی ملازمت اختیار کی۔ جہانگیر نے اُسے "چغتائی" اور "رئیس الملک" کے خطابات سے نوازا۔

حیدر ملک نے ۱۶۱۸ء میں تاریخِ کشمیر لکھنی شروع کی اور ۱۶۲۰ء سے ۱۶۲۱ء (مطابق ۱۰۳۰ھ) میں مکمل کی۔ "بہارستان شاہی"، حسن بن علی کی تاریخ اور متذکرہ صدر کتاب کے مطالعہ کرنے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان تینوں کتابوں کے مآخذ ایک ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی حیدر ملک نے وہ رسوم و رواج نقل کئے ہیں جو ان کے خاندان میں اس وقت تک رائج تھے۔ چک دور کے بارے میں اس نے عینی شہادت کی بنا پر اس لئے لکھا کیونکہ وہ اس زمانہ میں نوجوان تھا۔ حالانکہ اس نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ان تمام واقعات میں اس نے کونسا حصہ ادا کیا۔ اس کا طرزِ تحریر صاف اور شستہ ہے۔ اس نے صحیح جغرافیائی حالات لکھے ہیں، لیکن واقعات کی جو تاریخی ترتیب اس نے دی ہے وہ لائقِ اعتبار نہیں، جیسے "بہارستانِ شاہی" کا مصنف بیہقی سیدوں کے کمالات کی تعریف کرتا ہے ایسے ہی حیدر ملک اپنے دادا ملک محمد ناجی کی دانائی اور ہمت و جرأت کی خوب خوب تعریفیں کرتا ہے۔ وہ شیعوں کے ساتھ یوسف شاہ کی ناروا پالیسی پر آزادی سے تنقید کرتا ہے۔ اس نے اُن کوششوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو چک سلطانوں نے مغل حملوں کی روک تھام کے سلسلہ میں کیں۔ اس کا یہ تذکرہ ہمارے لئے بہت ہی اہم ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے یوسف شاہ اور یعقوب شاہ کے قید و بند کے حالات اور ان کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں نہیں لکھا ہے۔ حیدر ملک کی تاریخ کشمیر کے تین مسودے موجود ہیں۔ میں نے انڈیا آفس میں رکھا ہوا نسخہ پڑھا جس میں شاہ میرا اور چک خاندانوں کے عہدِ حکومت کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ سرینگر میں جو نسخہ ہے وہ تلخیص ہے۔ اور ببلیوتھیکو نیشنل واقع پیرس میں جو نسخہ ہے اس کی تدوین مختصر کرنے کے بعد ہی کی گئی ہے۔ اس لئے بعض جگہوں پر واقعات کا تسلسل اور ان کی تفصیل بتانے میں دوسرے مسودوں سے میل نہیں کھاتا ہے۔

(ب) ہندوستان کی تاریخیں

نظام الدین کی "طبقاتِ اکبری" میں ایک حصہ کشمیر کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس میں زمانۂ قدیم سے اکبر کے فتحِ کشمیر تک کے حالات لکھے ہیں۔ نظام الدین نے میرزا حیدر کی "تاریخِ رشیدی" اور "تاریخِ کشمیر" کو اپنا مآخذ بنایا ہے، لیکن تاریخِ کشمیر کے مصنف کے بارے میں وہ بھی خاموش ہے۔ چونکہ اس نے کشمیر کی تاریخ سلطنتِ مغلیہ کے ایک صوبہ کی حیثیت سے لکھی ہے اس لئے تفصیلات سے پرہیز کیا ہے — واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان نہ کرنے کا عیب اس کتاب میں بھی ہے اور بعض اوقات ناموں سے اشخاص اور مقامات کا یقین مشکل ہو جاتا ہے۔

"تاریخِ فرشتہ" از محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی جو فرشتہ کے نام سے مشہور ہے، میں کشمیر سے متعلق بھی ایک باب ہے۔ لیکن عام طور پر مصنف کے پیشِ نظر "طبقاتِ اکبری" رہی ہے۔ اس لئے کوئی نئی بات نہیں لکھی ہے — زراعت، مذہب اور فنِ تعمیر سے متعلق معلومات "تاریخِ رشیدی" سے لئے ہیں۔

عبد القادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں کشمیر کے لئے الگ سے کوئی حصہ یا کم از کم باب بھی نہیں لکھا ہے۔ لیکن اکبر کے فتوحات کے سلسلے میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چک خاندان کے ساتھ اکبر کے سلوک کے بارے میں اس نے اچھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور کہیں کہیں کشمیر کے ادباء و فضلاء اور مشائخ کا تذکرہ کیا ہے۔

"معاصرِ رحیمی" کے نام سے عبد الرحیم خانخاناں کی سوانح عمری خواجہ عبد الباقی نہاوندی نے ۱۶۱۶ء میں مکمل کی۔ اس کا ایک حصہ تاریخِ کشمیر پر صرف کیا گیا ہے لیکن "طبقاتِ اکبری" کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس لئے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا ہے۔

محمد شریف نجفی کی "مجالس السلاطین" ہندوستان کی ایک مختصر تاریخ ہے۔

جسے ۲۸-۱۹۲۸ء میں مکمل کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے ایک حصہ میں رنچن (سلطان صدر الدین) کے اسلام قبول کرنے کے بارے میں تفصیلی تذکرہ ہے۔

امین احمد رازی کی "ہفت اقلیم" جغرافیائی قاموس کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ۱۵۹۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ میرزا حیدر کے فتح کشمیر کا حال مختصراً بیان کرتی ہے۔ کئی کشمیری شاعروں، مشائخ اور بادشاہوں کے بارے میں اجمال کے ساتھ لکھا ہے اور کشمیر میں شال بافی کی تجارت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

(ج) مغلوں کی تاریخیں

ابوالفضل نے اکبرنامہ میں میرزا حیدر کے دورِ حکومت کا ایک اہم تذکرہ کیا ہے تاہم اس نے ابوالمعالی اور قارہ بہادر کے کشمیر پر حملوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چک خاندان کے ساتھ اکبر کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور اکبر کے ہاتھوں وادی کے فتح ہونے کا حال بھی درج ہے۔ اس نے صحیح جغرافیائی حالات لکھے ہیں اور چند خامیوں کو چھوڑ کر اس کا یہ تذکرہ صحیح ہے آئینِ اکبری بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس میں کشمیر کے جغرافیائی حالات اور اس کے باشندوں کے رہن سہن پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہانگیر کے "تزکِ جہانگیری" میں کشمیر کی تاریخ، لوگوں کی عادات اور رسم و رواج کے بارے میں کافی اہم اشارے موجود ہیں۔

(د) وسطِ ایشیا کی تاریخیں

شرف الدین علی یزدی کا "ظفرنامہ" تیمور اور خلیل سلطان کی تاریخ ہے جسے ۲۵-۱۴۲۴ء میں مکمل کیا گیا ہے۔ اس میں سکندر اور تیمور کے ان روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے جب اس نے ہندوستان پر دھاوے بولے۔ اس کتاب میں کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن اور باشندوں کے بارے میں اختصار سے لکھا گیا ہے۔ "ملفوظاتِ تیموری" میں جسے عام طور پر تیمور کی خود نوشت کہا جاتا ہے، سلطان سکندر اور اس کے تعلقات اور کشمیر کے جغرافیہ کے بارے میں اشارہ کے طور پر کچھ کچھ لکھا گیا ہے۔ بابر کے خالہ زاد بھائی میرزا حیدر دوغلت نے "تاریخ رشیدی" کے نام سے مغلستان، کاشغر کے منگول بادشاہوں کی تاریخ ہے جو ۱۵۴۶ء میں مکمل ہوئی۔ میرزا حیدر نے کشمیر پر دو بار حملے کئے۔ پہلی بار ۱۵۳۲ء کے اوائل میں کاشغر سے آئے اور دوسری مرتبہ نومبر ۱۵۴۰ء میں لاہور سے حملہ کرکے فتح کیا اور دس سال حکومت کی۔ پہلے حملے کے حالات تو اس نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ دوسرے حملے کا حال اور انتظامِ حکومت کے بارے میں بہت ہی کم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تاہم اس نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر کشمیر کے فنِ تعمیر، زراعت، مذہب، آرٹ اور دستکاری کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بدقسمتی سے کشمیری امراء کی بغاوت نے اسے زندہ نہ رہنے دیا۔ ورنہ وہ کشمیر کی تاریخ کے سلسلے میں بہت ہی اہم معلومات بہم پہنچاتا۔

(ہ) سلاطینِ دہلی کی تاریخیں

اگرچہ کشمیر ثقافتی، تجارتی اور سیاسی اعتبار سے زمانۂ وسطیٰ میں بھی بقیہ ہندوستان سے اپنے روابط رکھتا تھا، لیکن سلطنت دہلی کے مؤرخوں نے تاریخ کشمیر کی طرف بہت ہی کم اشارے کئے ہیں۔ یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی نے اپنی "تاریخ مبارک شاہی" میں کشمیر کے علی شاہ اور جسرت کھوکھر کے درمیان کی آویزش کے بارے میں لکھا ہے۔ تاریخ داؤدی اور تاریخ خانجہانی میں اعظم ہمایوں اور میرزا حیدر کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے اور اُس وقت کے حالات لکھے ہیں جب امرائے کشمیر نے اسلام شاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے یہ غلط لکھا ہے کہ اعظم ہمایوں کشمیری امراء کے ہاتھوں سے مارا گیا جب کہ میرزا حیدر ابھی زندہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شیر شاہ اور امرائے کشمیر کے تعلقات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

(و) سیر و ملفوظاتِ مشائخ

حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ان کے ایک شاگرد نورالدین جعفر بدخشانی نے "خلاصۃ المناقب" [۲۳] کے نام سے لکھی۔ لیکن اس نے حضرت سید علی ہمدانی رح کے کسی بھی اس کارنامے کا تذکرہ نہیں کیا ہے جو انہوں نے کشمیر میں انجام دیا۔ اس کتاب کا جو نسخہ میرے مطالعہ میں آیا، وہ پہلے برلن لائبریری میں تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اُسے ٹوبن جن یونی ورسٹی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہاں کے لائبریرین نے بڑی مہربانی سے اُس کی فوٹو کاپی بھیج دی۔ جعفر بدخشانی کی دوسری کتاب "منقبت الجواہر" حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری سے متعلق ۱۳۷۸ء میں لکھی ہے۔

"تحفۃ الاحباب" میر شمس الدین کی سوانح عمری ہے جسے پندرہویں صدی کے وسط میں لکھا گیا ہے۔ میر شمس الدین نے کشمیر میں نوربخشیہ تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کے مصنف کا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن ایک بات اس کے بارے میں یہ معلوم ہوئی کہ اس کا باپ میر شمس الدین کا مرید تھا اور وہ خود نوربخشیہ تعلیمات کا بڑا سخت معتقد تھا۔ جب میر شمس الدین کشمیر آئے تو وہ ابھی

بچہ ہی تھا۔ بڑا ہُوا تو اُسے اُن کی صحبت میسّر ہوئی۔ میر شمس الدین کے کشمیر کے آنے کا تذکرہ اُس نے تفصیل سے کیا ہے۔ اُن مشکلات کا جائزہ لیا ہے جو میر شمس الدین کو اپنی تعلیمات عام کرنے کے سلسلہ میں پیش آئے۔ اس نے میر شمس الدین کی اُن کامیابیوں کو بھی بیان کیا ہے جو انہیں کشمیر اور بلتستان میں نصیب ہوئیں۔ تاہم اپنے ممدوح کو مجاہد السلام ثابت کرنے کے لئے اس کی بُت شکن کارروائیوں کی خیالی رُوئیداد لکھی ہے۔ اس کے باوجود کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس کے مطالعہ سے کشمیر میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار، سیاسی تاریخ کی جھلکیاں، باشندوں کی سماجی زندگی کی مختصر سی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ اس کتاب کا جو نسخہ میں نے پڑھا ہے وُہ میر شمس الدین کے خاندان کے چشم و چراغ آغا سید محمد یوسف (شیعہ) مجتہدِ کشمیر نے عنایت فرمایا۔ انہوں نے مجھے کتاب اس زمانہ میں عنایت کی جب میں ۱۹۵۲ء میں کشمیر میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ کتاب کا دوسرا نسخہ اُن کے ایک رشتہ دار کے پاس ہے جو اب اسکردو میں بستے ہیں۔

"ہلالتہ العارفین" کے نام سے حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح عمری ان کے ایک مُرید خواجہ اسحاق قاری نے لکھی ہے۔ اگرچہ کتاب بہ حیثیتِ مجموعی حضرت سلطان العارفین رح کی کرامات اور خوارق العادات باتوں پر مشتمل ہے، لیکن پھر بھی اس کے پیچھے سے کشمیر کی سماجی زندگی کی دُھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے۔ مُلّا علی رینہ نے ۱۵۸۷ء میں "تذکرۃ العارفین" کے نام سے حضرت سلطان العارفین رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھی۔ یہ کتاب معاشرتی اور مذہبی زندگی کے بارے میں اہم مواد کی حامل ہے۔

نورُ اللہ شستری نے "مجالس المومنین" کے نام سے شیعہ اہلِ کمال اصحاب کے سوانحی خاکے مرتب کئے جس میں مختصراً حضرت سید علی ہمدانی رح اور محمد نور بخش کے حالاتِ زندگی درج ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ محمد نُور بخش کی تعلیمات کا تعارف کشمیر اور بلتستان میں کیسے ہُوا۔

(۳) زمانۂ مابعد کی فارسی تصانیف

(الف) تواریخ کشمیر

ایک کشمیری برہمن پنڈت نارائن کول عاجز نے اپنی کتاب "تاریخ کشمیر" سنہ ۱۷۱۰ء میں مکمل کی۔ اس میں زمانۂ قدیم سے لے کر سنہ ۱۷۱۰ء تک کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب حیدر ملک کی کتاب کا خلاصہ پیش کرتی ہے اور کوئی خاص بات اس میں نہیں لکھی گئی ہے۔

سنہ ۱۷۲۳ء میں عبا رفیع الدین احمد نے شاہ جہاں آباد میں "نوادر الاخبار" کے نام سے کشمیر کی تاریخ لکھی۔ مؤلف کے آباؤ و اجداد بلخ سے آئے ہیں، لیکن وہ خود کشمیری نژاد تھا۔ مصنّف نے ہندو راجوں، مہاراجوں کا تذکرہ مختصراً کیا ہے، لیکن سلاطین کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہے۔ یہ ان حقائق کی تائید کرتی ہے، جو "بہارستانِ شاہی" اور حیدر ملک کی تاریخ میں درج ہیں۔ لیکن ان ترقیوں کا بیان مؤلف نے نہیں کیا ہے جو حیدر ملک کی کوششوں کا نتیجہ عمل ہیں۔ سلاطین کی غیر مُسلم رعایا سے متعلق پالیسی کا اس نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ یہ تفصیل ہر لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ تسلسل قائم رکھنے میں حقیقت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا ہے۔ مثلاً مؤلف یُوسف شاہ خان اور یُوسف چک کو ایک ہی وجود سمجھتا ہے اور یعقوب شاہ کو یعقوب خان کا نام دینے کی غلطی کرتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس بات میں مُضمر ہے کہ اس نے وادیٔ کشمیر میں سُنی روایات کو قائم رکھا، لیکن تخت نشینی کے جھگڑوں میں اُس نے مذہبی وجوہ کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی کہ ان کو نہ دینی چاہیئے تھی۔

محمد اعظم نے اپنی کتاب "واقعاتِ کشمیر" سنہ ۱۷۴۷ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب اس سے پہلی لکھی ہوئی کتابوں کی تلخیص ہے۔ لیکن سیاسی تاریخ لکھنے کے ساتھ ساتھ اس نے سلاطین کے دَور کے مشائخ و صوفیا اور علماٗ کے بارے میں بہت اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

بدی الدین ابو القاسم نے "گوہرِ عالم" کے نام سے زمانۂ قدیم سے لے کر سنہ ۱۷۸۶ء تک، کی تاریخ کشمیر لکھی ہے۔ مؤلف کو اس کا اعتراف ہے کہ اُس نے نُور نامہ حسن قاری اور محمد اعظم کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا اسلوبِ بیان مرصع اور پیچیدہ ہے اور کہیں کہیں ایسی باتیں لکھتا ہے جن کی تائید دوسری کتابوں سے نہیں ہوتی ہے۔

عبد القادر خان نے اپنی کتاب "حشمتِ کشمیر" سنہ ۱۸۳۰ء میں بنارس میں مکمل کی۔ مؤلف نے اپنی کتاب کے لئے "گوہرِ عالم" کو مآخذ مانا ہے اور اس میں ضمناً تبت، بدخشاں اور دوسرے ہمسایہ ممالک کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اُنیسویں صدی میں "حشمتِ کشمیر" کے علاوہ کئی دوسری کتابیں بھی اس سلسلہ میں لکھی گئی ہیں[۱۹] لیکن ان تمام میں سے "تاریخ حسن" از پیر حسن شاہ (المتوفی ۱۸۹۸ء) اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ تمام دوسری کتابیں حیدر ملک کی تاریخ کا چربہ ہیں۔ "تاریخ حسن" کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کشمیر کے جغرافیہ، مسلمانوں کی یادگاریں، ذات پات، قبیلے اور مذہبی

فرقوں سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر مؤلف نے اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں۔ ہندو بادشاہوں کے دَور کے لئے کلہنا کی " راج ترنگنی " سے مواد لیا ہے اور سلاطین کے دَور کے لئے "بہارستان شاہی " سے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا ہے اور اس کے ساتھ حیدر ملک، نظام الدین اور ابوالفضل کی تصانیف کو بھی زیرِ نظر رکھا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں مشائخ کے سیر و ملفوظات ہیں جس کے لئے بعض تذکروں اور مقامی روایات سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔ چوتھا حصہ فارسی شاعری کے بارے میں ہے۔ اس شاعری نے سلاطین کے دَور اور مغلیہ بادشاہوں کے دَور میں جو ترقی کی، اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا ہر حصہ اہم ہے۔ یہ سہل، شستہ اور صاف پیرایہ میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔

(ب) مغلیہ دَور میں دوسرے صوبوں کی تاریخیں

آخری مغل تاجداروں کے زمانہ میں لکھی ہوئی تاریخوں میں سے صمصام الدولہ کی "معاصر الامراء" کے بغیر باقی تمام تاریخیں ہمارے لئے غیر اہم ہیں۔ اس کتاب میں ضمناً کشمیر پہ میرزا حیدر اور عبدالمعالی کے حملوں اور آخر میں اکبر کے اسے فتح کرنے کا حال درج ہے۔ صوبوں کی تاریخوں میں سے تین کا تذکرہ کرنا کافی ہوگا۔ "احوالِ کشتواڑ " ۸۳ — ۱۸۸۲ء "تاریخ راجگانِ جموں " یا "راج درشنی " ۱۸۴۲ء میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ راجگانِ راجوری " ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ ان میں تاریخ کشمیر کا تذکرہ ضمناً موجود ہے۔ انہوں نے اپنا مواد قصص و روایات سے لیا ہے، اس لئے تاریخی اعتبار سے اہم نہیں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جموں، کشتواڑ اور راجوری عرصۂ دراز تک سلاطین کشمیر کے ماتحت تھے، لیکن ان کتابوں میں ان واقعات کا تذکرہ بھی موجود نہیں۔

(ج) ملفوظاتِ مشائخ

"تذکرۂ مشائخ کشمیر" میں بابا نصیب نے حضرت شیخ نور الدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے مریدوں کی اُس سعی و عمل کو بیان کیا ہے جو انہوں نے کشمیر میں اسلام کے پھیلانے کے سلسلہ میں کیا۔ مسلمان مشائخ اور برہمن پروہتوں کے درمیان جو مناظرے ہوتے تھے، انہیں دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری کتاب "مجموعہ دار النصاب مشائخ کشمیر" ہے۔ رِن چانا (سلطان صدر الدین) سے موسیٰ رینہ کے زمانہ تک جیسے جیسے اسلام پھیلا، اس کا حال مختصراً اس میں درج ہے۔ سیاسی پہلو پر بھی ساتھ ہی ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے — عبدالوہاب نے "فتوحاتِ کبروی" ۱۷۴۹ء میں لکھی۔ رِن چانا (سلطان صدر الدین) سے اکبر کے زمانہ تک کشمیر میں اشاعت اسلام کی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ سلاطین کی تاریخ اس میں مختصر طور پر بیان کی گئی ہے۔ حضرت سید علی ہمدانی رح ان کے فرزند ارجمند حضرت سیّد محمد اور دوسرے مشائخ کے سوانحی خاکے اس میں دیئے گئے ہیں۔ داؤد مشکواتی نے ۱۶۵۴ء میں "اسرار الابرار" لکھی ہے — "خوارق السالکین" جو "تاریخ ہادی" کے نام سے مشہور ہے ۹۸ — ۱۶۹۷ء میں مکمل ہوئی۔ "نُور نامہ" جسے بابا نصیب الدین غازی نے حضرت شیخ نور الدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھ کر ۳۱ — ۱۶۳۰ء میں مکمل کیا۔ معین الدین مسکین کی تاریخ کبیر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کتابوں میں ہمیں تاریخی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور سماجی زندگی کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔

(۴) کشمیری ادب — لوک گیت اور کہانی

زمانۂ وسطیٰ میں کشمیری زبان ادب کے لحاظ سے بہت مال دار تھی۔ لیکن شومئ قسمت سے اب بہت کم زمانہ کی دست بُرد سے اس کا ادب بچ سکا ہے۔ للہ دَید کے گیتوں کو بارنٹ اور گیریرسن نے جمع کیا اور پھر ان کا ترجمہ کیا ہے۔ جے الکول نے حضرت شیخ نور الدین نورانی رح کے کچھ صوفیانہ کلام اور حبہ خاتون کی غزلوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان سے زمانۂ وسطیٰ کے معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ لارنس، ناولز، گیریرسن اور دوسرے یورپین سیاحوں نے لوک گیت اور کہانیاں جمع کیں اور یہاں کے رسم و رواج کو نقل کیا ہے۔ ان تحریروں سے باشندوں کی عادات و اطوار اور رسوم و رواج کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(۵) اہلِ یورپ کی لکھی ہوئی تاریخیں

شاہ میر اور چک خاندان کے دَوروں میں کسی بھی اہلِ یورپ کو کشمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ فادر جروم اکساویر اور بینی ڈکٹ، ڈی گوئس وہ پہلے یورپین ہیں جنہوں نے اکبر کی معیت میں ۱۵۹۷ء میں کشمیر کی زمین پر قدم رکھا۔ اُنہوں نے اپنے تاثرات، جو مختصر طور پر قلم بند کئے ہیں وہ ہمارے لئے بہت اہم ہیں۔ فرانسس کو پلسرٹ نے کشمیر کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بہت مختصر ہے، لیکن اورنگ زیب کی معیت میں آنے والے برنیر نے یہاں کی معاشرتی اور معاشی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ فادر ڈیزہی ڈیری کا بیان اس لئے اہم ہے کہ اس نے کشمیر کی تجارت کے بارے میں معلومات بہم پہنچائے ہیں اور فادر فرائر نے بہت خوبی کے ساتھ سماجی زندگی پر روشنی ڈالی ہے — اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے یورپین سیاحوں کے تاثرات اس لئے اہم

ہیں کہ اُنہوں نے پُرانی روایات کو نقل کیا ہے اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر کچھ ایسی جگہوں کے شناخت کرنے میں مدد ملتی ہے جو اب باقی نہیں ہیں یا جن کے نام بعد میں بدل دئے گئے ہیں۔

(۹) آثارِ قدیمہ کی شہادت

اس عہد کے بارے میں آثارِ قدیمہ سے بہت کم شہادتیں ملتی ہیں۔ جو سکّے اب تک ہاتھ آئے ہیں وہ ہمیں سُلطانوں کے نام اور القاب بتاتے ہیں، لیکن ان سے بادشاہوں کا تسلسل قائم کرنا ناممکن ہے۔ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ پرُانی تعمیرات بہت کم ہیں۔ ان محلات، مساجد اور خانقاہوں میں سے، جو سلاطین کے دَور میں تعمیر ہوئے، اکثر تخت نشینی کے جھگڑوں اور بیرونی حملوں کی نذر ہوگئے ان میں سے صرف مزارِ سلاطین، مقبرہ اور مسجد مدنی بچی ہوئی ہیں، لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ دوسری عمارات میں سے بعض یا تو دوبارہ تعمیر کی گئی ہیں، یا بعد کے زمانہ میں بعض کی بہت زیادہ مرمت کی گئی ہے۔ اس دَور کے جو چند کتبے دست یاب ہوئے ہیں وہ ہماری تاریخی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتے ہیں۔

حواشی ماخذ تاریخ کشمیر

تاریخ سلاطینِ کشمیر کا ایک باب

۱؎ سری وارا، کتاب ۱، باب ۵، حواشی صفحہ ۳

۲؎ ان کے بارے میں تذکرہ آگے آرہا ہے۔

۳؎ قاری کی تاریخ اب دست یاب نہیں ہوتی ہے اور بعض لوگ محمد اعظم کی کتاب "واقعاتِ کشمیر" کو قاری کی تاریخ سمجھ بیٹھے ہیں جو غلط ہے۔

۴؎ جونا راجا ۱۱

۵؎ اسٹین ۱، صفحہ نمبر ۲۷۲

۶؎ کشمیر از جناب صوفی صاحب، ۱، صفحہ نمبر ۱۶۷

۷؎ سری وارا، صفحہ نمبر ۲۳۱

۸؎ اسٹین

۹؎ سری ورا، صفحہ نمبر ۹۹

۱۰؎ انڈسیچی اسٹڈین (مطالعۂ ہند) ۸، صفحہ نمبر ۲۹۸ ؛ ۳۰۰

۱۱؎ 〃 〃 〃 صفحہ نمبر ۳۳۷، ۳۴۱

۱۲؎ 〃 〃 〃 〃 ۲۹۲

۱۳؎ انڈسیچی اسٹڈین (مطالعۂ ہند) صفحہ نمبر ۲۹۲، ۲۹۳

۱۴؎ اسٹین ۱، صفحہ نمبر ۲۷۶

۱۵؎ مطالعۂ ہند ۸، صفحہ نمبر ۳۰۲

۱۶؎ 〃 〃 صفحہ نمبر ۳۴۲

۱۷؎ 〃 〃 〃 ۳۴۸

۱۸؎ 〃 〃 〃 ۳۶۹

۱۹؎ "کشمیر" از جناب صوفی صاحب کے مطابق محمد شاہ کے پہلے دَورِ حکومت میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ کتاب میں محمد شاہ کے جانشینوں کے نام اور چک خاندان کے بادشاہوں کے نام یوسف شاہ تک دئے گئے ہیں۔ مسودہ پر کوئی ایسی تاریخ تحریر نہیں ہے۔ لیکن سید مبارک اور لوہار شاہ ناموں کی غیر موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ ۱۵۷۹ء کے اوائل میں جب کہ یوسف شاہ پہلی بار تخت پر بیٹھا، لکھی گئی ہے اور اس کا یہ دَور دو مہینے کا رہا۔

۲۰؎ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حیدر ملک کا دادا ہے۔ حیدر ملک کی تاریخ کے مسودہ میں اس کا نام کمال الدین لکھا گیا ہے، لیکن متذکرہ کتاب میں اس کا نام جلال الدین بتایا جاتا ہے۔ مگر شاید یہ کتابت کی غلطی ہے!

۲۱؎ بینی پرشاد کا دعویٰ ہے کہ نظام الدین نے جو تاریخ کشمیر پڑھی وہ "راج ترنگنی" کا فارسی ترجمہ تھا، لیکن یہ دعویٰ پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ نظام الدین نے فارسی کتابوں کو بھی ماخذ کی حیثیت دی ہے، کیونکہ اس کے بیانات سنسکرت تاریخوں سے پورے طور پر مطابقت نہیں رکھتے ہیں اور شاہ میر کے آخری بادشاہوں اور چک خاندان کے بارے میں فارسی کتابوں سے استفادہ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ شُکا نے ۱۵۹۶ء میں کتاب لکھی جب کہ "طبقاتِ اکبری" کا مصنف اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا تھا۔

۲۲؎ حضرت سید علی ہمدانی رح کے بارے میں کئی اور کتابیں بھی ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ اس باب میں کیا گیا ہے اوروں کے نام کتابیات کے تحت درج ہیں

۲۳؎ اسٹوری نے ببلیوگرافیکل سروے آف پرشن لٹریچر ۱، ۳، صفحہ ۶۸۴ تا ۶۸۷ پر کئی اور کتابوں کے نام دئے گئے ہیں۔ لیکن وہ تمام حیدر ملک کی تاریخ کی تلخیص ہیں۔

عبدالاحد آزاد
ترجمہ : مقبول احمد سید

ایک نظم [1]

میرے محبوب میں ترے صدقے
فرصتِ شوق و غمِ عشق کسے
کیسۂ زر ہی سے ہے رونقِ زیست
میں کہ ہوں کیسۂ مفلسی کی طرح
بے زر و بے درم و زار و زبوں
شوق فکر و غمِ دل کیسے رکھوں
تجھ کو رخسار کی تزئیں کا خیال
تجھ کو کاکل کے خم و پیچ کا غم
میری آنکھیں غمِ امروز سے نم
تیرے ہاتھوں میں حسیں دستۂ گل
میرے ہاتھوں میں ہے ہل کی ہتھی
تیرے پیروں میں ہے زرّیں خلخال
اور مرے پاؤں گِل آلودہ، نڈھال
تو ہے انبارِ طلا کا مالک
سود در سود کے پھندے میں اسیر
میں تہی دست و تہی کیسہ فقیر
مجھ کو بے کار ہی جینا ہے ضرور
حاکمِ وقت کی مرضی ہے یہی
میرے پیروں میں ہے زنجیرِ گراں
تو ہے بوئے گلِ تر، سروِ رواں
میرے محبوب میں ترے صدقے
فرصتِ شوق و غمِ عشق کسے!

[1] "مدن وارو گگہ پاڑی" (دسنگرمالا حصہ دوم) کے چند بندوں کے خیال کا ترجمہ

بلجی ناتھ پنڈت

کشمیر میں فلسفۂ شو

(نمبر: ۲)

بودھ فلسفہ کی خاص خامی یہ ہے کہ اگر لمحہ تک ٹھہرنے والے وِگیانوں کے سلسلے کا کوئی مستقل آسرا نہیں تو جس بات کو ایک وِگیان نے جان لیا اُس بات کی یاد دوسرے وگیان کو ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ جاننا اور یاد پڑنا یہ دونوں ایک مشترکہ چیز میں ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی چیز کو الف نے دیکھا تو ب کو وہ چیز یاد نہیں پڑ سکتی، الف کو ہی اُس کی یادداشت ہو سکتی ہے؛ یادداشت اگر نہ ہو تو دُنیا کا کوئی بھی کاروبار نہ چلے۔ مگر کاروبار چلتا ہے اور یادداشت ہوتی ہے۔ اس واسطے چاہے بودھ پسند کریں یا نہ کریں، مگر اُن کو ضرور ماننا پڑے گا کہ لمحہ بہ لمحہ بدلنے والے وِگیانوں کے سلسلوں کے کوئی آسرے بھی ضرور ہستی رکھتے ہیں جو اُن الگ الگ وِگیانوں کے کاروباروں کو ملاتے ہوئے دُنیا کا کام چلاتے رہتے ہیں۔ بودھوں کا نِروان ایک ایسی حالت کا نام ہے جسے کوئی بھی عاقل آدمی تسلیم نہیں کرے گا۔ کیونکہ کون عقل مند یہ چاہے کہ اُس کی ہستی ہی ختم ہو جائے۔ دُنیا کو وگیان کی داستانوں کی تصویریں کہنا بھی عقل مندوں کو ٹھیک معلوم نہیں پڑتا۔ آخر یہ دُنیا قائم ہے۔ کون اس کی ہستی سے انکار کر سکتا ہے؟

فلسفۂ ویدانت کے خلاف شِو شاستر یہ کہہ سکتا ہے کہ جب مایا اور اوِدیا دونوں خود ہی جھوٹی چیزیں ہیں تو اُن کے آسرے پر دُنیا کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔ جس چیز کی خود کوئی ہستی ہی نہیں اُس چیز کے اثر سے اتنی عجیب، غریب دُنیا کیسے وجود میں آ سکتی ہے۔ پربرہم تو ہمیشہ ست چت آنند ہیں۔ وہ انتہائی درجے کے پاک ہیں۔ مایا اور اوِدیا دونوں ناپاک ہیں۔ ان ناپاک چیزوں میں وہ طاقت کہاں سے آسکے کہ پاک ہستی پر اپنا اثر ڈال سکیں اور اگر پربرہم پر بھی ان کا اثر پڑ سکتا ہے تو وہ کس بات کے پربرہم ٹھہرے۔ پھر تو وہ بھی ایک دُنیائی رُوح جیسے ہی ثابت ہو سکتے ہیں؛ اس واسطے پربرہم پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اب اثر پڑتا دُنیائی رُوح پر۔ مگر پربرہم کو چھوڑ کر رُوح وغیرہ کسی بھی چیز کی کوئی حقیقی ہستی ویدانت میں مانی ہی نہیں گئی ہے۔ اس واسطے دُنیا کا مسئلہ ویدانت کے ذریعے حل نہیں ہو سکتا۔ وہ پربرہم اگر نہ کچھ کرتا اور نہ کراتا ہے۔ اگر وہ آکاش کی طرح بالکل شانت ہے تو اُس میں آنند کاہے کا۔ اس بات کو سبھی جانتے ہی ہیں کہ آنند میں ایک عجیب و غریب ہل چل سی ضرور رہتی ہے۔ اس لئے اُس کا آنند بھی نام کا ہی آنند ثابت ہوتا ہے۔ جس ہستی میں اُمنگ نہیں وہ ہستی بے جان ہستی کے ہی برابر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جان خود اُمنگ ہی تو ہے، اس لئے شانت پربرہم ایک مہان آکاش جیسی بے جان چیز ہی ثابت ہوتا ہے۔ اگر مایا، اوِدیا اور دُنیا اور رُوح سب جھوٹی چیزیں ہیں اور اگر حقیقت میں یہ چیزیں ہیں ہی نہیں تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا اور پھر مسئلہ ہی کون اور کیسے؟ اگر کوئی مسئلہ سامنے نہیں تو ویدانت جیسے فلسفہ کی بھی کیا ضرورت؟ جب کوئی چیز دراصل ہے ہی نہیں تو ویدانت خود بھی ہے ہی نہیں، مرشد کوئی نہیں اور شاگرد کوئی نہیں — مگر یہ چیزیں سب ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ہی تو ویدانت کا فلسفہ سیکھا جاتا ہے اور سکھایا جاتا ہے۔ اس واسطے یہ کہنا کہ دُنیا وغیرہ ہے ہی نہیں، صرف اسے نظر انداز کر دینا ہی ہے۔ مگر جس وقت بھوک پیاس وغیرہ ستاتی ہے اُس وقت تک کوئی بھی دُنیا کے وجود کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وِیشنو فلسفہ میں بھگوان جیو اور دُنیا کو الگ بھی مانا گیا ہے اور تینوں کو ایک بھی مانا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے ممکن ہو سکتی ہیں۔ اس

بات پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ بھگوان کو کسی خاص جسم والا اور خاص شکل والا ماننا بھی ٹھیک معلوم نہیں پڑتا۔ نجات کی حالت ایک قسم کے بہشت میں رہنے کی سی حالت ثابت ہوتی ہے۔ اس واسطے اس فلسفہ سے بھی سمجھدار آدمی کو پوری تسلی نہیں ہو سکتی۔ ویشنو فلسفہ میں ایک اور خامی یہ رہ گئی ہے کہ اس فلسفہ کی نشوونما فلسفہ کے طرز پر نہیں ہوئی ہے بلکہ پورانک ڈھنگ پر ہی ہوئی ہے۔ عقلمند آدمیوں کو پُران سے کبھی تسلی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ پُران ان پڑھ لوگوں کے لئے بنے ہیں، ودوانوں کے لئے نہیں۔ یہ ہی خامیاں دکھن کے شیو شاستر میں بھی ہیں۔ اگرچہ اُس کی نشوونما ویشنو شاستروں کی نسبت کافی مقدار میں ہوئی ہے۔ دونوں ویشنو اور شیو اکثریت کو ہی مانتے ہیں، وحدت کو نہیں۔ صرف مدھ آچاریہ وحدت کے حامی ہیں۔

شیو شاستر کے اصول کے مطابق سیکھنے والے شاگردوں کی علمی، عقلی اور رُوحانی حیثیت کے مطابق تمام درشن اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہی ہیں۔ دُنیا کے لوگوں کی ذہانت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اگر سب کو ایک ہی فلسفہ سکھایا جائے تو کوئی کوئی بشر اُس کو سمجھ سکے گا۔ مگر زیادہ تر لوگ اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے۔ اس واسطے بھگوان نے دُنیا کی رُوحوں پر مہربان بنتے ہوئے بہت قسم کے شاستر رِشیوں، مُنیوں، سنتوں اور فقیروں کے ذریعے کہلوائے اور سکھوائے ہیں۔ جس کی جتنی طاقت ہو وہ اُتنے درجے کے شاستر کو پڑھ سکتا ہے اور اُس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے وہ آگے اُونچے اُونچے درجے کے شاستروں کو بھی پڑھ کر اور آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس واسطے شاستروں کی آپس کی اختلاف رائے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ شیو شاستر کا اصول ہے۔

فلسفۂ شیو نے سب مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی بات کو تصوّر نہیں کیا ہے کیونکہ تصوّر انسانی عقل کا کام ہے اور انسانی عقل محدود ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کا تصوّر ٹھیک ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو۔ اس واسطے شیو شاستر اپنے اصولوں کو انسان کے اپنے تجربے سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اُس کے مطابق ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ وہ ہے، اس واسطے وہ ہے۔ یہ دُنیا بھی تبھی ہے جب اس کو جان دار ہستیاں جانتی ہیں کہ یہ ہے۔ بے جان چیز ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہے۔ کیونکہ ہونا اور ہونے کا علم ہونا اور اُس علم کے تغیر کا بھی احساس کا ہونا یہ جان دار کا کام ہے۔ جان دار میں چیتنا ہے۔ چیتنا کو ہمیشہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہے۔ گویا وہ ہمیشہ اپنی ہی چمک سے خود چمکتی ہے۔ دیگر چیزیں بھی اُسی کی چمک سے چمکتی ہیں اور اُسے چمکنے کے لئے کسی کی عنایت کی ضرورت نہیں۔ چیتنا چمکتی ہے اور اُسے اپنے چمکنے کا احساس بھی ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کے چمکنے کا نام پرکاش ہے اور احساس ہونے کا نام ومرش ہے۔ چیتنا کو سموِت کہتے ہیں۔ تو سموِت ضروری ہے۔ جاگنے کی حالت میں، خواب کی حالت میں اور بغیر خواب والی نیند کی حالت میں بھی سموِت ہوتی ہی ہے۔ سموِت میں ہمیشہ ہی ایک اُمنگ رہتی ہے جس سے وہ ہمیشہ جاننے کے لئے اور کرنے کے لئے فطرتاً راغب رہتی ہے۔ ایک شیرخوار بچہ بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ جانتا اور کرتا رہتا ہے۔ جاننا اور کرنا جیو کی چاہ کی دو صورتیں ہیں۔ انسان کے دِل میں جب حقیقت کو سمجھنے کی چاہ بہت تیز ہو جاتی ہے تو وہ اُس لگن میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اُس کی عقل بھی کہیں غائب سی ہو جاتی ہے۔ ابھی تک تو انسان کی چیتنا یا سموِت عقل کے آئینے کے ساتھ ساتھ ہی چمکتی تھی۔ مگر اب اُس آئینے کے غائب ہو جانے پر وہ سموِت صرف اپنے شدھ پرکاش سے ہی خود بخود چمکنے لگ جاتی ہے۔ اس چمک کو ہی درشن کہتے ہیں اور جسے ایسی چمک کا تجربہ ہو جائے اُسے رِشی کہا جاتا ہے۔ اس درشن میں دیکھی ہوئی بات کو بعد میں وہ رِشی یاد کر کر کے عقل اور زبان کی طاقت سے لوگوں کو، جہاں تک ہو سکے، سمجھاتا ہے۔ مگر ان طاقتوں کے ذریعے اُس کا پورا سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں۔ اس واسطے سمجھنے والے کو بھی کوشش کر کے اُسی حالت پر پہنچنا پڑتا ہے تب اُسے بھی حقیقت کا درشن ہو جاتا ہے۔ اور وہ بھی رِشی بن جاتا ہے۔ اس قسم کے درشن کی ہی بنا پر ہندوستان میں فلسفہ کو درشن نام دیا گیا ہے۔

تو اس قسم کے درشن کا کافی ابھیاس کر کے اُس کی بنا پر فلسفۂ شیو کے آچاریوں نے کہا ہے کہ جیو کی سموِت دراصل لامحدود ہے۔ ہر ایک جیو میں ایک ہی سموِت کام کرتی ہے۔ شدھ سموِت میں دُنیائی سُکھ دُکھ وغیرہ کا نام بھی نہیں۔ وہ تو شدھ پرکاش اور شدھ ومرش کا مِلا جُلا رُوپ ہے۔ وہ ہے اور ہمیشہ ہے؛ وہی ہے۔ ساری دُنیا اُسی میں ہے۔ اُس میں دُنیا، دُنیا کی شکل میں نہیں بلکہ سموِت کی ہی شکل میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ جس طرح ایک بیج کے دانے میں سارا پودا یا سارا درخت موجود رہتا تو ہے مگر بیج کی

ہی صورت میں پودے یا درخت کی صورت میں نہیں۔ سموت کے سمندر میں دُکھ سُکھ وغیرہ کی مد و جزر کی لہریں نہیں ہیں۔ اس واسطے وہ شانت ہے۔ مگر اتنی شانت بھی نہیں کہ اُسے بے جان کہا جائے۔ اُس کے اندر ایک اُمنگ جیسی ہل چل ہمیشہ رہتی ہی ہے۔ یہی اُس کی چیتنا یا Consciousness ہے۔ اس ہل چل کی وجہ سے وہ ہمیشہ کلپنا (تصوّر) کرتی رہتی ہے۔ اس تصوّر کی وجہ سے اُس کے اندر ہی دُنیا کی ایک دھیمی سی شکل کھِچ جاتی ہے۔ مگر اُس شکل میں اور سموت میں فرق ہوتے ہوئے بھی آپس میں وحدت ہی رہتی ہے۔ وہی کلپنا جب ذرا بڑھ جاتی ہے تو دُنیا مفعول کی شکل میں اور سموت فاعل کی شکل میں چمکنے لگتی ہے۔ اس حالت میں دُنیا سموت سے الگ، دُنیا کی ایک چیز دوسری چیز سے الگ اور ایک جسم کی سموت دوسرے جسم کی سموت سے الگ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس طرح سے سموت اپنے آپ کو محدود کر کے ایک دُنیائی رُوح جیسی بن جاتی ہے اور اچھے اور بُرے کرم کرنے لگتی ہے۔ بہت مدّت تک ایسا کرتے ہوئے بعد میں کسی مردِ کامل کی عنایت سے دُنیائی رُوح کو روحانیت کی تربیت مِل جاتی ہے۔ رُوحانیت کے راستے پر چلتے چلتے اور ترقی کرتے کرتے اُسے بھی وہی حالت ہو جاتی ہے جو پُرانے رِشیوں کو ہوئی تھی۔ جیسے کسی غربت سے ستائے ہوئے آدمی کو کسی طرح یاد پڑ جائے کہ اُس کے گھر میں ہی بڑا بھاری خزانہ ہے، تو جھٹ اُسے غربت کی تکلیفیں چھوڑ دیتی ہیں اور وہ بڑا امیر بن جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ امیر ہی تھا، مگر اپنی امیری کو بھُول کر غریبی کی تکلیفوں کا شکار بنا ہوا تھا اور اب اپنی امیری اُسے یاد آ جاتی ہے اور غریبی سے اُسے نجات مِل جاتی ہے۔ اُسی طرح ایسے انسان کو بھی تب یاد پڑ جاتا ہے کہ وہ تو لامحدود ہے۔ یہ ساری دُنیا اُس کا اپنا ہی تصوّر ہے۔ تصوّر سے ہی اُسے اپنی ذات دُنیائی رُوح جیسی معلوم ہوتی تھی۔ مگر دراصل وہ لامحدود اور پاک سموت ہی ہے اور کچھ نہیں۔ ایسی یاد یا اس قسم کی اپنی پہچان کا ہی نام نجات ہے اور ایسی پہچان کا نہ ہونا اور دُنیائی رُوح کی حالت میں ہونا ہی قید ہے۔ دراصل یہ قید اور یہ نجات دونوں ہی سموت دیوی کے تصوّر ہیں اور کچھ نہیں۔ قید کا تصوّر کرتے ہوئے اور نجات کا تصوّر کرتے ہوئے دونوں حالتوں میں سموت اپنا حقیقی صورت سے ذرا بھر بھی گرتی نہیں۔ یہی تو اُس کی وہ طاقت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ تصوّر کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنانا ہی خدائیت ہے۔ یہ خدائیت یا ایشورتا ہر ایک رُوح میں کسی نہ کسی حد میں موجود رہتی ہے

اِس لئے ہر ایک رُوح ایشور ہی ہے، مگر محدود ہے۔ درشن کے ذریعے اپنی لامحدود حالت کے پہچان لینے پر رُوح کی ایشورتا یا خدائیت بھی لامحدود بن جاتی ہے۔ اس لئے تب وہ پرم ایشور بن جاتا ہے۔ بنتا کیا ہے، پرمیشور ہی تھا اور ہے۔ صرف بھُولی ہوئی پرمیشورتا اُسے یاد آ جاتی ہے۔ اس مباحثہ کا خلاصہ یہ ہے کہ پرم ایشور اپنی شکتی کے بوتے پر ہمیشہ ہی حدبندی کا تصوّر کرتا ہوا ایک طرف سے دُنیائی رُوح کی صورت میں اور دوسری طرف سے بے جان دُنیا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہی اپنی لامحدودی کو پھر سے پہچانتا ہوا اور حدبندی کے تصوّر کو پھر سے مٹاتا ہوا درشن کے تجربے سے رِشی بنتا رہتا ہے۔ اس طرح سے قید کو اور نجات کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس قسم کے سوال کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ یہ اُس کی فطرت ہے اور یہی اُس کی خدائیت ہے۔ اگر اُس میں یہ فطرت نہ ہوتی تو وہ ایک ہوتا۔ اور کوئی شخص یا کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ وہ بھی خود ہوتا یا نہ ہوتا، اس بات کا فیصلہ بھی کون کرتا۔ مگر وہ ہے اور پرم ایشور ہے۔ اس لئے اپنی پرم ایشورتا کی مستی میں دُنیا کا تصوّر کرتا رہتا ہے۔ اس دُنیا میں بے شمار رُوحوں کی صورتوں میں خود اُترتا رہتا ہے اور خود ہی پرم ایشور کی حالت پر پھر چڑھتا ہی رہتا ہے۔ ہمیشہ بے شمار صورتوں میں چڑھتا اور اُترتا رہتا ہے۔ چڑھنے اور اُترنے کے بے شمار درجوں میں وجود میں آتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ دُنیا اتنی عجیب و غریب ہے۔ یہ ساری ہی چڑھنے اور اُترنے کا اُس کا ایک لامحدود کھیل سمجھئے۔ اس دُنیائی روح کی حالت میں بھی وہ ہمیشہ تصوّر کرنے میں لگا ہی رہتا ہے کیونکہ یہ اُس کی فطرت ہے۔ آگ کا چھوٹے سے چھوٹا انگارہ کیوں نہ ہو، وہ آگ ہی ہوتا ہے۔ اُس کی فطرت آگ کی فطرت ہوتی ہے۔ اسی طرح رُوح کی فطرت پرم ایشور کی ہی فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کسی رُوح میں یہ فطرت تھوڑی مقدار میں اور کسی کسی روح میں زیادہ مقدار میں ظاہر ہوتی ہے کیونکہ چڑھنے اور اُترنے کے کھیل کے میدان میں کوئی رُوح کسی سیڑھی کے کسی درجے میں اور کوئی رُوح کسی اور سیڑھی کے کسی اور درجے میں پڑی رہتی ہے نہیں تو دراصل سب کچھ پرم ایشور ہی ہے۔

اس کھیل کے میدان کے ۳۶ درجے مانے گئے ہیں۔ اُن ۳۶ کو بھی تین حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصہ بالکل وحدت کا حصہ ہے۔ اُس کے دو درجے ہیں شِو اور شکتی۔ پرم ایشور تو شُدھ اور لامحدود سموت ہے۔ سموت کو ہی

تعمیر

ایک تصور سے پرکاش کہتے ہیں اور ایک تصور سے وِمرش۔ پرکاش ظاہر ہونے یا apparantness کو کہتے ہیں اور وِمرش اُس ظاہر ہونے کے احساس کو Consciousness کو کہتے ہیں۔ پرکاش کو شِو اور وِمرش کو شکتی کہتے ہیں۔ دراصل پرکاش وِمرش سے الگ نہیں رہتا اور وِمرش پرکاش سے الگ نہیں رہتا۔ اِس لئے شِو اور شکتی دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ وہ حقیقت ہی شُدھ سموِت یا پرم ایشور کہلاتی ہے۔ اُسی میں چھتیس عناصر ظاہر ہوتے ہیں اور اُسی میں غائب بھی ہوتے ہیں۔

دوسرا حصہ وہ حصہ ہے جس میں وحدت کے ساتھ اکثریت بھی ظاہر ہو جاتی ہے اُسے وِدیا کی دشا کہتے ہیں۔ اس حصے میں تین عناصر ظاہر ہوتے ہیں۔ اِس باریک تصور کی حالت میں بھگوان کے اندر ہی دُنیا کا بھی دھیما اور صاف ظہور نمودار ہو جاتا ہے۔ سموِت کے اندر دُنیا کے دِھیمے سے ظہور کو سدا شِو دشا کہتے ہیں۔ اور واں اُس کے صاف ظہور کو ایشور دشا کہتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں سموِت اور دُنیا میں وحدت ظاہر ہوتی ہے۔ اس وحدت کے نقطۂ نگاہ کو وِدیا یا شُدھ وِدیا کہتے ہیں۔ علمِ حقیقی اِسی وِدیا کا نام ہے۔ شکتی کی حالت تو علمِ حقیقت سے بھی اُوپر کا درجہ ہوتا ہے۔

ان درجوں کے تیسرے حصے میں اکتیس عناصر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ بھگوان کا تصور جب کافی ٹھوس بن جاتا ہے تو سموِت اپنی حقیقی صورت کو چھپا لیتی ہے۔ اس اپنے آپ کو چھپانے کی پرم ایشور کی شکتی کا نام مایا ہے۔ مایا کا پردہ پڑ جانے پر بھگوان شُدھ سموِت کو اپنی ذات سمجھنا بھول جاتا ہے اور جسم کو یا پران کو یا شُونیہ کو یا عقل کو ہی اپنی ذات سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یہ مایا چھٹا عنصر ہے۔ مایا آگے پھیلتی ہوئی پانچ شکلوں میں ظاہر ہو کر اس بھُولے ہوئے بھگوان کو اور بھی محدود بنا دیتی ہے۔ وہ اس طرح سے، کال یعنی وقت کا تصور بن کر اُسے ایک طرح سے وقت کی حد کا شکار بنا دیتی ہے۔ اُس کی جاننے اور کرنے کی طاقتوں کو محدود کر کے شُدھ وِدیا اور کلا کہلانے لگتی ہے۔ اپنے شریر وغیرہ کے ساتھ اور شریر وغیرہ کو اچھی لگنے والی چیزوں کے ساتھ اُس میں اُلفت کا لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ یہ لگاؤ راگ کہلاتا ہے۔ راگ کی وجہ سے اچھے اور بُرے کام کرنے لگ جاتا ہے۔ مگر اس کے جاننے اور کرنے کے کام اور اس کا لگاؤ تینوں ہی قانونِ قدرت کی حد میں محدود ہو کر رہتے ہیں۔ یہ قانونِ قدرت نِیتی کہلاتی ہے۔ ان پانچ حدوں کے اندر محدود ہوا بھگوان ہی

تعیر

جیو یا پُرش کہلاتا ہے۔ یہ محدود بنانے والے پانچ عناصر ہیں اور پُرش بارہواں عنصر ہے۔ پُرش فاعل بنتا ہے اور دُنیا کی وہ حالت، جس میں سب چیزیں ایک مشترکہ حالت میں موجود ہیں، کوئی چیز کسی چیز سے الگ نہیں، اُس کا مفعول بنتی ہے۔ دُنیا کے تمام عناصر کی اس مشترکہ وحدت کی حالت کو مُول پرکرتی کہتے ہیں۔ پرکرتی مانو دُنیا کی ایک بہت باریک حالت کا نام ہے۔ پرکرتی آگے ستھول یعنی ٹھوس بنتی ہوئی ایک طرف سے من، بُدھی اور اہنکار، یعنی سوچنے اور سمجھنے کی طاقت اور خودی کے احساس کی صورت میں اور سُننے، چھُونے، دیکھنے، چکھنے اور سونگھنے کی طاقتوں اور بولنے، کرنے، چلنے، خارج کرنے اور آنند لینے کی طاقتوں کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اور دوسری طرف سے شبد یعنی آواز، اسپرش یعنی چھُو، رُوپ یعنی شکل، رس یعنی مزہ اور گندھ یعنی بُو کی شکل میں اور آکاش، ہوا، آگ، پانی اور مٹی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ تیرہ طاقتوں کو کرن عنصر کہتے ہیں اور ان دس کو کاریہ عنصر کہتے ہیں۔ کرن عناصر میں پہلے تین انتہ کرن یعنی اندرونی طاقتیں اور باقی دس باہری کرن ہیں۔ اُن دس میں بھی پہلے پانچ کو گیان اندریاں اور باقی پانچ کو کرم اندریاں کہتے ہیں۔ کاریہ عناصر دو قسم کے ہیں۔ سوکھشم یعنی شبد وغیرہ باریک عناصر اور آکاش وغیرہ ستھول یعنی جسیم عناصر، یہ تئیس[۲۳] اور پرکرتی چوبیس بنتے ہیں۔ پُرش تک کے بارہ عناصر مِلانے سے ان کی گنتی ۳۶ بن جاتی ہے۔ سمجھانے کے لئے اس کھیل کے یہ چھتیس درجے بنائے گئے ہیں۔ زیادہ تشریح کی جائے تو عناصر کی تعداد بہت بڑھ سکتی ہے اور مختصر طور پر کہا جائے تو تین ہی عناصر ہیں۔ مایا تک آتم عنصر، اُس سے اُوپر سدا شِو تک شُدھ وِدیا کا عنصر اور اُس سے اُوپر شِو عنصر۔ اصلیت میں عنصر ایک ہی ہے اور وہ ہے پرم ایشور۔

رِشی بننے کے لئے شِو شاستر کے اصولِ عمل کے مطابق انسان کو دُنیا چھوڑ کر جنگل نہیں جانا چاہیئے۔ دُنیا کا کام اور اپنی گھر گرہستی کا کام چلاتے چلاتے ہی بھگوان کی بھگتی کا مادہ بڑھانا چاہیئے۔ اُس سے بھگوان خوش ہو جائیں گے اور اُن کی عنایت سے بھگتی کی اُمنگ بڑھتی جائے گی۔ جوں جوں بھگتی بڑھتی جائے گی توں توں دُنیا کا لگاؤ گھٹتا جائے گا۔ یہ سلسلہ چلتا رہے تو جلد ہی بھگوان کی مہربانی سے کسی رِشی کے ساتھ تعلق جُڑ جائے گا۔ اُس سے تربیت حاصل کر کے انسان خود رِشی بن جائے گا۔ (بقیہ بر صفحہ ۹۲)

خالد کشمیر کے ہاتھوں ایوانِ اُردو کا افتتاح

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کی نو تعمیر شدہ عمارت "ایوان اُردو" کی رسم افتتاح انجام دینے کے لئے وزیر اعظم جموں کشمیر جناب بخشی غلام محمد صاحب ۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو ایک بج کر ۳۰ منٹ پر طیران گاہ بیگم پیٹھ پر ہوائی جہاز سے اُترے۔ صدر، معتمد اور اراکین مجلس انتظامی افتتاح عمارت ادارہ اور ممتاز قائدین ادیبوں اور پروفیسوں نے بخشی صاحب کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ صدر ادارہ نواب زین یار جنگ بہادر نے بخشی صاحب کو پھول پہنائے۔ معتمد ادارہ ڈاکٹر زور نے اراکین وحاضرین کا تعارف کرایا۔ اسی دن سوا چار بجے بخشی صاحب صدر ادارہ کے ہمراہی میں اپنے قیام گاہ راج بھون سے ایوان اُردو کے معائنہ (پری ریو) کے لئے تشریف لائے۔ صدر، معتمد اور اراکین کی موجودگی میں آپ نے بعد معائنہ عمارت گروپ فوٹو میں شرکت کی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو رفعت منزل کے سجے سجائے شامیانے میں منعقدہ اس افتتاحی تقریب میں جہاں حیدرآباد کے ممتاز ادیب، شاعر، پروفیسر، صحافی، سیاسی قائد اور اُردو دوست جمع تھے۔ وہیں اس تقریب میں شرکت کیلئے کشمیر سے ممتاز ادیب وشاعر جناب علی جواد زیدی اور دلی سے جناب جگن ناتھ آزاد بھی بذریعہ طیارہ آچکے تھے۔ ۵ بجے یہ تقریب عالیجناب بھیم سین سچر صاحب گورنر آندھرا پردیش کی صدارت میں شروع ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے جناب گورنر صاحب اور بخشی صاحب کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ صدر ادارہ جناب پدما بھوشن، نواب زین یار جنگ بہادر نے خیر مقدمی تقریر پڑھی۔ بخشی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ نے ان کی اُردو دوستی کی ستائش کی اور ادارے کے بارے میں بتایا کہ "عمارت کے لئے ہم ۱۹۴۳ء سے کوشاں ہیں، بالآخر ۱۹۴۴ء میں اس کا نقشہ مرتب ہوا۔ اور فنڈ جمع کیا جانے لگا۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا تھا۔

پیامات کی پیش کش کے بعد گورنر آندھرا پردیش نے بخشی صاحب سے استدعا کی کہ وہ افتتاحی تقریر فرمائیں۔ تالیوں کی گونج میں بخشی صاحب نے تقریر شروع کی۔ "ادارے نے قلیل مدت میں جس قدر وقیع اور نادر چیزیں جمع کی ہیں، اور جو کارنامے اُردو کی ترویج وبقا کے سلسلے میں اس نے انجام دئے اس کی میں داد دیتا ہوں۔ زور صاحب جس اہم کام کو آگے بڑھا رہے ہیں، اس کا تعلق صرف دکن اور حیدرآباد سے نہیں ہے، بلکہ سارے ہندوستان اور ساری دُنیا سے ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں ادب اور زبان کا تذکرہ آتا ہے، وہیں ہمیں ایک ایسے نقطۂ نظر سے سوچنا اور سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد زبانوں کا بٹوارہ ایک بھیانک غلطی ہوگی۔ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کی زبان ہے۔ اسے کشمیر سے کر راس کماری تک بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کے مستقبل سے مایوس ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس کی ترویج میں غیر مسلموں نے بھی بہت حصہ لیا ہے۔ تنگ نظری، تعصب، تہذیب وتمدن کے حق میں سم قاتل ہوتے ہیں۔ ہماری تہذیب بیرونی رنگا رنگ تہذیبوں سے اکتساب کرتی رہی ہے ہندو کلچر، ایرانی کلچر اور پٹھانوں کا کلچر ہماری تہذیب میں رچ بس گیا ہے۔ آندھرا پردیش کا کلچر بھی اسی طرح قابل فخر ہے۔ ہندی اور اُردو کے لئے لڑنے والے کسی کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ اُردو ادب ملک کی زبان بن چکی ہے اور سب کو اسے سیکھنا چاہیئے۔"

بخشی صاحب نے اُردو کے تعلق سے آندھرا پردیش کی حکومت کی ستائش کرتے ہوئے تلیگو اُردو اکیڈیمی کے قیام پر حکومت کو مبارکباد دی۔ اور اس توقع کا اظہار کیا کہ ریاستی حکومت اور گورنر صاحب اُردو کے تعلق سے اپنی فراخ دلانہ پالیسی کو برقرار رکھیں گے۔ ادارۂ اُردو دکن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بخشی صاحب نے فرمایا کہ دکن نے اُردو زبان کی ترویج واشاعت میں نہ صرف تاریخی رول ادا کیا ہے۔ بلکہ اس زبان پر بہت بڑا احسان بھی کیا ہے۔ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی مروجہ زبان آج بھی قطعی طور پر ہمارے دیہات (بقیہ بر ص ۹۹)

احمد اسحاق نعمانی

شبلی۔ علیگڑھ سے ندوہ تک

شبلی جیسی بوقلموں شخصیت پر قلم اُٹھانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ ایسی شخصیتوں کا مطالعہ جن کی زندگی بظاہر مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہو اور ہر خانہ بادی النظر میں تضاد بھی رکھتا ہو، اور پھر جن کی زندگی سیدھی سادی لکیر کے بجائے قوسین بناتی ہو، مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ شاید یہی وجہ ہے جو شبلی پر اب تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں، جانب دارانہ تعصب سے مبرّا نہ ہو سکیں اور شخصیت کی اسی پیچیدگی کا نتیجہ ہے جو ہماری سہل پسند طبیعت شبلی کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے بے نیاز رہی ہے۔

شبلی کی شخصیت کے گرد شبلی پرستوں اور شبلی دشمنوں نے جو مختلف مباحث کا دائرہ بنا رکھا ہے اس میں سب سے نازک مسئلہ شبلی اور حالی اور سرسید کے نجی تعلقات اور سیاسی اختلافات سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں مشرقی شخصیت پرستی کے بہانے واقعات کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے اس کا نقصان شبلی کو بھی اُٹھانا پڑا ہے اور حالی و سرسید کو بھی۔ لیکن سب سے زیادہ گھاٹے میں اُردو ادب رہا جس میں صحت مند تنقید کے بجائے بُت شکنی و بُت پرستی کی بدعت عام ہو گئی اور ہم اپنے بزرگوں کے بارے میں مبہم و متضاد رائے پڑھ کر ہمیشہ شبہات میں مبتلا رہے۔

شبلی کی زندگی کا سب سے زیادہ عبرت انگیز حصہ ان فرضی چشمکوں سے متعلق ہے جس کی ابتدا مہدی افادی کی نظر میں حالی سے ہوتی ہے اور سرور صاحب کی نظر میں سرسید سے۔ اتفاق سے چشمک کا سرچشمہ نہ سرسید تھے نہ حالی اور بنیادی طور پر (ہر قسم کے سیاسی و مذہبی اختلاف کے باوجود) آپس میں کسی نجی چشمک کے وجود کا سراغ نہیں ملتا۔ سرسید کے مذہبی خیالات سے شبلی ہی نہیں، ان کے اکثر رفقا کو بھی اختلاف تھا۔ سیاسی طور پر بھی سرسید کے بہت سے رفیق ان سے متفق نہیں تھے علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقصد یعنی قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر ان اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور اس جذبہ نے سب کو ایک دوسرے سے متحد رکھا۔

شبلی علی گڑھ سے کسی دشمنی کی بنا پر نہیں الگ ہوئے تھے۔ دراصل اس سارے قضیئے کی بنیاد شبلی کی وہ دُکھتی ہوئی رگ تھی جس کی بنا پر ان کی اپنی انفرادیت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حیدرآباد میں ایک عرصہ تک انہیں "علی گڑھ کے نامی پہلوانوں" میں شمار کیا جاتا تھا۔ شبلی جو چالیس برس کی چھوٹائی بڑائی کے باوجود سرسید سے علمی و ادبی مباحثوں میں برابری سے بحث کرتے تھے اور جو اسکات المعتدی، المامون جیسی کتابوں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" جیسے مضامین، روم و مصر و شام کے سفر، تمغۂ مجیدیہ اور شمس العلماءُ کا خطاب پانے کے بعد کافی شہرت پا چکے تھے۔ اپنی شخصیت کو اس طرح علی گڑھ والوں میں گُم ہو جانے پر راضی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے نجی مجلسوں میں جب بھی کہیں ان کی انفرادیت پر آنچ آتی وہ اپنی زُود اشتعال طبیعت کی بنا پر شدید ردّ عمل کے تحت علی گڑھ والوں کے خلاف کچھ ایسے کلمات کہہ جاتے جو عام حالات میں وہ ہرگز نہ کہتے۔ بہت جلد مُشتعل ہو جانے والے اور زُود حِس لوگوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، حالانکہ چند لمحات کے بعد وہ بھُول جاتے ہیں کہ انہوں نے ابھی کوئی سخت بات کہی۔ ایسے لوگ دِل میں ذرا بھی کدورت نہیں رکھتے اور کبھی کبھار "بھُول بھال کر" تیز جملہ کہہ دینے کے بعد عموماً وہ ہر قسم کے خیال کو دِل سے نِکال دیتے ہیں۔ یہ خیالات جس طرح غیر شعوری طور پر دِل میں آتے ہیں اسی طرح غیر شعوری طور پر نِکل بھی جاتے ہیں۔ اس میں کسی بنی بنائی اسکیم یا کینہ کا دخل بالکل نہیں ہوتا۔

بہرحال شبلی کے یہ کلمات اتفاق سے چند ایسے لوگوں کے کان میں بھی پڑے جو سرسید اور حالی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور انہیں اس سے بہت تکلیف

پہنچی۔ اس عقیدت کی بنا پر یہ لوگ شبلی سے بدظن ہوگئے۔ اس کے علاوہ "حیاتِ جاوید" کی بابت شبلی نے مولوی عبدالحق صاحب کے سامنے (سُنی سُنائی باتوں کی بُنیاد پر) جو کچھ کہا وہ مولوی صاحب کو بہت ناگوار گذرا۔ انہیں سب باتوں سے اس فرضی چشمک کی ابتدا ہوتی ہے جو آپس میں تو نہ تھی لیکن شبلی و حالی کے شاگردوں میں ایک دوسرے سے شدید سیاسی اختلاف ہونے کی بنا پر بہت واضح صورت میں تھی اور جس کو دونوں گروہوں نے اپنی باتوں میں وزن لانے اور اپنے نظریات کی ترویج کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مہدی افادی کے مضمون "حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک" سے بھی مدد ملتی ہے۔ مہدی افادی لفظِ "چشمک" کو نجی و ذاتی تعلقات میں کسی قسم کی رنجش نہیں بلکہ کسی ادبی نظریہ کی بابت آپس میں اختلاف رائے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بقول ان کے "   تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے ہی خوش گوار تھے جتنے باوصف اختلاف وکلائے مقدمہ کے اجلاس کے باہر ہوا کرتے ہیں۔" اور ان کے مطابق چشمک کے "جراثیم" دراصل کہیں اور پائے جاتے ہیں" جس طرح ناممکن ہے کسی ٹیکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا (یعنے مولوی عبدالحق صاحب کا) مقدمہ نہ ہو۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاس داری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ یعنے چشمک کے جراثیم ان کے مقدمات میں کثرت سے ملیں گے کہ یہ امر ان کے لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہوگیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور اظہارِ خیال سے کبھی نہیں چوکتے۔"

چوں کہ چشمک کے پروپیگنڈے میں "حیاتِ جاوید" پر شبلی کے مجلسی تاثرات اور تنقید کا سب سے اہم حصہ ہے؛ اس لئے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ شبلی نے سرسید کی سوانح حیات کو "کتاب المناقب" (یعنی تعریف و مدح کی کتاب) "مدلّل مداحی" اور "کذب و افترا کا مجموعہ" کہا، صرف اسی بنا پر شبلی کو گردن زدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ "حیاتِ جاوید" پر یہ تنقید اگر "بالکل صحیح" نہیں ہے تو "بالکل غلط" بھی نہیں ہے۔ اختلاف صرف اتنا کیا جا سکتا ہے کہ شبلی نے جس چیز کو عیب سمجھا، وہ "حیاتِ جاوید" کی خوبی ہے۔ "مناقبت یا مداحی" اور وہ بھی "مدلّل" کہنے سے "حیاتِ جاوید" کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے نہ کہ کمی! میرے خیال میں "حیاتِ جاوید" کے بارے میں یہ پہلی اور آخری بات کہی جا سکتی ہے۔ دلیل کے ساتھ کسی کی مدح کرنا اور ایسی مدح جو قائل کر دے، آسان کام نہیں ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے "کتاب المناقب اور وہ بھی نامکمل" میں لفظ "نامکمل" سے اختلاف کیا ہے۔ گو کہ حالی نے واقعی بہت سے اہم واقعات کو اپنی درویش صفت طبیعت سے مجبور ہو کر گول مول کر کے لکھا ہے تاکہ اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔[1] مثلاً آخر عمر میں سرسید اور سید محمود میں جو شدید اختلاف سید محمود کی کثرتِ شراب نوشی اور انگریز پرستی کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا اس کا تذکرہ ۹۰۰ صفحات کی کتاب میں کہیں نہیں ملتا۔ حالاں کہ صرف یہی واقعہ سرسید کو ان تمام الزامات سے بچا سکتا ہے جو انگریز پرستی کے سلسلے میں اُن پر کئے گئے ہیں۔

"حیاتِ جاوید" میں نہ صرف ان واقعات کو نظر انداز کیا گیا ہے جن کا چھپانا بقولِ سرور صاحب جرم میں داخل ہے بلکہ "یادگارِ غالب" کی طرح[2] اس میں بعض واقعات کی تاریخی غلطیاں بھی ملتی ہیں (جن کا روشنی میں لانا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ اس جگہ اس کا تذکرہ ایک طرح کا اخلاقی جرم بھی ہے) اس وجہ سے شبلی کی نکتہ چینیوں کو تنقیداتِ العالیہ (higher criticism) کہہ کر صاف کیا جا سکتا تھا لیکن اس واقعہ کا ایک بہت افسوس ناک پہلو بھی ہے۔ شبلی نے علی گڑھ چھوڑا، تو اندرونی طور پر علی گڑھ کی قیادت سرسید سے چھن کر سید محمود کے ذریعہ پرنسپل بیک کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ سید محمود، سرسید کے لڑکے ہونے کے باوجود بالکل مختلف ذہن رکھتے تھے کیونکہ ان کی نشو و نما بالکل مختلف حالات میں ہوئی تھی۔ سرسید نے دِلّی کی تاراجی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ ایک بگڑے ہوئے آزاد مُلک اور سنورے ہوئے غلام مُلک کے آرام کے فرق کو ایک وطن دوست کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ سول سروس میں ہونے کے باوجود وطن سے محبت اور قوم سے ہمدردی رکھتے تھے۔ سید محمود نے آزادی نام کی شئے کا صرف نام سُنا تھا اور بس۔ وہ بیورو کریسی میں پلے بڑھے تھے اور اس کو خدا کی شان کا مظہر سمجھتے تھے۔ انگریز ان کی نظر میں "حاکم" تھا اور ہندوستانی "محکوم"۔ اس کے آگے سوچنے کے نہ وہ عادی تھے اور نہ اس کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے سرسید کی "وطن دوستی" سید محمود کی "بیورو کریسی" کے سامنے دَب گئی۔ سید محمود سرسید سے آخری دِنوں میں جو بھی چاہے سو کروا لیتے تھے اور سرسید کی زبان پرنسپل بیک اور سید محمود کی باتیں دہرانے سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔[3] معاملات بعد میں اس قدر بگڑے کہ سرسید کو اپنا گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ اور اسی غریب الدیاری میں نواب اسمٰعیل کے مکان پر ان کا

---

[1] ملاحظہ ہو حبیب الرحمٰن خان شروانی کا تبصرہ "حیاتِ جاوید" / مقالاتِ شروانی

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون "یادگارِ غالب" – "سویرا" لاہور

[3] سید محمود کس طرح سرسید کو اپنے کام کے لئے استعمال کرتے تھے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

انتقال ہوگیا۔

ان دِنوں سرسید بہت خاموش رہنے لگے تھے۔ اس پر ان کے ایک دوست نے جب استفسار کیا تو بولے کہ " اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چُپ رہنا ہوگا۔ اس لئے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔ " سرسید جیسے (بقولِ حالی) "ڈسپاٹک" شخص کو، جس کی تمام عمر جدوجہد میں گذری اور جس نے ہر طرح کی تکلیف اور مذہبی و سیاسی مخالفت کو دلیرانہ طریقہ سے مقابلہ کیا۔ یہ جُملہ کہتے وقت کرب اور دُکھ کی جن منزلوں سے گذرنا ہوا ہوگا، اس کے متعلق سوچتا ہوں تو رُوح کانپ جاتی ہے۔ سرسید جو شکستوں کو اپنے استقلال سے فتح میں تبدیل کر لیا کرتے تھے اور جنہوں نے ناکامیاب ہونا سیکھا ہی نہ تھا، اس قدر مایوس اُسی وقت ہوسکتے تھے جب اپنے خوابوں کی غلط تعبیر ہوتے دیکھتے۔ باپ اور بیٹے کی اس کشمکش نے ہندوستانی تاریخ کے سارے دھاروں کے رُخ تبدیل کر دیئے اور بیک جو پارلیمنٹ کی ممبری چھوڑ کر سرکارِ انگلشیہ کی پالیسی کے مطابق صرف اس لئے علی گڈھ آئے تھے کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیں[1] دھیرے دھیرے علی گڈھ پر قابض ہوگئے۔

شبلی حالات کے بدلتے ہوئے تیور اور سرسید کی بے بسی سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف رہے ہوں گے۔ اس لئے کالج میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے رسُوخ اور وہاں کی سیاست کی مرکزیت میں تغیرِ ثقل (shift of gravity) کی بنا پر علی گڈھ چھوڑنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن سرسید سے ایک دم اس طرح بدظن ہوجانا سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں پہنچ کر ہم صرف چار نتائج نکال سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یا تو شبلی اس تغیرِ ثقل سے بالکل لاعلم تھے اور بدلے ہوئے حالات کی تمام تر ذمہ داری سرسید پر ڈالتے رہے ہوں یا بیٹے کا جرم باپ پر عائد کرتے رہے ہوں یا معمولی عینیت کا شکار رہے ہوں یا پھر ان کے اور سرسید کے درمیان ذاتی چشمک کی ساری تفسیریں غلط ہیں۔ مجھے آخری بات اس لئے اور زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ جن اختلافات کی بنا پر چشمک کا شبہ کیا جاتا ہے وہ پہلے بھی تھے۔ نیز سرسید کی زندگی میں شبلی علی گڈھ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور اس کے علاوہ سرسید کے انتقال پر شبلی کا عربی خط بنام نواب علی حسن خان اتنا دردناک اور جذباتی ہے[2] کہ ذاتی چشمک کا دعویٰ کرنے والوں کی ساری دلیلوں کی بُنیاد ہلا دینے کو کافی ہے۔

شبلی نے علی گڈھ کیوں چھوڑا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ شبلی پر اس سلسلہ میں بڑی سخت تنقیدیں کی گئی ہیں۔ لیکن ان تنقیدوں کی تمام بُنیاد اسی عداوت پر ہے جو شبلی اور سرسید کے پیروؤں نے ایک دوسرے کو سیاسی میدان میں نیچا دِکھانے کے لئے چلا رکھی تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، شبلی نے علی گڈھ کسی دُشمنی کی بنا پر نہیں چھوڑا تھا۔ سید محمود اور پرنسپل بیک کی قیادت میں علی گڈھ جس منزل کی طرف جا رہا تھا، اس میں شبلی جیسے انگریز دُشمن کا علی گڈھ چھوڑنا ناگزیر تھا۔ شبلی کو چھوڑیئے، مولوی سمیع اللہ، جو سرسید کے دست راست تھے اور حالی، محسن الملک اور وقار الملک بھی، جن کے آغوش میں علی گڈھ تحریک پروان چڑھی، بدلے ہوئے حالات سے اس قدر زیادہ بد دِل ہوچکے تھے، وہ خود اپنے پیرِ مغاں کے خلاف ہوگئے تھے اور آخری تین حضرات تو ایک بیان بھی "پیسہ" اخبار میں نکلوانے والے تھے، بالفرضِ محال اگر شبلی، سرسید اور "تحریک" کے دُشمن تھے تو مندرجہ بالا حضرات تو اس کے بہی خواہ تھے۔ پھر انہوں نے سید محمود پر کیوں نہیں اعتماد کیا۔ اور پھر انہوں نے سرسید کی اس رائے کی کیوں مخالفت کی جس کی رُو سے ان کے بعد سید محمود کو ہی کالج کا سیکرٹری بنایا جاتا۔ شبلی اگر صرف اس وجہ سے گنا ہگار ہیں کہ انہوں نے

اس کا اندازہ حاجی اسمٰعیل کے خط بنام وقار الملک سے ظاہر ہوتا ہے :-

(۱) یہ سچ ہے کہ سرسید خود بہت پریشان ہیں۔ مگر جو بات سید محمود ایجاد کرتے ہیں۔ آخرکار مقبول و منظور ہوتی ہے۔ میں نے تو سید صاحب کے یہاں جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ یا تو ان کی رائے میں شریک ہو اور کارروائی پر دستخط کرو اور نہیں تو سید محمود کی گالیاں کھاؤ اور غصہ کرو تو جُوتی پیزار کرو

(۲) آپ کا (یعنی وقار الملک کا) نام ٹرسٹیوں کی مد سے بموجب اختیاراتِ سیکرٹری (سرسید) خارج کیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ بہت بے جا کارروائی ہے جو ہونے والی ہے۔ اُنہوں نے (یعنی سرسید نے) فرمایا کہ سید محمود پیچھے پڑے ہیں۔ "

(۳) شبلی اس کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے حمید الدین فراہیؒ کو لکھتے ہیں "کالج کا حال کشمکش میں ہے، سرِدست بیک صاحب نے قبضہ کرلیا ہے۔ سید محمود کی حالت بہت خراب ہے۔" (مکاتیبِ شبلی ملہ اپریل ۱۸۹۸ء)۔ سید سلیمان ندوی مرحوم حاشیہ پر اس خط کے متعلق نوٹ میں لکھتے ہیں۔ "علی گڈھ کالج کے بیک صاحب پرنسپل تھے۔ سید محمود سرسید احمد خان پر حاوی ہوگئے تھے اور بدمستانہ ہر ایک شخص سے اُلجھتے تھے۔ "

---

[1] "یہ بات اب راز نہیں رہ گئی کہ مسٹر بیک کا مقصدِ حیات یہ تھا کہ علی گڈھ کالج کو تبلیغِ برطانویت اور درسِ وفا کا مستقل ادارہ بنا دیا جائے۔ "
علامہ اقبال سہیل / سیرتِ شبلی / الاصلاح اکتوبر ۱۹۳۸ء / صفحہ ۶۳۶

[2] ترجمہ :- " قومی عمارت کے ستون ہل گئے۔ یعنی سرسید احمد خان بہادر اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ یہ سانحہ ایک شنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کچھ دِنوں تک کچھ نہیں کرسکتا۔ " (۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء)

میر

نظریاتی اختلاف کی بناپر تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی اور حالی، محسن الملک اور وقار الملک صرف اس وجہ سے بےگناہ ہیں کہ وہ ذاتی اختلاف کی بنا پر (یعنے ایسا اختلاف، جس کی بُنیاد سرسید کے لڑکے سید محمود کی ذات ہے یا بالفاظِ دیگر سرسید کی خود اپنی ذات ہے) سرسید کے خلاف بیان نکالنے پر آمادہ تھے جس سے ان کے وقار کو بھی ٹھیس پہنچنے کا خطرہ تھا، تو یہ شبلی کے ساتھ سراسر ظلم ہوگا۔

سرسید جب ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل میں نئی دفعات کے مطابق سید محمود کو جوائنٹ سیکرٹری بنوانے لگے تو مولوی سمیع اللہ خان ان سے الگ ہوگئے" اور ان کے ساتھ ان کے اکثر دوست بھی، جن میں زیادہ تر علی گڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے، اس اختلاف میں شریک ہوگئے۔ "حالی کی زبان سے ذرا اس کی پوری تفصیل سُنیئے:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد خان بالکل ایک ڈسپاٹک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو ان کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بُنیاد سمجھو اور چاہو ان کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو، بہرحال یہ خصلت ان میں ضرور تھی۔ گو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگ دِل نہ ہوتے تھے مگر جن اصولوں پر انہوں نے کالج کی بُنیاد رکھی تھی ان سے ہرگز وہ دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں مُخل سمجھتے تھے اس کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا، چلنے نہیں دیتے تھے۔ ان کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے پہلے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو ۱۸۵۷ء سے لے کر آخرِ دم تک ان کے پیشِ نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لئے انہوں نے یورو پین اسٹاف کو کالج کا جزوِ غیر منفک قرار دیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ یوروپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ اور ان کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آیندہ کے لئے سیکرٹری شپ کا انتظام نہ کیا تو ان کے بعد ضرور مولوی سمیع اللہ خان سیکرٹری ہوں گے۔ انہوں نے نیز اور بعض اور یورپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سید محمود کو جوائنٹ سیکرٹری مقرر کردیں تاکہ یوروپین اسٹاف، جس کو معاہدہ کرکے انگلستان سے بُلایا گیا تھا، سرسید کے آیندہ جانشین کی طرف سے پُورا پُورا اطمینان ہوجائے ... ...

یوروپین اسٹاف کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور ان کو کالج کی آیندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضروری تھا، اس لئے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر کرنے کے لئے داخل کرنی اور سید محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔"[1]

سرسید نے سید محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی "کیا یا سرسید کو" بہ جبر" راضی ہونا پڑا، اس کے متعلق ہم خود قیاس آرائی کرسکتے ہیں۔ یہاں "یوروپین اسٹاف کا مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک "جانا" اور پھر ان کی طرف سے یہ صلاح مِلنا کہ "سید محمود کو جوائنٹ سیکرٹری مقرر کردیں تاکہ یوروپین اسٹاف، جس کو معاہدہ کرکے انگلستان سے بُلایا گیا تھا، سرسید کے آیندہ جانشین کی طرف سے پُورا پُورا اطمینان ہوجائے۔" اور پھر اس پر دھمکی آمیز اصرار بھی کہ "یوروپین اسٹاف کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور ان کو کالج کی آیندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضروری تھا" وغیرہ سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرسید کے ہاتھ کس قدر بندھے ہوئے تھے اور انہیں مجبوراً "یوروپین اسٹاف کی خواہش" منظور کرنی پڑی اور سید محمود کو آیندہ جانشین بنانے کے لئے جوائنٹ سیکرٹری بنانا پڑا۔

سید محمود سے مولوی سمیع اللہ وغیرہ کی شکائتیں کچھ غلط نہ تھیں۔ "ان کی قابلیت میں کچھ شبہ نہ تھا، لیکن وہ طبیعت کے ذرا تیز تھے اور شراب نوشی کی مذموم عادت ان کی شہرت کو بٹا لگا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس زمانے میں اپنی قابلیت، شہرت اور باپ کے اثر و رسوخ کے باوجود کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ناقابل سمجھا جائے اور اس سے استعفیٰ طلب کیا جائے وہ ایک ایسی قوم کے اہم ترین ادارے کا موزوں مہتمم کیسے ہوسکتا ہے جو شراب کو حرام سمجھتی ہو۔"[2] بہرحال اسی خراب نوشی اور یوروپین اسٹاف کے بڑھتے ہوئے رسوخ نے بعد میں بڑی سنگین صورت اختیار کرلی اور اسی نے حالی وغیرہ کو مخالفت کرنے پر اُکسایا۔ شبلی کی حیثیت اب تک صرف ایک تماشائی کی تھی۔

"پیسہ" اخبار والا بیان تو سرسید کی اچانک موت کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آسکا۔ اس لئے اس بیان کی تفصیل سے ہم محروم ہیں لیکن وقار الملک کا کچھ

---

[1] "حیاتِ جاوید" صفحہ نمبر ۳۳۰ — ۳۳۳

[2] شیخ اکرام / "موجِ کوثر" صفحہ نمبر ۵۶

اسی قسم کا ایک خط جو حالی کے نام لکھا گیا تھا، اس واقعہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے مطابق "ایک خاص مضمون بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جناب سرسید مرحوم و مغفور ایک مہینہ بھی اور زندہ رہتے تو جناب (یعنی حالی) اور محسن الملک اور خاکسار کے دستخطوں سے ایک یادداشت ٹرسٹیوں میں جاری ہو چکی تھی کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں چلے جانے سے روک لیں۔" اس بیان کے مطابق اگر سرسید کی بروقت موت نہ ہو جاتی تو نہ صرف ان کے خلاف "پیسہ" اخبار میں بیان نکالا جاتا بلکہ کالج کے ٹرسٹیوں میں کوئی بھی ایک یادداشت کے ذریعہ فوری کارروائی کے لئے اُکسایا جاتا۔ یعنی کالج کے مفاد کے لئے حالی، محسن الملک اور وقار الملک متحدہ طور پہ سرسید کی مخالفت پہ آمادہ تھے۔ یہاں پہ ایک بڑا پریشان کن سوال ہمارے سامنے اُٹھتا ہے کہ کیا واقعی سرسید اپنے اصلی راستے سے ہٹ گئے تھے؟ اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ "روش سرسیو آورد تھی" آمد نہ تھی اور ان کی آواز کی انفرادیت اس وقت ختم ہو چکی تھی اور وہ چاہتے رہے ہوں یا نہیں، انہیں وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا جو ان سے کرنے کے لئے کہا جاتا۔

شبلی اس وقت بڑے مخمصے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ علی گڑھ چھوڑنا بھی چاہتے تھے اور نہیں بھی چھوڑنا اس لئے چاہتے تھے کہ یورپین اسٹاف جس طرح حاوی ہو رہا تھا اُس سے شبلی کیا، تحریک کے سارے ہمدرد بے بس ہوتے جا رہے تھے اور چھوڑتے ہوئے گھبرا اس لئے رہے تھے کہ روزی کا مسئلہ خطرے میں تھا۔ بہرحال جب شبلی علی گڑھ چھوڑنے پر ابھی نیم راضی ہوئے تھے اور ان کے سامنے یہ تجویز تھی کہ چھ مہینے وہ علی گڑھ رہیں اور چھ مہینے ندوہ میں۔ تو پرنسپل بیک نے بڑی زبردست سیاسی چال چلی۔ ایک طرف اسنے خود تو شبلی سے درخواست کی کہ وہ اس تجویز کو منظور کر لیں ۱؎ کیونکہ ان کے جیسے ذی علم کے چلے جانے سے علی گڑھ کو بڑا زبردست علمی نقصان پہنچے گا ۱؎ اور دوسری طرف سید محمود کے ذریعہ اس کی سخت مخالفت کروائی۔ ۲؎ چونکہ اُن دنوں سید محمود اور شبلی میں بنتی نہ تھی اور سید محمود علی گڑھ کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے بات کھپ گئی اور اس تجویز پر عمل نہ کیا جا سکا اور شبلی کو مجبوراً علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔

میں نے اب تک شبلی کی علی گڑھ سے علیحدگی علی گڑھ سے دشمنی نہیں کہا ہے۔ اس کے کچھ ٹھوس وجوہات ہیں۔ شبلی کا نصف سال علی گڑھ اور بقیہ نصف سال ندوہ میں رہنے پر راضی ہونا، اُن کا سال بھر چھٹی لے کر (اعظم گڑھ میں رہ کر) یہ دیکھنا کہ وہ علی گڑھ کے باہر رہ بھی سکتے ہیں یا نہیں، ان کا علی گڑھ سے سیدھے ندوہ جانے کے بجائے پہلے اعظم گڑھ، پھر کشمیر، پھر اعظم گڑھ، پھر حیدرآباد اور تب سب سے آخر میں لکھنؤ جانا، اُن کا حیدرآباد میں محسن الملک (جو اُن دنوں کالج کے سیکرٹری تھے) کے اصرار پر دوبارہ علی گڑھ لوٹنے کے متعلق سوچنا ان کا محسن الملک سے معاملہ طے نہ ہونے کے بعد حیدرآباد چھوڑ کر اعظم گڑھ میں سکون سے بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام پورا کرنے کا پلان بنانا وغیرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابتدا میں نہ تو علی گڑھ کے دُشمن تھے اور نہ اس کے متوازی کوئی تحریک چلانا چاہتے تھے اور اس وقت تک انہیں ندوہ کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔

ایک چیز اور، جو قابل غور ہے، یہ ہے کہ اگر واقعی شبلی کسی دشمنی کی بنا پر علی گڑھ چھوڑتے تو وہ وہاں سے نکلنے کے بعد فوراً ہی کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کرنے اور ندوے کے پلیٹ فارم سے انہی دنوں ایک متوازی تحریک چلا دیتے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وہ بہت زود اشتعال طبیعت رکھتے تھے اور جس کی مخالفت پر اُتر آتے اُسے نقصان پہنچانے کے لئے کسی مناسب موقعہ کا انتظار نہ کرتے۔ ایسی حالت میں ان کا حیدرآباد میں داغ کی صحبتوں میں غزلیں کہنے اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر "علم الکلام"۔ "الکلام"۔ "الغزالی" اور "موازنہ" جیسی ٹھوس علمی کتابیں لکھنا (جس کے لئے ذہن کی یکسوئی ضروری ہے) ناممکن تھا۔ اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں پیش کروں گا

۱؎ "آخرکار مجبوراً علامہ شبلی نے استعفیٰ دے دیا مگر پرنسپل بیک نے یہ سمجھ کر کہ شبلی کا اس حلقۂ اربابِ وفا سے نکل جانا اور بھی مُضر ہوگا۔۔۔ استعفیٰ نامنظور کر دیا۔۔۔ ۔۔۔ اس کا جواب بیک نے یہ دیا کہ آنریری سیکرٹری یا ٹرسٹیوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ میرے کسی ماتحت کو میری مرضی کے خلاف موقوف کر دیں۔۔۔ ۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے آپ پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔" (علامہ اقبال سہیل / سیرت شبلی / الاصلاح فروری ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۰۲)

۲؎ ذرا اس سلسلہ میں حمید الدین فراہی کے نام شبلی کا خط ملاحظہ ہو۔ "واقعہ یہ ہے کہ بیک صاحب اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ یہاں مشاہیرہ قیام کروں لیکن سید محمود دفعتاً اس کے مخالف ہو گئے اور اپنی اسی حالت میں بہت سی باتیں کہیں۔۔۔ ۔۔۔ میں تو اُس دن سے آج تک سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں۔" (مکاتیب ۱۸۳) یہاں لفظِ "دفعتاً" غور طلب ہے

کیونکہ اس کا تعلق منطق سے نہیں، نفسیات اور عقل سے ہے۔

سرسید کی موت کے بعد حالات نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور حالی، محسن الملک اور وقار الملک نے مخالفت ترک کرکے اور شبلی نے ایک پُر درد عربی خط اور ایک مضمون لکھ کر مرحوم کی دوستی اور ان کے کارناموں کا حق ادا کر دیا۔ لیکن علی گڈھ اب مکمل طور پر یوروپین اسٹاف کے ہاتھ میں چلا گیا اور پانی سر سے اس قدر اُونچا ہو گیا کہ سید محمود کے انتقال کے بعد محسن الملک بھی حالات کی رَو میں بہہ گئے۔ وقار الملک نے حالی سے اسی کی شکایت کی تھی :۔

"میں جو اب کی مرتبہ علی گڈھ گیا تھا تو نواب محسن الملک بہادر کو وہ واقعہ یاد دِلایا جس سے میری غرض یہ تھی کہ ایک تو وہ وقت تھا کہ جب وہ اس مقصد کے واسطے سرسید کی بھی پروا نہ کرتے تھے، یا آج وہ دِن ہے کہ خود اس سے زیادہ غلطیاں کر رہے ہیں۔"

اُدھر شبلی پر اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے وہ علی گڈھ کی قومی قیادت سے مایوس ہوتے گئے اور بالآخر حیدر آباد (دکن) میں جب سیاسی اتھل پتھل ہوئی تو وہاں سے الگ ہو کر انہوں نے ندوہ کے پلیٹ فارم سے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ وہی تحریک تھی جس نے ابوالکلام آزاد کے کارہائے نمایاں کے لئے دروازے کھولے اور جس کی بنیاد پر شبلی پر "شیخ الکل" بننے کی ہوس کا الزام لگایا گیا۔ میں نہیں جانتا کہ قومی کام میں "شیخ الکل" بننے کی خواہش کے مجرم ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ سرسید کے انتقال کے بعد کھُل کر سیاست کے میدان میں آئے اور وہ بھی ایک مدہم اور سُست رفتار ردِّ عمل کے بعد۔

ندوہ میں شبلی کی جس سیاسی تحریک کا آغاز ہوتا ہے وہیں اس کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے اور ندوہ ہی ان کی سیاسی موت کا باعث بن گیا۔ در اصل ندوۃ العلماء میں وہ جس جماعت کا سدھار کرکے مُلک کی رہنمائی کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے اس کی نفسیات سے شاید وہ اچھی طرح واقف نہیں تھے (ورنہ ایسی غلطی وہ ہرگز نہ کرتے) یہ وہ قوم ہے جو دُنیا کے ہر گوشہ، ہر مذہب اور ہر فرقہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

راجندر ناتھ رہبر

غزل

طبیب چھوڑ نہ جاتے تو اور کیا کرتے
وہ مجھ فراق کے مارے کی کیا دوا کرتے

ہماری آپ سے رغبت خطا سہی لیکن
خطا یہ آپ سے ہوتی تو آپ کیا کرتے

خموش رہ کے سہے ہیں ہمیں نے اُن کے ستم
وہ بابِ لُطف و کرم کیوں نہ ہم پہ وا کرتے

مُریدِ شیخ جی رندوں کو کر لیا ہوتا
یہ مے کشی جو کہیں آپ بر ملا کرتے

سمجھ کے غیر کا گھر آ نکلتے میرے گھر
تم اپنے قول کو بھُولے ہی سے وفا کرتے

ہم اپنی جان کے دشمن نہیں تھے بندہ نواز
ہم اعتبار کہاں تک جناب کا کرتے

ہم اُن سے کہہ نہ سکے اپنا حال اے رہبر
دِلوں پہ چھایا تھا رُعبِ جمال کیا کرتے

ابنِ فرید ایم اے (علیگ)

ادب کا رُوپ

ادب کے لئے یہ دَور اگر حقیقت پسندی کا دَور قرار دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ حقیقت پسندی کی اصطلاح ایک زمانے میں اپنے مخصوص معنی رکھتی تھی۔ اس سے مُراد ایک خاص طبقے یا ادبی گروہ کے نظریات و افکار کی عکاسی تصوّر کی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان معنی میں ایک صحت مند تبدیلی واقع ہوئی۔ خاص طور سے میراجی، منٹو، کلیم الدین احمد، ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری اور پنڈت کشن پرشاد کول نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ رشید احمد صدیقی نے بھی جب ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا تو بڑے نپے تُلے الفاظ میں حقیقت پسندی کے مفہوم کو واضح کیا۔ ادبی حلقوں میں اس اصطلاح کے متعین معنی کے سلسلے میں جس بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا اس نے صرف اصطلاح کے متعین معنی میں ہی تبدیلی نہ پیدا کی بلکہ اس کے ساتھ اُردو ادب کو ایک نیا ذہن بھی دیا۔ سوچنے کے لئے نئی راہیں بھی کھولیں اور ادب کے نئے عصری تقاضوں کو سمجھنے پر بھی آمادہ کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کے سلسلہ میں اجتماعی شعور اور منظم غور و فکر کا سلیقہ ہندوستان کیا، مشرق کو بھی مغرب سے میسّر آیا ہے۔ ہمارے ادیبوں نے تہذیبی، تمدّنی، سیاسی اور اقتصادی اکتساب کے ساتھ ادبی اکتساب بھی قابلِ لحاظ حد تک مغرب سے کیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنی فکری و نظریاتی نشوو نما کے ڈانڈے بہ آسانی مغرب سے مِلا دیتے ہیں۔ اسے بعض حلقوں میں احساسِ کمتری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ الزام اپنی جگہ پر بالکل دُرست سہی لیکن اس حقیقت سے کہاں انکار کیا جا سکتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ صدی سے ہندوستان زندگی کی ہر جولاں گاہ میں مغرب کے مقابلے میں بُری طرح سے احساسِ کمتری کا شکار رہا ہے اور اب آج کا دَور وہ دَور ہے جس میں ہر مُلک مغرب کی فوقیت کے سامنے سرنگوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں اجتماعی شعور کے فروغ کے ساتھ مغرب کے متضاد نظریات و افکار بھی مقبول ہو گئے۔

ان افکار و نظریات میں جو رُوح کار فرما ہے، اس کی افادیت سے تو انکار کیا جا سکتا ہے، لیکن ادب کے بارے میں آج یہ بات کہنا سراسر زیادتی ہوگی کہ وہ زندگی کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کی طرف مائل نہیں ہے یا اُس کی رہنمائی کے لئے اعلیٰ صلاحیتوں سے تہی دست ہے۔ البتہ جب زندگی کی رہنمائی یا اس کی اصلاح کا سوال سامنے آئے گا تو ہمارے لئے یہ جائزہ لینا ضروری ہو جائے گا کہ ادب زندگی کی تعمیر کے لئے جو کچھ دے رہا ہے وہ کس معیار کا ہے؟ زندگی کے افادہ کے لئے اس کا نظریاتی اور فکری سرمایہ کِن صلاحیتوں کا حامل ہے؟

اگر اجمالاً ان مسائل کا حل ہم تلاش کرنا چاہیں تو بنیادی طور پر ہمیں یہ نہ بھُولنا چاہیئے کہ زندگی کا افادہ صرف اسی میں مضمر ہے کہ بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبُود اور اس کی متوازن و پُر امن زندگی کے امکانات زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ انسانیت کی مادّی ترقی، اس کے علم اور ذہن میں اضافہ ہی متوازن اور پُر امن زندگی کی ضمانت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اس مواد سے کون سا محفوظ و مامون محل تیار کرے۔ گویا زندگی کے ساتھ اس وقت تک انصاف نہیں کیا جا سکتا جب تک نظریاتی طور پر بالغ نظری نہ حاصل ہو جائے! اور ادیب صرف چند حدود میں مقیّد رہنے کے بجائے فائدہ یا نقصان کے دُور رس نتائج کا ادراک نہ کر سکے۔

ادب کے لئے جب ایسے سنجیدہ طرزِ فکر کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اکثر اوقات اپنی صلاحیتوں سے موزوں کام لینے کے بجائے ادب کے مناصب کی متنوع تشریحات یا حقیقت پسندی کے مختلف معنی پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ در اصل ایک جھنجھلانے والی کیفیت ہے۔ ادب کی تاریخ ایسے حقائق سے تہی دست نہیں ہے جو اس کی اہمیت، افادیت اور اثرات کو پیش کرتے ہوں۔ ادب نہ صرف زمانہ کے مزاج سے اپنا مزاج بناتا ہے بلکہ جواباً اپنے مزاج سے زمانے کے مزاج کو بھی متاثر کرتا ہے۔

شمع جب روشنی دیتی ہے تو خود بھی جلتی ہے۔ زندگی کے بارے میں ماحول کی جبریت کے سامنے بے دست و پا ہو جانا دراصل ایک طرح کا احساسِ شکست ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہم ادب میں وہی پیش کر رہے ہیں جو زمانے میں ہو رہا ہے یا ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا، یہ دُرست ہے، لیکن جب سیلاب کے دو تند و تیز دھارے مدِمقابل ہو جائیں، تو جو قوی ہوگا وہ اپنے ساتھ کمزور کو بہا لے جائے گا۔ ماحول کی جبریت کے سامنے اگر ہم خس و خاشاک بن جائیں گے تو یقیناً اس کے ساتھ بہہ جائیں گے لیکن اگر اپنے اثرات خود اس پر بھی مرتب کرنا چاہیں گے تو ہمیں شعوری آمادگی اور نظریاتی تربیت کی ضرورت ہوگی۔ ماحول اگر ہمیں بدل سکتا ہے اور ہم اس کے مقابلے میں ہمیشہ مجہول رہتے ہیں تو ناتراشیدہ جھاڑیوں کی طرح ہمارے مفاسد ہر طرف بڑھتے جائیں گے۔ اب اسے ہم چاہے جتنا حقیقت پسند کہیں اور اس کی چاہے جتنی ہی عکاسی کریں، لیکن اس طرح کی کوئی مفاہمت کبھی ممکن نہ ہو سکے گی، کیونکہ ہماری عکاسی کے بعد اس کے اثرات اور شدید تر ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ زندگی افادہ کے بجائے فساد کی طرف بڑھتی چلی جائے گی۔

اس مرحلہ پر ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم ماحول کے مقابلے میں ستیزہ کاری کر سکتے ہیں تو ہمیں ادب کے ذریعہ کیا پیش کرنا چاہیئے؟ یہ سوال اپنی جگہ پہ خواہ کتنا ہی اہم ہو، مگر زندگی پر بحیثیتِ کُل سوچنے کے بعد کچھ اور مسائل بھی ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ ہم اسے کیونکر گذارنا چاہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک کیا محمود ہے اور کیا نامحمود؟ مزید برآں اس شعوری فیصلے کے بعد یہ بھی پیشِ نظر رکھنا کہ خود زندگی کونسی ہیئت اختیار کر رہی ہے اور کیا بحیثیتِ مجموعی یہ نوعِ انسان کو سماجی اور ذہنی ارتقاء کی طرف لے جا رہی ہے یا نہیں؟ ان مسائل کا حل جب ہم تلاش کریں گے تو ہمیں خود ایک ذہن بنانا ہوگا جو زندگی کے ساتھ زیادہ سنجیدگی کا رویّہ اختیار کر سکے۔ اُسے ایک بہتر نظم کا پابند بنا سکے۔ جب یہ ذہن بن جائے گا تو وہ ادب میں بھی "حقیقت پسندی" کے بہتر رُوپ کی طرف مائل ہوگا۔ وہ اپنا کام صرف اتنا ہی تصوّر نہ کرے گا کہ سماج کو برہنہ دیکھ کر دیکھتا ہی رہ جائے بلکہ اُسے چولی پہنانے کی بھی فکر کرے گا۔ وہ تماشائی نہ ہوگا بلکہ اپنے اندر غور و فکر اور اقدام کی صلاحیت بھی رکھتا ہوگا۔ وہ مفلوج اور ناکارہ انسان کی طرح صرف زبان ہی چلاتا نہ رہے گا بلکہ بڑھ کر اس فساد کے منبع پر پتھر بھی رکھ دیگا۔

ماحول کی جبریت سے انکار کرنے کے بعد ادب کی یہی افادیت اور ادیب کی یہی فعال صلاحیت سامنے آتی ہے۔ اُس پر معاشرہ کی بہت بڑی ذمّہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ وہ اگر حقائق سے صرفِ نظر کرکے محض خامہ فرسائی کرتا رہے گا، تو خود تو مشہور ہو جائے گا، لیکن آنے والی نسلوں کے لئے بس یو جائے گا۔ ہمیں ادب محض اس لئے نہ پیدا کرنا چاہیئے کہ اُس سے تسکینِ قلب یا لذت حاصل ہوتی ہے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر قلم ہاتھ میں لینا چاہیئے کہ ہم آیندہ نسلوں کے سلسلے میں ایک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

آیندہ نسلوں کی تعمیر کے سلسلے میں جو ذمّہ داری ہم پہ عائد ہوتی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ ہم اس فرض سے پُوری آگاہی حاصل کریں جو ہم پر معاشرہ کے ایک فرد کی "حیثیت" سے عائد ہوتی ہے۔ ایک فن کار معاشرہ کو بہت کچھ دے سکتا ہے اور دیتا رہا ہے۔ اس کے موئے قلم سے معاشرہ کا زبان گویا ہوتی ہے۔ اس کی فکر سے سماج کا ذہن جھلکتا ہے۔ اسی بنا پر اُسے یہ احتمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے دَور پر تنقیدی نظر ڈالنے اور اس کے تاریک گوشوں کو پیش کرنے کا تو ذمّہ دار ہے لیکن نہ وہ خود اپنی ذات میں کسی تبدیلی کے لانے کا سزاوار ہے اور نہ کسی عملی اقدام کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ جس لمحے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لئے کوئی متعین راہ منتخب کرے، اُس کی غیر جانب داری ختم ہو جائے گی اور وہ ناقدِ حیات کے مرتبہ سے محروم ہو جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، وہ سماج پر انگشت نمائی کرنے کا تو حقدار ہے لیکن خود کسی کو اپنے آپ پر انگشت نمائی کا مجاز تصوّر نہیں کرتا۔ "حقیقت پسندی" کا یہ مفہوم میری اپنی ذہنی اختراع نہیں ہے۔ منٹو کا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ میراجی نے بھی اپنی حقیقت پسندی کے ذریعہ اس سے مختلف کوئی چیز پیش نہیں کی۔

یہ صرف دو نام ہیں۔ بہت سے ناموں کا گِنانا کوئی ادبی کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ وہ تمام تحریریں، جو ایک منفی تاثر یا سفلی جذبات کی تسکین اور عوام کی بے نام "خواہشات" کی تکمیل فراہم کرتی ہیں، ایسے ہی مریضانہ ذہن کی عکاس ہیں۔ ادیب کو قرطاس پر فنّی گل کاری کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ اس نے کتنے رنگوں کا انتخاب فنّی تقاضوں کی بنا پر کیا ہے۔ کتنے [illegible] اُس نے عوام کی بصیرت [illegible] کرنے اور محض بصارت کو [illegible] کر لینے [illegible] پیدا کئے ہیں۔ اس دَور کے منتخب افسانوں اور شعری تخلیقوں کا اگر آپ جائزہ لیں تو خود اندازہ ہو جائے گا کہ محبت کے نام پہ بوالہوسی کو صرف اس لئے جزوِ ادب

بنایا جاتا ہے کہ تخلیق کے یہی مرحلے قاری کو ایک طرح کے جنسی جنون میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ لذت آمیزی کے سیلاب میں بہہ کر فن کار کی بھونڈی سے بھونڈی پیش کش کو سینے سے لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ فن کار اس گر کو کسی اچھے جذبے کے تحت استعمال نہیں کرتا؛ مگر جب تنقید کی کسوٹی پر یہی کھوٹ نمایاں ہونے لگتی ہے تو فن کار چیخ اٹھتا ہے اور اپنی لغزشوں کے لئے ہزاروں جواز تلاش کرنے لگتا ہے۔ کبھی مصحفی، امیر مینائی، مومن اور غالب کے حوالے دینے لگتا ہے تو کبھی خود ناقد کی کور ذوقی کو چیلنج کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ادب میں وہ مرحلہ آجاتا ہے کہ ناقد کو فن کار کے ساتھ اور عوام کے ناتربیت یافتہ ذوق کے ساتھ مصالحت کرنی پڑتی ہے۔ جوش کا غیظ و غضب اور فراق کی جھنجھلاہٹ کون بھول سکتا ہے؟ یہ اردو ادیب کی فراریت پسندی کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کے نعرے بھی حقیقت پسندی اور تعمیر معاشرہ کے لئے وقف ہیں۔ اس مضمون میں کسی منفرد فن کار کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، صرف اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ ایسے فن کاروں کی تمام تخلیقات سے اگر بنیادی فکر کے عوامل کو یک جا جمع کیا جائے تو کسی صحت مند معاشرہ کا خاکہ ہمارے ذہن میں نہیں ابھرتا، نہ اس کی کوئی نشان دہی ملتی ہے۔ اچھے برے اصول اس طرح خلط ملط نظر آئیں گے کہ آخری فیصلہ کی قوت ہی جواب دے جائے گی۔

ادب میں یہ نعرہ بہت عام ہو چکا ہے کہ فن کار پر کوئی قید و بند عائد نہیں کی جا سکتی۔ اس کی قوتِ تخلیق کو نہ تو پابند کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ایک ڈگر پر چلنے کے لئے اُسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں کلیت پسندی کا کوئی مقام نہیں ہے، مگر اس طرح کے وعدے کرنے والے اپنی ایک بنیادی فروگذاشت سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ ادیب کو شاید کوئی ایسا فرد تصور کرتے ہیں جو معاشرہ میں پیدا نہیں ہوتا؛ معاشرہ میں پروان نہیں چڑھتا، معاشرہ کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ وہ کسی اور دنیا سے اچانک نازل کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ اس باختگی کے عالم میں جو کچھ دیکھتا جاتا ہے اس پر "فن کارانہ" تنقید کرتا جاتا ہے۔ کتنا بھونڈا تصور ہے یہ فن کار کے بارے میں! اگر فن کار اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اور اُسے ایک معاشرہ میسر آیا ہے تو یقیناً اپنی شخصیت کی تعمیر میں وہ اپنے معاشرے سے بہت کچھ اکتساب کرے گا، کیونکہ شخصیت کی تکمیل معاشرے کے اثرات کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ ذہن، مزاج اور طرزِ زندگی ہر فرد اپنے معاشرہ سے حاصل کرتا ہے اور ان میں بقدرِ ضرورت تبدیلی بھی لاتا رہتا ہے تاکہ زندگی کے برتنے ہوئے، جب نئے حالات نئے تقاضے نئے مسائل کھڑے کر دیں تو وہ زندگی کا توازن نہ کھو سکے۔ متوازن زندگی کے اسی محور پر ادیب یا فن کار کو بھی گردش کرنا ہوگا۔ اگر وہ اپنے آپ کو ماورا تصور کرتا ہے تو اختلال (Abnormality) کا شکار ہوگا۔ اور اُسے اپنے آپ کو کسی ذہنی معالج کے سپرد کرنا پڑے گا ورنہ سوچنا ہوگا کہ وہ جو کچھ ادب کے ذریعہ معاشرہ کو دے رہا ہے۔ کیا وہ اتنا ہی افادہ بخش ہے جتنا کہ اس نے معاشرہ سے اکتساب کیا ہے؟

ادیب کو اپنے معاشرہ کا بہی خواہ بن کر رہنا چاہیئے۔ یہی اس کا منصب ہے۔ وہ خواہ کلیت پسندی کا قائل نہ ہو، مگر اُسے ہمیشہ اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ معاشرہ کے بغیر وہ نہ اپنا ذہن بنا سکتا ہے اور نہ مزاج! وہ معاشرہ کے وجود کے بغیر نہ تو اپنے فن کی تخلیق کر سکتا ہے اور نہ اس کے لئے تحسین حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حقیقت یہ ہے کہ خود اس کے اصولِ فن معاشرہ کے بغیر متعین نہ ہو سکیں گے۔ جب وہ اس قدر معاشرہ کا دست نگر ہے تو اُسے چاہیئے کہ ایک طرف اظہارِ فن کے لئے خواہ قید و بند قبول نہ کرے مگر ذہن و فکر کی تربیت اور نقطۂ نظر کی ترویج کے لئے صحت مند اثرات کو اس حد تک قبول کرے کہ وہ اس کا مزاج بن جائیں۔ بات پھر کچھ کلیت پسندی کی سی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے اپنے مافی الضمیر کو مثالوں کے ذریعہ واضح کرنا ناگزیر ہوگا۔

میر کی شاعری کا ایک مزاج ہے۔ غالب کے پورے کلام میں بہ حیثیتِ مجموعی وحدتِ فکر ملتی ہے۔ اقبال کے یہاں ایک سوچا سمجھا پیغام ملتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے شعوری طور پر ایک تہذیب کا انتخاب کیا ہے۔ نثر میں بھی حالی، شبلی، رتن ناتھ سرشار وغیرہ نمایندگی کر سکتے ہیں۔ ان سب کے ذہن و فکر میں پختگی تھی۔ ان کے مزاج میں ان کی فکر اس طرح جذب ہو گئی تھی کہ ان کی ہر ادبی کاوش میں اس کا جھلکنا ناگزیر تھا۔ معاشرہ اگر ادیب اور فن کار سے کسی طرح کی اصول پسندی کا متقاضی ہے تو وہ یہی ہے تاکہ ادب واقعتاً حقیقت پسند بن سکے اور اس کے ذریعہ آیندہ نسلوں کی صالح اور صحت مند تعمیر ہو سکے۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم ادب کی نئی تشکیل کرنا شروع کریں گے تو ہمیں اپنے بہت سے پرانے بتوں کو توڑنا ہوگا، نئے اصولوں کو اختیار کرنا ہوگا مگر نتیجتاً جو ادب اس نئے روپ میں تخلیق کیا جائے گا وہ معاشرہ کے لئے دردِ سر بنے، معائب کو ہوا دینے اور اخلاقی پستی کو عام کرنے کی بجائے، امن و سکون کا ضامن اور اعلےٰ اقدارِ حیات کا علمبردار ہوگا اور اس دور میں ہمیں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے۔

محمد اسحٰق صدیقی

چاند پر کیا ہے؟

بہت پُرانے زمانے کی بات ہے کہ انسان پہاڑ کی کھوہوں میں رہا کرتا تھا۔ اُس وقت اُسے نہ کھیتی باڑی کرنا آتی تھی اور نہ آگ جلانا۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے جانوروں کو پتھر سے مار کر شکار کرتا تھا اور اکثر خود اُن کا شکار ہو جاتا تھا۔ رات میں اگر کوئی جانور اُس پر حملہ کر دیتا تو اندھیرے کی وجہ سے وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکتا تھا۔ اگر چاندنی رات ہوتی تو البتہ اُسے اپنی جان بچانے کا موقع مِل جاتا تھا۔ اس لئے وہ دِل ہی دِل میں چاند کا احسان ماننے لگا۔

پھر جب انسان نے کھیتی باڑی کرنا شروع کی تو ٹھیک وقت پر فصل بونے اور کاٹنے کے لئے دِنوں اور مہینوں کا گننا ضروری ہوگیا اور اس کے لئے اُس نے چاند سورج کی مدد لی۔ جب سورج ایک بار نکل کر ڈوب جاتا اور دوسرے دِن پھر نکلتا تو اس بیچ کی مدت کو دِن کہتے۔ انسان نے یہ بھی دیکھا کہ چاند چودہ دِنوں تک آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور چودہ دِنوں تک آہستہ آہستہ گھٹتا ہے، اور ۲۹ ویں یا ۳۰ ویں دِن پہلے کی طرح باریک نظر آتا ہے۔ اس اُنتیس یا تیس دِن کی مدت کو اُس نے مہینہ کہا۔ چاندنی اور مہینہ، یہ دونوں چیزیں چاند سے تعلق رکھتی ہیں اور بڑے کام کی ہیں۔ اِسی لئے جب انسان نے مختلف چیزوں کی پُوجا شروع کی تو چاند کو بھی ایک رحم دِل دیوی سمجھ لیا۔ چاند کا مرتبہ اگر کسی سے کم تھا تو وہ سورج دیوتا تھا۔

رفتہ رفتہ بعض لوگوں کے دِلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دُنیا کا کوئی بنانے والا ہے اور اُس نے سورج کو دِن میں روشنی دینے کے لئے اور چاند کو رات میں روشنی دینے کے لئے بنایا ہے۔ چاند اور سورج دو قندیلیں ہیں جو آسمان کی چھت سے لٹک رہی ہیں۔

بعض آدمی غور کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ چاند ایک بڑا آئینہ ہے جس میں زمین کے پہاڑوں کا عکس پڑتا ہے۔ لیکن کسی کے دماغ میں آیا کہ خود چاند پر اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ بھلا کوئی اس بات کا کیسے یقین کرتا جب تک خود اپنی آنکھوں سے چاند کے پہاڑوں کو دیکھ نہ لیتا؛ لیکن انہیں دیکھنے کے لئے ضروری تھا کہ یا تو انسان چاند پر جائے یا خود چاند کو اپنے سے قریب لائے — دُوربین کی ایجاد سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔

سن ۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک عینک ساز کو ایک انوکھی ترکیب سوجھی! اُس نے ایک نلکی کے اندر عینک کے چند شیشوں کو جوڑ کر ایک آلہ بنایا۔ جس سے دُور کی چیزیں قریب نظر آتی تھیں۔ جب اس کی خبر اٹلی کے مشہور سائنس دان گلیلیو کو ملی تو اُس نے سوچا کہ یہ "جادُو کی نلکی" چاند تاروں کو دیکھنے کے لئے بڑی مفید ہو سکتی ہے۔ گلیلیو نے سن ۱۶۰۹ء میں خود اپنے ہاتھ سے ایک دُوربین بنائی جو اگرچہ آج کل کی دُوربینوں کے مقابلے میں بڑی بھونڈی تھی تاہم اُس سے وہ چیزیں نظر آتی تھیں جو گلیلیو سے پہلے کسی نے نہ دیکھی تھیں۔

گلیلیو نے دُوربین کی مدد سے چاند کو بھی دیکھا اور اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ چاند، جسے شاعر اتنا خوبصورت بتاتے ہیں، داغی ہے۔ اُس کے چہرے پر چیچک کے ایسے داغ ہیں۔ دراصل یہ داغ چاند کے حلقہ نُما پہاڑ ہیں۔

جب یہ پتہ چلا کہ چاند ہماری زمین کی طرح ایک دُنیا ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دُنیائیں ہیں تو انہیں دیکھنے کے لئے بڑی بڑی دُوربینیں بنائی گئیں۔ جیسے جیسے بڑی بڑی دُوربینیں بنتی گئیں، چاند کے بارے میں ہماری معلومات بڑھتی گئیں۔ پہلے تو دُوربین سے دیکھ کر چاند کے نقشے بنائے گئے، پھر دُوربین میں کیمرہ جوڑ کر چاند کے فوٹو لئے گئے۔ چاند کا سب سے بڑا نقشہ ۲۵ فٹ چوڑا ہے۔ اسے ایک انگریز پی، ولکنس نے ۱۲ سال میں بنایا اور ۱۹۴۶ء میں دُنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ اس نقشے میں چاند کے تقریباً ایک لاکھ مقامات ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ نقشہ چاند کے اُس رُخ کا ہے جو ہمیں نظر آتا ہے۔ چاند کی گردش کا حساب کچھ اس طرح ہے کہ ہمیں اس کا دوسرا رُخ دکھائی نہیں دیتا۔

چاند کے خاص خاص مقامات کے نام گلیلیو کے بعد کے عالموں نے رکھے تھے

نام اس لئے رکھے گئے کہ چاند کے مختلف حصوں کو پہچاننے اور اُن کے بیان میں آسانی ہو۔ یہاں ہم چاند کے صرف نظر آنے والے حصے کا بیان کرتے ہیں۔ اس کا ایک چھوٹا سا نقشہ اگلے صفحوں پر ملے گا۔

(۱) حلقے نما پہاڑ

چاند کی خوبصورتی محض اس کی روشنی کی وجہ سے ہے۔ اگر آپ دُوربین سے اُسے دیکھیں تو تعجب کریں گے۔ چاند کے چہرے پر چیچک کے ایسے داغ نظر آتے ہیں۔ چاند کے یہ داغ دراصل حلقے نما پہاڑ ہیں۔ اگر آپ زمین پر ایک بڑا سا گڑھا کھودیں اور اُس کی مٹی کنارے کنارے جمع کر دیں تو یہ صورت حلقے نما پہاڑ کی ہوگی۔ ان میں سے بڑوں کو "گھیرے والے میدان" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہاڑوں سے گھِرے ہوئے ہیں اور چھوٹوں کو "دہانے" کہا جاتا ہے۔ دہانہ دراصل آتش فشاں پہاڑ کے مُنہ کو کہتے ہیں۔ جب کوئی ایسا پہاڑ آگ برساتا ہے تو اُس کی چوٹی اُڑ جاتی ہے اور اُس کی جگہ ایک گڑھا بن جاتا ہے۔ زمین پر آتش فشاں پہاڑوں کے جو دہانے ہیں وہ آس پاس کی زمین سے بہت اُونچے ہیں۔ چاند پر ایسے دہانے کم پائے جاتے ہیں۔ چاند کے اکثر دہانوں کا فرش، باہر کی سطح سے نیچا ہے۔ دہانوں کی دیواریں باہر سے جتنی اُونچی ہیں، اندر سے اُس کی دُوگنی گہری ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی آدمی باہر سے دہانے کی دیوار پر چڑھے تو اُسے دہانے کے فرش تک پہنچنے کے لئے باہر کا دوگنا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔



بعض دہانوں کا گہراؤ باہر کی چڑھائی سے تگنا یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ عموماً دہانوں کی دیواریں اندر کے مقابلے میں باہر کی طرف زیادہ ڈھلواں ہیں اور بعض کی تو اندر کی طرف قریب قریب سیدھی ہیں۔

چاند کے اُس رُخ پر، جو ہمیں نظر آتا ہے تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) دہانے ہیں۔ یہ چند گز سے لے کر کئی میل تک چوڑے ہیں اور ان کی دیواریں ہزاروں فٹ اُونچی ہیں۔ سب سے بڑا دہانہ ایک سو ستر (۱۷۰) میل چوڑا ہے۔ یہ دراصل ایک گھیرے والا میدان ہے جس کا نام بیلی ہے۔ سب سے گہرا دہانہ نیوٹن ہے، جس کی گہرائی تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) فٹ ہے۔ اگر ہم اس میں ایورسٹ کی چوٹی کو اُٹھا کر رکھ دیں تو وہ باہر سے نظر نہ آئے گی۔ ایورسٹ زمین کی سب سے اُونچی چوٹی ہے جس کی بلندی ۲۹،۰۰۰ فٹ ہے۔ سُورج کی روشنی پڑنے سے چاند کے دہانے کافی چمکتے ہیں۔ چاند پر سب سے چمکدار جگہ ارسٹارکس کا دہانہ ہے۔

چاند کے بعض دہانے جُڑواں ہیں، یعنی دو دہانے آپس میں ملے ہوئے ہیں بعض دہانے زنجیر کی صورت میں ایک دوسرے سے جُڑے ہیں اور بعض جھاگ کی صورت میں پاس پاس جمع ہیں۔ اکثر بڑے دہانوں کے اندر چھوٹے دہانے پائے جاتے ہیں۔ بعض میں ایک اور بعض میں کئی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ پھر ان چوٹیوں کے "مُنہ" بھی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔



بعض دہانوں میں دُھواں دیکھا گیا ہے۔ نومبر ۱۹۵۸ء اور اکتوبر ۱۹۵۹ء میں ایک رُوسی سائنس دان نے الفونسس نامی دہانے کو آگ برساتے دیکھا اور اس کی تصویریں کھینچیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کے بعض آتش فشاں پہاڑ اب بھی گرم ہیں۔

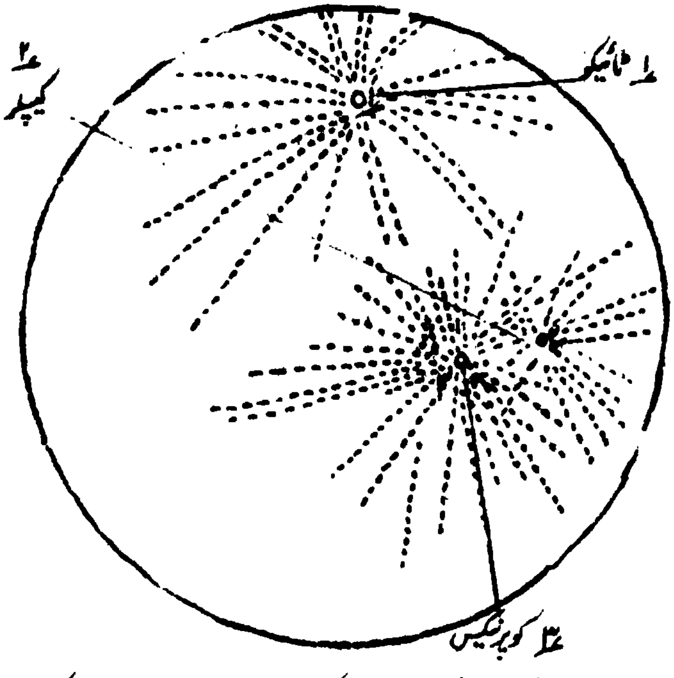
(۲) انوکھی کرنیں

دُوربین سے دیکھنے پر چاند کے بعض دہانوں سے چمکدار لکیریں نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں "کرنیں" کہتے ہیں۔ یہ پانچ سے لے کر دس میل تک چوڑی ہیں اور پندرہ سو (۱۵۰۰) میل تک لمبی ہیں۔ سب سے زیادہ اور سب سے لمبی کرنیں ٹائیکو نام کے دہانے سے نکلتی ہیں۔ ایسی تقریباً سو (۱۰۰) لکیریں ہیں جو سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ہر اُس چیز پر سے گذرتی ہوئی چلی جاتی ہیں جو ان کے راستے میں آتی ہے۔ یہ سب صاف اُس وقت نظر آتی ہیں جب چاند پُورا ہوتا ہے ان کی چمک بعض جگہ دھبّوں کی صورت میں ہے۔

ـــــــــــــــ

لہ صفحہ نمبر ۶۶ پر چاند کا جو نقشہ ہے اُس میں صرف بڑے دہانے دکھلائے گئے ہیں اگر چھوٹے دہانے بھی دکھلائے جاتے تو نقشہ بڑا گِچ پِچ ہو جاتا۔ اسی خیال سے دہانوں کے نام بھی نہیں لکھے گئے ہیں۔

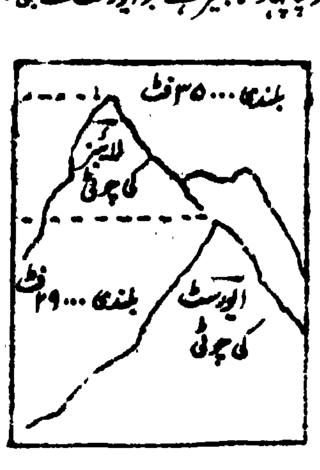
تعبیر



ان کرنوں کی اصلیت کیا ہے؟ اس کا کسی کو پتہ نہیں ہے۔ ایک خیال ہے کہ یہ آتش فشاں پہاڑوں کی راکھ ہے جو چاند کے دہانوں سے نکل کر دُور دُور تک چھا گئی ہے۔ چاند پر ہوا نہیں ہے، اس لئے راکھ کی یہ لکیریں جوں کی توں برقرار ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ کرنیں اُس گرد کی بنی ہیں جو چاند پر ٹوٹنے والے تاروں کے گرنے اور پھٹنے سے اُڑی۔

(۳) پہاڑوں کے سلسلے

پہاڑوں کے لمبے سلسلے چاند پر کم پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس طرح کے جو پہاڑ ہیں (تقریباً ایک درجن) اُن کے نام زمین کے پہاڑوں کے نام پر ہیں۔ مثلاً الپّشائی، کاکیشش، ایلپس وغیرہ۔ چاند کی جسامت کو دیکھتے ہوئے یہ پہاڑ بہت اُونچے ہیں۔ چاند کا سب سے اُونچا پہاڑ لائبنیز ہے جو ایورسٹ سے بھی ۶۰۰۰ فٹ زیادہ اُونچا ہے۔



چاند پر سب سے لمبا پہاڑی سلسلہ اپنیائن ہے جو ۴۰۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ۳۰۰۰ چوٹیاں ہیں۔

جہاں پہاڑ ہونا وہاں وادیوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وادی دو پہاڑوں کے درمیان کی زمین کو کہتے ہیں۔ چاند پر سب سے بڑی وادی اپیائن ہے جو اسّی میل لمبی اور تین میل گہری ہے۔

چاند پر ہوا اور پانی نہیں ہے، اس لئے وہاں کے پہاڑوں میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر چاند پر ہوا اور پانی ہوتا تو پہاڑوں کی چوٹیاں گھس جاتیں اور ان میں گولائی پیدا ہو جاتی۔ لیکن وہ اب بھی ویسی ہی نکیلی ہیں جیسی پہلے تھیں۔ اسی طرح چاند کے دہانے بھی اب تک پہلے جیسے بنے ہیں۔

(۴) بے پانی کے سمندر

چاند پر جو کالے کالے دھبّے ہیں اُن میں بعض کو انسان کا چہرہ نظر آتا ہے، بعض کو خرگوش اور بعض کو ایک بڑھیا، جو بیٹھی چرخہ کات رہی ہے، لیکن یہ سب باتیں دل بہلانے کی ہیں۔ دراصل یہ دھبّے بڑے بڑے میدان ہیں۔ جن لوگوں نے چاند کے پہلے نقشے بنائے تھے وہ انہیں سمندر سمجھتے تھے اور انہوں نے ان کے بڑے شاعرانہ نام رکھے تھے جو اب تک چلے آتے ہیں۔ مثلاً امرت کا سمندر، بادلوں کا سمندر، زرخیزی کا سمندر۔ اسی طرح چاند پر اوس کی کھاڑی[1]، دھنک کی کھاڑی، نیند کی جھیل اور نیند کی دلدل بھی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی میں پانی نہیں ہے اور نہ شاید کبھی تھا؛ جنہیں سمندر کہا جاتا ہے وہ چٹیل میدان ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے[2] سے بنے ہیں۔ یہ میدان چاند کے آدھے حصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا "بارش کا سمندر" ہے جو ۷۵۰ میل لمبا ہے دہانوں کے مقابلے میں یہ سورج کی روشنی پڑنے سے کم چمکتے ہیں۔ اسی لئے سیاہ دھبّوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان میدانوں میں بعض جگہ لمبے لمبے شگاف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند پہلے پگھلی ہوئی حالت میں تھا اور جب وہ ٹھنڈا ہونے لگا تو اُس کی سطح جا بجا چٹخ گئی اور لمبی لمبی دراڑیں پیدا ہو گئیں۔ یہ دراڑیں سیکڑوں میل لمبی ہیں۔ لیکن ان کی چوڑائی اور گہرائی کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے۔

---

[1] پانی کا وہ حصہ جو خشکی میں دُور تک چلا جائے اُسے کھاڑی یا خلیج کہتے ہیں جیسے خلیج بنگال یا بنگال کی کھاڑی۔

[2] لاوا اُس پگھلی ہوئی آگ کو کہتے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں سے نکلتی ہے۔ یہ آگ دراصل زمین کے اندر کی پگھلی ہوئی چٹانیں ہوتی ہیں۔

(۵) پتھر کے بُلبلے

چاند کے بعض حصوں میں گنبد ایسے نظر آتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب چاند پگھلی ہوئی حالت میں تھا تو اُس کی سطح پر بڑے بڑے بُلبلے اُٹھا کرتے تھے۔ کیونکہ اندر کی گیس باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اور جب وہ زور کرکے نکلی تو لاوے کا ایک بڑا سا بُلبلہ بن گیا۔ اسی طرح بُلبلے بنتے رہے اور پھوٹتے رہے۔ ان میں سے جو پھوٹے نہیں اور سخت ہوگئے وہ اب بھی موجود ہیں اور جو پھوٹ گئے اُن کے کنارے باقی رہ گئے۔ یہی چھوٹے دہانے ہیں۔

(۶) گرد کی تہیں

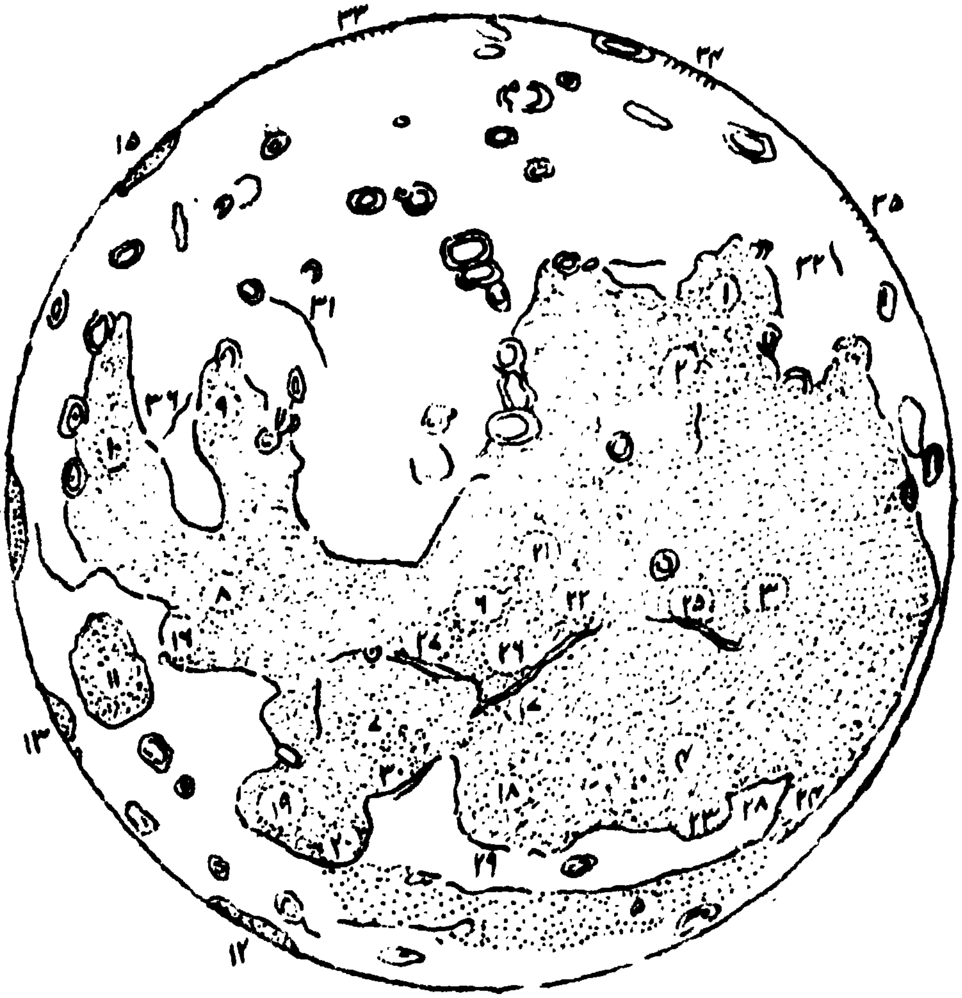
سپاٹ اور ڈھلوان چٹانوں کو چھوڑ کر چاند کی کُل سطح گرد سے ڈھکی ہوئی ہے لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اُس کی تہہ کتنی موٹی ہے (بعض سائنس دان اُس کا چند انچ موٹا ہونا بتاتے ہیں اور بعض ایک میل) یہ گرد کچھ تو آتش فشاں پہاڑوں کی راکھ ہے۔ کچھ چٹانوں کے ٹوٹنے سے بنی ہے اور کچھ ٹوٹنے والے تاروں کی گرد ہے۔ آتش فشاں پہاڑوں سے آگ کے علاوہ راکھ بھی کافی مقدار میں باہر نکلتی ہے۔

چاند پر سردی گرمی بہت ہوتی ہے۔ گرمی سے چٹانیں پھیلتی ہیں اور سردی سے سُکڑتی ہیں۔ درجۂ حرارت کے بار بار اور زیادہ بدلنے کی وجہ سے چٹانیں کمزور ہو جاتی ہیں اور اُن کے پَپڑ اُکھڑنے لگتے ہیں۔ ٹوٹنے والے تاروں کی گرد چاند پر دو طرح سے جمع ہوتی ہے۔ ایک تو گرد کے وہ ننھے ننھے ذرّے جو خلا میں اُڑتے پھرتے ہیں اور دوسرے وہ گرد جو ٹوٹنے والے تاروں کے چاند پر گرنے اور پھٹنے سے پیدا ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ چاند کے بعض دہانے بھی اسی طرح بنے ہوں!

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے چاند کے "جغرافیہ" کا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی چیز کو دُور سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، اس لئے اب انسان چاند کو دُور سے دیکھنے کے بجائے قریب جاکر دیکھنا چاہتا ہے۔ چاند تک پہنچنے کے لئے تیزی سے تیاریاں ہو رہی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ چاند پر جانے کے بعد کتنی نئی نئی باتوں کا پتہ چلے گا!

○ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے جن کے نام مشہور آدمیوں کے نام پر ہیں۔

▒ سمندر، جو دراصل لاوے کے میدان ہیں۔



(۱) نمی کا سمندر
(۲) بادلوں کا سمندر
(۳) طوفان کا سمندر
(۴) بارشوں کا سمندر
(۵) سردی کا سمندر
(۶) بھاپ کا سمندر
(۷) سکوت کا سمندر
(۸) سکون کا سمندر
(۹) امرت کا سمندر
(۱۰) زرخیزی کا سمندر
(۱۱) آفتوں کا سمندر
(۱۲) ہمبولٹ کا سمندر
(۱۳) کنارے کا سمندر
(۱۴) اسمتھ کا سمندر
(۱۵) دکھن کا سمندر
(۱۶) نیند کی دلدل
(۱۷) سڑنے والی دلدل
(۱۸) بادلوں کی دلدل
(۱۹) نیند کی جھیل
(۲۰) موت کی جھیل
(۲۱) بیچ کی کھاڑی
(۲۲) لہروں کی کھاڑی
(۲۳) دھنک " "
(۲۴) اوس " "
(۲۵) کارپیتھین پہاڑ
(۲۶) اپینائن "
(۲۷) ہیمس "
(۲۸) جورا "
(۲۹) آلپس "
(۳۰) کاکیشش "
(۳۱) الٹائی "
(۳۲) پرسی "
(۳۳) لائبنیز "
(۳۴) ڈارفیل "
(۳۵) رُک "
(۳۶) پیرے نیز "

حامدی کاشمیری

دو غزلیں

نگاہ و فکر کے آشفتہ پن کی یاد آئی
کسی کی زلفِ شکن در شکن کی یاد آئی

ترا خیال ہے یا ہے بہارِ رعنائی
تو یاد آئی، گل و یاسمن کی یاد آئی

میں خود ہی اُٹھ کے چلا تیری انجمن سے، مگر
ہزار بار تری انجمن کی یاد آئی

مرے ندیمو، مناؤ قفس میں جشنِ بہار
کہ آج مجھ کو بہت رِ چمن کی یاد آئی

تمہارے شہر کے عشرت کدے ہیں خوب، مگر
یہاں بھی کیوں ہمیں دار و رسن کی یاد آئی

وہ لمحے دے گئے احساس کو گلوں کا جمال
وہ لمحے جن میں کسی گلبدن کی یاد آئی

لرز کے چھٹ گئے دکن کی شام کے سایے
کبھی جو حامدی صبحِ وطن کی یاد آئی

کلی کا حسن سحر کے لئے ترستا ہے
یہ جلوہ، جلوہ نگر کے لئے ترستا ہے

وہ تشنہ کام، ترے میکدوں سے کیا مانگے
جو تیری ایک نظر کے لئے ترستا ہے

تم اپنے چہرے سے شبگوں نقاب سرکاؤ
زمانہ نورِ سحر کے لئے ترستا ہے

ترے جہاں میں سلگے غم کی آگ اے مطرب
کہ تیرا نغمہ اثر کے لئے ترستا ہے

یہ دِل اُٹھائے ہے جو تیری قربتوں کے ناز
غضب ہے، تیری خبر کے لئے ترستا ہے

جبینِ دل نے فقط ایک بار سجدہ کیا
وہ سجدہ جو ترے در کے لئے ترستا ہے

شری کوشک بکولا
وزیرِ مملکت برائے امورِ لداخ

لداخ —— شاہراہِ ترقی پر

لاماؤں کا وطن —— لداخ بودھ تہذیب اور علم و فن کا ایک قدیمی مرکز ہے۔ فلک بوس اور دیو قامت پہاڑوں اور بودھ خانقاہوں سے گھرا ہوا یہ علاقہ ہماری قدیم، متبرک اور شان دار روایات کا علم بردار ہے۔ لیکن ان گراں بہا خصوصیات کے باوجود صدیوں سے ریاست کا یہ پہاڑی ضلع مخصوص جغرافیائی حالات اور ذرائع نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے پس ماندہ رہا تھا مگر خوش قسمتی سے آج یہاں کے جفاکش اور بہادر عوام ریاست کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے دوش بدوش خوش حالی اور فارغ البالی کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں۔

ضلع لداخ وادیِ کشمیر کے شمال و مغرب میں کوہ ہمالیہ اور کیون لین کی آغوش میں ۹ ہزار سے ۱۳ ہزار فٹ کی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ وہاں اوسطاً سالانہ دو سے تین انچ تک بارش ہوتی ہے اور لوگوں کا سب سے اہم پیشہ زراعت ہے۔ عام طور پر یہ علاقہ پہاڑی ہے اور اس کا رقبہ ۳۷،۰۰۰ مربع میل اور آبادی ۸۰،۰۰۰ ہے۔ لوگ مختلف نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑے امن پسند، سادہ اور مشاق ہیں۔ صدیوں سے ان کے رسم و رواج اور طریقِ بود و باش میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

یہ سرحدی ضلع لیہہ اور کرگل کے دو تحصیلوں پر مشتمل ہے جن میں کُل ۲۳۹ دیہات ہیں۔ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد اس ضلع کی طرف خاص دھیان دیا گیا۔ چنانچہ ضلع میں مختلف تعمیری سرگرمیوں میں مناسب ربط اور گہرا تال میل پیدا کرنے اور یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک علیحدہ وزارت تشکیل کی گئی۔ چنانچہ پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران یہاں کے لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنے اور دوسری سہولیات بہم پہنچانے کے لئے گوناگوں قسم کے اقدامات کئے گئے اور اب دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی میعاد میں تعمیر و ترقی کا یہ کام اور آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

آج سارے لداخ میں اسکولوں، شفاخانوں، نرسری فارموں اور بہتر ذرائع نقل و حمل کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے اور لوگ اپنی روزمرہ زندگی اُمید اور اطمینان کے ماحول میں گذار رہے ہیں۔

ضلع نے گذشتہ برسوں کے دوران تعلیمی میدان میں نمایاں پیش قدمی کی ہے۔ متعدد اسکول کھولے گئے ہیں اور طلبا کو مناسب وظیفے دے کر کالج کی تعلیم پانے کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تحصیل لیہہ سے بیشتر طلبا کو اعلیٰ فنی تربیت دلانے کے لئے ریاست سے باہر بھیج دیا گیا۔ ان میں سے کچھ طلبا تربیت حاصل کرنے کے بعد واپس ریاست میں آگئے ہیں اور مختلف محکموں میں اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

غذائی اعتبار سے خسارہ کے اس سرحدی علاقہ میں غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے متعدد تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ چنانچہ رنبیر سنگھ پورہ اور کرگل میں دو زرعی توسیعی و نمائشی فارم قائم کئے گئے ہیں اور اجتماعی توسیعی سروس کے پروگرام کے تحت مقامی لوگوں کو بہتر بیج اور کیمیاوی کھاد استعمال کرنے اور بہتر زرعی طریقے اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے اور ضلع میں غیر آباد زمین کو قابل کاشت بنانے کی مہم بھی آگے بڑھائی جا رہی ہے۔ نیز علاقہ میں آب پاشی کی سہولیات کو ہمہ گیر فروغ دینے کے پیشِ نظر یہاں آب پاشی کی چھوٹی بڑی اسکیموں پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے۔ جابجا کوہلیں اور چھوٹی بڑی

نہریں بنائی جا رہی ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسرے پانسالہ منصوبہ کے اختتام پر اس باب میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی جائیں گی۔

مقامی لوگوں کو علاج و معالجہ کی بہتر سہولیات مہیا کرنے کی غرض سے یہاں طبیعتہ سروس کو بھی مستحکم بنیادوں پر اُستوار کیا جا رہا ہے۔ ماضی میں یہاں لیہہ، کرگل اور دراس میں صرف تین دواخانے موجود تھے۔ لیکن گذشتہ تین برسوں کے دوران یہاں کے مختلف مقامات پر متعدد دواخانے کھولے گئے ہیں اور لیہہ کے ہسپتال میں بستروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے سال کے دوران گاندھی آئی ہسپتال کے گشتی یونٹ نے علاقہ میں آنکھوں کی بیماریوں کے خلاف ایک ہمہ گیر مہم شروع کر دی تھی جس کے نتیجہ میں علاقہ میں اس بیماری پر بہت حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔

ضلع نے افزائش نسل حیوانات کے میدان میں بھی کافی قدم آگے بڑھائے ہیں۔ پہلے یہاں لیہہ میں صرف ایک معمولی سا شفاخانۂ حیوانات تھا لیکن آج یہاں لیہہ اور کرگل میں دو بڑے شفاخانجات حیوانات اور دراس میں ایک ویٹرنری ڈسپنسری کے علاوہ مرژسے میں بھیڑ اور مویشی پالنے کا ایک فارم بھی چالو ہے۔ علاوہ اس کے مویشی اور بھیڑوں کی نسل کو ترقی دینے کی اسکیم کے تحت مقامی بھیڑوں، بکریوں اور گائیوں کی نسل کو بھی بڑھاوا دینے کے لئے کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ متذکرہ صدر اسکیم کے تحت جان تھانگ سے نر اور مادہ دُمب (بھیڑ کی ایک قسم)، پشم دینے والی بکریاں، نر انسکار کے گھوڑے گھوڑیاں، لداخی اور کشمیری گائیں، بیل، دُمب اور ریمبولیٹ خریدے گئے ہیں اور انہیں گذشتہ برسوں کے دوران قائم کئے گئے افزائش نسلِ حیوانات کے فارموں میں پالا جا رہا ہے۔

گذشتہ کئی برسوں کے دوران ضلع میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لئے بھی کئی اہم تدبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ چناں چہ لیہہ اور کرگل میں تربیت اور بُنائی کے کئی نئے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی لوگوں کو کتائی، بُنائی اور ڈیزائن بنانے کی جدید تیکنیک سے رُوشناس کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان زیرِ تربیت اُمیدواروں کو زمانۂ تربیت کے دوران ماہوار ۴۰ روپے کا وظیفہ دیا جاتا ہے۔

ضلع میں ایندھن کی کمی پر قابو پانے اور زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لئے علاقہ میں جنگلات اُگانے کی مہم کو تیز تر کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ علاقہ میں سال ۱۹۵۸ — ۱۹۵۹ء کے دوران ۱۲۷،۰۹۱ درختوں کی قلمیں لگائی گئیں اور زمین کو کٹاؤ سے بچانے کے لئے علاقہ کے باغات کی دو ہزار مربع فٹ طویل دیوار بندی کی گئی ہے۔

یہ ہیں اُن تبدیلیوں کی چند جھلکیاں جو لداخ میں پچھلے کئی سال کے دوران رُونما ہوئی ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسرے پانسالہ منصوبہ کی تکمیل سے اس علاقہ کی سماجی اور معاشی زندگی میں اور تبدیلیاں آئیں گی اور یہ علاقہ پس ماندگی سے نکل کر ترقی اور خوشحالی کی راہ پر آگے بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

زراعت — قومی فلاح و بہبود کی اہم بنیاد

ریاست کی بڑھتی ہوئی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے گذشتہ کئی برسوں کے دوران گوناگوں قسم کے عملی اقدامات کئے ہیں:— بے کار زمین کو زیرِ کاشت لایا گیا۔ کسانوں کو بہتر بیج اور کیمیاوی کھاد مہیا کی گئی۔ آبپاشی کے ذرائع کو توسیع دی گئی۔ مزارعین کو جدید آلاتِ زراعت نیز موزوں طریقۂ کاشت سے رُوشناس کرایا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلے پانسالہ منصوبہ کے دوران جہاں ۱۴ لاکھ ۹۳ ہزار روپے خرچ کئے گئے وہاں دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں ۸۰،۴۲۲ لاکھ روپیہ صرف کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ زراعت کی ترقی ہماری ہمہ گیر ترقیات کا ایک حصہ ہے!

دوارکاناتھ گپتا
بی، ایس سی

جموّں وکشمیر کی معدنیات

جموں وکشمیر، جوکہ ہندوستان کے نقشہ میں ایک سرتاج کی طرح دکھائی دیتا ہے، معدنیات سے بھرپور ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ہندوستان کے چند ماہرین جیسے جناب سی، ایس میڈل مس (C.S. Middlemiss) واڈیا (Wadia) سمپسن (Simpson) سٹیورڈ (Steward) جوتی پرشاد (Joti Prashad) گاڈون (Godwin) اور لبھو رام (Labu Ram) نے ریاست کا سروے کیا۔ بعد میں یہ کام جیولاجیکل سروے آف انڈیا (G.S.I) اور تیل اور قدرتی گیس کمیشن (O & N.G.C) کی نگرانی میں ہوا۔ اس چھپی ہوئی دولت کا پورا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ لیکن پھر بھی اس وقت تک جن معدنیات کا پتہ لگایا جا چکا ہے اُن سے یہ قوی اُمید ہوسکتی ہے کہ ایک دِن ریاست جموں کشمیر خود اپنے کارخانے چالو کرے گی اور کافی حد تک بے روزگاری کے مسئلے کا حل بنے گی۔

مندرجہ ذیل معدنیات، جوکہ ریاست کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں، نیچے درج کی جاتی ہیں :-

(۱) فیولز (Fuels)

(الف) پٹرولیم :- تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے مانسر گاؤں میں پٹرولیم کی کھوج لگائی۔ یہ گاؤں جموں سے تقریباً ۳۰ میل مشرق کی طرف ہے۔ قدرتی گیس، جوکہ مانسر میں دریافت ہوئی، اُس سے پیلے رنگ کا شعلہ پیدا ہوا، اور یہ قدرتی طور تیل کی موجودگی ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا متوقع حصہ، جہاں کہ تیل دریافت ہوا ہے وہ مُراد پور (Muradpur) کے نزدیک ہے۔ یہ گاؤں تحصیل ریاسی میں ہے۔ یہاں ۱۹۵۸ء میں ایک پانی کے کنوئیں کی کھدائی کے دوران تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے تیل دریافت کیا۔ پٹرولیم جیولوجسٹوں (Geologists) کی رائے میں مانسر اور مُراد پور جوالامکھی تیل بلٹ کا ایک حصہ ہیں۔

جناب سی، ایس میڈل مس (C.S. Middlemiss) نے "نار بدن ڈوم" (Nar-Budhan Dome) جوکہ کھار ڈوم (Khaur Dome) (پاکستان میں) سے ملتا جُلتا ہے اُسے صوبہ جموں میں دریافت کیا۔ ان دونوں جگہوں میں چٹانیں (Rocks) عمر اور لیتھالوجیکل (Lithological) ایک جیسی ہیں اور پٹرولیم کوٹلی، راجوری اور نوشہرہ کے علاقوں میں مِل سکتا ہے۔ کشمیر میں بھی اس کے مِلنے کے کافی امکانات ہیں۔

(ب) پیٹ (Peat)

پیٹ ہندوستان کے چند حصوں میں ملتی ہے۔ یہ جہلم دریا کے الوبیم (Alluvium) اور کشمیر کی اُونچی اُونچی وادیوں کے دلدل میں بھی پائی جاتی ہے۔

(ج) لگنائیٹ (Lignite)

یہ گھٹیا قسم کا کوئلہ ہے۔ اس کو وادیِ کشمیر کا بھوُرا کوئلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ کشمیر میں ہندواڑہ کے علاقہ نیچی ہامہ (Nichahama) رائے تقن واقع تحصیل بڈگام اور وادیِ لولاب (Lanyalab) واقع شالی گنگا کے علاقوں میں کافی مقدار میں مِلتا ہے۔ جناب سی، ایس میڈل مس (C.S. Middlemiss) کی رپورٹ کے مطابق یہ کوئی ۱۲۸ لاکھ ٹن کے قریب ہے۔ فی الحال سال بھر میں صرف ۲۲۰۰ ٹن کوئلہ نِکالا جاتا ہے۔

نہر

لیکن اس وقت جموں وکشمیر گورنمنٹ اس کوئلے کو وسیع پیمانے پر نکالنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کرے گی۔ کشمیر کے بھورے کوئلے کے ساتھ جو مواد نکلتا ہے وہ قدرتی طور پر سیمنٹ بنانے کے لئے بہترین ہے۔

ریاست کشمیر کی نچھہامہ کی کان سے نکلنے والا لگنائیٹ اینٹیں پکانے کے لئے کچھ دیر ہوئی استعمال کیا گیا تھا اور یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا ہے۔ اس کامیاب تجربہ کے نتیجہ کے طور پر صرف سرینگر میں ہی جلانے کی تین لاکھ من لکڑی کی بچت ہوسکے گی۔ یہاں کچھ عرصہ سے ایندھن کی قلت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی توقع ہے کہ تجربے کی کامیابی اینٹوں کے بھاؤ میں، جو کہ اس وقت ۸۰ تا ۹۰ روپے فی ہزار ہیں، کافی حد تک کمی ہوگی۔

اس کے علاوہ یہ کوئلہ سرکاری دفتروں میں سردی کے موسم میں بخاریوں میں جلایا جاتا ہے۔ ریشم خانہ اور دوسرے بڑے بڑے کارخانوں میں بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لگنائیٹ کی ڈسٹلیشن (Distillation) پیداوار سے موٹر سپرٹ اور فینولز (Phenols) منافع پر تیار کئے جاسکتے ہیں۔

(د) کوئلہ (Coal)

کوئلہ کے زیادہ مشہور رقبے کالاکوٹ، مٹکا، ماہوگالا، چکھر، ڈونسال سولکوٹ وغیرہ ہیں۔ یہاں ایک کروڑ ۲۱ لاکھ ٹن کے لگ بھگ ذخیرے ہیں اور یہ جیولاجیکل کے مطابق ایوسین (Eocene) ٹین اور المونیم، تانبہ زنک، سیسہ وغیرہ اس کوئلے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی یہ کوئلہ ان کچھ دھاتوں (Ores) کے نکالنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ابھی یہ کوئلے کے ذخیرے پوری طرح سڑکوں کے ساتھ نہیں ملے ہوئے ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر پر ہم پنجاب کو بنگال کی نسبت سستے داموں پر کوئلہ فراہم کرسکتے ہیں۔ ہند کا ایوسین کوئلہ خاصیت میں تقریباً لگنائیٹک (Lignitic) ہے۔ لیکن ہماری ریاست کا کوئلہ انتھریسٹک (Anthracitic) خاصیت کا ہے۔ اس کی وجہ زمین کا کوئی ٹرشیری (Tertiary) عرصہ میں حرکت کا سبب ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کالاکوٹ کا کوئلہ سخت اور سیمی بٹیمنس (Semi bituminous) ہے۔ اس لئے اس کو مارکیٹ میں لانے سے پہلے فرائی کرکے کوٹنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی یہ کوئلہ کافی مقدار میں گندھک کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

(۲) کچی معدنیات (Ore Deposits)

(الف) گریفائیٹ (Graphite) یہ جموں کی کچھ کوئلوں کی کانوں کے ساتھ پایا جاتا ہے اور یہ پنسلیں، کالا تیل کا روغن، ڈرائنگ کی سیاہی، کاربن الیکٹروڈس (Electrodes) بنانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(ب) باکسائیٹ (Bauxite) سنہ ۱۹۱۹ میں تحصیل ریاسی کے چکھر گاؤں میں مسٹر سی۔ ایس۔ میڈل مس نے اس کچی دھات کو دریافت کیا۔ چکھر کے علاوہ یہ جنگل گلی، سکھوال گلی، سالال، پنہاسہ، سنکھر مرگ، پونچھ اور چاپر باری وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ صوبہ جموں میں یہ عموماً کوئلہ کی کانوں کے متوازی لائن میں ہی ملا ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ فرسٹ کلاس پتھر خام میں ایلومونیم کوئی ۷۰ سے ۸۰ فیصدی ہوگا۔ ایسے بڑھیا قسم کے پتھر کے خزانے کوئی ۲ لاکھ ٹن کے لگ بھگ ہوں گے۔ ڈی۔ این۔ واڈیا کے خیال میں ان ذخیروں کا وجود میں آنا لیٹریٹک (Lateritic) کہلاتا ہے۔

مسٹر سی۔ ایس۔ فاکس (C. S. Fox) کے خیال کے مطابق صوبہ جموں میں ایک سیرامک (Ceramic) فیکٹری قائم ہونی چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ میولائیٹ (Mullite) یا بناوٹی سیلیمنائٹ (Sillimanite) تیار کرنے کے لئے، جو کہ پگھلوں کو (Flame) شعلہ دیں۔ جموں وکشمیر گورنمنٹ کی طرف سے صوبہ جموں میں ایک سرامک فیکٹری تیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کی جارہی ہے جس کی مشینری یوگوسلاویہ سے لی جارہی ہے۔ صوبہ جموں کا باکسائیٹ اگرچہ زیادہ مقدار میں ہے اور جو کہ بیرز (Bayers) کے عمل سے ایلومینیا (Alumina) تیار کرنے کے لئے غیر موزوں ہے۔ جب کہ یہ کافی مقدار میں سلیکا (Silica) رکھتا ہے اور جو پیسنے میں سخت ہے اور اسے کاسٹک سوڈا کے ساتھ حل کرنا بھی مشکل ہے۔

جہاں تک کہ بجلی کا تعلق ہے وہ چندر بھاگا سے دان گڈھ سے میسر ہو سکتی ہے جو سلال باکسائیٹ کے نزدیک ہے۔

"کچی دھاتوں کو منافع پر کام میں لانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے اور صرف تجربہ کار آدمی ہی اس کو سرانجام دے سکتا ہے۔"

(۴) لوہا (Iron)

پُرانے وقتوں میں کچے لوہے سے صاف لوہا ریاست میں تیار کیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت رام بن پل سے ملتا ہے جو کہ دریائے چناب پر ہے۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ پل آس پاس کے لوہے سے جو کہ چکھر اور سالال کے علاقوں میں ملتا ہے، تیار کیا گیا ہے۔ علاوہ کھانڈلی واقع راجوری میں لوہے کی بہت سی کانیں ہیں۔ صوبہ جموں میں ریاسی کے اضلاع میں بھی یہ پایا جاتا ہے۔ خام لوہے کا پتھر بسنت گڑھ اور ڈوڈہ کے جنوب مشرقی سلسلہ کوہ میں بہت ملتا ہے۔ کالا کوٹ کوئلے کی کان کے نزدیک بھی خام لوہے کے ذخیرے معلوم ہوئے ہیں۔ صوبہ کشمیر میں لوہا اننت ناگ، برنگ، کرناہ، سیرے تحصیل ہندواڑہ، تحصیل اوڑی، گریز اور سوپور کے اضلاع میں پایا جاتا ہے۔ یہ ذخیرے اچھی طرح سے کھود کر نہیں نکالے جاسکتے ہیں جب تک کہ آمد و رفت کے ذرائع میسر نہ ہوں۔

(۴) تانبا، زنک اور سیسہ (Copper, Zinc and Lead)

تحصیل ریاسی کا علاقہ سلال گیستا سے لے کر سکھوال گلی تک خام تانبے کے پتھر کے لئے مشہور ہے۔ خام تانبا کے پتھر کی علامات دیگر جگہوں میں مثلاً کشتواڑ، کرگل اور زنسکار کے علاقوں میں بھی ملی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بانہال کے قریب چند سال پہلے معلوم ہوا تھا۔ یہ کوئی ایک میل لمبے خطہ میں ملا ہے۔ جست خام کا پتھر جسے زنک بلینڈ (Zinc Blende) کہتے ہیں سمت ۱۹۲۵ میں انچی وادی واقع دراہلی حصہ میں معلوم کیا گیا تھا۔ اس میں دس ہزار ٹن خام پتھر موجود ہونے کا اندازہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس جگہ اس پتھر کا بہت بڑا ذخیرہ ملے گا اور اس کچی دھات میں ۶۸ فیصدی جست اور ۳۲ فی صدی گندھک وغیرہ کی ملاوٹ ہے۔ زیدین دراہلی کا شمالی حصہ پہلے وقتوں میں سکے اور چاندی کے خام پتھر کے لئے بہت مشہور تھا۔

(۵) گیلنا (Galena)

سیڈ (Lead) کے ذخیرے گیلنا کی شکل میں وادی کشمیر میں بونیار (Bunyar) کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں اور رام سُو، کوٹلی اور کشتواڑ میں بھی یہ مل سکتا ہے۔ یہ کچی دھات گریٹ لائم سٹون کی سلیٹوں اور سِشٹوں میں موجود ہے۔ تحصیل ریاسی میں گیلنا لال پیلے اُوچرس (Ochreous) کے میٹل کے ساتھ ملا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۵ر۱ لاکھ

تعیر

ٹن گیلنا کشتواڑ میں پیدا کیا گیا ہے۔

(۶) ایلمے نائٹ (Ilmenite)

یہ صوبہ کشمیر میں وارکھا (Warakhawah) میں پایا جاتا ہے۔

(۷) میگنی سائیٹ (Magnesite)

یہ جموں و کشمیر میں صرف کرگل لداخ کی سڑک پر واقع شارگال (Shargol) کے نزدیک ملتا ہے۔ یہ قدرے سخت ہوتا ہے۔ یعنے ۶ — ۷

(۸) بیرائیٹس (Barytes)

اس کو سفید سُرمہ کہتے ہیں۔ یہ کچی دھات گریٹ لائم سٹون کے سوراخوں میں (Veins) پائی جاتی ہے۔ اس کو پٹرولیم اور گلاس کی فیکٹری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وادی انچیی میں واقع ننگل، کوٹلیاں کیان (Kotlian Khukian) اس کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا وجود گریٹ لائم سٹون کی نقل و حرکت کے کارن ہے۔ کیونکہ ان کی رہائش مقام فالٹیڈ لائن (Faulted boundary) کے میل یا تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن ان کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے۔

(۹) جپسم (Gypsum)

مسٹر ڈی، این واڈیا کی رپورٹ کے مطابق جپسم کشمیر کے اُوڑی ضلع (Uri) کے پہاڑوں میں کوئی ۲۵ میل سلسلۂ کوہ میں پھیلا ہوا ہے۔ لچھی پورہ اسلام آباد، بیگنا، کھتیاں، رام بن اور عسر اس کے لئے مشہور ہیں۔ رام بن اور عسر میں جیولوجیکل سروے آف انڈیا (G.S.I) کی ایک ٹیم نے ۱۹۵۷ ۱۹۵۸ء میں جپسم کی مفصل وجوہات معلوم کیں۔ بونیار (Bunyar) جپسم سے سیمنٹ اور سلفوریک ایسڈ موجودہ وقت میں آمد و رفت کی مشکلات سے تیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس کو تجویز کے طور پر چھوٹے پیمانے پر پلاسٹر آف پیرس (Plaster of Paris) تیار کرنے کے لئے استعمال میں لایا جائے گا۔ ۵ر۲ لاکھ روپیہ کی لاگت سے بارہ مولہ میں ایک فیکٹری قائم کی جارہی ہے۔

(۱۰) جم سٹون (Gem Stone)

(الف) نیلم :- کشمیر نیلم کا گھر کہلانے کے قابل ہے۔ اس کی کھوج سمت ۱۸۸۱

میں کی گئی تھی۔ نیلم کی کانیں گاؤں سُمجن (Soomjan) واقع پاڈر میں پائی جاتی ہے۔ یہ کانیں ۱۴۸۰۰ — ۱۴۹۰۰ فٹ کی بلندی پر ہیں۔ یہ علاقہ سال میں زیادہ دیر برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ دُھند، جو کہ سطح زمین پر چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ اس دھات سے دِل کش اور آنکھوں کو مسرت بنا دینے والے نظارے پیدا کرتی ہے۔ یہ وادیِ کشمیر کا ایک خاص عجوبہ ہے!

(ب) ایکومیرائین (Aquimarine)

یہ کم قیمتی ہیرا ڈاسا واقع والٹی ستان (Baltistan) میں پایا جاتا ہے۔

(ج) روبے لائٹ اور گرین ٹورملین

(Rubellite and green Tourmaline)

روبے لائٹ کے ٹکڑے نیلم کی کانوں سے سات میل دُور ایک مقام پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح گرین ٹورملین گرے نائٹ کے سوراخوں میں مِلتا ہے جو کہ نیلم کی کان سے ایک میل کے فاصلے پر ہیں۔ ٹورملین کی گرین قسم کو انڈی کو لائٹ (Indicolite) کہتے ہیں۔

(د) کواڈز (Quartz)

کواڈز کے ٹکڑے پاڈر اور کشتواڑ کی پہاڑیوں میں مِلتے ہیں اور شنگر وادی میں بھی یہ پائے جاتے ہیں۔

(س) سرپنٹن (Serpentine)

اس کو عام طور پر زہر مورہ کہتے ہیں۔ یہ شنگر وادی کی بلندیوں پر مِلتا ہے۔ یہ چائے کی پیالیوں، تمباکو کی پائپیں اور طشتریاں بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک فائدہ مند ہیرا کاٹنے والی (Gem Cutting) فیکٹری سرینگر میں تعمیر کی جاسکتی ہے۔

(۱۱) بلڈنگ میٹریل (Building material)

زی وان (Zewan) اننت ناگ، ہانسبل، اتھر داجن اس کے لئے مشہور ہیں۔ مسٹر ڈی، این واڈیا کے خیال کے مطابق ٹرائیسک (Triassic) کے چونے کے پتھر کشمیر کی پُرانی عمارتوں، مندروں اور مشہور مرلشے مارتنڈ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

(۱۲) سیمنٹ (Cement)

جموں وکشمیر گورنمنٹ نے سیمنٹ کی دو فیکٹریاں ایک جموں میں، دوسری سری نگر میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ریاسی میں موکل گاؤں سے جیولاجیکل سروے آف انڈیا ٹیم نے گریٹ لائم سٹون کی رینج سے اس کے نمونے لئے ہیں۔ سوائے انجیمی کے لائم سٹون تقریبًا دُو گنی تہہ میں ہے۔ گاؤں بانڈی پور واقع بارہ مولہ میں بھی ایسے ہی نمونے دریافت کئے گئے۔

تعمیر

(۱۳) عمارتی روغن (Mineral Paints)

صوبہ جموں کے گریٹ لائم سٹون (Great Lime Stone) میں کافی مقدار میں لال پیلا (Ochreous Material) جو کہ گرے فائٹ کی سلیٹوں میں پایا جاتا ہے، دریافت ہوا ہے۔ یہ روغنی عمارات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جموں میں اس کی ایک پینٹ فیکٹری ہے۔ بارہ مولہ میں بھی ایک ایسی ہی فیکٹری قائم کی جاسکتی ہے۔

خاتمہ

دوسری معدنیات جو کہ ہندوستان میں مِلتی ہیں وہ آرچین (Archean) عمر کا ذخیرہ ہیں۔ علاوہ ازیں اور کھوجیں یہ ثابت کریں گی کہ ہمالیہ کی سنٹرل رینج تقریبًا آرچین (Archean) چٹانوں سے بنی ہیں جو کہ راجپوتانہ، مدھیہ پردیش اور سنگم سے مشابہت رکھتے ہیں۔

ریاست کے مختلف علاقوں میں پوشیدہ معدنی دولت کے ذخیروں کو بھی ڈھونڈ نکالنے کی ایک ہمہ گیر مہم شروع کر دی گئی ہے۔ واقعی ان ذخیروں کا پتہ لگانے سے ہماری قومی دولت میں اچھا خاصہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ مرکزی حکومت نے ڈائریکٹوریٹ آف جیولاجی کا نیا محکمہ ریاست میں کھولا ہے۔ یہ سروے ٹیم ریاست کی مختلف معدنیات کی کھوج پُورے زور و شور سے کرے گی۔ فی الحال جنگل گلی میں کوئلہ رام بن میں جست اور ریتھر ہامہ میں لگنائٹ اور سمبہ ہال میں تانبے کی کھدائی کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ بہرکیف صنعتی میدان میں ہماری پیہم اور مسلسل پیش قدمی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آج ہماری ریاست صنعتی ترقی کے ایک نئے دَور میں داخل ہوگئی ہے اور واقعی یہ دَور ہمارے لئے اور ہماری آیندہ نسلوں کے لئے ایک بہتر اور روشن مستقبل کا پیامبر ہے۔ جب ریاست صنعتی ترقی میں پُورے طور اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگی تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کام کی ترقی ہمارے لئے ایک خوشی کا پیغام لائے گی اور اُس وقت قدرت بھی چِلا اُٹھے گی اور کہے گی "بہت اچھا!" "Nature will cry out and say well done!"

اے، کے پیر

کشمیری رسم الخط

اگر یہ مان لیا جائے کہ قدیم زمانے میں کشمیریوں نے اپنی زبان کے ادب کو محفوظ رکھنے کے لئے کوئی رسم الخط ہی ایجاد نہیں کیا تھا یا ان میں رسم الخط ایجاد کرنے کی استعداد اور قابلیت ہی نہ تھی یا قابلیت اور استعداد رکھتے ہوئے انہوں نے اس کی ایجاد کی طرف دھیان ہی نہ دیا ہوگا تو یہ فرض کرنا خلافِ قیاس اور خلافِ واقعہ ہے۔ کیونکہ کیا وہ لوگ، جو سنگتراشی، مصوری، نقاشی، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کے باکمال ماہر اور صناع تھے، اپنی زبان کا رسم الخط ایجاد نہ کر سکتے؟ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ضرور کیا ہوگا، جس کو طوفانِ حوادث نے لاپتہ کر دیا۔ باور نہیں تو قالین بافوں کے کارخانہ پر جائیے، دیکھئے، ٹیڑھی ترچھی بے ڈھنگی لکیروں اور نشانوں سے، جو کاغذ کے ایک ورقے پر ہیں، قالین باف کیا گلکاری اور کیا رنگ آمیزی بروئے کار لاتا ہے۔ کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ ہنر بڈشاہ کے زمانے میں ایران اور ترکستان سے یہاں آیا ہے، ہم کہیں گے چلئے آپ کا فرمانا ہی صحیح۔ لیکن کیا وہ لوگ جن میں دوسرے ملکوں کے نازک ہنروں کو اپنانے اور بلند پیمانے پر پہنچانے کی استعداد، لیاقت اور قابلیت ہے، ملکی ہنروں اور ضرورتوں سے لاپروائی برتنے والے ہو سکتے ہیں؟ اور ملکی اور قومی ضرورتوں میں رسم الخط سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے آوازوں کے نشانات ایجاد کرنا کونسی بڑی بات تھی! ہمارے پاس کشمیری زبان میں قدیم زمانے کا کوئی لٹریچر نہیں۔ اس واسطے اس بات کا کھوج لگانا کہ کشمیر کی ابتدائی زبان کیا تھی اور کس نوع کی تھی، نہایت ہی مشکل ہے؟ حروف کی آوازوں سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کی تحقیقات سائنسی طریقوں پر پرکھانے سے اطمینان بخش ثابت نہیں ہوتی۔

فارسی اور عربی الفاظ کے بارے میں، جنہوں نے کشمیری میں جگہ بنائی ہے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کی اصلیت نمایاں ہے۔ رہے وہ الفاظ جو ہمیں خالص کشمیری نظر آتے ہیں، قابل غور اور تحقیق ہیں۔ کیا یہ زبان کے ابتدائی وضع شدہ الفاظ ہیں یا ایک وقت پر کشمیری میں داخل ہو کر انہوں نے صورت اختیار کی ہے؟ یہ سوال فلسفۃ اللسان کے عالموں اور ماہروں کے لئے ہے۔ ایک تاریخی نظریے کے مطابق سنسکرت کشمیر کی ابتدائی زبان ہے۔ لیکن سنسکرت بذاتِ خود ویدک زبان سے نکلی ہوئی زبانوں کی ایک شستہ، پاکیزہ، دلکش اور دلربا صورت ہے۔ وہ صورت، جو اس نے ہندوستان میں پائی اور کچھ عرصے کے بعد جس کا گہوارہ کشمیر بنا۔

معلوم ہوتا ہے اور قیاس کا اتفاق بھی اس کے ساتھ ہے کہ سنسکرت کی خوبصورتی، پاکیزگی، خوش الحانی، ترنم، فصاحت اور بلاغت نے اصلی کشمیری زبان اور اس کے رسم الخط کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ بڑے بڑے پنڈت اور ودوان گھروں میں، بازاروں میں، سبھاؤں میں سنسکرت الفاظ استعمال کرنے میں اپنی شان تصور کرتے تھے۔ عوام کی زبان پر چڑھ کر بگڑی ہوئی شکل میں یہی الفاظ کشمیری بن گئے۔ کشمیریوں نے سنسکرت رسم الخط کو اپنایا اور اصلی کشمیری رسم الخط "معدوم ہو گیا۔ اس تغیر و تبدل کا پتہ ہمیں ان کشمیری" سابقوں اور لاحقوں سے ملتا ہے جو ہم بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً شینہ وُدن (برف کا پانی) چھلن وُدن (چاول یا ترکاری دھونے میں استعمال کیا ہوا پانی) یہ "وُدن" عام لاحقہ ہے۔ حالاں کہ پنڈت پانی کے لئے "پون" اور مسلمان "آب" بولا کرتے ہیں۔

للہ عارفہ اور شیخ العالم رح کے زمانے تک کشمیری پر سنسکرت کا غلبہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کا غلبہ شروع ہوا۔ جس طرح اسلام پھیلنے سے پہلے اگر کوئی کشمیری کشمیری زبان میں طبع آزمائی کرتا تھا اور

اپنے کلام کو سنسکرت رسم الخط میں لکھتا تھا۔ اسی طرح اسلام پھیلنے کے بعد اگر کوئی کشمیری زبان میں نظم یا نثر کے دھاگے میں خیالات کے موتی پروتا تھا، تو وہ فارسی رسم الخط استعمال کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں کشمیری زبان کی طبیعت کے موافق نہ تھے۔ اس حقیقت سے متاثر ہو کر کشمیری ادب کے دِل دادہ پنڈتوں نے سنسکرت کی بُنیاد پر " دیوناگری " رسم الخط ایجاد کیا جو ایک حد تک کشمیری کے لئے موزوں تھا۔ لیکن بعض لوگ فارسی رسم الخط ہی کو کشمیری لکھنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ فارسی رسم الخط میں اکثر کشمیری آوازوں کے لئے نشانات موجود نہیں (نہ حروف ہیں اور نہ اعراب) اس واسطے کشمیری کی جو گت اس رسم الخط میں ہوئی وہ پوشیدہ نہیں۔ اس طرزِ تحریر میں لکھی ہوئی کسی پُرانی کتاب کو پڑھیئے تو آپ پر یہ بات روشن ہو جائے گی۔

کشمیر میں ہندو راجوں اور مہاراجوں کے اقبال کا سُورج ڈوُبنے کے ساتھ ہی سنسکرت کی نُور فشانی بھی دھیمی پڑ گئی۔ لیکن مسلمان بادشاہوں اور سُلطانوں کے زوال کا اثر فارسی پر نہ ہوا۔ سکھوں اور ڈوگروں کے زمانوں میں بھی عدالتی اور کاروباری زبان بدستور فارسی رہی اور اس وقت تک رہی جب کہ اُردو نے ... ...

عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کی جگہ لی۔ اس ہندوستانی کا رسم الخط کچھ حرفوں میں معمولی اضافہ کر کے فارسی ہی رہا۔ مثلاً ت کے نقطے ہٹا کر ط کی زیادتی سے ٹ، ج میں ھ کی زیادتی سے جھ وغیرہ۔
کشمیر میں بھی اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا گیا۔ ... ... حکومت کی مشینری چلانے کے لئے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے انگریزی اور اُردو دان لوگ منگائے گئے۔ ساتھ ہی کچھ مدرسے بھی قائم کئے گئے جن کے اُستاد بھی پنجاب اور ہندوستان ہی سے منگائے جاتے تھے۔ یہ لوگ ہمارے اُستاد تھے کشمیری سے بالکل ناواقف، اُردو بامعنی روانی پڑھاتے تھے۔ مشکل فارسی یا ہندی لفظوں کے معانی اُردو میں بتاتے تھے۔ انگریزی کے معنی بھی اُردو ہی میں کرتے تھے۔ "ڈاگ" معنی کُتّا، کیٹ معنی بلّی، ریٹ معنی چوہا وغیرہ۔ ہم آپس میں پوچھتے تھے "کُتّا" کیا ہوتا ہے؟ خدا ہی جانتا ہے کہ ہم نے اُردو اور انگریزی زبانوں پر کیونکر عبور حاصل کیا! مجھے ابھی سمجھ میں نہیں آتا

تعمیر

اس کا اثر آج تک موجود ہے۔ اور ایک تربیت یافتہ، تجربہ کار مدرس انگریزی کے معنی کشمیری میں نہیں بتا سکتا۔ بلکہ وہی ڈاگ معنی کُتّا بچوں سے رٹواتا ہے۔ حالاں کہ ڈاگ معنی "ہُون" (کشمیری) چھوٹے بچوں کو آسانی سے ذہن نشین ہو سکتا ہے۔

عوامی حکومت نے نظام تعلیم کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی طرف توجہ کی ہے۔ ٹیکسٹ بُک کمیٹی قائم کی گئی اور اس کی سب کمیٹیوں میں سے ایک کمیٹی کے سپرد "کشمیری رسم الخط" تیار کرنے کا کام ہوا۔ اس کمیٹی نے کافی وقت لگانے کے بعد عربی رسم الخط کی بُنیاد پر "کشمیری رسم الخط" مرتب کیا۔ یہ رسم الخط چوں کہ نہایت پیچیدہ تھا، اور اس کے ساتھ ہی غیر سائنسی بھی، لہذا یہ کامیاب نہیں رہا۔ اس میں جو درسی کتابیں شائع کی گئیں، بچے اُن کو پڑھ ہی نہیں سکے۔ اس کے بعد حال ہی میں مروجہ اُردو رسم الخط میں تھوڑی ترمیم کے بعد ایک رسم الخط تیار کیا گیا ہے جو بہت حد تک ہماری مشکلات کو حل کرتا ہے۔ مگر اسے زیادہ بہتر بنانے کے لئے میں ذیل کی تجاویز ہمدردانہ غور کے لئے پیش کرتا ہوں:-

چوں کہ کشمیری ادب کے شائق، دِل دادہ اور سرپرست (جن میں ہمارے عظیم رہنما اور وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد پیش پیش ہیں) چاہتے ہیں کہ کشمیر کے پُرانے گم شدہ ادب کا کھوج لگایا جائے۔ ادب میں نئی رُوح پھونک کر اسے تازہ زندگی بخشی جائے۔ کشمیری ادب کا معیار بلند کیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کشمیری زبان کے لئے ایک ایسا رسم الخط تیار کیا جائے جو سہل اور آسان ہوتے ہوئے سائنسی بُنیاد پر قائم ہو، جس کو عام لوگ پسند کریں۔ سرسری نگاہ سے اُردو رسم الخط میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی کرنے سے یہ مقصد پُورا ہو سکتا ہے۔ اُردو حروفِ تہجی میں یا ان کی شکلوں میں کمی زیادتی کرنے کی یوں تو چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ صرف ان آوازوں کے حروف اور اعراب ایجاد کرنے کی معمولی تکلیف ہے جو خالص کشمیری ہیں۔ حروف میں شاید دو (۲) ہی حرف ہیں " ژ " اور " ژھ "۔

"ژ" ایک آواز ہے جو اُوپر اور نیچے کے دانتوں کو مِلاکر اور زبان کو دانتوں کے ساتھ لگا کر نکالنے سے پیدا ہوتی ہے۔ فارسی "ژ" اور "ج" کو مِلاکر پڑھنے سے جو آواز حاصل ہوتی ہے، یہ آواز قریب قریب اس سے ملتی جُلتی ہے۔

"ژھ" ایک آواز ہے جو زبان کے دونوں (دایاں اور بایاں) کناروں کو داڑھوں کے ساتھ لگا کر زبان کی نوک کو کھُلا چھوڑ کر نکلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ "ز" اور "چھ" مِلاکر پڑھنے سے جو آواز حاصل ہوگی "ژھ" کی آواز اسی سے ملتی جُلتی ہے۔

کشمیری مادری زبان رکھنے والوں کے لئے یہ آوازیں دُرستی سے نکالنے میں کوئی دِقت نہیں۔ غیر کشمیریوں کو چاہیئے کہ یہ آوازیں کشمیری سے سُن کر یاد رکھیں۔

اعراب، جو اُردو رسم الخط میں مستعمل ہیں، ان ہی میں قدرے ہیر پھیر کرکے کشمیری آوازوں کے لئے علامات قائم کرنا بہتر نظر آتا ہے:۔

ٓ (مد) َ (زبر) ِ (زیر) ُ (پیش) ْ (جزم) ّ (تشدید) ً، ٍ، ٌ (تنوین) کشمیری میں جگہ پائے ہوئے لفظوں میں بدستور اپنا کام جاری رکھیں گے۔

ٓ کا استعمال ابتدائی "ا" کے ساتھ ہی مخصوص رہنا چاہیئے جیسے "آؤ"۔ "آب" وغیرہ میں۔ فارسی اور عربی لفظوں میں تنوین کی علامت کو موجود رکھنا چاہیئے جیسے دفعتاً۔ اتفاقاً وغیرہ میں۔

کشمیری لفظوں میں "ن" لگانا چاہیئے۔ آنَن۔ کرَن وغیرہ میں۔

َ (زبر) کی حالتیں

َ عام مشہور علامت جیسے اُردو کَل۔ پَل اور مَن میں۔ کشمیری اَکھ (ایک) پَن (دھاگا) تَن (جسم) اس کی مثالیں ہیں۔

ٓ عام علامت۔ لفظ کا پہلا حرف اگر لمبی آواز والا "ا" ہو، اس پر استعمال کیا جاتا ہے جیسے اُردو آٹھ، آیا، آرام وغیرہ میں۔ کشمیری "آن" (لاؤ) آؤ (آجا)

ٚ یہ علامت اَ سے چھوٹی حرکت ظاہر کرنے کے موزوں ہوگی۔ ہندی अ (اَ) کو اور بھی چھوٹا کرنا ہے۔ اُردو امیر، کبیر، کلی، گلی میں جو شروع کے حروف کی حرکت کی آواز ہے اُسے اور بھی چھوٹا کرنا ہے۔ کشمیری زٕ (دو) ترٕ (تُو) ہٕٹ، مٕٹ (خواہ مخواہ) مثالیں ہیں۔

ٓٚ یہ علامت اُوپر کی علامت ٚ کی لمبی کی ہوئی حرکت کو ظاہر کرے گی۔ اس سے تقریباً وہی آواز حاصل ہوگی جو آ اور اُ کے بین بین ہوسکتی ہے۔ کشمیری ترٚ (سردی) ڈٚش (ڈنڈا) اس کی مثالیں ہیں۔

ٔ یہ نشانی وہ آواز ظاہر کرے گی جو امیر، کبیر، کلی، گلی کے پہلے حروف کی حرکت موجود رکھ کر درمیانی حروف نکال کر آخری حرف ساتھ لگانے سے حاصل ہوگی۔ کشمیری ژٔر (چڑیا) لٔر (مکان) گٔر (گھڑی) اس کی مثالیں ہیں۔

ٔ یہ علامت حرف کے اُوپر اور نیچے لگنے سے ایسی آواز پیدا ہوگی جو اُوپر کی حرکت ٔ کو لمبا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ کشمیری آٔٹھ (آٹھ) ژٔٹھ (دھاریاں) کیٔڑ (سبزی ترکاری کا سُوکھا ہوا تنا) اس کی مثالیں ہیں۔

ِ (زیر) کی مختلف صورتیں

ِ عام مشہور علامت جیسے اُردو بِل۔ اِس۔ گِن میں کشمیری نِ (لے جا) دِ (دیدو) رِکھ (لکیر) رِکھ (رِکھ) اس کی مثالیں ہیں۔

ِ یہ نشانی دو فائدے دے گی۔ جب حرف کے پہلے حرف کے نیچے آئے گی تو ایسی چھوٹی اور ذرا سی ترچھی زیر کی آواز ظاہر کرے گی جو فارسی زِ میں پائی جاتی ہے۔ فارسی "زِ مشرق بمغرب"۔ جس کشمیری لفظ کے پہلے حرف کی یہ حرکت ہوگی اس کا مابعد بھی ضرور متحرک ہوگا۔ جیسے کشمیری مِہ (مجھے) تِہ (تجھے) کِہ (کھا)۔ تِہٹ (بجھا ہوا) زِہت (گرم راکھ)

دوسرا فائدہ:۔ لفظ کے آخری حرف کے نیچے ہی یہ علامت ایک انوکھی آواز پیدا کرے گی۔ جو نہ مکسور اور نہ ساکن محسوس ہوگی! بلکہ بین بین میں! یُوں تو ایسے لفظ کا پچھلا حرف ساکن ہی ہوتا ہے، لیکن اس آخری حرف کے تلفظ پر اس طرح کا دباؤ ڈالنا ہوگا کہ زیر کی خفیف سی حرکت معلوم ہو۔ مثلاً "کُلِ عالم" کے فقرہ کو لیجئے۔ اس میں سے "عالم" کو ہٹاکر "کُلِ" ہی پڑھیئے۔ اگر اس لفظ کے پچھلے حرف کو بدستور متحرک رکھا جائے تو "کُلِ" پڑھا جائے گا۔ اور اگر "ل" کو ساکن بنایا جائے تو "کُلْ" پڑھا جائے گا۔ لیکن "کُلِ" کا تلفظ یہ ہوگا کہ "ل" نہ ساکن ہے اور نہ مکسور، بلکہ ان دونوں

تعمیر

حرکتوں کے بیچ میں۔ کشمیری کٟلۍ (درختاں) وٟلِ وٟلِ (جلدی جلدی) آسۍ (ہم) کٟنۍ (پتھر) اس کی مثالیں ہیں۔

ـٖ حرف کے نیچے یہ علامت زیر کی لمبی آواز پیدا کرے گی۔ (اِی) جیسے اُردو پیر۔ میر۔ کھیر میں۔ کشمیری سیٖر (اینٹ) زیٖن (کاٹھ) بیٖٹھ (بیٹھی) اس کی مثالیں ہیں۔

ـٟ یہ نشانی حرف کے نیچے آکر فارسی بہ۔ دِہ۔ سِہ کی آواز پیدا کرے گی۔ کشمیری ہٟرٕ (شعلہ) وٟس (سہیلی) سٟکھ (ریت) زٟن (گاما) اس کی مثالیں ہیں۔

ـٍ اُردو کے لے۔ دے کی آواز پیدا کرے گی۔ کشمیری تٍیر (خوبانی. دیر) نیٍر (نکل جا) رٍیل (ریل گاڑی) ہٍیہ (ارے) اس کی مثالیں ہیں۔

ـُ (پیش) کی مختلف آوازیں اور صورتیں

ـُ عام مشہور علامت اُردو بُلبُل، پُل، بُت میں۔ کشمیری کُل (درخت) ہُ (وہ) شُر (بچہ) گُر (گھوڑا) اس کی مثالیں ہیں۔

ـُو جب حرف علت "و" پہلے حرف کے ساتھ ہو اور پہلے حرف پر علامت (ـُ) ہو تو پیش کی حرکت لمبی ہوگی جیسے اُردو سُوت، مُول، پھُول۔ کشمیری نُون (نمک) ژُور (چور) کھُور (اُسترا) زُول (چراغاں) اس کی مثالیں ہیں۔

ـــ و جب لفظ کا دوسرا حرف "و" ہو اور پہلے حرف پر کوئی علامت نہ ہو تو پیش کی قدرے چپٹی آواز نکالو۔ جیسے اُردو ڈول، گول، چور، شور۔ کشمیری مول (باپ) ادل (گھونسلا) زور (زور) ژور (چار)۔

ـٗ یہ نشانی حرف پر لگانے سے ایک ایسی آواز پیدا ہوگی جو اُردو گول، ڈول، بول میں "و" کی لمبی آواز نہایت چھوٹی بنا کر خفیف پیش کا اثر قائم رکھتے ہوئے حاصل ہوگی۔ کشمیری میں "و" ساتھ رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کشمیری مٗل (قیمت) بٗن (نیچے) دٗس (دیوار) کٗل (نہر) اس کی مثالیں ہیں۔

ـۄ اُوپر کی نشانی ـٗ سے ملتی جلتی حرکت ظاہر کرے گی۔ یہ حرکت کشمیری کے بغیر اور کسی زبان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ کشمیری اۄن (اندھا) اۄر (درست، اچھا) مۄت (پاگل) شۄن (گہرا) کھۄر (گنجا) ڈۄگ (مکّا) اس کی مثالیں ہیں۔ غیر کشمیری کشمیریوں سے تلفظ سُن کر اس حرکت میں مہارت پیدا کر سکتے ہیں۔ فرق کے لئے دیکھئے:۔ سۄن (سونا) شۄن (گہرا) ڈگ (شالی کو موسلے سے کوٹنا) ڈۄگ (مکّا) کھۄر (پاؤں) کھرٗ (گنجا)

نوٹ:۔ وہ الفاظ جن کا پہلا حرف غیر متحرک ہو، دوسرا حرف متحرک "ر" یا "ی" ہو اور تیسرا حرف حروفِ علت و۔ ا۔ ی میں سے کوئی حرف ہو حرف علت کی حرکت کے مطابق بولا جائے گا۔ جیسے اُردو "کیا"، بیاج، پران، دراوڑ، فریم، کریم، میوزیم۔ کشمیری میّون (میرا) بیّن (علیحدہ) ژیّن (دیوار کا پایہ) پیّن (گرنا) نیّن (لینا) کیُتھ (کیسا) ہیُتھ (ایک جیسا) وغیرہ۔ کرٕہ (کوس) ترٕہ (تیس) شران (غسل، اشنان) ترام (تانبا) ترٚم (تھالی) وغیرہ

اعرابوں کو ایک نظر سے پہچاننے کے لئے ذیل کے دئے ہوئے نقشے مفید ثابت ہوں گے:۔

زبر کی مختلف آوازیں اور صورتیں

اعراب کی صورت	ـَ	ـٚ	ـٔ	ـٕ	ـٗ	ـٓ	لفظ کے بیچ میں یا آخر پر
کشمیری لفظ	تَر	تٚر	ترٔ	تٕیر	ترٗ	آو	تار
اُردو ترجمہ	اثر	نوک	کاغذ یا کپڑے کا ٹکڑا	درنگی	ٹھنڈ	آیا	دریا کا پاٹ

زیر کی مختلف آوازیں اور شکلیں

اعراب کی شکل	ـِ	ـٟ	ـٍ	ـٖ	ـٟـٟ
کشمیری لفظ	دِل	پٟل	رٍیل	ریٖل	وٟلِ وٟلِ
اُردو ترجمہ	دل	چھلکا	ریل گاڑی	دھلک کی ریل	جلدی جلدی

پیش کی آوازیں اور علامتیں

اعراب کی شکل	ـُ	ـُو	ـــ و	ـٗ	ـۄ
کشمیری لفظ	کُر	کھُور	کھور	کھرٗ	کھۄر
اُردو ترجمہ	اُلجھن	اُسترا	چڑھالیا	گنجا	پاؤں

غلام نبی خیالؔ

غزل

شفق چھُ از تہِ وۄزُل نار ہیوٗ ژٕہ ترٲو نظر
ژٕ‌یہ کٔمی وٕدۄنۍ چھُ گوٚمُت ضایہِ میوٚن خوٗنِ جگر

ژٕہ بانبر پو کمہِ؟ مہِ بانبر فضا چھُ از تہِ وسیع
وٕں گوو ژٕہ ژھکنہِ مِٹاواں پنُن یہِ حدِ نظر

سۭچھُ دُنیہَس پلہِ پیوٚمُت فقط یقیں تہِ وہم
تۄسے رٹان چھُ برسرِ ژھوٚرُوی تھزر تہِ بجر

اگر نہٕ چوٗن سُخن بادہِ دود چانہٕ دِلک
کھسی ژٕ‌یہ لَے تہِ اَماپوٗز بٔنِیس گژھی نہٕ اثر

قصیدہ خان بُنتھ کُسنہٕ ووت دربارس
مگر میٚہ ڈیٹھ نہ خاکس وۄتھان مُشکِ عنبر

تگن گرہی چھُ زمانس پزِس نبادہِ اَپزٕ
لگاں فرُوجہِ فسانن حقیقتس نہٕ بوٕ وَر

چھِ یار دوس تہِ زاناں میہ رُٹ وَتھاہ تہٕ رُٹم
مگر لیسی گژھہِ بڈۄنہہ کُن تُلیم سٕہ تو تہِ مژر

قرار نہکہِ چھُ راواں یہِ سِلسلاہ چھُ یتھوٗی
ہَجر بنان سیٚزر تَے سیٚزر بنان ہجر

عشق عنیق سمندر سنیٚر لَبِیس نہٕ کہیں
نظر کریٚاَیہِ میہ ہوسن مگر میہ راٲو نظر

اگر نہٕ میٹھہِ زباں وٕیہہ کھینتھی سو رِندی خام
یُس نہ تاب فراقُک تُسند عشق نہٕ پزر

سُنا یہ کارِ مُیسں دِل ذٕہیں تہِ گوو نہٕ بے کل
تسنٕز حیات بے حاصل تُسند مرُن بے حصر

گژھن سہ زالہِ شمع تَے بُزالہ داغ دِلکی
صُبح ژٕہ چھولنہٕ ژٕہ تو وَتھ وٕچھکُسند چھُ سحر

پیٚواں چھُ از تہِ میٚہ سوچُن یہِ موٚت خیال چھُ کیاہ؟
وَنوس یوٗرہٕ نصف شب وٕنان اورہٕ سحر

مسرور کولگامی

مرنس نکار

مہ چھم زندگی زندگانی شوبانی   مہ نوز تمنّا نوی نوجوانی
مہ چھم قدرِ تِچ رژ مدر مہربانی   مہ ریژھ مہربانی وُچھتھ دل برمانی
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

مہ گل ژُر فولمت چھ سرو سمن زن   وُکٹ چُھس تہ چھم مینز لاگت چمن زن
مہ اندانُد چھ گلگیر گتنی یاسمن زن   گمُت تازہ چھم زندگی ہُند چمن زن
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

مہ دُنیا لباوُن چھ ارمانی ہُند   عجب رنگ برنگ جان سامانی ہُند
مُدرس بھرتھ خاصہ پیمانی ہُند   کشش کوشش تیز ہنگامی ہُند
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

گژھن سیت یارن مہ منز پوشہ زارن   تلن دِ لور بموُ رسند نو بہارن
گژھت شالمارن وُچھن آبشارن   تمہ پیٹھ رِوان زندگی ہُند مُشارن
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ددیا

ژہ کیاہ زیر گوی چھم گژھن ویرناگے   مہ میون داد عیش چھ نشاط باغے
اژھن شاہی دلبرِس کوتہ زاگے   تتی تازہ یارانہ تس سیت لاگے
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

مہ منبہ زدلو تھاوِہ مت پیالہ رُبرُ   گلالو تہ سن پوشوی مالہ کرٔکرٔ
تمے مالہ تھوِہ شبنمن چھونہ جرٔ جرٔ   کرکھ بلبلو پاک اوراد پرٔ پرٔ
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

مہ برونہہ کنہ چھ نازک تہ نازل حسینا   حسیناہ عجب واہ عجب ماہ جبیناہ
فِدا چھس بہ نازن پیٹھ چھم ناز نیناہ   فدا چھس بہ دولت امی ناامی نا
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

بہ چھس زندہ چھم زندگی زندہ تھاوان   ہِنن زندگی پوشہ تھر اِمِش سجاوان
رِیخ تازہ دِنہار زن بولہ ناوان   فقط لولی منز بہ چھم تولہ ناوان
ژہ یود موتہ ریکھ تو تہ دن کیا بہ مریا
جدائی اِتھو چیزدی نِش بہ ذریا

شروٗک

راتھ پٔتھ اوس میٚہ سورٕدی ہسپتال کھیٚنہٕ یوان۔ زن آسہ لبہ تام میانی بارٕو دِوان۔ دایہ ہنز کتھ رٕوز میٚہ راتی راتس میٚنگہ گوران۔ یہ کاتژاہ وُلیہٕ کتھ اُس۔ یہ کتھ بوزتھ دوٚشوَیہ میٚہ کنہٕ فیٖرٕ تانی۔ یہے کتھ اُس نہٕ بہٕ آسہس وۄنۍ ہسپتالہ منز ژلن یژھان۔ امہ کنۍ نہ زہ میٚہ اوس نہ علاج وآتان۔ میٚہ آسو نہ ہسپتالکۍ مُلازم چھینٛنۍ تہٕ مور چھلہ کران۔ بہٕ کیاہ ونہٕ میٚہ کاژاہ خدمت اُس وآتان۔ اَدہ رات تورٕ میٚہ فکرہ زِہ امہ خدمتک مطلب کیاہ اوس۔ دایہ تہ نرسہ کیازہ آسہ میٚہ نفوکن اتھہٕ داران۔ میٚہ کتھ پٔتھ اوس یوٗت للہِ موٗت لاسے کرنہٕ یوان۔ میٚہ کیازہ اوس ہسپتالک انچارج ڈاکٹر محی الدین یوٗت مہربان۔ میانس وارڈس منز آسہ بیٚیہ کینٛہہ بیمار زنانہٕ تہٕ۔ اماپوز تمن اوس نہ کانہہ ستیکھ تہٕ ژھعنان۔ بہٕ چھس پوٚز زِہ دوٚد، شُوگل، ڈبل روٹ، تھٔوٗ، انجکشن تہٕ وٹامن پلہ آسہ تمن تہٕ میلان مگر میانہٕ خاطرہ اوس اہتمام زیادَے سپدان۔ میٚہ اوس ہفتس منز دوٚیہ ترٛیہ پھیرہ خبر کیتوک شوربہ تہٕ دِنہٕ یوان۔ دوٚیمہ ترٛیمہ دوٚہہ پلو بدلاونہٕ یوان۔ دایہ آسہ میٚہ پٔرتھ صبحن شُتہ چھلان۔ مس مژران، مس چھلان زنتہٕ میٚہ اوس پٔرتھ دوٚہہ دٕیوہ گون آسان۔ کسر اُس یژی زِہ آتھن اُسِم نہ ماننٛز ستھان۔

ڈاکٹر محی الدین اوس دوٚہس منز ژورہ پھیرہ میانس وارڈس منز دِوان تہٕ نرسن میون حال پرژھان۔ میٚہ اوس کنہٕ پھرہ پانہٕ دواچھاوان۔ نتہٕ پانہٕ ... بشن کران۔ ییٚلہِ گوڈنیکہ دوٚہہ میٚہ اکہ کمپونڈرن انجکشن کوٚر، میٚہ ہیٚنیا یہ سازٕی نرٕ۔ یوٗت زِہ ڈاکٹر محی الدین گو نارونار۔ تمۍ کرہ نود پانسس بڑونہہ کنہٕ میانہٕ نرہٕ شکورہ۔ اکہ دوٚہہ اوس نہٕ ہسپتالس منز اکھ انجکشن موجود۔ یہ اوس بیٚیہ اکہ ڈاکٹرن میانہٕ خاطرہ تجویز کوٚرمُت۔ ڈاکٹر محی الدینن گوڈہ پننہٕ چندہ منزہ پٔیسہ تہٕ بازارہ انہٕ نوٚون تمی وِزہ انجکشن۔

تمۍ تھوو سورٕدی ہسپتال اِستادٕہ۔ سارنی کمپونڈرن کرٕن بے عزتی۔ زن اوس کتھ تامت دِلو مٹیومُت!

"تمہ پتہ کونہ دۄلوہ میٚہ بۄنہہ زِہ یہ انجکشن چھنہ سٹاکس منز موجود" شاید آسہ بے یہ کتھ تمۍ لیچھ پھیرہ کمپونڈرن تہٕ بیٚین ڈاکٹرن پرژھمژ بیٚیہ زِہ ڈاکٹر تہٕ آسو امہ وِزہ موجود۔ تمن پھورلو نہٕ آن تہٕ۔ تم اُسو نظرہ بوٚن کٔن تھاوِتھ ژورہ ژورہ میٚہ کٔن وُچھان' زن اُسکھ تم سازٕی ژورہ ہانژہ رٕٹمتۍ۔ میٚہ گوٚو کیاہ تامت تمن کٔن وُچھنہٕ۔ میٚہ کرٕ پانٛزی پانس سٔیٹھاہ دوٚہ دٔہ۔ بہٕ نے یود لگہ ہا' یمن بیچارین کیازہ پٔیہے یژھ بیوآرٕی!

انجکشن کرنہٕ پتہٕ رٕوزس بہٕ واریاہس کالس سونچان۔

زِہ ڈاکٹر محی دینس کوتاہ خیال چھہ میون!

ڈاکٹر محی دینہٕ عمر آسہ ہے میانس ہیرس لالہِ میٚیبس سونٛ تہٕ تہٕ زیادہ، کم نہ کینٛہہ۔ اماپوز سانس لالہِ میٚیبس تہٕ ڈاکٹر محی دینس کاتژاہ فرق چھہ۔

ہسپتالکۍ مُلازِم چھنہ اپز کینٛہہ ونان۔ ڈاکٹر محی دین چھہ نیزہٕ پاٹھی دِوتا! مگر رات یوسہ کتھ اپٹہ دایہ وۄنۍ سو بوزِتھ پیوٚ میٚہ چیتس سورٕدی کینٛہہ یاد۔ ڈاکٹر محی دین اوس نہ ہُنتھ مُنتھ میٚہ پٔتھ یوٗت مہربان کینٛہہ تہٕ۔ میٚہ کتہٕ اُس خبر اُمس شیٹھہ دہرِس ترٛیٹھس رچھہ کوٚڈ یتھو خراب۔

بۄ ٲسُس رٲتۍ راتس سونچان۔ اتھ کینہہ کوتاہ خوش چھُ کران۔ اُمۍ سُند اسُن، اُمۍ سُنزٕ کتھ، اُمۍ سُند سفید شین ہیو گگرونُد، زان چھ ناید فٔلو۔ گر رات شامن یلہٕ سہٕ میٚہ نبض وُچھنہٕ خاطرٕ میانِس بسترس پیٹھ بیوٗٹھ۔مت گوم زِ ہسپتالکہ سٹرِنزٕ سیتۍ ژھنہٕ بۄ اُمِس یِہو ناید فٔلو اکہ اکہ نیبر لُدِتھ۔ اُمۍ کیاہ زانِنس بۄ یا میٚہ چھ نوٚزُک بیماری اگادِہ گیمٕژ یا یہ میٚہ چھنہٕ گر نیوٗل کانہہ شیچھ خبر پژھنہٕ یوان۔ توٚے ما زانِنس بۄ اُمۍ پیٹھے لجنٕژ ہش۔

میٚہ پھیوٗر سوٗروی پان بٔنیس طرفس کُن۔ بۄ اُسس نہ دوہٕ ژ اُمُند مُتھ تہٕ وُچھُن بژھان۔ اتھ منٛز چھُنہٕ کانہہ شک زِ رات کرِہ تمۍ پانہٕ تہٕ میٚہ سیتۍ سیٹھاہ کم کتھہ۔ تِمس اوس شیوٗ تہٕ کرِہ نٔے۔ ادٔے آسہٕ تمۍ سِنزٕ کرِہنہٕ حِشمہٕ زیادٔے کرِہنہٕ ژہ۔ ہتس کتھس دِلوتس میٚہ کُنُوی جواب۔ سہٕ تہٕ نہ زیٛوٗہ سیتۍ کینہہ۔ میٚہ ہیٚژھ زیادٕہ کلس کام — میٚہ زون زِ اُمِس چھُ کہ تانۍ دایہ وٗنمُت زِ میٚہ چھُ واپس گرٕ گژھنُک فیصلہ کوٚرمُت۔ تہٕ کیازِ یلہٕ میٚہ وُچھنہٕ پتہٕ سہٕ بٔنیس بیمارس وُچھنہٕ لٔگ، تس زان آسی اُتھ گنڈ یوان۔ یتھ کُنہ کھوٚکمُت گرٕ زیٹھو زیٹھو شاہ چھُ ہیوان، تیتھے کُنہٕ تراوی تمۍ واریاہ دوہٕ ش۔ تہٕ میٚہ کُن وُچھنہٕ وراٚے وُراو وارٕٹھہ منٛزٕ نیبر۔ پتہٕ آیہٕ نرس، تمہٕ بدلوو میوٗن دوا۔ میٚہ اوس صرف اکھ دٔوا خوراک چیوٗمُت۔ باقی اوس سوٗروی موجوٗد۔ نرسہٕ تروٗ دسیٚے تتی سوٗروی دٔوا کھوٚکرٕ پلچی منٛز۔ تمہٕ پتہٕ اوٚن تمہٕ اکھ بوتلہٕ کینٛتھ بدلہٕ دوا۔ میٚہ دوٚپ دٔپس زِ میٚہ چھنہٕ دوہٕ ژ دٔوا کینہہ چوٗن گر میٚہ ہیوٗک نہ دٔنِتھ۔ تہٕ کیازِ میٚہ اُس یہ نرس سیٹھاہ ناگُنہٕ۔ بۄ اُسس نہ اُمِس رعبہ یوان۔ تمہٕ دِیوٗت بوتلہٕ وارہٕ چھوک ہیوٗ۔ تہٕ اکھ دٔوا خوراک پھرِن پیالس اندر۔ میٚہ اُس ساریٛ نفرت گیمٕژ، میٚہ گیہ امہٕ دوا ہیچ تہٕ نفرت۔ اما پوز بۄ گوٚنس ترسہٕ مجبوٗر۔ اُمہٕ ہِنزٕ کوٚنہ کتھہ نہ دٔنس اوسنہٕ میٚہ وار۔ یہ اُس میٚہ زان لوکہ چاریچ دِنس۔ میٚہ اُس نہ پنٕنۍ کانہہ کتھ اُمِس نِش ژوٗرِہ تھاوِ مژ۔ تہٕ امہٕ اُس نہ پنٕنۍ کانہہ کتھ میٚہ دِنہٕ وراٚے تراوِ مژ۔ اُمِس اُس گرا صبحن ڈیوٹی آسان، گرا شامن۔ پزٕتھ کانہہ دائے اُس میٚہ سیٚے

شکایت کران زِ بۄ کیازِ چھس نہ تِمن سیتۍ تیتھہ کُنہ حمیدٕ ژ پاٹھۍ زلان میلان۔ بۄ کیازِ چھس نہ تِمن پنٕنِس مستس کنگوٗ دِنہٕ دِوان۔ بۄ چھس حمیدس ہپاران۔

پزٕر چھُ یہ زِ حمیدس چھنہ یہ کام ذِمہٕ کینہہ تہٕ زِ سو گژھہ بیمارن مس تہٕ پارٕ ٹی۔ یہ کام چھ داین ہنٛز۔ بۄ اُسس نہ داین مستس اتھہ تہٕ لاگنہٕ دِوان۔ خُدا زانہٕ اُہنٛد اتھہ کتھہ کتھہ چھ لگمتۍ۔ حمیدہ نیوٗ زاوِلیوٗ اتھو اوس میٚہ کنگوٗ کرانہ وٕنس منٛز بڈٕ مزٕ لگان۔ خاص کرِتھ تمۍ ہِنزن کتھن۔ سو اُس میوٗن مس پاران کہ کتھہ ونان۔ گرا اُسس منٛز منٛز میانِس مستس سیتۍ اُخت وُٹھ لاگان۔

"ژریٚہ کیاہ رووٗدی میلہٕ چیز گژھہ نہ وُٹھن لاگُن۔" بۄ تہٕ اُسس اُخت تِمس نصیحت کران۔ سو اُس گوڈٕ گوڈٕ نکار کران — "یہ ہسا آسہٕ ہی الہٕ گیبہ ژوٚگمُت!"

اما پوز اکہ دوہ وٗن میٚہ تمہٕ واٚلنج مٔژراوِتھ:

"ژریٚہ کیاہ چھوٗی پتاہ؟" تمہٕ کھوٚوٗ کنگوٗ دندن منٛز تہٕ بیٚیٹھو میٚہ لٹٕر پارٕ تہٕ۔

لٹٕر پاران پاران وٗن میٚہ تمہٕ: "چھک سہٕ بوزان!" زان تِمس اوس کانہہ راز باوُن۔

"چانہٕ اکہ مس وارٕ سیتۍ ہیٚکہ کانہہ تہٕ گٹہٕ چھس منٛز رات کیٚوتھ ساریسی شہرس پھیرِتھ۔"

سو اُس میٚہ بیٚیہ تہٕ خبر کیاہ کیاہ ونان۔ بۄ اُسس منٛدہٕ چھان امہٕ وِزہ اوس میٚہ پنٕنۍ پان مُشِت گژھان۔ ژ اس مُشِت گژھان۔ سہٕ آمہٕ تاوٕ مُشِت گژھان یُس میٚہ وُچھس اُندری اُندری شور اوس کوٚرمُت۔

دایہ ہنٛز کتھہ بوٗزِتھ پیٚیہ میٚہ رات رات کیوٚتھ حمیدٕ نہ تمہٕ ساریے کتھہ یاد۔ کیٚنہ اُسس ونان ڈاکٹر صیب کیازِ چھُ میٚہ صاف روزنُک مشورٕ دِوان۔ سہٕ اوس داین لیکھہ لیکھہ ہیوان زِ میٚہ گژھن نم کاسنۍ، مس چھلُن تہٕ پلو بدلنۍ۔

اکہ دوہ اُس حمیدن چھُٹی ہیٚژمٕژ۔ میٚہ اوس نہ امہٕ دوہ مس کینہہ

تہٕ چھولمُت نہٕ اوسُم کنگُو دِیُتمُت۔ ڈاکٹر محی الدین زاد میأنِس وارڈس اندر۔ گژھٕ ژھنیتھ آو میٲنِس۔ تہٕ کیازِ دروازِ اژونی اوس میٲنِس بسترس میٖنہٕ سیٖتی کنہ باتھ کرِتھ ودأنی یلہِ تمہ بیٖین زنانہٕ بیمارن ہُند معاینہ کوٗر، میٖنہٕ باسیہ ژھینیٖو اچھو فوران۔

تمہٕ کوٗر اُکس دایہِ آلو۔ اُمسی دایہِ یِہ رات، شامن ڈاکٹر محی دِینِہٕ صورت تہٕ سیرت اُنہٕ پٔنِک پانٹھو میٖنہٕ برٛونٹھہ لنہٕ تھاو۔

ڈاکٹر محی دین اوس مُلازمن پیٹھ خالی کنہٕ وِزِ نارٲض گژھان۔ اما پوٚز وز ہیوٚک تمہٕ پیٖنن علاجِ ژوٗرہ تھاوِتھ۔ سہٕ بیوٚٹھ خبر لیٖہ لیہ دایہِ ونہِ۔ باسان اوس زِ سہٕ چھُ تس بیوٗاری کران۔ ساری بیمار لگٔو صرف میأنِس بسترس کُن وُچھنہِ۔ یُہ ووزلیس تہٕ وودشلیس یلہِ میٖنہٕ پوٚز دایے اُس ڈاکٹر صٔیبس ونان:

"جناب یِہ چھا سون مانان۔ اُمس گژھِ حمیدا جی آسن۔"

یِہ بوزِتھ ہیوٚکنہ میٖنہٕ کانہہ بیمارس کُن وُچھت۔ میٖنہٕ ہیٖرہ کلہِ نلہِ کیٚر زادر۔

کیٚر زادرِ اندر کلہِ اُسِتھ تہٕ اوس میٖنہٕ باسان زن ڈاکٹر محی دینن سیاہ چشمہٕ تھلِ تھلِ میٖنہٕ کُن وُچھان۔ میٖنہٕ چھُنہ یاد میٖنہٕ کیازِ پییہِ امی وِزِ نیٖندر۔ اتھ نیٖندرِ اوس تیوٗت مزہ زِ زٕہ دَوا خوراک رووی میٖنہٕ چیٖنہ۔

اما پوٚز راتھ رات پییہِ میٖنہٕ پیٹھ۔ یُہ ہیٚچھس نہٕ اچھ پیٹھ اچھ تھاوِتھ۔ اچھ وُٹھتھ اُسی میٖنہٕ سیٖنٹھاہ وُلہٕ خیال پریشان کران۔ یُہ رُوزُس راتھ راتس انِگٹس منز اچھو داہرأوِتھ۔ توہ پتہٕ تہٕ خبر کیاہ کیاہ سونچان۔ یُہ اُسس دیان یُہ کیازِ آیےیس یتھ ہسپتالس منز۔ یُہ اُسس زن ستیمُژ۔ زن اُسنس کاٲنسہِ شکر آچارس پیٹھ برِتھ وِزمژ۔ راتس کُنژ میٖنہٕ واریاہ پھیرہ تیر یُہ بجس واریاہ کینہہ سونچنہِ۔ میٖنتہِ دوپ زہ بیٚلی ہُند مول کیازِ چھُنہٕ پیارٕ نظری دِوان۔ دٔیوہ تمہٕ تہٕ آسہِ بوزمُت۔ دایے اُس ونان زِ یِہ کتھ چھ نیٖشن پیٹھ۔ یُہ اُسس پننی سادہ گی منز زانان زِ تس آسہِ کٲم زیادہ چھژ۔ نتہٕ آسہِ کُن گام ڈیوٹی تُلمُت ——

بیٚہرس تہٕ ہِشہٕ کوسہٕ چیٖنڈ آسیہ بنیتھ زِ تم تھاوِہن تمس نوشہٕ ہُند خیال۔ بس اکھ زأوِل دود اگادِ اوس گومُت۔ یوسہٕ تیہندی کنہٕ مرنہٕ سرأس!

مگر میٖنہٕ اوسنہٕ مرُن۔ یُہ رُوزُس راتھ راتس سونچان زِ میٖہ چھُ زندہ رؤزُن تہٕ زندہ روزِتھ مرنہٕ خاطرہ ہوشُن۔ باقژن ہُند بُتھ وُچھنہ خاطرہ ہوشُن تہٕ اکھ سہٕ تماشہٕ وُچھن یمہِ کنہٕ پتھ کانہہ میٖنہٕ دُرہ دُرہ کرہ۔

یُہ کٲژاہ چاأر تہٕ فیاُر چھس۔ میٖنہٕ توٚگ نہٕ از تانی یِہ زانُن زِ ہسپتالک ہسپتال کتھ بیٚیٹھ چھُ میانہٕ خاطرہ وودنی آسان!

میٖنہٕ اُسی ساری پرٛژھان زِ ژٕ یٔہ کیاہ چھُوی خانہٕ دار کران —

شہ کوٚنہٕ چھُ یور یوان۔ سہٕ کیازِ آو ازتام اکی دوی پھیرہ۔ تس چھا چأنی ماے مُشتِ گیمژ۔ تس چھا چأنی پٔرِ پانٹھو تسلا گیمتۍ!

ژٕ یٔہ کتِ چھے سٔرَو۔ ژٕ یٔہ کتِ چھے بیٚلی؟ ژٕ یٔہ کیازِ چھُوی نہٕ کانہہ بیٚلی یور انان۔ ژٕ یٔہ ہیٚکِہ ہی ناہٕ کُس تہٕ ہیٚہرٕ گرسی منز علاج کرہ نأوِتھ؟"

میٖنہٕ آیہِ راتھ راتس یم ساری سوال دُوبارہ دماغس منز، زن آسم لچھ یژہ مچھ کنس تل گیٚس گیٚس کران — "ژٕ یٔہ کوٚنہٕ چھُوی رُون یور یوان۔ ژٕ یٔہ چھُوی ناپانس تہٕ گھرٕنک لول یوان۔"

یوان کیازِ اوسُم نہٕ! مگر یُہ کتِ اُسس یتھ حالتس منز گرٕہ گژھنہٕ لایق۔ ہِشہٕ ہیٚہرس گژھِ نوشہٕ آسنہٕ پوٚہل ہِشس۔ یوسہٕ دانس لٔلہِ، گرس لٔلہِ۔ یوسہٕ ہِشہٕ شاہ چیٖوُر کرنُک موقعہ دِیہِ۔ یوسہٕ دوہس خرہ سُندی پانٹھو جکہِ تہٕ شامن تو تہٕ ترُن لمیٖتھ ہیٚکہِ۔ یوسہٕ ہیٚرہ بوہنہٕ ساری لُرِتھ والہِ تہٕ ژُوِتھ ہیٚکہِ۔ یوسہٕ ہِشہٕ ہنز حکومت مانہٕ تہٕ کلہِ نومرأوِتھ کٲم کرہ۔ توٚتامت کٲم کرہ یوٚتامت نہٕ تس کانہہ ژوچُو کسر گژھِ۔

یلہِ یُہ یم سارِے کامہِ اُسس کران تیٚلہِ تہٕ اوسُم کانہہ ژھکِتھ جوٚرِتھ یِہ ونان زِ بچے تھاو وودنی زِ آسکھ ستیمُژ!

ازیلہِ میٖنہٕ سوژوی پان وُرنہٕ تہٕ وتھرنہٕ تُلمُت اوس پننِس گرس منز کتِ اُس میٖنہٕ گژھِ کانہہ جاے رُوزمژ!

اما پوٚز یِہ زانِتھ تہٕ کوٗر میٖنہٕ رات شامہٕ نس گرٕہ واپس گژھنُک

فیصلہٕ۔ ہسپتالس منز اُس نہٕ دوہٕ میانہٕ خاطرہ روزنۍ کانہہ دَتھ۔
میہٕ آسہٕ لبہٕ زن لاینہٕ یوان۔ پَتھ کانہہ بیمار زنانہٕ زن اُس میہٕ کُن
ٹُکہٕ ٹارہ وُچھِت بیَیس کُن ونان :

"چھکھے وُچھان۔ گاو موج ہے گاو موج، اُمِس چھے نہٕ پترٕ ہی
نہٕ ڈاکٹرٕ مِی دِین کتھ بیٹھ چھِم یُت مہربان۔"

یُدوَے کانہہ بیمار زنانہٕ ژاسہٕ ٹونک ترٕ کرہ ہے، میہٕ اوس باسان
زن سارِنٕی ہُند زِیُوٹھ اسن کھنگارا چھُ میہٕ کُن دَوان ترٕ دوران۔

یلہٕ صُبحن اڑہ فلہٕ گاشہٕ مشیرہ منزہ بانگ آیہٕ، میہٕ توٚر نہٕ فِکرہ زِ
میہٕ کیازِ اُس نِوہ سرہ بیٚنہٕ پرٚاَنہٕ پأٹھۍ ژاس شروع گومُت۔ از اوس
میانہٕ ژاسہٕ بدلہٕ صداہ گژھان۔ زن اوس میأنِس وارڈس اَندر کانہہ
میٚژرہ تیلک ٹین پکہٕ ناوان۔ یلہٕ پوٚرہ پأٹھۍ گاش آو، میہٕ تُل نہٕ
بُتھ بیٚٹھہ وُزُن ترٕ۔ ترٚیہٕ ژورِہ پھِرہ آیہٕ اَکھ داے میہٕ وِزہ ناونہٕ۔
وُدنہٕ تمۍ اُسس نہٕ جواب دِوان، سورُوی کینہہ بوزان ترٕ وُچھان۔
بیَین بیمارن ہندی پأٹھۍ دوت میٚنہٕ دودھ چینہٕ خاطرہ۔ میہٕ تھاوِہ
نوو سُہ تھٕے کِنۍ الماری منز۔ بہٕ اُسس امہٕ وِزہ ترٕ بدلی کینہہ سوران۔
بہٕ اُسس ببلی ہندِس ماٚلِس پرٚاران۔ میہٕ اُس تمِس سٟیٹھہٕ سوزناومُت
میہٕ اوس تس اِتھے اَکِس دایہٕ اتھہٕ پیغام سوزمُت زِ بہٕ چھس نہٕ
دوہٕ مولے یتھ ہسپتالس منز روزنہٕ یژھان۔ ہرگاہ ژٕ یہٕ میون
حاجت چھُوی، میہٕ واتہٕ ناوِ گھرٕ واپس، بہٕ مرہ پنِنِس گَرِس منز۔
"میأنِس نصیبس کیاہ اوس لیکھِت۔" میہٕ اُس ڈاکٹرٕ مِی دِنہٕ
سخ ژران۔ دپان اُسس زِ اُمِس مُدس چھُنا یہٕ زون زِ ہتا
یہٕ کیاہ چھس بہٕ کران۔ سے اَندری سلہٕ گومُت۔ میہٕ کیاہ چھُ رُودمُت
اُمِس کیاہ سنا آو میہٕ منز لبنہٕ زِ یہٕ ہیوٚٹھ میہٕ سیتہٕ مرُن تُشرِتھ عشق کرنہٕ۔
ترٕ سارِسی ہسپتالس منز تھاوُنس نہٕ بُتھ دِنہٕ لایق۔

شنکر آچاریہ پٕتہٕ کِنۍ یلہٕ سرتلہٕ تھال ہیوٚ سریہٕ بھگوان نوٚن ژراو
گُلہٕ چھٕترٕ منزی ژایہٕ اَکھ تاپہٕ رِکھ میأنِس وارڈس منز۔ حمیدہ آیہٕ
امہٕ وِزہ میہٕ سٟیٹھہٕ ہیٚتھ زِ چون برتھا چھُوی ببلی کو چھِہ منز
ہیٚتھ ہیرہ کھسان۔

یہٕ بوزِتھ گوو میہٕ اَندرٕ ہُم شاہ اندر ترٕ نیبرٕ ہُم نیبر۔ خبر کیازِ
ژٕ جو میہٕ گُمہٕ ژھٹ بِشِس نیرِتھ۔ رُمن رُمن باسیہٕ میہٕ تیر۔ ببلی کُن
وُچھِت آو میہٕ وَدُن۔ میون وَدُن توٚر نہٕ کأنسہٕ فِکری ترٕ کیازِ
اُتھو سیتہٕ آیہٕ میہٕ زِیٹھ ژاسہٕ لہر۔ سُہ کھوژ میون حال وُچھِت۔
ترٕ میہٕ وُچھِت زانہٕ دَسے کیاہ زانِتھ تِتھۍ ببلی دوشوَے نِرِہ ترٕ
کوٚرُن میہٕ نالہٕ موٚت۔ میہٕ چھُنہٕ یاد زِ بہٕ کیتِس کالس رُودُس
ببلی کُن وُچھان۔ میہٕ رُود نہٕ یاد ہی زِ ببلی ہُند مول ترٕ ما چھُ تَس
سیتی آمُت۔

مگر ببلی ہُند مول اوس دروازس کُن بُتھ کٔرِتھ چارپایہٕ پیٚٹھ
اڈ ڈنجہٕ بِہِتھ۔ تمۍ تُجہٕ نہٕ میہٕ کُن چشمہٕ ترٕ۔

میہٕ پرٚژھ حمیدس ڈاکٹر صیٚب چھا آمُت؟

"آہن سُہ آمُت چھُ۔" تمہٕ نیہٕ ببلی میانہٕ کو چھِہ منزہ۔ سُہ
بلیٹھ لَس ماہ کرنہٕ۔

"تہُند حکم چھُ زِ توہی ہیکیو نہٕ دُنہٕ ہسپتالہ منزہ نیرِتھ۔"
حمیدن کرٕ کتھ، زن دِژِن میہٕ ٹھپہ

"کیازِ؟" میہٕ دوٚنس شانہٕ پیٚٹھہ کلہ تھوٚد تُلِتھ۔

"اَدہ کوٚت گژھکھ؟" ببلی ہُند مول وُوتھ میہٕ کُن شرارتہٕ
سان۔ تمۍ سنژہ اُچھو آسہٕ ہوکھمتہٕ تُل ہی۔

"بہٕ گژھہ گھرٕ۔ بہٕ مرہ پنِنہٕ گھرٕ۔ بہٕ مرٕ نہٕ ہسپتالس منز۔" میہٕ
دِتُس کھوٚر زِ ٹھیکہٕ اَدِتھ جواب۔ تمۍ ترٚاو زِیُوٹھ اسن کھنگرا۔

"گھرٕ" میہٕ باسیو زن یہٕ ونان ونان تمۍ بُڈ تھوک تِژ ترٕ
لأگِھ میہٕ بُتھِس۔

"ژٕ چھکہٕ گھرٕ ژانہٕ لایق؟"

حمیدس توٚر نہٕ فِکری زِ ببلی ہُند مول کیاہ چھُ ونان۔ تمہٕ دِتُس
اسان اسان جواب۔

"نہٕ ہارا۔ کیازِ نہٕ۔ وارہ کارہ گژھِتن ٹھیک۔ گھرے چھُس
گژھن۔ اُسی کیاہ یتہٕ کُنڈہ ژھنزسہٕ۔"

ٹھیک چھُ۔ اختوی رُڈ تونس یہٕ کورِہ ہِن ترٕ یُتو۔" ببلی ہُند
مول وُوتھ حمیدس کُن۔

"میہٕ کلیمہٕ زیٚو۔ میہٕ توٚگ نہٕ کینہہ ترٕ وَنُن۔ بہٕ لجس حمیدس

کٔن وُچھنہٕ۔

تہٕ ہیٚکہٕ نہٕ بُنتھہٕ۔ "حمیٖدن دِتُس جواب۔ یہِ سیٚزٕ تہٕ سادٕ نرس۔ اُمیس اوس نہٕ فِکرِ تران زہٕ بتٚی ہُند مول کوتاہ شٔشترٕ دٕ چھُ بنیومُت۔

"تۄہیہ پٔرتھوہ ڈاکٹر می دِینس؟" بتٚی ہندی مأل وُچھ میٚہٕ کُن۔ میٚہٕ باسیوٚ نارٕ تیٚنگلن پٮ۪ٹھ پان۔ نہٕ چھُم وۄدن تگان نہٕ چھُم اسُن تگان۔ مت گوم بسترٕ پٮ۪ٹھ دِوان تہٕ دارٕ کِنہٕ دِمہ دِوان اما پوٚز میٚہٕ تیٚگ نہٕ زیٚو تہٕ ہلاوِنہٕ۔ تھوٚد دِوان تھنک اوسنہٕ سوالی پیدٕ سپدان۔

میٚہٕ آیہِ امی وِزہٕ زیادٕ ژاس سیٚنِٹھاہ کالس رُوز ژاس جأری۔ ژاس کران کران گومہ سینہٕ ترٕن کرٚدپس۔ زن میأنس وچھس پٮ۪ٹھ خبر کُس تاز دُود اُسو پھٔٹران۔ میٚہٕ گو اُچھن تہٕ انہٕ گوٚٹ۔ زن اوسُم کھور نیوٚمُت پٮ۪ٹھ آہستانس تام گٔستامت وزہٕ سیٚتی لمان۔ میانہِ ژاسہِ ہُند کھٔرون کھٔرون بوٗزِتھ گیہِ وارِیاہ میأنس وارڈس منٛز جمع۔ تم گیہِ چارپایہِ وُچھن تہٕ کھوٚورِ اِستادٕ۔ ہیہ بونگہ) لگی میٚہٕ تم وُچھنہٕ۔ میٚہٕ زون زہٕ میٚہٕ آو مرنُک وقت۔ امی وِزہٕ آو ڈاکٹر می دِین اکھ مشیٖن ہیٚتھ۔ تمِس سیٚتی اُس اکھ جان اڈٕ ور زنانہٕ۔ تمۄ سُند بُتھ اوس زن موٚنجمُت سماوار۔ نیپہ نیپہ کران سیٚنِٹھاہ خوش شکیل سیٚنِٹھاہ نفیس وردن لأگِتھ۔ تمِس پتہٕ پتہٕ آیہِ اکھ داسے۔ تمِس اتھہٕ اوس ناسوأری رنگُک ریشمی بُرقعہ۔ یہٕ آسہِ سہے اۄسہی اڈٕ ور زنانہٕ ہُند۔

ڈاکٹر صیٚب وُچھت گیہِ سأری اکِس طرفس کُن۔ بتٚی ہُند مول لوٚگ تسُس تھدِ تھدِ وُچھنہٕ۔ میٚہٕ اُس نہٕ ژاس رُکأنی۔ بہٕ اُسس سورٕدی پان وُچھن تہٕ کھوٚور چھاوان تہٕ شٔشترٕ وٕ چارپایہِ مُنیوٚل ملہ نادان۔ ڈاکٹر می دِینن کٔڈ چندٕ منٛزٕ اکھ دوا پِل۔ سۄ آیہِ رأون میٚہٕ پانہٕ۔ بہٕ اُسس نہٕ امہِ وِزہٕ تہٕ اُمۄسُند بُتھ وُچھن یژھان۔ یتھ ہسپتالس منٛز رُودنا دۄ دۄ اُسس درأی ڈاکٹری کانہہ۔ یہِ کتھ گٔو میٚہٕ اگادٕ!

دوا پِل کھیٚنتھ گیہِ میٚہٕ ژاس رژھ کھنٛڈ بند۔ بہٕ آیس زورٕ شانس پٮ۪ٹھ سادٕنہٕ۔ ڈاکٹر می دین لوٚگ مشینہٕ کیاہ تامت ٹھک ٹھک ہیوٗ کرنہٕ۔ تمہِ پتہٕ وۄن تمۄ اڈٕ ور زنانہِ کُن — "بیگم!"

بیگم اُس میٚہٕ کُن عارٕ ہشِ چشمو سیٚتی وُچھان؛ زن سۄ اڈٕ نیٚندرٕ کأنسہِ ہُشیار کٔر۔

"حکُم—" تمہِ دِتُس جواب

"وُچھوہ تۄہیہ۔ گأزٕ شرارتی چھِ یہِ میأنی کورِ ہِن۔ چھنا زن عیٖن تہٕ غیٖن ہٕ جرہ!"

میٚہٕ باسیوٚ زن انہٕ گٹِس منٛز گاش۔ ڈاکٹر می دینہٕ زیوٚہ "میأنی کورِ ہِن" لفظ بوٗزِتھ گیہِ میٚہٕ رُم رُم کھٔرا۔ زن میٚہٕ بجلی تارٕ لاجِکھ میٚہٕ مُژرادٕ اُچھو!

ڈاکٹر می دینہٕ آشنہٕ روٚٹ میٚہٕ کلہٕ پٮ۪نِس گوٚٹس پٮ۪ٹھ۔ سۄ لیٚج میٚہٕ ڈیکہ ہور وُچھنہٕ تہٕ چوٚنٹھ صاف کرنہٕ۔ میٚہٕ تۄگ نہٕ امہِ وِزہٕ کأنسہِ کُن وُچھن۔ بہٕ اُسس کنو ڈاکٹر صیٚبنہٕ زیوٚہ بیٚیہِ اکہِ لٹہٕ بوزُن یژھان — "میأنی کور۔ میأنی کور—"

میٚہٕ دِیوٚت زورٕ نہٕ دن چیر۔ بہٕ کھوٚتُس زہٕ میٚہٕ گوٚژھنہٕ یہِ لفظ دِندٕ بُرنیوٚ کِنہٕ نیرِتھ ژلُن۔

ڈاکٹر صیٚبن تُلۍ میأنی وُٹھ زہٕ پننیوٚ اوٚنگجو سیٚتی تھوٚد۔

"مُژرادسا اُس۔" سۄ لوٚگ میٚہٕ ونُنہٕ۔ یتہٕ کِنہٕ لوکٹِس شُرِس ہیٚنہٕ مول ماٹھہٕ نٔیارہ سان دۄدھ چھُ چاوان تتھے کِنہٕ چاوُنس بہٕ ڈاکٹر می دِینن دوا۔ یہِ دَواہ چھہٕ ژوٚل میٚہٕ پٔراتھ وٚ کِن نیرِتھ۔ میٚہٕ اُسی دٔنہٕ زورٕ بند تھأوِمتو۔ ڈاکٹر صیٚبن ترٛاو چھ دٔند میأنین دندن منٛز۔

"مُژرادسا اُس!" سۄ لوٚگ میٚہٕ ونُنہٕ۔ میٚہٕ مُژر دوونہٕ تو تہٕ اُس بہٕ "مُژرہٕ رأون اُس میوٚن گوبُرٕ!" امہِ وِزہٕ رُودنہٕ میٚہٕ پانس تأزٕ خبر کیتھہٕ کِنہٕ گیہِ میٚہٕ موٚمژن نرٛیٚن حرکت۔ بہٕ گٔیس تھوٚد وُتھتھ۔ میٚہٕ روٚٹ ڈاکٹر صیٚب نالہٕ میتہِ۔ "ڈاکٹر صیٚب۔" میٚہٕ ژھوٚ ژاس کران وَدن کٔرِکھ نیرِتھ۔ "ہے بہٕ نہٕ مرہ ہانہٕ۔"

ڈاکٹر می دینُن گرم گرم شاہ اوس میانہِ تالہِ رُمن رُمن پھیران۔ میأنس مستس فش فش دِوان وۄن ڈاکٹر صیٚبن — "تنابنہٕ نہٕ۔ بہٕ نادِمے نہٕ ژہٕ مرنہٕ۔" یہِ بوٗزِتھ گیہِ میٚہٕ سأری گنٛڈ یلہٕ۔ سوٚردی شرٛوک آد مُژرادونہٕ۔ بہٕ ہیٚکہ نہٕ وٚنِتھ زہٕ میٚہٕ کوتاہ پھیوٚر۔ میٚہٕ کیاہ گو۔ یہِ — میٚہٕ کیازِ اوسنہٕ امہِ دۄہہ مس چھٕلمُت۔ میٚہٕ کیازِ اوسنہٕ امہِ دۄہہ کنگو دِیوٚتمُت!

غزل

داریاہ کلیج میہ چھنہٕ تمسنز خبر
زن چھ سُنسان میانہٕ یمہٕ سینک مندر

زُونہٕ کُن کمُو وُچھنہٕ لیکن ہیچ ہیچ
یُس میہ وُچھ مُشکل دَرٕزِ تس کُن نظر

زن تہٕ سِرِیس وُچھنہٕ باسی نُور نار
شبنمن زن کار کوٗر ہوٗ وُن اثر

تس سِوا چھُنہٕ کانٛہہ تہٕ شوٗباں عالمس
خاک یارو خاک یِم شام و سحر

پاس کرِہ میٚونُی قیامژ دوہ خدا
یلہٕ نہٕ وُچھ بیٚیہ کانٛسہٕ منز یُوتاہ سیٚزر

گیٚو تہٕ یامتہٕ گیٚو تہٕ ہاسا زندرد
گژھ میہ پانس کیُتھ سیٹھاہ نِنٛوی مژر

میانی یِم ہمسایہٕ چھِنہٕ ہمسایہٕ ہو
دوہ ذُچھ سنٛخ مُشکل کرُن دوہ دوہ بسر

تو تہٕ چھُس بیٚیہ سوٗی پنٛنٕ دُبرائے ہیٚتھ
اتھ ہسَن کتھ کر! یہ گو میٚونُی جِگر

داریاہ بڑو تھہ سوٗنچٕژ کتھ دزرایہٕ پوٚز
دِل تہٕ گژھ مانُن تہٕ بیٚیہ آسنہٕ نظر

میانہٕ اچھو ونٛنےٚ بہٕ چھُس بیمار سنٛخ
ژھل حکیمو کُرٕی، دوہ ہے رُوزِم کسر

گو یہٕ گو لیکن چمن پھیران چھُم
آذرِ وعدے گمتٕ زیر و زبر

حکیم غلام احمد نثار
[illegible]

رنمب آرہ

مُتیہِ مجنونہٕ تُتہِ بے عارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرٕہ لولو
چھوٗی ژٕہ اصلی مشکن نندن سر — ساقیاہ چھوٗک وطنک سۄن دلبر
دامنہٕ اکہِ گے گام سرشار لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرٕہ لولو
نۄن گلہٕ نشہِ تراوِت یامت رَد — دوٗرہٕ منزلہٕ یامت ژٕہ لۄتھ چھُہ
تِتھہ لاران پتہٕ شہمارٕہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرٕہ لولو
شِشنہٕ بالو پتھ چھوٗی چۄن مالین — تاپہٕ ترشن زدٕ لمُت چھوٗی تالیوٗن
دَگ دَگ سۄن درامُت نارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
بُیرہٕ سندٕ پاٹھہ چھوٗک گرزان سونتس منز — ژھالہٕ ماران سفرچ چھوک کران نشر
دِلہٕ دارن گنداں تِکہٕ تارٕہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
نَے چنگ و رباب سوز وایان — انقلابس زٕدرہٕ زدرہٕ ناد لایان
آب چۄن میانہِ آشچے دارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
چھے ژٕہ تیزی پکنس بے تابی ! ! — چھے لولہٕ سیٖت کینژاہ بے خوابی
دِہقانہٕ سند چھوٗی ژٕہ امارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
چھوٗک ژٕہ نالاہ ٹھنڈ تے برفانی — ہیچہ نادان کاشرٕ ن قربانی
ژٕے بجر تھک سانہِ امبارٕہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
مزدورن ہنز بجر تہ چھے ژٕہ شفقت — تۄے کدلس سیٖتن چھے ژٕہ نفرت
اِن غریبن کامہ بُتھ تارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
ہیمہ مالہ چھوٗی رٹموت چۄن دامن — ناگرائن تھوتھس منز کامن
یہ چھُہ عاشقن کوٗت آزارہ لولو — کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو
چۄن آلو نشارس پک با پک — چھُنہ سفرس لازم منز کڈن تھک

ژھوہ مارٕن بیتہِ دوٗہ تارہ لولو
کمہِ تارٕے ترے رنمب آرہ لولو

مُقبل کاشیری

اہرہ بلک آبشار

زن چھُ ریوان زار زار اہرہ بلُک آبشار
نالہ دِیوان بار بار اہرہ بلُک آبشار

زُون تہٕ تارک سُمبہ خیرہ زن دُکھتی چھِ یُور ی
لختِ جگر چھِکہ بیسار اہرہ بلُک آبشار

روزِہ ناسہ اکہ دَماہ بوزِہ ہا میوٚن سوزِ دِل
دارہ ونہ ہس حالِ زار اہرہ بلُک آبشار

گرایہِ ماران ناگراے کم وَژن نُژی نُژی کران
شوُب داراہ بے قرار اہرہ بلُک آبشار

گاہ پیوٚان گگہے دِہ نقان گگہے وُپھان گگہے وُڈان
چھُس دِلس زن ولہِ نار اہرہ بلُک آبشار

چھُس دِلس یُت کیاہ ملال چھُنا تمکاہ رِیوٚس کران
کوُت کرُ توٚس زار پار اہرہ بلُک آبشار

الماس چھُ نین ہُند کران آمُت چھُ باپاریاہ یہِ لوٚڈ
مات تہٕ دوہ کیاہ کاروبار اہرہ بلُک آبشار

رنگہ رنگہ کی چھِس لباس موختہ ہار لعل و گہر
مہرِ نیاہ زن شوُب دار اہرہ بلُک آبشار

کوٚرت سنا دوران دَوان دَب کھیوٚان وُتھی دُتھی پیوٚان
کیاہ سنا چھس پیٚرہ لار اہرہ بلُک آبشار

کوہ ژٹان بالن کھیوٚان سنیرَن اندر پادَن پیوٚان
زن مُتِس دِل بے قرار اہرہ بلُک آبشار

کوہ کن فرہاد زَن بالن ژُٹِھ ہیٚتھ آب آو
پھولہ راوٚذ لالہ زار اہرہ بلُک آبشار

آو وَدان رِیوان سیٚٹھاہ دزراد تہٕ بناوت یہِ گو
جنتھاہ کیٚاہ کوہسار اہرہ بلُک آبشار

چھانُک یہِ آب و تاب یہِ زمینچ شوُب چھا
نہٕ چھا سونتُک بہار اہرہ بلُک آبشار

پیالہ بھران بار بار عاشقن چاوان مے
ساقیاہ کیٚاہ شوُب دار اہرہ بلُک آبشار

حدیثِ دیگراں

یونی ورسٹی علی گڈھ

۲۳ر مارچ ۱۹۶۰ء

بھئی ٹینگ صاحب۔ السلام علیکم۔ "تعمیر" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ!

"تعمیر" کے اچھے ہونے کے لئے ہنس راج رہبر، وحید اختر، علی جواد زیدی، شفیق جونپوری، پروفیسر پی، این پُشپ، دینا ناتھ نادم اور رحمان راہی جیسے اہلِ قلم اصحاب کا نام ہی کافی ہے۔

خطۂ کشمیر کی برگزیدہ ہستیوں کے بارے میں لکھانا ہو تو کچھ ایسے اصحاب سے لکھوایئے جو عقیدت مندی سے پھول چڑھانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ جو اُن کے حالات و کوائف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کرتے رہیں تاکہ قاری کے سامنے یہ بات آجائے کہ اُن کو کس "عشق" نے بے قرار کیا۔ حالات کو عام لوگوں کی طرف صرف تماشائیوں کی طرح دیکھنے کے بجائے انہیں کس جذبے نے ان میں حصہ لینے کے لئے اُبھارا، ماحول نے کس حد تک اُن سے اثرات قبول کئے اور انہوں نے ماحول کے مطابق اپنے اندر کس قدر تبدیلیاں کیں۔

بلھم ناتھ پنڈت (کشمیر میں فلسفۂ ریشو) کے بارے میں کیا کہوں سوائے ع

تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

اس پر بقیہ مضمون آنے پر ہی رائے زنی کی جا سکتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے اتین اشرف کی دو غزلیں کیوں شائع کیں؟ ان میں کونسی ایسی بات کہی گئی ہے جس کی وجہ سے انہیں شائع کیا جائے۔

آپ جو یہ کشمیری زبان کی تخلیقات (ستار احمد شاہد) اُردو حصے میں دیتے ہیں، بہتر ہوگا اگر آپ اس کا ترجمہ بھی دیا کریں۔ ورنہ انہیں کشمیری حصہ میں شائع کیا کریں۔

قاضی عبدالودود کی یہ رائے کہ "حدیث دیگراں" محض فضول ہے، محلِ نظر ہے۔ یہ حصہ رسالے کو جان دار بنانے میں کافی مدد دیتا ہے۔ شاید ہی قاضی صاحب کو ایک جگہ چند دوستوں کا بیٹھ کر کسی مضمون یا کسی کتاب کے بارے میں اپنی اپنی رائے دینے میں تامل ہو۔ تو "حدیثِ دیگراں" اُسی کا نعم البدل ہے۔ ہاں یہ ایڈیٹر کا کام نہیں کہ وہ رائے دینے والوں سے مختصر خطوط لکھوایئے۔ وہ اُن کا اپنا احساس ہونا چاہیئے۔

اختر محی الدین کی یہ تمنا کہ لوگ کشمیر پر اقبال اور چکبست کی سی نظمیں نہیں لکھتے ہیں، ہر کسی سے اس کی اُمید کرنا کسی حد تک صحیح نہیں۔ عظیم فن کار ہی عظیم تخلیق پیش کر سکتا ہے اور یہاں بات یہ بھی ہے کہ اقبال اور چکبست نے دوسروں کی طرح نہ صرف کشمیر کو دیکھا بلکہ اُن کے جذبات بھی تو خطۂ کشمیر سے وابستہ ہیں۔

اگر آپ کشمیری حصے میں "تاثرات" کو "حدیث دیگراں" کی طرح ۲ صفحوں تک ہی محدود کر دیتے تو اچھا تھا تاکہ باقی صفحے غزل، نظم اور افسانہ کے لئے وقف ہو جائے۔

آپ کا : غلام نبی ہاگرو

۱۷۔ بچلرس کوارٹرس۔ معظم جاہی مارکیٹ

حیدر آباد (آندھرا پردیش) ۲۳ر مارچ ۱۹۶۰ء

برادرم۔ سلام مسنون! نیا "تعمیر" آج ملا۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ مت سمجھئے کہ تازہ شمارہ مواد اور معنویت، معیار اور تخلیقات کے لحاظ سے پچھلے شماروں سے کہیں بہتر ہے۔ در اصل "تعمیر" کا معیار اور روایات اب بن رہی ہیں۔ شمیم صاحب کی پچھلی کوششیں اور آپ کی حالیہ محنت ہی اس ترقی کا اصل سبب ہیں۔ مجھے نیا شمارہ پسند آیا۔ کم سے کم اسی معیار کو آیندہ بھی برقرار رکھیئے۔ اچھے لکھنے والے تو بہت ملیں گے مگر رسالے کی انفرادیت کے لئے ترتیب و انتخاب کا سلیقہ و جدت بڑی اہم چیز ہے۔ اسی سے کسی بھی ادبی جریدے کا کردار بنتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے!

مخلص : وحید اختر

جوزا (اٹلی) یکم مارچ ۱۹۶۰ء

عزیز دوست!

السلام علیکم و برکت اللہ۔ آپ کا خط کل مجھے ملا۔ اسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جو آپ لکھتے ہیں، سو خوبصورت ہے۔ آپ کی چٹھی سے معلوم ہوا کہ آپ بھی اٹلی کو چاہتے ہیں۔ اِتنی محبت مجھے بھارت کے لئے ہے۔ کشمیر عجیب زمین یقیناً ہے جو ہم بہت چاہتے ہیں اور ہماری بڑی خواہش ہے کہ ایک دِن اُدھر آدیں۔ آپ کے مُلک کے پہاڑ ساری دُنیا میں مشہور ہیں اور جو لوگ کشمیر میں گئے وہ اسے بھُول نہیں سکتے۔

میں نہیں مانتا تھا کہ میری اُردو اچھی ہوتی میں نے کبھی کوئی اُردو کتاب نہیں پڑھی۔ اس خوبصورت زبان کا زیادہ مطالعہ کروں گا۔

آپ بھی کہتے ہیں کہ مجھے جو کتابیں واجب ہوں وہ بھیجنی چاہتے ہیں۔ اس لئے شکریہ کرتا ہوں۔ آپ کے اِخبار کے لئے بھی بہت بہت شکریہ۔ آپ مہربان ہی ہیں اور میں ممنون ہوتا ہوں۔ جو کتابیں آپ اُردو ادب کے مطالعہ کے لئے مفید مانتے ہیں، سو بھیج دیجئے۔ جو کتاب اب مفید ہے وہ اُردو ادب کی چھوٹی تاریخ ہے۔ اس کے ساتھ کلیاتِ سودا مفید ہوگی۔ لیکن آپ مجھے بہتر صلاح دے سکتے ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں۔ آپ کی مہربانی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے! معاف کیجئے اگر اتنی تکلیف دے رہا ہوں۔ میں اپنے خیالات اور رائے آئندہ کو لکھتا رہوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے اور خط بھیج دیں گے۔ خوش ہوں جب آپ کی چٹھیاں مِلتی ہیں۔ آپ کی دوستی کے لئے خوشی ہے۔ کشمیر اور بھارت کو سلام! اگر میں آپ کے لئے کچھ کر سکوں گا تو لکھیئے!

آپ کا دوست:۔ اینزو ترُبین

ریوا۔ مورخہ ۲۶ رمارچ ۱۹۶۰ء

بھائی یُوسف صاحب۔ سلام مسنون

جنوری فروری ۱۹۶۰ء کا "تعبیر" نظر نواز ہوا۔ عنایت کے لئے شکریہ۔ پرچہ نہایت پسند آیا۔ ظاہری و معنوی ہر دُو اعتبار سے "تعبیر" بہت ہی خوب ہے۔ حُسنِ آرائش اور حُسنِ ترتیب دیکھ کر آپ کی بے پناہ صلاحیتوں کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ یہ کہنا (جیسا کہ چند لوگ کہتے ہیں) کہ "تعبیر" کا شمار اُردو کے بہت اچھے جریدوں میں ہونے لگے صحیح نہیں۔ بہت اچھے رسالوں میں آج بھی "تعبیر" کو شمار کیا جاتا ہے اور یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ بہت ہی اچھوں کے شمار میں بھی جلد ہی آجائے گا۔ والسلام آپ کا:۔ نوّر قاضی پوری

سی۔سی فارسٹس آفس ریوا (مدھیہ پردیش)

۱۰۸-۱-۷ معظم پورہ۔ حیدر آباد (آندھرا پردیش)

۲۴ رمارچ ۱۹۶۰ء

محترم۔تسلیم و نیاز! "تعبیر" کے دو تین شمارے ملے۔ میں امتحان میں مصروف تھی، اس لئے "تعبیر" کی رسید نہ بھیج سکی۔

"تعبیر" میں سب سے اہم بات کشمیر کی چھاپ ہے۔ کشمیر کے آرٹ و ادب پر بہت اچھے مضامین آپ شائع کر رہے ہیں۔ جنوری فروری کے شمارے میں "کشمیر میں فلسفۂ شو" اور "کشمیر کے چند لوک ناچ" بہت پسند آئے۔

اُمید ہے کہ "تعبیر" اسی طرح ترقی کے منازل طے کرتا رہے گا۔

مخلصہ:۔ جیلانی بانو

کاپرن (کولگام)

۵ رجنوری ۱۹۶۰ء۔ میانہٕ یُوسف بھایا۔

السلام علیکم۔ بہٕ آس راتھی سٕتہٕ دۄہ شہرہ واپس تہٕ اوٚنم دسمبرُک "تعبیر"۔ اخترنہٕ "سونزل" تہٕ بییہٕ وارِیاہ کتابہٕ سونزلہٕ منٛزہ پٔرم وُلِستام پانٛژھ افسانہٕ زٕ چھم پرنٕے۔ پانٛژوٕے باسیم بے معنی تہٕ بے مقصد۔ "محمد و ولدیٕسُو"۔ "دٕلبری"۔ "تقلی خدایی" تٕم دۄہ" نہٕ چھ لانٛژھ نہٕ بیٛٹھ پوٚدہ۔ خبر اختر کیازِ چھُ یِتھو فضول چیز لیکھان! اخترن چھ وارِیاہ رٕتہٕ کہانیہٕ لیچھمٕژٕ۔ یٔژ پأٹھو چھُ پِنٕسِ اِنسانس وتہٕ راوٕراوان۔ کیٛا تٕمٕسٕند افسانہٕ "دریایہٕ ہند ایزار" دٕ دٕ کیٛا یہٕ بکواس!

"تعبیرس" منٛز تہٕ پرٕم اختر سٕنٛز کہانی "انسان چھُ عجب ذات"۔ مگر یہٕ کہانی چھےٚ زہر ہٕش لیچھمٕژٕ۔ حُسنس متعلق چھ یہٕ حسین کہانی۔ حُسنس پتھ مۄت گژھن اوس جانی مگر فنا گژھن چھُم نہٕ باسان جان۔ کاش اگر میم صاحب تہٕ رمضان ہوتہ بجایہٕ مُتہٕ روزہن۔ اخترنہٕ کہانی تہٕ یہے تقدیٖن شہپارن منٛز گنزرنہٕ۔ توہہٕ ژھۄرُ یہٕ نیک قدم زِ "تعبیرک" کاہ ورق تھاوٕ وٕ کأشرِ خأطرٕ وقف۔ پتہٕ کُنٛ چھپاوِو تُہ کامل صابنہٕ تہٕ علی محمد لونہٕ کہانیہٕ تہٕ۔

"تعمیرَس" کاشُر ادب ہُبر کڈنکس یِرادس پیٹھ کوتاہ شاد گوس ، تہٕ چھکنہٕ وَنِتھ۔ مینہٕ کریٚو شمیم صاحبس امہِ کتہٕ تُہند عرض از برونہہ زِہ دُری نیر تُہندہٕ دسکو دِیِو میٚون تمناہ جگہ ہیہ۔ یہٕ دیہ جلدی پانہٕ ترٕ شہر۔ امہِ نمبرہ خاطرہ انہٕ کنہہ جان چیز تو یہہ نِشہٕ۔

کامِل صابنہٕ نظم "ابہام" - خیالنہٕ رباعیاتِ عمر خیام آیم سیٹھاہ خوش۔ اَزیکی "تعمیر" چھُ پُرٕ پاٹھو نوٚوی بہار ہاوان۔ صرف چھُم تماہ زِہ رٔیتہٕ پیٹھہٕ رٔیتہٕ گژھہ باضابطہ نیرُن۔

باقی چھُس وارٔسے ! ناجی منوّر

جامع مسجد، گورکھپور

۲۴ر مارچ ۱۹۶۰ء

عزیز محترم جناب یوسف صاحب ! آداب و نیاز

آج "تعمیر" کا جنوری فروری کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ دیکھتا رہ گیا۔ خدا کی قسم خیال و خواب میں بھی، خصوصاً کشمیر سے اتنے خوبصورت پرچہ کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے جس خلوص اور قابلیت سے پرچہ کو ترتیب دیا ہے اس کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ خدا کرے آپ کی ادارت کے زیر سایہ یہ پرچہ اور پروان چڑھے۔ اگلے شمارے تک آنکھیں ترستی رہیں گی !

خیر طلب : سید لطف اللہ گورکھپوری

گورنمنٹ نارمل اسکول

بیلپور (پیلی بھیت) ۷ فروری ۱۹۶۰ء

مکرمی یوسف صاحب تسلیم !

آپ کی ادارت میں "تعمیر" نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اس کی اشاعت میں باقاعدگی آگئی ہے اور مضامین کے انتخاب میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ کشمیری ادب کے ساتھ اُردو نثر و نظم کے شہ پاروں کی کافی مقدار میں شمولیت ضروری ہے۔ ورنہ رسالہ باہر والوں کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی کا سامان فراہم نہ کر سکے گا۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ! والسلام مُبشر علی صدیقی

معرفت واثق جونپوری - ۹- نذیر احمد روڈ

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ - ۳۰ مارچ ۱۹۶۰ء - مکرمی یوسف صاحب تسلیم - اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے - "تعمیر" کا تازہ شمارہ بہت پسند آیا۔ اس کو آپ نے بالکل ہی بدل دیا ہے۔ افسانوں اور غزلوں اور نظموں کا معیار بلند ہو گیا ہے۔ اتنے خوبصورت رسالہ کو مرتب کرنے کے لئے میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے — یہ اختر محی الدین صاحب نے کیا بے ہودہ زبان استعمال کی ہے۔ اگر اُنہیں اعتراض کرنا تھا تو صاف ستھری زبان میں ہی کرتے۔ راہی معصوم رضا نئی نسل کا بہترین شاعر ہے۔ اس شاعر پر ذاتی حیثیت سے کیچڑ اُچھالنا بُری بات ہے اور آپ نے اس کو شائع کر دیا ہے۔

آپ کا :- امیر عارفی

۱۵۱- اے سیپرس لائن سکندر آباد

(آندھرا پردیش) ۲۵ر مارچ ۱۹۶۰ء

پیارے یوسف ! "تعمیر" ملا۔ اتنا حسین پرچہ ترتیب دینے پر مبارک قبول کرو۔ کشمیری ادب کی ترویج کے لئے تم جو کوششیں کر رہے ہو اُس کے لئے تم ہر کسی حوصلہ افزائی کے مستحق ہو۔ یہاں میرے دوست "تعمیر" کو ایک نظر دیکھنے کے لئے میرے کمرے پر ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں۔

اُمید ہے کہ اب تمہاری صحت اچھی ہوگی ! تمہارا :- سعید

ترووُہ ژُہتھ [۲۳]

محترم ٹینگ صاحب ! "تعمیر" وُچھتھ چھُ دِلک باغ فولان۔ پُرٕ کِنہٕ چھُ "تعمیر" نندہ بانہٕ، میٹھ، مُدرہ تہٕ پوشرہ وُنہٕ ادبُک علم بردار۔ البتہ چھُم اکھ عرض ضروری کرُن زِہ کاشرہ خاطرہ چھوہ تہٕ یہ کمی وَرِخ وقف تھاوِیو۔ آخر اُردو خاطرہ چھہ بیٚیہٕ ترٕ ہتہٕ بدٕو رسالہٕ تہٕ اخبار، یِتہٕ زن یہ چھپتھ تہٕ فولتھ ہیٚکہٕ۔ کاشرس کس چھُ "تعمیرہ" رٔوس، یس اتھ وولہٕ متہٕ لاے کرِہ۔ سیٹھاہ جان گژھہ اگر توہہٕ کاشرٕ خاطرہ جاے وسیع قلبی ہاوِہ ہیٚو !

تُہند کانہہ حکمُ ؟ تُہند یُنٕ : مسرور کونگامی

دھانُور (ناگام)

۱۷ر جنوری ۱۹۶۰ء

یوسف بھیّا۔ "تعمیر" کا نومبر دسمبر ۱۹۵۹ء کا مشترکہ شمارہ کل پریمی نے بھیج دیا۔ اور آج میں نے اسے ختم کر دیا۔ زیرِ نظر شمارہ اپنی رنگا رنگی اور تنوع کے

لحاظ سے بہت ہی اچھا ہے۔ مگر ایک دو چیزیں اس شمارے میں فضول شامل کی گئی ہیں۔

نریش کمار شاد کا مضمون "نئی شاعری اور طوائف" تشنۂ تکمیل ہے یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔ پھر بھی گوارا ہے!

سیفی سوپوری کی غزل کشمیر میں اُردو کے حسین مستقبل کی ضمانت ہے۔ فضا ابنِ فیضی کی نظم "روشنی کی طرف" اُردو ادب میں جمود پرستوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

اختر محی الدین کی کہانی "آدم چھہ عجب ذات" فن اور تکنیک کے لحاظ سے ایک طویل مختصر افسانہ ہے۔ کہانی پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اختر بھیا اب حقیقت پسندانہ نقطۂ نگاہ کو اپنانے لگے ہیں۔

مظفر عازم کی غزل بہت ہی خوبصورت ہے مگر غلام محمد مشتاق کی غزل میں کوئی نئی بات نہیں۔ غزل کے چوتھے بند میں عیبِ تنافر ہے۔ کامل صاحب کی نظم "ابہام" کشمیری ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

"تعمیر" میں کشمیری ادب کے لئے صفحات مخصوص کرنے کا جو فیصلہ آپ نے کیا ہے، میں ذاتی طور آپ کو اس بات کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔ اس سے کشمیری ادب کی ترویج میں بڑی مدد ملے گی!

ستمبر کے شمارے میں شامل نازکی صاحب کے قطعات اور موہن یاور کی کہانی دونوں مطبوعہ ہیں۔ نازکی صاحب کے قطعات ہفتہ وار "رہنما" سرینگر اور موہن یاور کی کہانی "چند تصویرِ بتاں" ماہنامہ "شاعر" بمبئی میں اس سے پہلے آگئی ہے۔

آپ "تعمیر" کا کشمیری ادب نمبر نکال رہے ہیں۔ یہ کشمیری ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ خدا کرے یہ نمبر بھی "تعمیر" کی سابقہ دستاویزوں کی طرح ایک حوالے کی دستاویز بن کر سامنے آئے۔ میں جلد ہی اس شمارے کے لئے ایک مضمون بھیج دوں گا!

آپ کا اپنا:۔ موتی لال ساقی

"کشمیر پوسٹ" جموں

۲۷ر مارچ ۱۹۶۰ء

ٹینگ صاحب، آداب!

جنوری اور فروری کا "تعمیر" ملا۔ اب کی بار پرچے کا نکھار بڑا ہی جاذب نظر ہے۔ گیٹ اَپ اور تصویروں کے انتخاب میں آپ نے نفاست کا مظاہرہ کیا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے بھی یہ شمارہ پچھلے شماروں سے سبقت لے گیا ہے۔ شمیم

صاحب نے "تعمیر" کو جس معیار پر پہنچایا تھا، مجھے مسرت ہے کہ آپ اُس معیار کو برقرار رکھنے کے لئے پوری صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اگر "تعمیر" کی اشاعت میں باقاعدگی آجائے تو ادب نواز دوست آپ کے بڑے شکر گذار رہیں گے۔

آپ کا:۔ وید بھسین

پریس انفارمیشن بیورو۔ جموں

۷۔ اپریل ۱۹۶۰ء

یُوسف پیارے، مُسکراتے رہو! خط ملا تھا رسید اس لئے نہ بھیجی کہ تم نے لکھا تھا "بہاروں کے دیش سے نکل کر جموں آرہا ہوں۔" انتظار کی مدختم ہوچکی تو سوچا بہاروں کے دیش سے کون آتا ہے؟ "—— (بے وقوفی ملاحظہ ہو)

تازہ پرچہ خوب ہے۔ خصوصی طور پر سرورق بہت ہی پیارا ہے۔ میرے دوست اگر پرچے کے یہی ڈھنگ رہے تو یقین ہے کہ "تعمیر" اُردو ادب کی تعمیر میں ایک خاص رول ادا کرے گا۔

اب کون سے مہینے کا پرچہ کون سے مہینے شائع ہو رہا ہے؟ (معذرت کے ساتھ)

کارِ الٰفت؟ مخلص: زیڈ سیمی

کوچہ چراغ علی۔ ۲۰۱ سردار منزل حیدر آباد

برادرم یوسف صاحب۔ تسلیم

ڈاک میں دوسری ساری چیزوں کے ساتھ آپ کا حسین و جمیل "تعمیر" بھی ملا، جو جنوری اور فروری کا شمارہ ہے۔ میں اس کے لئے مشکور ہوں۔ "تعمیر" یقیناً صفِ اوّل کے جریدوں میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اس کی ظاہری خوبصورتی میں اضافے کا سبب جہاں اس کا خوبصورت ٹائیٹل ہے وہاں اس کی سائز بھی حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ اس سائز کے پرچوں میں "ماہِ نو" کے سوا شاید کم پرچے اس آن بان سے نکلتے ہیں۔ یُو، پی سے "نیا دَور" بھی اچھا نکل رہا ہے۔ کہیں ایسا شمارہ دیکھا تھا۔ "قد و قامت" ٹھیک سے یاد نہیں۔ آپ نے مواد کی فراہمی میں بھی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سارے نام جانے پہچانے ہیں۔ ہنس راج رہبر، اختر انصاری، امین اشرف، وحید اختر، علی جواد زیدی، نازش اور آمنہ ابوالحسن اتنے سارے نام اس شمارے کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ کشمیری ادب سے متعلق جو معلومات تعمیر سے فراہم ہوتی ہیں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن دبی زبان سے آپ سے اگر یہی کہوں کہ اُردو کی وسیع دامنی کو بہرحال ملحوظ رکھیئے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال متین

باقیات

دو من چھتیس سیر (بقیہ از صفحہ نمبر ۳۷)

یہ نام مہادیو کے لئے اتنا موزوں تھا کہ مجھے زور کی ہنسی آئی۔ اور اسے روکے رکھنے کے لئے ہی مجھے وہاں سے دُور جانا پڑا۔

جب میں گھر لوٹ کر چارپائی پر لیٹا، تب بھی مجھے عجب سنگھ کی یہ بات یاد آرہی تھی اور میں اس نام کو بار بار دُہرا کر دِل ہی دِل میں ہنس رہا تھا اور ہنسنے میں لُطف آرہا تھا۔ اس ہنسی کے دوران ہی میں نے مہادیو کو اُلٹ پلٹ کر ہر پہلو سے دیکھا اور ہر پہلو پر دو من چھتیس سیر جلی حروف میں لکھا نظر آیا ؛

کشمیر میں فلسفۂ شو (صفحہ ۵۲ سے آگے)

یہ راستہ کافی لمبا ہے۔ کئی ایک جنموں میں پُورا ہو سکتا ہے۔ مگر سارے راستے کی سنگ بُنیاد وَیراگ نہیں، تپ نہیں، یوگ ابھیاس نہیں۔ اور کچھ نہیں صرف ایک بھگتی ہے۔ بھگتی ہی جب پکّی ہو جاتی ہے تو وہی سب سے بڑا یوگ بن جاتی ہے۔ وہ گیان کا سب سے اُونچا درجہ بن جاتی ہے اور اُسی سے حقیقت کے درشن ہو جاتے ہیں۔ بھگتی کے بغیر اگر کسی بھی راستے کو انسان اپنائے تو آگے اتنی مُشکلات آتی ہیں کہ جن میں انسان کو بہہ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ بھگتی کے راستے میں کوئی بھی خطرہ نہیں۔ مُشکلات خود بخود حل ہوتی جاتی ہیں۔ کوئی غلطی ہو جائے تو وہ بھی خود ٹھیک ہو جاتی ہے، شروع میں چاہے رفتار سُست ہی ہو مگر راستہ کچھ نہ کچھ طے ہو ہی جاتا ہے اور آگے بھگوان کی ایسی عنایت ہو جاتی ہے کہ رفتار کافی تیز ہو جاتی ہے اور انسان جلد ہی منزلِ مقصود پہ پہنچ جاتا ہے۔

خالدِ کشمیرؒ ایوانِ اُردو کا اِفتتاح (بقیہ از صفحہ نمبر ۵۳)

اور شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کا کام عام کیجئے۔ اسی طرح مخطوطات اور خطاطی کے کام، جو قومی وِرثے ہوتے ہیں، اس ادارے میں مجتمع ہیتے ہیں۔ پس یہ ادارہ قومی ملکیت ہے اور اسے سنبھالنا ہم سبھوں کا فرض ہو جاتا ہے۔ کشمیر کے ایک خادم کی حیثیت سے میں یقین دِلاتا ہوں کہ اس اِدارے کی مدد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ اُردو کی ترقی میں حکومت کشمیر بہر طور مدد و معاون رہے گی۔ کیونکہ اُردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے اور اسے اس کی ترقی سے دِلچسپی ہے۔" (تالیاں) رات کے دس بجے بخشی صاحب نے محفلِ شعر و سخن [illegible]

میں شرکت فرمائی اور پھر قوالی سے بھی لُطف اندوز ہوئے۔ محفلِ شعر و سخن میں میرزا علی جواد زیدیؔ، جگن ناتھ آزادؔ، حیرتؔ بدایونی۔ سلیمان اریبؔ، سا گھوبند رناؤ جذبؔ، وحیدؔ اختر، کنول پرشاد کنولؔ، اسدؔ انصاری، سرورؔ ڈنڈا، مظہرؔ کامل، ریورنڈ ریحانی، ابن احمد تابؔ، یٰسین علی خان یٰسینؔ، عباسؔ نقوی، پرنس ہاشم جاہ، صلاح الدین نیرؔ، سراجؔ، عابدؔ صدیقی اور مہر النساء نے حصہ لیا۔ عزیز احمد صاحب قوال نے امیر خسرو، عثمان ہارونی، جگرؔ، امجدؔ اور کامل شطاری وغیرہ کا کلام سازوں کے ساتھ پیش کیا۔ محفل شعر و قوالی کو عائشہ رشاد صاحبہ نے عمدگی سے کنوین کیا۔ اس طرح ایوانِ اُردو کی یہ باغ و بہار تقریب رات تقریباً دو بجے اختتام کو پہنچی۔

زاوئیے (بقیہ از صفحہ نمبر ۳)

محکمہ اطلاعات کے شعبۂ ثقافت کے زیرِ اہتمام لٹریری فورم کے قیام کا ثقافتی حلقوں میں جو خیر مقدم کیا گیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے ادبی اجتماعات کی تنظیم کتنی ضروری ہے۔ اس فورم کو جس نقطۂ نظر سے شروع کیا گیا ہے وہ کافی صحت مند ہے۔ یہاں ہندی، اُردو، کشمیری اور ڈوگری کے ادیب اپنی تخلیقات پیش کر سکیں گے اور اُن پر آزادانہ فضا میں تبادلۂ خیال ہو سکے گا۔ یہ بات جہاں ان مختلف زبانوں کے درمیان ایک بہتر تفہیم کی شکل میں صورت پذیر ہوگی، وہاں فن کار اور قاری بھی دُو بدو کسی فنی تخلیق کے حُسن و قبح پر ایک دوسرے کی رائے سے بہتر طور آگاہ ہو سکیں گے۔

انجمن ترقیِ اُردو کی کشمیر شاخ کی تشکیلِ نو ایک مُبارک قدم ہے۔ اس انجمن نے کُل ہند پیمانے پر کافی اچھا کام کیا ہے۔ مگر یہی بات کشمیر شاخ کی سابقہ کارکردگیوں کے متعلق وثوق سے نہیں کہی جاسکتی۔ اُمید ہے کہ جس لگن اور جذبے کے ساتھ اس کا احیائے جدید ہوا ہے وہ برابر قائم رہ کر اس کی گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کرے گی۔

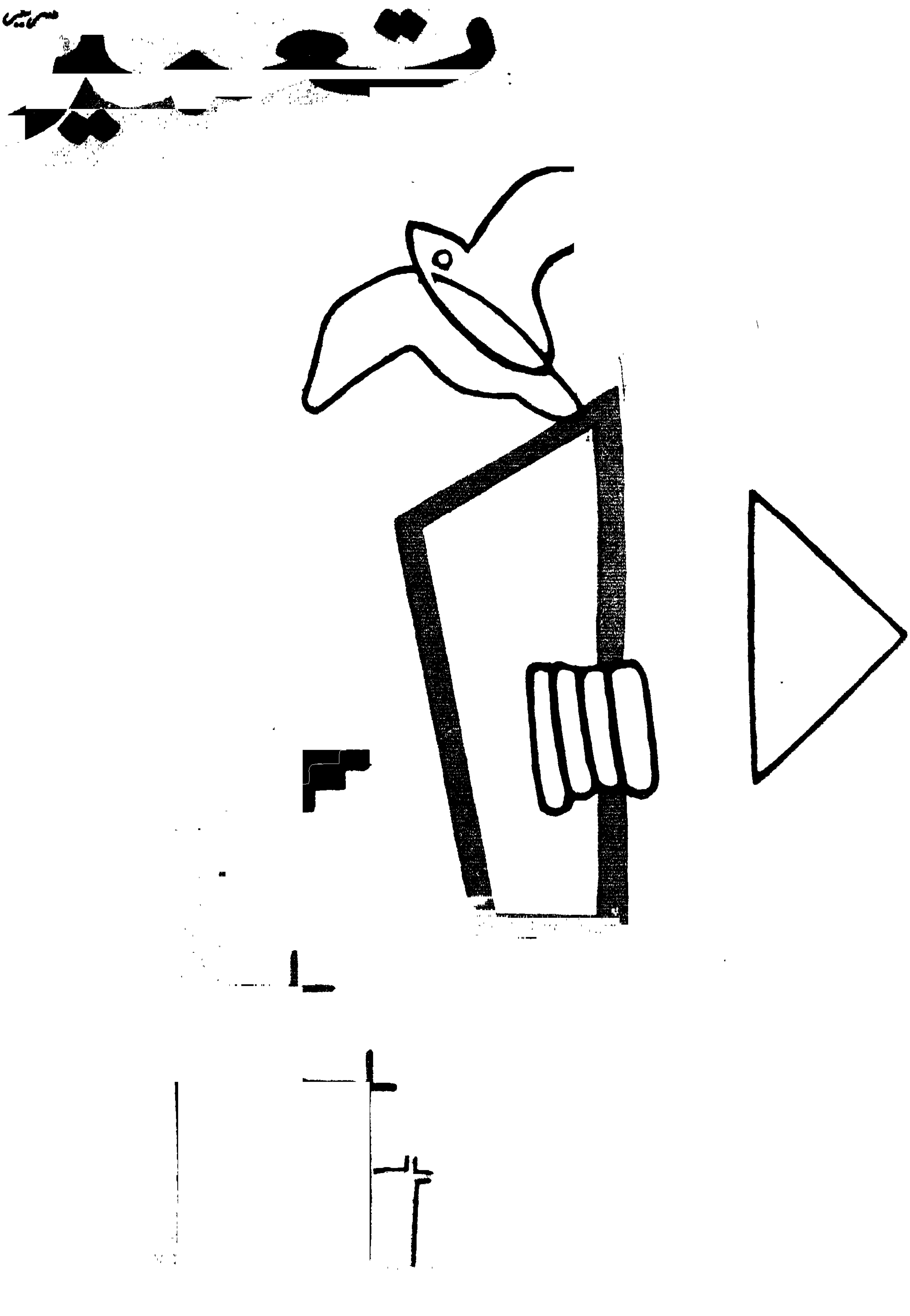
نگارشات

ارسال کرتے وقت اس امر کو ملحوظ خاطر رکھیئے کہ یہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہوں۔ دوسری صورت میں آپ معاوضے کے حق دار نہیں رہ سکتے۔ (ایڈیٹر)

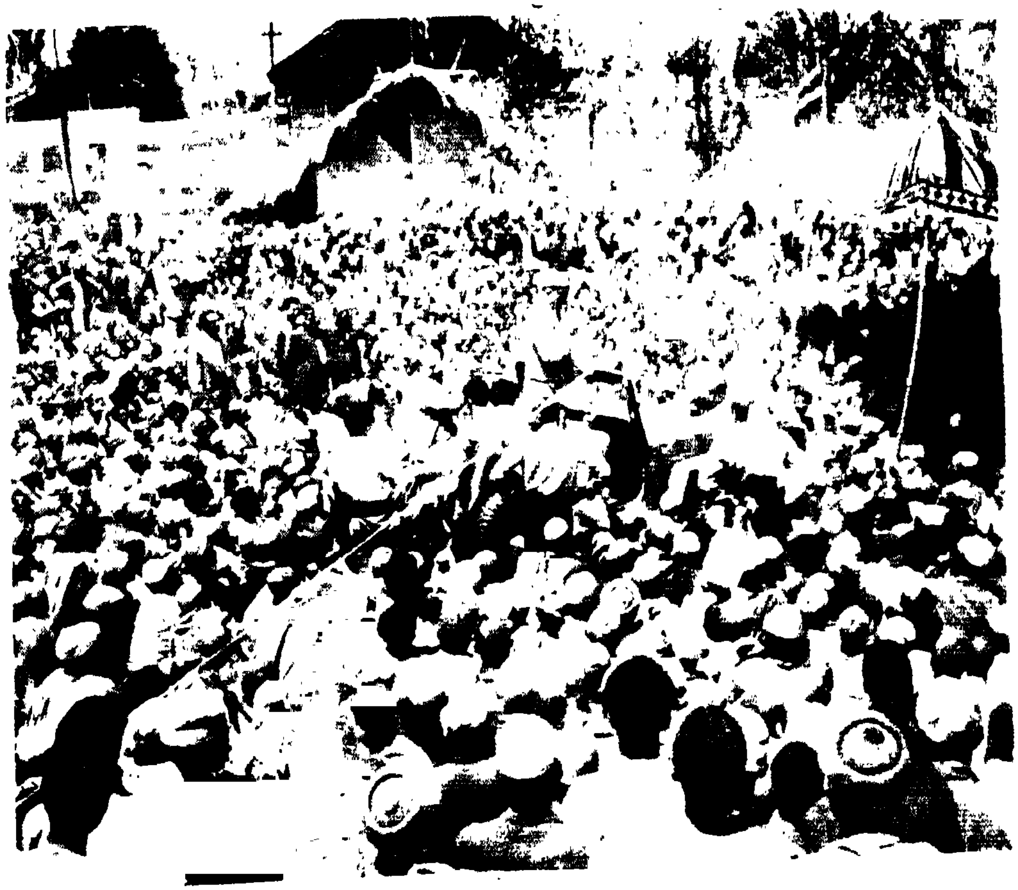












عوام دا محبوب عوام دے
حلقے میں

ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

جون سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ۵ — شمارہ ۲۴

جنرل ایڈیٹر
جے، این زتشی
ناظم اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

•

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے — سالانہ چھ روپے

•

پیرزادہ محمد سعید پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر لالہ رخ پبلی کیشنز سرینگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

زاویے

صوبہ جموں کا دَورہ مکمل کرنے کے بعد پچھلے مہینے وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد نے وادیِ کشمیر کا دورہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ وہ سرینگر کے کونے کونے میں گھومے اور رفاواری سے لے کر بتہ مالنہ تک جاکر ان علاقوں کے عوام سے دُوبدو گفتگو کرتے رہے اور اُن کے مسائل کا جائزہ لیتے رہے۔ وزارت جنوبی میں وہ پلوامہ، شوپیان، کولگام، اننت ناگ اور دوسرے مقامات پر درجنوں اجتماعات سے مخاطب ہوئے جن میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ اس دَورے میں عوام کی طرف سے خالدِ کشمیر کے لئے جس عقیدت و احترام کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا اور جس جوش و خروش سے اُن کا خیر مقدم کیا گیا اُس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خالدِ کشمیر کے لئے عقیدت کی جڑیں کتنی گہری ہیں اور کشمیر کے دُور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ کس طرح اُنہیں اپنا محبوب اور نجات دہندہ تصوّر کرتے ہیں۔ وزارت شمالی میں جہاں اُنہوں نے سوپور، بارہ مولہ، ہندواڑہ، اوڑی اور دوسرے مقامات پر عوام کو خطاب کیا، عقیدت و احترام کے ایسے ہی جذبات مشاہدے میں آئے۔

گاندربل اور بڈگام میں بھی عوام کا جذبۂ محبت ہر طرف عیاں نظر آرہا تھا۔ بخشی صاحب نے اپنے اس دَورے میں ان علاقوں کے مسائل کا بہ نفسِ نفیس جائزہ لیا اور بہت سی صورتوں میں موقع پر ہی مختلف احکامات صادر کئے۔ اس کے علاوہ اُن کے اس دَورے کی خاص اہمیت یہ تھی کہ اس کا اثر براہِ راست تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے خاکے میں رنگ آمیزی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ جناب بخشی غلام محمد نے ہر جگہ جاکر وہاں کے تمام مسائل اور وسائل کا بہ نظرِ عمیق مشاہدہ کیا اور اسی روشنی میں تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے لئے تجاویز اُبھر آئیں۔ بخشی صاحب کی تقاریر میں نئے تعمیری دَور کی گونج صریح طور نظر آرہی تھی۔ اُنہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ محنت و ریاض کے مسلک کو اپناتے ہوئے فلاحی معاشرے کی اُس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جادہ پیمائی تیز تر کریں جو اَب زیادہ دُور نہیں ہے!

ہیمال ناگرائے

(رسالے کی پُشت پر طبع شدہ تصویر)

"ہیمال ناگرائے" کشمیر کی شاید سب سے قدیم لوک کہانی ہے جس کا زمانہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال پیشتر کا ہے جب کشمیر میں ناگ قبیلے کے لوگ بستے تھے۔ اس کا ماخذ کشمیر کے تاریخی قصبے شوپیان کے نزدیک رمبی آرہ کے کنارے بلہ پورہ کا گاؤں ہے جہاں اب بھی ہیمال اور ناگرائے نام کے دو چشمے اس امر کہانی کی صداقت کی دلیل ہیں۔

صدارام ایک نکھٹو خاوند تھا۔ بیوی (چھورہ بٹین) نے مارا تو روزگار کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ ایک چشمے کے کنارے سستانے بیٹھا تو غنودگی چھا گئی اور سو گیا۔ اس عرصے میں روٹیوں کے تھیلے میں ایک ناگ آگھسا۔ نیند ٹوٹنے پر جب اس بات کا پتہ چلا تو یہ سوچ کر اُسے گھر لے آیا کہ بیوی کے ہاتھ میں تھیلا دیدونگا ناگ اُسے بے خبری میں ڈس کر موت کی نیند سلائیگا۔

بیوی نے جب تھیلا کھولا تو سانپ کی بجائے ایک من موہنا بچہ برآمد ہوا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ اُن کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ بچہ اصل میں ناگ راجکمار (ناگرائے) تھا۔ یہ جب بڑا ہوا تو وہاں کی راجکماری ہیمال سے محبت کرنے لگا۔ راجکماری بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ وہ ناگ بن کر شاہی باغ میں داخل ہوتا اور اندر جاکر پھر انسانی صورت اختیار کرلیتا۔ آخر بڑی مشکل سے دونوں کی شادی ہوگئی۔ اُدھر ناگ راجکمار کی تلاش میں پاتال کی کچھ ناگ لڑکیاں اُس قصبے میں آگئیں۔ اُنہوں نے ہیمال کی سہیلیاں بن کر ایک چال چلی اور ناگرائے کو ہیمال کے ذریعہ دُودھ میں نہلوایا۔ جس سے وہ پھر ناگ بن گیا اور ناگنیں اُسے کھینچ کر پاتال میں لے گئیں۔ اس کا ہیمال کو بہت صدمہ ہوا اور وہ شوہر کی تلاش میں در در گھومنے لگی۔ ایک براہمن کو اُس نے سونے کا ادھل ادھ موسل دے کر پتہ لگایا کہ ناگرائے سے ملنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے۔ اب ناگرائے اپنے قبیلے کی حراست میں تھا۔ لہٰذا وہ ہیمال کے گھر نہیں رہ سکتا تھا۔ آخرکار اُس نے ہیمال کو پتھر بنا کر اپنے پاس رکھ لیا تاکہ ناگنیں اُسے دیکھ نہ سکیں لیکن ناگنوں کو اس کا پتہ چل ہی گیا۔ ہیمال عورت کی شکل میں آکر ناگ بچوں کو دُودھ پلانے کا کام کرنے لگی۔ ایک بار ہیمال کی غلطی سے کچھ ناگ بچے زیادہ گرم دُودھ پینے کی وجہ سے مرگئے۔ غصّے سے ناگنوں نے ہیمال کو ڈس لیا اور اُس کے جسم کو راکھ بنا ڈالا۔ لیکن ناگرائے نے منتروں کی طاقت سے اُسے پاتال سے باہر لے جاکر پھر زندہ کردیا۔ ایک دوسرے راجکمار نے (بقیہ بر صفحہ ۴۳)

شباب ملّت ایم اے

اے جنّتِ کشمیر

اے گلشنِ شادابِ وطن ۔ حسن کی تصویر
اے جنّتِ کشمیر
اے سُرخیٔ رُخسارِ وطن ۔ مخزنِ تنویر
اے جنّتِ کشمیر

دامن کشِ دِل ہیں ترے پُرکیف نظارے ۔ ذرّے ہیں تری خاک کے پُرنور ستارے
ہے سارے زمانے کی نظر میں تری توقیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
شاداب ترے دشت تری وادیاں گلپوش ۔ آغوش سے ماں کے نہیں کچھ کم ترا آغوش
پانی ترا امرت ہے تو مٹی تری اکسیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
موجوں کا یہ سنگیت یہ جھرنوں کا حسین ساز ۔ مسکن ہے فرشتوں کا تری جلوہ گہِ ناز
منظر ترے خیام کے اشعار کی تفسیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
اس باغ کے ہر پھول میں خوشبوئے وفا ہے ۔ اس خاک کے ہر ذرّے میں اُلفت کی ضیا ہے
تو عشق کی میراث ہے تو حسن کی جاگیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
جلوؤں سے ترے آنکھ چُرانا نہیں آساں ۔ واپس ترے آغوش سے آنا نہیں آساں
منظر ترے بن جاتے ہیں دِل کے لئے زنجیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
تھے گُرگ و سپردِ ترے گلزار کے بُوٹے ۔ نہرو سے کواکب ترے آکاش سے ٹوٹے
تیرے ہی عناصر سے تھی اقبال کی تخمیر ۔ اے جنّتِ کشمیر

ہے آج ترے گھر کی بہو لیلیٰ جمہور ۔ ہے اپنا لہو اس کی حسیں مانگ کا سیندور
سپنے ترے بیٹوں کے ہیں شرمندۂ تعبیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
پژمُردہ جو گُل تھے وہ ہوئے ہیں تر و تازہ ۔ جنتا نے اُٹھایا ہے غریبی کا جنازہ
لہرایا ہے بیٹوں نے ترے پرچم تعمیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
صد شکر کہ باقی نہیں اب دورِ مصیبت ۔ صد شکر کہ مشکور ہے یہ طرزِ حکومت
نیرنگیٔ ایّام سے پلٹی تری تقدیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
اِک حصّہ ہے مفلوج ابھی تک ترے تن کا ۔ اغیار کے پنجے میں گریباں ہے وطن کا
سر پر ہے ترے آج بھی تولی ہوئی شمشیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
ہے تشنۂ تکمیل ابھی کام ہمارا ۔ خطرے میں نظر آتا ہے آرام ہمارا
کرنا ہے ابھی قلعۂ اغیار کو تسخیر ۔ اے جنّتِ کشمیر
دُشمن نے لکھی جس میں تباہی کی عبارت ۔ تاریخ وہ تیری تھی کبھی دفترِ عظمت
کرنا ہے اسے خامۂ ایثار سے تحریر ۔ اے جنّتِ کشمیر

ہے باعثِ تسکینِ جگر جس کا حسیں نام
ہیں جس کے تصوّر سے عدو لرزہ براندام
بخشی[1] ہے نگہباں وُہ ترا صاحبِ تدبیر
اے جنّتِ کشمیر

[1] بخشی سے مُراد جناب بخشی غلام محمد

اختر انصاری

اُردو ڈراما اور "انارکلی"

اُردو ادب کی اصناف میں ڈراما سب سے کم عمر اور سب سے پس ماندہ صنف ہے۔ سب سے کم عمر اس لئے کہ امانت کی "اِندر سبھا" سے پہلے اُردو میں ڈرامے کا سُراغ نہیں مِلتا، اور یُوں اُردو ڈرامے کی عمر زیادہ سے زیادہ سَو (۱۰۰) برس قرار پاتی ہے۔ باقی رہی صنفِ ڈراما کی پسماندگی، تو اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اُردو میں اوّل درجے کے ڈرامے اُنگلیوں پر گِنے جاسکتے ہیں اور شاید ہمارے یہاں ایک ڈراما بھی اس معیار کا نہیں ہے جس معیار کے بے شمار ڈرامے مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں میں موجود ہیں۔ درآں حالے کہ ہمارے ادب کی بعض دوسری اصناف مثلاً شاعری اور مختصر افسانہ نگاری مغربی ادب کی انہیں اصناف سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں اور اپنے دامن میں ایسی تخلیقات رکھتی ہیں جن کو بِلا تامّل فخر کے ساتھ مغربی ادب کے شاہکاروں کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اُردو ڈرامے کی پیدائش میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟ اس سوال کا جواب شاید ہمیں اُردو زبان اور ادب کے بُنیادی عناصر کی چھان پھٹک میں ملے گا۔

اُردو زبان کی تشکیل میں ایک طرف عربی، فارسی اور تُرکی اور دوسری طرف ہندوستان کی آریائی زبانوں نے حصہ لیا ہے۔ تشکیلِ زبان سے ہٹ کر تعمیرِ ادب میں ان مشرقی زبانوں کے اثرات کے علاوہ مغربی ادبیات کے اثرات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے قدیم ادبیات کی عظمت و رفعت سے تو سب واقف ہیں۔ باقی رہا ترکی زبان کا قدیم ادب، تو اُس کے بارے میں بھی اتنا تو بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے معیاروں کے لحاظ سے ایک ترقی یافتہ ادب تھا۔ لیکن اس سارے ادبی سرمایے میں ڈرامے کی صنف مفقود تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اسلام کے وہ شرعی احکام تھے جن کی بناء پر ڈرامے کے تمثیلی اجزا یعنی نقالی، اداکاری، بہروپ، رقص اور موسیقی ممنوعات کا درجہ رکھتے تھے اور دوسری وجہ اس امر کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک خاص قسم کی پردہ داری، ایک خاص قسم کا اِخفا تقریبًا ہر زمانے میں اور ہر ملک میں مسلمانوں کے تمدّن، معاشرے اور ادبیات کا نُمایاں اور عمومی وصف رہا ہے۔ اس پوشیدگی اور رمزیہ کیفیت کی بہترین مثال شاید فارسی اور اُردو غزل کا علامتی اور کفایتی انداز ہے جس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ "برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست" یا وُہ بات جس کو انگریزی مقولے میں The best of art is the Concealment of art کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے، نہ صرف غزل کی بلکہ اسلامی ممالک کے تمام ادب العالیہ کی عام خصوصیت رہی ہے اور یہ خیال ہرگز دُور از کار یا بعید از قیاس نہیں کہ اس خصوصیت کی بنا پر اسلامی ممالک کا ادب ڈرامے کی صنف سے جو بیّن و برملا اظہار کی صنف ہے، خالی و محروم رہا۔ اس کو شاید یُوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مُسلمانوں کے تمدّنی مشاغل اور فنّی و ادبی سرگرمیوں میں جو ایک خاص قسم کا وقار اور رکھ رکھاؤ عام طور پر پایا جاتا ہے اُس کی بنا پر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ ڈراما جیسی صنف بھی "بلند سنجیدگی" کی حامل ہو سکتی ہے اور یُوں اُن کی ادبی جدوجہد صنفِ ڈراما کو اپنانے کی کوشش سے بیگانہ رہی۔ خلاصہ کلام یہ کہ عربی، فارسی یا ترکی کے توسّط سے اُردو میں ڈرامے کی پیدائش نہ ممکن تھی نہ ہوئی۔ البتہ زمانۂ قدیم میں جس طرح یُونان والوں نے ڈرامے کی صنف کو فروغ بخشا تھا اُسی طرح سنسکرت زبان کے مصنّفوں نے بھی اس صنفِ ادب کو اپنی جولاں گاہ بنایا تھا اور لازوال تخلیقات پیش کی تھیں۔ قاعدے کی رُو سے سنسکرت ڈراموں کے اثرات کے تحت اُردو میں ڈرامے کا رواج بالکل شروع ہی سے ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

تعمیر

جس کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی سنسکرت زبان و ادب کی شمع گُل ہو چکی تھی اور سنسکرت ڈرامہ قالب بے جان بن چکا تھا۔ کالی داس اور بھو بھوتی کے قلم نے جس فن کی آبیاری کی تھی وہ فن بھانڈوں اور نقالوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر مبتذل اور رکیک ہو چکا تھا اور اُس میں ہرگز کسی ایسی زبان کے ادب کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں تھی جو وقت کے متعدد تہذیبی ورثوں کے اختلاط سے وجود میں آ رہی تھی اور اپنے عوامی کردار اور جمہوری حیثیت کے باوجود درباروں، محل سراؤں اور خانقاہوں کے بلند ثقافتی معیاروں کی پابند تھی۔

مغربی ادب کے اثرات بھی اُردو میں ڈرامے کی پیدائش کا سبب نہیں بن سکے۔ اس لئے کہ یہ اثرات ہمارے ادب پر صحیح معنوں میں غدر کے بعد پڑنے شروع ہوئے۔ غدر کے بعد البتہ اُردو ڈرامے کا ارتقا مغربی ڈرامے کے زیر اثر نہایت تیزی کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ہندوستان میں اسٹیج اور تھیٹر کی عدم موجودگی نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی زبان میں ڈرامائی ادب ایک بلند پایہ اور کامیاب اسٹیج کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ گو اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ادب میں بلند پایہ اور طبع زاد (نہ کہ مستعار و ماخوذ) ڈراموں کا وجود ہی ایک کامیاب اور پھلتے پھولتے اسٹیج کی موجودگی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ غدر کے بعد غالباً مغربی اثرات ہی کے تحت ہندوستان میں اسٹیج اور تھیٹر وجود میں آیا۔ لیکن اُردو ڈرامے کی بدقسمتی سے یہ جان ہار اور جوانا مرگ ثابت ہوا۔ یعنی پہلے خاموش متحرک تصاویر اور پھر ناطق فلم کی ایجاد اور مقبولیت نے اُس کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ آج بھی ہندوستانی اسٹیج کس مپرسی کے عالم میں ہے اور پردۂ سیمیں فلمی گانوں کی دل آویزی کے سبب سے خاص و عام کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک گیتوں بھرے فلموں کی کشش فلمی ستاروں کی دل فریبی اور پسِ پردہ گانے والوں کی سحر کاری کا یہی عالم ہے، تھیٹر کی ترقی کے راستے مسدود رہیں گے۔ اور نہ تو پیشہ ور حلقوں میں ڈرامے کی مانگ پیدا ہوگی اور نہ اعلیٰ درجہ کے ڈرامے وجود میں آئیں گے۔

اگر اُردو ڈراما امانت سے سو پچاس برس پیشتر وجود میں آجاتا اور جدید فلموں کے آغاز سے پہلے ترقی کی منزلیں طے کر کے مضبوطی کے ساتھ قدم جما لیتا تو آج فلموں کی مقبولیت اُس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنتی اور مغرب کے

تھیٹر

ڈرامائی ادب کے اثرات اُس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتے۔

امانت کی "اندر سبھا" پر گفتگو کرنے سے پہلے اُردو میں ڈراما نگاری کی دو ناکام کوششوں کا ذکر ضروری ہے جو "اندر سبھا" کی تصنیف سے بہت پہلے عمل میں آئیں۔ ان دو ناکام کوششوں کی رُوداد دراصل دُنیائے ادب و فن کی دو ایسی فاش غلطیوں کی رُوداد ہے جو اگر سرزد نہ ہوتیں تو اُردو ڈراما "اندر سبھا" سے بہت پہلے وجود میں آ گیا ہوتا۔

پہلی کوشش کا علم ہمیں سید بادشاہ حسن حیدرآبادی کے ایک قابل قدر تحقیقی مضمون "اُردو ڈرامے کی پیدائش" (مطبوعہ "ادبی دُنیا" بابت جنوری ۱۹۴۲ء) سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ... ... نوازؔ نامی ایک شخص نے کالیداس کے شہرہ آفاق ڈرامے شکنتلا کا ترجمہ شروع کیا ... ... یہ فرخ سیر کے دورِ حکومت یعنی ۱۷۱۲ تا ۱۷۱۸ء کے درمیان کا زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کے ایک فوجی سردار موسیٰ خان ولد فدائی خان کو ایک لڑائی جیتنے کے صلے میں عظیم خان کا خطاب ملا تھا اور اس خطاب کی خوشی میں اُس نے نہ صرف جشن منایا بلکہ بڑی فیاضی بھی دکھائی۔ جنگ و جدال کے علاوہ اس سردار کو ادب اور زبان کی ترقی سے بھی دلچسپی تھی۔ اُس نے یہ بات خود ہی محسوس کی یا نہ معلوم نوازؔ نے اُسے توجہ دلائی کہ اُردو میں ڈراما ابھی تک عنقا ہے۔ موسیٰ خان نے بہرصورت سرپرستی کے لئے کمر کس لی۔ لیکن جہاں نوازؔ کو یہ سہولت بہم پہنچی وہاں یہ دشواری بھی پیش آئی کہ ایسے میدان میں جہاں نقوشِ قدم ہی نہیں دکھائی دیتے وہاں قدم رکھے تو کیونکر رکھے۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد نظر شکنتلا پر پڑی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ نوازؔ کو سنسکرت سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ ایک پنڈت کی مدد سے بہرحال اُس نے ترجمہ پورا کیا۔ جن لوگوں نے شکنتلا کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ ایک تو ترجمے کی دقتیں، اُس پر سنسکرت اور قدیم ہندو دیومالا کی تمثیلی روایتوں کو پوری طرح نہ سمجھ سکنے کی دشواری سوا۔ غرض یہ کہ ترجمہ ہوا تو سہی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈرامے کی شکل میں ترجمہ کرنے اور مکالمے اور

تمثیل کی دوسری خوبیوں کو ہو بہو باقی رکھنے کی بجائے نواز نے سہل انگاری یا ناواقفیت کی وجہ سے اُس کو قصّے کی شکل میں منتقل کر دیا۔ انہیں حالات کی وجہ سے اس ترجمے کی وجہ سے جو توقع ہو چلی تھی کہ اس کے بعد ترجموں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اور ڈرامے کی صنف قدیم ہندوستانی ڈراموں کے تراجم سے مالامال ہوگی، پُوری نہ ہوئی۔ بہت جلد یہ ترجمہ طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور اس پر گمنامی کے پردے پڑ گئے۔ "

تقریباً سو برس بعد یہ غلطی پھر دہرائی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں مرزا کاظم علی جوان نے للو لال جی کی مدد سے شکنتلا کا ترجمہ کیا اور چونکہ اُردو کی دُنیائے ادب اُس وقت تک ڈرامے کے تصوّر سے بیگانہ تھی اور اسٹیج یکسر معدوم تھا اس لئے ایک مرتبہ پھر ڈرامے کا ترجمہ افسانے کی شکل میں کیا گیا۔ اور ڈرامے کے خارجی اسلوب اور تمثیلی پہلو کو اہمیت نہیں دی گئی۔ چناں چہ یہ کوشش بھی اُردو میں ڈرامے کی پیدائش کا سبب نہیں بن سکی اور شکنتلا کے دو ترجموں کے باوجود اُردو ادب ڈرامے کی صنف سے بیگانہ رہا۔ ظاہر ہے کہ اگر شکنتلا کا ترجمہ افسانے کی بجائے ڈرامے کی شکل میں کیا جاتا اور عملی پیش کش کے مطالبات کو خاطر خواہ اہمیت دی جاتی اور پھر جس طرح آگے چل کر "اندر سبھا" ڈرامائی اسلوب کا پیکر بن کر سامنے آیا اور ایک ڈرامے کی طرح اسٹیج پر کھیلا گیا؛ اُسی طرح یہ بھی کھیلا جاتا تو اُردو میں ڈراما "اندر سبھا" سے بہت پہلے وجود میں آ گیا ہوتا۔

اندر سبھا کی تصنیف یعنی اُردو ڈرامے کی پیدائش کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ واجد علی شاہ کے حکم سے امانت نے یہ ڈراما لکھا اور پھر وہ قیصر باغ میں کھیلا گیا جس میں بادشاہ نے بھی تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اداکار کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعض حلقوں میں یہ بھی خیال کیا جاتا رہا ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی یُوروپین تھا جس نے اُن کو مغرب کے اوپرا یا میوزیکل کامیڈی کا حال بتایا اور اس سے اُن کے ذہن میں ڈرامے کا تصوّر پیدا ہوا لیکن یہ سب باتیں محض قیاسی ہیں اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ امانت کا بادشاہی دربار سے کوئی تعلق تھا نہ "اندر سبھا" بادشاہ کے ایما سے لکھا گیا؛ اور نہ قیصر باغ میں کھیلا گیا۔ مذکورہ بالا مضمون سے امانت اور اُن کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں اُس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امانت کا واجد علی شاہ کے دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ بادشاہ کے ایما سے اندر سبھا لکھا گیا۔ صاحبِ مضمون لکھتے ہیں :- " امانت سنہ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ٹھیک بیس برس بعد یعنی ۱۲۵۱ھ میں امانت کی طاقتِ گفتار میں فرق آ گیا اور انہوں نے اسی سبب سے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تقریباً دس برس تک امانت کی اسی طرح بسر ہوئی۔ واجد علی شاہ اُس وقت تقریباً اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے اور گو تخت نشین ابھی نہ ہوئے تھے لیکن موسیقی اور شاعری سے دلچسپی شروع ہو چکی تھی بلکہ اس زمانے میں عمر اور حالات کے اعتبار سے اس قسم کے سب تفریحی مشاغل اپنے پُورے رنگ پر تھے۔ ظاہر ہے کہ امانت اُس وقت تک واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچے نہ تھے اور پہنچتے بھی تو کیونکر؟ جب کہ زبان کا روگ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس کے بعد یکایک امانت کو عراق جانے کی سُوجھی اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر لوٹے تو حُسنِ اتفاق سے اُن کی گویائی عود کر آئی۔ لیکن ابھی لکنت باقی تھی اور لکنت بھی ایسی تھی کہ خاص دوست احباب کے سوا وہ عوام میں بے تکلف آنے جانے سے ایک عرصہ تک کنارہ کرتے رہے۔ اس زمانے میں بھی امانت دربار نہ پہنچے تھے اور نہ اُن کے وہاں پہنچنے کا کوئی امکان تھا۔ البتہ گھر ہی پر دوست احباب اور شاعروں کا خاص مجمع رہتا تھا اور اُنہیں کی صحبت میں وہ دِل بہلاتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک شاگرد حاجی مرزا عابد علی عبادت نے انہیں اندر سبھا لکھنے کی ترغیب دی۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ لیکن بعض دوسری دلچسپیوں نے اُس کو سنہ ۱۲۷۰ھ سے پہلے مکمل ہونے نہ دیا ... ... ان حالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں امانت "اندر سبھا" لکھنے سے پہلے پہنچ نہ سکتے تھے اور جب وہ دربار ہی میں نہ گئے تھے تو بادشاہ نے بھی اُن سے فرمائش نہ کی ہوگی۔ "

باقی رہا "اندر سبھا" کے قیصر باغ میں کھیلے جانے کا سوال، تو اس سلسلے میں بھی صاحبِ مضمون کا استدلال مُناسب اور فیصلہ کُن معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :- " جن اصحاب نے واجد علی شاہ دربار کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قیصر باغ میں اس قسم کی ساری تفریحی چیزیں بادشاہ کے ایما سے ہوتی تھیں اور چونکہ واجد علی شاہ خود ایک پُرگو شاعر تھے اور موسیقی میں بھی انہیں کافی دخل تھا۔ اسی لئے ایسی محفلوں میں اکثر و بیشتر اُنہیں کی کہی ہوئی چیزیں پیش

کی جاتی تھیں۔ واجد علی شاہ کا کلیات سامنے رکھ کر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ کیا شاعری کی کوئی ایسی صنف بھی رہ گئی ہے جس میں انہوں نے کوئی چیز موزوں نہ کی ہو! اوّل تو یہی ثابت نہیں ہوتا کہ اندر سبھا کا ڈرامہ کبھی قیصر باغ میں کھیلا گیا۔ لیکن اگر اس قسم کا کوئی تماشہ ہُوا بھی ہوگا تو امانت کا کیا ہوا نہیں بلکہ خود واجد علی شاہ کا موزوں کیا ہوا ... ... اس ڈرامے میں دو کردار ایسے ہیں جو دربار میں بیک وقت ادا نہیں ہو سکتے۔ اندر راجہ ہے اور گلفام عاشق اگر واجد علی شاہ نے خود بھی اس میں پارٹ ادا کیا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے تو ان دونوں میں کسی کردار کا پارٹ ادا کیا ہوگا؟ اگر وہ راجہ بنتے تو کس درباری کا دِل گردہ تھا کہ اُن کی موجودگی میں اُن کی ہی گوپی سے وہ عشق کرتا۔ اگر خود گلفام بنتے تو راجہ بننے کی کِسے مجال تھی۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ تماشائی کا پارٹ ادا کرتے ہوں گے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں اور خصوصاً ایسے تفریحی مشاغل میں اُن کے آس پاس سوائے منظورِ نظر اور حرم میں شامل کی ہوئی عورت کے کوئی اور نہ ہوتا تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ان عورتوں سے عاشقی کرنے کی کِسے جرأت ہو سکتی تھی۔"

عام قیاسات کے غلط ہونے کا آخری ثبوت جو ہمیں مذکورہ مضمون ہی سے دست یاب ہوتا ہے' یہ ہے کہ امانت نے اندر سبھا کے علاوہ ایک اور کتاب "شرحِ اندر سبھا" بھی لکھی ہے (جس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانے میں ہے) اور اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اندر سبھا عبادت کے کہنے پر لکھی گئی ہے۔ امانت نے اندر سبھا کی تاریخ بھی کہی تھی اور اُن کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ جو "شرحِ اندر سبھا" میں موجود ہے' صاف طور پر بتاتا ہے کہ اندر سبھا پہلی مرتبہ قیصر باغ میں نہیں کھیلا گیا بلکہ لکھنؤ کے عوام نے اُسے نہایت ذوق و شوق اور جوش و خروش کے ساتھ اسٹیج کیا۔

مگر یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اندر سبھا کی تخلیق کن اسباب کے تحت ممکن ہوئی۔ واجد علی شاہ کا دَور لکھنؤی تمدّن کے ظاہری عروج اور باطنی انحطاط کا زمانہ تھا۔ صاحبِ اقتدار جاگیرداری طبقہ اپنے زمانے کی ترقی پذیر قوتوں سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس لئے وہ زوال اور پس ماندگی کا شکار ہو کر اپنی زندگی کو ہو حق' راگ رنگ اور تفریح و تعیش کی نذر کر چکا تھا۔ اُس زمانے کے تفریحی مشاغل میں رہس، نوٹنکی، سوانگ، بہروپ اور طرح طرح کی نقلیں

تعمیر

بہت نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے علاوہ سنسکرت ڈرامے کے بگڑے ہوئے آثار رام لیلا اور دوسری مذہبی و نیم مذہبی تمثیلات اور سماجی رسُوم کی شکل میں موجود تھے۔ اُردو مرثیوں اور مثنویوں کے ڈرامائی عناصر اور تمثیلی اجزا بھی ایک قوی اور جاندار محرک کے طور پر روشناسِ عوام تھے۔ یہی وہ خام مواد تھا جس سے اُردو ڈرامے کا پیکر تیار ہوا۔ ممکن ہے مغربی ڈرامے کے تصوّر نے بھی اس پیکر کی تشکیل میں بالواسطہ طور پر کسی حد تک مدد دی ہو۔ اور یُوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ڈرامے کی پیدائش سنسکرت ڈرامے اور مغربی ڈرامے کے براہِ راست اثرات کے تحت تو نہیں مگر بالواسطہ اثرات کے تحت ضرور ہوئی۔ اور وقت کی عوامی زندگی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بطن سے اُس نے جنم لیا۔

"اندر سبھا" کے بعد اُردو ڈرامے کا عبوری دَور شروع ہوتا ہے جس میں ایک کم عیار اور سوقیانہ ہندوستانی اسٹیج کے لئے رونق بنارسی، طالب بنارسی، احسن لکھنؤی، بےتاب دہلوی، آغا حشر کاشمیری اور دوسرے پیشہ ور ڈرامہ نگاروں نے بےشمار ڈرامے لکھے جن میں کچھ مترجم تھے اور کچھ طبع زاد۔ مگر بیشتر ادنیٰ معیار کے کارنامے تھے۔ ان میں جو بہترین خیال کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حشر کے بعض ڈرامے وہ بھی ایک عبوری اور تجرباتی دَور کی پیداوار ہونے کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ ایک تاریخی اہمیت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فلمی تصاویر وجود میں آئیں اور ہندوستانی تھیٹر ترقی کے امکانات سے محروم ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد ڈرامے کا جدید اور موجودہ دَور آتا ہے۔ اس دَور نے گنتی کے چند ڈرامانگار پیدا کئے اور ان چند ڈرامانگاروں نے بھی مقدار یا نوعیت کے لحاظ سے اس صنف کے کارناموں میں کوئی معتد بہ اضافہ نہیں کیا۔ امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، ڈاکٹر عابد حسین اور اشتیاق حسین قریشی اور جدید تر لکھنے والوں میں اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور مرزا ادیب اس دَور کے قابلِ ذکر ڈرامانگار ہیں۔ مگر تاج کے علاوہ ان لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے ڈرامانگاری پر اپنی پُوری توجہ صرف کی ہو اور اس صنف میں زندہ رہنے والا کام پیش کیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر عابد حسین کا تنہا ڈرامائی کارنامہ "پردۂ غفلت" ایک اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے اور اشک کے متعدد ایک ایکٹ کے ڈرامے فن کے بڑے اچھے نمونے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ان سب لکھنے والوں کی ڈرامائی پیداوار کوئی خاص ادبی اہمیت یا وزن نہیں رکھتی اور اس نے اُردو میں صنفِ ڈراما کو آگے بڑھانے میں کوئی قابلِ ذکر خدمت انجام نہیں دی۔ ان میں سے اکثر لکھنے والے افسانہ

نگار پہلے ہیں اور ڈراما نگار بعد میں اور صرف ضمنی حیثیت سے۔ پھر اُن کی افسانہ نگاری میں معیار کی جس بلندی کا ثبوت مِلتا ہے ڈراما نگاری میں نہیں ملتا۔ اور چونکہ یہ بُنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ڈرامے کے میدان میں اُن کی جدوجہد تمثیلچوں اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکی۔ اشتیاق حسین قریشی نے ضرور Full length ڈرامے لکھے ہیں۔ لیکن اُن کے ڈراموں کو فنی معیار پر پرکھا جائے یا تاثیر کے نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو اُن کو زیادہ سے زیادہ صنفِ ڈراما کے لئے ایک اعتذار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ تاجؔ البتہ بُنیادی طور پر ڈراما نگار ہیں۔ اور درجۂ اوّل کے ڈراما نگار ہیں اور اُن کا ڈراما "انارکلی" قدرِ اوّل کا ڈراما ہے۔ مگر افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ انارکلی اُن کی ابتدا ہی نہیں انتہا بھی ہے!

(۲)

انارکلی کے فنی اور ادبی پہلوؤں کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس ڈرامے کا مواد کیا ہے اور کس نوعیت کی چیز ہے اور مصنف اُس کے استعمال کرنے میں ایک ڈراما نگار کے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہوا ہے۔

ڈرامے کا مواد عہدِ اکبری کے ایک واقع سے فراہم کیا گیا ہے جس کا تعلق اکبر سے زیادہ اُس کے بیٹے سلیم سے ہے اور جو اکبر کے حرم کے بعض دوسرے افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تاجؔ "انارکلی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-
"لاہور میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کی طرف سے انارکلی کے مقبرے میں اُس کی جو داستان ایک فریم میں لگی ہوئی ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے : لاہور کا سول اسٹیشن انارکلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطاب شہنشاہ اکبر کے حرم میں نادرہ بیگم یا شرف النسا بیگم ایک منظورِ نظر کنیز کو ملا تھا۔ ایک روز اکبر شیش محل میں بیٹھا تھا۔ نوجوان انارکلی اُس کی خدمت میں مصروف تھی تو اکبر نے آئینوں میں دیکھ لیا کہ وہ سلیم کے اشاروں کا جواب تبسّم سے دے رہی ہے۔ بیٹے سے مجرمانہ سازش کے شبہ پر شہنشاہ نے اُسے زندہ گاڑ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں اُسے مقررہ مقام پر سیدھا کھڑا کرکے اُس کے گرد دیوار چن دی گئی۔ سلیم کو اُس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا . . . "

اس قصے کی تاریخی قدر وقیمت حد درجہ مشتبہ ہے۔ چنانچہ تاجؔ لکھتے ہیں :- "جہاں تک میں تحقیق کرسکا ہوں، تاریخی اعتبار سے یہ قصہ بے بُنیاد ہے۔ یہ داستان نہ معلوم کب اور کیونکر ایجاد ہوئی اور لاہور کی جن تواریخ میں اس کا تذکرہ ہے اُن میں کہاں سے لی گئی۔ خود داستان میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر کئی ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے یہ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔"
لیکن اس واقعے کا اصلی یا فرضی ہونا ادبی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور مصنف یہ کہنے میں حق بجانب ہے :- "میرے ڈرامے کا تعلق محض روایت سے ہے۔ بچپن سے انارکلی کی فرضی کہانی سنتے رہے۔ یہ حُسن و عشق اور ناکامی و نامرادی کا جو ڈراما میرے تخیّل نے مغلیہ حرم کی شوکت و تحمل میں دیکھا، اُس کا اظہار ہے۔" اور ناقد کا فرض بھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس اصلی یا فرضی تاریخی قصے کی بُنیاد پر جو ڈراما لکھا گیا ہے وہ کسی حد تک ایک تاریخی ڈراما اور کامیاب ڈراما کہلانے کا مستحق ہے۔

بسا اوقات ہم کسی ناول یا ڈرامے کو نہایت آسانی کے ساتھ تاریخی قرار دے دیتے ہیں۔ شررؔ کے ناولوں کو تاریخی ناول اور خود شررؔ کو اُردو کا سر والٹر اسکاٹ خیال کرنا اسی قسم کی مضحکہ خیز غلطی ہے۔ چند تاریخی شخصیتوں یا شہروں یا لڑائیوں کے ذکر سے یا چند تاریخی ناموں کے استعمال سے کوئی ناول تاریخی نہیں بن جاتا۔ تاریخی ناول نگار یا ڈراما نگار دراصل ایک ایسا مؤرخ ہوتا ہے جو عام مؤرخ کی طرح کسی خاص تاریخی دَور یا اُس دَور سے متعلق اہم سیاسی واقعات و تحریکات کے ذکر پر اکتفا نہیں کرتا۔ نہ بادشاہوں کی معرکہ آرائیوں اور محلوں اور درباروں کی سازشوں کو اپنا موضوعِ اصلی سمجھتا ہے بلکہ ان خارجی مظاہرِ حیات کی تہہ میں جو معاشرتی اور تمدّنی زندگی پرورش پاتی ہے اُس کے چہرے سے نقاب ہٹاتا ہے۔ اُس کی تحریر کے آئینے میں ہم اُس زندگی کی جھلک دیکھتے ہیں جس کی بنا پر ایک تاریخی دَور اور دوسرے تاریخی دَور سے مختلف اور متفاوت ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے اصلی خط وخال یعنی تمدّن ومعاشرت، رسم ورواج اور عقائد و اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ زمانۂ زیرِ بحث کے سطحی پہلوؤں سے گذر کر بُنیادی حقائق کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ وہ حالات و واقعات کے سرسری جائزے کو کافی نہیں سمجھتا اور اپنے مطالعے کو زندگی کی سطح تک محدود رکھنے کے بجائے اُن بُنیادی قوّتوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے جو سطح سے بہت نیچے زندگی کی تہوں میں کارفرما ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ جس زمانے کو اپنا موضوع بناتا ہے اُس زمانے کی بُنیادی حقیقتوں کی اساس پر اپنے فنی کارنامے کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ انارکلی کا مصنف ان فرائض سے کہاں تک عہدہ برآ

ہوا ہے۔ اور انارکلی میں تاریخی ڈرامے کے لوازمات کس حد تک پائے جاتے ہیں؟ انارکلی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس ڈرامے کے مختلف کردار مثلاً اکبر، سلیم، رانی، حکیم صاحب اور دِل آرام محض چند تاریخی نام نہیں ہیں جو چند عام اور گول مول کرداروں کو عطا کر دئیے گئے ہوں بلکہ درحقیقت تاریخی شخصیتیں ہیں، جو واضح اور یقینی طور پر ایک خاص تاریخی دَور کی نمایندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی محبت و نفرت، بود و ماند، ذہن و مزاج، حرکات و سکنات، عادات و اطوار، اصول و عقائد اور میلانات و مشاغل مخصوص ہیں اور ایسے کہ اُن کی مدد سے ہمارے ذہن میں ایک خاص تاریخی دَور کا تصوّر متعین ہوتا ہے۔ کرداروں کے علاوہ واقعات اور مناظر تک بھی اُسی دَور کی جھلک صاف نظر آتی ہے جس دَور کو ڈرامانگار نے ڈرامے کا موضوع بنایا ہے۔ ان امور کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انارکلی ایک تاریخی ڈراما ہے اور تاریخی ڈرامانگاری کے معیار پر پُورا اُترتا ہے۔

ڈراما زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اس ترجمانی کا انداز ناول یا افسانے کے بیانیہ انداز سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یہاں عملی اداکاری بیانیہ انداز کی جگہ لے لیتی ہے۔ چنانچہ حرکت یا عمل ڈرامے کی تکنیک کا اساسی عنصر ہے۔ افسانہ نگار کو یہ آسانی ہر وقت حاصل ہوتی ہے کہ کہانی کے واقعات کو جب جی چاہے خود بیان کرے اور جب جی چاہے کرداروں کے عمل اور بات چیت کے ذریعہ ادا کرے۔ مگر ڈرامے میں تمام واقعات کرداروں ہی کے اقوال و افعال کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں اور مصنف خود کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ اگر ڈرامے میں مکالمے کا عنصر عمل پر غالب آجائے۔ یعنی مکالموں میں بیانیہ انداز کی زیادتی ہو تو ڈراما بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ڈرامے میں ہر جگہ مکالمے کے ساتھ ساتھ حتی الامکان عمل بھی پایا جائے۔ قدیم یونانی ڈرامے کی مثال سے اِک چیز کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یونانی ڈرامہ نگاروں میں اسکیلس کو ٹریجیڈی کا مُوجد اور سب سے بڑا ماہر اور ارسٹوفینیز کو کامیڈی کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان دو کے علاوہ سوفوکلیز اور یوریپیڈیز کا شمار بھی اہم یونانی ڈرامانگاروں میں ہوتا ہے۔ اسکیلس کے ڈراموں کی نُمایاں خصوصیت مکالمت ہے اور مکالمت بھی ایسی جو صرف دو کرداروں میں محدود ہوتی ہے۔ سوفوکلیز نے اپنے ڈراموں میں ایک قدم آگے بڑھایا اور کرداروں کی تعداد دو سے تین کر دی۔ یوریپیڈیز نے اس میں مزید وُسعت پیدا کی۔ اس ارتقا کے باوجود یُونانی ڈراما مجموعی حیثیت سے مکالمت کے تنگ دائرے میں مقیّد رہا۔ یہ یونانی ڈرامے کا بڑا نقص تھا۔ اُس میں عملیت مفقود تھی۔ اس کمی کو پرولوگ، ایپی لوگ اور کورس کے ذریعے پُورا کیا جاتا تھا۔ یہ تینوں چیزیں روائی انداز اور بیانیہ حیثیت رکھتی تھیں۔ پرولوگ میں ڈرامے کے واقعات سے پیشتر کے واقعات و حالات کی رُوداد ہوتی تھی۔ اور ایپی لوگ ایک ایسا بیان ہوتا تھا جس کی مدد سے ڈرامے کے انجام کو اُس کی آخری حد تک پہنچایا جاتا تھا۔ گویا پرولوگ ڈرامے کی بیانیہ تمہید اور ایپی لوگ اُس کا بیانیہ تتمہ تھا۔ ڈرامے کے مختلف اجزا کو آپس میں مربوط کرنے اور واقعات کے درمیانی کھانچوں کو پُر کرنے کے لئے جو امور تماشائیوں کے گوش گذار کرنے ہوتے تھے۔ اُن کو کورس کے ذریعہ بیان کیا جاتا تھا۔ مُدعا یہ کہ یُونانی ڈرامے میں بیانیہ یا روائی انداز کو بہت زیادہ دخل تھا۔ ہندوستانی کا سنسکرت ڈراما اس لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اگرچہ اُس میں بھی خارجی ذرائع سے پلاٹ کو آگے بڑھانے کا کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ منتظم، شارح اور نقیب مختلف مناظر کے درمیانی وقفوں میں سامعین سے خطاب کیا کرتے تھے۔ یُورپ کے ڈرامے میں یہ نقص بتدریج کم ہوتا گیا اور شیکسپیئر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے ڈرامے نے اپنے بُنیادی عملی کردار کو پُورے طور پر منوا لیا۔ یُوں شیکسپیئر اور بعد کے ڈرامانگاروں کے یہاں بھی بیانیہ انداز مِلتا ہے، مگر یہاں بیان خارجی ہونے کی بجائے داخلی ہوتا ہے۔ یعنی کرداروں کی بات چیت اور نقل و حرکت ہی کے توسل سے بیان و تشریح کے فرائض انجام پاتے ہیں۔

انارکلی دَورِ جدید کے عملی ڈرامے کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ مکالموں میں کہیں کہیں "بیان" پایا جاتا ہے جو کسی بھی ڈرامے میں ناگزیر ہوگا۔ مگر مکالمہ "ایکشن" پر کہیں بھی غالب نہیں آتا اور ہر جگہ مکالمے اور عمل کا مناسب امتزاج قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے آخر تک کسی بھی جگہ ڈراما سُستی یا جمود کا شکار نہیں ہوتا اور حرکت اور زندگی اور عملیت سے معمور رہتا ہے۔

اسی کے ساتھ انارکلی کے پلاٹ پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جب ہم کسی ڈرامے کے پلاٹ کا جائزہ لیتے ہیں تو دراصل ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اُس ڈرامے میں وحدتِ عمل بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وحدتِ عمل کیا چیز ہے اور ڈرامے کے کس وصف یا کن اوصاف پر دلالت

کرتی ہے؟

افلاطون فنِ شعر و ادب کا پہلا نقاد ہے۔ لیکن اس موضوع پر پہلی مستقل تصنیف پیش کرنے کا سہرا ارسطو کے سر ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بھرت منی نے سنسکرت ڈراموں کی چھان بین کرکے نٹ شاستر تالیف کی اُسی طرح ارسطو نے یونانی ڈراموں کی روشنی میں Poetics (شعریات) لکھی جسے ادبی تنقید کی خشتِ اوّل سمجھنا چاہیئے۔

ارسطو نے ڈرامے کے لئے "وحدتِ عمل" کو لازمی قرار دیا ہے، جس سے مُراد یہ ہے کہ ڈرامے کے تمام واقعات اور کرداروں کے تمام افعال کو ایک مرکزی نقطے یا محور کے گرد گھومنا چاہیئے تاکہ ڈرامے میں وحدتِ تاثر پائی جائے اور وہ دیکھنے یا سمجھنے والوں کے ذہن پر ایک واحد اور مجرّد اثر مرتب کرے۔ وحدتِ عمل کے علاوہ ارسطو وحدتِ زماں کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ڈرامے کو چند گھنٹوں کے اندر اندر ختم ہونا چاہیئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈرامے کے واقعات کو چند گھنٹوں کے مختصر وقفے سے زیادہ مدّت پر حاوی نہیں ہونا چاہیئے یا یُوں کہیئے کہ ڈرامے کے واقعات کو عام زندگی میں رُونما ہونے کے لئے بھی اُتنا ہی وقت درکار ہونا چاہیئے جتنا وقت اُس کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ ان دونوں وحدتوں کے ساتھ ناقدین نے ایک تیسری وحدت یعنی "وحدتِ مکان" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور ان تینوں وحدتوں کو وحدتِ ثلاثہ یا اتحادِ ثلاثہ کے نام سے پُکارا ہے۔ حالاں کہ شعریات میں وحدتِ مکان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرامے کے لئے صرف وحدتِ عمل ایک لازمی چیز ہے کہ اُس سے وحدتِ تاثر کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ دوسری وحدتیں نہ لازمی ہیں نہ ہر جگہ ممکن۔ البتہ اختصارِ زماں اور اختصارِ مکان کی خصوصیتیں ممکن بھی ہیں اور مستحسن بھی۔ اُن کو ڈرامے میں برتا بھی جا سکتا ہے اور اُن سے ڈرامے کی شدّت، گٹھن اور تاثیر میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ شیکسپیئر کے بعض ڈراموں میں تینوں وحدتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بسا اوقات وہ صرف وحدتِ عمل کی پابندی کرتا ہے اور وحدتِ زماں اور وحدتِ مکاں کو ضروری نہیں سمجھتا۔ یہی حال اِبسن، شا، گالز وردی اور دوسرے جدید ڈراما نگاروں کا ہے۔

انارکلی میں بھی وحدتِ عمل اور اُس کے ساتھ وحدتِ تاثر پائی جاتی ہے۔ اور وحدتِ زماں اور وحدتِ مکاں کی بجائے صرف اختصارِ زماں اور اختصارِ مکاں کی خصوصیتیں ملتی ہیں۔ انارکلی ایک طویل ڈراما ہے مگر اس کا مطالعہ ہمارے ذہن پر صرف ایک اثر چھوڑتا ہے اور صرف ایک نقش مرتسم کرتا ہے ـــــ انارکلی کی حزنیہ زندگی اور الم ناک موت، سلیم کا پُر جوش اور والہانہ عشق جس پر عہدِ طفولیت کی گہری چھاپ بھی ہے، اکبر کا سیاسی فلسفہ جو اتنا ہی گمبھیر اور سنجیدہ ہے جتنا کہ سلیم کا جذبۂ عشق طفولیت آمیز اور جذباتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اکبر کا شاہانہ جلال، حاکمانہ غیظ و غضب اور پدرانہ محبت، مہارانی کا رویّہ جو ٹھیٹھ ہندوستانی ماتا کا انداز لئے ہوئے ہے، دِل آرام کی زہریلی رقابت یا رقیبانہ مخاصمت، ثریا اور بختیار کی بے بسی اور ڈرامے کی دلچسپی کے دوسرے تمام خطوط اسی ایک نقطے پر آکر مِل جاتے ہیں۔ مزید برآں انارکلی میں جو واحد تاثر ہمیں ملتا ہے وہ حد درجہ واضح، شدید اور گہرا ہے اور اُس کے پیدا کرنے میں ڈرامے کے تمام مختلف مناظر اور اجزا حصہ لیتے ہیں اور برابر کے شریک ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مصنف نے ڈرامے کو غیر ضروری اور غیر متعلق یا ضمنی و ثانوی واقعات سے محفوظ رکھنے میں پُوری فن کارانہ احتیاط سے کام لیا ہے اور ڈرامے کی حدود میں صرف اُن امور و حقائق کو داخل ہونے کی اجازت دی ہے جو وحدتِ تاثر کی پیدائش کے لئے بالکل لازمی تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ شروع سے آخر تک ڈراما ایک بے جھجک، متوازن اور ہموار رفتار کے ساتھ عمودی سمت میں آگے بڑھتا ہے۔ نہ کہیں جھٹکا محسوس ہوتا ہے نہ کہیں کھانچا پڑتا ہے۔ نہ کہیں جھول ہے نہ کہیں ڈھیلا ڈھالا پن ہے۔ واقعات "چال جیسے کڑی کمان کا تیر" کے مصداق سُرعت اور یکسوئی کے ساتھ اور ایک بے جھجک انداز میں اپنا ڈرامائی سفر طے کرتے ہیں اور ڈرامائیت کے پُورے تیوروں کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہنچ کر مرکوز ہو جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت جتنی واضح ہے اُتنی ہی وضاحت اور یقین انگیزی کے ساتھ "انارکلی" کی فنی پختگی اور بلندی پر دلالت کرتی ہے۔

ڈرامے کا فن اصلاً تصادم یا کشاکش کا فن ہے اور ڈرامے کی دلچسپی تمام و کمال اسی پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تصادم دو مختلف یا متضاد قوتوں کے درمیان ہو سکتا ہے اور یہ دو متصادم قوتیں کوئی بھی دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً موت اور زندگی، نیکی اور بدی، محبت اور فرض، انسان اور فطرت، انسان اور فوق العادت کردار، انسان اور سماجی ماحول، شعور اور تحت الشعور اور متضاد طبعی رُجحانات۔ جب یہ دو قوتیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو ڈرامے میں تصادم کی کیفیت رُونما ہوتی ہے اور اُس کے سہارے ڈراما

آگے بڑھتا ہے اور نقطۂ عروج تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تصادم کا وجود اور اُس کی نوعیت اور شدّت بھی ایک کسوٹی ہے جس پر ڈرامے کو پرکھا جاسکتا ہے۔

انارکلی کو تصادم کے نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو یہ ایک پُر زور اور جان دار ڈراما ثابت ہوتا ہے۔ اس میں ہم قدم قدم پر تصادم سے دوچار ہوتے ہیں۔ سب سے نمایاں مثال وہ تصادم ہے جس کا مظہر اکبر اعظم کا کردار ہے۔ انارکلی میں ہم جس اکبر سے مُلاقات کرتے ہیں وہ اوّل سے آخر تک بیٹے کی محبت اور سلطنت و حکمرانی کے تقاضوں کی باہمی کش کش میں مُبتلا نظر آتا ہے۔ رانی کا کردار بیٹے کی محبت اور شوہر کی مطابعت کے درمیان کش کش کا مظہر ہے۔ خود انارکلی کی ذات میں ہمیں محبت اور مصلحت یا جذبات اور عقل یا دِل اور دماغ کی کش کش جلوہ گر نظر آتی ہے۔

کردار نگاری کے لحاظ سے بھی انارکلی بلاشبہ ایک کامیاب تخلیق ہے۔ ڈرامے کا مطالعہ ہمارے ذہن میں اکبر، سلیم، رانی، انارکلی اور دوسرے افراد ڈراما کا ایک مخصوص تصوّر پیدا کرتا ہے۔ ہم اپنے ذہن کی لوح پر اور چشمِ تصوّر کے سامنے ان اشخاص کی تصویریں نہایت صاف اور غیر مبہم نقوش میں کھینچی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔ یہی کامیاب کردار نگاری ہے۔ مثال کے طور پر انارکلی کا کردار ہمارے ذہن پر ایک ایسی دوشیزہ کا نقش اُبھارتا ہے جس کے خط و خال میں حُسن و جمال کے ساتھ غم گینی اور سنجیدگی بھی سموئی ہوئی ہے، جو محبت کرسکتی ہے مگر رقابتوں کا تدارک نہیں کرسکتی۔ سپردگی، شیفتگی، ناز آفرینی اور نیازمندی سے بہرہ وافر رکھتی ہے۔ مگر ٹھوس حقیقتوں سے نبرد آزما اور عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔

کردار نگاری سے ملتی جُلتی چیز ماحول نگاری یا فضا کی عکاسی ہے اور اس کا بھی ڈرامے میں بڑی اہمیت ہے۔ "انارکلی" میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ خلا میں رُونما ہوتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک مخصوص ماحول کے کینوس پر اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مُصنف نے ہر جگہ نہایت کامیابی کے ساتھ ڈرامے کے اشخاص و واقعات کے پس منظر کی مصوّری کی ہے۔ ہر منظر کے آغاز میں جو اشارات خطوطِ وحدانی میں دئے گئے ہیں اُن کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری لاجواب ہے اور وہ ہر جگہ ڈرامے کے واقعات کے لئے ایک حقیقی اور جیتی جاگتی فضا پیدا کرتے ہیں۔ ایکشن (عمل) اور مکالمے بھی اُس فضا کو روشن اور واضح کرنے میں پُوری خدمت انجام دیتے ہیں اور مجموعی طور پر ڈرامے کے مطالعے سے ہماری نظروں میں مُغل درباروں، محل سراؤں اور سبزہ زاروں کی تصویریں گھُومنے لگتی ہیں۔

اب رہی مکالمہ نگاری، تو "انارکلی" کے مکالمے اس حد تک تو ضرور واقعیت پسندی پر مبنی ہیں کہ مختلف افراد کا اندازِ گفتگو اور لب و لہجہ مختلف ہے۔ مثلاً کنیزوں کی آپس کی بات چیت رانی کی گفتگو سے نمایاں طور پر مختلف ہے اور خود رانی کی زبان موقع و محل کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی ہے۔ لیکن ان مکالموں کی سب سے بڑی خامی ضرورت سے زیادہ ادبیت اور بڑھی ہوئی شعریت ہے۔ بعض مقامات پر یہ شاعرانہ رنگینی محض شاعرانہ پن ہوکر رہ گئی ہے جس سے ماحول کی واقعیت ناقابلِ انکار طور پر مغلوب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اصلیت پر تصنع کا غلاف یا ساختگی کا جھُول چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عام روزانہ زندگی میں لوگوں کی بات چیت کا جو انداز ہوتا ہے اُس کو جُوں کا توں یا ہو بہو کسی افسانے یا ڈرامے میں پیش کردینا نہ ممکن ہے نہ مُناسب۔ اور بڑے سے بڑا حقیقت نگار بھی روزمرہ کی عام اُلجھی ہوئی اور ڈھیلی ڈھالی بات چیت کو یا ٹھیٹھ اندازِ گفتگو کو کسی نہ کسی حد تک ضرور اپنی ادبی زبان کے رنگ میں رنگتا ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر اصل کی فطریت اور بے ساختگی مکمل طور پر نقل میں آجائے تو نقل نقل نہ رہے اور سچ تو یہ ہے کہ "نقالی" کا جواز بھی باقی نہ رہے۔ یعنی ادبی فنون کا وجود ہی خطرے میں پڑجائے۔ مگر اصلیت سے بہت زیادہ انحراف بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں بھی نقل کی "نقلیت" کے ضعیف یا مُشتبہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ "انارکلی" کے مکالموں میں یہ انحراف جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک طرف ڈرامے میں ادبی حُسن کاری اور صناعانہ نقش گری کی کمی نہیں تو دوسری طرف اصلیت اور واقعیت کا رنگ بھی اُڑتا ہوا سا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکالموں میں کہیں کہیں پچھلے دَور کے ڈراموں کا ایک عام وصف یعنے اسٹیجی یا تھیٹریکل انداز بھی ملتا ہے جس کو اب متفقہ طور پر ڈرامے کے متروکات میں شمار کرنا چاہیئے۔ مکالمہ نگاری کی انہیں دو خامیوں کی بنا پر "انارکلی" کا شمار غالباً اُن ڈراموں میں نہیں ہوسکتا جو بیک وقت دارالمطالعے (بقیہ بر صفحہ)

دو غزلیں

ارشد صدیقی

جو دے سکے نہ اُجالے بھی زندگی کے لئے
وہ غم تو ایک مصیبت ہے آدمی کے لئے

تمہاری بزم کی رونق ہمارے دم سے ہے
ہمیں نے دل کو جلایا ہے روشنی کے لئے

رہِ حیات میں احسان غیر کا کیوں لیں
دلِ ایسا خضر ہی کیا کم ہے رہبری کے لئے

بتا اب اے دلِ خانہ خراب کیا ہوگا
وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں دوستی کے لئے

فریبِ شوق سے کچھ روشنی تو ملتی ہے
یہ لغزشیں ہی بہت کچھ ہیں آدمی کے لئے

غمِ حیات غمِ معتبر سہی لیکن
غمِ حبیب ہی کیا کم ہے زندگی کے لئے

یہ سوگوار فضائیں یہ تیرگی ارشد
ترس رہے ہیں ستارے بھی روشنی کے لئے

اثر انصاری

بے خودی لائی مجھے بزمِ خود آرائی تک
عشق نے ساتھ دیا منزلِ رسوائی تک

اتنا پُر کیف تصور ہے تری آنکھوں کا
جھوم جاتی ہے شبِ ہجر کی تنہائی تک

اعتبار اپنی نگاہوں کا میں کھو بیٹھا ہوں
ساتھ میرے کوئی آئے شبِ تنہائی تک

اتنے جلوے ہیں جوانی کی نگہبانی میں
نظریں پہنچیں گی بمشکل تری انگڑائی تک

سامنے تو ہے مگر عالمِ بے خبری میں
ڈھونڈ آیا ہوں تجھے وادیِ سینائی تک

لاکھ پابندِ چمن نکہتِ گُل تھی لیکن
لے کے پیغامِ جنوں آ گئی سودائی تک

مل سکا مجھ کو نہ خود اپنی ہی ہستی کا سراغ
خاک چھانی ہے بہت محفل کی پہنائی تک

چشمِ مخمور نے وہ کام کیا ہے کہ نہ پوچھ
ہاتھ پہنچا نہ کبھی ساغرِ صہبائی تک

رقص کرتی ہوئی جب موجِ بہاراں گزری
ہو گیا چاک جگر لالۂ صحرائی تک

کوششِ ضبطِ فغاں ہو گئی ناکام اثر
لُٹ گئی ہائے مری تابِ شکیبائی تک

آر، ایل چھتہ

ڈوگرہ آرٹ گیلری

شمالی ہندوستان کے آرٹ اداروں میں سال ۱۹۵۴ء میں ایک اور اضافہ ہوا جب ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے جموں کے گاندھی بھون ہال میں ڈوگرہ آرٹ گیلری کا افتتاح کیا۔ جموں کی کلچرل اور سماجی جماعت ڈوگری سنستھا نے ۱۹۴۹ء میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ جموں میں ایک نمائش منعقد کی جس میں پہاڑی چترکلا کی لگ بھگ گیارہ سو (۱۱۰۰) تصاویر اور دیگر کلچرل نمونوں کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس موقعہ پر جموں شہر کے سینکڑوں لوگوں نے شمولیت کی۔ یہ نمائش ڈوگرہ آرٹ گیلری کے افتتاح کا پیش خیمہ تھی۔ ہر ملک اور قوم کی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ترقی کے دور میں اس کے مختلف کلچرل شعبوں میں ارتقا ظہور میں آتا ہے اور یہی کلچرل شعبے اس زمانہ کے قوم کی تمدنی دولت تصور کئے جاتے ہیں اور اپنے معیار سے کلچرل ترقی کی جانچ اور پڑتال کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پس ہمارے ملک میں بھی پچھلے سو سال میں ایسا ہی ہوا۔ شروع شروع میں آرٹ سے لگاؤ رکھنے والوں اور کئی پبلک جماعتوں نے ہندوستان بھر میں ایسے کلچرل اداروں کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ ملک کی معاشرتی تواریخ سے دلچسپی رکھنے والی بہت سی ہستیاں اس صدی میں ہو گذری ہیں۔ ان میں سر ولیم جونز کا نام محتاج تعارف نہیں۔ صاحب موصوف نے ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک ادبی اور تعلیمی ادارہ تھا جس میں سر ولیم نے مختلف جماعتیں قائم کیں۔ یہ جماعتیں علم حیوانات، علم جمادات، نسلی خصوصیات کا علم اور علم آثارِ قدیمہ پر مشتمل تھیں۔ اس سوسائیٹی نے رفتہ رفتہ ملک کے ایک اہم کلچرل ادارے کی صورت اختیار کر لی۔ زمانہ بعد میں اس ادارے کو کل ہند میوزیم بلڈنگ تحریک کا بانی سمجھا جاتا رہا اور یہ ہے بھی درست، کیونکہ سر ولیم جونز کی مندرجہ بالا سرگرمیوں سے ہی تمام ہندوستان بھر میں معاشرتی اداروں کے قیام کی تحریک نے زور پکڑا۔ ۱۸۹۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی سلور جوبلی کے جشن کو ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جا رہا تھا۔ اس جشن کی وجہ سے مندرجہ بالا تحریک کو اور بھی فروغ ملا۔ ان دنوں لارڈ کرزن (جو ہندوستان کے گورنر جنرل تھے) اور محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر جنرل نے ملک میں آرٹ اداروں کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ ان دو حضرات کی وجہ سے اس تحریک نے ملک کے گوشہ گوشہ میں مزید زور پکڑا۔ اور مدھیہ پردیش اور راجستھان کی کئی ریاستوں میں آرٹ میوزیم قائم کئے گئے۔ سرینگر کشمیر میں بھی سری پرتاپ سنگھ میوزیم اسی دوران قائم ہوا۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی وقفہ میں ملک کے مختلف مقامات مثلاً حیدرآباد، ریوا، ہمت نگر، جام نگر وغیرہ میں آرٹ میوزیم قائم کئے گئے۔ ڈوگرہ آرٹ گیلری کے وجود میں آنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ریاست کے لوگوں نے پچھلے تیس برس میں آرٹ کو سمجھنے کے لئے بہت ترقی کی ہے۔ لہٰذا ۱۹۵۴ء میں آرٹ گیلری کو جموں میں قائم کیا گیا۔

ڈوگرہ آرٹ گیلری میں مختلف سیکشن ہیں۔ جو پہاڑی پینٹنگ، ڈوگرہ تلواروں اور بندوقوں، نشاناتِ آثارِ قدیمہ، چٹانوں اور سوالک کی پہاڑیوں کی معدنیات کے نمونوں پر مشتمل ہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی علمی نوعیت ہے۔ لیکن آرٹ کے لحاظ سے دستی تصاویر کی سیکشن ایک نمایاں رتبہ رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس میں پہاڑی چترکلا کے بیش بہا نمونے جو کہ کوہ ہمالیہ کے دور دراز مضافات سے اکٹھے کئے ہوئے ہیں، پیش کئے گئے ہیں۔

قارئین پر بخوبی واضح ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز سے پیشتر ہندوستانی پینٹنگ کا مراد مغل اور راجپوت پینٹنگ سے لی جاتی تھی۔ لیکن ہندوستانی چترکلا کے نامور طلبا مثلاً آرچر، فرنچ، جاسپر، مینلے، مانوک جیسی شخصیتوں کے ہم از حد ممنون ہیں جنہوں نے کہ پہاڑی سکول کو اپنی قیمتی کھوج کی بدولت چار چاند لگا دیئے۔

ڈوگرہ آرٹ گیلری کی مختلف سیکشنیں ہیں جن میں جموں، چمبہ، بسوہلی، کانگڑہ، پونچھ، گلیر اور نورپور قابل ذکر ہیں۔ ان اسکولوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان کی تمام تصویریں ہمالیہ کا پس منظر ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن تاہم ہر اسکول اپنے مقامی ماحول سے متاثر ہے اور اپنی مقامی خصوصیات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

جموں کلا کا اسکول جسے "جموں آرٹ سکول" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اٹھارویں صدی کی ہندوستانی پینٹنگ کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے۔ یہ اسکول اپنی پورٹریٹ کی تصویریں بنانے کے لئے مشہور تھا۔ اس میں شروع شروع میں پرسپیکٹو ڈرائینگ کا آرٹ نہایت کمال پر پہنچا۔ لیکن بعد میں شیڈنگ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ شاہی محلات اور دیگر عمارتوں کو ٹھوس دکھا کر پینٹنگ میں اُن کے نقوش کو بخوبی عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جموں اسکول کی چند تصاویر میں چاندی کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ چونکہ چاندی کا استعمال کسی اور پہاڑی اسکول نے نہیں کیا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں جموں کے کلاکاروں نے ایسی پینٹنگ بنائی تھیں جن میں رادھا کرشن کے پوتر پریم، نائک نائیکا کا پریم اور راجوں مہاراجوں کی داستاں کو ایسے ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے کہ جسے دیکھ کر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن رادھا کے بال سنوار رہے ہیں۔ نائیکا اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے۔ عورت مور سے کھیل رہی ہے وغیرہ وغیرہ کافی دلچسپ ہیں۔ ان میں بیشتر ایسی تصاویر ہیں جن میں چاندی کا استعمال کیا گیا ہے۔ نیز شیڈنگ اس ڈھنگ کا ہے کہ انسانی چہرہ و جسم کے اعضا ٹھوس معلوم ہوتے ہیں۔ جموں اسکول کی کوئی دو سو (۲۰۰) کے قریب تصاویر ڈوگرہ آرٹ گیلری میں نصب ہیں۔

چمبہ اسکول کی پینٹنگ جموں پینٹنگ سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اس کے رنگ زیادہ گہرے اور تیز ہیں اور جموں اسکول کی مصوری سے بالکل بالاتر ہیں۔ بسوہلی اسکول کی پینٹنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں چہروں کے نقوش بڑھا چڑھا کر دکھائے ہیں۔ مثلاً آنکھوں کو زیادہ کشادہ اور اُن کے گھیرے کو بادام کے مانند دکھایا ہے۔ تواریخ آرٹ کے ماہرین کا خیال ہے کہ بسوہلی قلم کی بنیاد دیواروں پر کی ہوئی چترکاری (فرسیکوز) پر رکھی گئی ہے۔ اس کے رنگ گرم اور پچھلی زمین بھورے رنگ کی ظاہر کی ہوئی ہے۔ بسوہلی اسکول کی ایک اہم رسم یہ تھی کہ اس میں انسانی لباس کو پیلے رنگ کا دکھایا جاتا تھا۔

وادیٔ کانگڑہ کی تصویریں جموں اسکول کی تصاویر سے زیادہ عمدہ ہیں۔ رنجیت دیو کے زمانہ میں جب جموں ایک طاقت ور ریاست تھی تو کانگڑہ وادی کے فن کاروں نے جموں کے فن کاروں کی رسوم اور طرز کو اپنایا۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں جموں پر سکھوں کے پے در پے حملوں کے بعد ان کا قبضہ ہوا۔ تو بہت سے فن کار، جو جموں میں مستقل طور پر رہائش پذیر تھے، میدانی علاقہ میں بھاگ گئے۔ اس لئے کانگڑہ اسکول نے اس وقت جموں اسکول کی رسوم کو اپنی کلا میں جگہ دی۔ لہٰذا گلیر ہی بڑھیا رسومات کا ضامن رہا اور کانگڑہ اسکول کے فن کاروں پر بہت اثر ڈالتا رہا۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ "گلیر ہی وادیٔ کانگڑہ آرٹ کا جنم داتا ہے۔" کانگڑہ وادی کی تصاویر کا موضوع ہے "اُلفت" چاہے یہ مرد کی طرف سے عورت کے لئے ہو یا عورت کی طرف سے مرد کے لئے۔ ڈاکٹر رندھاوا رقم طراز ہے کہ "کانگڑہ وادی کے فن مصوری کا معاشرتی موضوع "محبت" ہے اور اس کی منیر کو رباعی کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے جو کہ شان اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔"

پونچھ اسکول کی پینٹنگ کے اپنے اصول ہیں۔ ان کے رسمی ڈھنگوں کا خاصہ یہ ہے کہ یہ ایک ڈرامائی منظر پیش کرتی ہیں۔ لیکن تفصیل کو بے حد باریکی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اس ریاست کے تواریخی واقعات کو بخوبی جاننا پڑے گا۔ ماضی کی تاریخ یوں ہے:- پندرہویں صدی سے انیسویں صدی کے شروع تک پونچھ میں اسلامی حکومت کا دور دورہ تھا لیکن بعد میں اس کے حکمران ہندو ہو گزرے ہیں۔ اسی وجہ سے پونچھ آرٹ ہندو مسلم آرٹ کا سنگم سمجھا جاتا ہے۔

گلیر کے فن کاروں کی مصوری کے نایاب نمونے، جو اپنی مثال آپ ہیں، اپنی نمایاں خوبصورتی کی وجہ سے تمام پہاڑی آرٹ سے سبقت لے گئے ہیں۔

اور قلم شناسی اپنی خوش نمائی اور باریکی کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ راجہ لوگ اپنے وزیروں سے گھیرے ہوئے دِکھائے گئے ہیں یا شاہی محلات کے برآمدہ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہم محلات کے باہر درختوں اور پودوں کو سبزہ زار میں کھڑا پاتے ہیں۔ کیلے اور سرو کے درخت سوالک کی پہاڑیوں میں اُگے ہوئے بخوبی نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اجناس کی تقسیم بالکل قدرتی ہے۔ نفاست کے لحاظ سے گلیر پینٹنگ مُغل پینٹنگ کی طرز کی نظر آتی ہے لیکن گلیر اسکول کے فن کاروں نے مقامی رسُومات پر زور ڈالا ہے۔ گلیر کا جغرافیہ اس کی فنی خصوصیات کا ذِمہ دار ہے۔ سوالک پہاڑیوں کے دامن میں قائم شدہ یہ ننھی پہاڑی ریاست اپنے فن میں ترقی کرتی گئی۔ پنجاب کے بلند پایہ فن کار یہاں آبسے تھے اور گلیر آرٹ میں آزادانہ روِش اختیار کر لیتے تھے؛ جس وجہ سے گلیر کا آرٹ دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ گلیر کا فنِ مصوری اتنی بلندی حاصل کر گیا کہ ہمسایہ ریاستوں مثلاً چمبہ، نُورپور، کانگڑہ وغیرہ کے فن کاروں پر کافی حد تک اثر انداز رہا۔ آرچر صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: یہ مقامی آرٹ بہت نازک اور خوشنما ہے اور یہ سب سے بڑھیا قلمِ مصوری (کانگڑہ آرٹ) کا جنم داتا ہے۔ "

اس کے علاوہ گیلری میں مغل پینٹنگ کے چار اور نُورپور کے تین نمونے موجود ہیں۔ پُرانے چند دستاویز بھی یہاں موجود ہیں۔ ان میں ایک جلد فردوسی کے شاہ نامہ کی ہے جو ۱۰۲۴ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ ایک جلد فارسی میں لکھی ہوئی سکندر نامہ کی ہے جو عنایت اللہ شیرازی نے ۹۸۸ ہجری میں لکھی تھی۔ ایک جلد رامائن کی، جو مُلا سین نے ۱۰۶۲ ہجری میں فارسی میں لکھی تھی، بھی موجود ہے۔ ایک جلد تبت بودھی سنسکرت کی، جو دو سو (۲۰۰) سال پہلے لکھی گئی تھی، بھی رکھی ہوئی ہے۔

ایک سیکشن میں ڈوگرہ شاہی بندوقیں توڑے دار اور غیر توڑے دار رکھی ہوئی ہیں۔ یہ تعداد میں کوئی ۱۶ کے قریب ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دو توپیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔

تھوڑا ہی عرصہ پہلے ڈوگرہ آرٹ گیلری میں ایک نئی سیکشن کھولی گئی جس میں چٹائیں اور کانی معدنوں کے نمونے بھی رکھے ہیں۔ یہ اُن علاقوں سے حاصل کئے گئے تھے جن میں ڈوگرہ لوگ بستے ہیں اور جہاں ڈوگرہ فن کار اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ رِشی برُوک ولیم صاحب نے فروری ۱۹۵۸ء میں ڈوگرہ آرٹ گیلری کا ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا: "ادارہ اوائلِ ایّام میں بے حد تعریف کا مستحق ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ آخر میں یہ ادارہ اپنی نوعیت کا مقامی فن کاروں کے لئے ایک مجسمہ ثابت ہوگا۔ میں گیلری کے تمام کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ یہ تجربہ جو یہاں جموں میں شروع کیا گیا ہے، تمام ہندوستان میں آزمایا جائے گا۔ "

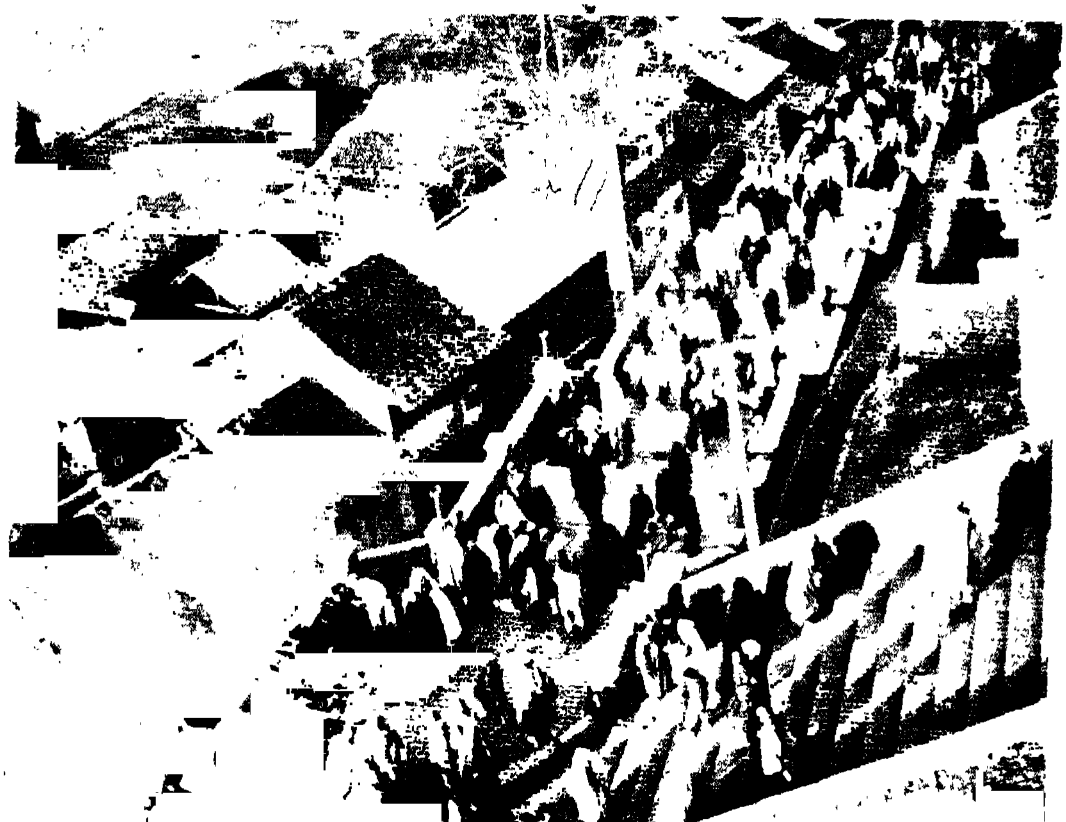
جموں آرٹ گیلری ریاست جموں وکشمیر کے کلچرل اداروں میں ایک نمایاں ہستی رکھتی ہے اور اسے شمالی ہندوستان کے تمدنی اداروں میں ایک خاص حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

ریاست جموّں وکشمیر میں صنعتی خوشحالی

ریاست میں صنعتی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لئے حکومت مُؤثر اقدامات کر رہی ہے جس کے نتیجہ کے طور پر مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں:۔

★ جموں میں ایک صنعتی بستی قائم کی گئی ہے۔ اس بستی میں چھوٹے چلنے کی ۴۶ فیکٹریوں کے لئے جگہ مہیا کی جائے گی۔ تیس فیکٹریوں کے لئے عمارتیں مکمل ہو چکی ہیں جو کہ ۲۳ کارخانہ داروں کو الاٹ کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور صنعتی بستیاں ایک سرینگر اور ایک اننت ناگ میں قائم کی جا رہی ہیں۔ ★ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں ۱۴ لاکھ ۱۵ ہزار روپے صنعتی قرضہ جات کے طور پر تقسیم کئے گئے۔ ۵۰ لاکھ روپے کے سرمایہ سے ایک فائنانس کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران مشینری اور خام مال کی درآمد کے لئے ۲۶۰ افراد کے حق میں لائسنس اجرا کرنے کے لئے سفارش کی گئی تھی جس میں ۶۸ پارٹیوں کے نام پر لائسنس جاری کر دی گئی ہیں...







درشن رادھا سے مادھو ملن میں
(جموں اسکول)



ایک رانی لونڈی کو ہدایات دے رہی ہے
(جموں اسکول)

ڈوگرہ آرٹ گیلری



رامائن کا ایک سین



درشن رادھا کے بال سنوار رہی تھیں
(جموں اسکول)



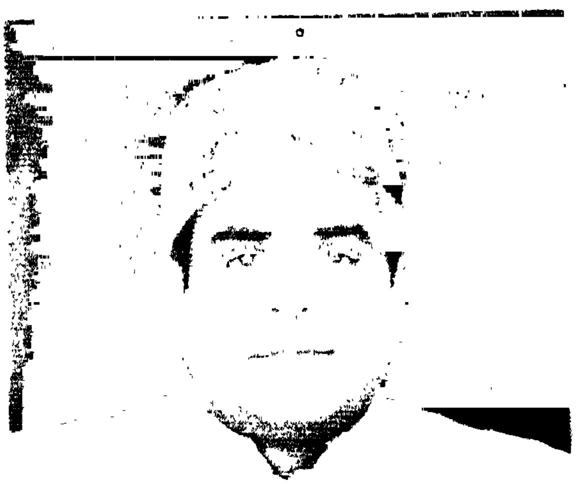
محلات کی ایک رانی مور سے کھیل رہی ہے
(جموں اسکول)

ڈوگرہ آرٹ گیلری



دلکش پنجما یگ کی رسم ادا کی جا رہی ہے
(جموں اسکول)





(۲۳)

نئے سال کے موڑ پر

صبح کا پھول کھلا، رات کے سایے مہکے   بوئے صہبا سے خرابات کے سایے مہکے
زلفیں بکھریں، مرے جذبات کے سایے مہکے

زخمہ زن کون ہوا بربطِ ہستی پہ مرے   پھر مری سانس میں نغمات کے سایے مہکے
پہنچی لہجے کی کھنک ساز کی انگڑائی تک
زندگی آ ہی گئی منزلِ رعنائی تک

ہر طرف شوخیٔ ماحول کے آثار ملے   مجھ کو راتوں کے اندھیرے بھی ضیا بار ملے
جاگتے میکدے، ہنستے ہوئے بازار ملے

شاید اس راہ سے گذرا ہے ستاروں کا جلوس   تھی جہاں گرد وہاں کرنوں کے انبار ملے
ہے یہ جلوؤں کا تبسم کہ نظر ہنستی ہے
شام کے سرمئی دامن میں سحر ہنستی ہے

گیت والے چلے، شائستۂ فریاد چلے   رندِ میکش چلے، صوفی چلے، زہاد چلے
ہم چلے، تم چلے، ناشاد چلے، شاد چلے

کہہ دو خسرو سے کہ راہوں میں بچھائے آنکھیں   قصرِ شیریں کی طرف جھوم کے فرہاد چلے
تلخیٔ زہرِ ستم، قندِ وفا میں گم ہے
زندگی منزلِ لیلیٰ کی فضا میں گم ہے

سو حجاباتِ حوادث سے نکل کر آئی   خارزاروں پہ روایات کے چل کر آئی
پیرہن تلخ حقایق کا بدل کر آئی

یہ بھی اعجاز ہے اے ساقیٔ جمہور ترا   زندگی ساغرِ جمہور میں ڈھل کر آئی

پھر نظر میں وہی صہبا کی کرن جاگ اُٹھی
جام یوں کھنکے مری صبحِ وطن جاگ اُٹھی

چاندنی ذہن میں، نظروں میں فسانے جاگے   آنکھیں ملتے ہوئے خوابوں کے زمانے جاگے
پھر غنودہ سی فضاؤں میں ترانے جاگے

میری فریاد کا لہجہ بھی تھا کیا خواب شکن   سوئے تھے جو زمیں میں وہ خزانے جاگے
کارواں محنت و سرمایہ کا کس موڑ پہ ہے
میری منزل ہے وہی زندگی جس موڑ پہ ہے

رُوحِ آلام کو سرمست بنا کر گزرا   برقِ خونریز کو دامن میں چھپا کر گزرا
چھیڑ کر زخم کو، اشکوں کو ہنسا کر گزرا

راہِ ہستی سے فروغِ غمِ جاناں کی قسم   میں غمِ دہر کو آئینہ دِکھا کر گزرا
خار بھی مجھ سے ملے ہیں "گُلِ رعنا" بن کر
زہرِ ہستی مرے ساغر میں ہے صہبا بن کر

بانکپن نظم کا، غزلوں کی جوانی شاداب   عشوۂ لفظِ حسیں، روحِ معانی شاداب
خامشی نظروں کی، ہونٹوں کی کہانی شاداب

میرے ماحول کا بھرپور تغزل، کیا خوب   دِن کا شہزادہ جواں، رات کی رانی شاداب
میرے آغوش میں سلمائے بہار آج بھی ہے
شعلۂ دہر گلستاں بہ کنار آج بھی ہے

یہ جواں بزم میں کم عمر اُجالوں کا ہجوم   یہ شبِ ماہ یہ خورشید جمالوں کا ہجوم
یہ مرے شہر میں آوارہ غزالوں کا ہجوم

یہ حسیں لوگ، تُنک شمع، جواں پروانے   انجمن ہے کہ مرے شوخ خیالوں کا ہجوم
چاندنی کو مری پلکوں پہ ہے نیند آئی سی
نظریں اُٹھتی ہیں تو زیست اُٹھتی ہے شہنائی سی

غم کے آداب، مسرت کے قرینے بدلے   وقت کی موجیں، تمدن کے سفینے بدلے
ارتقائے نگہ و فکر کے زینے بدلے

اے نئے سال! ترے غمزۂ کافر کے نثار   رُوپ کتنے مری دیوانہ وشی نے بدلے
پاؤں رکھتا ہوں تو کھِل اُٹھتے ہیں راہوں میں کنول
میں کہیں قلعۂ دہلی ہوں کہیں تاج محل
اِک ذرا پرورشِ لوح و قلم بھی کر لوں   خاکِ اصنام سے تخلیقِ حرم بھی کر لوں
پھر نا! بیعتِ پیرانِ عجم بھی کر لوں
کِس لئے نرم ہے میرے جنوں کا پندار   اپنے قدموں پہ جبیں وقت کی خم بھی کر لوں
میں نے تاریخ کو دِل اور نگاہیں دی ہیں
بازوئے عصر کو پرواز کی راہیں دی ہیں
جس کو منزل کہیں وہ طور مری راہ میں ہے   ہر قدم عزم سے معمور مری راہ میں ہے
سایۂ رایتِ جمہور مری راہ میں ہے
فاصلے گھٹ کے رہے روشنی و ظلمت کے   اِک حسیں سلسلۂ نُور مری راہ میں ہے
کِس سے آسودگیٔ شوق کی یہ بات کہوں
میں نئے سال کی شاداب گزرگاہ پہ ہوں

ریاست جمّوں و کشمیر ترّقی کی شاہراہ پر

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے دَوران مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں :-

۴۸ - ۱۹۴۷ء میں تعلیم پر صرف ۴۷، ۳۳ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے تھے جبکہ ۶۱ - ۱۹۶۰ء میں ۶۲، ۱۹۴ لاکھ روپے صرف کئے جا رہے ہیں۔

ریاست میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا ہے۔

زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے ۳۱، ۲ لاکھ من کھاد تقسیم کی گئی۔

دو کلا کمئی کے بیجوں کی پیداوار کے لئے ۴۳ فارم قائم کئے گئے۔

چھ لاکھ سے زائد پھل دار پودے زمین داروں میں تقسیم کئے گئے۔

پھل دار پودوں کی ۱۸ نرسریاں قائم کی گئی ہیں۔

۴۴، ۷ لاکھ پونڈ یوروپین سبزی کے بیجوں کی پیداوار ہوئی۔

شہروں اور مفصلات میں طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے ۸۱ ہسپتال و سینی ٹوریا، ۲۳ ہیلتھ سنٹرز، ۱۴ ہیلتھ یونٹ، ۸۲ ایلوپیتھک ڈسپنسریاں اور ۱۸۵ آیورویدک اور یُونانی ڈسپنسریاں قائم ہیں۔

موتی لال جیلخانی

ادب، ادیب اور قاری

ادب کیا ہے ؟ یہ سوال نیا نہیں ہے۔ ہر ادبی مباحثے کے شروع میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اختتام پر تشنۂ جواب رہ جاتا ہے۔ اگر ادب کی تشریح ہم یوں کریں کہ ادب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو "عکس ہائے رنگین" میں پیش کرنے کا نام ہے۔ لیکن اگر اس تشریح کا بغور جائزہ لے لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت ہی فرسودہ بحث چھڑ گئی۔ فن اور مواد کا سوال پیدا ہوا۔ بہت سے احباب، جو ادب میں "ازموں" کے قائل ہیں، اپنے اپنے خیال کے مطابق یا تو مواد پر زور دیں گے یا ہیئت پر، لیکن یہ بحث یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بعض دوست ادب میں مواد کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیں گے اور بعض اس بات پر زور دیں گے کہ مواد اُس وقت تک کسی کام کا نہیں جب تک اُسے مناسب اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر پیش نہ کیا جائے۔ بہت سے احباب ادب میں زندگی کی عکاسی کا سُراغ لگائیں گے اور کئی زندگی اور ادب کے آپسی رشتے پر ہی بس کریں گے۔

میں ذاتی طور ادب میں "ازموں" کا قائل نہیں ہوں۔ میری نظروں میں ادب ادب ہے، زندگی نہیں ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ ادب اپنا مواد زندگی سے اخذ کرتا ہے، لیکن یہ مواد ادب میں پہنچ کر فقط زندگی ہی نہیں رہ جاتا! بلکہ ادب کے تانے بانے کا جزو بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں زندگی میں تغیر ایک ناقابلِ تنسیخ قانون ہے وہاں ادب لافانی ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ حقیقت پسندی، رومانیت، کلاسیکیت —— یہ سب ادبی اظہار کے مختلف اسلوب ہیں اور ادبی اظہار کے ذریعے ہو سکتے ہیں۔ اگر ادب میں صرف مواد کو ڈھونڈا جائے اور اُس کی ہیئت کو فراموش کیا جاوے تو ہم ادب سے وہ حظ اُٹھانے سے رہ جاتے ہیں جو ادب کے اندر موجود ہے! اور جس کو حاصل کرنا ادب میں اوّلین کام ہوتا ہے۔ ادب سے جو مسرت قارئین کو حاصل ہوتی ہے وہ ادبی تجربے کے ثمر سے نہیں بلکہ خود ادبی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ عام بول چال اور ادب کا فرق کیا ہے ؟ عام بول چال میں خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن ادب میں احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ زندگی کے حقائق کے ردِ عمل میں جو احساسات ایک ادیب کے ذہن میں اُبھرتے ہیں اُن کی ترتیب اور اظہار کا نام ہی ادب ہے۔ یہ صرف ادب ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ میں ادب میں افادیت کا قائل نہیں ہوں اور ادب کی افادیت کے لئے میرے نزدیک صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ قاری کو محظوظ اور متاثر کر سکے۔ اگر قارئین ادب سے محظوظ ہوتے ہیں تو ادب کی ساری لوازمات پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر ادب میں کوئی افادی پہلو بھی نکل آئے اور اس کے ساتھ ہی ادب کی ساری لوازمات اور روایات بھی برقرار رہیں تو اُس صورت میں سونے پر سہاگہ والی مثل صادق آئے گی۔

ادب انسانی دِل کے چند نگاؤ نئے مقاصد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ادب کا کام انسان کی اندرونی خواہشات اور مقاصد کو تبدیل کرنا نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کرنا ادب کے دائرہ اختیار میں ہے۔ ادب زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے فنطاسیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اسے ایک نئی قسم کی، بہت ہی اعلےٰ اور عمدہ حقیقت کا نمود ہوتا ہے جس سے قارئین سرور و کیف سے جھوم اُٹھتے ہیں۔ وہ ادب کے اندر اپنے احساسات اور جذبات کی ترتیب ایک نئے انداز سے پاتے ہیں۔ گویا ادب ان کے سامنے اپنے جذبات اور احساسات کے آئینہ کی حیثیت سے آتا ہے۔

بہت سے احباب کا خیال ہے کہ ادب کا واحد مقصد تخلیقِ حسن ہے۔ ادب

کا مدعا فقط حسن پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ حسن ادب کا ایک اہم جزو ہے اور یہ ادب کے اندر کئی ایک طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ادب کا مدعا و مقصد فقط تخلیقِ حسن ہی ہوتا تو انسان ادب سے اس قدر مسرور نہیں ہوتا جتنا کہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب اپنا مواد زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ چونکہ زندگی بجائے خود بہت ہی حسین ہے اور جس قدر حسن زندگی کے اندر موجود ہے اور کہیں نہیں ہے۔ البتہ اگر ایسا کہیں کہ حسن اگر ہے تو زندگی میں ہے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حسن خود زندگی کے اندر موجود ہے تو انسان کو حسن کی تخلیق کے لئے ادب کی ضرورت کیوں پڑی اور زندگی میں حسن کی موجودگی میں انسان ادب سے کیوں ایک خاص قسم کا سرور حاصل کرتا ہے۔ ادب میں حسن کی عکاسی ہی قاری کو مسرور نہیں کرتی بلکہ اسے ادب سے وہ تمام چیزیں حاصل ہوتی ہیں جنہیں وہ حقیقی دنیا سے حاصل نہ کر پاتا اور جنہیں حاصل کرنا انسان کی ابدی جستجو ہے اسی چیز میں ادبی سرور کا راز پنہاں ہے۔

ایک ادیب جب زندگی میں کلی یا جزوی طور پر متاثر ہوتا ہے تو وہ زندگی کے اسی پہلو کے نقوش اپنے ذہن کے اندر سمو لیتا ہے اور وہاں پر اس پر ایک خاص کیمیائی عمل سا جاری ہوتا ہے اور ان نقوش کو ادیب اپنے تخیل کی رنگینیاں عطا کرتا ہے اور اس طرح سے زندگی سے حاصل کئے ہوئے مواد اور ادیب کی عطا کی ہوئی تخیل کی رنگینیوں کے ملاپ سے ایک نیا کیمیائی مرکب وجود میں آتا ہے۔ اس کی اپنی ایک ہیئت ترتیب پاتی ہے اور یہ کیمیائی مرکب اپنا ایک خاص تیکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ ادیب کے ذہن میں ایک ادبی کارنامہ جنم پاتا ہے۔ ادب چونکہ کوئی انفرادی چیز نہیں اور اس کے لئے سماجی ہونا لازمی ہے اسی لئے اس ادبی ہیئت کے، جو کہ ادیب کے ذہن کے اندر تیار ہوئی ہے، کے اظہار کے لئے ادیب بے قرار ہو جاتا ہے۔ اظہار کے لئے ذریعہ اظہار کا ہونا لازمی ہے۔ ادیب ذریعہ اظہار کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ ادب کا ذریعہ اظہار زبان ہے۔ اسی لئے زبان کا سہارا لے کر ادیب اپنی ذہنی ہیئت کا اظہار کرنا چاہتا ہے جو اس کے ذہن کے اندر موجود ہے اور جس سے وہ زندگی میں ایک مخصوص حالت میں فیض یاب ہوا تھا۔ جب زبان کے سہارے سے ادیب اپنی اصلی ذہنی ہیئت کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔ ہیئت سے پورے طور زبان کے سانچے

تعبیر

میں ڈھالنے کے بعد بھی اصلی ذہنی ہیئت ادیب کے ذہن کے اندر موجود اور محفوظ ہوتی ہے۔ قارئین کا کام ہے کہ وہ ادب کی خارجی شکل کا سہارا لے کر اور زبان کو ادیب کے ذہن تک پہنچنے کا سامان سمجھ کر ادیب کی اصلی ذہنی ہیئت کو حاصل کریں۔ اسی صورت میں قاری ادیب کے فیضان سے پورے طور محظوظ ہو سکتا ہے۔

چونکہ زبان کے ذریعے سے ہی ایک ادبی ہیئت کی خارجی ترتیب ہوتی ہے۔ اس لئے زبان ادب کے لئے ایک اہم جزو مانی گئی ہے۔ ادبی حسن کا سب سے اہم جزو حسنِ اسلوب اور حسنِ بیان ہے۔ زبان اور طرزِ تحریر کا انتخاب ادیب کا اولین کام ہوتا ہے اور اس کام کی کامیابی میں اس کے ادبی کارنامے کی کامرانی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اگر اس کا طرزِ تحریر اور لب و لہجہ اس ادبی کارنامے کے مزاج اور جسامت سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو وہ فنی کامرانی کا ہفت خواں طے کرتا ہے۔ اس صورت میں قارئین طرزِ تحریر کے ذریعے ادیب کی اصلی ذہنی ہیئت تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں اور اسی قسم کا فیضان حاصل کر سکتے ہیں جو ادیب کو عطا ہوا تھا۔ اس لئے اگر کہیں کہ طرزِ تحریر اور حسنِ اظہار ادب کی جان ہے تو کوئی بے جا بات نہیں ہوگی۔

ادیب ادب پیش کرتا ہے اور تجزیۂ ادب قارئین کا کام ہے۔ لیکن قارئین سے میری مراد ہر پڑھنے والے سے نہیں ہے۔ ہر پڑھنے والا قاری کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ ادب چونکہ ایک بہت ہی پیچیدہ عمل سے پیدا ہوتا ہے اور ادب میں انہی پیچیدہ راستوں سے ہو کر اصلی ادبی ہیئت کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ادب کو سمجھنے کے لئے ربطِ ذہن بہت ہی اہم بات ہے۔ صرف ربطِ ذہن ہی سے کام نہیں بن جاتا ہے۔ اس کے لئے قاری کا Receptive Mood بھی ایک اہم بات ہے۔ قاری کے اندر اگر یہ سارے اوصاف موجود نہ ہوں تو وہ ادب کی گہری وسعتوں سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ، وہ وجدانی حالت حاصل کر سکتا ہے جس سے ہم کنار ہونا ادب کا اصلی مدعا و مقصد ہے۔ ادب کو سمجھنے کے لئے بہت ہی ریاضی کی ضرورت ہے۔ صرف ایک بار کسی ادبی تخلیق کا پڑھنا کافی نہیں بلکہ جب اس کا بار بار مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاوضہ کے طور پر قاری اس سے وہ سرور حاصل کرتا ہے جسے پیش کرنا ادب کا اصلی مدعا ہے۔

میں ذاتی طور سے ادب میں اس بات کا حامی نہیں ہوں کہ ادب کا واحد کام زندگی کی تشریح اور تعبیر ہے۔ ادب کا سب سے بڑا اور واحد مقصد پڑھنے والے کو مسرت بخشنا ہے۔ ہاں اگر اس میں زندگی کی تشریح، تعبیر اور ترتیب کا بھی مُدعا پیش کیا گیا ہو تو کوئی عذر نہیں۔ بشرطیکہ اس قسم کے مدعا و مطلب ادبی اکائی کے کیمیائی جزو بن گئے ہوں۔ ادب میں زندگی کے کیسے بھی اہم ترین پہلو کے لئے پروپیگنڈا کا سہارا ڈھونڈنا برا اور نا انصافی ہے۔ ادب سے مُراد خطابت کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ادب اور خطابت الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ ادیب، ادیب ہے کوئی خطیب نہیں کہ جب بھی اُس کے من میں کسی اہم سیاسی یا سماجی مسئلے سے متعلق کوئی ترنگ اُٹھے تو وہ قارئین کے سامنے لیکچر بازی شروع کرے۔ ذاتی طور سے میں ادب میں خطابت کے خلاف نہیں ہوں اور نہ ہی اس بات کا قائل کہ ادب میں خطابت کے لئے کوئی گنجائش نہیں، دراصل ان سب چیزوں کا انحصار طرزِ بیان پر ہوتا ہے۔ اگر طرزِ بیان اس قسم کا اختیار کیا گیا ہو کہ یہ عنصر ایک ادبی کارنامے کی حقیقی اکائی میں گھُل مل گئے ہوں تو یہ ادب کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ ہاں اگر اس میں ادیب کامیاب نہ ہو تو محض پروپیگنڈا بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے پروپیگنڈے کو کئی احباب غلط طور حقیقت پسندی کا نام دیتے ہیں۔

ادبی حقیقت پسندی صرف نیچر کی تقلید کا نام ہی نہیں ہے۔ ادبی حقیقت پسندی ایک غیر مانوس چیز کو ایک مانوس پیرایے میں پیش کرنے کا نام ہے۔ جو لوگ ادب میں نیچر کی تقلید کو حقیقت پسندی کا نام دیتے ہیں اور زندگی کی ہُو بہُو تصویر کو ادب کا نام دیتے ہیں، وہ بھُول جاتے ہیں کہ ایک فوٹوگراف اور فنِ مصوری کے ایک کارنامے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وُہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ ادب زندگی کا عکس پیش کرنے کا نام نہیں بلکہ عکس ہائے رنگین پیش کرنے کا نام ہے۔ زندگی میں جتنی حقیقتیں ایک ادیب کو متاثر کرتی ہیں، ادیب ان کو پیش کرنے میں اپنے تخیل سے مدد لیتا ہے اور پھر اس امتزاج کو مبالغے سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے جو حقیقت ادیب کے مشاہدے میں آئی تھی اُس میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح سے ایک نئی حقیقت کا جنم ہوتا ہے جسے ہم بآسانی ادبی حقیقت کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ ادبی حقیقت ایک فطری حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دراصل ایک [illegible] ہے اور جس پر ہمیں حقیقت ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ادب کی دِل کشیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے ربطِ ذہن ایک اہم بات ہے۔ قارئین جب تک محنت اور لگاؤ کے ساتھ ادب کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ ادب کے بارے میں اپنا کوئی نظریہ پیش نہیں کر سکتے۔ جب قاری اپنے اندر وہ ربط پیدا کر لیتا ہے جسے پا کر وہ ادب کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے تو اس حالت میں قاری ادیب کو اپنے نظریہ ادب سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرح سے ادب کو پیدا کرنے اور اسے دِل کش سے دِل کش بنانے میں ادیب کی رہنمائی کرتا ہے۔

ادب، ادیب اور قاری کا آپس میں جو رشتہ ہے، یہ ادبی دُنیا کا سب کچھ ہے اور ادبی دُنیا میں ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا ناممکن ہی نہیں بلکہ ان کے بغیر ادبی دُنیا کا تصوّر ہی محال ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کر کے ہی ادبی دُنیا کو متحرک کرتے اور ادبی تحریک کو آگے لے جاتے ہیں۔

"تعمیر" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
(۲) باتصویر مضامین اور فیچر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں
(۳) ان نگارشات میں ظاہر کی گئی آرا سے حکومت جموں وکشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے تنقیدی مضامین ترجیحی طور طلب کئے جاتے ہیں

دو غزلیں

صرف خوابوں کی پرستش کے گنہگار ہوئے ایک موہوم سی خواہش کے گنہگار ہوئے
لوگ کہتے ہیں وہ مائل بہ کرم ہیں ہم پر کیسی نادیدہ نوازش کے گنہگار ہوئے
یوں تو سو بار غمِ دل کو سنانے بیٹھے اور نہ اک بار گذارش کے گنہگار ہوئے
ذکر چھیڑا جو وفاؤں کا تو رُوٹھے ہم سے خواہ مخواہ اپنی ستائش کے گنہگار ہوئے
آپ کے حُسن پہ تنقید کی جرأت نہ ہوئی گر نئی طرزِ نگارش کے گنہگار ہوئے

داغِ دل، اشکِ ستم نذر کئے تو جانا
کس قدر طرفہ نمائش کے گنہگار ہوئے

میں ہوں عابد اور تو معبود ہے ! کیا یہی بس منزلِ مقصود ہے
وسعتِ قلب و نظر تو بخش دی اور جہانِ آب و گل محدود ہے
کر رہا ہوں طے خلا کے راستے پھر بھی کیا میرا جنوں بے سود ہے
منزلِ انساں نہ بن، تیرے طفیل راہِ فکرِ آدمی مسدود ہے
اک ذرا ذوقِ نظر کی ہے کمی ورنہ کیا ہے جو یہاں مفقود ہے

بڑھ رہا ہے آدمی ہر راہ پر
گر اسیرِ فکرِ ہست و بود ہے

شیخ غلام رسول
(ممبر لیجسلیٹو کونسل)

قدیم مغل شاہراہ کی تجدید

اپنے حالیہ دورۂ کشمیر کے سلسلے میں جب وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد شوپیان تشریف لے آئے تو انہوں نے وہاں دُور دُور سے آئے ہوئے عقیدت مندوں کے اجتماعِ عظیم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ایشیا کی سب سے اونچی ٹنل دس ہزار فٹ کی بلندی پر پیر پنچال کے سلسلہ کوہ پر واقع علی آباد کے نزدیک بنائی جائے گی۔ یاد رہے کہ علی آباد سرینگر کے جنوب مغرب میں ۵۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بخشی صاحب نے ہجوم کی پُر جوش تالیوں کے درمیان اعلان کیا کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا مقصد قدیم بادشاہی شاہراہ کی تجدید کر کے سرینگر اور جموں کے درمیان ایک متبادل ذریعہ آمد و رفت کو وجود میں لانا ہے۔ وزیر اعظم نے آگے چل کر فرمایا کہ شوپیان کے تاریخی قصبے کو پیر پنچال کا جگر کاٹ کر راجوری سے ملایا جائے گا اور اس شاہراہ کی تعمیر ریاست کی ترقی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھے گی اور اُس عظیم پروگرام کا ایک شاندار کارنامہ ہوگی جو حکومت ریاست میں رسل و رسائل کو فروغ دینے کے سلسلے میں شروع کئے ہوئے ہے۔ جناب بخشی غلام محمد نے حاضرین کو یہ بھی بتایا کہ اس منصوبے کو مکمل کرنے کے سلسلے میں اقدامات اُٹھائے جا رہے ہیں اور اُمید ہے کہ عوام اس سلسلہ میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس کے بعد بخشی صاحب شوپیان سے آٹھ میل دُور ہیر پورہ چلے گئے اور وہاں سڑک کے امکانات کا بہ نفسِ نفیس جائزہ لیا۔

مغل روڈ کی تجدید کا مطالبہ کئی اہم وجوہات کی بنا پر پچھلے چند سال سے عوامی اور سرکاری دونوں سطحوں پر زور پکڑتا رہا ہے۔ مجھے اس امر کا اظہار کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ آج سے کئی سال پہلے میں نے قانون سازیہ میں اس مسئلے کی طرف حکومت کی توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد متعدد بار اس مطالبے کو قانون سازیہ کے اندر اور باہر دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ پچھلے سال قانون سازیہ میں ایک غیر سرکاری تحریک اسی مقصد کے لئے پیش ہوئی اور حکومت نے اس کو منظور کر لیا۔ ہماری آمد و رفت، تجارت اور درآمد و برآمد کے مختلف شعبوں میں پچھلے کئی سال سے جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اُس کی وجہ سے بانہال کارٹ روڈ پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور آمد و رفت کے اس بڑھتے ہوئے دباؤ کو سمونے کے لئے ضروری تھا کہ جموں اور سرینگر کے درمیان ایک متبادل شاہراہ کا انتظام کیا جائے۔ قدیم مغل روڈ کی تعمیر کے منصوبے سے اس مسئلے کا خاطر خواہ حل نکل آیا ہے اور اُس کے ساتھ ہی تجارت و آمد و رفت کے نئے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ دراصل یہ شاہراہ کشمیر کو باقی دُنیا سے جوڑنے والی قدیم ترین شاہراہوں میں سے ایک ہے۔ پیر پنچال کا سلسلۂ کوہ جو وادی کے جنوب مغرب میں پھیلا ہوا ہے وادی کا سب سے اونچا سلسلہ کوہ ہے جس کی اوسط بلندی تیرہ ہزار فٹ ہے اور بعض جگہ تو کئی چوٹیاں بیس ہزار فٹ کی بلندی کی بھی موجود ہیں (ٹٹلی کوٹی) اس سلسلۂ کوہ میں کونسر ناگ کا پُر ہیبت چشمہ بھی ۱۵,۰۰۰ فٹ کی بلندی پر موجود ہے۔ علی آباد کے نزدیک اس سلسلے کی دو کڑیاں بتدریج پست ہو کر ایک نشیبی درہ بنا کر ایک قدرتی گذرگاہ کو وجود میں لاتی ہیں۔ ابتدا سے ہی یہ درہ کشمیر آنے جانے کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اسی لئے قدیم کشمیر میں ہیر پورہ (راج ترنگنی میں اس کا نام سوراپورہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سٹائن) ایک اہم تجارتی اور فوجی اہمیت کے مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا ہے۔ اگر آمد و رفت کے ان امکانات سے کچھ لمحوں کے لئے قطع نظر بھی کیا جائے تو اس قصبے کی اتنی غیر معمولی اہمیت اور خوش حالی کی تاویل محال ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اسے

وادی کا مغربی دروازہ کہا جاتا تھا اور غیر ملکی جاسوسوں اور حملہ آوروں سے بچاؤ کے سلسلے میں یہاں فوجی معائنے کی ایک چوکی (راج ترنگنی کی درنگ) اور قلعہ بنایا گیا تھا۔ کشمیر میں داخلہ دینے سے پہلے یہاں باہر سے آنے والوں کی جانچ پڑتال ہوتی تھی۔

اس شاہراہ کے ساتھ تاریخ کشمیر کا ایک اور عظیم واقعہ وابستہ ہے۔ اسی راستے سے سلطان شہاب الدین کے دورِ سلطنت میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح ۷۷۴ ہجری (۱۳۷۲ عیسوی) میں کشمیر تشریف لائے اور بقول اقبال ؎ خطہ را آں شاہِ دریا آستین

دادِ علم و صنعت و تہذیبِ دین

چنانچہ اُن کی آمد کے نشانات اب بھی اس سڑک پر جابجا نظر آتے ہیں۔ شوپیان سے تین میل اُوپر سوگام کے مقام پر اُن کی یادگار اس وقت بھی مرجعِ خلائق ہے۔ مغلیہ خاندان کے دَور میں اس شاہراہ کا ستارۂ اقبال پُورے طور چمک اُٹھا۔ انہوں نے اس کی مرمت کی۔ اس پر پُل تعمیر کئے اور جابجا سرائیں بنوائیں۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے شاہی کاروان اسی راستے سے گذرے۔ درحقیقت نور الدین جہانگیر کا انتقال اسی شاہراہ کو عبور کرتے ہوئے ہوا۔ جب اُس کی طبیعت کشمیر آکے ناساز ہوگئی تو نورجہاں نے کُوچ کا حکم دیا۔ روایت ہے کہ علی آباد سے آگے جاکر اس کا انتقال ہوگیا۔ نورجہاں کی فراست اور جہانبانی کے جوہر جس طرح اس موقع پر کھلے اُن کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر فوج میں جہانگیر کی موت کا چرچا عام ہوجاتا تو ہراسانی اور انتشار کا پھیلنا لازمی تھا۔ جس کا ردِعمل پُورے ہندوستان میں کافی بھیانک ہوتا۔ لہٰذا اُس نے مُناسب وقت تک اس راز کو سربستہ رکھنے کا عزم کرلیا۔ جب بھی لاؤ ولشکر خیمہ زن ہوتا تو شاہی خیمے کے ٹھاٹھ باٹھ اُسی انداز و اداسے قائم رہتے۔ نورجہاں خیمے سے باہر آکر اُسی طمانیت و تمکنت سے دادِ حکومت دیتی کہ کسی کو شُبہ نہیں ہوسکتا کہ اندر شہنشاہ جہانگیر کا سَر تاج شاہی کے بدلے کفن کی بے نورُ سفیدی میں ملبوس ہے۔ اُس کے ضبط اور تمکین کا عالم یہ تھا کہ خاص متعمد بھی اسی دھوکے میں رہے کہ شہنشاہ طبیعت کی ناسازی کے سبب خلوت اور آرام چاہتے ہیں۔ جہانگیر کے جسدِ خاکی کی تطہیر بھی کی گئی اور چنگس سرائے کے نزدیک اُس کے بطن کے بعض

تعمیر

حصے اب تک مدفون ہیں (ملاحظہ ہو صوفی کی "کشیر")

اس سڑک کا ایک اجمالی نقشہ یہ ہے کہ کشیر کے صدر مقام سرینگر (سطح سمندر سے بلندی ۵۲۲۵ فٹ) سے جنوب کی طرف چلئے۔ للّا عارفہ کے گاؤں پانپور سے ہوتے ہوئے پلوامہ پہنچیئے۔ وہاں سے شوپیان۔ یہ سفر ۳۲ میل کا ہے اور سڑک پچھلے برس پُورے پختہ بنائی گئی ہے۔ شوپیان (سطح سمندر سے بلندی ۶۷۱۴ فٹ) آج سے ایک صدی لگ بھگ ایک ضلع اور تحصیل کا صدر مقام تھا۔ مگر اب مغل روڈ کے اُجڑنے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت گھٹ گئی تھی جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اب یہاں لے دے کے صرف نیابت قائم ہے۔ شوپیان سے آٹھ میل کے بعد ہیرہ پور (سطح سمندر سے ۷۷۰۰ فٹ) کی بستی آتی ہے جو رنبی آرہ کے دونوں کناروں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے پہاڑی سفر کا آغاز ہوجاتا ہے علی آباد (سطح سمندر سے ۱۰۰۰۰ فٹ بلند) کا پڑاؤ یہاں سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بعد گیارہ میل چل کر پوشیانہ کی بستی آتی ہے۔ اس ۱۱ میل کے سفر میں ۱۱۴۰۰ فٹ بلند پیر پنچال چوٹی عبور کرنا پڑتی ہے جہاں پر ٹنل نصب کرنا مقصود ہے۔ اس کے بعد پہاڑی کی ڈھلوان پھر نشیب کو جاتی ہے (پوشیانہ سطح سمندر سے ۸۱۵۰ فٹ ہے) آٹھ میل چل کر بہرام گلہ ۵۸۰۰ فٹ بلند) کا مقام آتا ہے جہاں پر پہاڑی سفر کا اختتام ہوتا ہے۔ درحقیقت یہی تیس میل ہیں جہاں سڑک پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہرام گلہ کے بعد پھر پختہ سڑک شروع ہوجاتی ہے۔ بہرام گلہ سے تھنہ منڈی ۱۰ میل۔ تھنہ منڈی سے راجوری ۱۴ میل، راجوری سے دھرم سال ۲۴ میل، وہاں سے چوکی چورا ۲۲ میل، وہاں سے اکھنور ۱۳ میل اور پھر وہاں سے جموں تک کی مسافت ۱۶ میل رہ جاتی ہے۔ اس طرح سے یہ ساری مسافت ۱۷۰ میل کی رہ جاتی ہے جو بانہال روڈ کے مقابلے میں تیس بتیس میل کم ہے۔ اُمید ہے کہ ٹنل کی تعمیر سے اس فاصلے کے بہت سے تکلیف دِہ حصے میں قابل لحاظ حد تک کمی ہوجائے گی۔

یہ سڑک بکر والوں کی آمد ورفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی تعمیر سے اُن کے مسائل بھی کافی حد تک کم ہوجائیں گے۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے حکومت نے جس فراخ دِلی اور حوصلے سے کام لیا ہے وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ امید اس سے ہماری آمد ورفت کی تاریخ میں ایک سنہری باب کا اضافہ ہوجائے گا۔ جون ۱۹۶۰ء

سید لطف اللہ گورکھپوری

تدفین کی اساطیر

تاریخ گواہ ہے کہ دورِ عتیق سے ہی انسان اپنے مُردوں کے آرام و آسائش کے لئے اپنی اپنی استطاعت اور قوت کے مطابق انتظامات کرتا آیا ہے۔ اس کی پسندیدہ چیزیں، اس کی مرغوب غذا اور بے پناہ دولت اس کے ہمراہ رکھنے کے ساتھ ساتھ دیوی دیوتاؤں سے اس کے گناہ معاف کرانے اور اس کی رُوح کو آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

موجودہ زمانے کے انسانوں میں بھی ایسے جذبات موجود ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وہ ترقی یافتہ ہوتا جارہا ہے اور وقت اور حالات بدلتے جا رہے ہیں، مُردوں سے متعلق اس کی ہمدردی میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ اسی لئے اگلے زمانے کے مُردے کے مقابلے میں آج کا مُردہ زیادہ غریب ہوگیا ہے۔ جہاں پُرانے زمانے کے مُردے اپنے پہلو میں اربوں روپے کے خزانے لئے پڑے ہیں وہاں آج مسلمان صرف فاتحہ اور چالیسواں کے بعد مردے سے تقریبًا ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ہنود بھی آدھ پاؤ رتی سونا مُردے کے مُنہ میں چھوڑکر (وہ بھی کہیں کہیں) برسی اور تیرھویں تک کی رسُوم سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔

کریٹ کے مُردے

پُرانے زمانے کے مُردوں میں، عام خیال یہ ہے کہ مصر کے مُردے سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے بھی زیادہ دولت مند مُردے ابھی زمین کے اندر دَبے ہوئے ہیں۔ جزیرہ کریٹ کے مُردے بھی ایسے ہی دولت مند مُردوں کی صف میں آتے ہیں۔

شہر کریٹ عیسٰی سے تقریبًا ڈھائی ہزار سال پہلے بحر ایجین کے جزیروں کا دارالسلطنت تھا۔ محققوں اور عالموں نے یہاں کی تہذیب کو ایجین یا کریٹین تہذیب کا نام دیا ہے۔ یہی زمانہ موہن جودڑو کا بھی ہے۔ کریٹ کے لوگ کون تھے؟ ابھی اس سوال کا صحیح جواب نہیں مِل سکا ہے، پھر بھی اتنا ضرور پتہ چلا ہے کہ ان لوگوں کی مصوری اور اسپین کے التامارا کے غاروں کی مصوری میں بے طرح مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اندازہ یہی کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اسپین والوں کے ہی بھائی بند تھے جو کبھی یہاں آبسے تھے۔

عیسٰی سے دس ہزار برس پہلے سے تین ہزار برس پہلے تک ان کا زمانہ غیر ترقی یافتہ رہا۔ لیکن عیسٰی سے تین ہزار برس پہلے سے دو ہزار برس پہلے تک یعنی مائنوں اَن کے زمانے میں یہ تہذیب خوب چمکی۔ ان لوگوں نے پانچ سو ایجین جزیروں میں کروسس نام کی اپنی حکومت قائم کی۔ کریٹ اس کا دارالسلطنت تھا۔ آگے چل کر یہ تہذیب یُونانی تہذیب میں گھُل مِل کر اپنے وجود سے محروم ہوگئی!

دُنیا بھر کی قوموں میں اس قوم کے مُردے سب سے زیادہ دولت مند پائے گئے ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں سر سلیمن نے کریٹ نوساس نام کے ایک مقام کی کھُدائی کی تھی۔ وہاں ایک پُورا کا پُورا راج محل مِلا۔ اور اس کے پاس ہی پُرانی قبریں بھی مِلیں۔ ان قبروں کا زمانہ عیسٰی سے ڈھائی ہزار برس قبل، مانا جاتا ہے۔ ان قبروں کے اندر سونے چاندی کے زیور، ہاتھی دانت پر کی گئی سونے کی مصوری کے زیورات، سونے کے برتن اور سونے چاندی کے لاتعداد ٹکڑے مِلے تھے۔

اس کے بعد سلیمن نے ان کے بسائے ہوئے یُونانی شہر مائیکینی کی کھدائی کرائی۔ یہ شہر آگردس کے وسط میں تھا۔ یہاں بھاری بھرکم وسیع چٹانوں کا بنا ہوا ایک قلعہ مِلا۔ اس قلعہ سے باہر گولائی سے قطار میں بہت سی قبریں مِلیں۔ ان قبروں میں مُردے تابُوتوں میں کھڑے دفنائے ہوئے مِلے۔ تابُوتوں کی

ساری خالی جگہیں سونے چاندی کے زیوروں سے بھری کی بھری ملیں۔

دو تین سال قبل سٹیمن نے ٹرنس کو کھودنا شروع کیا۔ یہاں بھی ایک شاہی محل ملا۔ اس کے پاس ہی مائیکینی جیسی سونے چاندی سے بھری قبریں ملیں تعجب ہے کہ یہاں جنگیں لڑی گئیں، مگر کسی کا دھیان ان قبروں میں مخفی ان خزانوں کی طرف نہیں گیا۔

ایران کے پرانے مُردے

ایرانی مُردوں کی تاریخ میں سب سے دولت مند مُردے وہاں سب سے پہلے بسنے والی قوم "مگے" کے ہیں۔ یہ قوم مذہب کی تبلیغ کرتی تھی اور پانی، روشنی اور ہوا کی پوجا کرتی تھی۔ ان کے رسم و رواج آریوں سے ملتے جلتے تھے۔ مرنے کے بعد ان کا خیال تھا کہ رُوح ایک پُل سے ہوکر گذرتی ہے۔ آدمی اگر گنہگار ہوتا ہے تو اندھیرے میں گِر کر مصیبتیں اور عذاب جھیلتا ہے۔ نہیں تو پُل پار کرکے جنت میں چلا جاتا ہے۔ جہاں چاندنی میں خوبصورت اور فرحت بخش دوشیزائیں اس کا استقبال کرتی ہیں۔

چناں چہ یہ لوگ بیل، بھیڑ، گدھوں اور گھوڑوں کی قربانی دے کر اور قبروں کو دولت سے بھر کر اپنے مُردوں کے چاروں طرف موم لپیٹ دیا کرتے تھے کہ رُوح ہلکی رہے اور آسانی سے پُل پار کرسکے۔ مرنے والے کا لباس بھی سینے پر کھُلا رہتا تھا تاکہ رُوح کو جسم سے نکلنے میں آسانی ہو۔

مصر کے مال دار مُردے

مصر کے مُردوں کی دولت مندی عالمی شہرت کی مالک ہے۔ وہاں بادشاہوں کی ممیائی بناکر انہیں پتھر کے تابوت میں رکھتے اور اُوپر اہرام بنا دیتے تھے۔ متوسط طبقے کے لوگ اسی طرح کوٹھریاں بناتے تھے۔

ان کوٹھریوں کی اندرونی دیواروں کو مرنے والے کے واقعات زندگی سے مطابقت رکھنے والی تصویروں سے مزیّن کرتے تھے۔ ہر کوٹھری کے بغل میں ایک دوسری کوٹھری بھی بنائی جاتی تھی جس میں مرنے والے کی مومیائی رکھی جاتی تھی اور اس میں مرنے والے کی تمام چیزیں اور کافی دولت رکھ کر ساری جگہ کو ریت اور کنکریٹ سے بھر کر راستے تک چھپا دیا کرتے تھے۔

بادشاہوں کے لئے اہرام بنانے کا رواج تھا۔ مصر میں ایسے کُل ملاکر اسّی (۸۰) اہرام ہیں جن میں سے تین کافی بڑے ہیں، اس میں میم فس کے اہرام سب سے بڑے ہیں۔ یہ شہنشاہ چیوپس اور مین کرُسے کے بنوائے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف پہلے سنگِ مرمر لگا ہوا تھا۔ جسے محمد علی نے اُکھڑوا کر اپنی مسجد میں لگوایا۔

ابھی حال میں کچھ نئے مقبروں کی دریافت ہوئی ہے۔ یہ مقبرے پہاڑیاں کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ یہاں بھی مومیائی کے ساتھ دولت بھر کر ساری عمارت اور تمام راستے چھپا دئے گئے ہیں۔ یہ مقبرے دیر البحری اور ابی درس میں نکلے ہیں جن میں ایسے خزانے نکلے ہیں جن کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔

اہرامِ مصر میں جو تصویریں پائی گئی ہیں اس میں مُردے کی موت، اس کی مومیائی بنانے اور دفنانے سے پہلے مومیائی کو کھڑا کرکے اس کے آگے رونے چلّانے اور غم منانے تک کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ رونے والوں کی تصویریں اس لئے بنائی جاتی تھیں کہ مُردے کی رُوح کو سکون ملے۔ ان میں کچھ رنگین تصویریں بھی ہیں اور کچھ کندہ کی ہوئی۔

اہرام کا بنانا عیسیٰ سے ۳۱۰۵ برس پہلے شروع ہوا۔ سب سے پہلا اہرام وہ ہے جو شہنشاہ جور کے مقبرے پر بنا۔ مگر سب سے لمبا چوڑا اہرام وہ ہے جو شہنشاہ خفو یا روی آپس نے عیسیٰ سے تین ہزار برس پہلے ایک لاکھ مزدور لگوا کر بیس سال میں بنوایا تھا۔ مگر وہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ بعد میں اسی خاندان کے ایک شہنشاہ فیرو جیفرے نے پُورا کروایا تھا۔ یہ اہرام ۴۸۱ فٹ اُونچا ۷۵۵، فٹ لمبا ہے۔ اس میں ۱۵۰ ٹن تک کے ۲۵ لاکھ پتھر لگے ہوئے ہیں اور تیراہ ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا ہے۔

شہنشاہ توتن خامون کا اہرام کھولا گیا تو اس میں سے بے پناہ دولت کے ساتھ مذہبی معاملات میں رہنمائی کرانے والی کتاب، شہنشاہ کی کُرسی، سونے چاندی کے برتن، زیور اور کتنے ہی ہتھیار تو ملے ہی، تابوت کے اندر مومیائی اور مومیائی کے اُوپر چڑھا ہوا سونے کا چہرہ اور تابوت کے اُوپر سونے کا ڈھکن بھی ملا۔ مقبرے کی دیواروں پر اشارے کی زبان میں مومیائی بنانے کا نسخہ بھی تھا۔

میمز کے مقبرے سے بھی اسی طرح کی چیزیں مومیائی والی کوٹھری میں ملیں۔ ساتھ ہی کچھ ایسی تختیاں بھی ملیں جن سے مصر کے رسم و رواج پر روشنی پڑتی ہے۔ ان تختیوں کا زمانہ پانچ ہزار سال پُرانا متصوّر کیا جاتا ہے۔ جب کہ مصر میں مُردے کو جلایا جاتا تھا۔ لیکن وہ شاید شہنشاہ کی پسندیدہ چیز سمجھ کر اس کے ساتھ رکھی گئی۔

شہنشاہ مین کڈے کا اہرام جب دیکھا گیا تو لوگ دنگ رہ گئے۔ کیونکہ تابوت کے اندر میت من و عن موجود تھی۔ اہرام کے جس کمرے میں میت دفنائی گئی تھی وہ بالکل بھول بھلیاں تھا۔ اور دروازے کو چھپانے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا تھا۔ اسے تلاش کرتے وقت وہ دستاویز ملی تھی جس میں لکھا تھا کہ مقبرے سے متعلق خزانہ اور جواہرات وغیرہ فلاں تہہ خانے میں ہیں۔

مصری اپنے مُردوں کے آرام کے لئے ان کے ساتھ مقبروں میں زیادہ سے زیادہ دولت، کھانے پینے اور ضروریات زندگی کے دوسرے لوازمات کافی مقدار میں مہیا کر دیتے تھے۔ مقبرے تو وہاں اب بھی بنتے ہیں۔ مگر اب دولت وغیرہ ان میں نہیں رکھی جاتی۔

یونان کے مُردے

پرانے یونان میں مُردوں کو گاڑتے بھی تھے اور جلاتے بھی تھے۔ لیکن مُردے کی عزت ہر دو صورتوں میں کی جاتی تھی۔ جو لوگ مُردوں کو جلاتے تھے وہ ان کے ساتھ سواری کے گھوڑے وغیرہ بھی جلا دیتے تھے اور سمادھی کے اندر ان کی پسندیدہ چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کے سامان اور کافی دولت گاڑ دیتے تھے۔ اسی طرح جو مُردوں کو دفناتے تھے وہ قبروں میں ہر طرح کے سامان رکھ دیتے تھے۔

مرنے کے بعد یونان میں مُردے کے بھُوت کی پوجا کی جاتی تھی اور جانوروں کی قربانی دی جاتی تھی۔ مُردے کی راکھ پر سمادھی بنانے، اس میں کھانے کی چیزیں اور دولت وغیرہ رکھنے کا چلن چوتھی صدی تک رہا۔ مصر کی نقل پر دو تین اہرام بھی تعمیر کرائے گئے۔

میسوپوٹامیہ کے مُردے

مُردوں کی قدیم تاریخ ٹٹولنے پر میسوپوٹامیہ کے مُردے بھی کم دولت مند نہیں دکھائی دیتے۔ یہاں کا "اُر" نام کا علاقہ سیرین لوگوں کا مخصوص علاقہ تھا۔ ان لمبی داڑھی اور تندرست و توانا جسم رکھنے والوں کو بھی اپنے مُردوں سے ازحد محبت تھی۔

سر لیونارڈ وولی کے ہاتھ ان کے مُردوں کی بہت سی قبریں لگ گئی تھیں۔ اس وقت ان کے مُردوں کی اصلیت کا پتہ چلا تھا۔ یہ قبریں سونے چاندی، ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چیزوں اور سیپیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ قبروں کے اوپر بڑی فنِ مصوری ہے۔ ۱۸۸۴ء میں خورساباد کی کھدائی میں بھی اسی طرح کی تعمیر قبریں ملی تھیں جو خزانوں سے بھرپور تھیں۔

رومنوں کے عیاش مُردے

جہاں مصر اور کریٹ کے مُردے دولت اور خزانوں میں بڑھے چڑھے ہیں وہاں شان و شوکت اور عیاشی میں پرانے رومنوں کے مُردے سب سے آگے ہیں۔

پرانے زمانے میں یہاں اسکن قوم کی حکومت تھی۔ اسکن سردار بڑے عیاش ہوتے تھے۔ اس کا پتہ بھی قبروں کی کھدائی سے چلا ہے۔ جتنی بھی قبریں اب تک کھدوائی گئیں سب میں بیوی اور شوہر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ملے۔ ان کے ادھر ادھر سونے چاندی کی سلیں بھری ہوئی تھیں۔

رومنوں کے مقبروں میں اصلی جواہرات، دھات کے پتر اور مورتیاں پائی گئیں۔ اتنا ہی نہیں سونے چاندی کے بہترین زیوروں، قیمتی لباسوں سے لے کر دھات کے بنے ہوئے پلنگ اور شراب کے پیالے تک نکلے۔ اس کے علاوہ قبروں کے اندر ایسی تصویریں بھی بنی ہوئی ملیں جن کے دیکھنے سے ان لوگوں کی عیاش مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔

سب سے دولت مند جاپانی مُردے

اب تک جتنے بھی ملکوں کے مُردوں کا ذکر آیا ہے ان میں سب سے دولت مند جاپان کے مُردے ہیں۔

میکڈانلڈ کے کہنے کے مطابق دنیا کا سب سے دولت مند شہر میٹالین ہے جو بحرِ عظیم میں ڈوبا ہوا ہے۔ یونان کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ شہر کسی زمانے میں جاپان کا ایک بہت خوش حال شہر تھا۔ ایک دن اچانک یہ غرقِ آب ہو گیا۔ آج کل یہ جاپان کے قبضے میں ہے۔ سمندر کا پانی یہاں اتنا صاف ہے کہ نیچے شہر کے مکان، مندر اور ان کی مصوری صاف دکھائی دیتی ہے۔

پجاریوں کا کہنا ہے کہ اس شہر کے مندر اور مقبروں میں ایک بڑی حکومت کا بے پناہ سرمایہ دبا پڑا ہے۔ یہ حکومت بہت پرانے زمانے کی حکومت تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ پانی میں ڈوبے ہوئے اس شہر کے دو حصے ہیں۔ پہلا وہ، جس میں حکومت کے دولت مند اور صاحبِ اقتدار لوگوں کے مُردے محفوظ ہیں جو تعداد میں تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ ہر ایک مُردہ پلیٹنم کے تابوت میں رکھا ہوا ہے اور ہر ایک تابوت میں کم از کم سوا سو اونس دھات لگی ہے۔ دوسرے حصے کے بارے میں ابھی کوئی واضح رائے نہیں قائم کی جا سکی ہے۔ کہتے ہیں کہ جاپانیوں سے

(بقیہ آخری صفحہ پر)

وحید اختر

گم گشتگی

میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں
چہرہ چہرہ کھوج رہا ہوں
نگری نگری گھوم رہا ہوں
وہ آنکھیں، وہ عارض و لب، وہ خال و خد کھوئے ہیں کہاں
کون پتہ اُن کا دے گا
جن لوگوں نے اُنہیں دیکھا ہے
اُس کا پتہ اُس کی خیریت جان کے بھی انجان سے ہیں

جو میرے ہمدرد ہیں میرے غم کے محرم
اپنے غم میں مصلحتوں کے ہاتھوں مجبور و معذور
وہ دشنام طراز ہیں، جان کے بھی انجان بنے پھرتے ہیں
اُس کے عارض و لب میں کوئی رنگ نہیں اب دیکھ چکے ہیں
پھر بھی مجھ سے رنگ کی باتیں کرتے ہیں
میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں

کون کسی کا دُکھ سہتا ہے، کون کسی کو اپناتا ہے
میں نے اُسے چاہا تھا لیکن
اُس سے بچھڑ کر شکوہ سنجِ تنہائی ہوں
نشے میں بھول چکا ہوں
وہ ہو دُور مگر اُس کا غم دُور نہیں ہے
میں نے غزلوں نظموں میں اُس کی تصویر اُتاری ہے
میں نے لفظوں سے معنی کی باتیں کی ہیں

پر وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے
تم نے مجھ کو یاد کیا ہوتا تو میں آ بھی جاتی
تم تو اپنی شخصیت کو کھوج رہے تھے
تم تو اپنی ہی تکمیل کے خواہاں تھے
تم نے مجھ کو پایا تھا پر کھو بھی چکے ہو
اور اب اپنے غم کے ہاتھوں خود کو بھی کھوتے جاتے ہو

میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں
میں خود اپنے ساتھ نہیں ہوں!

گالی

جب قادر گنائی کا لونڈا استادا آس پاس کے لوگوں کی نظریں بچا کر چوری چھپے ساجدہ کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو مختی دُور پیر کے مزار کی عقبی دیوار کے پاس بیٹھ کر اُسے دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ اور گالیاں دے رہی تھی۔ سات خصموں والی مَیا کا پوت۔ ذرا دیکھو اور سُنو۔ غلطی سے ذرا سا چھوا تو دماغ ہی بھک سے اُڑ گیا صاحبزادے کا۔ جیسے سانپ نے چھو لیا ہو— توبہ میری!

تھک ہار کر اُس نے جیب سے نسوار کی ڈبیہ نکال کر ایک چٹکی بھر لی۔ اور مزار کے پتھریلے فرش پر زور سے تھوک دیا۔ آج مختی کے سراپا میں وہ ٹھہراؤ اور سکون موجود نہیں رہا تھا جو موجود ہوا کرتا تھا۔ آج بہت مدت کے بعد وہ پھر ایک سراپا گالی بن گئی تھی۔ ایک نمکین، چلبلی گالی، جسے اُگلتے وقت کبھی وہ ایک عجیب سی لذت محسوس کرتی تھی۔ اُس نے مُنہ ٹیڑھا کر کے ایک اور گالی فضا میں اُچھال دی۔ مگر اُسے محسوس ہوا جیسے ایک آگ سی ناف سے لے کر زبان کی نوک تک کوندتی چلی گئی۔ اُس نے زور سے مزار کے پتھریلے فرش پر دوسری مرتبہ تھوک دیا اور جیب سے اپنی تنخواہ کے پیسے نکال کر پانچویں مرتبہ گننے لگی۔ ٹکٹ کے دس نئے پیسے نکال کر باقی پوری رقم موجود تھی۔ پانچ روپے کے قدرے میلے سے نوٹ، ایک ایک روپے کے تازہ اور سرسراتے ہوئے نوٹ، جن کو چھوتے وقت ایک عجیب طرح کی جھرجھری سارے بدن میں آتی تھی اور خواہ مخواہ جوانی یاد آتی تھی۔ اور ایک دو روپے کا بہت ہی میلا کچیلا نوٹ۔ اُف! یہ دو روپے کا نوٹ کتنا گندہ تھا۔ اس کے اپنے کاروبار کی طرح۔ دو روپے کا نوٹ الگ کر کے اُس نے سوچا کہ وہ گھر جاتے ہی یہ دو روپے کا نوٹ ساجدہ کو دے کر قادر گنائی کے پاس بھیج دے گی اور ایک سری منگا دے گی۔ باقی کے پیسے تو وہ لوٹا دے گا ہی،

نعیم

پر اس گندے نوٹ سے چھٹکارا مل جائے گا— اور پھر اس ایک سری کے لئے تو پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جہنم میں جائے یہ ایک مہینہ۔ ایک مہینے میں ایک سری۔ لعنت ہو۔ سوچتے سوچتے مختی رُک گئی۔ کس پر لعنت ہو—؟ ہاں کس پر آخر؟

ایک بار پھر گالی پیٹ سے اُچھل کر اس کی زبان پر آگئی۔ نُدیدے! حرامی پلے! آخر کیا سمجھا ہے ان لوگوں نے مجھے؟ کسی کا دیا تو نہیں کھاتی ہوں۔ لاٹ صاحب ہوں گے تو اپنے گھر۔ میں بھی اپنے گھر میں رانی ہوں۔ نپٹ لوں گی ایک ایک سے۔ وہ صلواتیں سُناؤں گی کہ اگلی تین پشتیں بہری اور اندھی پیدا ہوں۔

حرامیوں کی اولاد— میں کمیٹی میں مُلازم ہوں تو کیا۔ میں سڑکوں پر جھاڑو پھیرتی ہوں تو کیا۔ میں ٹوکری میں کچرا جمع کرتی ہوں تو کیا۔ کسی کی دبیل تو ہوں نہیں۔ کوٹھڑی کا ڈھائی روپیہ کرایہ دیتی ہوں۔ مُفت تو نہیں رہتی اس محلے میں۔ جہنم کے مُردے! آج تک میری شرافت دیکھتے تھے، اب میری کمینگی بھی دیکھیں گے۔ قادر گنائی کا مریل اور حرامی لونڈا نہ ہوا، لاٹ صاحب کا خانساماں ہو گیا۔ توبہ میری!

مختی نے مزار کے فرش پر ایک اور مرتبہ تھوک دیا اور شانوں کو جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے جلدی گھر جانا چاہیئے۔ آج پورے ایک مہینے کے بعد گوشت پکانا تھا۔

مختی جب پہلے پہل اس محلے میں آئی تھی تو اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی دن وہ اس محلے کو بھی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس سے پہلے جب وہ کہنہ مزار کے محلے میں رہتی تھی تو خدا جانے کن خوابوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی

رہتی تھی۔ کہنہ مزار کے پورے محلے کے ساتھ اُسے شدید نفرت تھی۔ وہ اُسے کبھی بھنگن کی سطح سے اُونچا نہیں دیکھ سکتے تھے اور یہ بات مختی کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

آخر کیسے برداشت کرتی کہ کوئی آدمی اس کے پاس سے گذرتے وقت ضرور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے کپڑے بھی مختی کے ساتھ چھُونے نہ پائیں۔ آخر کیسے برداشت کرتی کہ کوئی آدمی اس کی بات کو یُوں نظر انداز کرے، جیسے مختی نے بات نہ کی ہو؛ گالی اُگل دی ہو۔ آخر اُس کا خون کیسے نہیں کھولنے لگتا، جب وہ کسی بی بی کو اپنے بچے سے یہ کہتے سُنتی، نانا! اس کے ہاتھ کا کھانا گناہ ہے۔ یہ بھنگن ہے۔ کچرا جمع کرتی ہے۔ کیسے چپ رہتی، جب لوگ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ میں پنہاں گالی کی تلاش کرتے۔ مختی ہے صاحب! اپنے محلے کی بھنگن اور بھنگنوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں، گالی اُن کی زبان کی نوک پر رہتی ہے۔

مگر اُن دنوں مختی کی زبان کی نوک تو کجا، اس کے دماغ کی دہلیز پر بھی کبھی گالی نے اپنا پر تک نہیں ڈالا تھا۔ مگر یہ بات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی تھی۔ کیسے رہتی آخر؟ لوگ اس طریقے پر پیش آئیں تو آدمی کتنا ہی سخت دل کیوں نہ ہو، برداشت کی حدیں تو کبھی نہ کبھی پھلانگ ہی جاتا ہے۔ مجبور ہو جاتا ہے یہ حدیں پھلانگنے پر۔ انتہائی ضبط کے باوجود جب مختی کی حالت بہتر نہ ہوئی اور نہ آئندہ بہتر ہونے کی کوئی اُمید باقی رہی تو اس کے اندر کی عورت جیسے کروٹ لے کر بیدار ہو گئی۔ وہ عورت، جو ایک غلیظ اور مکروہ گیرج میں پیدا ہوئی تھی اور دُنیا میں آتے ہی پہلا بول جس کے کانوں میں پڑا تھا، وہ گالی ہی تھا ـــ نلے مالزادی! اب کی بار پھر ایک مالزادی کو جنا ہے۔ کوکھ جلی ـــ • وہ عورت بیدار ہو گئی جو کیچڑ اور چیتھڑوں کے ڈھیر میں پروان چڑھی تھی جس کی خمیر غلاظت سے اُٹھی تھی اور جس کی آنکھ گلیوں کی کیچڑ میں کھلی تھی۔ مکروہ، گھناؤنی، سراپا گالی۔

اس لئے ایک دِن جب کہنہ مزار کے لوگ بیدار ہو گئے تو انہوں نے مختی کو نہیں بلکہ مختی کے اندر کی اُس عورت کو دیکھا جسے خود مختی نے بے رحمی سے اور بے دردی سے بہت عرصہ پہلے ذبح کیا تھا۔ مگر اب اُسے پتہ چلا تھا کہ اُس نے بہت بے وقوفی سے کام لیا تھا۔ اُس نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی کہ اُس نے اپنے اُوپر بھروسہ کیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ کل دُنیا اُس

تو

پر بھروسہ کرے گی یا نہیں۔ اور دُنیا کب کسی پر بھروسہ کرتی ہے۔ اور دوسرے دن اُس نے کہنہ مزار کا محلہ چھوڑ دیا تھا۔

مختی کو اپنی اس غلیظ زندگی سے اُسی دن نفرت ہو گئی تھی۔ جب بائیس برس پہلے اس کی شادی کی گئی تھی۔ عورت چاہے کیچڑ کے ڈھیر میں پیدا ہوئی ہو، چاہے ڈن لپلو کے بچھونے پر ـــ شادی کے بارے میں ایک ہی قسم کے رنگین خواب دیکھتی ہے۔ مختی نے بھی اپنی بھرپور جوانی کی آگ پر سینچ سینچ کر کچھ ایسے ہی خواب تیار کئے تھے۔ پر پہلی رات کو ہی وہ خواب منتشر ہو گئے تھے۔ جب رسُل شیخ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا تھا۔ ٹخنوں ٹخنوں تک میل سے اٹے ہوئے پاؤں۔ جیسے ان پاؤں نے کبھی پانی کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔ کھلی قمیص سے جھانکتا ہوا میلا کچیلا سینہ۔ جیسے اس سینے میں کبھی کوئی ارمان نہیں جاگا ہو۔ سر کے چھدری بال بے ترتیب، پریشان، گرد سے اٹے ہوئے، جیسے ان بالوں نے کبھی کوئی صابن کا اشتہار نہ دیکھا ہو۔ مُنہ سے پھُوٹتی ہوئی ٹھرے کی بساند، جیسے اس مُنہ نے کبھی محبت کا لفظ نہیں دوہرایا ہو۔ رسُل شیخ اور اُس کا یہ حُلیہ دیکھ کر ہی مختی کے دِل میں شدید نفرت کا ایک دھارا یک لخت پھُوٹ پڑا تھا۔

اُس نے کوئی زیادہ اُونچی اُڑان بھی تو نہیں کی تھی۔ وہ اپنے ماحول کی غلاظت کو پہچانتی تھی، پر شادی کے دِن ـــ اس دن تو غلیظ سے غلیظ اور مکروہ سے مکروہ تر چہرہ بھی جانا پہچانا لگتا ہے۔ رسُل شیخ کی طرح اَن جانا اور ڈراؤنا تو نہیں۔ خود وہ کتنی صاف صاف اور اُجلی اُجلی لگ رہی تھی اُس دن۔ اُس نے صابن سے نہایا بھی تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی سلائیاں بھی پھیری تھیں ـــ ہونٹوں کو دنداسہ کے چھلکوں سے لال بھی کیا تھا ـــ اور ـــ اور ـــ اُس نے کنکھیوں سے رسُل شیخ کی طرف ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اُف! اس کے دونوں پَر کِس بے دردی سے نوچے گئے تھے۔ اُسے یُوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ایک بہت اونچی سطح سے گر گئی ہو اور گِر کر اُس کی ہڈیاں پسلیاں چُور چُور ہو گئی ہوں۔ پھر وہ اپنے آپ کو بھُول کر رسُل شیخ کی باہوں میں آ گئی تھی۔ اور دُنیا کے تمام خواب دُھندلا گئے تھے۔ نفرت کے تیز اور شدید دُھویں میں۔

سوچ سوچ کر مختی اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی کہ خود اس کے اندر کوئی غلاظت نہیں تھی۔ کوئی بدبُو نہیں تھی۔ کوئی کیچڑ کی بجبجی بجلی نہیں تھی۔ وہ تو

بس ایک عورت تھی جو قافلے کے آخر پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں جھاڑو اور ٹوکری لئے۔ ایک معمولی عورت۔ ایک نہایت معمولی شئے۔ جو صرف اپنے اردگرد کے ماحول میں اور اپنے آس پاس کے لوگوں میں رہنے سے ہی ذلیل، نیچ اور کمینی بن گئی تھی۔ اُسے ایک نہایت معمولی عورت ہونا بُرا نہیں لگتا تھا بلکہ دُنیا کی نگاہوں کی چبھن بڑی کھلتی تھی جو حقیر اور گندے ماحول میں پنپنے والے انسان نہیں دیکھتی بلکہ صرف وہ ہیولے دیکھتی ہے جن کے گرد صدیوں نے اپنی گرفت اتنی مضبوط کی ہوتی ہے کہ وہ اس گرفت کی آہنی جکڑ اور اس گرفت کی سرد مہری بالکل ہی محسوس نہیں کرتے۔

اور آخرکار مختی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس ماحول سے بھاگ جائے گی اور چار برس بعد جب رسُل شیخ کالرا کی بیماری کی نذر ہو گیا تھا تو مختی نے اپنی بچی کو گود میں اُٹھا لیا تھا اور اپنی گٹھڑی کو کمر پر لاد لیا تھا اور بھنگیوں کے اُس ماحول سے بھاگ آئی تھی۔

کہتے ہیں کوّا مور کے پَر لگا کر مور نہیں بن سکتا۔ پر مختی اس نئے ماحول میں آکر واقعی مور کی چال چلنے لگی تھی۔ یہاں آکر اس نے اُن تمام گالیوں کو فراموش کر دیا جن کی بدولت وہ اپنے علاقے میں مشہور تھی۔ ارے توبہ! مختی کی گالی سُنو اور اپنے حلق سے کڑوا کریلا اُترتے دیکھو۔ اُس نے اُن تمام گندی باتوں کو بھُلا دیا، جو اس کے ماحول نے اُسے سونپ دی تھیں۔ دِن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتی، شام کو مٹی کا دِیا جلا کر اپنے کپڑے رفو کرتی اور اللہ کا شُکر بجا لاتی۔ کمیٹی سے پیٹ بھرنے کے پیسے مِل ہی جاتے تھے۔ سو اور کیا چاہیئے تھا۔ ہاں البتہ اپنی بیٹی ساجدہ کا وہ خاص خیال رکھتی۔ وہ اُسے محلے کے باقی بچوں کے ساتھ کھیلتے کُودتے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتی—— اپنے پُرانے پھرن یا اوڑھنیاں پھاڑ کر اور دوبارہ سی کر اس کے لئے کپڑے تیار کرتی۔ اس خیال سے کہ آج کل کپڑوں سے ہی کسی کی اچھائی یا بُرائی متعین کی جاتی ہے۔

اگر مختی نے یہ سب اس خیال سے کیا تھا کہ دُنیا اس کا رُتبہ اور اس کا ماضی اور اُس کی قوم سے وابستہ باتیں بھُول کر اُسے اپنائے گی اور قافلے میں ذرا سا آگے چلنے کی جگہ دے گی تو اُس کا یہ خیال نہ صرف غلط ثابت ہوا بلکہ گناہ کے مترادف بھی۔ مختی لاکھ شریف سہی، لاکھ سیدھی سادی سہی، لاکھ اچھی عورت سہی، پر تھی ایک بھنگن ہی۔ کچرے کی ڈھیری، آخ تھو!

تعمیر

مختی نے یہ محلہ بھی چھوڑ کر دوسرے میں پناہ لی تھی۔ مگر یہاں بھی لوگوں نے اُسے بھنگن سے اُونچا سطح نہیں دی تھی۔ اس محلے میں آکر اُس نے پھر ایک مرتبہ شعوری کوشش کی تھی کہ وہ نئی زندگی شروع کرے گی۔ پچھلی تمام رنجشیں بھُول جائے گی۔ یہاں آکر دوسرے دِن سویرے ہی، جب وہ سڑک پر جھاڑو پھیرنے نکلی تھی تو اُس نے اُن تمام پنڈتانیوں کو سلام کرنا شروع کیا تھا جو مُنہ اندھیرے سے مندر میں جانا شروع کر دیا کرتی ہیں۔ اُس نے مسجد میں جانے والے اُن مُسلمانوں کو بھی سلام کر کر کے اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو کندھوں پر انگوچھے لئے، پھرنوں کے نیچے کانگڑیاں دبائے نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔

سلام بی بی جی

السلام علیکم خوجہ صاحب۔

جیسے کہہ رہی ہو، میں مختی ہوں، تمہارے ہی محلے کی رہنے والی۔ اُس نکڑ والی کوٹھڑی میں رہنے لگی ہوں۔ میں تمہارے لئے سڑک پر جھاڑو پھیرتی ہوں۔ تمہارے گھروں کا کچرا جمع کروں گی۔ مجھے دیکھو۔ مجھے اپناؤ۔ میں تمہاری نئی پڑوسن ہوں۔ مگر لوگوں کے لئے مختی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ بھنگن ہے تو کیا ہوا۔ کوئی بارسوخ آدمی تو ہے نہیں کہ جس کے آنے سے محلے کی گلیوں کی مرمت ہو جائے۔ بجلی کے سڑے ہوئے بلب بدل دئے جائیں۔ کمیٹی کے نلوں کو ٹھیک کیا جائے۔ بھنگن۔ کچرے کی ڈھیری۔ ہونہہ!

ہفتہ بھر کے بعد ہی مختی کا بھرم خود بخود کھُل گیا۔ محلہ کوئی بھی ہو، لوگ ایک جیسے ہیں۔ رُتبے کو دیکھتے ہیں، دِل کو نہیں دیکھتے۔ جھاڑو کو دیکھتے ہیں ہاتھ کی ملائمت اور نرمی نہیں دیکھتے۔ آخر وہ کمیٹی کی ملازمت تو نہیں چھوڑ سکتی ان حرامیوں کے لئے۔ اس کام کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ہاں! وہ برتن صاف کر سکتی تھی، پر اُسے گھروں میں گھُسنے کون دیتا۔ وہ کپڑے دھو سکتی تھی۔ پر اُسے پاس پھٹکنے کون دیتا۔ وہ لپائی کا کام کر سکتی تھی، پر اُسے ہاتھ لگانے کون دیتا۔ بھنگن۔ سات پُشتوں سے بھنگن۔ جس کا دِل کچرے کی ٹوکری میں اور دماغ جھاڑو کی تیلیوں میں ہونا چاہیئے۔ اب اگر کوئی سرپھری ہنس کے پَر ڈھونڈنے لگے تو اس میں دُنیا کا کیا قصور۔ خود اُس کی بے وقوفی کی علامت ہے یہ۔

چلتے چلتے مختی کو اپنا دِل بیٹھتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اب بہت تھک چکی ہے۔ نڈھال ہو گئی ہے۔ اُسے ساجدہ کا خیال آیا، جو اب جوان ہو چکی تھی اور نیند میں بڑبڑانے لگی تھی۔ بدبخت لڑکی۔ پیدا ہوئی

اور وُہ بھی میرے گھر میں، جہاں بیٹی بیٹا تو کہلائی جا سکتی ہے مگر بٹیا رانی نہیں۔ ساجی! اب میں تیرے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ تمہارے خواب اب بِک نہیں سکتے۔ تمہارے پَر اب نوچ لئے جائیں گے۔ تمہاری زبان پر گالیوں کی دبیز تہہ چڑھ جائے گی۔ بھنگن کی اولاد سات پُشتوں کے بعد بھی بھنگن کی اولاد کہلائی جائے گی۔ لے اب سنبھال اپنے مقدّر کی ٹوکری اور پھیر جھاڑو اپنی مانگ کی سیدھی لکیر پر۔ اس سے پہلے کہ تجھے تمہارے باپ کی طرح، تمہارے ماحول کی طرح، اس ساری دُنیا کی طرح تم سے بھی نفرت ہو جائے۔

چلتے چلتے اچانک مختی کو ایک بار پھر قادر گنائی کے لونڈے سلاما کی بات یاد آ گئی۔ اور ساتھ ہی معدے کے پیندے سے ایک گالی اُبھر کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ پر اُس نے اس گالی کو روکا نہیں۔ کیوں روکے کوئی۔ کیا فائدہ ہے روکنے میں۔ میں کہوں گی۔ کہوں گی۔ سَو بار کہوں گی۔

سات خصموں والی میا کا پوت۔ سُور کی اولاد —— کُتیا کی نسل کا حرامی پلا۔ لے، ابھی اور لے۔ حرامی نے کس ڈھٹائی سے صبح ہی صبح کہا تھا:

"سنبھل کے چلا کر۔ اندھی ہے تو؟ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں تمہاری جو میری ٹوپی کو چھوا ہے تم نے۔ مُردار کہیں کی —— "

غلطی سے ٹوپی کو چھوا تھا تو کسی سانپ کے پھن سے تو نہیں چھوا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہ بولی تھی اُس وقت۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ ایک میں ہوں جو اپنی اوقات بھول گئی ہے، وُہ تو نہیں بھولا ہے۔ اُس نے سوچا تھا —— مگر اب اس کے دل ہی دل میں آگ کے ایک ریلے نے سر اُبھارا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلکان کر رہی تھی۔ کوّے کو لاکھ صابن سے نہلاؤ، اس کا رنگ کالا ہی رہے گا۔ آج اُسے پُوری طرح اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ہار گئی ہے۔ اور اب مزید جدوجہد کی تاب اس میں باقی نہیں رہی ہے۔ اُس نے پھر سے نئی سڑک کی وہ مختی بننے کا فیصلہ کیا جس کی نمکین، ریشمی، زہریلی گالی سُنو اور اپنے حلق سے کڑوا کریلا اُترتے دیکھو۔

یہ فیصلہ کر کے تیز تیز قدموں سے وہ گھر میں داخل ہو گئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے دو روپے کا وہ میلا کچیلا نوٹ باہر نکال لیا اور اُسے اُنگلیوں میں پکڑ کے کھٹاک سے دونوں پٹ کھول دئے۔

"لے ساجی! قادر گنائی کی دُکان سے جلدی ایک سری لے آ —— اور ——"

مگر وہ اپنا جملہ پُورا نہ کر سکی۔ اللہ! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے آنکھیں جھپکا کر پھر دیکھا۔

سامنے قادر گنائی کا لونڈا سلاما ساجدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اُسے ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

مختی کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ یکایک ایک گالی اس کے اندر سے اُبل کر لبوں تک آ گئی —— اور لبوں پر آ کر منجمد ہو گئی!

ہیمال ناگرائے

(صفحہ ۴ سے آگے)

ہیمال سے شادی کرنا چاہی۔ اُس نے ناگرائے کو مروا ڈالا۔ لیکن ہیمال اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہو گئی۔ ان دونوں کی راکھ کو جہاں پھینکا گیا وہاں ایک کدو کی بیل اُگ آئی جس میں ایک نیا جسم لے کر ہیمال اور ناگرائے پھر سے نمودار ہوئے۔

ہیمال اور ناگرائے کی کتھا ہر کشمیری جانتا ہے اور صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلتی آئی ہے۔ ہمارے لوک ادب کو بھی اس کہانی نے کافی مالا مال کیا ہے اور اس کے بڑے حسین استعارے ہمارے گیتوں کو رونق بخشتے ہیں۔ ولی اللہ متو نے اسے مثنوی کی صورت میں قلمبند کر کے زندہ و جاوید کر دیا ہے۔ دینا ناتھ نادم نے اسے اوپیرا کی شکل دے کر ۱۹۵۵ء میں سٹیج پر پیش کیا۔ اس کی دھنیں اور گیت مقبول ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

لٹریری فورم ۔۔۔ ایک جائزہ

ادیبوں کے اجتماعات سرینگر کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں بلکہ آج سے چند سال پیشتر اس قسم کی محفلیں بڑی باقاعدگی کے ساتھ انعقاد پذیر ہوتی تھیں۔ جن میں چند ادیب اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے جن پر ہر کوئی شریکِ محفل اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ادیب اور قاری کے درمیان ایک بہتر تفہیم کو وجود میں لانے کے علاوہ ادب کی رفتار کو تیز کرنے کے سلسلے میں بھی ایک مؤثر ذریعہ بن گیا تھا۔ مگر پچھلے چند سال سے اس قسم کی محفلوں کی روایت ختم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہوگئی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ ایک ادیب کو اپنی کوئی نئی تخلیق سنانے کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ یا تو چند دوستوں کو ہوٹل میں لے جاکے چائے کی پیالی سے اُن کی تواضع کرنے اور اُس کے بعد اُنہیں اپنی کہانی یا مضمون سنائے بلکہ بعض حالتوں میں تو بعض دوست اپنے گھروں میں طعام کی چھوٹی چھوٹی تقریبات منانے پر بھی آمادہ ہوجاتے تھے۔ جہاں اُن کی تخلیق بعض سخن فہموں کے سامنے پیش ہوسکے۔

کشمیر کے کلچرل آفیسر جناب شمیم احمد شمیم مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کرلیا۔ چنانچہ ادیبوں کے لئے ایک جگہ مِل بیٹھنے جہاں وہ آزادی سے تخلیقات پر بحث کرسکیں کے لئے اُنہوں نے لٹریری فورم کی بنیاد ڈالی۔ شعبۂ ثقافت کے دفتر میں واقع ہال اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہاں ہر جمعے کو ساڑھے پانچ بجے ادیب دوست ایک مجلس منعقد کریں اور وہاں پر بغیر کسی لسانی تفریق کے ادیب اپنی نگارشات سُنائیں۔ اس سلسلہ کا ابتدائی اجتماع ۹ اپریل کو جناب شکیل الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں یہ اصحاب موجود تھے:۔ پروفیسر جیالال کول، شمیم احمد شمیم، بنسی نردوش، تیج بہادر، شانت، ہری کشن، ناجی منور، حسرت، چمن لال ہکو، فرحت گیلانی، نور محمد بٹ، غلام محمد مشتاق، غلام نبی شاہ، وید راہی، اختر محی الدین، محمود حسن بدخشی، چمن لال چمن، موتی لال جیل خانی، ستار احمد شاہد، غلام محمد دلشاد، امیش کول، نشار، دیپک کول، مہندر شرما، موہن لال نراش، مکھن لال بیکس، پران کشور، پریمی، علی محمد ون، محمد یوسف ٹینگ، ششی شیکھر توشخانی، اوتار کشن رہبر۔

کلچرل آفیسر جناب شمیم احمد شمیم نے اس سلسلے کے تعارف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اس کا مقصد ادیبوں کے تال میل اور ادیب اور قاری کے درمیان مفاہمت کی بہتر فضا کو پروان چڑھانا ہے۔ پہلے اس قسم کے اجتماعات منعقد ہوتے رہتے تھے، مگر چند برس سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ اسی لئے محکمہ اطلاعات کے شعبۂ ثقافت کی طرف سے یہ سلسلہ شروع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ یہاں ہر جمعے کے ساڑھے پانچ بجے یہ محفل باقاعدگی سے منعقد ہوتی رہے گی اور یہاں کوئی بھی ادیب ہندی، اُردو، کشمیری، پنجابی یا کسی دوسری زبان میں نظم و نثر کی کوئی بھی تخلیق پیش کرسکتا ہے، جس پر آزاد اور بے تکلف فضا میں بحث و مباحثہ ہوا کرے گا۔ البتہ میری دانست میں سب کی سہولت کے لئے بہتر رہے گا کہ اگر مباحثے کی زبان اُردو رکھی جائے۔ شمیم صاحب کی اس تجویز سے ساری مجلس نے اتفاق ظاہر کیا۔

محمد یوسف ٹینگ کو فورم کا سیکرٹری چُنا گیا۔

اس کے بعد چمن لال چمن نے جو پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ٹی۔ بی سینی ٹوریم ٹنگمرگ میں زیرِ علاج رہنے کے بعد پہلی بار کسی ادبی اجتماع میں شرکت کر رہے تھے، اپنی کشمیری نظم سُنائی۔ نظم کو کافی پسند کیا گیا۔ ان کے بعد وید راہی نے اپنی ہندی کہانی "گرم ہاتھوں کی ٹھنڈک" سُنائی۔ جس پر کافی بحث ہوئی اور جسے مجموعی طور پسند کیا گیا۔ مکھن لال بیکس کی کشمیری نظم "ورق ورق" پر بھی تنقید ہوئی۔

۵ رمئی کو دوسری نشست سری امر ناتھ دولی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس اجتماع میں ایجنڈا کے مطابق غلام نبی خیال نے اپنی کشمیری نظم "میون حسن چون عشق" سُنائی۔ نظم بعض لوگوں کو بڑی پسند آئی اور بعض دوستوں نے اسے روایتی قرار دیا۔ ششی شیکھر نے اپنی ہندی نظم "ایک خوبصورت دن" سُنائی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ اختر محی الدین نے اپنا کشمیری افسانہ "آین ہور جنگ" سُنایا۔

جس پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث و تمحیص ہوئی۔

تیسری میٹنگ جناب محی الدین شال کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ سب سے پہلے ہری کشن کول نے اپنی ہندی کہانی "داؤں" سنائی جسے مجموعی طور ناپسند کیا گیا۔ ناجی منور کے کشمیری قطعات "مس کھاسو" پر متضاد آراء کا اظہار کیا گیا۔ بنسی نردوش کی کہانی "بھگوانس سند سروپ" بھی طویل بحث و مباحثہ کا موضوع بنی۔ مگر اس بات پر سب نے اتفاق ظاہر کیا کہ کہانی میں گرفت موجود ہے۔

اگلی نشست کی صدارت صوفی غلام محمد نے کی۔ سب سے پہلے رتن لال شانت نے اپنی کشمیری کہانی "کسر تہ کھوچر" سنائی۔ اس کے بعد اوتار کشن رہبر نے اپنا کشمیری افسانہ "بہ کالج کور" سنائی جس پر بڑی مختلف آراء سامنے آئیں۔ اس نشست میں موہن لال نراش نے اپنی ہندی نظم "کہانیاں اور اتہاس" سنائی یہ نظم اُن محدودے چند تخلیقات میں سے ایک ہے جنہیں بزم نے یک زبان ہوکر سراہا اور جی کھول کر داد دی۔

۲۷ مئی کی نشست کی صدارت کے فرائض شری اُمیش کول نے انجام دیئے۔ ابتدا میں چمن لال ہکو نے اپنی کشمیری کہانی "شینہ ہینو" سنائی۔ کہانی پر چند آراء ملاحظہ ہوں :۔

شمیم :۔ یا تو یہ کہانی میری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کا کم ہی اندیشہ ہے یا یہ کہانی بن نہیں پائی۔ کہانی کار کوئی چیز پیش کرنا چاہتا ہے مگر تکنیک پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے اُلجھ گیا ہے۔ کہانی کے کردار جیتے جاگتے لگتے ہیں۔ مگر اُن میں تعمیر کا احساس مفقود ہے۔ نوخیز افسانہ نگار کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے زیادہ ریاض کرنا ہوگا۔"

اُمیش :۔ میں اس کو ایک نہایت سنجیدہ اور جدید طرز کی کہانی کہوں گا۔ جو دِل خراش بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ کہانی کار نے اس میں جو IRONY پیدا کی ہے وہ بڑی متاثر کُن ہے۔ خامی یہ رہ گئی ہے کہ کہانی کے مرکزی کردار کو کہانی کے باقی واقعات اُبھرنے میں مدد نہیں دے سکے اور اسی لئے کہانی کمزور پڑ گئی۔"

رشید نازکی نے، جو خاص دعوت پر بانڈی پورہ سے تشریف لائے تھے، اپنی کشمیری نظم "یہ کیاہ؟" سنائی۔ یہ نظم ایسی دوسری چیز ہے جسے محفل نے یک زبان ہو کر سراہا اور پسند کیا۔ اسی محفل میں ہریش بھاردواج نے چند اُردو غزلیں اپنی دِلکش ترنم میں سُناکر داد حاصل کی۔

۳ جون کے اجتماع کی صدارت شری بنسی نردوش نے انجام دی۔ ایجنڈے کے مطابق امیش کول نے اپنا اُردو افسانہ "تین قدم، تین موسم" سُنائی۔ چند آراء درج ذیل ہیں :۔

بنسی نردوش :۔ میں اس کہانی سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی جوانی ڈھلتی جا رہی ہے۔ کہانی کار نے اس اُلجھن کو جس نفسیاتی باریکی سے پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ کہانی ہر لحاظ سے ایک مکمل فن پارہ ہے۔

شکیل الرحمن :۔ میرا خیال ہے کہ یہ ڈھلتی جوانی کی نہیں بلکہ عمر اور ذہن کی کشمکش کی کہانی ہے۔ عمر کے ساتھ جذبات گھٹتے یا بڑھتے نہیں ہیں۔ اس مختصر سی کہانی میں عورت کی نفسیات کے ایک باریک گوشے سے نقاب اُٹھایا گیا ہے۔ نقطۂ عروج کافی واضح ہے اور کہانی عنوان میں جذب ہوکر رہ گئی ہے۔

اس کے بعد صوفی غلام محمد نے اپنی کشمیری کہانی "ہہدہ بب" سُنائی۔ کچھ آراء ملاحظہ ہوں :۔

جمیل خانی :۔ مجھے یہ کہانی پسند آئی۔ "ہہدہ بب" کا کردار بڑے بھرپور انداز سے پیش ہوا ہے۔

شال :۔ مجھے کہانی پسند نہیں آئی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص تقریر جھاڑ رہا ہو۔

رہبر :۔ یہ نہ تبصرہ ہے نہ تقریر۔ اچھی کہانی ہے، البتہ انجام میں کردار کی تلخی پورے طور نہیں اُبھرتی۔

نور محمد بٹ :۔ اس کہانی میں فقط موضوع ہی موضوع ہے۔ فنی پیکر اُس کا ساتھ نہیں دے سکا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ :۔ کہانی کو بےجان کہہ کر انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نوکر کے احساس کو ایک سماجی حقیقت کے پس منظر میں فنی دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں کہانی میں کچھ ڈھیلاپن آگیا ہے۔

طوالت کے خوف سے ان صفحات میں بحث و مباحثے کی تفصیل کا سمانا ناممکن ہے۔ مگر جس طور پچھلے دو ماہ سے یہ سلسلہ جاری رہا ہے، جس طور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے اور جس انداز سے تخلیقات پر تنقید ہوئی ہے اس کو زیرِ نظر رکھ کر یہ توقع رکھنا عبث نہیں ہے کہ یہ فورم نہ صرف ادیب اور قاری کے درمیان تفہیم کا ایک مؤثر وسیلہ ثابت ہوگا بلکہ یہ کہ [illegible] ادب کی ترویج کے سلسلے میں اس طرح سے کافی مدد مل سکے گی۔

ژٕ تہٕ بٔہ

ژٕ چھکھ تہٕ حوٗر یِرادٕچ چھےٚ عاشقن ہمدم
بہٕ چھُس تہٕ کارِ دوگنٕ عالمُک ژیٚنۍ کُن سرخم
ژٕ چھکھ تہٕ نوٗرٕ صوٗرت رَو رنگاں چھُے جامہٕ گُلن
بہٕ چھُس تہٕ نارٕ الاوس ریٚہن گِندان شبنم
ژٕ چھکھ تہٕ پوشہٕ نفرین پیٚٹھ مژر وناں بُلبُل
بہٕ چھُس تہٕ ساز غلافن اندر نالاں سرگم
ژٕ چھکھ تہٕ عالمُک میزاں چھُے برقرار تمام
بہٕ چھُس تہٕ شوخ بغاوت چھےٚ زِندگی سرہم
ژٕ چھکھ تہٕ رُوح سجِد وٗنی دِداں چھُے دلدارس
بہٕ چھُس تہٕ مسندٕچ شاہی تمام سفرکۍ صدم
نِصف شبن میٚنہٕ گیمُت ناٹکی چیاٗنۍ سُنبُل موے
جوان چشمہٕ اچھی نیندرِ تارکن میٚنہٕ دِژم
سینزٕ سوقہٕ میٚنہٕ اگرسنگ ژٕ دُٹھ تہٕ اختابن
نیالہٕ چانہٕ وَتن بَر نہٕ آیہٕ گاشہٕ ہلم
یوتام چوٗن ژندن بوٗہ میٚنہٕ کاشرادہ دِلس
بنے داغ میٚون تخیل بنے لاگ میٚون قلم
یوتام میانِ فنچ یادہٕ گی چھےٚ چانۍ سپر
غلام چوٗن چھُ عالم، بُلند چانۍ علم
ہمیشہ تازٕ ازل تاگرزِ یہٕ چانۍ نظر
نصیبہٕ روزہ ہن یتہٕ مسراپہٕ میانۍ قدم

زٕ غزل

دینا ناتھ نادمؔ

مُہ تھاوکھُٹۍ کھُٹۍ ژٕ جام ساقی، ژیٚ ییتۍ چھُ واراہ حساب باقی
میٚہ خوٗنِ دِل از سیٚٹھاہ چھُ چیوٚن کیوٚت، ژٕ رچھ نِگاہ کیوٚت شراب باقی

گمُت گلاٗن اُچھن چھُ بیچھ پھیوٗر تہٕ سُنبلن پاٗرہٕ زان ڈٕجہِ ہرٕ
چھُنہٕ غنیمت چھُکنِ نیٚبر زِل بُمِس اُچھن دٕ نہٕ چھُ آب باقی

یوٚتام میٚہ جگرس الاو قایِم، یوٚتام میٚہ چشمن جلاو قایِم
توٚتام میٚہ آبس اثر شرابُک، توٚتام ژیٚ رویس گلاب باقی

ژٕ یلہٕ تیٚلۍ اکھ، بہٕ پوش لاگے، بہٕ آلوے پوشہٕ نوٗلہِ سزٕ لے
بہٕ سونت دۄدٕ گوٚژھ نہٕ زانہہ تہٕ سوٗرن، میٚہ خوابہٕ روزہِ خواب باقی

خبر ژیٚ مایاد چھُوی سہٕ دوہ یلہٕ میٚہ یاد پیوٚہم سوال کوٚرمے
اُچھو وَنیوتھم ژیٚ حال واراہ، وُڈھو تھوٚویوتھم جواب باقی

ژیٚ چھُوی کُنن کُنہٕ! نقد دِمے زُ تہٕ جان، دِل یا جگر ژٕ منگہم
مہٕ وُچھ ژٕ میانین چھُنین اتھن کُن، مہٕ تھو نِگاہ پیٚٹھ حساب باقی

یہِ لولہٕ چھِ زیٚٹھ وَتھ قیامت، نہٕ تمِ ہیٚنس دَم دِنس نہٕ مُہلت
قدم قدم انقلاب جگرس، نظر نظر اضطراب باقی

گلالہٕ رنگہٕ نادِمس چھُ شعارن، گُلاب چھِ بوے تس خیالن
شُگفتہٕ ژھیٚنتہٕ تس اِرادٕنۍ وُچھ، چھُ یادنُک آب و تاب باقی

رشید نازکی

دیوانہٕ دارہ کیاژٕ چھُکھ مُضطر تہٕ ییتھ بےتاب
تابندہ گہرسٕ درہ نِشہٕ ژھینٚہ گو بنیوٚد باتاب

میانیوٚ خیالوٚ راتٕ راتس تارکن دِیوٚت تاب
سحرن مگر اشہٕ دانہٕ سدرے پھٹۍ تہٕ گے غرقاب

بے شک چھُ حُسن کاینٚاتس یوٗسفاہ دِیوٚتمُت
عشقس تہٕ پُرٕ ژھتوٚ کیٚژہ زلیخایہِ گیہِ بے خواب

ستہ سااسی رنگ زُٹی یاونن ییٚنہٕ پرتَوٚ چون ییٚو
یُژی یاٗژھی از فردوس نظرِ عالمِ اسباب

دِل جلوہ گاہِ شاہدِ مقصود بنۍ تیٚلۍ!
یلہِ چشمہٕ ہارن خوٗنِ جگرُک گوہرِ نایاب

یُس چانہٕ دُوریٚہ اسہِ شمع چانہٕ ییٚنہٕ پوٚنپرٕ
تس خستہ جانس کیاہ کرن ناصح تہٕ بیٚیہِ احباب

ییٚنہٕ چانہٕ ملک شورشہِ پیوٚ مستانہٕ چون میوٚن
دوہ بدیوٚ زن بیٚیہِ خاکہِ منزٕ مس لالہ سیراب

ضد بے کمالی میانی شاید آس کمالس
چھُم کاٗملن کُن عرض یِی بیٚیہِ از لِبعد آداب

مستانہٕ پاٗٹھین یُد یکُن چھُوی لولہٕ جہانس
رٹھ خیر تگ دامن مہٕ نم ہیٚچھ نازکین آداب

دیپک کول

چوکہ دآر

راتچ کتھ۔ پتہ یوس مُژکری ہِن پانہٕ دآژ سپز سوہ آس وُنہ تہ پھوتسی تل۔ توتہ کوز امہ واریاہ تاب، نتہ کیاہ چھُ، یژھنی کتھن پتہٕ چھُ فساد نوان۔ دپہ یہ کونہ ہیٚنی جان گژھتھ تہ کوڈُن نہٕ اُزی چون ہِش ہے آسہ ہیٚس، دپہ ہیٚس گژھ ژہ تہ پانس تہ پُہ تہ پانس۔

یلہ للس سہ راتک محنظرہ اَچھن ذرنیٹھ مالن یوان اوس تمِس اُسہ تیرہ کُنڈو دوہقان۔ بیٚیہ تہ یلہ وارہ پاٹھو زٔنتھ دِتھ کینژن بیٚین کتھن تہ راتچ کتھ سیتو واٹھ لگان باران اوسُس اَمِس اَس پننس رینس پتہٕ پژھ پھٹان، سیتھ ڈلان تہ ژکھ کھسان۔ پتہ اُس یل دِتھ اَمِس کُن نظر کرِتھ اَمِس وُچھنا کران، زن نا دَپان آسس۔ "وُچھ کِتھ پاٹھو چھُوی نشرِ پہ راوُن تگان۔ یہ تہ گژھ تگُن۔ بہتھ چھکہ تتھ پاٹھو زن زُون ناچ زُون زانکھ— پتہٕ چھکہ بے نسکہ کران۔ نہ وُچھ۔۔"

تلس اُس نہ وونی تیٚژھاہ ژکھ اُمیٚندین کارن پتہٕ یژھاہ زن اُمیٚندیس دِرکہ ژمس پتہٕ آسہس۔ توَے اُس سوہ راتک آدلیک شرارت مشراوتھ پننین خیالن پھیور دِتھ سونچان۔ خبر کیاہ رود اَمِس! یہ زن اوس نہ یتھ کُس نیک پور ژاس۔ کمہٕ کھیو براَرو ژھیوٹ۔ پتھ دیُن لایق رُود نہ۔ پیٚشتھ کُڈنس پُہ تہ دلہٕ۔ میہ زانہ ہے نہ ناد کانہہ، وونی زانہم سارِی۔ وونی آتھ بلاے ساریہی۔ یہ وُچھتہ بخیلن کو سہ مسخ صورت چھس گامژ۔ کانہہ دپہ خبر گاژھا کاش چھن کرہ مژہ۔ کتھ آیہ یم وندنہٕ اُمیٚندسی

پانس۔"

پننہ سیزرہ کنز اوس نہ للس یتہ بہان زہ تمُسند رُودن کیاہ چھُ تُوتاہ ناکارہ یُوتاہ زن شہ رات مادھو کاکنیو تہ تہندیو دانگجو منز مارکس بنوو۔ تہ کیازہ نیتھرہ پتہٕ ازتام زانہ بے نہ سو اُمیٚندہ رنگہ کانہہ تژھ کتھ، یتھ پتہٕ زن دندس تل اُڈنگج پیہے بیٚینہ۔ یی یاد پتہٕ اوس للس اَندری تیلہ تلیوُن ہیو لگان۔ تہ سو آس اَمِس وُچھتھ بیٚیہ وُچھان کینژھاہ امہ سنجو زہ یہ تہ وچھنا تہ اُچھو میلہ ہن۔ مگر تم تہ وُچھنس نہ کینہہ تہ للس تہ رُود نہ پانس اتھ۔ سو وُژھس اَکھتی ماکھتی ذرکہ بے نا دِتھ۔ "مایا رامنز نوش تہ آسہ ہے یتھے کنز بہان۔"

موہن لالس زن لیُچ ہش اُمنز ہ کتھ۔ تمُو وَونُس کمہ تام ہِشہ۔ "گژھ گژھ مالیوُن ما چھُوی گژھُن۔"

للس لوُگ چَس تہ وُژھس۔ "کیازہ گژھہ مالیوُن۔ بُہ کتہ گژھس زوودِ ہندِہ خاطرہ زُنٹ نالہ کڈُن داجیٚن۔ تمہ گیہ تمَے۔"

موہن لالس کھُژ بیٚیہ ژکہ ہِش تہ تمُو وَونُس بڈہ ہِشہ۔ ہیٚوتھ بیٚیہ یی ونُن۔ نہ چھے خبر کینہہ نہ چھے اَتر کینہہ۔ بلو چھک مَردو پاجامن زنگہ ژھنان۔ کنہ ژہ گیکھ اَمِس مادھو بیٚچھنین کزیکن کُن۔ بُہ نے وُژھرِ ہے مُکرہ ترادہس کرِتھ۔ بیٚیہ وُچھ ہا نہ تہ یم زامترو۔ یم اتہ کرایہ چھن تھاَدو ہتو تم کیاہ کرہ ہانس۔ اَمِس دِلس چھنہٕ پننہ عقل رُوزمژ۔ لُوکہ کتھن گژھان۔ پتہٕ کیاہ وَنتھس پہ کھنہ دمہ آلو۔ میہ گوس صرف اکھ لحاظہ۔۔۔"

"سۆوی لحاظہٕ چھُ بوڈ لحاظ۔" للن وۆننس ٹیپ ژٹان۔

"بُستے تی ونان چھس۔ گر ژٕ مۆتہٕ آستہٕ زیادٕ کتھہٕ کران۔"

موہن لالن وۆننس دزان دزان ہیوٚ۔ للس باسیوٚ موہن لالس ہیوٚتُن بیٚیہٕ شرارت کرُن تہٕ تمہٕ وۆننس نیچ بدلاوِتھ۔ "تو تہٕ گیہٕ کتھاہ۔ پوٚز پوٚزوۆنوٚہ۔ ٹھیک چھُ، لحاظہٕ چھُ اُچھن دوان، تمہٕ میلن بیٚیہٕ، چوکہٕ دارہٕ کنٕز، از ہٕ پگاہ، آخر بُسن چھُ یِتی۔ ٹھیک ٹھیک تہٕ چھُ سونچُن۔ بیٚیہٕ تہٕ کرُتھ اندریوٚم شرنیہ، تتھ کیاہ سپدِہ۔ بہٕ زن پیوٚ اُمسندِس ماگسی تادن، نتہٕ کیاہ، دوہٕ ذ یلہٕ وُچھوٚن اُمس پزٕ ہے توہہٕ سالِہین تہٕ نگاہ کرُن۔ خیر۔"

موہن لال ہیوٚتُن بیٚیہٕ اُمسندیوٚ کتھو سیتو پسرٕ یوان تۆسے دوتھس سٕ وۆننس۔ "ژٕ یہٕ چھُہی دوہٕ ذ یوٚہوی تیوٚل۔ بہٕ کیاہ کرَے اتھ۔"

للس لجٕ اُمسنزٕ یہٕ کتھ سخت تہٕ تمہٕ دِتُس جواب۔ "تیوٚل پیوٚہ اُسی۔ ادسُس نئے تیوٚلوٚی پیوٚمت تیٚلہٕ ما آسہٕ ہاکنس سانہٕ چوکہٕ دارہٕ کُن اُچھ دِرہ لگان۔"

موہن لالس باسیہٕ للنہٕ یہٕ کتھہٕ بیٚیہٕ راتچے ہشہٕ۔ سُہ وۆتھس کتھ ژھوٹ راوان۔ "کیاہ چھک بُہ کران؟۔ ژٕ یہٕ وۆنوُی، کتھ چھنہٕ تہٕ یہٕ زن ژٕ سمجھان چھک۔ ژٕ سونچ تہٕ بانٔے۔ اگر تی آسہٕ ہے تیٚلہٕ اوسا مینہٕ ژٕ سے نقی کرُن۔"

للس ووت بیرِس پینٹھ ہیوٚ تہٕ سو وُزھس۔ دیان چھکہ ژٕ سے نقی اوسہٕ کرُن۔ یا مینہٕ اڈسے نہٕ روزِ زانہہ۔ ننہ کھسہٕ ہن ترٲوِتھ ژٕ یہٕ باقی۔ صُبح شام اوشکھ اتھ چوکہٕ دارہٕ پینٹھ بہان۔ بہٕ اُسس گژھہٕ لجہٕ آسان۔ تہٕ مینہٕ نقرٕ کنٕز اُسوٚہ جورٕ ماران۔ بیٚیہٕ ونان ژٕ سے نقی اوسہٕ کرُن۔ امہٕ کھوتہٕ کیاہ گژھک دوہٕ ذ کرُن۔ ہونہہ۔ گاشنہٕ دُری اگر مینہٕ دوہٕ ذ ژٕ یہٕ پینٹھ اکھ رژھ ژٕ ھ روز۔ پینٹھہٕ چھکہ ییتھ پاٹھو کتھہٕ کران۔ مندٕ چھہ۔"

للہٕ ہین ہین کتھن توٚگ نہٕ موہن لالس کانہہ جواب دِیُن۔

یہس ینہٕ پینٹھہٕ یم کانٛی پینٹھ کھوٚت، موہن لالن اُمس سیٚتے چوکہٕ دارٕ ژٕ ٹھہٕ۔ اُمِس اُمس امہٕ دارٕ ہنز پوٚت کل ترژھ گینزٕ زٕ منزٕ منزٕ اوس سُہ دفترٕ تہٕ شلی یوان۔ لاژ ایے نہٕ چوکس کنہٕ تہٕ اُمِس اُمس دارٕ منزٕ تاپنگج تیران۔ ہیتہٕ یوٚتامت نہٕ ہیتہٕ وتہٕ کمیتھ کلی دارٕ اُمسنہٕ دوان۔ یہٕ ماجہ ہند گوبرٕ تہٕ اوسُس نہٕ اتھہٕ حرکت کران۔ للس اوسنہٕ پننہٕ سٕنزرٕ بھاوٕ کنٕز رات تام تہٕ یہٕ فکرٕ تران زٕ یہٕ کیہٕ مارہٕ مۆتہٕ اوس اتھ چوکہٕ دارہٕ پینٹھ بہان۔ نتہٕ آسہٕ ہے تمہٕ اُمِس یہٕ پوٚت کل مُشراوِنچ کانہہ سبیل کرٕ ہٕژ۔ کینہی نئے تہٕ مادھو کاکنہٕ گھر واجنہٕ آسہٕ ہٕنٛزٕ کانہہ ہمسایہٕ بایہٕ اتھہٕ شینچھ نقاوہٕژ زٕ کورِن ہی گژھہٕ راچھ کرٕ ژ۔ زمانہٕ چھُنہٕ جان تمِس ترٕ ہے پانٔے فکرٕ تہٕ از پیٚیہ ہے نہٕ ییتھ پاٹھی کتھ مجلس پینٹھ۔ مگر یہٕ چارٕ۔ امہٕ ہیوٚکھ نہٕ رات تام تہٕ کینہہ ژ ینتھ۔ بیاکھ کتھاہ تہٕ اُمس، سو زن گیہٕ یہٕ زٕ للس اوس پانس موہن لالُن اُتھی بہن خوش کران۔ تمِس اُمس اُمسندٕ ہیٚنہٕ سیتو وتھ ہش زن یوان۔ تہٕ کرُتھ تہٕ اُمس سو منزٕ منزٕ ٹھٹھہ ہانہٕ کران بیٚیس کُن ونان۔ "گژھو بہو کٹھہٕ پانس۔ ییتھ بہتھ کیاہ چھوٚہ کران۔ ادرٕ آسے بیہہ کانہہ، سُہ کیاہ ونہٕ۔ دیہٕ نا اُمِس کیاہ سام روو زمانہٕ بغیر چھُس نہٕ پینتس وار یوان۔" موہن لال تہٕ اوسُس ٹھٹھس منزٕ کران ونان۔ "ونتہٕ۔ تمہٕ سیتہٕ کیاہ گو۔ بیٚیہٕ تہٕ کرِتھ اپُز چھا کینہہ۔" یہٕ بوزِتھ اُسو للس بوکہٕ ہنان، مگر نبرٕ یہٕ بانٛز دِتھ اُسس ونان۔ "توہہٕ چھوٚہ زیادے اکیٚر گیمتو۔" موہن لال اوسُس اتھ پینٹھ اسنہٕ ہانہٕ کران۔ مگر از اوس للس تمن سارِنی کتھن منز ییچھرتہٕ ژاچھر باسان۔ از اوس اُمِس پورٕ پاٹھیٚن فکرٕ تران زٕ موہن لالنہٕ تمہٕ ہیچھہٕ میچھہٕ تہٕ مایہٕ بھرٕ ژٕ کتھہٕ آسہٕ نہٕ اُمسندٕ خاطرٕ بلکہ آسہٕ تمہٕ اُمِس لاگتھ اپور مادھو کاکنس گھرس کُن ونہٕ یوان۔

مادھو کاکنٕز نو لرٕ اُس تمُنزٕ پرانہٕ لرٕ سیتی تہٕ اہنزٕ سٕیوٚ سیوٚد۔ منزٕ اوس نزدیک زمینہٕ ٹکرٕ، یُس زن سارِنی ہند

آئن اوس۔ یتھ سیدِہ آسنہٕ موجب اُس یِمن پانٕہ واُنۍ اورِہ یور ٹھیک پاٹھۍ نظر۔ بگارِہ مُشک تہٕ لیچہِ ہُند ژھین تام اُسۍ یِم اورِہ یور یوان۔ یِنہٕ پیٹھہٕ موہن لالس ماگ موییہٕ، تِنہٕ پیٹھہٕ اوسُکھ نہ دوہۍ زیادِہ یُن گژھن پانٕہ واُنۍ رُودمُت۔ گرٕ ہمسایہٕ آسنہٕ کِنۍ اُس وُنہٕ تہٕ یِڑہ دوہہ، تُکہٕ دوہہ اکھ اکس تاہرِ پھوٗل سوزان۔

مادھو کاکن گھرِ اوس ساری مجلس منز جان گرمستی لمرِ مانیہٕ یوان۔ لشن لبشن، نوشہٕ، کورِہ، یُن گژھن، آزرتھ ماُزرتھ بوزو سے تہٕ حسابی اوس نہ مادھو کاکس تنخواہ زیادِہ کینہہ۔ مگر دیان سنہٕ اوس مہاراجہٕ سِندِس پرائیویٹس منز رُودمُت، یتہٕ تمۍ زُود لمو۔ توٚے اوٚنس مجلس منز تہٕ کافی بوش۔

مادھو کاکن اوس موہن لال پانٕہ واریاہہ لٹہٕ اتھ چکِہ دارِہ پیٹھہٕ بہتھ وُچھمُت۔ تہٕ کمنہ دمہٕ اوس اوس سُہ دوہۍ کوندہ مٹاسنہ دانٕہ بجایہٕ اتھو دارِہ پیٹھی سمکھان۔ راتھ ستھنس تام اوس بہٕ ژرِ پاٹھۍ اورِہ یور چلان تہٕ راتھ منزِس بدلیہ حالات، یلہٕ زٕن، مادھو کاکن ہنگہٕ تہٕ منگہٕ اپارِہ پیٹھہٕ کرکیاہ لاُی۔

"ہیا دوپہے ہا موہنا، ژہ کینہو اتھ دارِہ پیٹھہٕ ژونہِ۲۴ گھنٹہٕ کران آسان؟"

موہن لال گو یہٕ بوزِتھ ہے بنگہٕ ہیوٗ تہٕ ووٚنُنس۔ "کیاہ ساکیاہ؟ وُچھ کیاہ چھُہ ونان اورِہ۔ کیاہ ساکیاہ۔ زن نہ زانی کینہہ کولس، بدمعاش دلہٕ۔ اژہ نہ اندر۔"

موہن لالس توژ فکرِہ۔ تہٕ سُہ ووٚتھس۔ "بہوٗ بہوٗ بیچھا، یتہٕ پاٹھۍ اُس زِہ نہ کرِیکہٕ دِوان۔ کُنہٕ وقتاہ یکہ دارِہ کِنۍ لاینہٕ — اژھ اندر —"

مادھو کاکس کھوت جہل۔ مگر موہن لالن تہٕ وُچھنس نہ کینہہ گژھن۔ کتھو تژیو سیتو ژونن اندر۔ للہٕ اُس اتھی تمِس گژہٕ واُلنہٕ سخت ڈیہ ساسے۔ سو اُس ہیِنس پنِنۍ کِنۍ اندر کُن لمان، مگر موہن لال کتھ مانہٕ ہیٚس تمہٕ وقتہٕ۔ سُہ اوس تاری نار۔ مادھو کاکن یلہٕ ہورُن ہیوٚتھ، کمنہٕ دمہٕ اوس آو جوش۔ موہن لالس سیتو پتھم پرِو نٹھیم وانہٕ پیٹھہٕ یارز، ژکھ دِتھ ووٚتھ سُہ ماُلۍ سِندِہ طرفہٕ تہٕ تمہِ پتہٕ ہیژہ اُمبندیو دانگجو تہٕ نرِہ ژرہ ناونہٕ، یلہٕ زن موہن لالن زِنۍ ہٹ تیج تہٕ ہلکارِی ہیوٗ سپدِتھ دوپکھ "وُسو بلہٕ، بہٕ تہٕ وُچھ۔" محلہٕ والیو یلہٕ وُچھ زہ لڑاُیہ ہا تیزایہٕ، تمہٕ کھتو اُڈی یور، اُڈی ہور، پننہٕ کِنۍ یِمن ژھوپہ کرناونہٕ۔ ہُمبارِی دِرایہٕ مادھو کاکنۍ آشین تہٕ للس ژُود نہ چارے کینہہ۔ تمہٕ کیاہ ونِنس کتھہٕ زِہ تہٕ تریٔ، یتھ زن اُندری ژمچہٕ ہیژرن تہٕ لوتہٕ پاٹھۍ ژایہٕ والیی۔ ہمسایہ باپہٕ آسہ دیمیو کِنۍ ٹلہٕ گُڈتہٕ گُڈی برابر پھیند تماشہٕ وُچھان، تہٕ للہٕ اُس تمن کُن ونان — "نہ بی گوس کیاہ۔ کتھ آیہٕ میانس ڈُنیس ونِتہٕ۔ اُمس ہے پننی کوکہٕ بد آسہ — ہے تہٕ ژہ کِہ تہٕ کرُکھ مادہ ژھد ہیتس۔ دیٖد بی خصلتی بژھنہ بے حیا — نتہٕ کیاہ گو بِنَنس وچھس ہے کُلف آسہٕ، گچھس دھکہٕ دِتھ یکہٕ۔ کانسہ ہندِہ وُچھِنہٕ سیتو کیاہ گو۔ یہٕ نہ گوڈہٕ پننہٕ بیٹہ مُشک ہیوان۔ تہٕ ادہ دُنیین راہ کھاران۔ پیٹھہٕ وُچھ کیتھہٕ پاٹھۍ چھہ وُووہ لران سوُنیس اتھو ہتی۔ چھسی یلتو۔ دِژم اُمسندِس پانس رتہٕ چھِنہٕ تہٕ ژٹہٕ کِنہٕ۔" یُوتاہ وُنِتھ ہوٚکھ للس ہیوٚر۔ تہٕ موہن لالن ژاُنۍ نرِہ ہتھ کرِتھ اندر۔ تمِس ہیوٚتن دِلس کیاہ تام گژھن۔

محلہ والیو کوٚر دوہشونۍ ورین زارہ پارہ تہٕ لڑاُی ہیبہٕ۔ تہٕ یتس کالس ڈوٗل سندھیاہ تہٕ۔ یتہٕ ژُو یمو دوہو باژو پانٕہ واُنۍ یتھ پیٹھہٕ زن للہٕ مالیون ژلنس پیٹھہٕ واژایہٕ۔

موہن لال اوس وُنہٕ تہٕ بُتھ لدِتھ بہتھ تہٕ للہٕ اُس تمِس آٹہٕ واٹہٕ انیج کوشش کران۔ توٚے لاگ امہِ اُمس سیتو بیٹہِ کتھ تہٕ پژھنس۔ "اچھا دوہۍ پژھوہ بہٕ تہٕ ہہٕ اکھ کتھاہ، تہٕ ہہٕ چھوہ میاُنۍ دُری۔ گوڈنیتھ کیاہ مانیو میاُنۍ دُری توہیہ، تو تہٕ پرانہٕ لحاظہٕ، پوز پوٚزنے ونیو — یِکس ہمشہٕ آسوہ توہہ وُچھان۔"

امہٕ کتھہٕ سیتو گو موہن لالس گُتہٕ گُتہٕ ہیوٗ تہٕ تمۍ ووٚنُنس اسہٕ وُنہٕ بُتھہٕ۔ "ژے پانٕہ زانہٕ وُنۍ چھک۔ ژی دنتہٕ کوہہ ہش

گژھہ آسُن۔"

"میٚہ چھُ باسان مُنزِم ہِش۔" للن ؤونُس تِتھٕ پاٹھۍ زن تمِس ژٕٹِس اوس۔

دوٚن ماچھےَ خبر۔ بٕلۍ چھک کران۔ بٕ اوسُس اَکِس وُچھان بٕ اوسُس دوٚن وُچھان۔" موہن لالن ؤونُس پٔژھ یُون ہیوٚ۔ مگر للس باسیوٚ زِ یہ شہ اوس اُمِس ٹھٹھہٕ کران، توَے ؤونُن تمِ اسان اسان۔ "تُہنزی لچھ دُری اگر میٚہ یِمۍ کتھو ہیتو تل پُتِس کشِن یِوان چھُ۔ بیٚیہِ تہٕ کٔرِتھ یمۍ اَکِس ہیتو کوٚر، تمۍ کوٚر بٔیمِس ہیتو تہٕ۔ تہٕ کٔرِتھ میٚہ کیا زِہ دوٚنٕتھ ژُرنی۔"

اتھ پٮ۪ٹھ ترٛوو موہن لالن ... ...

... ... بڈٕ

بڈٕ اسنہٕ کھنگالہ ۔ تہٕ للس پیوٚ، ییوٚل تہٕ دان یادٔسو وُڈھ اُمِس کُن۔ دٔپنس۔ "یکیوٚ ہیوٚر کھسو۔ بستہٕ تہٕ چھِنا رنوٗ۔"

یہ ؤوتھُس۔ "گژھہٕ کھس ژٕ۔ بٕ چھُس یتھی بہتھ۔"

للس آو موقعہ کتھ دِنُک سو وُڈھُس۔ "ہاے ہے میٚہ ووٚن نہ میانہٕ غاگاوہ کھٕسو۔ میٚہ زن دوٚپ، ذرہ بنا گژھہ نا تہُند خیال تہٕ کرُن یمۍ زن تُوہہ ہتھ ییژھ خاطِری ہیٚژھ۔ یاتے نہ بُرزِس اُچھو نِشہٕ ڈٕلُن، ناتے دوٚن یِتِس کالس بُتھری نہ وُچھُن۔ کوتاہ تاب۔ تُوہہ ما چھُوہ خبر، امہٕ سیٖتۍ آسے وٹھ گژھنُک اندیشہ چھُ۔ ذرہ بے نا کٔریو انصاف۔ یکو کھسو۔"

موہن لالس توٚر فکرِ زِ للہ چھ دوٚن اُمِس ٹاٹھ کران تہٕ ریٚژھ تلان۔ توَے ؤونُس تمۍ۔ "نہ۔ نہ میٚہ چھُنہٕ کھسُن۔ کھس ژٕ۔ بٕ چھُس یتھی ٹھیک۔"

للہ کھوٚت ہیوٚر۔ تہٕ چھُکس اتھ دُنۍ ترٛاو للن تِتھٕ پاٹھۍ دار یِلہٕ زن نا تمِس مادھو کاکنین دنہٕ اوس۔" فرٗٹے مُنہٕ۔ تہُندی عاقبت نہ کینہہ۔" امہٕ دِژ دارِ کنۍ وارہ پاٹھۍ نظراہ وظراہ تہٕ اتہٕ وُچھِن مادھو کاکنِس نوٚوِس مکانس یوٚرہ کنہٕ چھ سارے دارِ دِتہٕ۔ یہ گیہ خوش زِہ داتہٕ چھ کتھہٕ سیٖتۍ چھکہ زمۍ گومُت۔ امہٕ پتہٕ رُچ

سو کأم کرنہٕ تہٕ سیندا دِتھ چھوٚن دَے۔ دَے چھپلتھ دٕرایہ چھُلن دوٚن دارِ کنۍ ترٛاونہٕ تہٕ کرُن بیٚیہِ اَہندِس مکانس کُن کہِ تام شیہ سان نظراہ یِلہٕ اُمِس اَہندِس پرانِس مکانس کُن تہٕ نظر پٮ۪یہِ۔ اتہٕ اَسۍ کم تامت کلہٕ کُڈِتھ اُمِس کُن وُچھِتھ ژرژان ہیوٚ۔ امہٕ ژیوٗنہٕ اورکُن تہٕ سو ژایہِ بیٚیہِ اندر تہٕ رُژ پننہٕ کامہٕ سیٖتۍ۔ امہٕ دِژھ بٕلۍ اورکُن بیٚیہِ نظراہ۔ اتہٕ وُچھن یم بیٚیہِ بیٚتھے کنۍ پانس کُن کمۍ تام اُچھو وُچھان۔ بیٚنتۍ کھنڈی دِژ امہٕ بیٚیہِ اورکُن نظر۔ تم اَسِس بیٚیہِ بیٚتھے کنۍ وُچھان۔ تختس پٮ۪ٹھ بہتھ للہٕ ژمیہِ ہِش۔ سو اُس نہٕ دوٚن تھوٚد تہٕ ہیکان وُچھتھ۔ تہٕ تہِ دِژ بیٚیہِ اورکُن نظر۔ تم اَسِس بیٚیہِ کنۍ کمۍ تام اُچھو وُچھان۔ سو دوشِلیہ ہِش۔ سو اُس نہ دوٚن تھوٚد تہٕ ہیکان وُچھتھ۔ یوٚتام زان ہتہٕ گوٚ وُگرہ۔ چایہِ لوٚگ باکھ تہٕ اَلہٕ ہپنہٕ حرکت تہٕ کران۔ صرف تُلِ ماریو دارِ کنۍ نظراہ نظراہ دوان زِ یمہٕ ما ڈٕلا۔ تم دوشوَے اَسۍ شینکرز گُمژ ہیوٚ اُتھی، بیٚتھے کنۍ، کلہٕ کُڈِتھ اُمِس زاگِہ ہیوٚ بہتھ۔ زن نا کُنۍ تہِ رِس پٮ۪ٹھ بہتھ کانٹ کأنہٕ ژٕری سِندِس اِحس منز شوٗشتہٕ ناوِس وُچھان آسن۔۔۔ للس باسیوٚ یہ چھ مادھو کاکنین ہنزی کانہہ چال۔ یوسہ زن یمن اندر وانگجین مٔژ قاودٕ چھن للس اوس نہ کینہہ فکرِ تران۔ تمِس اوس اتھ سأری کأنی منز پیٚن پان وُنکین تیوٗتھاہ کنوٗی زوٚن باسان زِہ سو اُس گٔرکھہ دِنۍ یِژھان۔ یپأری اوسُس سخت شرارت، یپأری اوسُس سخت فرٹ ہیوٚ۔ وینہٕ ریٚنس خبر شہ کیاہ مطلب، ژارہ امہٕ تل۔ نتہ بےَ کموٗت تمِس بہل تہٕ گژھہ دوٚن بیاکھ بُتھو لاگےَ منہمأی منہمأی۔ اتی اُس سونچان کوٚہہ نقب کرُن یمن، اتی اوسُس مت گژھان اتی پٮ۪ٹھ یمن گردن دِنس۔ مگر تگان ہیوٚ زان اوسُس نہ کینہہ۔۔۔ آخر کرُن ہمت تہٕ چل چل دِژن دار۔ تمۍ ترٛووہس اَسُن۔ للس باسیوٚ اُمسنزیہ دار دِنۍ تہٕ تہُندیہ اَسُن تمأری محلن وُچھمُت۔ تمِس ژایہِ زنگن تھرہ تھرہ۔ دِلس گُمیس دٔبہ رازے۔ دان ترٛاوِتھ ہیٚژراین دوٚن سو یوٚن ریٚنس نِشہ وسوٗ یِلہٕ زن سہ پلنگے پانس بروٚنٹھ کنہٕ (بقیہ برصفحہ ۴۴)

محمد ایوب بیتاب

وولہٕ فولہٕ وُن سمسار وُچھوَ

دوٕ تہٕ زندگی رژ سام ہیٚیوٚ، لو کچار وُچھوَ شہجار وُچھوَ !
آسٕشن دوٕ میذن چھلیاہ بَج، اُسو تمہٕ کوٗہی رُت وٚلیوہ ہار وُچھوَ

یتہٕ گُل چھوٚہن بلبل گیوٚن سنطور وزن دریاو گرزن
یتہٕ بالن رەپوٗہی شینہ دستار، یتہٕ اَبرن کر گچھ تالہٕ رزن
قدرت کران سنسز سمسارس، اُسو سوٗہی فولہٕ وُن سمسار وُچھوَ

یتہٕ دوہ چھہٕ صُبحن نوٗرٕمن زن ساژہ بنن بہارازہ بنن
یتہٕ راتھ چھہٕ شامس مس مژرن تس زُوان چھہٕ تارکھ مالہٕ انن
یتہٕ پوٗتے پریوژھپہ ژھورکرن، اُسو یِہٕنی ہُند ملہٕ ژار وُچھوَ

یتہٕ لیٚل چھہٕ پرارن مجنونس یتہٕ وُنِ یمبرزلہٕ دِت بمبرس
یتہٕ دوہ کولہ فرہاد پکہٕ ناون یتہٕ ہیمالہٕ دِتھ لوس دس
یتہٕ شمعس پنٕٹھ پونپُر دزن، اُسو اُہندے لولک نار وُچھوَ

یتہٕ ہی لجی ورکین ترپچی تے لالن نِنی ماتزہٕ مچی !
یتہٕ داَن تھر یوکھور رنگ پوشن یتہٕ پمپوشس چھے لوٗرِ ہچی
پی وُچھ وُچھ دِلہٕ کی لوٗرہ فولن، وولہ یارو تم گلزار وُچھوَ

یتہٕ مستی چھے مس پیالہٕ برتھ یتہٕ رونقٕ وینہ مے خانن منز
یتہٕ رندے چھے سیر گمتی، یتہٕ مس برو برو وُنہٕ بانن منز
اسہٕ چیوٚ گوتُل تیٚلہٕ سیر گژھو یلہٕ چشمن ہُند خُمار وُچھوَ

یتہٕ بونہٕ شہل یتہٕ یارہ گرل تھمنز چھے وژی گل بولن
یتہٕ ہرن چشمن سرمہٕ کرتھ چھی نافس مشکن گنڈ کھولن
اُسو نوٚوٗ فلوتے تارہ گھٹرو یلہٕ اسہٕ مشکن رژ دھار وُچھوَ

یتہٕ علمک امنک ادبک دور، یتہٕ آسٕشن جوان تے گاش ژوپارہٕ
یتہٕ سلمہٕ ژھارن اختر چھوٚی یتہٕ طوطہ ونن چھوٚی ولہ وَنہٕ ہارہٕ
وولہ لوٗرہ گژھو یتہٕ دادی بلن تتہٕ چھوکنی ہُند بلغار وُچھوَ

حدیثِ دیگراں

۱۵ - الف - موتی باغ ۲ - نئی دہلی

۲۴ رمئی ۱۹۶۰ء - برادرم یوسف صاحب! سلامِ محبت

"تعمیر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ تمام مندرجات میں شمیم صاحب کے مقالے نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ کہیں کہیں مجھے نظریاتی طور پر اختلاف ضرور ہے لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں شمیم صاحب کے سماجی شعور کی پختگی اور تخلیقی تنقید کی شگفتگی کا نہایت فن کارانہ امتزاج ملتا ہے۔

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے! نیازمند: نریش کمار شاد

نوین شاہدرہ - دہلی - ۳۰ رمئی ۱۹۶۰ء

برادرم تسلیم۔ "تعمیر" کا نیا شمارہ ملا - یہ واقعی بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ بلجی ناتھ پنڈت کا مضمون "کشمیر میں فلسفۂ شو" کا پہلا حصہ کچھ اچھا تھا، لیکن دوسرا حصہ بہت سطحی ہے۔ بدھ کے فلسفہ کے جدلیاتی پہلو پر مصنف نے بالکل روشنی نہیں ڈالی - در اصل ہر فلسفہ کی مادی اور سماجی بنیادیں ہوتی ہیں، جنہیں وہ سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا: ہنسراج رہبر

عزیز محترم۔ جنوری فروری کا مشترکہ شمارہ ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ بڑے فاضلانہ انداز میں پرچہ ترتیب دے رہے ہیں۔ اس بار رہبر کا مضمون "پریم چند اور تحریک آزادی" کافی پسند آیا۔ معلوماتی ہے اور دلچسپ بھی۔ رادھے کشن کا "کشمیر کے لوک ناچ" بھی قابل مطالعہ ہے۔ حصۂ نظم میں نازش کے "میرا وطن" کے بعد علی جواد زیدی کا "انجام کا انجام" بڑا سحر انگیز ہے۔ زیدی صاحب کی آزاد نظم، نظم برائے نظم نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو متوجہ کرتی ہے۔ زیدی صاحب سے نثر میں بھی لکھوائیے۔ وہ کافی صالح خیالات رکھتے ہیں۔ یوسف صاحب! آپ نے "تعمیر" کو کافی سنوارا ہے، روایات کو بھی برقرار رکھا ہے اور نئے اشارے بھی دئے ہیں۔ کسی طرح اس منزل پر بھی پہنچئے کہ پرچہ وقت پر اور ہر ماہ شائع ہو۔ باقاعدگی "تعمیر" کے حسن میں اور اضافہ کر دے گی۔ اب بھی آپ ہر شمارہ میں ذہنی بالیدگی کے لئے جو سامان فراہم کرتے ہیں اس کے لئے آپ داد کے مستحق ہیں۔ خلوص کار: شمس کنول بمبئی

مئوناتھ بھنجن (اعظم گڈھ) ۲۰ ر اپریل ۱۹۶۰ء

برادرِ محتشم! تسلیم و نیاز - جنوری فروری کا "تعمیر" زیرِ نظر ہے۔ ہنس راج رہبر کا مضمون "پریم چند اور تحریک آزادی" مختصر سہی، لیکن ہے بڑا مکمل اور معلوماتی - پریم چند کی افسانہ نگاری کے عہدِ طفولیت اور عہدِ شباب کے سارے پس منظر اور داعیات بڑی واضح شکل میں سامنے آگئے ہیں۔ ان کے سیاسی عقائد ان کی انسانیت پرستی، وطن دوستی کے جذبات، عوامی ماحول سے اُن کا ذہنی ربط ان تمام اسٹیج سے قاری بیک وقت گذر جاتا ہے۔ احسن اللہ بیان سودا کے معاصرین میں سے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الہٰی نے ان پر بحیثیتِ قصیدہ نگار بڑی مختصر مگر اچھی گفتگو کی ہے۔ قیصر قلندر نے پردیسی کی داستانِ حیات کو اتنا بے تکلف پیرایۂ بیان دیا ہے کہ اس کشمیری افسانہ نگار کی زندگی کے دھندلے خطوط بھی روشنی میں آگئے ہیں اور ان خطوط میں بڑی زندگی اور معنویت جھلک اٹھی ہے۔

منظومات میں علی جواد زیدی کی نظم "انجام کا انجام" ان کے تعمیری شعور کی آئینہ دار ہے۔ نگاہوں کے سامنے بکھرے ہوئے ماحول کے تقاضوں سے انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ اُمید افزا ہیں اور رجائیت کے سنگِ میل۔ شاعر اس نظم میں گردِ کارواں سے جو منزل تراشنا چاہتا ہے وہ ہمارے آپ کے لئے "جنتِ فردا" کا حکم رکھتی ہے۔ شفیق جونپوری کی غزل سے اُن کی فنی مہارت اور دیرینہ مشقی آشکارا ہے۔ حریفانِ وطن سے کس اعتماد سے مخاطب ہیں سے (بقیہ بر صفحہ ۴۴)

باقیات

تدفین کی اساطیر

(صفحہ ۲۸ سے آگے)

ان قبروں کا پتہ لگا لیا ہے اس لئے یہاں اپنی بحری فوج کا اڈہ بنا لیا ہے اور غیر ملکی جہازوں کے ادھر سے گذرنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

بے بی لن کے مردے

بے بی لن کے پرانے مردوں کے پاس تو دولت ملی ہی، شہنشاہ سکندر نے اپنے دوست ہیکفن کے لئے جو وسیع سمادھی تعمیر کرائی تھی، اس میں ۲۴ جہازوں کے سونے کے ماڈل بھی ملے ہیں۔ اس سمادھی کی کئی منزلیں ہیں جن میں سب سے اوپر کی منزل دھات کی بنی ہوئی ہے۔ اس سمادھی میں تصوری سمندری آرائش شروں کے علاوہ اور جتنی بھی مورتیاں تھیں، سب سونے چاندی کی تھیں۔ اس کے علاوہ سکندر کی طرف سے تحفہ کے طور پر دی ہوئی جواہرات کی تھیلیاں الگ تھیں۔

ان کے علاوہ بہت سے مردے ایسے بھی ہیں، جب وہ زندہ تھے اسی وقت اپنے خزانے جنگلوں، تالابوں، مکانوں، پہاڑوں، مندروں اور مسجدوں میں چھپا گئے تھے جن کا پتہ سوائے ان مردوں کے اور کسی کو نہیں۔

چوکہ دار

(صفحہ ۴۱ سے آگے)

اسنہ ہناہ کران وچھن۔ رژھ کھنڈی چھس سہ وچھان بلہ زن تمو وۄنمس۔ " زٕ وۄہ ہندہ خاطرٕ چھا ژٕٹ نالہِ لڈان۔" تہ یہ ونان ونان مژرآو تمو ٹاس کرِتھ چوکہ دار۔ تمس تورگ نہ کہیں وَنُن۔ پتہ وۄتھس شوی۔ " ان تہ ژٕہ دوذ چیلہ۔" یہ ونان ونان ... سۄ اتھ دارہ منز تتھے کنہ بیتھ پاٹھو یہ بہان اوس۔

تتہ گیہ گجل ہش۔ تہ دِژ تٔلو ٹارنو بیٚہ دارہ کُن نظر۔ سو دار اوس ترٕپرِتھ۔ تہ گاٹ اُس ژجہرٕ۔ امہ تردو فریکھ ہیوٗ تہ وچھن ریٚنس کُن۔ سہ اوسُس تورٕ اسنہ ہناکران۔ زن نا ونان اوسُس تور یہ دوذ فکرہ یُکہ مارہ متہ اوسُس یتھ دارہ پیٚنٹھ بہان۔

تمس دوگنیہ شانہ ہیو۔ تہ تمُس باسیو زن از پانہ پیر پنڈت پادشاہن تمُس ڈیکس ریوٹھ کرِتھ اُہی کران وَدٕن۔ " گژھ ژٕ یہ ڈیکہ ستھ موجود روزُن۔"

حدیث دیگراں

(صفحہ ۴۳ سے آگے)

۵۔ "کہدو ان سے جو بجھاتے ہیں مری شمع حیات۔ میں نہ ہونگا تو زمانے میں اندھیرا ہوگا۔"

اور ان کا یہ تیور تو بڑا ہی قائل ہے: "پھول جب دیکھئے ہنس ہنس کے اڑاتے ہیں مذاق یوں ہی گر آگئی کانٹوں کو ہنسی کیا ہوگا۔" لیکن کلاسیکل مکتبۂ فکر و خیال سے تعلق رکھنے کے باوصف شفیق جونپوری ترقی پسند اسلوب غزل کے بھی دل دادہ نظر آتے ہیں مقطع ملاحظہ فرمائیے: "آپ بھی ہمت مرد ہو۔ یہ ہنستے تھے شفیق۔ ہم نہ کہتے تھے یہ قطرہ کبھی دریا ہوگا۔"

اختر انصاری ملک کے بہترین و منفرد قطعہ نگار ہیں۔ ان کے قطعات میں تجربے کی حدت، مشاہدے کی بوقلمونی، فکر و نظر کی تیزی اور مطالعہ کی وہ شدت ملتی ہے جو ایک فن کار جب دل کو خون کر لینے اور نگاہ میں حیات کائنات کی تمام رنگا رنگی سمیٹ لینے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یوں تو ہر قطعہ اپنی جگہ دقیع و دل نشین ہے مگر ظرف غم، میرا درد، بجھنے بخت مذکورہ عنوانات کے ذیل میں جو قطعات ہیں ان میں شاعر کی فکری انفرادیت پورے طور پر نمایاں ہے۔

وحید اختر کی غزلیں بھی ہموار ہیں مگر بعض جگہ ردیف میں وہ حسن اور نکھار نہیں پیدا ہو سکا جو ہونا چاہیئے جیسے:۔ "شہر خوباں میں اگر باد صبا ہو جانا" دوسری غزل میں عقدۂ دل کی گرہ بھی سقم سے خالی نہیں، ویسے شعروں میں بڑی سادگی اور بے ساختگی ہے، یہ اشعار دیکھئے:۔

جی کے بہلانے کو دنیا میں، سہارے ہیں بہت۔ ساز کار آئے تمہیں، ہم سے جدا ہو جانا
کتنی فریاد و لب کی کے زباں پائی وحید۔ کھیل سمجھے نہ کوئی نغمہ سرا ہو جانا
فاش ہوتی نہ غماز اگر غم کی وحید۔ سخت مشکل تھا کہ مفہوم ادا ہو جاتا

بہرکیف جنوری و فروری کا یہ مشترک شمارہ بڑے متنوع مضامین نظم و نثر کا حامل ہے۔ کشمیر کے ادبی و ثقافتی موضوعات پر مشتمل جھلکیاں بڑی نظر گیر ہیں۔ اس طرح آپ کشمیر کے تہذیبی و لسانی ورثے کا تحفظ فرما رہے ہیں اور یہ کوشش بڑی مبارک ہے۔

آپ کا: فضا ابن فیضی

خط و کتابت کا پتہ:۔

محمد یوسف ٹینگ

ایڈیٹر "تعمیر" گورنمنٹ پریس بلڈنگس

سرینگر (کشمیر)





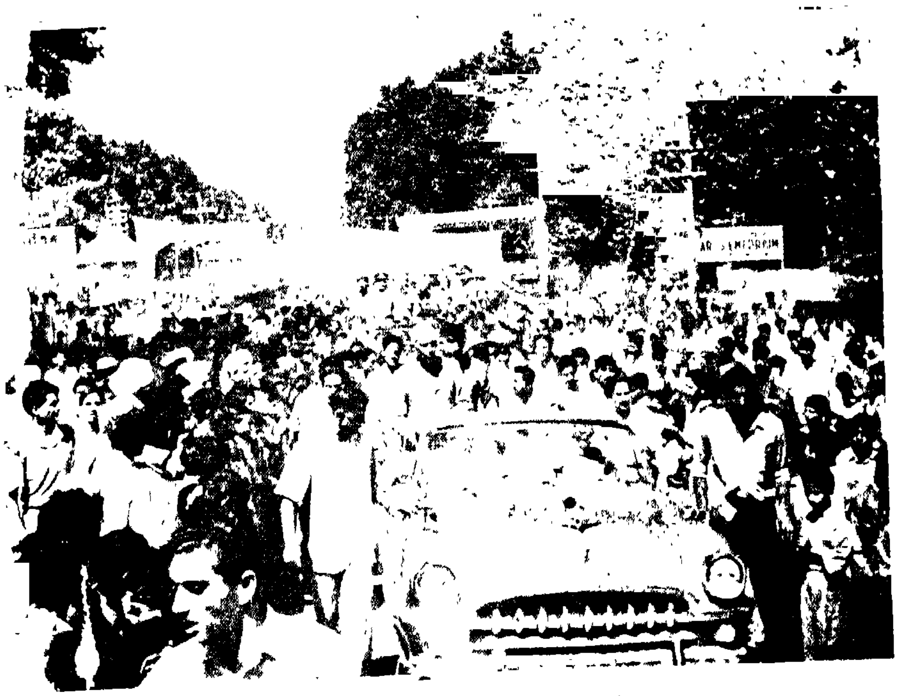


ماہنامہ

تعمیر



جولائی سنہ ۱۹۶۰ء



سری نہرو [illegible]
سری نہرو اور بخشی [illegible]



ماہنامہ **تعمیر** سرینگر

جولائی ۱۹۶۰ء

جلد ۵ ——————— شمارہ ۲۵

جنرل ایڈیٹر

جے، این زتشی

ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے — سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط و کتابت کا پتہ :———

محمد یوسف ٹینگ ایڈیٹر ماہنامہ تعمیر ، سرینگر

پیرزادہ محمد سعید پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گورنمنٹ پریس سرینگر میں چھپا اور لالہ رخ پبلیکیشنز کی طرف سے شائع ہوا

رواں ہے قافلہ سالار قافلے کو لئے

ترپن منزلیں ——————— ترپن قدم

(۱) دستاویز الحاق کی توثیق

(۲) جمہوری آئین کی تکمیل اور اس کا نفاذ

(۳) مجوزے کا خاتمہ

(۴) پُرانے کواپریٹو قرضہ جات سے نجات

(۵) جواہر ٹنل کی تعمیر

(۶) مُفت اور عام تعلیم کا اجراء

(۷) کسٹم سے نجات

(۸) مہاجرین کی بحالی

(۹) پرمٹ سسٹم کا خاتمہ

(۱۰) ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ

(۱۱) مہنگائی الاؤنس کا بندوبست

تعمیر

(۱۲) لیبر قوانین کی منظوری اور نفاذ
(۱۳) تمدن و علوم کا احیاء (جشن کشمیر۔ کلچرل اکاڈمی اور کلچرل شعبوں کا قیام)
(۱۴) انجینیرنگ کالج۔ سکول آف ڈیزاین اور پالی ٹیکنیک کا قیام
(۱۵) میڈیکل کالج کا قیام
(۱۶) نئے تعلیمی منصوبے کا نفاذ۔ تعلیمی بجٹ میں ۱۹۴۷ء کی بہ نسبت دو سو گنا زیادہ اضافہ۔
(۱۷) صحت عامہ کی سہولیات کی توسیع۔ ملیریا۔ ٹی بی اور دوسری وبائی بیماریوں کا انسداد۔
(۱۸) سیاحت کو فروغ دینے کے منصوبوں پر عملدرآمد۔ سرینگر اور جموں میں سیاحوں کے استقبالیہ مراکز کی تعمیر۔
(۱۹) کھیلوں کا فروغ۔ سرینگر اور جموں میں لاکھوں روپے کی لاگت سے سٹیڈیم کی تعمیر۔
(۲۰) نئی صنعتوں جیسے ٹینریز۔ جوئنری ملز۔ سیمنٹ کے کارخانے اور اینٹوں اور ٹائیلوں کے کارخانے کی تنظیم۔
(۲۱) گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی صنعتوں کی ترویج۔ ایمپوریم کا قیام۔ صناعوں اور دستکاروں کی اعانت اور امداد۔
(۲۲) برقی قوت میں زبردست اضافہ۔ درجنوں نئے قصبوں اور دیہات کو برقی رو کی فراہمی
(۲۳) آبپاشی کی بہتر سہولتوں کے لئے نئی نہروں کا جال۔ لفٹ ایریگیشن کے کئی مراکز کا قیام۔ کٹھوعہ نہر اور پرتاپ نہر کی تعمیر۔
(۲۴) کم تنخواہ ملازمین کے لئے بستیاں
(۲۵) کسانوں کی اعانت کے لئے لاکھوں روپے کے کوآپریٹو قرضہ جات کی سہولیات
(۲۶) ۲۱ صنعتی بستیوں کا قیام

(۲۷) پسماندہ علاقوں (لداخ کشتواڑ وغیرہ) کی ترقی کی سکیموں پر عملدرآمد۔

(۲۸) پسماندہ طبقوں اور دلت جاتیوں کی بہبودی کے لئے منصوبوں پر عمل۔

(۲۹) ریاست کے درجنوں مقامات کو نلکوں کے پانی کی فراہمی

(۳۰) حکومت کے شہیدوں کے ورثا میں ملازمت، رقوم اور وظائف کی تقسیم

(۳۱) فی کس آمدن میں قابل قدر اضافہ۔

(۳۲) روزگار کے لئے ہزاروں نئی اسامیوں کا وجود۔

(۳۳) وادی کشمیر کو سیلاب سے نجات دینے کے لئے عظیم سیلاب روک منصوبے کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد۔

(۳۴) اجتماعی ترقی اور قومی توسیعی سروس کے ۵۳ بلاکوں کا قیام۔ سوناواری کے ماڈل بلاک کی تشکیل۔

(۳۵) جموں و کشمیر یونیورسٹی کو امتحانی ادارے کی سطح سے اٹھا کر تدریسی ادارہ میں تبدیل کرنا جہاں علوم فنون کے مختلف شعبوں میں تعلیم دی جا رہی ہے۔

(۳۶) ریاست کے معدنی ذخائر کی کھوج کے لئے معدنی کارپوریشن کا قیام

(۳۷) ریاست کی آمدن میں معتدبہ اضافہ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء دو کروڑ چوہتر لاکھ چالیس ہزار
سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء ۵ کروڑ تربیس لاکھ اناسی ہزار
سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء ۱۳ کروڑ ۹۲ لاکھ انتیس ہزار

(۳۸) ریاست کے مختلف حصوں میں ... ۶۸ ممبروں کی تعداد کے سینکڑوں کوآپریٹو اداروں کی تنظیم۔

(۳۹) تعلیم نسواں کا فروغ۔

(۴۰) غریب تاجروں کی امداد کے لئے قرضوں کا بندوبست

(۴۱) زراعت کی ترقی نئے بیجوں کا تعارف اور تقسیم۔ کیمیائی کھاد کی تقسیم۔ بہتر زرعی آلات

کا آغاز۔ کاشت کے سائنسی طریقوں کی حوصلہ افزائی۔

(۴۲) سرینگر اور جموں میں دماغی امراض کے ہسپتالوں کا قیام۔

(۴۳) سرینگر اور جموں میں بھک منگوں اور بے سہارا عورتوں کی بحالی کے مراکز کا قیام

(۴۴) میووں کی پیداوار میں اضافہ کے لئے نرسریوں کا قیام اور لاکھوں پودوں کی تقسیم

(۴۵) ایندھن کی فراہمی کے حل کے لئے لاکھوں بے ثمر درختوں کا نصب کرنا۔

(۴۶) مرکزی الیکشن کمیشن اور سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار کی ریاست پر توسیع۔

(۴۷) بکروالوں (خانہ بدوش چرواہے) کی تعلیم اور سدھار کے لئے متحرک سکولوں اور شفاخانوں کا قیام۔

(۴۸) سرینگر اور جموں میں نئے سیکرٹریٹ بلاکس کی تعمیر۔

(۴۹) مال مویشی کی برداخت اور ترقی کے لئے کلیدی گاؤں سکیم کا اجراء۔ نئی اور بہتر قسم کی نسل پیدا کرنے کے لئے باہر سے مویشیوں کی درآمد ۔۔۔ مویشیوں کی وبائی بیماریوں کے خلاف انسدادی مہم۔

(۵۰) ۵۰ لاکھ روپے کی لاگت سے مالی کارپوریشن کا قیام

(۵۱) ٹرانسپورٹ کی جدید تشکیل و تنظیم۔

(۵۲) زمین کا کٹاؤ روکنے کے لئے لاکھوں جنگلی درختوں کی بوائی۔

(۵۳) ذرائع نقل و حمل کو ترقی دینے کے لئے ہزاروں میل سڑکوں کی تعمیر۔ درجنوں نئے پلوں کی تعمیر۔ سینکڑوں میل سڑکوں کو پختہ بنانے کے کام کی تکمیل۔

ترتیب

زاویے

بخشی غلام محمد اب محض ایک ذات کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک دور، ایک تحریک، ایک رجحان اور ایک مستقبل کا عنوان ہیں۔ تاریخ کشمیر کی اس جلیل القدر شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرکے ہم بیک وقت اپنی عظیم الشان تحریک آزادی کی روایات پر اپنے فخر، غیر مذہبی جمہوریت کے نظریے پر اپنے ایمان اور ایک حسین مستقبل کی شگفتگیوں سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ بخشی صاحب کی زندگی اُن تمام روایات کی ترجمان اور مظہر ہے جن کا لہو سمے ہندوستان کے صحت مند کشمیر کو شاداب اور شادماں بنا رہا ہے۔ اُن کی قومی زندگی کا طلوع تحریکِ حریت کے ایک سرفروش مجاہد کی حیثیت سے ہوا۔ ہماری تحریک آزادی کے سب سے کڑے کوسوں کی جادہ پیمائی کا کام اُن ہی کے سپرد ہوتا رہا۔ اور زمانہ گواہ ہے کہ جب بھی یہ اولوالعزم سپہ سالار کسی مشکل محاذ کو سر کرنے کے لئے گیا تو فتح وظفر نے ہمیشہ اُس کے قدم چومے۔

"معمار کشمیر" کا خطاب اُس کے ان ہی جگردار کارناموں کا اعتراف ہے۔ آزادی کے بعد جب داخلی اور عملی محاذوں پر قوم کی تعمیر نو اور اس کے مستقبل کو سنوارنے کا وقت آیا تو بعض راہی اُلجھ کر دماغی خلجان کے عالم میں خود تحریک آزادی اور سیکولر ڈیموکریسی کے آدرشوں کو اُکھاڑنے کے نامبارک شغل میں مگن ہوگئے۔ عصری تقاضوں کی بصیرت رکھنے والا سرفروش مجاہد پھر آگے بڑھا اور اُس نے ملک و قوم کی لاج رکھتے ہوئے تحریک حریت کے عظیم اصولوں کا پُرجلیل پرچم تھام لیا۔ ہمیشہ کی طرح اب کے بھی میدان اُسی کے ہاتھ رہا۔ آزادی کے استحکام اور دوام کی جدوجہد تعمیر و ترقی کی عظیم مہم میں تبدیل ہوگئی۔ مطلق العنانیت کی تخریب کا مجاہد اب اس تعمیر و تشکیل کا معمارِ اعظم بن گیا۔ الفاظ کی بہ نسبت واقعات کی گواہی زیادہ معتبر ہوتی ہے اور آج سے تیرہ سال پہلے اور آج کے کشمیر کا تقابلی مطالعہ کرنے والا ہر صاحب نظر معمار کشمیر کے تعمیری کارناموں کا خود اندازہ کر سکتا ہے۔ جنگ آزادی کے اس جانباز قافلہ سالار، غیر مذہبی جمہوریت کے اس جری علمبردار اور تعمیر نو کے اس باسلیقہ معمار کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرکے ہم ان تمام چیزوں کے ساتھ اپنی عقیدت اور اپنے لگاؤ کا اعادہ کرتے ہیں۔

تعمیر

فضا ابن فیضی

غزالِ کشمیر

(خالد کشمیر کی سالگرہ پر)

بنامِ لالہ و گل حسنِ زندگی کے لئے
بڑے شگفتہ و رنگیں پیام لے کے اُٹھا
ہزاروں صبح کے جلوے سموئے آنکھوں میں
جبینِ شوق پہ ماہِ تمام لے کے اُٹھا
نفس نفس پہ لٹاتا ہوا متاعِ سکوں
قدم قدم پہ حیاتِ دوام لے کے اُٹھا
تُو اپنے تشنہ لبوں کی [illegible] وہ محفل میں
مئے حیات سے لبریز جام لے کے اُٹھا
بہشتِ آب جو و کشت و سبزہ زار میں تو
نسیم کا نفسِ خوش خرام لے کے اُٹھا
اسیر ہونے کو بے تاب ہیں تمام آہو
یہ کون عنبریں زلفوں کے دام لے کے اُٹھا
یہ کون مست چناروں کے نرم سایے میں
جو صبح سے بھی حسیں ہے وہ شام لے کے اُٹھا

غزالِ وادیِ کشمیر! شوق میں تیرے
مرا کھلا ہوا آغوش بن گیا ہے ختن
نظر میں پھول کھلے، ذہن میں کلی چٹکی
ترا نفس ہے بہاروں کا عنبریں دامن
وہ بزمِ شعر وہ تقریبِ جشنِ گل وہ سماں
ہے تیرے لطف سے گلگوں قبائے شعر و سخن
وہ خلدِ شوق "شبِ شالیمار"[1] کے جلوے
وہ رقصِ روح وہ رقصِ نظر وہ رقصِ بدن
کھلے کھلے سے گریباں وہ حسن و مستی کے
وہ موجِ رنگ میں بھیگے ہوئے سے پیراہن

[1] جشنِ کشمیر

بہ ایں نشاطِ طبیعت بھی تیرے سینے میں   سُنی گئی ہے دلِ کائنات کی دھڑکن
وہ کسمسا اُٹھی کشمیر کی جواں تہذیب   ترے سبو کی مئے تُند ہے غُمار شکن

ادا شناس جنوں سے مرے کوئی پُوچھے   تری نگاہِ طرب کا فسونِ دل داری
بھرا بھرا وہ جہلم کا نیلمیں سینہ   وہ زر نگار شکاروں کی نرم رفتاری
کہیں سفیدوں کے جھرمٹ کہیں گلابوں کے   سری نگر ہے کہ شہرِ طلسمِ گل کاری
گلاب و عطر کی ان خواب وش فضاؤں میں   تری نوا نے جلائے چراغِ بیداری
ترے فروغِ تدبر سے صبح بن کے رہی   وہ رات جو ترے دیدہ وروں پہ تھی بھاری
جو برف زاروں کے سینے میں آج روشن ہے   نہ بجھ سکے گی وہ ذوقِ عمل کی چنگاری
محمدؐ عربی کے غلامِ با اقبال   نئی ادا سے ذرا ڈالیہ طرحِ خودداری

محیطِ قلب و نظر تھی جو تیرگی اس کو   ترے شعور نے ظرفِ سحر میں ڈھال لیا
جہاں سے ایک قدم بھی گزرنا مشکل تھا   وہاں بھی تُو نے نیا راستہ نکال لیا
جو کھائی رزم گہہِ زندگی میں چوٹ کہیں   تو زخمِ دل پہ تبسم کا پردہ ڈال لیا
تھا جس کے بخت میں جامِ جہاں نُما ہونا   ترے جنوں نے وہی ساغرِ سفال لیا
پڑی تھی تجھ پہ یہ کس پیرِ میکدہ کی نظر   کہ تُو نے گرنے سے پہلے ہمیں سنبھال لیا
کچھ اور بڑھ گیا گلمرگ و پہلگام کا حُسن   جو تُو نے ہاتھ میں آئینۂ جمال لیا
ہے ذرہ ذرہ گزرگاہِ آفتاب ترا   کہاں سے تُو نے مرا شعلۂ خیال لیا

یہ زندگی کی اُمنگیں یہ حرّیت کی ترنگ ——— ترا شعورِ سیاست بڑا حسیں نکلا
ترا پیام ہے چہرہ کشائے حسنِ عمل ——— ترا پیام بہت عہد آفریں نکلا
عجیب شے ہے ترا غمزۂ مسیحائی ——— کہ زہرِ دولتِ تریاق کا امیں نکلا
دیا ہے جس نے ترے پائے شوق کو بوسہ ——— وہ خار پھول سے بھی بڑھ کے نازنیں نکلا
فروغِ نورِ سحر مُنہ چھپائے پھرتا ہے ——— تری شبوں کا اندھیرا بھی مہ جبیں نکلا
تجھے جنوں نے یہ کن راستوں پہ ڈال دیا ——— کہ آج تک نہ خمِ زلفِ عنبریں نکلا
نشاطِ باغ سے آئی وہ پھر ہوائے جنوں ——— کچھ اور حوصلۂ جیب و آستیں نکلا

وہ تیری طبعِ زمانہ شناس کی تیزی ——— کہ شاخِ گُل کو بھی تلوار کر لیا تُو نے
بلا کے گو کہ نشیب و فراز تھے لیکن ——— رہِ حیات کو ہموار کر لیا تُو نے
فروغِ راحتِ کونین بن کے بیٹھے ہیں ——— وہ حادثات جنہیں پیار کر لیا تُو نے
ثبات و عزم کی اُس نکہتِ پریدہ کو ——— نفس میں اپنے گرفتار کر لیا تُو نے
ترے اُفق پہ ہے کس آفتاب کا سایہ ——— کہ اور صبح کو گلنار کر لیا تُو نے
چمن میں چھیڑ کے خاتونِ حبّہ کے نغمے ——— سکوتِ گُل کو غزل بار کر لیا تُو نے
نوائے بربطِ مہجور و نغمۂ آزاد ——— ہر ایک ساز کو بیدار کر لیا تُو نے

یہ مجھ سے پوچھ تری سحر پاش نظروں نے ——— جگا دیا ہے ہر اک دِل میں جادوئے کشمیر

جواں ہے تیری محبت سے چہرۂ لداخ تِرے خلوص سے ہے گرم پہلوئے کشمیر
یہ آبشار کا سیماب، برف کی چاندی یہ کون لے کے چلا پھر مجھے سوئے کشمیر
یہ دامِ بن یہ جلوہ خانۂ حسنِ فطرت کا یہ بانیہال یہ محراب ابروئے کشمیر
وہ ابرِ میکدۂ عیش باغ سے اُٹھا بکھر گئے مِرے شانوں پہ گیسوئے کشمیر
ہوا ہے تیرے تصوّر میں بارہا محسوس مِرے گلے میں حمائل ہیں بازوئے کشمیر
یہ چاندنی یہ شگوفے یہ موجِ نکہت و رنگ خود اپنے دام میں ہے آج آہوئے کشمیر

خدا کرے نہ کبھی یہ بہار کمھلائے
یہ جشنِ زہرہ و ناہید تجھ کو راس آئے

سلام مچھلی شہری

نغمۂ نو

صبح کچھ اور ہے، اس خلد کی ہے رات کچھ اور
ساز کچھ اور ہیں اس بزم کے نغمات کچھ اور
دورِ دلکش کے تو پہلے بھی تھے کچھ دعویٰ دار
خالدِ وادیِ کشمیر کی ہے بات کچھ اور

(انصار ہاروانی ایم۔پی)

خالدِ کشمیر

انقلابی تحریکیں شاندار ہستیاں پیدا کرتی ہیں۔ مگر انقلاب کی کامیابی کے بعد اکثر رجعت پسندی کی شکار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ چین میں چیانگ کائی شیک، روس میں ٹراٹسکی مصر میں نحاس پاشا اس کی مثال ہیں۔ کشمیر کی انقلابی تحریک بھی ایسی مثال سے خالی نہیں ہے۔

مبارک ہیں وہ انقلابی جو تعمیر کے دور میں بھی انقلابی روایات کو برقرار رکھتے ہیں۔ خالد کشمیر اس کی ایک زندہ مثال ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی نے بڑی شاندار ہستیاں پیدا کیں۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے، علی برادران، پنڈت مدن موہن مالویہ ایک شاندار ماضی کے بعد فرقہ پرستی کے شکار ہو گئے مگر جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد اور ان کے جوان بخت اور جواں سال رفیق کار بخشی غلام محمد کے قدم بڑے سے بڑے فرقہ پرستی کے طوفان کے سامنے نہ ڈگمگائے۔

جب ہندوستان کی سیکولر ڈیموکریسی (SECULAR DEMOCRACY) کی تواریخ غیر جانبداری کے ساتھ تیار کی جائے تو مجھے کوئی شک نہیں ہے اس میں تین درخشاں ستارے نظر پڑیں گے اور وہ ہوں گے جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد اور بخشی غلام محمد۔

نیا کشمیر ہندوستانی قومیت کا ضامن ہے اور اس کے قائد کی حیثیت سے بخشی غلام محمد کی خدمات آئیندہ آنے والی نسلوں کے لئے خضر راہ ثابت ہوں گی۔

بخشی صاحب ہندوستان کی ان تمام انقلابی روایات کے وارث ہیں جنہوں نے آج ہندوستان کو اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں امن کی تحاریک میں ایک شاندار جگہ دی ہے۔ بخشی صاحب نہ صرف کشمیر کی آزادی کی تحریک کے جنم داتا رہے ہیں بلکہ اس کی تعمیر نو میں ان کا وہی حصہ ہے جو کمال اتاترک کا ترکی کی تعمیر میں تھا۔ شاید شاعر مشرق علامہ اقبال کے دماغ میں بخشی غلام محمد کا تصور تھا جب انہوں نے کہا ؎

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہ ہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

نریش کمار شاد

ہفت رنگ

(خالدِ کشمیر بخشی غلام محمد کی نذر)

۱ روشنی کے ضمیر زندہ باد — صبحِ نَو کے سفیر زندہ باد
تُو رُخِ کاشمیر کی ضَو ہے — خالدِ کشمیر زندہ باد

۲ کیف پرور ہے وادیِ کشمیر — حُسن کا گھر ہے وادیِ کشمیر
جس میں خوشبو ترے شعور کی ہے — وہ گُلِ تر ہے وادیِ کشمیر

۳ تُو نے بدلی عوام کی تقدیر — اے خوشا تیرا جذبۂ تعمیر
ذرّے ذرّے سے آ رہی ہے صدا — آفرین بر تُو خالدِ کشمیر

۴ اپنے اخلاصِ بے پناہ کا رنگ — ہر کسی کی نظر میں بھرتا ہو
حکمراں ہے وہی جو تیری طرح — حکمرانی دلوں پہ کرتا ہو

۵ کیوں نہ ہو دردمند دِل تیرا — تیرے سینے میں ہے عوام کا دِل
تُجھ سے وابستہ شوکتِ کشمیر — "تجھ سے تاباں جبینِ مستقبل"[1]

۶ تُو حقیقت میں خالدِ کشمیر — ایک شمشیر بھی ہے ساز بھی ہے
فطرتاً سرفروش ہے لیکن — طبعاً اِک ادب نواز بھی ہے

۷ ہوں دُعا گو بقولِ غالبؔ میں — اے نئے کاشمیر کے معمار
"تُو سلامت رہے ہزار برس — ہر برس کے ہوں دِن پچاس ہزار"

[1] یہ مصرع حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا ہے (شاد)

حافظ علی بہادر خان

بخشی غلام محمدؒ

چند جھلکیاں —— چند تاثرات

انگلستان کے مشہور زمانہ شاعر شیکسپیئر کی بہترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ اُس کی ذات "وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت" کی حامل تھی۔ HE WAS ONE IN MANY MANY IN ONE ۔ بخشی صاحب میں بھی یہ کمال پایا کہ مجاہدوں میں مجاہد، مدبروں میں مدبر، مقرروں میں مقرر، دوستوں میں دوست، ادیبوں میں نکتہ سنج، شاعروں میں سخن شناس اور سب سے بڑھکر یہ کہ انسانوں میں انسانیت کے علمبردار ہیں۔ ان تمام خانوں میں اُن کی زندگی کے مظاہر سے بٹے ہوئے ہونے کے باعث ایک مختصر مقالہ میں صرف چند جھلکیاں یا چند تاثرات ہی پیش کئے جا سکتے ہیں اور قارئین سے یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ

(ع) تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

منصوبہ بندی کے موجودہ دور میں معذرت کے ساتھ بے ربط تجربات لکھتے ہوئے



خالد لشمير—خادم لشمير

اگر وہ دیکھتے ہیں کہ عوام کے بڑھتے ہوئے جوش کو قابو میں رکھنے کے لئے مقامی انتظامات کافی نہیں ہیں تو فوراً خود ساختہ منتظم بن کر یہ کمال دکھا دیتے ہیں۔ ناگپور کانگریس سیشن میں میں نے دیکھا کہ وسیع میدان کے ایک گوشہ میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ کئی لاکھ کا اجتماع تھا۔ انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ انتظام کی قائم کردہ حدیں توڑ کر ہزاروں آدمیوں نے پلیٹ فارم کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ کتنے ہی آدمی دب گئے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ فوری تدارک نہ ہوا تو بڑی ٹریجڈی ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ تک حشر برپا رہا اور لیڈروں کی اپیلیں بیکار ثابت ہوتی رہیں۔ آخر بخشی صاحب پلیٹ فارم سے کودے اور موقع پر پہنچکر اپنا کمال دکھانا شروع کر دیا۔ یہ عمل برطانوی دور میں جواہر لعل نہرو کیا کرتے تھے اور اب بھی کبھی کبھی پرانا سبق دہرا لیتے ہیں لیکن آج کل بخشی صاحب ہی نے یہ رول اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ کسی بھی عظیم قومی اجتماع میں نظم و ترتیب پر آفت آئی اور بخشی صاحب پلیٹ فارم پر ہوئے تو وہ جلد ہی میدان جنگ کے گھمسان میں پہنچ جاتے ہیں اور مہابھارت کی گیرد دار میں در آنہ گھس کر تھوڑی ہی دیر میں اس طرح نظم قائم کر دیتے ہیں کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ دراصل یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ بخشی صاحب کی محبت دلوں میں ہمہ گیر ہوگئی ہے اور دوسرے اس امر کا ثبوت ہے کہ بخشی صاحب حقیقی معنی میں عوامی لیڈر ہیں۔ صرف کشمیر کے نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے۔

عوام سے تعلقات

چند سال ہوئے سرینگر میں ایک عظیم الشان قومی جشن ہوا تھا جس کی سرگرمیاں ایک ماہ سے زیادہ جاری رہی تھیں۔ مجھے اس وقت "دور جدید" کا خاص نمبر شائع کرنا تھا لہذا کافی عرصہ سرینگر میں قیام کیا۔ اکثر بخشی صاحب کے ساتھ مختلف علاقوں میں سفر کرتا رہا۔ عجیب سماں دیکھا۔ دیہات و قریات میں جگہ جگہ لوگ موٹر روک لیتے تھے اور اپنی ضروریات پیش کر دیتے

تھے۔اکثر درخواستوں پر بخشی صاحب فوراً فیصلے دیتے تھے بعض ایسی درخواستیں رکھ لیتے تھے جن پر تحقیق و غور کی ضرورت ہوتی تھی۔ چونکہ بخشی صاحب کے سفر میں یہ واقعات بالکل عام تھے اسلئے وہ موٹر میں پیچھے کی نشست پر نہیں بیٹھ سکتے تھے بلکہ عموماً ڈرائیور کی برابر ہی بیٹھتے اور اُن لوگوں کی درخواستوں پر اس طرح گفتگو و فیصلہ کرتے کہ میں نے کبھی کسی گروپ کو غیر مطمئن نہیں پایا۔ ایک جگہ کسی دیہاتی مدرسہ کے لڑکوں نے موٹر کو روک لیا۔ شکایت یہ تھی کہ دُور سے تو جشن کے لئے آئے مگر اُن کو پروگرام میں نہیں شریک کیا گیا۔ حالانکہ اس وقت بخشی صاحب یورپ کے بعض خاص سیاحوں سے اہم ملاقات کے لئے جا رہے تھے مگر موٹر سے اُتر کر لڑکوں کی بات سُنی اور انہیں خوش کر دیا۔ اُن کے واپس گھر جانے کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا۔ لڑکے "بخشی صاحب زندہ باد" کے نعرے لگاتے چلے گئے۔

جب بخشی صاحب کی موٹر سرینگر کے حدود میں ہوتی تھی تو دوکاندار دکانوں سے شہری کمروں سے اور آیندہ روند سڑکوں سے "سلام علیکم" کی اس طرح بوچھاڑ کرتے تھے گویا کہ وہ بخشی صاحب کو وزیراعظم سے زیادہ محبوب لیڈر یا رفیق کی حیثیت میں دیکھتے تھے۔ اُن کی کوٹھی کے سبزہ زار میں بھی عوام دور دور سے آکر اکٹھے ہوا کرتے ہیں اور اس طرح اپنے معاملات بے تکلفی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جیسے کہ وہ پُرانے رفیق دوست ہیں۔

میں سنہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور کانگریس میں ڈیلیگیٹ تھا۔ اب چالیس برس سیاسی ہنگاموں میں گزر چکے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر نامی گرامی لیڈروں کے ساتھ زندگی کا کچھ حصّہ بھی گزارنے کا موقع ملا لیکن یہ عجیب رنگ کسی کی زندگی میں نظر نہیں آیا۔ یہ بخشی صاحب کا مخصوص رنگ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ سہ

ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کچھ عرصہ سے دہلی میں بخشی صاحب سے مل کر میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید ذمہ داریاں بڑھنے کی وجہ سے اب اُن کے کیریکٹر کا مذکورہ بالا رنگ تبدیل ہونے لگا ہے۔ لیکن ایک ماہ قبل مراد آباد میں غلط فہمی دُور ہو گئی جبکہ وہاں کے اجتماعات میں بخشی صاحب کے اسی کیریکٹر کی جھلکیاں نظر آئیں۔

بخشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب بہت لوگوں کے نزدیک اپنے اپنے نقطۂ نظر اور ذوق کے مطابق مختلف ہو گا۔ لیکن اکثر اہل فکر میرے ساتھ اتفاق کریں گے جب میں یہ کہوں کہ سب سے بڑا کارنامہ اُن کا یہ ہے کہ کشمیر کی سیاسیات میں انہوں نے توازن پیدا کر دیا ہے یہ توازن ہی کشمیر کی روز افزوں ترقی کا ذمہ دار ہے۔ نہ پاکستان کا پروپیگنڈا اس توازن پر اثر کر سکا، نہ سلامتی کونسل کے مباحثوں سے اس میں فرق پیدا ہوا اور نہ خود کشمیر کے کسی گروپ کی سازش یا تنظیم سے اس سکوں میں کوئی لہر پیدا ہو سکی۔ عوام و حکومت میں پورا پورا تعاون ہے اور عوام جانتے ہیں کہ اُن کی ترقی کا مدار اسی تعاون پر ہے مستقبل کشمیر کے متعلق جو ذہنی توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اس میں کسی داخلی یا خارجی پروپیگنڈے سے ذرا سا بھی خلل آ جاتا تو کشمیر کی تمام ترقیاں ختم ہو جاتیں۔ کشمیر کی سیاسی زندگی کا یہ ہی طغرائے امتیاز ہے جو یورپ، امریکہ، روس اور خصوصاً اسلامی ممالک کے سیاحوں پر اثر ڈالتا ہے۔ دُنیا کے ہر گوشہ کے مدبر۔ صحافی۔ تاجر ادیب اور ہر شعبۂ زندگی سے دلچسپی لینے والے آتے ہیں اور اہل کشمیر کے اس ذہنی توازن کا نہایت گہرا اور خوشگوار اثر لے جاتے ہیں۔ یہ حیرت ہوتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے لٹے پٹے کشمیر کو ایسے پُرسکون ترقی پسند کشمیر میں تبدیل کرنا کیونکر ممکن ہوا۔

اس انقلاب کو بروئے کار لانے کے لئے کشمیر کے جن راہنماؤں نے حصّہ لیا ہے۔

اُن میں بخشی غلام محمد کا نام مؤرخ جلی حروف سے لکھیگا۔ وہ اس انقلاب کے ہر مرحلے سے گزرے ہیں۔ انہوں نے مظلوم و مقہور کشمیر میں بھی مجاہدانہ زندگی گزاری ہے۔ انہوں نے تقسیم کے بعد کے حملوں کے مقابلہ کے لئے بھی نہتے کشمیر کو دفاع کے لئے تیار کر دیا۔ پھر انقلاب کے بعد بھی نفسیاتی لمحہ ایسا آیا جبکہ بخشی غلام محمد نے مولانا آزاد، جواہر لعل نہرو، اور رفیع احمد قدوائی کے مشورہ سے خطرناک حالات کا مقابلہ کرنے کو جرأت مندانہ قدم اُٹھایا اور قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ بے اختیار زبان پر آتا تھا۔

ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پہ جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

بخشی صاحب کی تعمیری سرگرمیوں کے بیان کے لئے شرح ربط درکار ہے۔ اس لئے چند اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ بخشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ کشمیر کی سیاسیات میں انہوں نے ایک ایسا توازن پیدا کر دیا ہے جو ہر خارجی و داخلی حملہ کا کامیاب مقابلہ کرتا ہے اور ترقی کا بہترین ضامن ہے۔

ادبی ذوق

بخشی صاحب کی گرانبار ذمہ داریاں ہیں۔ ملاقات کرنے والوں کے لئے اُن کی قیام گاہ ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرصت بالکل مفقود ہے لیکن نہ معلوم اپنی نیند قربان کر کے یا کسی سحر کارانہ طریقہ سے ادبی ذوق پورا کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ایک پریس کانفرنس میں بخشی صاحب نے نمائندگان اخبارات کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ غالباً مطلب یہ تھا کہ جو صاحب آجائیں گے ان کے قیام وغیرہ کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اس پر ایک صحافی نے ہنس کر کہا کہ آپ نے جگر مرادآبادی کو جو دعوت دی ہے تو اس پر کافی روپیہ بھی صرف کریں گے۔ بخشی صاحب نے فوراً

جواب دیا کہ جگر صاحب کی بات اور ہے "اُن کو تو ہم کشمیر بھی بخش دیں" اس جملہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک بلند پایہ شاعر کے لئے بخشی صاحب کے کیا جذبات ہیں۔ آپ انہیں کسی ایسی صحبت میں بٹھا دیجئے جہاں اعلیٰ شعر پڑھے جا رہے ہوں تو بخشی صاحب عدیم الفرصتی کی شکایت کبھی نہ کریں گے۔ واضح رہے کہ اچھے شعروں کی شرط ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شعر معیاری نہ ہو تو وہ گھبرا جاتے ہیں۔ مشاعرہ کا بھی معیار گر جاتا ہے تو وہ کسی حیلہ سے نکل جاتے ہیں اور اگر معیار بلند ہے تو رات بھر جاگتے رہیں گے۔ سخن سنجی تو ان کا حصہ ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک کشمیری ہونے اور دہلی و لکھنو کی ادبی صحبتوں سے محروم رہنے کے باعث شعر و ادب سے اُن کا تعلق صرف رسمی ہوگا۔ مجھے خود بھی ابتدا میں یہ ہی غلط فہمی تھی لیکن سرینگر کے قیام میں اس غلطی کی اصلاح ہوگئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں اُن کا ذوق اتنا بلند ہے کہ آج تک میں سوچا کرتا ہوں کہ بخشی صاحب میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوئی۔ مکرر لکھتا ہوں کہ وہ معمولی سخن سنج نہیں بلکہ شعر و ادب کے ہر پہلو کو بدرجۂ اتم سمجھتے ہیں اور ان کی داد بہت ہی قابل قدر ہوتی ہے۔ غیر معیاری شعر پر داد دیتے میں نے اُن کو کبھی نہیں دیکھا۔

ہاں ایک بات اور۔ وہ یہ کہ جس طرح شعر و ادب کی صحبت سے انہیں گہری دلچسپی ہے اسی طرح مجلس سماع سے بھی خاص مناسبت ہے۔ اہل کشمیر کی زندگی میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اور بخشی صاحب اس بارے میں کشمیریوں کی پوری پوری نمایندگی کرتے ہیں۔ بغیر کسی خاص مجبوری کے وہ محفل سماع سے نہیں اٹھتے۔

ایک اُلجھن

میری زندگی کا اکثر حصہ مسلمانوں میں کام کرتے گزرا۔ آزادی سے قبل جہاد وطن کی تبلیغ تھی اور آزادی کے بعد جو خاص مسائل مسلمانانِ ہند کے متعلق پیدا ہوگئے ہیں اُن کے حل میں اپنی

تعمیر

حقیر استطاعت کے مطابق مصروف رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دورے کرنے کا بھی موقع ملا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر بخشی غلام محمد صاحب مسلمانانِ ہند کی قیادت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو شائد یہ مسائل حل ہو جائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ فرقہ پرستی کا عفریت اپنے چنگل ہر چہار طرف دراز کر کے ملک و ملت کو بڑی ٹریجڈی سے دوچار کرے گا۔ کئی بار میں نے بخشی صاحب کو ترغیب دی کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلم مسئلہ کے لئے بھی وقت نکالیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ہمیشہ مسلمانانِ ہند کی مشکلات میں مدد کی مگر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ مسئلہ کشمیر کی الجھن مجبور کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے عام مسایل میں صرف ایک حد تک ہی عملی دلچسپی لیں۔ کشمیر کی ذمہ داریاں اتنی گرانبار اور اتنی نازک ہیں کہ اُن کی خاطر وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے ورنہ اس وقت وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے محبوب ترین رہنما ہیں اور انڈین یونین کی حکومت میں بے پناہ اثر رکھتے ہیں۔ لہذا جہاں اور لیڈر ناکام رہتے ہیں وہاں وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اُمید ہے وہ وقت جلد آئے گا کہ مسئلہ کشمیر کی طرح مسلمانانِ ہند کے مسئلہ کو سلجھانے میں بھی وہ قرار واقعی حصہ لے سکیں گے۔

بخشی صاحب کی زندگی کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو سادہ الفاظ میں پیش کر دی گئی ہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا کہ "تعمیر" کے اس نمبر میں مزید گنجائش نکل سکتی ہے تو اور کتنے ہی مشاہدات ہیں جو اشاعت کے مستحق ہیں اور جن میں قوم کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ بخشی صاحب کی زندگی کا لب لباب یہ ہے :- ع۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عرش ملسیانی

خالدِ کشمیر

بشیخِ شہر مرا راہبر نہ بر ہمنے کہ صدق شاں ہمہ ریو است و سربسر تزویر
مراست راہ نما آں امیر اہلِ ہمم کہ نام اوست ملقّب بہ خالدِ کشمیر

بخشی

سخن را اے خدا انداز بخشی بہ ہر شاعر لبِ اعجاز بخشی
سخن را پایہ شد از عرش ارفع سخن را چوں شدہ دم ساز بخشی

غلام محمدؐ

غلام ہمت آنم کہ خود غلام نبیؐ بہ نام خویش غلام محمدؐ عربی
ہزار کفر بہ ذاتش اگر نہ قربان صفات او چو نہ گوئی کمالِ بے ادبی

پرتھوی راج کپور

اپنے بخشی صاحب

میں بخشی غلام محمد سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ اُن میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے وہ خاص بات جو ایک آدمی کو عام آدمیوں سے الگ الگ سا۔ پرے پرے سا۔ اوپرا اوپرا سا رکھے غیر بنا دے پرایا کر دے جس سے ملنے سے آپ کو ہچکچاہٹ سی ہو۔ دہشت پیدا ہو۔ گھن آنے لگے جس کے قریب جاؤ تو محسوس ہونے لگے کہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ رہے ہیں سانس پھول رہی ہے۔ دم نکلنے کو ہے۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ان میں۔ بخشی صاحب اس دیش کے عام آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ اس دیش کے تمام آدمیوں کا سا رنگ روپ۔ عام آدمیوں کی سی ڈیل ڈول عام آدمیوں کی سی بے نیازی ہے۔ بھولپن ہے۔ کوئی تصنع نہیں۔ بناوٹ نہیں۔ پھوں پھاں نہیں۔ ٹھونس ٹھانس نہیں۔ بات چیت بھی عام آدمیوں کی سی۔ کوئی ڈکشنری۔ شبد کوش یا لغات میں سے رٹے ہوئے لفظ نہیں ہیں۔ اُن کی بول چال میں کہ جن کے بولتے ہوئے ایک بھلا چنگا آدمی

بھی یوں معلوم ہونے لگے کہ بخار کے زیر اثر بلبلا رہا ہے ۔ہیجان بک رہا ہے۔ رام جانے کیا کہہ رہا ہے کیوں کہہ رہا ہے۔ کس لئے کہہ رہا ہے اور کس کے لئے کہہ رہا ہے۔

نہیں یہ سب باتیں نہیں ہیں ان میں اور نہ ہی وہ باتیں ہیں جو دُر بھاگیہ وِشس ۔ بدقسمتی سے چند لیڈروں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو لیڈر بننے کے لئے عوام کے پاؤں تلے ہتھیلیاں بچھاتے پھرتے ہیں اور جب اُن کے ووٹ حاصل کرکے لیڈر بن جاتے ہیں۔ تو پھر انہیں لوگوں کے سروں پر پاؤں رکھ کر چلتے ہیں۔ انہیں روندتے ہوئے مسلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

نہیں ان میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ہے کوئی بات تو وہی جو اس دھرتی کے عام آدمیوں کی خاص باتیں ہیں اور جو خاص باتیں آج ہم میں عام طور پر کم نظر آتی ہیں اور جن کے کم ہونے کی وجہ سے ہم اپنی یوجناؤں کو پوری طرح پورا نہیں کر پا رہے اور نہ ہی اس دیش کے مہان آتماؤں کی قربانیوں کے پھل سروپ حاصل کی ہوئی آزادی کا پورا پورا لابھ پوری طرح اٹھا پا رہے ہیں۔

پرغشی صاحب جیسے آدمیوں کو دیکھ کر ڈھارس بندھتی ہے۔ حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ دیش کے مہان نیتاؤں کے دیکھے ہوئے خواب۔ سوچے ہوئے نقوش حقیقت کے سانچے میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ عام اور تمام باتیں ہیں جو اس دیش کے جن سادھارن کی۔ عام آدمی کی بنیادی باتیں ہیں۔ جن پر اس مہان اور پراچین دیش کی عمارت کھڑی ہے اور ہزاروں طوفان سر پر سے گذر جانے کے بعد بھی کھڑی رہی ہے۔ اور کھڑی رہے گی۔ وہ ہیں اس دیش کا آتھیہ۔ اس کی مہمان نوازی۔ سادگی اور سادہ دلی پیسے والے سے بڑھ کر گنّی اور وِدوان۔ عالم اور ہنرمند کی عزّت کرنا۔ زور اور زبردستی کے آگے نہ جھکنا اور پیار اور نیکی کی قدر کرنا اور سب سے بڑھ کر اس دیش کی مٹی سے پیار۔ وہ مٹی جسے بڑوں نے رتن گربھا کہا ہے۔ جو گنج ہے خزانہ ہے بیش بہا

(باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

رسا جاودانی

معمارِ وطن

جوبن پہ ترے دم سے ہے یہ گلشنِ کشمیر
بہمن کی ہواؤں میں بھی ساون کی ہے تاثیر
اے خالدِ کشمیر

یوں مہر مہرِ راحت سے شگفتہ ہوئے خاطر
جیسے کہ بہاروں میں کھلے غنچۂ دِل گیر
اے خالدِ کشمیر

تن من سے تو تعمیر میں سرگرم شبا روز
اور جوشِ عمل میں نہ تکلّم نہ تقاریر
اے خالدِ کشمیر

اُن سب میں تری ذات گرامی ہی رہے گی
کشمیر کی تاریخ میں جتنے ہیں مشاہیر
اے خالدِ کشمیر

اظہارِ حقیقت ہے، نہیں مدح سرائی
شاعر کا قلم کیوں نہ صداقت کرے تحریر
اے خالدِ کشمیر

معمارِ وطن حُبِّ وطن دِل میں ترے ہے
ہے ذکر بھی تعمیر ترا فکر بھی تعمیر
اے خالدِ کشمیر

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے نتیجے کے طور پر اس ملک میں جو مسلمان رہنما باقی رہ گئے تھے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد بخشی غلام محمد صاحب کی ذات ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ راہ و رسم منزل کی نزاکتوں کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پن گھٹ کی ڈگر بہت کٹھن ہے اور اس میں وہی سرخرو اور شاد کام رہ سکتا ہے جو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ جیسی وسیع القلبی اور فراخ نظری سے بہرہ ور ہو۔

بخشی غلام محمد صاحب کو قدرت نے قلب و دماغ کی جو خوبیاں عطا کی ہیں ان کی تفصیلات فرصت اور موقع چاہتی ہیں۔ ان کی انتظامی قابلیت کے کرشمے کسی کو دیکھنے ہوں تو وہ کشمیر جنت نظیر میں چند روز گذار آئے جس اتفاق سے مجھے دو سال قبل اس کا موقع ملا ہے اور چونکہ وہاں میں خود اپنی موٹر میں گیا تھا اس لئے قریہ قریہ اور جگہ جگہ ٹھہرنے اور کشمیری عوام سے ملنے اور ان سے بے تکلف بات چیت کرنے کے متعدد مواقع ہاتھ آئے تھے۔ ہر جگہ کے بچے اور بوڑھے اپنے وزیر اعظم کی انتظامی قابلیت اور عوام کے دکھ درد کے احساس کے دل سے قائل نظر آئے۔

میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص ان کی ہمہ جہتی مصروفیت اور جذبۂ ہمدردی کے بارے میں رطب اللسان ہے۔ بلا لحاظ مذہب و ملک سبھوں نے یہی کہا کہ "اگر اس وقت وہ نہ ہوتے تو آج ہم بھوکوں مرجاتے۔ ہمارے ملک کے لئے ان کی ذات خدائے تعالیٰ کا ایک بہترین اور بےنظیر عطیہ ہے اور ہم شکرگذار ہیں کہ اس زمانے میں بخشی صاحب ہمارے سفینے کے ناخدا ہیں۔"

میں نے خود دیکھا کہ ہر تقریب میں بخشی صاحب کی بلند و بالا شخصیت عوام و خواص دونوں کے ساتھ میل ملاپ میں ایسا مخلصانہ برتاؤ کرتی تھی کہ ملنے والوں کے دل ان کی محبت اور عقیدت سے معمور ہو جاتے تھے۔

کارفرمائی اور مقبولیت عامہ کے ان جوہروں کے علاوہ بخشی صاحب کو ادب اور موسیقی اور شاعری سے جو گہری دلچسپی ہے اس سے ذاتی طور پر واقف ہونے کا مجھے ابھی چند ماہ قبل موقع ملا ہے جبکہ وہ ایوان اُردو کا افتتاح کرنے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

ہندوستان کی تہذیبی روایات اور ہمارے مشترکہ کلچرل ورثہ کی خصوصیات پر بھی ان کی بڑی گہری نظر ہے اُردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے جتنا انہماک اُن میں نظر آیا ہندوستان کے دوسرے مسلمان قائدین میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوان اُردو کی افتتاحی تقریب کے موقع پر میں نے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ بخشی صاحب مولانا آزاد مرحوم کے بعد اُردو والوں کے سب سے بڑے لیڈر اور رہنما ہیں اسی لئے ان کی نظریں ہر ضرورت کے وقت اُنہی کی طرف اٹھتی ہیں۔

ان سب خصوصیات اور خوبیوں کے علاوہ جو بات ان کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے میری نظر میں وہ ان کی خدا ترسی اور تصوّف و عرفان سے ان کا بےپایاں انہماک ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مخلوقِ خدا کی خدمت میں رات دن مصروف رہتے ہیں اور بلا امتیاز

مذہب وملت اچھے اور برے دوست اور دشمن گورے اور کالے ہر ایک کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرتے ہیں۔

یہ آسان کام نہیں ہے۔ خاص کر ایک سیاسی رہنما کے لئے اور اس سے بڑھ کر کشمیر جیسی ریاست کے وزیراعظم کے لئے۔ لیکن بخشی صاحب کے ذاتی خیالات اور طبعی رجحانات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے راستے کی کٹھنائیاں روز بروز آسان ہوتی جائیں گی اور ہوتی جا رہی ہیں۔

شاندار ترقی

"انڈین یونین کے ساتھ الحاق کی بدولت ہم اس ریاست کے لئے ایک جمہوری اور ترقی پسندانہ آئین بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ آئین سیاسی اور اقتصادی آزادی اور سماجی ترقی کے لئے عوام کی آرزوؤں اور امیدوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ جموں وکشمیر میں رہنے والے باشندوں کے حقوق اور مراعات کا چارٹر ہے اور ان کو ترقی اور خوشحالی کے بے شمار مواقع فراہم کرتا ہے۔ تاکہ وہ ہندیونین کی دوسری سٹیٹوں کے عوام کے شانہ بشانہ مساوی طور پر پُرامن لیکن تواریخی انقلاب کا پھل حاصل کر سکیں جس کے نتیجہ میں کروڑوں لوگوں کی قسمت بنائی جا رہی ہے تاکہ ان کی زندگی کا معیار اونچا ہو۔"

بخشی غلام محمد۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

دو قومی نظریے کا واٹرلو

"کشمیر دو قومی نظریے کے لئے واٹرلو کا میدان ثابت ہوا ہے، جہاں اس بے بنیاد نظریے کو انسانیت اور قومیت کے ارفع اصولوں کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ہم نے دائمی اور قائمی رشتہ استوار کرلیا ہے اور جب تک چاند اور سورج کی تابانیاں قائم ہیں، یہ رشتہ قائم رہے گا۔ آج سارے ہندوستان میں نئی زندگی موجزن ہے اور نئے ارمان انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں جمہوریت کے ارتقا اور سیاسی استحکام کے ایک روشن اور تابناک باب کا اضافہ کیا ہے۔ عظیم تعمیری منصوبے بلاشبہ نئے ہندوستان کے وہ عظیم معبد اور پوتر استھان ہیں جو ہماری لازوال خوشیوں کی تمہید باندھ رہے ہیں۔"

—————— بخشی غلام محمد

ناطق گلاؤٹھوی

نذرِ نیاز

آپ کو بخشی ہے بخشی جی خدا نے برتری
بُرجِ اقبال و شرف کے نیرِ تاباں ہیں آپ

سربلندی آپ کی ذاتِ گرامی پر نثار
ہر بلندی کی بلندی کے لئے ساماں ہیں آپ

خاکساری آپ کی، خاکِ وطن کی تاجدار
سرفروزانِ جہاں میں گوہرِ تاباں ہیں آپ

انکسار ایسا، خلوص ایسا، نہیں جس کا جواب
ہے عبارت خوبیِ اخلاق اور عنواں ہیں آپ

آپ سے ہوتا ہے پیدا جذبۂ حُسنِ عمل
جرأت افزائے زماں ہیں ہمتِ مرداں ہیں آپ

اِک نمونہ بن گیا ہے حُسنِ کردار آپ کا
بے گماں طرزِ عمل میں نازشِ دَوراں ہیں آپ

آپ بیواؤں، یتیموں، بے کسوں کے سرپرست
بے سر و ساماں غریبوں کے سر و ساماں ہیں آپ

آپ اہلِ غم کی دُنیا میں ہیں تسکیں کا پیام
ہر مرض، ہر درد، ہر دُکھ کے لئے درماں ہیں آپ

ہیں نکو کردار، نیکی پر ہمیشہ ہے خیال
امتیازِ ظاہر و باطن نہیں، یکساں ہیں آپ

ہر کہہ و مہ پر برابر آپ کے احسان ہیں
مُلک والوں پر خُدا کا اِک بڑا احساں ہیں آپ

لازم و ملزوم کی سی کچھ نظر آتی ہے شان
آپ پر ہے دیس نازاں، دیس پر نازاں ہیں آپ

دِن بدن بڑھتی چلی ہے قوم کی شان و وقار
ہر بھلائی، ہر ترقی کے لئے کوشاں ہیں آپ

ہند کا ٹکڑا ہے کشمیر آپ ہر دو ہی کے دوست
وحدتِ ملکی ہے اور دو قالب و یکجاں ہیں آپ

گھر گئی تو ہے بد اندیشوں کے لشکر سے ضرور — کیا بگاڑے گا کوئی اُردو کے جب نگراں ہیں آپ
آپ سیف اللہ ہیں دیتے ہیں باطل کو شکست — حق کی نصرت آپ سے ہے خالدِ دوراں ہیں آپ
ہے نمایاں آپ سے وضعِ بزرگانِ سلف — واجب التکریم ہیں، اکرام کے شایاں ہیں آپ
مجمع اخلاقِ حسنہ منبع لطفِ عمیم — ناز ہے انسانیت کو جس پہ وہ انساں ہیں آپ
مرحبا نغمہ سرائے فَادْخُلُوهَا خَالِدِين — گلشنِ فردوس ہے کشمیر اور رضواں ہیں آپ

کہہ نہ دو ممدوح کو ناطق محمد کا غلام
اس سے بڑھ کر کیا کہیں کہ کس لئے حیراں ہیں آپ

جی، ایم شاد

کوہ صفت

آبشاروں کی روانی ہے تری طبعِ رسا
تیری فطرت میں فلک بوس پہاڑوں کا جلال
حوصلے تیرے بلند، اور بلند، اور بلند
غیر ممکن نہیں تیرے لئے کوئی بھی سوال
تیری محنت سے، ترے ذوقِ چمن بندی سے
کھل رہے ہیں مرے کشمیر میں گلہائے خیال
عزم نے تیرے پہاڑوں کو دھنک ڈالا ہے
یہ ٹنل ہے ترے خوش رنگ ارادوں کا جمال
یہ ہے آئین، ترے عہد کا شہکار حسیں
اور یہ بھی تری ثابت قدمی کا ہے مآل
کامیابی کو نئی راہ گذر بخشی ہے
ایک اِک گام تری راہبری کا ہے کمال

کے۔ ایل۔ شریدرانی
(امرت بازار پتریکا)

کردار کا غازی

بخشی غلام محمد ۹ اگست ۱۹۵۳ء سے ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم ہیں۔ اُن کی شخصیت کو بجا طور پر ایک عظیم کوہ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ وہ پیر پنچال کے کسی سلسلۂ کوہ کی طرح مضبوط، توانا اور ٹھوس دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے پیکر میں اس حسین وادی کی رعنائیوں کا دل کش امتزاج ملتا ہے۔ گو کشمیریوں کے عام حُلیے کے پیشِ نظر وہ کچھ سیاہ فام سے لگتے ہیں۔ مگر اُن کا رنگ گندمی ہے جس میں زردی کا کوئی شائبہ نہیں۔ اُن کی جسمانی ساخت ایک ماہرِ فن کھلاڑی کی سی ہے اور اُن کی آواز میں مردانگی کا وقار اور گرج ہے۔ نصف صدی کی عُمر میں بھی اُن کا چہرہ ابھی ایسا ہی صاف اور بے شکن ہے جیسا اُس برف کا چہرہ، جو وادی کے چاروں طرف ڈیرا ڈالے ہے۔

کوہ صفت بخشی کے حیات و کردار کا تجزیہ بھی اُسی روشنی میں کیا جانا چاہیئے جیسے کہ پہاڑوں اور وادیوں کا کیا جاتا ہے۔ وادئ گنگا کے میدانوں کو ماپنے والا پیمانہ کسی غیر ہموار قطعۂ زمین کو ماپنے کے لئے بہت نازک اور غیر مکتفی ہوگا۔ بمبئی کے معیار کے مطابق ممکن ہے کہ بخشی صاحب

کو بلند الصوت کہا جائے۔ مگر وادی میں اپنی آواز سنانے کے لئے یہ صفت لازمی تھی تاکہ اُن کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر ہوئی اس بیضوی وادی میں صدائے بازگشت پیدا کرے۔ میدانی علاقوں میں بسنے والا اُن کی چال کو دیکھ کر خیال کرے گا کہ وہ جب راستے پر قدم اٹھاتے ہیں تو اپنی قامت کا سارا بوجھ ایک ہی طرف ڈال دیتے ہیں۔ مگر یہ دراصل ایک پہاڑی باشندے کی رفتار ہے جس میں تعجیل کو دخل نہیں جو پورے اعتماد سے قدم اُٹھاتا ہے۔ اُن کی طرزِ گفتار کے متعلق میدانی علاقوں کا باشندہ شاید یہ سوچے کہ بخشی صاحب کا انداز قدرے کھُردرا اور ایک ناتراشیدہ ہیرے کی طرح ناہموار ہے۔ مگر یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جانی چاہیئے کہ ملمع کئے ہوئے گوہر برف کی اس فراوانی میں اپنی آب و تاب کھو دیتے ہیں۔ میدانوں میں رہنے والے سیاست دانوں کے لئے چاہے کچھ بھی صفات ضروری ہوں بخشی صاحب کی ذات اُن صفات کا مجموعہ ہے جن کی نشو و نما کے لئے سرزمینِ کشمیر سازگار ہے۔

بخشی صاحب اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاتے کہ وہ ایک مزدور کے بیٹے ہیں۔ وہ ایک امریکی کی طرح اپنے معمولی سلسلۂ نسب کی کہانی بیان کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ انتہائی غربت سے اپنی پرواز کی ابتدا کر کے وہ دنیا کی حسین ترین وادی کے وزیر اعظم بنے اور یہی ان کی زندگی کا افسانہ ہے۔ اپنے خاندان کی بہت ہی خراب حالت کی وجہ سے وہ میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے اور پیٹ پالنے کے لئے انہیں لداخ میں ایک اُستاد بن کے جانا پڑا۔ لداخ جو ایک کشمیری کے لئے بھی عزلت اور خنکی کی آخری حد ہے۔

وہ سرینگر شہر کے قلب میں پیدا ہوئے۔ شاید چھٹے یا ساتویں پل کے قریب۔ اُن کی ولادت کی اس تخصیص نے بھی اُن کے سیاسی کردار کو تشکیل دینے میں کافی حصہ ادا کیا ہے۔ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے جنم کے وقت سے سرینگر کی اندرونی جنگِ اقتدار بعض مواقع پر ساتویں پل اور

شنکر آچاریہ کی پہا ڑی کے معرکہ کارزار کا رُوپ دھار سکتی ہے۔ ساتویں پُل کے نزدیک عوام رہتے ہیں اور شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے سائے میں پیلس ہوٹل اور یوراج کے محل کے ساتھ ساتھ جی ایم صادق کا بنگلہ واقع ہے جو آج بخشی صاحب کے حریف بنے بیٹھے ہیں۔

بخشی صاحب ساتویں پُل کے رہنے والوں سے براہِ راست متعلق ہیں، اور شنکر آچاریہ کے خود ساختہ دانش وروں پر طنز کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ گو یہ بات صحیح ہے کہ اب اُن کی سرکاری قیام گاہ نیڈوز ہوٹل کے پاس واقع ہے (جو شیخ عبداللہ کے سسرال والوں کی ملکیت ہے) مگر پھر بھی اُن کے بہت سے متعلقین ساتویں پُل میں بستے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ بخشی صاحب سے سوال کیا کہ کشمیر میں اُن کا سب سے پسندیدہ مقام کونسا ہے؟ میرا خیال تھا کہ قرعہ فال کوکرناگ گلمرگ یا سونہ مرگ پر پڑے گا۔ مگر جواب ملا۔ "پہلگام ہے" جس وقت کا یہ واقعہ ہے اُس وقت ہم اُن کی پہلگام کی چھوٹی سی رہائش گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے جو ایک شور مچاتی ہوئی ندی کے کنارے تعمیر کی گئی ہے۔ آگے چل کر انہوں نے بتایا کہ رواں دواں پانی کا تلاطم انہیں مرغوبِ خاطر ہے۔ اس موقع پر انہوں نے اس انداز سے کہا جیسے وہ خود کلامی میں مصروف ہیں۔ "جب اس تلاطم پر گوش برآواز ہوتا ہوں تو میں بھول جاتا ہوں کہ میرے گرد و پیش میں کون کیا کر رہا ہے۔"

اُس موقع پر انہوں نے اُس تنگ وادی میں سے دیودار کے درختوں کی طرف دیکھا جو اُسی طرح پہاڑی سے چپکے کھڑے تھے جیسے اُون بھیڑ کی کھال کے ساتھ چمٹی ہوتی ہے۔ اور کہا کہ "یہاں پر دیہات کا سا الھڑ پن ہے اور میں دیودار کے درختوں کی سرسراہٹ سے بہت محظوظ ہوتا ہوں۔" گو بخشی صاحب کسی بھی لحاظ سے تصنع پسند نہیں ہیں لیکن وہ شاعری کے بڑے رسیا ہیں۔ بسنت لال جو شاعر بھی ہے اور گوّیا بھی اور کسی دوسری ہی دُنیا کی مخلوق دِکھائی دیتا ہے۔ ہمیشہ بخشی صاحب کے قرب و جوار میں دکھائی دیتا ہے کبھی اقبال کے اشعار سے سند لاتا ہے۔ اور کبھی اپنے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور

تعمیر

اپنے چہرے پر ہر وقت رقص کناں تبسّم کو چھپانے میں ناکام رہتا ہے۔ بخشی صاحب عُمر خیام کے شیدائی بھی ہیں اور غالبؔ کے فدائی بھی۔ اور اُردو شاعری بہ حیثیت مجموعی اُن کے ذوق پر چھائی ہوئی ہے
پہلگام کی بارک نُما دیواروں والی رہائش گاہ کا خاکہ بخشی صاحب کے دماغ کی تخلیق ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ بخشی صاحب نے اب ایک قسم کے انجینئر کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور وہ ریسٹ ہاؤسوں کے ڈیزائن بناتے ہیں اور اُن کے مقام کا تعیّن کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال کوکرناگ کے ریسٹ ہاؤس کی ملحقہ عمارت ہے۔ پہلگام کی یہ چھوٹی سی رہائش گاہ ڈیزائن اور ماحول کے لحاظ سے ذوقِ نفاست کی بہت عمدہ مثال ہے۔ اُوپری منزل ایک سمندری جہاز کے تختے کا سا تاثر پیدا کرتی ہے اور بخشی صاحب کے مرغوب دریچے کے نزدیک اُن کی مرغوب کُرسی پڑی رہتی ہے جہاں سے وہ آبِ رواں کے نغمے سُنتے رہتے ہیں۔ وہ چار بجے علی الصباح بیدار ہوتے ہیں اور اس حالت میں فائلوں کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اُن کا پرائیویٹ سیکرٹری تک وہاں موجود نہیں ہوتا۔ وہ تیز رفتاری میں یقین رکھتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ چاہے غلط ہوں یا صحیح، فیصلے جلد جلد لئے جانے چاہئیں۔ چیانگ کائی شیک کے ساتھ اُن کا یہ عقیدہ مشترک ہے کہ زندگی کی نامرادی ایک ہی ہے کہ عمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اس کے بعد وہ دہلی سے نکلنے والے پانچ اخباروں کو ابتدا سے انتہا تک پڑھ ڈالتے ہیں۔ وہ خبروں کا نہایت ہی صحت مند ادراک رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ خبر کی ساخت کیا ہے، خبر کب بنتی ہے اور اسے کیسے وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

یہ راز اب راز نہیں رہا کہ سردار پٹیل یا شیخ عبداللہ کی بہ نسبت بخشی صاحب کو ہمیشہ زیادہ پسند کرتے تھے۔ میں نے اکثر موقعوں پر بخشی صاحب کی زبانی سردار سے متعلق بہت سے دلچسپ قصّے اور لطائف سُنے ہیں۔ درحقیقت یہ دو شخصیتیں بہت سی حیثیتوں میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ دونوں ہیروں کی طرح سخت ہیں اور دونوں کی شخصیتوں میں ناتراشیدہ ہیروں

کی ہی طرح کھردرے اور ناہموار پہلو ملتے ہیں۔ دونوں دانش مند ہیں مگر دونوں سخت و تند بھی ہیں۔ سردار پٹیل کے مانند بخشی صاحب بھی دن کا اکثر حصہ مختلف النوع لوگوں سے ملنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ صبح سویرے فائلوں کے ساتھ چند گھنٹے صرف کر دینے کے بعد اُن کی رہائش گاہ ایک شارع عام بن جاتی ہے۔ پہلگام کے کاشانہ خلوت میں بھی انہیں اکیلا رہنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ شاید وہ خود بھی اکیلا رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے ہیں جن میں بیرونی ملکوں سے آنے والے سیاح، سرکاری افسر، تنظیم کے کارکن اور عرضی نیاز تک شامل ہوتے ہیں۔ سرینگر کے صحافیوں نے مجھے اس امر کا یقین دلایا ہے کہ وہ بخشی صاحب سے کسی بھی وقت کسی دقت کے بغیر ملاقات کر سکتے ہیں اور اُن سے براہِ راست ٹیلیفون پر بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ جب اجتماعات اور اجلاسوں کا انعقاد ہوتا ہے تو حاضرین کے لئے آمد و رفت اور خورد و نوش کے انتظامات کے لئے خود اہتمام کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا ہے کہ وہ عوام کے لئے تو ہیں مگر وہ عوام سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ اپنی وگوں ملید برہمن نسب کے خون کی روانی کا قصہ مزہ لے لے کر بیان کرنے کے شیدائی ہیں۔ اس کے برعکس بخشی غلام محمد اسی حد تک عوام کے لئے ہیں جس قدر وہ اُن سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اُسی قسم کے ماحول میں جنم لیا جس میں لاکھوں کشمیری سانس لے رہے تھے۔ ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کے نقطۂ عروج پر بھی وہ عام کشمیری کے اطوار و عادات سے بے بہرہ نہیں ہوئے۔ یہ اُن کے لئے کوئی نیا کردار نہیں ہے۔ اُس وقت بھی جب شیخ عبداللہ اقتدارِ اعلیٰ کی مسند پر متمکن تھے بخشی غلام محمد نائب وزیرِ اعظم تھے اور عوام کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا اُن ہی کا کام تھا۔ بحیثیت وزیرِ اعظم انہوں نے عوامی رابطے پر اپنی پوری توجہ صرف کی ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وادی کے دیہاتیوں کا شہر کے باشندوں کے ساتھ جذباتی ہم آہنگی کا اہم کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ گو یہ رفتہ رفتہ تکمیل پذیر

ہوتا جا رہا ہے۔

حال ہی میں مجھے بخشی صاحب کے ساتھ کار میں سرینگر سے پہلگام جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈرائیور کے علاوہ کوئی اے ڈی سی یا پہرہ دار ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ کوئی دوسری حفاظتی جیپ بھی ہمارے ساتھ نہ تھی۔ یہ واقعہ شیخ عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے دس پندرہ دن بعد کا ہے جبکہ بیرونی دنیا میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کشمیر میں طوفان بپا ہو جائے گا۔ پہلگام جاتے ہوئے راستے میں ایک موڑ پر پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کچھ لوگوں نے ہماری کار روک لی۔ میرے دل میں کئی اندیشے پیدا ہوئے۔ بخشی صاحب کار سے فوراً باہر آئے اور پیار سے ایک آدمی کی پیٹھ پر تھپکی دی اور دوسرے کو اس کے نام سے پکارا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ دراصل فریادی ہیں۔ بخشی صاحب نے فریادیوں سے درخواستیں لے کر ان کا سرسری جائزہ لیا۔ ایک درخواست میں درخواست دہندہ نے اپنے سکول جانے والے بچے کے لئے مالی امداد کی درخواست کی تھی۔ بخشی صاحب نے وہیں پر اُسے ایک سو روپے دئے باقی درخواستیں آپ نے جیب میں رکھ لیں اور درخواست دہندگان سے وعدہ کیا کہ ان پر ضروری کارروائی کی جائے گی۔ میں نے یہ نظارہ بار بار دیکھا۔ ہر گاؤں اور ہر اجتماع میں ان کے شناسا لوگ موجود تھے۔

حاکم اور عوام کے درمیان اس قسم کے ذاتی تعلقات خیرہ کر دینے والے ہیں۔ عام طور پر اس قسم کے تعلقات اُس وقت تک پیدا نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ جب تک حاکم کی شخصیت ہمہ گیر اور جامع نہ ہو۔ امریکہ جیسے اعلیٰ قسم کے جمہوری ڈھانچہ والے ملک میں بھی انتخابات کے زمانے میں سیاست دانوں کو بچوں کو چُوم لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ابھی ابھی مہاراجہ کی مطلق العنانیت سے خلاصی پائی ہو۔ اس قسم کے تعلقات ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کچھ کم نہیں۔ میں نے ہندوستان کے ایسے بہت سے سیاست دانوں کے ساتھ سفر

کیا جو لوگوں میں سے ہیں۔ اور جو اختیار و اقتدار کے مالک ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے رابطہ قائم رکھنے کے راز سے آگاہ ہیں۔ لیکن بخشی صاحب ان سب میں نرالی شان رکھتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں تمام اُن لوگوں پر سبقت لے جاتے ہیں جنہیں میں جانتا ہوں اور جو وسیع و عریض ہندوستان پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ دہلی میں بھی پولیس یا پہرہ داروں کی حفاظت میں گھومنا پھرنا اچھا خیال نہیں کرتے ہیں۔ بخشی صاحب کے اس طرزِ عمل نے کئی ایسے مرکزی وزیروں کو حیرت میں ڈال دیا ہے جو پہرہ داروں اور خبر گیری کرنے والے چپڑاسیوں سے بھری ہوئی جیپوں کی حفاظت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا خیال تک بھی نہیں کر سکتے حالانکہ یہ بات حیران کن ہے کہ کوئی بھی شخص ایسے مرکزی وزیر کو مار ڈالنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا جب کہ بخشی صاحب اب بھی ایک مابہ النزاع شخصیت ہیں۔

سرینگر سے بیس میل دُور ایک گاؤں میں کشمیر کی مشہور و معروف وطن پرست شاعرہ حبہ خاتون کی یاد میں ایک مجلس منعقد ہو رہی تھی۔ بخشی صاحب معزز مہمانوں کے ایک گروہ کو مسز وجے لکشمی پنڈت کی قیادت میں اس جگہ لے گئے۔ بخشی صاحب وہاں پہنچتے ہی ڈائس اور مہمانوں کو چھوڑ کر تقریبات میں شریک ہوئے اور لوک گیتوں کے آہنگ پر اپنے ہاتھوں کو بجاتے رہے۔ آپ نے مائیک کو اپنے سامنے لایا اور کارروائی پر رواں تبصرہ کرنے لگے۔ آپ مذاق کرتے رہے اور دیہاتی عوام ہنستے رہے۔ معزز مہمانوں نے اس خوشگوار ڈرامے کو بے حد پسند کیا۔ آپ نے ایک رقاص کو تیزی سے ناچنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ ان کے مہمانوں میں ایک مشہور کلاسیکل رقاص بھی موجود تھا۔ مسز پنڈت موقعہ پاتے ہی فرار ہو گئیں کہ مبادا بخشی صاحب ان سے بھی کسی بات کی فرمائش نہ کریں۔ کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ نہ صرف خود تقریبات میں حصّہ لیتے ہیں بلکہ اپنے مہمانوں کو بھی ایسا کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ سب کو محفل کے رنگ میں شریک کر کے کیف و سرود سے محظوظ کرنا چاہتے ہیں۔



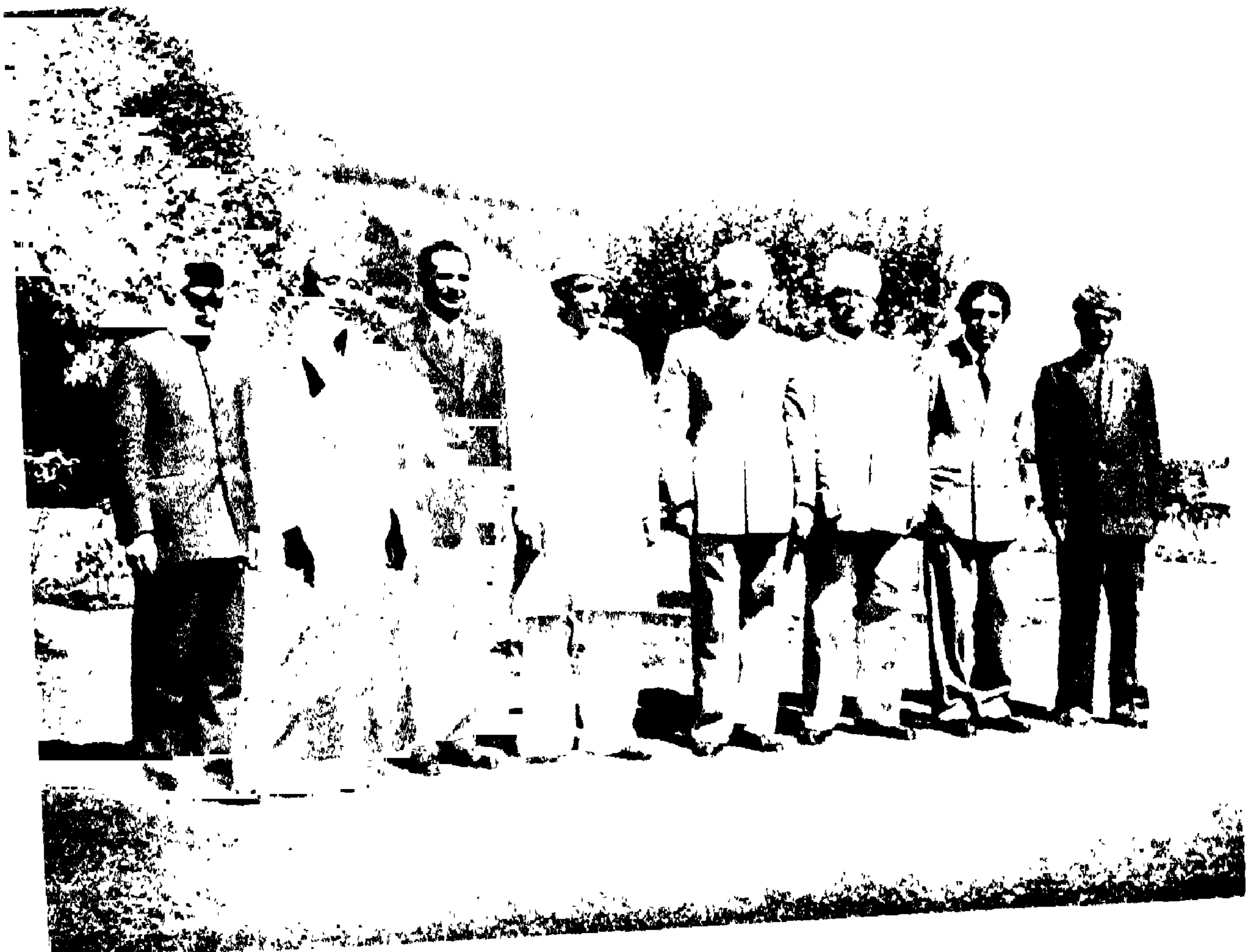
ہندوستان اور کشمیر کا ناطہ اٹوٹ ہے
راجن بابو



شری نہرو نے منزل آزادی کے ہر
مرحلے پر ہمیں سہارا دیا -
بخشی صاحب



آچاریہ ونوبھاوے کے مقدس
مشن کے لئے میں سارا کشمیر
دان دینے کے لئے تیار ہوں -
بخشی صاحب



صدر ریاست اور رفقا کابینہ کے ہمراہ

بخشی صاحب کا کنبہ سرینگر کے سب سے بڑے کنبوں میں سے ایک ہے جب کنبہ کے افراد ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں تو ایک بڑے مجمع کا سماں بندھ جاتا ہے آپ کے یہاں جوائنٹ فیملی سسٹم کا رواج ہے اور آپ کے پانچ بھائی ہیں جن میں کچھ تجارت کرتے ہیں۔ آپ کے کنبہ میں دس گریجویٹ ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی سرکاری ملازمت میں نہیں ہے۔ بخشی صاحب کا ایک اکلوتا لڑکا ہے جس نے جرمنی میں تربیت حاصل کی اور ایک جرمن نسل کی لڑکی سے بیاہا گیا ہے۔ آپ کی ایک لڑکی بھی ہے جس کا شوہر انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں لیا گیا ہے۔

آپ ۲۰ جولائی ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے ہیں۔ نوجوانی کے زمانے میں آپ ایک اچھے کھلاڑی بہترین تیراک اور کوہ پیما تھے۔ آپ فٹ بال اور ہاکی بھی کھیلا کرتے۔ آپ اُس وقت ایک معمولی اُستاد تھے جب آپ مہاتما گاندھی کی تحریک سے متاثر ہوئے۔ آپ نے نوکری چھوڑ دی اور آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن کی مقامی شاخ میں مُلازم ہوئے۔ آپ ۱۹۳۱ء میں مسلم کانفرنس میں شامل ہوئے یہاں طلبا اور مزدوروں کو منظم کرنے کے سلسلے میں آپ کی رہنمایانہ صلاحیتیں اُبھریں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کو طلباء کی ایک سٹرائیک منظم کرنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ ۳۴-۱۹۳۳ء کے دوران میں آپ نے ڈوگرہ شاہی کے ظلم و تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کر کے "خالدِ کشمیر" کا لقب پایا۔ ۱۹۳۸ء میں آپ پولیس کو چکمہ دیکر روپوش ہوئے۔ یہ آپ ہی تھے جس نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دینے کے فوراً بعد ریاست کے اطراف و اکناف میں کانفرنس کی کمیٹیاں قایم کیں۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی رہنمائی آپ نے اُس وقت کے برطانوی ہند میں بیٹھ کر کی۔ جب ریاست میں عوامی حکومت قایم ہوئی تو شیخ عبداللہ کی قیادت میں آپ اُس حکومت کے نائب وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی معزولی اور گرفتاری کے بعد آپ ریاست کے وزیراعظم مقرر ہوئے اور حکمران پارٹی آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر چُنے گئے۔

بہ حیثیت وزیراعظم وہ ایک قدیم مُغل روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بخشی صاحب نے کچھ دن مخصوص رکھے ہیں جب کہ کوئی بھی شخص بآسانی اپنی شکایت لے کے اُن سے مِل سکتا ہے اُن کے ساتھیوں میں سے کسی سے کوئی شکایت متعلق ہو تو وہ برموقع رفع کی جاتی ہے وہ سخت بھی ہیں اور مہربان بھی لیکن اپنے فرائض کا انہیں پُورا پُورا احساس ہے۔ ریاستی سیکولرازم پر ان کا یقین اٹل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے لئے کشمیر کا ہند سے الحاق ایک دائمی اور قائمی رشتہ ہے اور اس سلسلہ میں شیخ عبداللہ ہو، یا سیکورٹی کونسل، وہ کسی بھی طوفان سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بخشی صاحب فرقہ پرستوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور سازشیوں پر رحم نہیں کھاتے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء کے سیلاب میں اپنی بہادری اور جواں مردی کا ایک اور ثبوت دیا ہے جب کہ انہیں گھٹنوں تک پانی میں سے گذرتے ہوئے کندھوں پر چاول کی بوریاں لئے میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔

بخشی صاحب اب بھی جی، ایم صادق جیسے پُرانے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے الزامات کا جو وہ بخشی صاحب پر بد انتظامی، رشوت ستانی اور ریاست میں ہندوستان کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے بارے میں دیتے ہیں۔ بخشی صاحب کے پاس صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ ان کو ان الزامات کا جواب اپنے آپ سے ہی حاصل کرنا چاہئے۔ کیونکہ کل تک تو یہ لوگ خود بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالے تھے۔ وہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے ذاتی حملوں کے باوجود ان سے قطعاً مایوس نہیں ہوتے۔ میں نے سرینگر میں ان کے بلند کردار کا ایک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جب کہ ریلوے کے مرکزی وزیر مسٹر جگ جیون رام کے اعزاز میں بخشی صاحب کی طرف سے ایک استقبالیہ دعوت دی گئی۔ پارٹی میں بہت سے لوگ بخشی صاحب نے مدعو کئے تھے جن میں دہلی کے وزراء اور کئی سفیر جو بہ حیثیت سیاح کشمیر آئے تھے، موجود تھے اور جو پلیٹ فارم پر مرکزی وزیر کے پاس بیٹھے تھے۔ صادق صاحب کچھ دُور پلیٹ فارم کے نیچے علیحدہ ایک میز پر بیٹھے تھے۔ کر

بخشی صاحب فوراً صادق صاحب کے پاس گئے اور انہیں کھینچ کر اپنے ساتھ پلیٹ فارم پر لے آئے اور ان کو معزز مہمانوں کے حلقہ میں بٹھالیا اور خود تو میزبانی کرتے رہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ان کا مقابلہ ہر مرحلے پر ان کے سابق رہنما، ان کے سابق وزیراعظم اور ان کے موجودہ قیدی کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔ باہر سے آنے والے سیاح ان دونوں شخصیتوں کا ذہنی موازنہ کرتے ہیں۔ ریاست کے لوگ خاموشی سے ان کی مجموعی شخصیتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ ساتھی، جنہوں نے ان دونوں کے ساتھ کام کیا ہے غیر شعوری طور پر ان کا موازنہ کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود بخشی صاحب بھی شیخ عبداللہ کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتے ہیں جسمانی طور بخشی غلام محمد بلند قامت ہیں لیکن شیخ عبداللہ اس سے بھی زیادہ بلند قامت ہیں۔ بخشی صاحب عمر خیام کو پسند کرتے ہیں اور کشمیر کی آب رنگل کی پیداوار ہے لیکن شیخ عبداللہ اقبال کو پسند کرتے ہیں جس نے کہ لفظ پاکستان کی اختراع کی اور جو پنجابی سیاست کی پیداوار ہے۔ شیخ عبداللہ ایک پیشہ ور سیاست دان ہیں جو اپنے سامعین پر جادو کرتا ہے وہ اپنی تقریر میں قرآنی آیات شامل کرکے مجمع کو قابو کرلیتا ہے۔

پال رابسن کی طرح شیخ عبداللہ ایک گلوکار ہے اور اس کے خیالات سے زیادہ لوگ اس کی آواز سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بخشی غلام محمد ایک صاف گو مقرر ہیں جو گویا اپنے سامعین کو اعتماد میں لے کر ان سے گفتگو کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ عالمی سیاست پر خوب دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن بخشی صاحب اپنے اوسط درجے کے کشمیری کے طرز فکر سے پوری طرح مانوس ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے دور دراز پہاڑی علاقوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ شیخ عبداللہ کو لوگوں کی حمایت غیر شعوری طور پر حاصل ہوگئی لیکن بخشی صاحب کو یہ حمایت حاصل کرنے کے لئے تن دہی اور سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور وہ اسے قایم رکھنے کے لئے اب بھی جان فشانی سے کام کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ

ایک تنہا پسند اور تحکمانہ ذہنیت کا آدمی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے کیبنٹ ساتھی بھی اس کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ شیخ اپنے تصورات کی دنیا میں اپنی ایک سلطنت بنانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ بخشی صاحب ایک محنت کش آدمی ہیں جس کو اس بات پر پورا بھروسہ ہے کہ اب جمہوریت کا دور ہے اور آخرکار لوگوں کے لئے بے لوث خدمت ہی رفعت رکھتی ہے۔ شیخ عبداللہ ایک خود پسند ضدی ہے اور بخشی صاحب ایک ذہین اور حقیقت پسند ہیں۔ شیخ عبداللہ قدامت پسند ہیں اور اس میں قوتِ برداشت بالکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس بخشی صاحب ایک آزادہ پسند اور کشادہ دل شخصیت کے مالک ہیں۔ شیخ عبداللہ بسورتے ہیں لیکن بخشی صاحب ہمیشہ مسکراتے نظر آتے ہیں۔ شیخ عبداللہ اپنی ذاتی زندگی میں خوش و خرم رہنے کے باوجود عوام میں بے حد خشک اور تنگ نظر بنتا ہے۔ بخشی صاحب اپنی ذاتی زندگی میں سنجیدہ اور عوام میں بالکل خوش باش نظر آتے ہیں۔ اپنے خود پسندانہ تصورات کی وجہ سے شیخ عبداللہ اپنا اقتدار بھی کھو بیٹھا اور اس کے برعکس اک ہوشیار اور واقعیت پسند طرزِ عمل نے بخشی غلام محمد کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ بلند نامت شیخ سے اقتدار کے لالچ نے ہی اصلی اقتدار چھین لیا لیکن اچھے کھلاڑی کی طرح بخشی غلام محمد نے اپنا ماتھا ہی نہیں بھولا۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک طرف شیخ عبداللہ کو اپنے خود پسندانہ طرزِ عمل نے اپنی وفاداری بدلنے پر مجبور کر دیا لیکن دوسری طرف سے بخشی غلام محمد کی ثابت قدمی اور حقیقت پسندانہ نقطہ نگاہ نے انہیں ان بنیادوں پر مستقل مزاجی سے قائم رکھا ہے جو گنگا کے کنارے پر بھی اتنی ہی شاداب ہیں جتنی جہلم کے کناروں پر۔

بخشی صاحب کی جگہ کون لے گا؟ یہ سوال کئی لحاظ سے اس استفسار سے کم شدید ہے کہ نہرو کی جگہ کون لے گا؟ اور یہ وہ بات ہے کہ بخشی صاحب ابھی پچاس برس سے کچھ ہی زیادہ عمر کے ہیں اور ان کی قوتیں ابھی اپنے پورے شباب پر ہیں۔ وہ کسی اجتماع یا مشاعرہ سے سب سے آخر میں رخصت ہوتے ہیں اور ان سے بدرجہا نوجوان لوگ ان سے بہت پہلے تھک کر چور

ہو جاتے ہیں مگر جو مسئلہ ہندوستان کے لئے ایک سوالیہ علامت کا رُوپ دھار چکا ہے۔ وہی کشمیر کو بھی درپیش ہے گو اپنی نوعیت میں یہ چھوٹے پیمانے اور کم شدید نوعیت کا ہی سہی، یہ حقیقت شک و شُبہ سے بالاتر ہے کہ ابھی کوئی ایسا شخص اُفق پر نہیں آیا ہے جو بخشی صاحب کا صحیح جانشین ثابت ہو سکے۔ صادق صاحب حزبِ اختلاف میں چلے گئے ہیں اور ابھی اُسے ایک مضبوط جماعت کی پُشت پناہی حاصل نہیں ہو سکی اور بخشی عبدالرشید جنرل سیکرٹری نیشنل کانفرنس کو ابھی اس منصب پر پہنچنے کے لئے بہت سے مراحل طے کرنے ہوں گے۔ بہر کیف یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ سرزمین کشمیر میں ہند کے میدانی علاقوں کے مقابلے میں درخت زیادہ سُرعت کے ساتھ تناور اور گھنیرے بن جاتے ہیں۔

بارہا یہ خواہش کئی دلوں میں کروٹیں لے لیتی ہے کہ کاش بخشی صاحب کشمیر کے لئے اس قدر لابدی نہ ہوتے! یہ صحیح ہے کہ کشمیر کے لئے اُن کی ضرورت بہت زیادہ ہے مگر میرے خیال میں دہلی کے لئے اُن کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہے۔ اُن کی بدولت نہرو وزارت ایک نئی توانائی سے روشناس ہو گی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک مرکزِ نظر اور نشانِ منزل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور صرف بخشی صاحب کی ذات ہی ان تقاضوں کی کسوٹی پر پُوری اُتر سکتی ہے۔ یہ حقیقت نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ وہ ہندوستان کی ایک ریاست کے واحد مسلمان وزیر اعلیٰ ہیں۔ اُن کی شخصیت اُس قامت اور قربانی کی حامل ہے جو مولانا آزاد کی موت سے خالی ہونے والے نفسیاتی خلا کو پُورا کر سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بہت سی مخصوص دقتیں درپیش ہیں جو سب کی سب میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی ہی پیدا کردہ نہیں ہیں مگر یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بخشی صاحب کو کانگریس ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کا ایک ممبر بنایا جائے۔ یہ بات ہندوستان کے حق میں بھی اُتنی ہی مُفید ہے جتنی کشمیر کے لئے۔ تواریخی قوتوں نے اُن کے لئے ایک دوہرے کردار کا انتخاب کیا ہے جس کا ایک حصہ کشمیر میں پُورا ہوتا ہے اور دوسرا ہندوستان میں اور بحیثیت مجموعی اس عظیم مقصد کی تکمیل بخشی غلام محمد کے اپنے اختیار میں ہے۔

تہنیتِ رشید

۱۳۷۹ھ
بموقع سالگرہ بخشی عالی قدر

۱۹۶۰ء

قابلِ فخرِ وطن ہے اس زمانے کے لئے
ذاتِ والا خالدِ کشمیر عوش اقبال کی
حق نے بخشی ہے اُنہیں طبعِ رسا فکرِ جواں
زندگانی خود ہے شاہد خُوبیِ اعمال کی
جشنِ دِن پر ذرہ ذرہ دے رہا ہے یہ دُعا
خیر ہو اس مادرِ ہندوستاں کے لال کی
کیوں نہ انورؔ کی ہو یہ تاریخ مشہورِ جہاں
۶۱۰
ہوگئی عمرِ مُبارک اب ترپن سال کی
۱۳۵۰ + ۶۱۰ = ۱۹۶۰ء

محمد آصف

نذرِ خالدِ کشمیر

تُو نے خوابوں کو بنایا ہے حقیقت جب سے
لب پہ بھُولے سے نہ آیا کبھی تعبیر کا نام

تیری باتوں میں وہ جادُو ہے کہ مبہوت ہیں سب
اور دیوانے ہیں بھُولے ہوئے زنجیر کا نام

تُو نے خوشحال بنایا ہے تو سب ہیں خوشحال
اب مقدّر کے ہیں شکوے نہ ہے تقدیر کا نام

تصفیہ تجھ سے کراتے ہیں اگر ہو رنجش
کوئی لیتا ہی نہیں خنجر و شمشیر کا نام

عزم نے تیرے اولوالعزم بنایا سب کو
دِل کی محراب پہ ہے خالدِ کشمیر کا نام

ایس۔ پی۔ ساہنی

عوام کے چہیتے رہنما بخشی صاحب

شادی پور کے نزدیک ایک گاؤں کی سڑک کے کنارے لوگوں کی ایک جماعت کھڑی تھی۔ بخشی صاحب نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کو اُن کے نزدیک روکے۔ ساری فضا خوش آمدید کے ان نعروں سے گونج رہی تھی "خالد کشمیر زندہ باد"۔ "بخشی وزارت زندہ باد وغیرہ۔ اس کے باوجود چہروں پر اضطراب کے آثار نمایاں تھے اور ماحول جذبات سے پُر تھا۔

جہلم میں باڑھ آنے کی وجہ سے سارا گاؤں خوف زدہ ہو رہا تھا اور آس پاس کے علاقے پہلے ہی سے گھبرائے ہوئے تھے۔ جن علاقوں میں کسی قسم کا خوف و ہراس ہو۔ وہاں بخشی صاحب کا یکایک طور پر وارد آنا کوئی نئی بات نہیں لیکن اس گاؤں تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ بخشی صاحب تشریف لا رہے ہیں اس لئے وہاں کے باشندے اُن سے ملنے کے لئے سڑک پر جمع ہو گئے تھے تاکہ وہ اُن سے ٹماٹ کی بوریوں، بیلچوں چٹائیوں اور لالٹینوں کی درخواست کریں۔

وہ اپنی کار میں بیٹھے اور اُن کی آہ وزاری سنتے رہے۔ اُن کا ردِ عمل فوری اور

شجاعانہ تھا بخشی صاحب اُس صورت میں اُن کی مدد کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ اُمید سے ہاتھ دھو بیٹھ کر مایوسی کی کیفیت میں رہیں وہ انہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائیں گے بشرطیکہ وہ چیخنا چلانا بند کر دیں۔ عالم مجبوری سے نکل آئیں اور اپنا اپنا گاؤں بچانے اور آس پاس کے رقبہ کی حفاظت کرنے کے لئے ہی اپنا مُنہ کھولیں۔ اس سے اُن کی ہمت بندھی اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسیوں میں باتیں کرنا شروع کیں۔ دم زدن میں ایک شخص راستہ نکالتا ہوا بخشی صاحب کے سامنے آیا اور اُن سے کہنے لگا کہ میں رات بھر جاگ کر تن تنہا کام کروں گا۔ اس کے بعد دیگر اشخاص نے بھی اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔

بخشی صاحب کار سے باہر نکل آئے اور کیچڑ سے بھرے ہوئے راستے سے ہو کر جہلم کے بندھ کی طرف جانے لگے۔ انہوں نے خطرناک حصوں کا معائنہ کیا اور متعلقہ انجینروں کے نام احکامات جاری کئے کہ وہ ان جگہوں کی درستی کی طرف فوری توجہ دیں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی مدد آپ کریں اور ساتھ ہی انہیں اس بات کا یقین بھی دلایا کہ وہ اُسی رات کو واقعات کا جائزہ لینے اور کئے گئے کام کو دیکھنے کے لئے دوبارہ آئیں گے۔ ہم نے اُس رات بھی اس جگہ کا معائنہ کیا اور بخشی صاحب یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ لوگ لالٹینوں کی روشنی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ کام میں لگے ہیں۔ اُنہوں نے کمزور جگہوں کو مضبوط بنایا تھا اور انجینروں کا ایک عملہ اُن کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس طرح سے یہ گاؤں اور اردگرد کے علاقے محفوظ ہو گئے تھے۔

صرف ایک ہی واقعہ سے جو کچھ سال پہلے رونما ہوا اور جو بخشی صاحب کے انداز عمل کی تصویر کشی کرنے میں ممد ثابت ہوگا۔ خود بھی ایک باعمل انسان ہونے کے ناطے وہ عظمت عمل میں چار چاند لگاتے ہیں اور خود اعتمادی کی حس کو ... ...

پیدا کرتے ہیں۔ اس طریقے کو ترقیاتی سرگرمی کے تقریباً ہر ایک میدان میں ایک شاندار کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا ہے گو یہ طریقہ نہ تو انوکھا ہی ہے اور نہ ہی اُن کی اختراع۔ لیکن موجودہ حالات میں بخشی صاحب کی طرف سے اس کے اطلاق نے مؤثر بلکہ بعض اوقات تو انتہائی شاندار نتائج پیدا کئے ہیں۔

دوسرا ایک واقعہ بھی میرے ذہن میں آتا ہے جو اُس مرغوب کُن حافظہ کی تصویر کشی کرتا ہے جس کا مالک عوام کا یہ محبوب شخص ہے۔

میں تحصیل پلوامہ کے ایک دورے میں اُن کے ہمراہ تھا۔ ہم ایک گاؤں میں پہنچے جہاں انہیں ایک مجمع سے خطاب کرنا تھا جیسا کہ اُن کا معمول ہے وہ لوگوں کو اپنی شکایات پیش کرنے کی عام اجازت دیتے ہیں اور اُن سے ملاقات کرنے کی مختلف درخواستیں اُن کے پاس آتی ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی روتا ہوا اُن کے پاس آیا۔ اُس کے بیٹے کی آنکھیں کسی مرض میں مبتلا تھیں اور اُسے یہ خوف تھا کہ اُس کا بیٹا اپنی بینائی کھو بیٹھے گا۔ اُن دنوں اُس علاقے میں امراض چشم کا کوئی ماہر موجود نہ تھا۔ اس لڑکے کو ایک گاڑی میں سرینگر لا کر سرینگر کے سول ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ سال بعد بخشی صاحب وزیر اعظم کے ہمراہ اسی تحصیل کے دورے کا پھر اتفاق ہوا اور انہوں نے اسی علاقے میں قیام کیا۔ معمول کے مطابق لوگوں کا ایک انبوہ اُن کے گرد جمع ہوا۔ انہوں نے جونہی مذکورہ بوڑھے کو دیکھا تو اشارہ کر کے اُس کا نام لے کر اُسے بُلایا اور یہ پوچھا کہ آیا اُس کا بیٹا پوری طرح شفایاب ہوا ہے یا نہیں۔ بوڑھے نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اُس کا بیٹا اب صحت یاب ہوا ہے اور سکول جاتا ہے۔ اس لڑکے کو بھی وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایک ایسا وزیر اعظم جو پہلے ہی گوناگوں مسایل میں مصروف ہو اور جس کا ہفتہ ہزاروں لوگوں سے ملنا جُلنا ہو ایک عام آدمی کا نام یاد رکھے

اور اس کی کسی خاص شکل کو باوجودیکہ کئی برس گذر جانے کے بعد بھی فراموش نہ کرے۔ بخشی صاحب کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ غیر معمولی انتظامیہ امور سے متعلق حقائق۔ اعداد و شمار اور تاریخوں کے بارے میں اپنے حیرت انگیز حافظے سے کام لیتے ہیں اور ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ نہیں۔ جہاں اُن کی یادداشت ذرّہ بھر بھی غلط یا نادرست ثابت ہوئی ہو۔

میں نے کئی برسوں تک اُن کے ساتھ ساری وادی کا دورہ کیا ہے وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں چاہے وہ کوئی دُور اُفتادہ یا غیر منقطع علاقہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں کے اکثر سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کو آپ ذاتی طور جانتے ہیں۔ بخشی صاحب انہیں نام سے بلاتے ہیں اور اُن سے اُن کی بہبودی۔ اُن کے گھرانوں اور مسائل کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اُن کا محبوب بناتے ہیں۔ لوگوں کو اس بات کا اطمینان ہے کہ اُن کے وزیر اعظم اُن کی بہبود میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی ناطے تمام وادی کے لوگوں سے اُن کا رابطہ گہرا دیرپا اور ذاتی بن کے رہ جاتا ہے۔ الغرض وہ پورے طور پر عوامی رہنما ہیں۔

وہ قصبوں۔ دیہاتوں۔ وادیوں اور پہاڑوں کا دورہ کرتے ہیں اُن کے ساتھ عام طور پر متعلقہ علاقے سے وابستہ ایک یا دو وزیر قانون ساز یہ میں اس کا نمائندہ، ضلع کا ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ پبلک ورکس محکمۂ آبپاشی کے چیف انجینیر۔ محکمہ جنگلات کے چیف کنسرویٹر۔ ناظم تعلیمات اور محکمہ مال۔ کوآپریٹو۔ زراعت اور خوراک کے اعلیٰ افسران جایا کرتے ہیں۔ کسی جگہ پہنچنے پر بخشی صاحب مقامی رہنماؤں اور لیجسلیچر کے ساتھ اس جگہ کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے صلاح و مشورہ کرتے ہیں وہ افسران کے ساتھ مقامی مسائل ان کے حل اور مشکلات کی ازالگی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ترقی کے منصوبوں اور سماجی بہبود کی سرگرمیوں کی وسعت کے بارے میں غور و خوض کر کے مناسب فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ تب بخشی صاحب لوگوں کے

اجتماعات سے خطاب کرکے انہیں حکومت کی پالیسی اور ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ وہ انہیں بتاتے ہیں کہ لوگوں سے ریاستی معاملات اور اس کی معاشی۔ زراعتی۔ صنعتی اور سماجی ترقی کے میدان میں کون سا رول ادا کرنے کی توقع ہے وہ اُن کے مسائل کا حوالہ دیکر اُن پر واضح کرتے ہیں کہ انتظامیہ کس طرح ان مسائل کو حل کرنے کا خواہاں ہے۔ ان مواقع پر ہمیشہ اُن سے سوالات کئے جاتے ہیں اور مختلف امور کی وضاحت کروائی جاتی ہے۔ بخشی صاحب مستقل مزاجی سے ان تمام سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ لوگوں کے اجتماعات میں بخشی صاحب نے ایک ایسا انداز قایم کیا ہے جو نرالا ہے۔ وہ لوگوں کو اس بات کی پوری سہولت دیتے ہیں کہ وہ انہیں پوری طرح پہچان لیں۔ وہ نہ تو لوگوں کی سطح سے پست ہوکر اُن سے خطاب کرتے ہیں اور نہ ہی بلند ہوکر۔ بلکہ وہ اُن کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ اس بات کو تاڑ کر کہ اُن کے من میں کون سی باتیں ہیں بخشی صاحب ان باتوں پر بے کم و کاست باتیں کرتے ہیں۔

وہ اُن میں شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن سے منطقی انداز میں سوالات پوچھتے ہیں اور اُن کی غلطیاں تاڑ لیتے ہیں۔

بخشی صاحب صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ پایہ کے جمہوری رہنما ہیں۔ لوگوں کا ایک ایسا رہنما جس کا دل لوگوں کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

(ترجمہ:۔ غلام نبی خیال)

ایلا سین

پاک دِل و پاک باز

ہندوستان سے باہر بخشی غلام محمد کی نسبت اس امر کے علاوہ کہ اُنہوں نے شیخ عبد اللہ کی معزولی کے بعد ریاست کشمیر کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور بہت کم واقفیت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرون ہند کے حلقے اس حقیقت سے پورے طور روشناس نہیں ہیں کہ بخشی صاحب کی محبوبیت اور مقبولیت کا راز کیا ہے۔ جب میں اُن سے ملاقی ہوئی تو مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ اُن کی کامیاب شخصیت کا راز اُن کے سیدھے سادے طریقِ عمل میں مضمر ہے۔ اُن کی نظر بڑی بے لاگ ہے اور اُن کے خیالات بڑے واضح۔ جب بخشی صاحب کو کسی کام کی افادیت کا یقین ہو جائے تو وہ مشکلات کی پرواہ کے بغیر اُس منزل کے حصول میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ فوری طور پر فیصلہ کرنے اور پھر ان فیصلوں کو بغیر کسی تاخیر کے رُوبہ عمل لانے کی اس صلاحیت نے نوکرشاہی کی کئی بدعتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ چونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ اُن کی قوت کا سرچشمہ عوام ہیں، لہذا وہ نوکرشاہی کو اپنے اور اپنے عوام کے درمیان حائل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ سطوت و حشمت کا مظاہرہ نہیں کرتے کیونکہ اُنہیں اپنی قوتِ عمل پر اعتماد ہے۔ بخشی صاحب کی پوزیشن بڑی مضبوط ہے اور اُنہیں خود اس بات کا یقین ہے کہ جب تک وہ کشمیری عوام کی بنیادی ضرورتوں کو فراموش نہیں کرتے جب تک وہ مبہم کتابی نظریات کے خلفشار میں گم نہیں ہوتے اور جب تک وہ ذاتی جاہ پسندی کے خواب نہیں دیکھتے اُن کی مضبوط حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

بخشی صاحب کو پورے طور سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی شخصیت کو وادی کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ اُن کی خود اعتمادی کا راز جاننے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ سرینگر سے باہر دیہات میں اُنہیں

(بقیہ بر صفحہ ۹۳)

کمال احمد صدیقی

ادب نواز

تیری محفل میں کیوں ہے سوسن چُپ
اُسکی فطرت زباں درازی ہے
چشمِ نرگس جُھکی ہے تیرے حضور
آج کیسی نِگاہ بازی ہے
غمِ دوراں سے دِل ہے بے پرواہ
بے نیازی سی بے نیازی ہے
کِسی شاعر کو اب نہیں شکوہ
بے حقیقت سخن طرازی ہے
جاگ اُٹھا وقار اہلِ ادب
تیری شانِ ادب نوازی ہے

ڈی۔ این۔ کلہن

نئے کشمیر کا معمار

بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص اقتدار کی کرسی حاصل کرتا ہے تو وہ پرانی شخصیت کو سرے سے ہی بھول جاتا ہے۔ نہ صرف اُس کا چہرہ بلکہ اُس کے عادات جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کے دوستوں کو بھی اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور جھوٹے وقار کا مجبور دینا پڑتا ہے لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اقتدار کی کرسی سے وابستہ رسموں کو تکلیف دہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اصلی رنگ و روپ کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے۔ اسی قسم کے افراد کے زمرہ میں ریاست جموں و کشمیر کے موجودہ وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد بھی شامل ہیں۔

یہ بات نہیں کہ جناب بخشی غلام محمد کا رسمی تقریبوں کے ساتھ واسطہ نہیں رہا ہے یا وہ سرکاری کاموں سے غیر مانوس ہیں۔ آج سات سال سے جب سے کہ وہ کشمیر کی کابینہ میں شامل ہوئے ہیں۔ وہ ایسے طور طریقے سے اپنا کام چلاتے رہے ہیں کہ تجربہ کار سیاست دان بھی اُس پر رشک کرنے لگے جب ہم یہ بات زیر نظر رکھیں کہ آزادی سے پہلے کشمیر کی حالت کیا تھی اور اس ریاست کے سیاسی کارکنوں کو کس کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو بخشی صاحب کی شخصیت زیادہ

اُجاگر ہو جاتی ہے۔

بخشی صاحب کو اپنی جوانی کے دنوں میں سیاست نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ انہیں سیاسی شغل کا اتنا زیادہ شوق نہ تھا جتنا کہ اُن میں قوم پرستی کا جذبہ موجزن تھا وہ ابھی بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ گاندھی جی ملک کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ایک ایسی ریاست میں جہاں ایک شخصی حکمران کی حکومت تھی اور وہ بھی برطانوی حکومت کے زیر نگین بخشی صاحب نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ سرینگر کے کھادی بھنڈار میں شامل ہو جائیں۔ وہ گاندھی ٹوپی کے ساتھ کھادی بھی پہننے لگے اور جلدی ہی وہ "بخشی غلام محمد گاندھی" کے نام سے پکارے جانے لگے۔ "گاندھی" کا لفظ اب اُن کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ آج سے چند سال پہلے جب وہ آئین ساز اسمبلی میں نیشنل کانفرنس کی شاندار فتح کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر واقع سانبہ کے چھوٹے قصبہ میں گئے تو وہاں اُن کا "زندہ باد" کے نعروں کے ساتھ استقبال نہیں کیا گیا بلکہ جب وہ اس قصبہ جس کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے کے بازاروں میں سے گذرے تو مقامی باشندوں نے اُن کا "بخشی غلام محمد گاندھی کی جے" کے نعروں سے سواگت کیا۔

پاکستانی حملے کے دوران بخشی صاحب ہند فوج کے ساتھ ساتھ رہے اور جہاں جہاں جا سکتے محاذ جنگ پر موجود رہتے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے بخشی صاحب نے ہند فوج کے اعلیٰ جرنیلوں کے ساتھ دائمی دوستی پیدا کر لی ریاست جموں و کشمیر کے باشندوں نے بھی اسی طرح فوج اور اس کے افسروں کے ساتھ دوستی قائم کر لی۔

جو لوگ بخشی صاحب کے سیکولر نظریات اور پاکستان کی دو قومی نظریہ کی شدید مخالفت سے واقف ہیں وہ ہرگز تعجب کا اظہار نہیں کرتے جب بخشی صاحب اعلان کرتے ہیں کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق حتمی اور ناقابل تنسیخ ہے۔ انہوں نے اور اُن کے ساتھیوں

نے اپنی پالیسی اس وقت طے کی تھی۔ جب کہ پاکستان ابھی معرض وجود میں ہی نہیں آیا تھا۔ ۱۹۳۸ سے لیکر ہی کشمیر نیشنل کانفرنس ایک غیر فرقہ دارانہ اور قومی جماعت چلی آئی ہے۔ کانفرنس کے لیڈروں کا کانگریس کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعلق خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگار تحریک کے ساتھ رہا ہے۔

بخشی صاحب اُن دنوں کو بھول نہیں گئے ہیں جب ۱۹۴۶ میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد انہوں نے ایک بہت بڑا وقت کشمیر کے باہر گذارا تھا اور اُن کے بعض ساتھی مالی اور دیگر ذرائع کے بغیر "کوئٹ کشمیر" تحریک کی حمایت کے لئے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ایک شہر کے بعد دوسرے شہر میں پھرتے رہے۔ دہلی میں وہ پہاڑ گنج میں رہا کرتے تھے۔ اور وہ کانگریسی لیڈروں سے ملتے رہے۔ اخباروں کے دفتروں میں جاتے رہے۔ تاکہ تحریک کی اہمیت پوری طرح سے واضح کی جاتی رہے۔ انہی دنوں وہ گاندھی جی سے ملنے سیوا گرام گئے اور وہاں اُن کے سامنے کشمیر کے مسئلہ کی وضاحت کی۔

وزارت اعظمیٰ سنبھالنے کے بعد بخشی صاحب اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار تعمیری کاموں میں کرتے آئے ہیں۔ ریاست کی تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ ریاست معاشی اور صنعتی ترقی کی طرف قدم بڑھانے لگی ہے۔ بانہال پہاڑ میں نئی سرنگ نکالنے کی تجویز جو سال ہا سال تک محض تخیل بن کر رہ گیا تھا عملی صورت اختیار کر گئی ہے۔ سرینگر کو سیلابوں سے بچانے کا کام شروع کیا جا چکا ہے۔ کسانوں اور کاشت کاروں کو نوزہ اور دیگر سختیوں سے آزاد کرایا گیا ہے رشوت ستانی جو ریاست میں زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی کا قلع قمع کرنے کی مہم شروع کی گئی ہے نظم و نسق کو نئے سرے سے منظم کیا جا رہا ہے۔

یہ کام کسی بھی صورت میں معمولی نہیں۔ یہ ایک عظیم کام ہے لیکن جناب بخشی غلام محمد نہ

صرف ایک بہادر سیاست دان ہیں۔ بلکہ ایک بے خوف اور دور اندیش منتظم بھی ہیں۔ بعض اشخاص اُن سے ڈرتے بھی ہیں۔ لیکن عام لوگ اُن سے محبت بھی رکھتے ہیں۔ جو لوگ اُن سے ڈرتے ہیں۔ اُن میں سیاسی شاطر شامل ہیں لیکن جب عام لوگ انہیں کسی جگہ دیکھتے ہیں تو مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ سرینگر میں وہ ہفتہ میں دو بار کھلا "دربار" منعقد کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس "دربار" میں جاکر ذاتی طور اُن کے سامنے شکایت پیش کر سکتے ہیں۔ مختلف محکموں کے بڑے افسر اُن کے پاس ہی ہوتے ہیں اور وہ موقعہ پر انہیں ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن اگر شکایت کا تعلق کسی قصبہ یا گاؤں کے ساتھ ہو تو وہ ٹیلیفون پر ہدایات دیتے ہیں۔

بخشی صاحب "سرخ فیتے" اور دفتری طوالت کو برداشت نہیں کرتے۔ آج سے چند برس پہلے جب سرینگر کی تنگ سڑکوں میں حادثات کی متعدد وارداتیں ہوئیں تو انہوں نے میونسپلٹی کے حکام، انجنیروں اور اہل کاروں کو طلب کیا اور خود موقع پر گئے۔ صرف چند دنوں میں سڑکیں کشادہ کی گئیں جن مکانوں کو گرایا جانا تھا۔ اُن کے مالکوں کو موقع پر معاوضہ دیا گیا اور اسی وقت انہیں متبادل زمین دی گئی۔ بخشی صاحب ہر روز صبح موقعہ پر موجود ہوتے۔ انہی طریقوں پر عمل کرکے انہوں نے چرار شریف کی زیارت اور حبہ خاتون کے مزار کو نئی شکل و صورت دے دی اور جب کبھی کوئی ہنگامی مرحلہ درپیش آجائے تو انہی طریقوں پر عمل ہوتا دیکھا جائے گا۔ سیلاب آجائے تو آپ بخشی صاحب کو کسی سیلاب زدہ علاقے میں لوگوں کو بچانے کے کام میں اور اُن کا حوصلہ بڑھانے کے کام میں مصروف پائیں گے۔ کہیں آگ لگ جائے۔ بخشی صاحب ان لوگوں میں سے ہوں گے جو سب سے پہلے موقع پر حاضر پائے جائیں گے۔

اکثر باعمل انسانوں کی طرح وہ موسیقی اور شاعری کے دلدادہ ہیں وہ کشمیری اور اردو شاعری کے بڑے شوقین ہیں۔ جب تک جناب بخشی غلام محمد وزیراعظم نہ بنے تھے۔ وہ عموماً موسیقی

کی محفل منعقد کیا کرتے تھے۔ جناب بخشی صاحب کشمیر کی موسیقی کو بے حد پسند کرتے ہیں اور وہ کشمیری

- لوک گیتوں کو سُن کر ہرگز تنگ نہیں ہوتے لیکن نئی ذمہ داریوں نے اُن کا وقت اُن سے چھین لیا ہے اور وہ موسیقی سُننے کے لئے بمشکل وقت نکال سکتے ہیں وہ ریاست کی ترقی اور تعمیر کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ اُن کے کہنے کے مطابق انہیں اگست ۱۹۵۳ء کے بعد سے لے کر آج تک موسیقی سے دل بہلانے کا موقع نہیں ملا ہے۔
- بخشی صاحب بلند ہمت آدمی ہیں اور وہ وفاداری کے معاملے میں بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے تحریک اور جدوجہد آزادی کے دوران انحراف کیا۔ انہیں بخشی صاحب نے کبھی فراموش نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ اُن کے ساتھ بھی اپنی غیر رسمی دوستی قایم رکھے ہوئے ہیں۔

بخشی صاحب اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ وہ ساتھ ہی ایک تابعدار بیٹے کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

بخشی صاحب کا کل ہند اسٹیج پر ظہور سب سے پہلے کلیانی (بنگال) میں ہوا۔ جہاں ۱۹۵۳ء میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ ادھر مدراس میں بھی انہوں نے خوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنی وقعت میں اضافہ کیا۔ وہاں آپ نے اپنی تقریر میں جنوبی ہند میں رہنے والے لوگوں پر واضح کیا کہ اگر انہوں نے مسئلہ کشمیر کو نظر انداز کیا۔ تو اُس کے کیا نتایج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ایک طاقت ور اور موثر شخصیت ہونے کے باعث وہ دشمنوں اور نکتہ چینیوں کے بغیر نہیں۔ خواہ وہ ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔ اُن پر جو الزامات عاید کئے جاتے ہیں۔ اُن کی فہرست بھی لمبی چوڑی ہے۔ لیکن ان کا بدترین دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ جب سے انہوں نے وزارت اعظمیٰ کی کرسی سنبھالی ہے۔ انہوں نے ریاست کی کشتی کو استقلال اور

ثابت قدمی کے ساتھ آگے کی طرف چلایا ہے اور غیر یقینیت اور بے چینی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انہوں نے لوگوں میں اُمید کی نئی روح پھونک دی ہے۔ اور انہیں تحفظ اور استحکام کے بارے میں کئی قسم کے شکوک و شبہات کے بغیر ترقی کرنے کا احساس دلایا ہے۔ اُن کی بدنامی کرنے والے بھی کئی ایک پائے جاتے ہیں لیکن ہزاروں اشخاص نے جو گذشتہ سال کشمیر آئے۔ بچشم خود دیکھا ہے کہ نئے وزیر اعظم کی بہادرانہ قیادت میں ریاست کسی تیز رفتاری کے ساتھ قدم بڑھا رہی ہے۔

جبینِ مستقبل

"اقتصادی سدھار کی سرگرم کوششوں کے نتیجہ میں یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی عام طور سے بلند ہوا ہے۔ پسماندگی، غربت اور بھوک کی بدعتیں جو صدیوں سے یہاں کے لوگوں کو اپنے گرفت میں لئے ہوئے تھیں، رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے نیست و نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ اور خوشحالی اور مسرت کی منزلیں قریب آنے سے اُن کی زندگیوں میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے طرز زندگی پر بھی اس کا کچھ سماجی اثر پڑا ہے اور تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ آپ کے ذہن میں اُس ثقافتی اُبھار کی یاد بالکل تازہ ہوگی جو پہلے سال "جشن کشمیر" کے دوران ریاست کے تمام حصّوں میں دکھائی دیا۔"

بخشی غلام محمد۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

شمیم کرہانی

تیری محبت تیری جوانی

(خاکِ کشمیر کی خدمت میں)

سیلِ بلا میں، ناؤ بڑھائے، تیری محبت تیری جوانی
تُند ہوا میں شمع جلائے، تیری محبت تیری جوانی

جہلم کی دِل کش وادی میں، کیسر کی سُندر دھرتی پر
ایک نیا سنسار بسائے، تیری محبت، تیری جوانی

رنگ محل میں خاک اُڑا کے، شیش محل کی شمع بجھا کے
کٹیاؤں میں دیپ جلائے، تیری محبت، تیری جوانی

اہلِ سفر کے شکر کی خاطر، وادی وادی، پربت پربت
راہ نکالے، راہ بنائے، تیری محبت، تیری جوانی

چشموں کی برہم لہروں پر، ندیوں کے سرکش دھاروں پر
قید لگائے، بند بنائے، تیری محبت، تیری جوانی

اہلِ جہاں کی ریت نہ پوچھو، اپنا نشیمن، اپنا بسیرا
گاؤں سنوارے، شہر سجائے، تیری محبت، تیری جوانی

حال کی راتوں سے لڑتی ہے، یاس کی باتوں سے لڑتی ہے
مستقبل کی آس لگائے، تیری محبّت، تیری جوانی

اُٹھ کے زمیں سے گرنے لگے جو، گر کے زمیں پر اُٹھ نہ سکے جو
اُس کو سنبھالے، اُس کو اُٹھائے، تیری محبت، تیری جوانی

حُبّ وطن کی مستی ایسی، خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو
آنکھ سے چومے، دل سے لگائے، تیری محبّت، تیری جوانی

غم کی گھڑیاں ہنس کر جھیلے، عشقِ وطن میں جان سے کھیلے
ظلم کے آگے سر نہ جھکائے، تیری محبّت، تیری جوانی

بستی بستی سورج چمکیں، نگری نگری چاند ستارے
دھرتی کو آکاش بنائے، تیری محبّت، تیری جوانی

رن میں بڑھے پرچم کو سنبھالے، آنکھ اجل کی آنکھ میں ڈالے
جینے کے انداز سکھائے، تیری محبّت، تیری جوانی

مُلّا ہمدم، پنڈت ساتھی، عشقِ وطن کی راہ گزر میں
دیر و حرم کو ساتھ چلائے، تیری محبّت، تیری جوانی

پرچم کھولے، تیشہ تولے، ہاتھ کروڑوں ساتھ کو حاضر
جس میداں میں پاؤں بڑھائے، تیری محبّت، تیری جوانی

رات اندھیری، راہ میں کانٹے، پھر بھی رواں ہے پھر بھی رواں ہے
دُور اُفق سے آنکھ لڑائے، تیری محبّت، تیری جوانی

پستی سے ہستی کو اُبھارے، پربت سے وادی کو پکارے
قوسِ قزح کی سمت بُلائے، تیری محبّت، تیری جوانی

عہدِ وفا

"زندہ باد کے نعرے یا پھولوں مالاؤں کے ڈھیر میری رُوح کی پیاس نہیں بجھا سکتے۔ صرف ایک چیز مجھے حقیقی مسرت سے ہم آغوش کر سکتی ہے۔ خوش حال عوام کے خنداں اور بشاش چہرے۔ میں نے بڑے ہلاکت خیز طوفانوں اور بلاخیز سیلابوں میں قوم کی ناؤ کو ساحلِ مُراد تک لے جانے کے لئے ہر مصیبت سے ٹکر لی ہے۔ میری حقیقی مسرت، کا دن جب ہی آئے گا جب میں اس کشتی کو ساحلِ مُراد سے ہم کنار ہوتا دیکھوں۔ عظیم ہندوستان کی سربلندی اور فلاح کے لئے میں جان کی بازی لگانے پر بھی تیار ہوں۔"

(بخشی غلام محمد۔ سرینگر اپریل ۱۹۵۸ء)

شیوۂ خاص

جب بھی بخشی غلام محمد کوئی اہم اعلان کرتے ہیں تو اُن کی نظریں دُور آسمان پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔۔۔ قدیم روم کے مشاہیر کا شیوہ بھی یہی تھا۔

تو ہاں اُس وقت بھی اُن کی آنکھیں اُفق کو تک رہی تھیں جب اُنہوں نے عوامی کارکنوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

"ہندوستان کی ہر سرحد کی طرح ریاست کی سرحدیں بھی ہمارے لئے مقدس ہیں۔ ان سرحدوں کے ناموس کی حفاظت ہمارا اوّلین فرض اور مُتبرک ترین عبادت ہے۔"

تحسین و آفرین کے پُر جوش نعروں کے درمیان اُن کی پُر جلال آواز گونجتی رہی۔۔۔

"ہم اپنے مقدس وطن کی ایک ایک انچ زمین کے تحفظ کے لئے جان کی بازی لگائیں گے۔۔۔ یہ صرف خالی دعوے نہیں ہیں بلکہ تاریخ کے اوراق پر ہمارے اُس عزم کی چھاپ نُمایاں طور موجود ہے جو ہم اپنے عظیم مادرِ وطن، اپنی خوابوں کی سرزمین اور اپنی اُمیدوں کے مرکز کی سربلندی کے لئے ظاہر کرتے آئے ہیں۔"

اُن کی نگاہیں بدستور خلا کی وُسعتوں کو چیر رہی تھیں !



مادرِ وطن کی دہلیز پہ
وقت کی دستک



''وہاں پھر شاداب کھیتیاں
لہلہائیں گی''



مادی اسباب کا تعین واقعی ہے کہ . .



جس طرح آپ نے ایک سو دن . . . . .





اسی طرح مسلسل [illegible] کے ہجوم و انتشار
کے سامنے سوالوں کو [illegible]

"ریاست کی خوشحالی کے لئے میں
ہر کٹھن سفر اختیار کر سکتا ہوں"





"[illegible]
[illegible]
بخشتی ہے"

عتیق مرزا

تعمیر کا عہد

یہ ترقی کا زمانہ یہ ہے تعمیر کا عہد
لوگ کہتے ہیں اسے خالدِ کشمیر کا عہد

ہے ترے جہدِ مسلسل کا نتیجہ ـــــ آیا
عام انسانوں کی تعظیم کا توقیر کا عہد

اب نہ راتیں ہیں اندھیری نہ ہیں آنکھیں پُرنم
رات کے ساتھ گیا نالۂ شب گیر کا عہد

جستجو دل کو ہے تازہ تمنّاؤں کی
اس طرح آیا تمنّاؤں کی تاثیر کا عہد

تایا زنکن

محبوب قائد

وزیراعظم کشمیر بخشی غلام محمد کے عوام سے تعلقات ہند بھر میں لامثال ہیں اور عام لوگ اُن کے ساتھ اس حد تک قریب ہیں کہ بعض اوقات یہ بے تکلفی اور یہ قربت پریشان کن حتیٰ کہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ وزیراعظم لوگوں سے اس طرح گھُل مل کر باتیں کرتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر نہ تو مراسم کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ کوئی دُوری محسوس کی جاتی ہے۔

ایسے موقعوں پر نہ تو پولیس کے آدمی ہوتے ہیں اور نہ کوئی کٹہرا ہوتا ہے۔ ایسے ہی کوئی اور آدمی سٹیج کے بالکل قریب آسکتا ہے اور اس پر چڑھ بھی سکتا ہے۔ ایسا تو بہت سارے آدمی کرتے ہیں اور جب بوجھ سے لکڑی کے تختوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے تو اس پر سے لوگوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے "کشمیریوں کے محبوب" بخشی غلام محمد دفعتاً اپنی تقریر ختم کرتے ہیں اور لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ نکالتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ اُن کے ساتھ ساتھ اس طرح چمٹے رہتے ہیں۔ جیسے چھتے پر شہد کی مکھیاں۔

لوگوں کے ساتھ بخشی غلام محمد کے تعلقات کے بارے میں ایک نمایاں بات یہ ہے۔

کر وہ اُن کے ساتھ گھل مل جانے پر منحصر ہوتے ہیں اور کوئی حفاظتی دستہ اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہیں۔ وہ گاؤں کے ہر آدمی سے ملتے ہیں۔ لوگ چاہیں تو اُن کی پیٹھ پر تھپکیاں بھی دیتے۔ یا بسا اوقات عورتیں اپنی درخواستیں پیش کرنے کے لئے اُن کے کپڑوں کو بھی کھینچ لیتی ہیں۔ یہی طریقہ ہے بخشی صاحب کا لوگوں سے ملنے کا۔ وہ لوگوں کے ساتھ ایک وزیر اعظم کی طرح بات نہیں کرتے بلکہ اُن کا طریقہ کچھ ایسا ہے جیسا کہ کسی محفل ساز و سرور کے منتظم کا۔ جو ایک طرف اشارہ کرے تو فوراً ساز بجنے لگتا ہے اور دوسری جانب اشارہ کرے تو تاروں پر مضراب لگنا شروع ہوتا ہے۔ بخشی صاحب کا یہ طریقہ سادہ بھی ہے وہ لوگوں پر تقریریں نہیں جھاڑتے بلکہ اُن سے کھلے بندوں بات چیت کرنے کے لئے اُن کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ وزیر اعظم لوگوں کے ساتھ یہ بات چیت مکالمے کے انداز میں کرتے ہوئے اُن کو درمیان میں بولنے کا موقعہ بھی دیتے ہیں اور اس بات چیت کے دوران عورتیں بھی جوابات دیتی ہیں۔ کسانوں سے بات چیت کرنے کا یہ بڑا سہانا طریقہ ہے۔ اس میں فائدہ ہے کہ لوگ اس میں دلچسپی بھی لیتے ہیں۔ اور وزیر اعظم اور اپنے درمیان کوئی سماجی فرق محسوس نہیں کرتے۔ بخشی صاحب کی تقریریں بڑی آسان بھی ہوتی ہیں۔ وہ مطلب کی بات کرتے ہیں اور اُس میں عام لوگوں کی پسند کا میٹھا میٹھا مزاح بھی ہوتا ہے ایسے موقعوں پر لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کہیں کسی بچے کے چیخنے کی آواز بھی آجائے یا کوئی پرایا آدمی وہاں سے چلے تو بھی اُن کی توجہ نہیں ہٹتی اور یہ واقعی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ عمومی انداز میں باتیں کہنے یا سامعین کے سامنے کسی چیز کا تصور پیش کرنے میں ایک مشاق مقرر کو بڑی آسانی ہوتی ہے لیکن جب یہی بات عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے "خشک مضمون" کے متعلق کہنی ہو، تو یہ آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایک افضل مقرر ہیں اور اپنے ڈھنگ میں ہند بھر میں لاثانی ہیں۔

وزیر اعظم کے ہمراہ سفر کرنے کے لئے جسمانی طاقت کے علاوہ گھوڑے کی سواری، تیراکی اور کوہ پیمائی کے فنوں سے واقف رہنے اور لوگوں کے اُن بے پناہ ہجوموں سے راستہ نکال کر آگے

بڑھنے کی ترکیب جاننے کی ضرورت ہے جو اُن کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کرتے ہیں لوگوں کا یہ جوش و خروش اور یہ قوت اس وقت بڑا کام دیتے ہیں جب انکو وزیراعظم کے راستے میں جیپ کو کسی کیچڑ کے گڑھے سے اُوپر اُٹھانا ہوتا ہے یا اُسے کسی ایسے موڑ سے گذارنا پڑتا ہے جو وہاں اس غرض کے لئے انہی لوگوں نے (جو کہ جیپ کے کل پرزوں سے واقف نہیں ہوتے) فوری طور پر بنایا ہوا ہوتا ہے۔ کہیں اگر سڑک بالکل ڈھلوان ہوتی ہے تو یہ لوگ ایک ساتھ مل کر جیپ کو دریا میں گرنے سے روکنے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور جیپ کو دریا سے بنڈ پر لے جانے کا کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ جہاں جیپ نہیں جاتی وہاں وزیراعظم یا تو گھوڑے پر جاتے ہیں یا پیدل۔ لوگ اُن کے پانچ میل اور پا پیادہ چلنے کا کوئی خیال نہیں کرتے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ وزیراعظم وہ سب کچھ بھی دیکھ لیں جو اُن کے پروگرام میں درج نہیں۔ بخشی صاحب کو (اس بات کے باوجود کہ اُن کی ایک ٹانگ عرصہ پہلے ٹوٹ گئی تھی) آخرکار آگے جانا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ عوام اُن کی زبان سے "نہ" کا لفظ نہیں سُننا چاہتے۔ جب انسان اس بات پر دھیان دیتا ہے کہ وزیراعظم کشمیر اپنے حلقے میں ہفتے میں تین دن (۱۷ گھنٹہ روزانہ) سفر کرتے ہیں، تو وہ ایک چھوٹے بچے (جو صرف بعد دوپہر کچھ وقت کے لئے وزیراعظم کے ساتھ تھا) کی اس بات سے متفق ہو جاتا ہے کہ:-

"وزیراعظم ہونا بڑا مشکل ہے۔"

آثر انصاری

بادِ سحر

عشق کو واقفِ آدابِ جنوں ہونا تھا   غم کو شرمندۂ احساسِ سکوں ہونا تھا
لذتِ دردِ محبت کو فروزاں ہونا تھا   کچھ علاجِ تپشِ سوزِ دروں ہونا تھا

شانِ تخریب مگر پردۂ تعمیر میں تھی
اور ابھی فکرِ مشیت کسی تدبیر میں تھی

ناگہاں جلوہ فگن وادیِ کشمیر ہوئی   محرمِ عیشِ جواں کاوشِ تدبیر ہوئی
موجِ انفاسِ سحر، مطلعِ تنویر ہوئی   پھر سے تجدیدِ تمنائے جہاں گیر ہوئی

نکہتِ گل کو ملا شاہدِ زیبا کا پیام
لے کے انگڑائی اُٹھا ایک محمدؐ کا غلام

اہلِ کشمیر کی قسمت کا ستارہ چمکا   انقلاباتِ سیاست نے رُخ اپنا بدلا
ذرہ ذرہ، مہ و خورشید کا ہم رقص بنا   اپنی منزل کی طرف قافلۂ شوق بڑھا

اِک نئی صبح نئی شام کی تخلیق ہوئی
نَو بہ نَو جلوۂ تعمیر کی توثیق ہوئی

مۓ جذبات ڈھلی جامِ اخوت چھلکا   نشہ آلود ہوئی جنتِ ارضی کی فضا
نخوتِ حُسن کا مضرابِ فسوں بھی ٹوٹا   عطر افشاں ہوئی ہر اِک گُلِ رنگیں کی قبا

بوئے گل جاگ اٹھی برگ و شجر جھوم اٹھے
رقص تاروں نے کیا شمس و قمر جھوم اٹھے

شکر ہے اہلِ جنوں ذوقِ سفر تک پہنچے — کاروانِ مہ و انجم بھی سحر تک پہنچے
صاحبِ فکر و نظر لعل و گہر تک پہنچے — کچھ اُجالے تھے جو آغوشِ نظر تک پہنچے

زرفشاں شام ملی صبحِ درخشاں کے سوا
جانفزا بادِ سحر کیفِ فراواں کے سوا

یہ بہارِ ملک کا جہاں یہ گل و لالہ کا وطن — پھوٹتی ہے جہاں انوارِ تبسم کی کرن
زعفران زار پہ ہنستے ہوئے گلپوش چمن — سرِ کہسار مچلتے ہوئے جلووں کی پھبن

مہرباں اس پہ اگر خالقِ تقدیر رہے
پاسباں بن کے وزیرِ اعظمِ کشمیر رہے

"تعمیر" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔
(۲) باتصویر مضامین اور فیچر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں
(۳) ان نگارشات میں ظاہر کی گئی آرا سے حکومت جموں و کشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے تنقیدی مضامین ترجیحی طور طلب کئے جاتے ہیں

اُمیش کول

خاکہ اور رنگ

بخشی صاحب کی شخصیت جس بے پناہ قوتِ عمل کی حامل ہے اُسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے یہی اندازہ ہوتاہے کہ ان کی زندگی میں فن و ادب اور فکر و تخیل کا زیادہ گذر نہ ہوگا۔ اس شخصیت کا مالک کبھی کوئی رنگین سنگیت سُن کر ٹھٹک نہیں سکتا، کسی شوخ سی تصویر کو دیکھ کر رُک نہیں سکتا، کسی ساز کی مضطرب سی آواز سُن کر تڑپ نہیں سکتا۔

اور پھر ڈر سا لگتا ہے کہ کہیں ان کے ہاتھوں سے شیشۂ تمدن گر کر چُور نہ ہو جائے، ان کی قیادت میں پروان چڑھتا ہوا یہ نظام محض ایک مشینی نظام ہو کر نہ رہ جائے۔ جہاں صرف کھیت پکیں اور خواب مضمحل ہوں، صرف راہیں تعمیر ہوں اور رُومیں تشنہ رہیں، محض دولت پیدا ہو اور دلوں پر مُردنی چھائے۔ تواریخ میں کچھ ایسے بھی ناظم اور ہادی ہوئے ہیں جو اپنی قوموں کو کھیت اور اناج، راستے اور رسل و رسائل، دولت اور کام کاج تو دے سکے، لیکن ایک مُسکراہٹ نہ دے سکے۔ جن میں عزم و استعداد تو تھا، لیکن وہ دِل نہ تھا جو دھڑکتا ہے، وہ رگ نہ تھی جو دُکھتی ہے اور جب آدمی کے پاس صرف عزم و استعداد رہتا ہے، ایک دھڑکتا دِل نہیں رہتا، ایک دُکھتی رگ نہیں رہتی تو وہ حسن سے بے نیاز

ہوجاتا ہے اور اُس کے لئے تمدّن، اور تمدّن کی زبان بے معنی ہوجاتے ہیں۔

لیکن جب تصوّر کی یہ مہیب موج گذر جاتی ہے، خیالات تہہ لینے لگتے ہیں تو ذہن میں بخشی صاحب کی ایک دوسری تصویر اُبھرتی ہے۔ ایک دِل فریب سی تصویر، جس میں بخشی صاحب کی بے پناہ قوّتِ عمل کے ساتھ اُن کی حسّاس طبیعت بھی جھلکتی ہے۔ جس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ ہے، آنکھوں میں جستجو اور فراخ ماتھے پر فکر و تخیل کے سایے — یہ تصویر ایک ایسے آدمی کی تصویر ہے جو پہروں آسمان کی نیلی وسعتوں کے معنی ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جو بیٹھے بیٹھے ایک خیال کی تلاش میں بہت دُور نکل جاتا ہے اور جب حُسن کو پاتا ہے تو بے اختیار داد دیتا ہے۔

دراصل بخشی صاحب کی شخصیت کا توازن، اُن کے عزم و استعداد کے ساتھ، اُن کا فکر و تخیل اور سب سے بڑھ کر اُن کی حساسی سے قائم رہتا ہے۔ جس نے انہیں محض سیاسی رہنما کے رُوپ میں دیکھا ہے، فن کے شیدائی، فن کار کے ہمدم کے رُوپ میں نہیں دیکھا ہے وہ ان کی شخصیت کا صحیح تجزیہ نہیں کرسکتا۔ اس لئے تصویر کا صرف خاکہ دیکھا ہے، رنگ نہیں دیکھے ہیں۔ پرائم منسٹر بخشی سے کہیں دلچسپ جبہ خلقون اور آرزو مال کا متوالا بخشی ہے۔ وہ بخشی، جس نے للہ عارفہ اور شیخ نور الدین نورانی کے تقدس کو سینے میں جگہ دی ہے۔ جس کے انگ انگ میں مہجور کے نغموں کی مہک رچی ہوئی ہے — جس نے اس بخشی کو نہیں دیکھا اُس نے ایک بہت بڑے اور حقیقی ادب شناس کو نہیں دیکھا۔

یُوں فن کی قدر دانی کرنے کا خبط عموماً "خواص" پر اس قدر سوار رہتا ہے کہ ایک ماہرِ سیاست، جس نے کبھی فنِ تعمیر سے متعلق کبھی کچھ سُنا نہ پڑھا، بڑے اطمینان کے ساتھ فنِ تعمیر کے کسی بھدّے سے

نمونے کے حق میں ایک تعریفی تقریر کر بیٹھتا ہے۔ ایک ماہر معالج، جو ادب کے رموز سے واقف نہیں، بڑی آسانی سے ایک ادبی شاہکار کو گھٹیا قرار دیتا ہے اور ایک "ماہر میک اَپ" بالوں کی پانی ٹیل بنائے، ہونٹوں پر لِپ اسٹک اور چہرے پر غازہ پھیرتے، ایک تصویر کو دیکھ کر، بغیر سمجھے بڑی نزاکت سے کہتی ہے "ہائے کیا خوب ہے!"

لیکن فن کے ہمارے قدردان ـــ بخشی صاحب، شاید اس لئے بھی کہ وہ "خواص" کی صف میں سے نہیں، اس مندر میں پجاری کی طرح آتے ہیں، صاف دِلی اور بے تعصبی کے ساتھ۔ فن از خود ان پر اپنا حسن آشکار کرتا ہے اور یہ اسی حسن کی کرنوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ کسی داخلی ترغیب کے بغیر، وجد کی حد تک مسرور ہو جاتے ہیں۔

اگر "خوبصورت شے سے مسرور ہونے کی صلاحیت" ذوق" کی صحیح تعریف ہے تو بخشی صاحب ایک حقیقی با ذوق آدمی ہیں۔

بخشی صاحب کو فن کا سودائی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جہاں کہیں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی ہے اور آپ کے پاس تھوڑا سا بھی وقت ہوتا ہے، آپ محفل میں چلے آتے ہیں۔ پرائم منسٹر کی حیثیت میں نہیں، ایک عاشق کی طرح، اور آلتی پالتی مار کے بیٹھ کر انہماک سے شعرا کا کلام سنتے ہیں ـــ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ آنکھوں میں وہی جستجو اور ماتھے پر فکر و تخیل کے وہی سایے۔ آپ ہمیشہ اُس فاصلے کو مٹا دیتے ہیں جو ایک فن کار اور قاری کے درمیان ہوتا ہے۔

کبھی ایک جواں سال شاعر نے اپنی غزل میں کہا تھا ؎

"میں ایک لمحہ جینے کے لئے ایک گھونٹ زہر پی لیتا ہوں
نظامِ حیات آج بھی اس سے بہتر نہ ہو سکا۔"

شعر حسین تھا۔ آپ نے بے اختیار داد دی۔ شاعر کو زندگی سے شکایت تھی، آپ سنجیدہ ہو گئے اور کچھ سوچتے رہے۔ ایسے لگتا تھا جیسے آپ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر، اس تلخی کا منبع کھوج نکالنا چاہتے ہوں اور جواں سال شاعر سے کہنا چاہتے ہوں — "تم اس عمر میں یہ کون سا روگ لگا بیٹھے ہو، تمہاری یہ عمر ہنسنے چہکارنے کی ہے۔ ہنسو اور شادمانی کے گیت گاؤ!"

پھر جب محفل برخاست ہوئی، آپ شاعر سے، اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے مخاطب ہوئے۔ —"زندگی سے یوں مایوس نہیں ہوتے عزیز۔ اُمید ہے اگلی محفل میں کوئی ہمت افزا کلام سناؤ گے!"

اس نظام سے شکوہ کرنے والا شاعر شاید آپ کے مداحوں میں سے نہیں تھا، لیکن آپ اُس کے سب سے بڑے مداح تھے!

ڈرامائی شوز میں، جو شاعروں کی نسبت آداب سے آزاد رہتے ہیں، آپ بے تکلف ہو کر سامعین اور فن کاروں کے درمیان ایک عجیب ربط پیدا کرتے ہیں۔ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اور آپ سٹیج پر جا کر فن کاروں کی ہمت بڑھاتے ہیں، اُن کی تیاریوں کا جائزہ لیتے ہیں، اُنہیں چھوٹی موٹی ہدایات دیتے ہیں اور پھر آ کر اطمینان کے ساتھ سامعین میں بیٹھ جاتے ہیں۔ سامعین میں سے کچھ بے صبر حضرات پردہ اُٹھانے کے لئے چلا رہے ہیں اور آپ اُٹھ کر اُنہیں صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک برجستہ فقرہ کہہ کر اُنہیں تھوڑی دیر کے لئے بہلاتے ہیں۔ محفلِ موسیقی منعقد ہو رہی، تو آپ لوگوں کا استقبال اور انہیں قرینے سے بٹھانے کا انتظام

کرتے نظر آتے ہیں۔ یا سٹیج پر فن کاروں کو اُن کے ساز صحیح حالتوں میں رکھنے میں مدد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ موسیقی کا اثر قبول کرنے کے لائق ایک ستھرا ستھرا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر تار چھڑتے ہیں، نغمہ پَر تولنے لگتا ہے اور آپ ایسے محو ہو جاتے ہیں جیسے کوئی حسین خواب، بُن رہے ہوں۔

موسیقی کے ساتھ بخشی صاحب کو ایک والہانہ سا لگاؤ ہے۔ ستار اور سنطور سے لے کر قوالی اور چھکری تک جب کسی صنف کا نام آتا ہے تو آپ پر اُس بچے کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے جس نے ماں سے چاند اُتار کر لا دینے کو کہا تھا۔ لیکن آپ چاند کو آئینے میں دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے، آپ کو چاند چاہیئے۔ جہاں آداب اور تکلّفات رہتے ہیں۔ ایسی محفل میں آپ کی تشنگی نہیں مٹتی۔ "چھکری - طبلے اور کلرنٹ کے ساتھ ہو رہی ہو) تو آپ اپنے جذبات اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہارمونیم اور گنگرو ہی چاہئیں۔ اگر آداب اجازت نہیں دیتے تو آپ حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہیں گے، جیسے آپ کو چاند نہ لا کر دیا گیا ہو، صرف چاند کا سایہ دکھایا گیا ہو۔

ریڈیو سے متعلق ایک تقریب ہو رہی تھی، آپ نے قوالی کے ساتھ ہارمونیم نہیں دیکھا۔ استفسار کرنے پر جب آپ سے کہا گیا کہ ریڈیو پر ہارمونیم بجانے کا دستور نہیں، آپ اُداس سے ہو گئے۔ یہ کیسا دستور ہے جو آنکھوں میں کاجل نہیں ڈالنے دیتا۔ جو موجِ ہوا سے کہتا ہے اِٹھلا کے نہ چلو۔

تقریب کے اختتام پر کچھ اصحاب نے مزید ایک قوالی کی فرمائش کی اور آپ کو کھوئے ہوئے خواب کے دھاگے مِل گئے، اُچھل کر حاضرین سے بولنے لگے ـــ واقعی قوالی سُن چکنے کے بعد تشنگی کا احساس

رہا ہے۔ اس انجمن میں ہارمونیم بجانے کا رواج نہیں، ہم ایک دوسرا پروگرام مرتب کرتے ہیں اور . . . "

اور دوسرے ہی دن ہارمونیم سے آراستہ، ایک بے تکلف سی محفل منعقد ہوئی۔ جس میں قوالی سے شائقین پِل پڑے تھے!

مصوری کا احیا یہاں ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا، لیکن جو سرپرستی اس فن کو وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کے ذوقِ سلیم کے تحت ملی اور اس فن نے اپنے جس پرستار کو متوالے بخشی میں پایا، وہ اپنی مثالیں آپ ہیں۔ اب کوئی سال ایسا نہیں جاتا جب تصویروں کی نمائش نہ ہوپاتی ہو اور ہر نمائش میں بخشی صاحب طالبِ دیدار کی طرح آتے ہیں۔ دیر تک تصویریں دیکھتے رہتے ہیں۔ مصوّروں سے اُن کے بارے میں، اُن کی تصویروں کے بارے میں پوچھتے ہیں اور کچھ سوچتے ہیں۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ، آنکھوں میں وہی جستجو، فراخ ماتھے پر فکر و تخیّل کے وہی سایے ——— اور آپ اپنے لئے تصویریں چُنتے ہیں، کسی تصویر کے دام ادا کئے، کوئی تصویر تحفے کے طور پر مانگی . . . . . .

شاید ریاست کا کوئی ایسا مصوّر نہیں جس کی قلم کاری کا نمونہ، آپ کے کلیکشن میں نہیں۔

بچوں کی ایک نمائش ہو رہی تھی۔ آپ نمائش کا افتتاح کر رہے تھے۔ تاریک گلیوں کی طرف سے چلنے والا ایک بچہ پہلی بار تصویروں کے انعامی مقابلے میں شریک ہو رہا تھا اور پہلی بار آپ کو قریب سے دیکھ رہا تھا، اُس کی معصوم سوچوں میں وزیرِ اعظم ایک ایسا پُر شوکت انسان تھا جو بچوں کے ساتھ گھُل مِل نہیں جاتا۔ آپ نے ایک ننھے سے بچے کو پیار سے تھپکی دی، ایک ننھی سی لڑکی کو پُچکارا۔ اُس کی سوچیں زور زور سے جھُولنے لگیں ——"اگر وہ بچہ میں ہوتا، اگر وہ لڑکی میں ہوتا . . . . . ." سوچوں کا جھُولنا ہچکولے

کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انعامات کا اعلان ہوا۔ اور یہی بچہ پہلا انعام لینے کے لئے آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑی شفقت سے آپ نے شرماہٹ سے تمتمایا ہوا اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اُسے پیار کیا۔ اُس سے کئی باتیں پوچھیں، اُس کی پیٹھ تھپتھپائی —— اور وہ ہوا اُوپر قدم رکھتا ہوا سا، واپس اپنی جگہ پر آگیا۔

اُس دِن ایک عام سے بچے کی معصوم دُنیا میں، ایک پرائم منسٹر داخل ہوا تھا۔

آج یہ وادی نازاں ہے کہ اس کے بیٹوں کو ایک ایسا راہنما مِلا ہے جو قوتِ عمل رکھتے ہوئے حساس بھی ہے کہ جب یہ دو اوصاف ہم کنار ہوتے ہیں تو کلچرل اکادمی قائم ہوتی ہے، 'سکول آف ڈیزائن کھلتا ہے'۔ کلچرل آفس قائم ہوتا ہے —— جشنِ بہار منا کر یہاں کی بہاروں کا تبسم، یہاں کے لوگوں میں بانٹا جاتا ہے۔ اُن لوگوں میں جو بہاروں میں رہ کر بھی بہاروں سے دُور تھے۔ صبحِ نشاط اور شامِ شالیمار منا کر یہاں کی صبحوں کا کیف اور شاموں کا سرور یہاں کے لوگوں پر نچھاور کیا جاتا ہے، اُن لوگوں پر، جو کیف اور سرور کی وادی میں رہتے ہوئے بھی ان صبحوں اور ان شاموں سے محروم تھے —— ادیبوں کی مجلسیں ہوتی ہیں، شاعروں کی محفلیں سجتی ہیں، ساز بجتے ہیں، گیت گونجتے ہیں، رنگ چھلکتے ہیں اور ایک ایسے سماج کی تعمیر ہوتی ہے جہاں کھیتوں کے ساتھ دِل بھی شاداب رہتا ہے۔

عبدالعزیز میر ترانہ

خالدِ کشمیر

تیرے دربار میں سب راجہ ہیں سب پرجا ہیں
کون اس شان سے لوگوں کا نمائندہ ہوا؟
آج ہر راہگذر کاہکشاں ہے کہ نہیں
ہر خزف ریزہ ستاروں سا درخشندہ ہوا
آج پہلے سے بہت گہرا ہے ہر پھول کا رنگ
تیرا ہی ایک تخیل ہے جو پائندہ ہوا
تجھ کو بادشاہ کہوں خالدِ کشمیر کہوں
تیری ہی ذات سے پھر حسنِ ہنر زندہ ہوا
پیر پنچال بلندی پہ بہت نازاں تھا
تیری ہمت کی بلندی سے یہ شرمندہ ہوا

۵۳ ویں سالگرہ پر

مینارۂ نور

۱؎ جب سے تاریخ کا حافظہ شروع ہوتا ہے، کشمیر مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مینارۂ نور کے طور درخشاں نظر آتا ہے۔ کشمیر کے عظیم مفکروں جیسے للہ عارفہ اور شیخ نورالدین نورانی نے ہمیشہ اتحاد و آشتی کے سرمدی نغمے گائے ہیں۔ ان جمیل وجلیل آدرشوں کو اپنی رگ رگ میں سمو کر اولوالعزم کشمیری عوام نے ہر مشکل مرحلے پر مذہبی جنون اور تنگ نظری کے خلاف سینہ سپر ہو کر مقدس جدوجہد کی ہے۔

مہاتما گاندھی اور اُن سے قبل کے رُوحانی پیشواؤں نے انسانوں کی روحانی طہارت اور سماج کی اخلاقی بلندی کا پیغام دیا ہے۔ ہماری آیندہ خوش حالی کا دارومدار اگر ایک طرف مادی بہبود پر ہے تو دوسری طرف روحانی پاکیزگی بھی اتنی ہی اہم ہے۔ کیونکہ ایک متوازن نظام حیات کے بغیر سوسائٹی کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے بن پتوار کے ایک خوبصورت جہاز کی۔ ہماری آیندہ نسلیں اُسی صورت میں موجودہ تمدن کے تقاضوں سے صالح طور عہدہ برا ہو سکتی ہیں جب کہ وہ صحیح طور کشمیر کے شاندار ماضی کی بہترین روایات کی علم بردار ہوں۔ در حقیقت کوئی قوم اُس وقت تک صحیح معنوں میں مسرور نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کے انفرادی ارکان کے معیار اخلاق ثابت نہ ہوں۔ ہم للتادتیہ، اونتی ورمن اور زین العابدین جیسے عظیم سپوتوں کے وارث ہیں۔ ہمارے جلیل القدر بزرگوں نے باہمی بھائی چارے اور فرقہ وارانہ رواداری کی جو مشعل ہمیں سونپی ہے اُس کا شعلہ تا ابد تابندہ رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ورثہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کے لئے بھی تخلیقی کوششیں کرنا ہیں۔۔"

بخشی غلام محمد۔ سرینگر اوّل جولائی ۱۹۶۰ء)

تعمیر

ترنّم مُکرّر (۱۳۸۰ھ)

ازوُہرہ وادِہ چانے مُلکس چھُ شادیانہ   گیوّنے ترگِندنے زن وُٹھہ حُورہ آسمانہٕ
چھِہ گیوّن ترانہٕ چانی، بچھِہ چوان جامِ صحت   چھُوی فی المثل بنیومُت مے خانہ خانہ خانہ
نیکی ہیُن دُعاہ چھے ہتھ وہرہ داأدی یرٛ ادکھ   تسبیح یہٕ چانہٕ باپت گنٛزرِتھ چھے دانہ دانہ
خیراتہ چانہٕ برٛی برٛی گمرہ آسے مُستحقن   ژہ کڈان گرٛزھ، خدا چھُوی بیٛیہ پوٗرہ وُن خزانہٕ
حاجت مندن چھُ یُدوَے دروازٕہ چون محراب   بٔزہ اِنکسارہ روزان چھُکھ سرِ بسجدہ پانہٕ
یوٗت تام دست وۄ توٗی اتھہٕ روٗٹ کوٗرتھ غریبن   محروم رُود ما کانہہٕ، زٕلیوہ چانہٕ دٔراو ما "نہ"
سہوَن چھُ موکرہ وُن دِل چون بخشہ وُن چھُکھ   چھُوی حضرتِ غفورن بوٗدٕ بخشمُت ژٕے بانہ
دِل نیوٗتھ خاص و عامس کیاہ مانچھ چھُوی کلامس   شُکر کوٗرتھ ژٕے اِرزال، لس سانہٕ خوش بیانہ
گُلشن ژھوٗٹن بناوِتھ، دِتھ دُدی مٔتین گُلیٛن بگ   کشمیرِ نَو بناوُتھ اکھ جنتُک نشانہ
تعلیم تہٕ زراعت، بیٛیہ صنعت و تجارت   کتہٕ کور واتہٕ ناوِتھ اِمشکوٗر چھُوی زمانہ
ناخواندگی تہٕ غُربت، بیمارٕی تہٕ بے کارٕی   ژٕے ترٛاجس کرِٛنی چھی برہِ عدم روانہ
فن تہٕ ادب خصوصاً یکبار زِندہ کرٛی تھک   دٔپ تھَک ژٕے تمّ باذِنیِ "از زِندہ روز قدر دانہ"
گیوٗ مُطربن ترنّم، دٔپ سامعو "مُکرّر"   تاریخ[1] لوٗب مے اُتی تھے، گنٛزراو نکتہٕ دانہٕ

[1] ترنّم = ۶۹۰   ترنّم مکرّر = ۶۹۰ × ۲ = ۱۳۸۰ھ





مردِ خلیق

اوہو! اُس شام کو کیسا تماشہ تھا میرے لئے سرینگر میں قاصد اور جیپ دوڑ رہے تھے۔
اور آخرکار میں بازار میں ایک کشمیری ٹوپی کی تلاش میں سرگرداں پائی گئی (مگر مجھے سیاحی ہیٹ نہیں چاہیئے مجھے تو معمولی کشمیری ٹوپی چاہیئے۔ ایسی جیسی کہ سب اوڑھے پھرتے ہیں")

پبلک ریلیشن آفیسر نے ذرا ملامت آمیز آواز میں کہا کہ "کیا تم بخشی صاحب سے انٹرویو نہیں چاہتیں؟"

"یقیناً میں انٹرویو تو چاہتی ہوں ... ضرور چاہتی ہوں۔"

"تو وہ آپ کو آدھے گھنٹے میں گنگابل میں ملیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں چہل قدمی کرتی ہوئی پہنچ جاؤں گی۔"

ٹیلیفون ایسا معلوم ہوا کہ پھٹ جائے گا۔ جب آواز آئی ——

"ارے۔ آپ پیدل نہیں پہنچ سکتیں۔ دیر ہو جائے گی۔ گنگابل تو بارہ ۱۲ میل ہے۔

"اچھا خوب! میں سمجھتی تھی کہ بخشی صاحب کی کوٹھی کا نام گنگابل ہے۔" آخر سب ٹھیک ہوا۔ اور میں ایک جیپ میں گنگابل کی طرف چلنے لگی۔ ایک ہمدرد کشمیری جیپ کا ڈرائیور

تھا۔ . . . اور اُس کے سر پر وہی کشمیری ٹوپی تھی جس کی مجھے اتنی تلاش تھی۔

اری پربت کے دامن میں ہماری جیپ خوبصورت دیہات میں اُڑی چلی جارہی تھی۔ ڈھول، مُرغی کے بچوں اور حسین بچوں کے کھیل کُود میں سے ہوتی ہوئی وادی میں داخل ہوئی جس کے مناظر ہمیشہ مجھے حیرت میں ڈالتے تھے وہ بھورے سبز پہاڑ اور نیلگوں آسمان کا پس منظر جہاں سفید سفید بادل کے ٹکڑے مست رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں قریب ہی کشمیری حسین دیہات اور سبز و زرّیں کھیت اور درخت ہوا کے اثر میں مستانہ وار جھوم رہے تھے۔ چاول کی تیار فصلیں جن سے زرخیزی ثابت ہوتی تھی اور جوتی ہوئی زرّیں زمین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دولت اُگتی ہے اور مسرت کی فضا بناتی ہے۔ یہ رُوح پرور مناظر قابل دید تھے۔

آخر گنگابل آگیا۔ پل کو پار کرتے ہی سُرخ کپڑے پر "خوش آمدید" نمایاں نظر آیا۔ جشن کشمیر گنگابل پہنچ چکا تھا اور چاروں طرف اس کی جگمگاتی روشنیوں کا دَورہ ایسا تھا کہ گویا وینس میں روشنیوں کا کارنیوال ہو۔

آدمیوں کے ہجوم اور چناروں کی قطاروں کے درمیان کسی نے رہنمائی کرکے مجھے اُس تقریب میں پہنچا دیا جہاں میلوں دُور سے دیہات کے لوگ آآکر جمع ہوئے تھے اور ہر چہار طرف لطف و مسرت کی فضا تھی جس کو دیکھو، مگن تھا اور موسیقی کے ساتھ ساتھ جھُوم جھُوم کر سر ہلاتا اور پاؤں حرکت میں لاتا تھا۔ چناروں پر موسم خزاں کی آمد کے اثرات ظاہر ہوچکے تھے اور اس حسین فضا میں ہر ایک پر خاص حالت طاری تھی اور ہر ایک وہی ٹوپی پہنے نظر آرہا تھا جس کی مجھے اتنی تلاش تھی۔

ڈائس کے قریب پہنچے تو مجمع کو چیر کر مجھے بخشی صاحب تک پہنچایا گیا جو دہلی کے دو مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"ارے آپ یہاں کہاں؟ مگر وہ وہاں بیٹھ گئی اور پروگرام دیکھنا شروع کردیا۔ میری

خوش قسمتی کہ وہی فن کار کشمیری رقص کا مظاہرہ کر رہا تھا جو میرا دل پسند ہے جشن کی ابتداء میں

... ...

... ... شالیمار کے دیوالی جیسے پروگرام میں اُس کا رقص دیکھا تھا مگر وہاں وہ شرما رہا تھا۔ آج کھل کر بے تکلف کام کر رہا تھا۔ شالیمار کا بھی کیا منظر تھا۔ جھرنوں کے پیچھے سے چراغوں کے جھلملانے کا سماں قابلِ دید تھا۔ آج کی موسیقی نے محو کر دیا تھا۔ اُس کی کمر، گردن، سر، بھویں سب اس طرح کام کرتی تھیں کہ سب تالیاں بجاتے تھے۔ اور پھر جب اُس نے ایک دیہاتی عورت کی روزمرہ زندگی کا سماں کھینچا اور بتایا کہ کس طرح وہ روٹی پکاتی، کپڑے دھوتی اور پھر سُرمہ لگاتی ہے جب سُرمہ لگاتے ہیں ایک آنکھ میں کھٹک کا منظر پیش کیا تو لوگ پھڑک گئے۔ وہ تو اور زیادہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر پروگرام بہت طویل تھا۔ افسروں نے مائیکروفون اُس سے بڑی مشکل سے چھینا تاکہ دوسری چیزوں کا نمبر آئے۔ ابھی اسے روکنے کی کوشش ہی ہو رہی تھی کہ یکایک بارش آگئی۔ ہمارا ڈائس تو چناروں کے سایہ میں تھا مگر بخشی صاحب جھپٹ کر بارش میں پہنچے اور تمام مجمع کو اس طرح جیسے چرواہا بھیڑوں کو احتیاط سے لاتا ہے۔ درختوں کے سایہ میں لائے اور وہ بھیگے ہوئے مگر خوش و خرم ڈائس پر واپس آئے اور پھر ایک درخت کے نیچے کھڑے انتظار کرنے لگے کہ بارش کب رکتی ہے۔ میرے خواب و خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی وزیرِ اعظم عوام کے ساتھ اتنا بے تکلف بھی ہو سکتا ہے کھڑے کھڑے ایک موٹے گیرواکپڑوں والے شاعر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اور اُس کو سگریٹ پیش کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے ڈاک بنگلہ میں ہم سب انٹرویو کے لئے چلے گئے جہاں چائے پیتے پیتے ہم سوالوں کی بارش جس تیزی سے کرتے رہے اسی تیزی سے وہ جوابوں کی بارش کرتے رہے وہ وقت سے آگے رہتے ہیں۔ چونکہ اُن کا دماغ فوری فیصلہ کرتا ہے اور وہ فوری عمل کر ڈالتے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا مجھے جشن کے اس پہلو سے بڑی مسرت ہے کہ عورتیں اتنی بڑی تعداد میں آئیں۔ (باقی برصفحہ ۱۱۹)

نہال رضوی

خالد کشمیر

السلام اے ساقیٔ مے خانۂ جنت نشاں
نور و نکہت کیف و مستی مہر و الفت کے جہاں

رمز دانِ رنگ و بو اے ناظمِ شہرِ نشاط
خالدِ کشمیر و جموں صدرِ بزمِ انبساط

رہنمائے بے غرض دیوانۂ انسانیت
پیکرِ جہد و عمل دانائے رازِ حریت

جنتِ ارضی کو تو نے اے محمدؐ کے غلام
بخشی ہے رونق بنایا مرکزِ حسنِ تمام

خلق کی دنیا شمیمِ لطف کا معدن کہیں
پھول ہے تو وہ جسے سرمایۂ گلشن کہیں

تو نے مستقبل گلستاں کا بنانے کے لئے
جرأت اقدام کے فانوس روشن کر دیے

قلبِ دہقاں آشنائے دردِ ملت کر دیا
کتنے ویرانوں کو کھیتوں سے عبارت کر دیا

تیرے زرّیں کارنامے ہیں دلیل اس بات کی
نورِ مہرِ جہد سے چھانٹی سیاہی رات کی

زندگی کی چاندنی ہر سمت رقصاں تُو نے کی
روشنی گلزار و ویرانہ میں یکساں تُو نے کی

ارتقائے الداخ کا اِس بات کا ہے آئینا
تیرے دِل میں درد ہے کِتنا عوام الناس کا

فِکر میں تیری فلاحِ عام کے انداز ہیں
شاہراہیں جذبۂ تعمیر کی غمّاز ہیں

بجلیوں سے اپنے گلشن کو بچانے کے لئے
طے کئے ایثار و قربانی کے تُو نے راستے

کائنات دردِ ملّت جس کا ہر کردار ہے
تُو نے کشمیر کی قسمت کا وہ معمار ہے

دُھوپ سے تیرے عمل کی گلستاں در گلستاں
جاگ اُٹھے سوئے ہوئے خوشحالیوں کے کارواں

دے کے مایُوسوں کو تُو نے زندگی کے حوصلے
سرد نبضوں میں حرارت کے دِیئے روشن کئے

ظلمتِ بے روزگاری کم سے کم تر تو نے کی
بخش دی معصوم مزدوروں کے ہونٹوں کو ہنسی

کہہ رہا ہے یہ نئی تعلیم گاہوں کا وجود
ایک دن تو ختم کر دے گا جہالت کا جمود

غرق کرنے کو اٹھا تھا جو گلستاں کا وقار
اس تلاطم کو کیا تو نے سکوں سے ہم کنار

ہند سے کشمیر کے الحاق کی تکمیل کا
ناظمِ فردوسِ دنیا تیرے سر سہرا رہا

منزلِ دستور سازی میں تری دانش وری
ہر قدم بکھرا گئی جمہوریت کی روشنی

ہوش مندی تیری تیرے ہر عمل سے ہے عیاں
اے قتیلِ غمزۂ اردو ادب اردو زباں

تو نہ بہکے گا کبھی تجھ سے نہ ہو گی کوئی بھول
کیونکہ تجھ کو یاد ہیں آزاد کے اعلیٰ اصول

جب نئے کشمیر کی تاریخ لکھی جائے گی
تیری چوکھٹ چومنے چشمِ مؤرخ آئیگی

ساقیٔ مے خانۂ خلدِ جہاں پائندہ باد ناخدائے کشتیٔ کشمیر و جموں زندہ باد

معرکۂ مکرکوٹ

ہم پھولوں کے حسن کی خاطر انگاروں سے کھیلے ہیں

مکرکوٹ اُس قومی شاہراہ پر واقع ایک چھوٹا سا اور ناقابلِ توجہ گاؤں ہے جو جموں اور سرینگر کو ملاتی ہے۔ ممکن ہے کہ پچھلے زمانے میں یکے یا بیل گاڑیاں یہاں پر واقع باؤلی کی وجہ سے اس جگہ ٹھہر جاتی ہوں۔ کیونکہ اس پہاڑی مقام پر اب بھی صاف اور شیریں پانی مل جاتا ہے مگر زمانے کی تیز رفتاری نے اس کی وہ اہمیت بھی ختم کردی ہے اور شیورلیٹ اور مرسڈیز گاڑیاں اب یہاں سے فراٹے بھرتی گذر جاتی ہیں۔ صرف کسی وقت، جموں یا امرتسر سے آنے والے چھوٹے تاجر یہاں کی دکانوں میں اخروٹ یا خود رَو سبزیوں کی تلاش میں آجاتے ہیں جو کہ پہاڑی ڈھلوانوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ مگر عام حالات میں مکرکوٹ کو کوئی نظرِ اعتنا سے نہیں دیکھتا۔ یہاں تک کہ اکثر وہ لوگ بھی، جو قومی شاہراہ پر سفر کرتے ہیں، اس کے وجود سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس جگہ پر، نہ تو آرام کے وہ وسائل مہیا ہیں اور نہ ہی زندگی کی وہ ہماہمی، جو برسرِ راہ مقامات مثلاً کُد، بٹوت، رام بن یا بانہال کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور اندازہ کیجیے کہ اب یہی مکرکوٹ ایک گرم خبر بن کے تہلکہ مچا رہا تھا۔ پاس کی پہاڑی ڈھلوان

جس کے ساتھ سڑک ایک بالکونی کی طرح چپکی ہوئی پھسلتی جا رہی تھی اور اس طرح سے ہر اُس چیز کو بھی اپنے چُنگل میں داب رہی تھی جو پہلے یہاں پر نظر آ رہی تھی۔ ان چیزوں میں وہ بھاری بھرکم گھسی ہوئی چٹانیں بھی شامل ہیں جو اپنا مرکزِ ثقل جیسے کھو بیٹھی ہوں۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر پُل، کلورٹ، سڑک کو ایستادہ رکھنے والے پُختہ کنارے یا خود سڑک نام کی کوئی چیز منصۂ شہود پر سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔

جب ۲ ر جولائی ۱۹۵۹ء کو صبح سویرے بخشی غلام محمد جائے وقوع پر پہنچے تو "مون سون" کی گھٹائیں اپنی پُرغضب کیفیت میں بل کھا رہی تھیں اور زوروں کا مینہ برس رہا تھا۔ دریا کے پار سڑک کا کوئی سُراغ نہیں ملتا تھا۔ پتھر چاروں طرف سے یلغار کر رہے تھے اور لڑھکتی ہوئی چٹانیں وہ خوفناک شور پیدا کر رہی تھیں جیسے آتشیں توپ خانوں کے دہانے کھول دئے گئے ہوں۔ دیہاتی باشندے، جن کے مکان اب کیچڑ کے انباروں میں تبدیل ہو گئے تھے، تشویش اور وحشت کے مارے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ انجینئر بڑی حسرت ناک نگاہوں سے نیچے دیکھ رہے تھے کیونکہ سڑک کو کھُلا رکھنے کے لئے اُنہوں نے جو جان توڑ کوششیں کی تھیں، کرکوٹ کی پھسلن نے اُن سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ اور اس کاری ضرب سے مجروح ہو کر وہ ہتھیار ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک ہزار سے زائد کشمیری مزدور، جو سڑک کی بحالی کا کام کرنے کے لئے لائے گئے تھے، اس ہیبت ناک منظر کو خوف اور کرب کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

کرکوٹ کے اس مہیب سماں میں بخشی غلام محمد کے سامنے صرف یہی مسئلہ نہیں تھا کہ عناصر کے اس اچانک غیض و غضب کا کس طرح مقابلہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ دوسرا اہم تر مسئلہ یہ تھا کہ اُن دو ہزار سیاحوں کا کیا بندوبست کیا جائے جو سڑک کی اس رُکاوٹ کی وجہ سے یہیں پر محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ سیاح پہلے ہی دو ہفتوں کے لئے سری نگر، پہلگام اور دوسرے مقامات پر بے چینی سے سڑک کھلنے کا انتظار کر چکے تھے اور اب عملاً ان کے سارے ذخیرے ختم ہو چکے تھے۔ اضطراب اور بے کسی کی کیفیات اُن کے بشرے سے ٹپکتی پڑتی تھیں اور اُن پر نظر ڈال کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ ریاستی حکومت سے توقع رکھتے تھے کہ اُنہیں کسی حال میں بھی اُن کی منزلِ مقصود تک پہنچایا جائے اور اس سلسلہ میں معجزے کر دکھائے جائیں اُنہیں اس بات کا علم تھا کہ بخشی غلام محمد بحران کے ان اوقات میں اپنی قوتِ عمل سے معجزے دکھا چکا ہے بخشی صاحب کو بھی سیاحوں کی ان محسوسات کا بخوبی علم تھا۔

بخشی صاحب نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سیاحوں کو محفوظ جگہ پر پہنچایا جائے۔ وہ خود کشمیری مزدوروں کی بھیڑ میں گھس گئے اور اُنہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اُنہوں نے کہا:۔

"ہماری تجویز یہ ہے کہ سیاحوں کو دوسرے کنارے تک پہنچایا جائے۔ یہ بڑا کٹھن اور بڑا پُر خطر کام ہے۔ اُنہیں گھاٹی کے چوڑے پاٹ کو عبور کرنا ہے جس میں سیلاب کا پانی موجیں مار رہا ہے۔ ہمیں بہت سے ننھے مُنے بچوں، بوڑھوں اور ناتوانوں کو پار لے جانا ہے۔ اُن کے ساتھ اُن کی چھوٹی چھوٹی جائدادیں بھی ہیں اور دوسری طرف سے موسلا دار بارش برس رہی ہے ان حالات میں صرف یہی ایک حل ہے۔ کیونکہ اس لمحے سڑک کی آیندہ کیفیت سے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس مقدس کام کا بیڑا اُٹھائیں گے؟ کیا آپ کو احساس ہے کہ یہ کام کتنا متبرک ہے؟ کیونکہ ان لوگوں کی زندگی، ان کی جائداد اور ان کی عزت اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کیا میں بھروسہ رکھوں کہ آپ

اس مشکل مرحلے کو طے کر سکیں گے ؟ "

بخشی غلام محمد بڑی آہستگی اور بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ کشمیریوں سے مخاطب تھے۔ ایک بوڑھا مزدور آگے بڑھا اور اُس نے "خالدِ کشمیر زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا۔ باقی مزدوروں نے اس آواز میں اِس زور سے آواز مِلائی کہ پہاڑیوں میں اس نعرے کی صدائے بازگشت گونج اُٹھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے بخشی صاحب کو بتایا کہ "ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو حفاظت کے ساتھ دوسرے کنارے پہنچائیں گے اور ہم آپ کو یقین دِلاتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک معمولی سُوئی بھی کھونے نہ پائے گی۔ "

اور اس انداز میں کرکوٹ کے عظیم معرکے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے پہاڑی کی ڈھلان میں چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں کھودی گئیں تاکہ پیدل چلنے والے لوگ دریا کے کنارے تک اُتر سکیں۔ اُس کے بعد ایک کارنس طرز کا پُل اُس جگہ پر آر پار ڈالا گیا۔ جہاں دریا کا پاٹ سب سے تنگ تھا۔ اُس کے بعد دوسری طرف کی پہاڑی میں بھی سیڑھیاں کھودی گئیں تاکہ دریا کو عبور کرنے والوں کو پہاڑی پر چڑھنے میں سہولت میسّر ہو۔ اِسی اثنا میں سیاحوں کی مختلف ٹولیوں کو اپنے ساز و سامان کے سمیت مزدوروں کے مختلف گروہوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ہر ایک گروہ کا انچارج ایک ایک میٹ کو رکھا گیا۔ اس کے بعد اصل کوچ کا نقارہ بج گیا۔ بچوں کو آرام دِہ طریقے پر "پھرنوں" میں لپیٹا گیا اور اُنہیں گرم رکھنے کے لئے اُوپر سے چادریں تانی گئیں۔ بوڑھے مرد اور عورتیں جو اپنے پاؤں پر سیڑھیاں اُترنے کے قابل نہیں تھے، انسانی کندھوں پر سوار ہو گئے اور دوسری طرف کی عمودی چڑھائی طے کرنے کے بعد اُنہیں زمین پر اُتارا گیا۔ قافلے کے عقب میں دو سَو (۲۰۰) مزدور اسباب اور سامان لے کر روانہ ہوئے۔ دریا میں جس جگہ پر خطرے کا مقام آجاتا تھا، کشمیری ایک "انسانی رسّی" کو تشکیل دیتے

تھے اور ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر حیران و پریشان سیاحوں میں حوصلہ بھی پیدا کر دیتے تھے اور انہیں پُرخطر مقامات سے آگے بھی لے جاتے تھے۔ جتنے عرصے یہ معرکہ جاری رہا، فضا لڑھکتے ہوئے پتھروں کے لرزہ خیز شور و شغب سے معمور رہی۔ مگر نیچے نالے سے ایک خاص تال سم رکھنے والی آواز کا سلسلہ ہمارے کانوں میں پہنچتا رہا ـــــــ

" یا پیرِ دستگیر یا علی مدد کر یا شاہِ بغداد یا شاہِ ہمدان
یا پیرِ دستگیر یا علی مدد کر "

کشمیری اپنے بزرگوں اور اپنے مرشدوں کو آواز دے رہے تھے کہ وہ مشکل کے اس وقت میں اُن کی رہنمائی کریں اور انہیں کنارے لگا دیں!

اسی درمیان میں سڑک پر ایک اور ناٹک کی تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ دو گھنٹے پہاڑ کی پھسلن رُک جانے کے فضول انتظار کے بعد بخشی غلام محمد نے فیصلہ کیا کہ پھسلتے ہوئے تودے کو پیدل عبور کر کے انجینئروں اور مزدوروں کی سڑک کے دوسرے کنارے تک راہبری کی جائے۔ بخشی صاحب بول اُٹھے کہ وہ غیر معین عرصہ تک اس بات کا انتظار نہیں کر سکتے کہ پہاڑ کا غضب کب تھمنے کو آئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ پہاڑ کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں کئی دن کا وقت لگ جائے۔ انجینئروں نے ان سے بحث کی کہ کل ہی رات ایک لڑھکتے ہوئے ٹیلے کے نیچے آ کر تین مزدور اپنی جان کھو بیٹھے اور ایک جرمن انجینئر بُری طرح کچلا گیا! لہذا دانش مندی اور تجربے کا تقاضا یہی ہے کہ اس موقعے کو غنیمت جان کر اس جان لیوا منظر سے راہِ فرار اختیار کی جائے۔ اس کے جواب میں بخشی صاحب نے صرف یہی کہا کہ " میں اس خطرے کو آزما کے دیکھ لوں گا! "

جُوں ہی اُن کے قدم آگے بڑھے، مجمع میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ پتھروں کا ایک ریلا پھسل آیا۔ بخشی صاحب رُک گئے ـــــ دوسرا ریلا۔ ہوئی۔ بخشی صاحب پھر رُک گئے۔ چشم زدن میں سب نے کیا دیکھا کہ بخشی صاحب پُوری پامردی سے قدم بڑھا رہے تھے۔ موقعے پر جو بھی موجود تھا اُس نے سانس روک کے دُعا کی کہ اس جری کشمیری رہنما کی جان سلامت رہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس غرض کے لئے کوشاں تھا کہ سڑک کھُل جائے؛ اور وادی کے سیلاب زدہ علاقوں میں ضروریاتِ زندگی کی اشیا پہنچ سکیں وہ بڑے ضبط کے ساتھ تھوڑا تھوڑا آگے سرکتے رہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ پُر خطر مقام اُن کے عزمِ صمیم کے آگے سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ موت کی وادیاں اُن کے قدموں کے نیچے روندی گئیں اور وُہ صحیح وسلامت دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ ناگاہ فضا میں "خالد کشمیر زندہ باد" کا پُرجوش نعرہ گونج اُٹھا۔ اور اس کے چند لمحے بعد ہی انجینئر اور مزدور سڑک صاف کرنے اور چٹانیں کاٹنے کے کام میں ہمہ تن معروف ہو گئے۔ قسمت اب مہربان تھی۔ پہاڑ کا خشم جیسے تھم گیا۔ یکایک بادل چھٹ گئے اور نیلا مُسکراتا آسمان نمودار ہو گیا۔ ۱۸۰۰ پر سڑک کھُل گئی جب کہ بخشی صاحب نے پھر ایک جیپ میں بیٹھ کر اسے عبور کر لیا۔ دوسری صبح کو وادیٔ کشمیر سے آنے والی ۳۰۰ سے زائد لاریاں، سیاحوں سے لدی ہوئی۔ ۵ بسیں اور بہت سی موٹر کاریں یہاں سے جموں گئیں اور وہاں سے بھی لگ بھگ اسی مقدار کی گاڑیوں نے کشمیر کا راستہ لیا۔ ہندوستانی فوج کے ایک جرنیل نے، جو کئی دنوں تک کنوائے کے ساتھ رُکے پڑے تھے اور جنہوں نے بخشی صاحب کو پچھلے دن فطرت کی برہمیوں سے معروف جہاد دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ کٹھن سے کٹھن رُکاوٹ کو خاطر میں نہ لاکر آگے بڑھتے گئے، بطورِ تسلے قریب بخشی صاحب کی موٹر کار کو راستہ دینے کے لئے اپنی سواری رُکا لی اور اُس کے بعد بخشی

صاحب سے یوں مخاطب ہوئے :-

"جناب والا ! آپ نے اپنے عزم اور شجاعت سے ہمارے کنوائے کی رہنمائی کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے !"

پاک دل و پاک باز

(صفحہ ۳۱ سے آگے)

عوام کے جم مٹ میں دیکھا جائے، یہ منظر دیکھ کر ان کی سیاسی پختگی کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ابھی انہوں نے زندگی کی پچاس سے کچھ زیادہ ہی بہاریں دیکھی ہیں۔ مگر وہ عقل و دانش کا بے پایاں خزانہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی مقبولیت کو دیکھ کر وارفتہ نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اسے عوام کا معیار جات بلند کرنے کے مقصد میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح توانائی اور طاقت کے نئے مخزن وجود میں لاتے ہیں۔

(ترجمہ :- غلام نبی قادری)

مرحلۂ شوق

اگر ہم حقیقی معنوں میں ہندوستان کو خوشحال اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں تن آسان پسندی کو خیرباد کہہ کر خون پسینہ ایک کرکے مشقت کی راہ اپنانا ہوگی بے شک ہم نے بہت سے مرحلے طے کرنے ہیں مگر ہمارے خوابوں کی منزل ہماری لگن کا اور امتحان چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کے تمام باشندوں، بچوں، بوڑھوں، نوجوانوں اور عورتوں کو ملک کے وقار کو بلند رکھنے کے لئے محنت اور بے لاگ محنت کا راستہ اپنانا ہے۔ ہمارا نعرۂ مستانہ یہی ہونا چاہیئے ۔۔ "محنت کرو اور جی لگا کر محنت کرو !" (بخشی غلام محمد اُودھم پور -- ۲۶ اپریل ۱۹۵۹ء)

انور صابری

عالی صفاتِ خالدِ کشمیر زندہ باد

۱۹۶۰ء

نگاہِ فطرت کا آئینہ ہے ترا جمالِ نگاہ "بخشی"
تجھے مشیت نے زندگی کی حیات افروز راہ بخشی

جبینِ "کشمیر" کا تجمل ترے تدبّر کا ارتقا ہے
شعور تیرا نئی اُمنگوں کے واسطے رحمتِ خدا ہے

نئے عزائم کی منزلوں میں پیمبرِ انقلاب تو ہے
خرد کی محفل ہو جس سے روشن جنوں کا وہ آفتاب تو ہے

تری اُمیدوں کے گلستاں کی کلی کلی مسکرا رہی ہے
قدم قدم پر نظر میں بہارِ نو جگمگا رہی ہے

وقار بخشِ خلوصِ آدم تری محبت کی داستاں ہے
ہوں بتکدے جس سے مطمئن وہ حرم کی عظمت کا پاسباں ہے

چراغ تھے شالامار کے گل نشاط میں یاس سو رہی تھی
فضا میں ماضی کی ہر تجلی اسیرِ افلاس ہو رہی تھی

سکوت برلب تھی مدتوں سے حسین گلمرگ کی جوانی
خموشیوں کی دلیلِ واضح تھی آرزو کی ہر اک کہانی

جو تیرے ہاتھوں میں اس بہشتِ سرور زا کا نظام آیا
ریاضِ جنت کی وادیوں کا سلامِ دل تیرے نام آیا

اُداس ہر گوشۂ تصوّر جناں کی تصویر بن گیا ہے
مرے وطن کیلئے نشانِ عروجِ تقدیر بن گیا ہے

حدودِ چشمِ نظارہ بیں میں ہزار گلزار کھل رہے ہیں
ملے تجھے تیری خدمتوں کے نوازشِ حق سے مِل رہے ہیں

یہ تیرا گلشن جو خوابِ شاعر کی بن کے تعبیر ہنس رہا ہے
حدودِ فردوس میں یقیناً دلِ جہانگیر ہنس رہا ہے

حقیقتاً للّہ عارفہ کی مُرادِ فکرِ جمیل تو ہے
تقدّسِ نُور الدین ولیؒ کی دُعائے اجرِ تو ہے

جدید ماحول میں بکھیرے تری نظر کی ادا ادا نے
جو عالمِ کیف میں سُنائے تھے حبہ خاتون نے ترانے

تُو جاگتا ہے تو ساتھ تیرے تمام کشمیر جاگتا ہے
نگاہ کا پہرہ دار بن کر تری رسول میر جاگتا ہے

دماغ خسروؒ حقائقِ معرفت کی تا دیر روشنی دے
وطن کے اے خالدِ معظم خدا تجھے اور زندگی دے

مصطفیٰ حسن رضوی

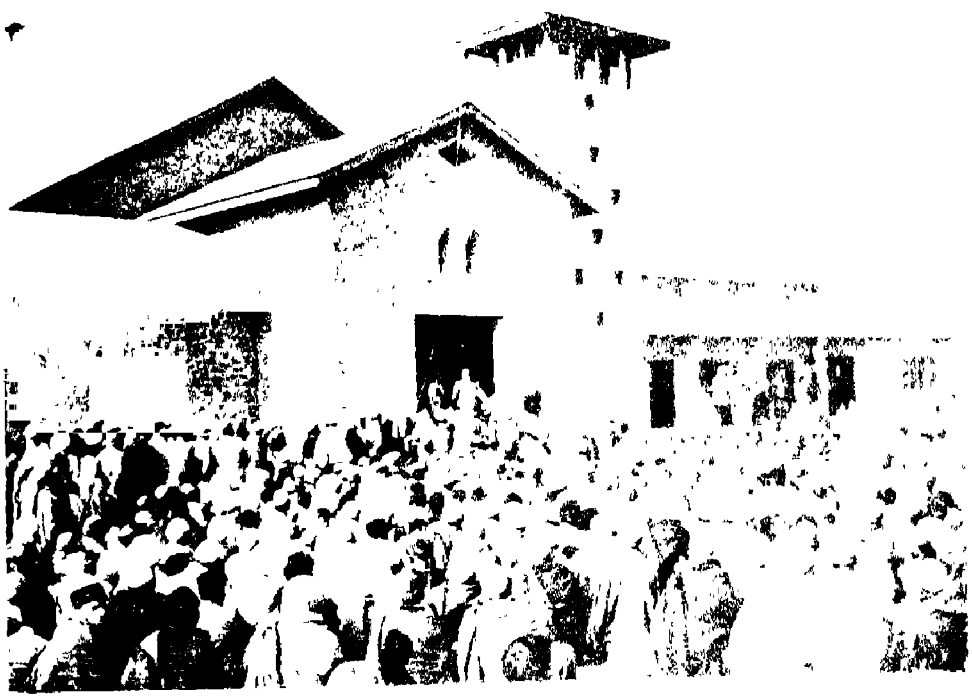
آزادیِ کشمیر

جموں وکشمیر کے وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد اس وقت اس محاذ کے سب سے بڑے کمانڈر ہیں جو دو قومی نظریئے کے خلاف سرزمین کشمیر پر قایم ہے۔ یہ مجاہد اب بھی اس مورچہ پر جما ہوا ہے جبکہ اس سے پہلے بڑے بڑے سورما تاب مقاومت نہ لاکر پیٹھ دکھا چکے ہیں۔ ایک موقع تو ایسا آگیا تھا جبکہ محاذ کے قایٔد کے فرار کر جانے کی وجہ سے یہ صاف معلوم ہونے لگا تھا کہ کہیں خدانخواستہ یہ جنگ ہم ہار نہ جائیں۔ قایٔد کی غلط پالیسی نے وطن پروری، نیشنلزم اور ایک قومی نظریے کو زبردست خطرہ میں ڈال دیا تھا لیکن اس نازک موقع پر جبکہ کمانڈر نے اپنی پوزیشن چھوڑ کر شکست کے امکانات پیدا کر دیئے تھے اس کے عقب میں ایک لڑنے والے سپاہی نے جس کے دل میں ہمّت و جرأت اور ملک وملّت کے لئے سچّی تڑپ موجود تھی آگے قدم بڑھایا اور محاذ کی قیادت خود سنبھال لی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ یہ بہادر و شجاع شخص بخشی غلام محمد ہے جس کے خلوص و وطن پروری اور حُب قومی کے جذبات نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر ایک قومی نظریئے کے گرتے ہوئے جھنڈے کو سنبھال لے۔ اگر یہ مردِ مجاہد نہ ہوتا تو یقین جانیئے کہ









دو قومی نظریہ مظفر و منصور ہو گیا تھا کہ کشمیر جنت نظیر ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے منقطع ہو کر رہ جاتا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ہندوستان کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ اگر بنظر غایر دیکھا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ چند ہزار یا چند لاکھ مربع میل رقبہ کے ملنے نہ ملنے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اس شاخ کو نہ کاٹنے دیا جائے جس پر یک قومی نظریئے کا آشیانہ لٹکا ہوا ہے۔ اور جس کو صیاد اپنے مفاد کی خاطر اُجاڑ ڈالنے کا کوشاں ہے۔

اہل کشمیر کے افلاس کو دُور کرنے کے لئے جو مخلصانہ کوششیں حکومت ہند کی مدد سے کی جا رہی ہیں وہ پاکستان سے ہرگز ممکن نہ تھیں اگر اس کے ساتھ کشمیر کا الحاق ہو گیا ہوتا۔ پاکستان کی معاشی حالت تو خود ہی سقیم ہے۔ جب پیر خود درماندہ ہو تو وہ دوسرے کی کیا شفاعت کر سکتا ہے پاکستان تو آپ ہی امریکہ کی مالی امداد کے سہارے جی رہا ہے۔ وہ کشمیر کی مدد کیا کرتا۔ ہمارے اس خیال کی تائید کشمیر کے اُس حالت کی مالی حالت کو دیکھ کر آسانی سے کی جا سکتی ہے جو اس وقت پاکستان کے قبضہ میں ہے جہاں نکبت و افلاس اور گرسنگی و فاقہ کشی کا دَور دورہ ہے اور جو اتنا پس ماندہ خطہ ارض ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کے کسی دوسرے خطہ کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان جب کشمیر کے اتنے چھوٹے سے حصّہ کی حالت کو نہ سدھار سکا تو وہ پُورے کشمیر کی حالت کو کس طرح سدھار سکتا تھا۔ کشمیریوں کو یہ تمام فوائد تو ایسی صورت میں ہی حاصل ہو سکے ہیں جبکہ انہوں نے اپنی قسمت کو ہندوستان کی قسمت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اگر کہیں خدا نخواستہ وہ پاکستان کے ماتحت پہنچ گئے ہوتے تو ان کی حالت اس وقت کی حالت سے بھی زیادہ بدتر ہوتی۔ جب وہ ڈوگرا راج کے تحت جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پاکستان کشمیر میں سرمایہ تو کیا لگاتا وہ تو اُلٹا

اس سے مواصلات کی شکل میں جلب منفعت ہی کرتا۔ بھوکا کسی بھوکے کو کھلانے پر تیار ہی کب ہوتا ہے بلکہ موقع پڑنے پر تو وہ اپنے پیٹ کی جوالا کو بجھانے کے لئے ایک بھکاری کے ٹکڑے بھی چھین لیتا ہے۔ یہ تو ہندوستان جیسا وسیع و عریض اور مضبوط و مستحکم ملک ہی ہے جو اپنے لامحدود وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس قابل ہے کہ وہ اپنے لمبے چوڑے پنج سالہ منصوبوں پر اربوں کھربوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد کشمیریوں کی سود و بہبود پر بھی کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ تاریخ کی یاد میں معاشی اعتبار سے ایسا زریں دور کشمیر میں کبھی نہیں آیا۔ جیسا ۱۹۵۳ء کے بعد سے آیا ہے۔

پاکستان کا یہ مطالبہ کہ کشمیر میں الحاق کی بنیاد پر استصواب رائے کرایا جائے کسی طرح قابل قبول نہیں ٹھہرتا اس لئے کہ کسی علاقہ کی کسی مملکت میں شمولیت کے لئے جو شرطیں ضروری ہوتی ہیں وہ سب ہندوستان میں شامل ہونے کے لئے اہل کشمیر نے پوری کرتی ہیں۔ جب برطانیہ نے اس برصغیر کا نظم و نسق ہندوستانیوں کے لئے حوالہ کیا تھا تو دیسی ریاستوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا تھا اور انہیں یہ اختیار دیدیا تھا کہ وہ خواہ ہندوستان میں شامل ہوں یا پاکستان میں۔ یہ ان کی مرضی پر موقوف ہے۔

کشمیر پر بزور شمشیر قبضہ کر لینے کی نیت سے پاکستان نے حملہ کر دیا اور ظاہر یہ کیا کہ جیسے یہ حملہ اس نے نہیں بلکہ سرحدی مسلمان قبائل نے کیا ہو۔ جب یہ حملہ آور تیمور و چنگیز کی طرح کشمیریوں کو تہس نہس کرتے ہوئے جن میں غالب اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی سرینگر تک پہنچ گئے تو مہاراجہ نے اور وہاں کے عوامی لیڈر شیخ عبداللہ نے حکومت ہند سے فوجی امداد مانگتے ہوئے ہندوستان سے الحاق کی پیشکش بھی کی جسے حکومت ہند نے منظور کر لیا اور فوجی کمک بڑی تیزی کے ساتھ روانہ کر دی۔ جس نے پہنچ کر حملہ آوروں کو وادی کشمیر سے دھکیل دیا۔ اور ان کا تعمیر۔

جو پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا دیا جہاں سے انہیں صرف دو ایک دھکوں کے بعد سرحد پار کیا جا سکتا تھا۔

اس عرصہ میں ہندوستان نے پاکستان کے اس جارحانہ اقدام کی شکایت بھی اقوام متحدہ میں پیش کر دی تھی اور اسے چارج بتاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس نے ہندوستان کے ایک ایسے حصہ پر حملہ کیا ہے جو ہندوستان میں شمولیت منظور کر چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان نے اپنا کیس پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کشمیر کا یہ الحاق ابھی مختتم نہیں ہے بلکہ جب کشمیر کے حالات اعتدال پر آ جائیں گے اور حملہ آور اسے خالی کر دیں گے۔ تو الحاق کی تصدیق استصواب رائے سے بھی کرائی جائے گی۔

شروع شروع میں تو پاکستان نے اس کا اقرار ہی نہیں کیا کہ حملہ اس کی فوجوں نے کیا ہے لیکن جب متحدہ اقوام کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تو بادل نخواستہ اس کا لحاظ کئے بغیر کہ وہ پہلے کس طرح غلط گوئی سے کام لے چکا ہے اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ہاں حملہ پاکستان ہی کی طرف سے ہوا تھا۔

اقوام متحدہ نے جنگ بندی کے احکام نافذ کر دئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کی ایک تنگ سرحدی پٹی پاکستان کے قبضہ میں رہ گئی اور بین الاقوامی انجمن کے حکم کا احترام کرتے ہوئے اس پٹی سے حملہ آوروں کو نہیں نکالا جا سکتا۔ اگر اس وقت یہ اندازہ ہو گیا ہوتا کہ اقوام متحدہ کی ٹال مٹول کے باعث کشمیر کے اس حصہ پر دشمن کے قبضہ کو دوام حاصل ہو جائے گا تو اسی وقت حملہ آوروں سے ریاست کا ایک ایک چپہ خالی کرا لیا جاتا تو آج کشمیر کی سرزمین پر دشمن کا ایک سپاہی بھی نظر نہ آتا ہوتا۔

استصواب رائے کا مسئلہ مشروط تھا اس بات سے کہ حملہ آور پاکستان کی فوجیں

پورے پاکستان کا تخلیہ کر دیں گی لیکن اب بارہ سال پوری ایک تمادی عارض ہو چکی ہے۔ پھر بھی پاکستان نے پورے کشمیر کا تخلیہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس کے ایک حصہ پر اب بھی غاصبانہ تصرف جمائے ہوئے ہے۔ ایسی صورت میں پاکستان کا استصواب رائے والے مطالبہ کو بار بار دہراتا اس کی کھلی ہوئی دھاندلی ہے۔

جب پاکستان نے کشمیر کا پورا پورا تخلیہ نہیں کیا تو مجبوراً ہندوستان نے استصواب رائے کی شرط کو اسی علاقہ میں پورا کرانے کی طرف توجہ کی جو پاکستان کے قبضہ سے باہر تھا۔ جموں اور کشمیر میں الحاق کے مسئلہ پر دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور اس دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کی شمولیت کی دستاویز پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اگر مقبوضہ کشمیر بھی پاکستان کی گرفت سے آزاد ہوتا تو اس کے باشندے بھی اسی طرح دستور ساز اسمبلی کے انتخاب اور فیصلہ میں حصہ لے سکتے تھے جس طرح ریاست جموں و کشمیر کے دوسرے باشندوں نے حصہ لیا۔ اب تو کشمیر کے مسئلہ نے ایک مختتم اور طے شدہ فیصلہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور وہ ہندوستان میں شامل ہو کر اس کا جز اس طرح بن گیا ہے کہ اسے کسی طرح اب الگ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

پھر یہ نہیں کہ پاکستان نے اپنے مقبوضہ حصہ کا تخلیہ ہی نہیں کیا بلکہ بعد میں امریکہ سے فوجی و دفاعی معاہدے کر کے صورت حال کو اور بد سے بدتر بنا دیا جس کے بعد استصواب رائے کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہا۔

کشمیر میں استصواب رائے کرانے کے مطالبہ پر ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ برصغیر کے کشمیر جیسے چھوٹے سے حصہ میں تو رائے شماری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ مگر پاکستان کے بننے نہ بننے کے مسئلہ پر ۱۹۴۷ء میں استصواب رائے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ اس کے لئے صرف لیگی لیڈروں اور مجالس قانون ساز کے کچھ ان لیگی ممبروں کی رائے ہی پر

تعمیر

پاکستان بنا لینے کو حق بجانب قرار دے دیا گیا جو جداگانہ طریقہ انتخاب کے ماتحت منتخب ہوئے تھے اور جن کی رائے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رائے ہرگز نہیں تھی۔ اب تو کشمیر میں رائے شماری کا مطالبہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ہم یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے الحاق کے لئے ہندوستان و پاکستان کے عوام کی رائے معلوم کی جانا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اب پاکستان کا وجود ایک حقیقت بن چکا ہے اسی طرح کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق بھی ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب نہ اُسے کالعدم قرار دیا جا سکتا اور نہ مسے۔ دونوں کی نوعیت ایک ہی سی ہے۔

درحقیقت کشمیریوں نے اپنے فطری حق خود ارادیت کا استعمال کرکے ہندوستان کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر لیا ہے۔ لیکن پاکستان چاہتا ہے کہ کشمیر کے موجودہ نظم ونسق کو ختم کرکے وہاں نراج کی سی کیفیت پیدا کر دی جائے اور اس وقت سرحدی قبائل خونخوار طور اس طرح کشمیر میں داخل ہو جائیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں مذہبی جنون اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔ مذہبی جنون دکھا کر کشمیریوں کی مسلم اکثریت سے اپیل کی جائے کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں اور اگر اس اپیل سے کام چلتا دکھائی نہ دے تو پھر تلوار کی نوک پر ووٹ حاصل کئے جائیں۔

مگر محافظ کشمیر بخشی غلام محمد کے عہد میں معاندین کی یہ چالیں کامیاب ہونے والی نہیں ہیں۔ وہ کبھی کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں کو پاکستان کے اندھے کنوئیں میں نہ گرنے دیں گے۔

کشمیر کی جو جنگ آزادی شخصی راج میں شروع ہوئی تھی وہ مختلف منزلوں سے گذر کر اب تکمیل کی ایسی منزل میں داخل ہو گئی ہے

جہاں اسکی حفاظت کے لئے بخشی غلام محمد سا مرد آہن موجود ہے۔ یہ مرد مجاہد بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اندرونی خطرات سے بھی کامیابی کے ساتھ نپٹ رہا ہے اور یہ بات اس کے تدبر و استقلال، اس کی جرأت و ہمت، اس کی دور اندیشی و مآل بینی اور اسکی سیاسی سوجھ بوجھ پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ہم بخشی غلام محمد کو کشمیر کا محافظ ہی نہیں بلکہ نجات دہندہ بھی کہیں تو یہ کسی طرح غلط نہ ہوگا اس لئے کہ سابقہ قیادت کی غلط روشی کے باعث کشمیر جس حاصل شدہ آزادی سے محروم ہونے والا تھا اس کو محفوظ و مامون بنانے کا اہم کام بخشی غلام محمد ہی نے انجام دیا ہے اور اس طرح کشمیریوں کو حقیقی نجات اسی مرد مجاہد کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

عزم صمیم

کشمیر قدیم زمانے سے علوم و فنون کا سرچشمہ رہتا آیا ہے۔ دُور دُور کے تشنگان علم یہاں آکر پیاس بجھاتے تھے۔ غلامی کی ظلمتوں میں یہ چشمۂ حیواں کھو گیا تھا مگر ہم نے عزم صمیم کرلیا ہے کہ کشمیر کو پھر سے علم و فن کے مطلع پر ایک روشن ستارے کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس غرض کے لئے ہم ہر ممکن کوشش سے کام کر رہے ہیں؛

بخشی غلام محمدؔ

مظفر شفیق

چشمۂ فیض

ہر ابوجہل اُس سے خائف ہے
علم و فن چاہتے ہیں اُس کی پناہ

مہر بھی اُس کو دیکھ کر ہے خجل
ٹھہرتی ہی نہیں ہے اُس پہ نگاہ

جام جمشید ہے ضمیر اُس کا
واقعی وہ ہے مردِ حق آگاہ

کیا کہوں اُس کا دل ہے کتنا وسیع
ایک سمندر نہیں ہے جس کی تھاہ

برتر از خسرو سکندر ہے
جس کی جانب اُٹھی ہے اُس کی نگاہ

ہر مغنّی ہے اُس کا دیوانہ
اور ہے شاعروں کا وہ نوشاہ

شکر ہے اُس نے رہنمائی کی
حالِ کشمیر ہو رہا تھا تباہ

خارزاروں کو کر دیا گلزار
پھول اُس کے لئے ہیں فرشِ راہ

اُس سے پایا ہے صنعتوں نے فروغ
عہدِ حاضر کا ہے وہی بادشاہ

رہبری میں ہے اُس کی استحکام
منزل اُس کے لئے ہے چشم براہ

اُس کو کہتے ہیں خالدِ کشمیر
جس کی عظمت کا ہے زمانہ گواہ

دورِ حاضر کا عظیم انسان

ٹیکساس کے شہر ابلینہ میں سماجی علوم کے میدان میں تحقیق کا کام انجام دینے والے ایک عالم مسٹر کالون سی، کالڈون نے ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کے نام اپنے ایک مکتوب میں مسٹر کالون لکھتے ہیں :۔

"میں اپنی قوم کے ایک بہترین ہائی سکول میں سماجی تحقیق کا اُستاد ہوں۔ میرے خوش گوار اور صلہ بخش فرائض میں سے میرے ذمہ ایک کام یہ تفویض ہوا ہے کہ میں اپنے سکول کے طلبا کے سامنے آج کی دُنیا کے رہنماؤں کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کی روئداد پیش کروں۔ جب میں اپنے لیکچروں میں ان بے لوث، صادق اور خوش خلیق انسانوں کے کارہائے نمایاں اور ان کی فکر انگیز زندگی کے حالات بیان کرتا ہوں جن پر ہماری دُنیا کی رنگ برنگ کی قوموں کے بھاری معاملات نپٹانے کی بڑی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ تو ان موقعوں پر میں اپنے آپ میں بڑی اُمنگ اور گرم جوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اپنے سکول کے ایک ایک لڑکے میں بھی یہی جوش وجذبہ اور یہی سرگرمی پاتا ہوں۔

سماجی علوم کے مطالعہ کے دوران اس موضوع پر کوئی بات چھڑتی ہے تو ہم خاص طور پر کشمیر کے قابلِ احترام، جفاکش اور سلیقہ شعار وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کی شخصیت، اور زندگی سے تحریک لیتے ہیں اور اس کا مطالعہ کرنے میں بڑی سنجیدگی برتتے ہیں۔

اس قوم کے نوجوان ایک عمدہ نظام حکومت، عالمی امن اور سمندر پار کے ملکوں میں رہنے والے اپنے تمام دوستوں کی سلامتی اور ان کی بہبودی سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وہ قدریں ہیں جو بنائے رکھنے اور جنہیں تقویت پہنچانے کے لئے آپ نت نئی اور بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں اور اسی لئے میرے سب طالب علم آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ سے متاثر ہیں۔ آپ سچے معنوں میں اپنے ملک اور عوام کے لئے گراں قدر خادم اور ممتاز شہری کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عزت مآب وزیر اعظم ——— ایک عظیم قوم اور عظیم ملک کی امتیازی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اس میں آپ جیسی ذہانت اور عظمت کے انسان خوشی خوشی اپنا سب کچھ اپنی قوم کے لئے وقف کر دینے کو تیار رہتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں مفاہمت کے لئے اور حکومت کے دائرہ میں آپ جو شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہیں۔ آپ کی ریاست ہماری دُنیا کا ہی ایک حصہ تو ہے۔ اس طرح سے ساری دُنیا آپ کی صلاحیتوں اور ذہانت سے فیض پا رہی ہے۔ درس و تدریس کے پیشے سے تعلق رکھنے والے ہم لوگ بھی آپ کے عمدہ کام سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اس سے ضرور باخبر ہیں کہ عظیم الشان کشمیر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ کو کتنی اہم اور پیچیدہ ذمہ داریاں نبھانا پڑ رہی ہیں۔ ہم ان تمام ترقیاتی کاموں کا غائر نظر سے جائزہ لے رہے ہیں جو آپ کے عظیم ملک میں عمل میں آ رہی ہیں۔

اگرچہ ہم آپ کی خدمات کی زبردست افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اس کو پرکھ لیتے ہیں، تاہم ہمیں نجی طور پر آپ تک تشکر سے بھرپور اپنے جذبات پہنچانے کا شاذ و نادر ہی کوئی موقع ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم پوری طرح سے یہ آنک نہ سکے ہوں کہ آپ کو اتنی خوبی کے ساتھ عوام کی خدمت انجام دینے کے لئے ذاتی طور پر کیا کیا قربانیاں دینی پڑی ہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ ہم آپ سے متعلق ہر مضمون

کا ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر بھی ہم یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ آپ کشمیر میں عوام کے بہبود کے لئے اور اس طرح ہم سب کے لئے ایک بہتر دُنیا کی تعمیر کی خاطر وقت وقت پر کتنے کوشاں رہتے ہیں؛ کیا کیا منصوبے سوچتے ہیں، کتنا فکرمند ہوتے ہیں اور کتنی قوت صرف کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کو اب تک جو اَن تھک جد و جہد کرنا پڑی ہے، ہم اس کی ایک معمولی سی جھلک تو پاسکتے ہیں مگر اس سے زیادہ کی جانکاری حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ بہرحال آپ کی خدمات میں کوئی کلام نہیں۔ ہم کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔

جناب وزیر اعظم ——— میں ایک سیدھا سادہ سکول ٹیچر ہوں۔ آپ اور میں آمنے سامنے شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔ لیکن میں ذاتی طور پر آپ کو ان کارہائے نمایاں کے لئے، جو آپ دُنیا کے بے شمار خوش خصال لوگوں کی خاطر انجام دے چکے ہیں اور جو آپ مستقبل میں انجام دینے جا رہے ہیں، دِلی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ہمیشہ آپ کی سرفروشی، آپ کی اولوالعزمی، آپ کی بے خوفی اور مثالی کردار کے اس انداز کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جس کے طفیل آپ نے اپنے کو اتنے ممتاز مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔

اپنی عظیم شخصیت سے آپ نے ہمیں جو فیض عطا کئے ہیں اُس کے لئے ہم شکرگذار اور احسان مند ہیں۔ جب تک مجھ میں دوسروں کو تعلیم دینے کی قوت رہے گی، میری کوشش یہی رہے گی کہ میں عزت مآب وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کی زندگی اور ان کے کاموں کی عظمت اپنے طلبا کے ذہن نشین کردوں۔ آپ جس تعظیم و تکریم سے سرفراز ہیں، یقینی طور پر آپ اس سے کہیں زیادہ عزت افزائی اور قدر و منزلت کے روادار ہیں۔ آپ کا نام زمانے کے ہر دور میں زندہ اور تابندہ رہے گا۔ اگر میں اپنے طلبا کو کوئی سبق دینے کی خواہش رکھتا ہوں تو وہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دُنیا میں عظیم قوموں کی تعمیر تن آسان لوگوں

نے نہیں کی۔ یہ قومیں عظیم انسانوں نے تعمیر کیں۔ ایسے انسانوں نے، جو عزم صمیم اور مدبرانہ بصیرت کے مالک تھے۔ قوموں کی تعمیر کا کام آج بھی جاری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ وزیر اعظم کی حیثیت میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور تدبر سے اپنے عوام کی آنے والی نسلوں کے لئے ایک آسودہ حال اور بہتر کشمیر کی تخلیق کر رہے ہیں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے برسوں میں آپ کی یہ خدمات زور و شور سے جاری رہیں گی۔ میں تہہ دل سے تمنا کرتا ہوں کہ آپ مستقبل میں جو عظیم کام انجام دینے جا رہے ہیں ان کی تکمیل کے راستے میں کامیابیاں اور مسرتیں آپ کے قدم چومیں۔ ایک بار پھر مجھے شکریہ ادا کرنے دیجئے۔ میری دعا ہے کہ پروردگار آپ کے شاملِ حال ہو اور وہ ہمیشہ آپ کو سلامت رکھے!

تمدنی احیا

"سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روایات اور ادبی اقدار کے احیا کے لئے سرگرم عمل ہوں۔ ہمیں ماضی کے ورثے کو کھنگال کر اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کشمیری عوام جہاں اپنی عظیم الشان کلچرل روایات کو عزیز رکھتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ نئی زندگی کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں ہیں۔"

——— بخشی غلام محمد

ساحر لکھنوی

زندہ باد اے خالدِ کشمیر

خالدِ کشمیر بخشی غلام محمد کی سالگرہ کے مبارک موقع پر تعمیر سرینگر کے لئے لکھی گئی

زندہ باد، اے خالدِ کشمیر، اے جانِ وطن

اے سراپا خلق، اے سرچشمۂ صدق و صفا — سربلند و سرفراز و صاحبِ جود و سخا
پیکرِ لطف و کرم، خورشید اقلیمِ عطا — حامئ اہلِ ادب، روحِ روانِ انجمن

زندہ باد اے خالدِ کشمیر، اے جانِ وطن

بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و ذی حشم — صاحبِ جاہ و مراتب، نازشِ اہلِ ہمم
خوش مزاج و خوش خصال و خوش کلام و خوش قدم — مخزنِ علم و فراست، قدردانِ اہلِ فن

زندہ باد، اے خالدِ کشمیر، اے جانِ وطن

اے نگہبانِ بہارِ گل فروش و گل فشاں — سنبل و نسرین و سرو و نسترن کے پاسباں
اے پرستارِ شبابِ خطۂ جنّت نشاں — بڑھ گیا ناظورۂ ارضِ وطن کا بانکپن

زندہ باد، اے خالدِ کشمیر، اے جانِ وطن

نکہت و نور و نزاکت، رنگ و بو کی سرزمیں — کہہ رہی ہے شاہدِ کشمیر کی روشن جبیں
میں تجلّی کا خزینہ ہوں لطافت کی امیں — گنگناتی ہے سحر ہوتے ہی یہ پہلی کرن

زندہ باد اے خاکِ کشمیر، اے جانِ وطن

اپنے دامن میں لئے سرمایۂ دانشوری — عظمتِ جم، شانِ خسرو، سطوتِ اسکندری
ذرّہ ذرّہ کر رہا ہے کہکشاں کی ہمسری — شدتِ احساس سے ہر اک زباں ہے نعرہ زن

زندہ باد اے خاکِ کشمیر، اے جانِ وطن

دوستو! لاؤ شراب و شیشہ و جام و سبو — عظمتِ ساقی ہے سارے میکدے کی آبرو
کم ہے جتنا بھی منایا جائے جشنِ رنگ و بو — زندگی سازِ طرب پر ہو رہی ہے نغمہ زن

زندہ باد اے خاکِ کشمیر، اے جانِ وطن

سالِ نو لائے ہمیشہ یوں ہی پیغامِ خوشی — نیّرِ اقبال کی پھیلے جہاں میں روشنی
کیف برسائے یوں ہی صبحِ بہارِ زندگی — خوش نما پھولوں سے مہکے آرزوؤں کا چمن

زندہ باد اے خاکِ کشمیر، اے جانِ وطن

مردِ خلیق —— (بقیہ از صفحہ ۸۳)

کیا تم نے غور نہیں کیا۔ عموماً یہ پردہ میں رہتی ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں پبلک میں آئی ہیں۔ میں حیرت میں تھی کہ کس طرح یہ کام کرتے ہیں اور زندگی کا کتنا کامل تصوّر ہے اور میں نے دیکھا کہ وہ بھی وہی کشمیری ٹوپی اوڑھے تھے جس کی مجھے اتنی تلاش تھی۔ دِل میں تو آیا کہ اُن سے کہوں مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے بازار میں جا کر ٹوپی خرید کر دیں گے اور میں وزیرِ اعظم کو اس حد تک لانا آداب کے خلاف سمجھتی تھی۔ وہ واقعی عوامی وزیر

جے۔ این۔ سادھو

ہمارا محبوب وزیراعظم

جب سے کشمیر کے واقعات نے دُنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ بخشی غلام محمد کا نام امتیازی حیثیت حاصل کر گیا۔ بخشی غلام محمد ایک طویل قامت اور مضبوط ارادے کے انسان ہیں اگست ۱۹۵۳ء سے جبکہ انہوں نے ریاست کی وزارت اعظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ اُن کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ پڑ گیا ہے۔ اُن کے چہرے سے جلال ٹپکتا ہے اور اُن کی آنکھوں میں جادو کا اثر ہے۔ وہ اپنی زندگی کی ۴۹ ویں بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن اُن کے چہرے پر جھریاں ہرگز دکھائی نہیں دیتیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ناقابل تسخیر عزم کے مالک ہیں۔ کیونکہ وہ شیر ببر کی سی قوت، لوہے کے موافق دل اور فولاد کے مانند ارادہ رکھتے ہیں۔

بخشی غلام محمد جولائی ۱۹۰۷ء میں شہر سرینگر کے عین وسط میں ایک غریب کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دوسرے کشمیریوں کی طرح اُنہیں بھی اپنے ابتدائی ایام اور جوانی کے دن طرح طرح کی مشکلات میں گزارنا پڑے۔ خوش قسمتی سے سکول میں اُن کا ریکارڈ شاندار رہا۔ وہ سکول سے باہر کوہ پیمائی، سماجی بہبود اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ غریبی کے باعث اُنہیں جلد ہی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور روزی کمانے کے لئے لداخ کے دور دراز علاقے میں ایک

تعمیر

اُستاد کی اسامی پر نامور ہونا پڑا۔ لداخ میں انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کس طرح حد درجہ غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہیں سے اُن کا سیاسی شعور بیدار ہوگیا اور وہ لوگوں کے بُرے سماجی۔ معاشی اور سیاسی حالات پر غور کرنے لگے۔

مہاتما گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کی تعلیمات کا ہی یہ اثر تھا۔ کہ بخشی غلام محمد نے ریاست میں سب سے پہلے "سمندر پار کی چیزوں کا بائیکاٹ کرو" کا نعرہ بلند کیا۔ یہی بخشی صاحب کا سیاسی بپتسمہ تھا اور یہ نعرہ اُنہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی اپیل پر دیا تھا یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ریاست میں سیاسی بیداری کا بہت کم نام و نشان پایا جاتا تھا چنانچہ اُس وقت کی حکومت نے بخشی صاحب کو گرفتار کرلیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں بخشی صاحب نے مکمل طور پر تحریک آزادی کے ساتھ وابستگی اختیار کرلی اور شخصی راج کے ظلم و ستم کا پُوری ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بخشی صاحب کشمیر مسلم کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے شخصی نظام حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بخشی صاحب نے طالب علموں اور مزدوروں کو اپنی اپنی یونینوں کے تحت منظم کیا۔ اس پر دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ اُنہیں بھی گرفتار کرکے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اور اس طرح تحریک آزادی کا یہ کارواں آگے بڑھتا گیا۔

بخشی صاحب کی قیادت اور غیر مذہبی نظریہ کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاکہ ریاست کی اقلیتوں کو قومی تحریک میں حصّہ لینے کا موقعہ فراہم ہوسکے۔ اسی جدوجہد کے دوران بخشی صاحب کو سنہ ۱۹۴۶ء تک چار مرتبہ جیل جانا پڑا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں وہ سب سے زیادہ مدّت کے لئے زیر حراست رہے جبکہ انہیں سولہ مہینوں تک ریاستی کی جیل میں محبوس رکھا گیا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں جب نیشنل کانفرنس نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک

شروع کی تھی تو بخشی صاحب پولیس کی نظر سے بچ کر ہندوستان میں چلے گئے جہاں وہ اپنے دوسرے رفیقوں کے ساتھ اس تحریک کے حق میں رائے عامہ منظم کرتے رہے۔ بخشی صاحب کی محنتوں کا ثمرہ جلد مل گیا اور وہ مہاراجہ کے ظلم و تشدد کے خلاف ہندوستانی عوام کے جذبات ابھارنے میں کامیاب ہو گئے۔ حتیٰ کہ کاک وزارت کی عمارت دھڑام سے گر گئی اور رام چندر کاک کو نہ صرف وزارت اعظمیٰ سے الگ ہونا پڑا بلکہ ریاست سے بھی باہر جانا پڑا۔ گاندھی جی کی کشمیر سے واپسی پر بخشی صاحب کی گرفتاری کے وارنٹ منسوخ ہو گئے اور ایک فاتح کے طور پر وہ دوبارہ ریاست میں داخل ہو گئے ۱۷ مہینوں تک ملک بدر رہنے کے بعد بخشی صاحب اگست ۱۹۴۷ء میں واپس کشمیر آ گئے۔ کشمیریوں نے اُن کا شاندار استقبال کیا۔ دریں اثنا ہندوستان منقسم ہو چکا تھا اور ریاست کی سرحدوں پر شیطانی عناصر سرگرم کار تھے۔

اپنی واپسی کے فوراً بعد بخشی صاحب نے ریاست کے اندر فرقہ پرست اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف مہم شروع کی۔ جو ریاستی عوام کے اتحاد اور یگانگت کو درہم برہم کرنے کے درپے تھے اور جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستانی قبائلیوں نے ریاست پر دھاوا بول دیا۔ بخشی صاحب نے اپنی بے مثال تنظیمی قابلیت کو استعمال کر کے "سلامتی فوج" کے نام سے ایک مضبوط جماعت قائم کر لی جس نے لوگوں کی صفوں کو درست کرنے اور اندرونی امن و امان کو برقرار رکھنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ دشمن شہر کے باہر ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ اُن دنوں بخشی صاحب کو اکثر ایسے مقامات پر دیکھا گیا۔ جہاں دشمن کا نشانہ بننے کا شدید خطرہ تھا لیکن بخشی صاحب ان تمام خطرات کی پروا کئے بغیر اپنا کام کرتے رہے۔ ایک اعلیٰ ہندوستانی فوجی افسر نے ایک بار کہا کہ "بخشی صاحب دراصل ایک فوجی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ شہری لباس پہنتے ہیں"۔ بخشی صاحب نے عوام دشمن عناصر اور تخریب پسندوں کو پکڑنے میں بڑا پارٹ ادا کیا۔

بخشی صاحب کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے۔ کہ انہیں عوامی تنظیم میں رہ کر کبھی عہدوں اور القاب کا شوق نہیں چرایا۔ وہ بھاری ذمہ داریوں کو بالکل وفاداری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ بخشی صاحب کی تمام سیاسی سرگرمیوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی حالت بہتر بنائی جائے اور وہ دوسروں کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ دوسرے سیاست دانوں کے برعکس وہ (ISMS) یعنی مخصوص سیاسی عقائد میں یقین نہیں رکھتے۔ آپ اُن کے سامنے کسی "ازم" پر گھنٹوں تک بات چیت کرتے رہیں لیکن بالآخر آپ یہی پائیں گے کہ آپ کے اس تمام گفتار کو بہرے کانوں سُنا گیا ہے۔

بخشی غلام محمد کو مارچ ۱۹۴۸ء میں جبکہ ریاست میں پہلی عوامی وزارت معرض وجود میں آئی۔ نائب وزیراعظم کا عہدہ سونپا گیا۔ وہ امن وامان اور اندرونی سلامتی کے انچارج تھے۔ ایک معمولی اُستاد اور بعد میں کل ہند کھادی بھنڈار کے ایک ملازم کے درجہ سے اُٹھ کر بخشی غلام محمد محض ملک کی خاطر اپنی خدمات کے عوض وزیراعظم کے عہدہ جلیلہ تک پہنچ چکے ہیں جب ۱۹۴۸ء میں جب مرحوم مسٹر سی۔ ای ٹنڈل بسکو کو جو اُن دنوں جنوبی افریقہ میں تھے۔ پتہ چلا کہ بخشی صاحب ریاست کے نائب وزیراعظم بن گئے ہیں تو مرحوم بسکو نے خوش ہو کر کہا "مجھے فخر ہے کہ میرا ایک طالبعلم کشمیر کا نائب وزیراعظم بنا ہے۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ غلام محمد بخشی جلد ہی ریاست کا وزیراعظم بنے گا اور اُسے کل ہند شہرت حاصل ہوگی۔

اگست ۱۹۵۳ء کے بحران میں بخشی غلام محمد نے انتہائی نازک حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس طرح ریاست تباہی اور بربادی کے راستے پر جانے سے روک دی گئی۔ صدر ریاست نے اس وقت کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کو برطرف کردیا اور بخشی غلام محمد کو ریاست میں نئی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو آپ لے ریاست کے تعمیر

وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو نیشنل کانفرنس کے اکیسویں سالانہ اجلاس میں آپ کو بالاتفاق نیشنل کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔

بخشی غلام محمد کے عادات سادہ لیکن عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ وہ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہیں اور وہ صوفیانہ کلام کے لئے عموماً وقت نکال ہی لیا کرتے ہیں۔ بخشی صاحب نے کشمیری موسیقی اور شاعری کو پھر سے زندہ کرنے میں ایک عدیم المثال پارٹ ادا کیا ہے۔ ایک زمانے میں وہ فٹ بال اور ہاکی کے شوقین کھلاڑیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ بہترین مقرر ہیں اور جب وہ کشمیریوں کے سامنے تقریر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ گویا اُن کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہیں۔ وہ اُردو میں بڑی اچھی طرح سے بول سکتے ہیں۔ انگریزی میں بھی اُن کی روانی بے حراغ ہے

بخشی غلام محمد اپنی تنظیمی قابلیت اور مہارت کے لئے مشہور ہیں۔ وہ مسائل کو حقیقت پسندانہ نظریہ سے حل کرنے کے لئے نام پیدا کر چکے ہیں۔ تساہل کا لفظ اُن کی ڈکشنری میں سرے سے ہی موجود نہیں۔ اُن کا ہر کام ہمیشہ پھرتی اور سرعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں سرخ فیتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ریاست کا ہر باشندہ کسی بھی وقت اُن سے ملاقات کر سکتا ہے۔ وہ ہر وقت لوگوں کی شکایات سُننے اور اُن کے تساہل حل کرنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔

بخشی غلام محمد بہترین دوست ہیں۔ اُن کا دل شیشے کی طرح صاف اور تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ وہ کسی سے حسد یا بغض نہیں رکھتے بلکہ تمام لوگوں سے محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دل سے اُن کو چاہتے ہیں اور وہ عوام کے محبوب وزیر اعظم کہلاتے ہیں۔

جب سے بخشی صاحب نے عنانِ حکومت سنبھالی ہے۔ ریاست کی کایا پلٹ چکی ہے۔

محمد ایوب بیتاب

ساقی

بڑی خود اعتمادی سے تیرے میخوار بیٹھے ہیں
کوئی جمشید ہے ساقی، کوئی پرویز ہے ساقی
مجھے بھی جلد جامِ بادۂ گلفام دے، جاؤں
کہ رفتارِ ترقی اب بہت ہی تیز ہے ساقی
بتا کِس نے میرے کشمیر کا نقشہ بدل ڈالا
جہاں بنجر تھے وہ مٹی بھی اب زرخیز ہے ساقی
دُہائی خالدِ کشمیر کی دیتے ہیں تشنہ لب
یہ کِس کا نام ہے جو اتنا دِلاویز ہے ساقی

ساگر چند مہاجن

چائے کی دو پیالیاں

میں نے میز پر پڑی ہوئی چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور معاً تاریخ اوراق پلٹتی ہوئی کئی سال پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

لاہور کی ایک سنسان سڑک، آدھی رات کا سماں اخبار کا دفتر غنودگی کا عالم۔ آنکھیں کچھ کھلی کچھ بند اور پریس کے لئے آخری کاپی کی دوڑ دھوپ، دنیا بھر کے ہنگامے، لیڈروں کے بیانات گاڑیوں کی ٹکر۔ چار بچوں کی ماں کا کوئیں میں کودنا۔ یہ سب کچھ میرے سامنے تھا پھر بھی وہ رات عام راتوں کی طرح بے کیف تھی۔ دنیا کی ہر واردات کو میں کسی قسم کے تاثر کے بغیر اخبار میں مناسب جگہ دے رہا تھا۔ ایسے میں نہ معلوم کب عقابی نگاہوں والا ایک کشمیری نوجوان میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا تھا۔

. بخشی غلام محمد کا آدھی رات کے وقت ہمارے دفتر میں پہنچ جانا کوئی غیر معمولی واقعہ

نہ تھا۔ اُن دنوں جموں وکشمیر میں ایک زبردست انقلاب جنم لے رہا تھا۔ ریاست کے چاروں کونوں میں ایک ہنگامہ خیز تحریک چل رہی تھی جسے تقویت دینے اور راعی اور رعایا کی باہمی کشمکش کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لئے ریاست سے باہر بہت کام کرنے کی ضرورت تھی، یہی مقصد سامنے رکھ کر بخشی غلام محمد اور اُن کے کچھ دوسرے ساتھی، انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں برطانوی ہند میں پھیل گئے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کانگریسی اور غیر کانگریسی لیڈر کو اپنی تحریک کی غرض وغایت سمجھا رہے تھے اور اپنا ہمدرد بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ ریاست کی تحریکِ آزادی میں عضبنا کی پیدا کرنے والے یہی نوجوان تھے انہوں نے اپنے اخلاص سے بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے دماغ سکیموں سے بھرے رہتے تھے۔ ان کی زندگی ادھیڑپن کی زندگی تھی۔ بارہا انہیں کھانا کھانے کی فرصت بھی نہ ملتی۔ میرا خیال ہے کہ اس رات بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں نے چپراسی سے کہا اور اُس نے نیچے دوکان سے (جو ہم اخباروں کے لئے رات دیر تک کھلی رہتی تھی) چائے کی ایک پیالی لاکر بخشی صاحب کے سامنے رکھ دی

اور کل جب بخشی صاحب کی کوٹھی پر میرے سامنے چائے کی ایک پیالی رکھی گئی۔ تو اچانک مجھے اُس پیالی سے بھاپ اٹھتی دکھائی دی۔ جو ایک رات . . میں نے اُن کے سامنے رکھی تھی۔ ان دو پیالوں کے درمیانی وقفے میں دنیا بدل چکی تھی۔ میں نے تاریخ کے دھندلکے میں ایک پُرجوش نوجوان دیکھا جو بار بار کہہ رہا تھا کہ ریاستی حکام کا فلاں بیان غلط ہے۔ وہ کس طرح کہتے ہیں کہ یہ تحریک فرقہ پرستوں نے چلا رکھی ہے وہ مصر تھا کہ شخصی حکومت کے خلاف ریاست کے سبھی ہندو مسلمان اور سکھ متحد ہیں ریاست کی لڑائی ہندو اور مسلمان کی لڑائی نہیں بلکہ جابر و مجبور کی لڑائی ہے۔ اُس نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے ان سب باتوں کو غور سے سُنا ہے۔ یہ کہتے کہتے

اس کی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔

میں نے کہا بخشی صاحب جگہ ہو یا نہ ہو۔ یہ سب باتیں صبح کے اخبار میں ضرور چھپ جائیں گی۔ آپ چائے تو پی جئے۔ اُس وقت تک چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

چائے کے پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بیتے ہوئے کچھ برسوں پر نظر دوڑائی۔ ان برسوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی لیکن کتنے طوفانوں میں سے گذرنے کے بعد۔ اس عرصے میں کتنے سیاسی اتھل پتھل ہوئے۔ زبردست آندھیاں آئیں اور ان آندھیوں میں میں نے بخشی غلام محمد کو نہایت متانت اور وقار کے ساتھ گرتوں کو سنبھالتے اور اغیار کو للکارتے دیکھا۔ بڑے بڑے سیلاب آئے لیکن یہ سیلاب اس کی آنکھوں کی چمک اور اُس کے ہونٹوں کا تبسم کو نہ لے جا سکے۔ یہ وہ دولت تھی جو چرائی نہ جا سکی۔ غریب ماں باپ کا یہ ہونہار فرزند فولادی انسان کہلانے کے باوجود چاروں طرف موتی بکھیر رہا۔

میں سوچنے لگا اگر آسمانِ کشمیر پر یہ ستارہ جلوہ گر نہ ہوتا اگر ہمالیہ کی خوبصورت گود میں اس بچے نے پرورش نہ پائی ہوتی۔ اگر افلاس اسے بچپن میں غریبوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے شناسا نہ کرتا تو تاریخ کے کئی اوراق کسی مختلف انداز سے لکھے جاتے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے پکارا چائے تو پی جئے۔ اس وقت تک چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

آمنہ تمکین

بخشی غلام محمدؒ

مرتبہ اُس کا ہوا اور بھی عالی تُو نے
جس کو دیکھا ہے نگاہِ غلط انداز کے ساتھ
تُو نے جو بات کہی سب نے وہی بات کہی
سب نے آواز ملائی تیری آواز کے ساتھ

اہلِ کشمیر کے ہر درد کا درماں تُو ہے
دورِ نو آیا ترے عہد کے آغاز کے ساتھ
سر جھکائے ہوئے رہتے تھے جو اپنے گھر میں
نام لیتے ہیں وہ کشمیر کا اب ناز کے ساتھ

(ٹائمز آف انڈیا)

فطری رہنما

کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمدؐ عوام سے تعلق رکھتے ہیں اور عوام کے لئے ہیں جس کسی نے اُن کی روزمرہ زندگی کا مشاہدہ کیا ہے انہیں اپنی میز پر دیکھا ہے اُنہیں بازاروں میں دیکھا ہے یا کھیتوں میں وہ اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوت و توانائی عوام سے اخذ کرتے ہیں۔

بخشی صاحب ایک مضبوط تن و توش کے آدمی ہیں۔ جن کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہے۔ کاندھے کشادہ ہیں اور روم کے مشاہیر کے متشابہ اُن کی ستواں ناک زبانِ حال سے اُن کے پیدائشی رہنما اور منتظم ہونے کا راز بتاتی ہے۔ اُن کی طبیعت میں وقار کی تمکنت اور انسان دوستی کی دلاویزی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ رہنمائی کرنے کے فطری عطیے کو پاکر انہوں نے اپنے آپ کو عوام کی آواز سننے کے لئے بڑی تنظیم سے تربیت دی ہے۔

بخشی صاحب کی طاقت کا ایک بڑا حصہ اُن کی تنظیمی صلاحیت میں مُضمر ہے۔ اُن کی نگاہیں معمولی سے معمولی جزئیات کو تاڑ لیتی ہیں۔ اُن کی تیز بین نظروں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اشخاص اور حالات سے متعلق اُن کا اندازہ بڑا ہی صحیح ہوتا ہے۔ اپنے عوام سے گہری

تعیر





واقفیت کی بنا پر وہ اُن کے قومی مزاج کی ساخت اور رجحانات سے بخوبی واقف ہیں اور جب سے انہوں نے وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھالی ہے۔ جموں و کشمیر کا حُلیہ ہی تبدیل ہو گیا ہے بخشی صاحب نے تعمیر کے دعوے ہی نہیں کئے۔ انہوں نے اپنے وعدوں پر عمل کی مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔

غلام قادر اندرابی

ہدیہ عقیدت

بڈگام کے ایک عوامی جلسے میں پیش کیا گیا

ہجوم خلق کا بڈگام کی تاریخ میں یہ کیا؟ عظیم المرتبت جلسہ ہے پہلی مرتبہ ایسا!
یہ کس کی عظمت و شوکت یہاں پر رنگ لائی ہے یہ لمحاتِ مسرت زا میں کیوں نغمہ سرائی ہے
خدا جانے کہ کس کس وجد میں ہیں لوگ یاں آئے امیدیں باندھ کر آئے مقاصد لاد کر لائے
نہیں کس رہنما قائد کی شوق دید لائی ہے کہ ان پر اس قدر وافر یہ ذوق دید چھائی ہے
حصول علم کے دلدادہ اسکولوں کے طالب ہیں عوام الناس کے خادم مسائل لے کے آئے ہیں
بہ جرأت سے بے محابا مانگنے کی جس نے بخشی ہے یہ دریا دل ہمارا خالدِ کشمیر بخشی ہے

برِ رسمِ افتتاحِ رَدّ[1] مبارک ہو مبارک ہو
یہ تاریکی کے بدلے نور کا پرتو مبارک ہو

[1] برقی قوت مراد

چراغ دین تابش

گوہرِ نایاب

اِک روایت ہے عہدِ بخشی کی
وہ ترقی نہیں ہے جس کا جواب
ہے حکومت عوام کی خادم
بدلے فرماں روائی کے آداب
فرقِ مزدور پہ ہے دورِ لعین
اور چہرہ کسان کا شاداب
خاکِ کشمیر آج ہے اکسیر
ذرّہ ذرّہ ہے گوہرِ نایاب
تجھ کو بادشاہ و خاکِ کشمیر
اہلِ کشمیر نے دیے ہیں خطاب

خالد کشمیر —— اکابرینِ سیاست وصحافت کی نظر میں

میں اُس ہمہ گیر ترقی سے کافی متاثر ہوا ہوں جو ہندوستان کے ایک لازمی حصے کی حیثیت میں ریاست نے کی ہے اور اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی رنگا رنگ شخصیت نے بھی مجھے کافی متاثر کیا ہے۔ کشمیر نے ہمارے دِلوں کو جیت لیا ہے اور اس جیت میں ان کا (بخشی صاحب کا) سب سے زیادہ حصہ ہے۔

—— (ڈاگ ہیمرشولڈ سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ)

بخشی غلام محمد ہندوستان کی نئی تقدیر کے ایک عظیم معمار ہیں۔ اُنہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی دُرست رہنمائی کی ہے جو ترقی کی منزلیں سُرعت سے طے کر رہے ہیں۔

—— (بی، آر بھگت ڈپٹی فائنانس منسٹر آف انڈیا)

وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد نہ صرف ریاستی عوام کے لئے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے توانائی کے ایک مینار اور فیض کے ایک بے پایاں مخزن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بخشی صاحب نے پاکستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے نہتے کشمیریوں کی جس ہمت کے ساتھ قیادت کی وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

بخشی صاحب کی عظیم قیادت میں ریاستی حکومت نے تعلیمی ترقی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔

—— (ڈاکٹر رگھبیر ممبر پارلیمنٹ)

میرے کشمیر کے دورے کا شاید سب سے نمایاں تاثر یہ ہے کہ بخشی غلام محمد اُن کشمیری بادشاہوں کی طرح ایک معمار کی حیثیت سے اُبھرے ہیں جنہوں نے مختلف تعمیرات کی صورت میں تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد تعمیراتی سرگرمیوں کی وجہ سے وادی کا حُلیہ ہی بدل گیا ہے۔

———— (دُرگا داس چیف ایڈیٹر ہندستان ٹائمز")

بخشی غلام محمد شہریوں کے لباس میں سب سے بڑے سپاہی ہیں۔ فوج صرف اس لئے ہی اُن کو محبت کی نظروں سے نہیں دیکھتی کہ کشمیر کے معرکوں میں وہ بڑی جُرأت سے خندق خندق جاکر گھومتے رہے! بلکہ اس لئے بھی کہ وہ اُس سادہ مگر دل کش شخصیت کے مالک ہیں جس کو سپاہی سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حکومت کے اور بہت سے معاملات میں غیر معمولی مصروفیت کے باوجود یہ ممتاز رہنما اور نئے ہندوستان کا معمار فوجوں کی بہبُودی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے وقت نکال ہی لیتا ہے۔ جہاں کہیں بھی سپاہیوں کے درمیان اُن کا گزر ہوتا ہے وہ اپنی عظیم شخصیت کا پرتو چھوڑتے ہیں اور وہ اُنہیں اپنا مفکر، دوست اور راہبر خیال کرتے ہیں۔

———— (سردار سُرجیت سنگھ مجیٹھا ڈپٹی ڈیفنس منسٹر آف انڈیا)

بخشی صاحب کے عزم، اُن کی توانائی اور عوامی بہبُود سے متعلق اُن کی زبردست دلچسپی کا ریاست کے تمام حلقوں میں اعتراف کیا جاتا ہے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اُن کی حکومت تمام شعبوں میں ترقی اور عوام کو خوشحال بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔ اُن کی حکومت نے اقتصادی سُدھار کے لئے جو اقدامات کئے ہیں اُس سے شہر اور دیہات میں رہنے والے لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔

———— (ہرودے ناتھ کنزرو)
ممبر پارلیمنٹ

جب میں نے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے ہمراہ وادیٔ کشمیر کا دَورہ کیا تو مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ کشمیر کس قدر ترقی کر چکا ہے۔

وزیر اعظم کسی حفاظتی پہرے کے بغیر عوام میں گھومتے رہے اور وہ اُنہیں پھول مالاؤں سے لادتے رہے۔ دہقان عورتیں اُن پر شیرینی کی بارش کرتی رہیں جو ایک بہترین استقبال کی علامت تھا۔ چاروں طرف "وزیر اعظم زندہ باد" کے نعرے گونجتے رہے اور دہقان زادیاں پکارتی رہیں — "ہمارا اَن داتا آگیا ہے"

(نمایندۂ سنڈے ٹائمز، لندن)

یہ بخشی غلام محمد کے عملی تدبر اور اُن کی عظیم شخصیت کا ہی فیض ہے کہ مجوزہ کے جبری طریقے کو ختم کیا گیا! جس کی وجہ سے سال ہا سال سے کشمیری کسانوں کی بُری حالت ہو گئی تھی۔ بخشی صاحب کے دورِ حکومت میں پہلی بار کسان حقیقی معنوں میں اپنی پیداوار کا خود مالک بنا۔ اُن کی دُور اندیشی حکمتِ عملی کی وجہ سے کشمیری کسان میں خود اعتمادی کا وہ جوہر پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کئی ایسے کارنامے انجام پذیر ہوئے ہیں جس سے ہم سب انگشت بدنداں رہ گئے ہیں۔

(پنجاب راؤ دیش مکھ مرکزی وزیر زراعت)

مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کشمیریوں نے واضح طور ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ صادر کیا ہے۔

(ارل ایٹلی)

کشمیر پر شگفتگی چھا رہی ہے۔ کسانوں کو اس قدر اعانت کبھی نہیں حاصل ہوئی ہے۔ تعلیم پر ۱۹۴۷ ۴۸ء سے کئی گُنا زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہر جگہ نئے سکول، نئی سڑکیں، نئے شفاخانے، آبپاشی کے نئے وسائل اور برقی قوت کی نئی لائنیں مشاہدے میں آتی ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کشمیر میں ترقی اُوپر سے مسلط نہیں کی جاتی بلکہ اس کے لئے نچلی صفوں سے باقاعدہ مطالبے ہوتے ہیں۔ جب وزیر اعظم

کسی گاؤں کے دورے پر جاتے ہیں تو انہیں دیہاتی بے تکلف انداز میں بتاتے ہیں کہ انہیں ایک مدرسۂ نسواں، ایک سڑک یا ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ اور جب وہ ایک مرتبہ وعدہ کر لیتے ہیں تو اُس کے ایفا میں دیر نہیں لگتی۔ یہ شگفتگی سیاسی استحکام کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔

("اکانومسٹ" لندن)

بخشی اور شیخ عبداللہ کے مابین وہی فرق ہے جو شوکت و سطوت کے خواب دیکھنے والے ایک بے عمل ( ) خیال پسند اور ایک عملی منتظم، جو کسی قسم کے غلط اندیشوں کا شکار نہیں ہے، کے درمیان ہو سکتا ہے۔ عبداللہ ایک طویل مدت تک ایک فرضی آزاد کشمیر کے فریب سے اپنے دل کو بہلاتا رہا۔ مگر ریاست کی اندرونی ترقی سے ہمیشہ بیگانہ بنا۔ مگر بخشی صاحب کے نزدیک سب سے اہم بات ریاست کا اندرونی استحکام اور ترقی ہے۔ بخشی صاحب بے پناہ ذاتی مقبولیت کے مالک ہیں اور اُن کا سیاسی ریکارڈ محتاج تعارف نہیں۔ کشمیر اور ہندوستان کے ساتھ اُن کی وفاداری مسلّم ہے اور اُن کی قیادت میں ایک ایسے خوش حال اور پُرمسرت کشمیر کا ہیولےٰ اُبھر رہا ہے جس کی نظیر اس کی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔

——————(فریک موریس)

اپنے بخشی صاحب

(صفحہ ۱۲۶ سے آگے)

علم و فن کا۔ دویا اور ہنر کا۔

مجھے بخشی صاحب کی باتوں میں، ان کے ہر قول اور فعل میں، آچار اور ویوہار میں دیش کی مٹی کی بھینی بھینی سُگندھ، میٹھی میٹھی خوشبو ملتی ہے اور اس مٹی کا پیار ملتا ہے۔ اسی لئے میں ان سے پیار کرتا ہوں۔

("تعمیر" کے لئے)

عباس علی وحشت

عہدِ خالدِ کشمیر

کشمیر کے عوام نہ کیوں تجھ پر جان دیں
اِک ربطِ خاص تجھ کو ہے اپنے عوام سے

کشمیر اور خالدِ کشمیر ایک ہیں
لیتے ہیں تیرا نام بڑے احترام سے

یہ عہد عہدِ خالدِ کشمیر بن گیا
خوش حالیوں کا دور ہے یہ تیرے نام سے

صحرا کو تُو نے رشکِ گلستاں بنا دیا
اب کی بہار آئی ہے کس اہتمام سے

اِک سوناؔ واری کیا ہے جدھر بھی نظر اُٹھے
سرمستیاں چھلکتی ہیں ہستی کے جام سے

ہر سال فصلِ گُل میں وہ بوٹا ہرا ہوا
پامال ہو گیا ہے جو تیرے خرام سے

سازبھی، شمشیر بھی!

گاندربل کے گرد و نواح میں بسنے والے دیہاتیوں کے لئے ۱۹۵۹ء کا سیلاب ایک اچانک آفت کی طرح آن جھپٹا۔ سندھ ندی جو ہولے ہولے بڑی روانی کے ساتھ بہتی تھی۔ اچانک پُرغضب ہوگئی اور گاؤں کی ہر چیز سیلاب کے خونی جبڑوں میں آگئی۔ دھان کے لہلہاتے کھیت جھیلوں میں تبدیل ہوگئے۔ کبیر بھوانی سے بیہامہ کی سڑک ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور تناور درخت اُکھڑ کر گر گئے تھے۔ چاروں طرف تباہی اور بربادی کے منحوس بھوت رقص کر رہے تھے۔

اس مایوس کُن صورت حال میں بخشی صاحب گاندربل پہنچے۔ بخشی صاحب سیلاب کے آغاز سے ہی دن رات ایک کرکے ہر خطرے کے مقام کا جائزہ لے رہے تھے اور بندوں کی مرمت، مصیبت زدوں کی امداد اور انسدادی تدابیر کے مختلف اقدامات کی خود نگرانی کر رہے تھے۔ بخشی صاحب کے پہنچتے ہی گاندربل میں ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ لوگ انہیں اپنی اجتماعی اور انفرادی بپتا کا ماجرا سُنانے لگے اور اس بات پر زیادہ تشویش ظاہر کرنے لگے کہ یہ تباہی اور بڑھے گی کیونکہ آسمان کا غیض ابھی تھمنے نہیں پاتا۔ جموں اور کشمیر کا وزیر اعظم جیسے مردِ آہن کے لقب سے پکارا





جاتا ہے۔ یہ حال سن کر متاثر ہوا اور انہیں اس بات کی فکر دامنگیر ہوئی کہ اس ناممکن صورت حال کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ اُن کے تھکن سے بھرپور بُشرے پر تفکّر کی کیفیات طاری تھیں۔ مگر اب وہاں ایک بشاش رنگ بھی چھا گیا۔ ایسے معلوم ہوا کہ اُن کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک جواب اُبھر رہا ہے۔ اچانک اُن کی طبیعت کے توی عنصر نے انگڑائی لی اور انہوں نے گاؤں والوں کو پُرعزم رہنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے گاؤں والوں کے دل ٹٹولتے ہوئے اُن سے بات چیت شروع کی

"یقین اور ہمّت سے کام لیجئے۔ سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تباہی کا ایک نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہم دریا کو اپنا پُرانا راستہ اپنانے پر مجبور کریں گے۔ ہم بندھوں کی تعمیر کریں گے اور راستوں کو بحال کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی شخص کو بھوکا یا بیمار نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اور گارے سے بنے ہوئے مکانوں کی تباہی کا افسوس کرنا بے حاصل ہے۔ کیونکہ ہم آپ کے اور آپ کے بال بچوں کی رہائش کے لئے ہوادار اور روشن مکانات تعمیر کریں گے۔ یہ سب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ ہمّت اور ایکتا سے کام لیں۔"

وزیراعظم پُراعتماد لہجے میں بول رہے تھے اور مایوس فضا میں اُمید کی قوس قزح لہرا اٹھی۔

اتنے میں ایک مُعمّر دہقان آگے بڑھا۔ اپنے بازو آسمان کی جانب بلند کر کے اُس نے بڑے جذباتی لہجے میں اُن سے خطاب کیا:-

"سیلاب نے ہماری تمام چیزوں کو نگل لیا ہے مگر اُس کا غم نہیں کیوں کہ خوشحالی کی منزل تک پہنچانے کے لئے آپ کا سایہ موجود ہے۔ ہم آپ کی رہنمائی میں ہر کوئی

کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

اِس آواز کی بازگشت میں عوام کا نعرہ گونجا جس سے فضا سرشار ہوگئی۔ یہ آواز دلوں سے دُعا بن کے نکلی تھی۔ "ہمارا رہنما مدّت دراز تک زندہ رہے۔"

ماہ جولائی کی اکیس تاریخ کو یہی دُعا ہر ریاستی باشندے کی زبان پر ہوگی۔ کیونکہ یہ اُن کی سالگرہ کا مُبارک دن ہے۔ سیلاب ہو یا قحط، آگ ہو یا کوئی اور آفت۔ عوام نے اُن کی صورت میں ہمیشہ ایک رفیق رہنما اور غمگسار کا مشاہدہ کیا ہے۔ بحران اور مصائب کے وقت اُن کے آہنی ارادے نے عوام کی اُمنگوں کو شاداب کر کے اُنہیں پھر سے آمادہ عمل کیا ہے۔ بزدل اُس کے پرتو سے شیر دل بن جاتے ہیں۔ انتشار اُس کے سایے سے تنظیم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر مصیبت کو اُس کا باتدبّر ذہن ترقی کی نئی تحریک بناتا ہے۔ مشکل اوقات میں بخشی غلام محمد کی ہمّت اور قوت شدّت سے اُبھر آتے ہیں۔ اور وہ رکاوٹوں کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں مستقبل کی تصویر اُجاگر رہتی ہے۔ سیلاب کی طغیانیوں میں وہ اُس تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں جو پانی اُترتے ہی انہیں اور اُن کے عوام کو شروع کرنا ہوگا۔ ایک سچّے اُمید پرست کی طرح وہ بادلوں کی غضبناکی میں اُن کے چھٹ جانے کا سماں دیکھتے ہیں۔ اور وقت گواہ ہے کہ اس آہنی عزم کے آگے مشکلات نے ہتھیار ڈال دئیے ہیں۔ اُن کے نکتہ چیں بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ایک صاحب نظر الوالعزم رہنما کی حیثیت میں ملک بھر میں اُن کے پایہ کے لوگ بہت کم ہیں اور ریاست میں تو کوئی بھی نہیں۔ شیخ عبداللہ کے ایک رفیق کا کہنا ہے۔ کہ ریاست کی سلامتی اور انتشار کے درمیان جو چٹان کھڑی ہے۔ اُس کا نام بخشی غلام محمد ہے۔

شہرپوش

۱ وقتکہِ زین العبدینہ، پوشن مالہِ کرآیو
غزلکہ شوٗبہ وِنہِ عنوانہ سنزہ تٔے لول بیرآیو

۲ عدلکہِ میرہ، علمکہِ یارہ، امنکہِ نوٗرہ زوتن چھکہ
ادبکہ لوہ ہتے گلزارہ، پوشے نوٗرہو بیر زٔیو

۳ عملکہِ شوٗبہ وِنہِ معمارہ، کر تعمیر وطن میٖون
وطنکہ الفتکہِ فوارہ، ناگن ساہہ گرآیو

۴ خوشبوہِ، شوٗبہ وِنہِ ہمپوشہ پھولہِم دوٗرہ ڈلس منز
سحرن لول پیہ رو بہ زٔونہِ ژندرک نوٗر جرآیو

۵ گگر گنڈٕ، وقتکے رفتارہ پادن پس ترِنچھے بیٛہہ
ازلن پیدہ کوٗرمت نوٗر، نوٗرہ گوٗرہ کرآیو

۶ ننہ چھا لعل کانہہ، چمکان گاہ ترٛاوان ونن منز
نوٗرس چھایہ گے دِرحانہ ازلس کیاہ بہٕ کرآیو

جناب بخشی غلام محمد

تاریخی پیغام

۹ اگست ۱۹۵۳ء کے تاریخی دن وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد خالد کشمیر نے قوم کے نام جو حیات افروز پیغام نشر کیا اُس کے بعض اقتباسات پیش خدمت ہیں :

آج کا دن کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جو فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں وہ ہماری قوم کی تاریخ اور مستقبل پر اثر انداز ہوگا۔ آپ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ گذشتہ چند ماہ سے ہماری ریاست ایک شدید سیاسی اور اقتصادی بحران کا شکار بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے ریاست کی وحدت اور یہاں کے عوام کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس قومی خطرے کو دُور کرنے کی اہم ضرورت کے پیش نظر میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے فرض کو محسوس کر کے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا ہے۔ یہ امر تکلیف دِہ ضرور ہے کہ ہم آج اپنے بعض پُرانے ساتھیوں سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں جن کے دوش بدوش ہم گذشتہ زمانے میں اپنے ملک کی آزادی اور وقار کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لیکن ایسے تاریخی مواقع پر، جب کہ کروڑوں آدمیوں کی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا سوال درپیش ہو، ذاتی تعلقات اور دوستی کو ملک اور قوم کے وسیع مفاد پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ اپنی آزادی کو مشترکہ جدوجہد کے دوران میں جس چیز نے ہمیں اور ہمارے آج کے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو متحد رکھا وہ ہمارے نصب العین اور اصولوں کا اشتراک تھا۔ یہی اصول کشمیر کی جمہوری تحریک کا سنگِ بُنیاد تھے۔ لیکن کچھ عرصے سے ہم انتہائی کرب اور بےچینی کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے پُرانے ساتھیوں نے ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور حکومت اور نیشنل کانفرنس کی تنظیم کے دائرہ عمل میں تمام جمہوری طریقوں کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔

مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ بہت سے احباب موجودہ واقعات کی رفتار سے پریشان

ہو جائیں گے اور ہماری اور ہمارے پرانے ساتھیوں کی جدائی ان کے لئے اتنی ہی تکلیف دہ ثابت ہوگی جتنی ہمارے لئے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ بہت جلد یہ محسوس کرلیں گے کہ ہماری پچھلی جد وجہد کے مشکل دور میں ہمارا اتحاد اس مشترکہ مقصد کی بنیاد پر تھا جو عوام کی تقدیر سنوارنے کا ضامن تھا۔ لیکن حالیہ واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہمارے ملک کے مفاد اور جمہوری تحریک کے مفاد کے ساتھ غدا کرنے کا ساماں کیا جا رہا تھا، جس کے نتائج بڑے عبرت ناک ہوتے۔ لیکن ہم میں سے کوئی شخص اتنا بے حس نہیں ہوسکتا تھا کہ ان واقعات کا اعادہ ہوتے دیکھتا۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے نیم برِاعظم میں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں اُجاڑ دیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر ہم اس وقت خاموش اور بے عمل رہے تو ہماری ریاست کا چپہ چپہ بدامنی اور ہرج کا شکار ہوجائے گا۔ اس لئے کافی غور و خوض کے بعد ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اپنے ملک اور قوم کو اس نازک اور تباہ کن صورت حال سے بچانے کے لئے اپنے ذاتی تعلقات اور دوستی کو اہمیت نہ دیں گے۔

بعض حالیہ واقعات نے انتشار انگیز عناصر کو یہ موقع دیا کہ وہ ہماری ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سفارش کرنے لگے۔ ہمارے بعض بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے قول و فعل سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ ہماری ریاست کے ایک حصے کو الگ کرکے ایک آزاد ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اپنی ان کوششوں میں بعض مفاد پرست بیرونی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل تھی اور یہ وہی بیرونی طاقتیں ہیں جو ہماری ریاست کے حقِ آزادی اور حقِ خود اختیاری کے استعمال میں روڑے اٹکاتے رہے ہیں۔

اگر ان انتشار انگیز عناصر اور ان کی پشت پناہی کرنے والی بیرونی طاقتوں کی سازشوں کا بر وقت تدارک نہ کیا گیا تو موجودہ صورت حالات جموں اور کشمیر کے عوام کے مستقبل کے لئے خطرناک بن جائے گی۔ ہماری ریاست کی جمہوری تحریک اس مقصد کے لئے مسلسل جد وجہد کرتی رہی ہے کہ انڈین یونین کے اندر ہماری ریاست کو ایک باوقار حیثیت حاصل ہو۔ لیکن اس وقت بعض حلقوں میں جو کوششیں جاری

ہیں اُن سے ایسے حالات پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے جن سے یہ عظیم مقصد فوت ہوجائے گا۔ بعض ایسے عناصر کام کر رہے ہیں جو یہاں ریاست کو ہندوستان یا پاکستان میں مکمل طور سے مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس سے پیدا ہونے والی انتشادی کیفیت میں بعض موقع پرست عوام کو ایک آزاد ریاست، ایک آزاد کشمیر کا سبز باغ دکھا رہے ہیں۔

"یہ صاف ظاہر ہے کہ ریاست کے اتحاد اور سالمیت کے پیش نظر ان طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ ریاست کے عوام کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر ریاست کو پاکستان میں مدغم کر دینے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ کشمیر کی کوئی اپنی حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی اور آزاد ریاست کے تصوّر کے ساتھ سیاسی اور معاشی غلامی کا اندیشہ ہے اور اس بات کا خطرہ ہے کہ ہم بیرونی طاقتوں کی خیرات اور اُن کے رحم و کرم کے محتاج ہوں گے۔

آزاد ریاست کا نعرہ انتہائی گمراہ کُن اور خطرناک ہے اور اگر ایشیا کے موجودہ حالات اور بین الاقوامی صورت حالات کے پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو اس قسم کا نعرہ دینے والوں کی نیّت کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی ممکن نہیں۔

ایسے آزاد کشمیر کے معنی کیا ہیں جو کسی سامراجی طاقت کے زیر اثر ہو۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی آزادی اور خودمختاری کے لئے شدید خطرے کا باعث ہوگا۔ ریاست کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ایسی آزادی ہمیں شدید اُلجھن اور بین الاقوامی کشاکش میں مُبتلا کر دے گی اور اس کا اندیشہ ہے کہ مختلف بیرونی طاقتوں کی مسلح کشمکش کشمیر کو دوسرے کوریا میں تبدیل کر دے!

جمہوری روایات

ہماری قومی تحریک کی غیر مذہبی اور جمہوری روایات کا ہندوستان کی قومی تحریک کے ساتھ مضبوط اور ناقابل شکست رشتہ ہے۔ ہم ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں ... ین دوست ہیں۔ ہندوستان کی رجعت پسند اور فرقہ وارانہ طاقتیں انہی سامراجی عناصر کی آکسا ... ں جنہوں نے ہماری ریاست کے

بعض حلقوں کو آزاد کشمیر کے فریب میں مبتلا کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب وہ مقابلتاً زیادہ طاقتور تھے، کشمیر کی نیشنل کانفرنس اور اس کے رہنماؤں نے اپنے غیر فرقہ وارانہ اقدام کی شاندار مثال سے ان شیطانی طاقتوں کی کمر توڑ دی تھی۔ ہم یہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے زمانے میں جموں کے عوام نے نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کا شاندار استقبال کیا تھا اور اپنے یہاں کے فرقہ پرست عناصر کی بدعنوانیوں پر نادم تھے۔ دُنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ رجعت پرستی کو مزید رجعت پرستی کے ذریعہ سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہ لوگ جو ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر سے ڈرا کر کشمیر کے اندر فرقہ پرستی کے جذبہ کو اُبھارنا چاہتے ہیں، بدترین گناہوں کے مجرم ہیں اور کشمیر کے عوام ہندوستان کے مسلمانوں، ہندوستان کے جمہوریت پرستوں اور پاکستان کے ترقی پسند عناصر کے دُشمن ہیں۔ فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی نہیں بلکہ اس کی مخالفت ہے۔ آج کے حالات میں ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر کے خلاف کشمیر سب سے بڑا حربہ بن سکتا ہے۔ لیکن صرف اس صورت میں، جب کہ کشمیر اپنی غیر فرقہ پرست جمہوری روایات پر قائم ہے۔

بحران کی وجہ

اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ موجودہ بحران کی اصل وجہ ریاست کے عوام کی شدید معاشی بے اطمینانی ہے۔ اس لئے ہندوستان سے کشمیر کے تعلقات منقطع کر کے یا پاکستان سے الحاق کر کے اس بحران کو دُور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کا علاج کسی بیرونی طاقت سے ساز و باز کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ عوام اور قوموں کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا کام کافی مشکل ہے اور اس کے لئے کوئی آسان راستہ تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ پانچ سال میں ہماری ریاست کی معیشت کو سنبھالنے کے سلسلے میں بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے کاروبار اور بہت سے پیشوں کو شدید نقصان پہنچا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر روزگار

کے ذرائع محدود ہو گئے ہیں، بے روزگاری پھیلی ہے اور عوام کا معیار زندگی بہت نیچا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم ونسق میں اہلیت، قابلیت اور ایمان داری کا معیار بھی گر گیا ہے۔ اس کی وجہ سے حکومت پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ گیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ حکومت میں ان کے بنیادی معاشی مسائل حل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس لئے ریاست کی معاشی تعمیر نو کی طرف فوراً توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس لئے ہم ریاست کے تمام وطن پرست اور امن دوست عوام کو اس اہم کام کی تکمیل کے واسطے متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اس طرح موجودہ بحران کو ختم کیا جائے۔ ہماری ریاست کی پوری تاریخ میں اس سے پہلے کوئی ایسا موقع نہیں آیا ہے جب مختلف حلقوں اور گروہوں کے اتحاد کی اتنی شدید ضرورت رہی ہو، جتنی آج پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ آج ہمارے لئے تباہی اور بربادی اور غلامی کے نئے سامان کئے جا رہے ہیں۔

اہلِ وطن سے اپیل

آخر میں، میں اپنے تمام اہل وطن سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ متحد ہو کر ہمت اور اعتماد کے ساتھ تمام موجودہ اور آنے والے خطرات کا مقابلہ کریں۔ اس وقت ہماری آزادی خطرے میں ہے اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہم اس کی حفاظت کے لئے بیدار اور کمربستہ ہیں۔ ہم نے "نیا کشمیر" کے پروگرام کو، جو برسوں سے ہمارے خوابوں میں بسا ہوا ہے، عملی جامہ پہنانے کا عہد کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم کام میں کشمیر کے تمام مرد اور عورتیں، بوڑھے اور بچے عملی حصہ لیں گے۔ ہمارے ہمدردوں اور ہمی خواہوں میں نہ صرف ہندوستان کے عوام ہیں بلکہ پاکستان کے ترقی پسند اور جمہوری عناصر بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ساری ترقی پسند اور امن دوست انسانیت ہمارے ساتھ ہے اور ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم نہ تو کسی بیرونی طاقت کو اپنے ملک کے لئے خطرے کا باعث بننے دیں گے اور نہ اپنی سرزمین کو اپنے ہمسایہ اور دوسرے ملکوں کے لئے خطروں اور سازشوں کا اڈہ بننے دیں گے۔ ہم اپنے لئے بھی امن چاہتے ہیں تاکہ ہم اپنی پس ماندہ قوم کی قسمت کو سنوار سکیں اور دوسروں کے لئے بھی امن چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان

اور دُنیا کے عوام کی محبت اور دوستی کے سایہ میں اور اپنے بازوؤں کی قوت سے ہم اپنے مقاصد کو حاصل کریں گے۔ ہمارے عوام اس نئی حکومت کے ساتھ ہیں اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کسی موقع پر اپنے عوام کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے! ——————

اعتذار

"تعمیر" جون ۱۹۶۰ء کے شمارے میں جناب اختر انصاری کے مضمون "اُردو ادب اور انارکلی" کا مندرجہ ذیل بقیہ حصہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ کتابت کی اس سنگین غلطی کے لئے ہم فاضل مقالہ نگار اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں —————— مدیر

... جو بیک وقت دار المطالعے کا لُطف اور اسٹیج کی زینت ہوتے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پڑھے بھی جاسکتے ہیں اور کھیلے بھی جاسکتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے "انارکلی" ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک ادبی شاہکار ہے اور اُردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نمایاں اور اہم سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ دراصل اُردو ڈرامے کی تاریخ جس جادۂ ارتقا سے عبارت ہے اُس کے ایک سرے پر امانت کی اندرسبھا ہے اور دوسرے سرے پر "انارکلی"۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک اُردو ڈرامے کے ارتقائی سفر کی معراج "انارکلی" ہے۔ یقیناً اس کا شمار اُردو نثر کے اُن چند برگزیدہ کارناموں میں ہوگا جو بیسویں صدی کے ادب میں مینارۂ روشنی کی طرح جگمگاتے ہیں۔ خیالستان، گئو دان، لیلیٰ کے خطوط اور غبارِ خاطر جیسی گراں مایہ تخلیقات کی صف میں اس کی جگہ بالکل محفوظ ہے۔

کشن سمیل پوری

اے خالدِ کشمیر

اے جنّت ارضی کے خبردار، خبرگیر — اے خالدِ کشمیر
تہذیب کی، اخلاق کی، اخلاص کی تصویر اے خالدِ کشمیر
لاریب ہے تو ایک حسیں خواب کی تعبیر اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

ہنس ہنس کے تجھے شیخ و صنم دیکھ رہے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں
اِک ساتھ کھڑے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں
پھر جموں و کشمیر ہیں آپس میں بغل گیر، اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

دُھومیں ہیں زمانے میں ترے قلبِ صفا کی اور عہدِ وفا کی!
بے باکی و حق گوئی و عدل بے ہمتا کی اِک ایک ادا کی
اے محسنِ اعظم مرے، اے عزم کی تصویر، اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

محسن مرے! تجھ کو نیا ساون[1] ہو مبارک گلشن ہو مبارک
غنچوں کی پھبن، پھولوں کا جوبن ہو مبارک دامن ہو مبارک
سو بار مبارک تجھے یہ عزت و توقیر، اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

[1] خالدِ کشمیر کی سالگرہ ساون میں پڑتی ہے

شمس الدین کاؔفوؔر

خراجِ عقیدت

ہندی تہٕ مُسلم پٕژہ بران تس چُھس بکانی ہمرکاب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
نیک مرد اچھُوی بہادُر زوتہ وُن زن آفتاب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
ذرا اگہ دِیو یمہٕ مُلکہٕ منزہ دُور کوٗرکن لوٗر ہیتھ — چھی دُعا گو لُوکھ اُمندی روز وشب کیاہ مینتہ تہ پیتھ
یا الاہ العالمین ہر وقت رُوزِتن کامیاب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
خانقاہن مندرن تہ مسجدن کیاہ جوٗر نہٕ سون — نیہٕ نیہٕ چھی تم کرانی پرٛیزہ لاوِن ہیرِہ بون
یی وچھتھ چھی عالمکو لُوکھ یِتھ سینہٕ متہٕ بیتاب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
اُننہٕ بجلی شہر وگامن کوٗر نہٕ روشن مُلک سون — کیاہ ضرورت چھم میہٕ وننک چھُوی زیہٕ وچھت حال پرٛون
سڑکہٕ ہند زاں تہٕ دُون مال خرچُن بے حساب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
مُجرِزہ تہٕ سرپُکس یوٗ سہ اُس شہمت کرُنہٕ دُور — گرسی ساری خوش سینہٕ کیاہ تم چھ ساری مسرور
ظُلُم سوٗرُوی غاب سپُن ظالمن گے زن کباب — خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب
دُورہ رُوزِتھ کاؔفوؔر چھس شرٛہ پانے پیٹھ فدا — یا الٰہی شاہ آباد تھاوتن چھُم یی مُدعا
سوز دِلچی تارہ وزانی چھم پچھان رباب
خالدِ کشمیر سون زن تارکن منز مہتاب

فاضل کاشمیری

سنہٕ ۱۹۵۳ ہِچ اکھ جھلک

(بخشی صابنہِ قلمدان وزارت سنبھالنہٕ پتہٕ)

آگنس منز زنگرس ہکھ دِتھ وٕنان اوس دانہٕ وول
یتھ تولس چھیم کاتھ وٕورتے یتھ تولس چھیم لار بیول
دانہٕ ارِل منزوگ نرخ تے چھے تِنی کتھ میون قول
ساڑہ نو چھیم گامہ پیومت، ساڑہ داہ دِم رٹھ سأ تول
رٹھ سأ تول گوڈہ لأر بیول

بوزمکھ پوزگژ برمژ چھیم شاداہ ترٕچ پُرہ کھار
منزوگ کنو دوہ ذٕ، منزوگ کنو، منزوگ کنو دوہ ذٕ
دراگہ دیوس بخشین گر لارہ لار

جولائی ۱۹۶۰ء

حدیث دیگراں

۱۳ر جون ۱۹۶۰ء - مکرمی تسلیم

"تعمیر" کا مارچ و اپریل کا مشترکہ شمارہ نظر سے گذرا۔ آپ نے "تعمیر" کو خاصا معیاری رسالہ بنا دیا ہے۔ اور مواد کی فراہمی میں اپنی پوری صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً کشمیری ادب پر مضامین کا انتخاب بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ کشمیری ادب کے علاوہ اُردو کے مضامین اور شعری ادب کے شہ پارے بھی اس میں شائع ہوتے رہیں تاکہ رسالہ مذکور کشمیر کے علاوہ ہندوستان و پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچتا رہے اور پڑھنے والے دلچسپی سے اس کا مطالعہ کرنے لگیں۔ زیر نظر شمارے میں جناب بخشی غلام محمد کا ریڈیائی مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد — چند یادیں" بہت پسند آیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس مشترکہ شمارے میں مولانا آزاد پر دو تین مضامین اور شائع کر دئے جاتے۔ اُمید ہے کہ "تعمیر" اُردو ادب کی توسیع و اشاعت میں پیش پیش رہے گا۔ "تعمیر" مجھے نہیں ملتا۔

نیازمند: ایم حبیب خان مہتمم کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند
علی گڑھ

۴ر جون ۱۹۶۰ء - محترم یوسف صاحب تسلیم

"تعمیر" کا گیٹ اپ بڑا شاندار ہے۔ بخشی صاحب کا مختصر مقالہ اور شمیم صاحب کا طویل مقالہ خصوصی طور پر پسند آیا۔ شمیم صاحب نے تو لاجواب جواب دیا ہے۔ بمبئی میں تو کشمیری جانتا نہیں، لیکن اختر صاحب کے افسا

یہ Comments پڑھنے کے بعد میں نے افسانے کے بارے میں اچھی رائے قائم کی ہے۔ اگر اندازِ بیان اچھا ہوگا تو افسانہ کا Theme ہی بتاتا ہے کہ افسانہ اچھا ہوگا۔ ویسے چونکہ جس زبان میں افسانہ لکھا گیا ہے وہ میں نہیں جانتا، اس لئے قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے! جواب کا منتظر: احمد اسحٰق نعمانی پہاڑپور (اعظم گڈھ)

کٹڑاہ باگھ سنگھ امرتسر۔ مکرمی و معظمی جناب تسلیم نیاز۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج اچھا ہوگا۔ ماہنامہ "تعمیر" کا مارچ اپریل ۱۹۶۰ء کا شمارہ ملا جو صوری و معنوی لحاظ سے ایک معیاری پرچہ ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو قابل ہاتھوں نے ترتیب دیا ہے اور میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ "تعمیر" اپنی انفرادیت اور لب و لہجہ کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے اور ملک کے سامنے قابل قدر اور بیش قیمت ادبی سرمایہ پیش کر رہا ہے۔

یہ فخر سرزمینِ کشمیر ہی کو حاصل ہے کہ جس طرح وہ اپنے پُرکشش مناظر کی وجہ سے حسین و جمیل ہے، مبالغہ نہ سمجھئے حقیقت ہے کہ "تعمیر" بھی اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور تنوع کے اعتبار سے جاذبِ دل ہے۔

نیازمند:۔ پورن سنگھ ہنر

جگراؤں۔ یکم جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

برادرم یوسف صاحب۔ "تعمیر" کا جون کا شمارہ بھی مل گیا ہے۔ شکریہ۔ زیرِ نظر شمارہ میں اختر انصاری صاحب نے انارکلی کے ڈرامائی محاسن پر نہایت عالمانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ ٹھوس ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخی اور ثقافتی موضوعات پر بھی آپ "تعمیر" میں لکھوا رہے ہیں۔ یہ امر بڑی حد تک قابل قدر ہے۔ اسی شمارہ میں سید لطف اللہ صاحب کا مضمون مدفین کی اساطیر کافی معلوماتی ہے۔ جس سے معاشرہ کے قدیم روایات اور رسوم سے قارئین کو واقفیت ملتی

ہے۔ تاریخی موضوعات کا یہ سلسلہ جاری رکھیئے۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

مخلص :۔ شاکر پشاوری یکم جولائی ۱۹۶۰ء

سید واڑہ (بہرائچ) اُتر پردیش۔ یکم جون ۱۹۶۰ء

یوسف بھیا۔ خوشبوئے خلوص۔ تیز دھوپ، تپش اور لُو کے جھلسے لمحوں میں اچانک آپ کا تحفۂ کشمیر "تعمیر" اپنے جلو میں وہاں کی تمام رعنائیاں لئے اس طرح نمودار ہوا جیسے شالامار یا ڈل کا تصور۔ جس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ ہم جیسے غریبوں کو بھی چند لمحوں کے لئے ڈل اور شالامار کی لازوال بہاروں سے ہمکنار ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ شمارہ بابت مارچ اپریل ۱۹۶۰ء پیشِ نظر ہے۔ ٹائیٹل نہایت شاندار ہے۔ حصۂ نظم میں شاذ تمکنت کی نظم "شبِ رفتہ" اور شہاب جعفری کی غزل پسند آئی۔ نریش کمار شاد کا مضمون یگانہ چنگیزی پر مکمل تو نہیں پھر بھی اہم ضرور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یگانہ چنگیزی پر جس قدر شرمناک مظالم لکھنؤ کے ادبی حلقوں کی طرف سے ہوئے ہیں اتنے شاید ہی کسی اُردو شاعر کے ہمراہ ہوئے ہوں۔ آپ یقین جانیے کہ جب اس باکمال فنکار کا انتقال ہوا تو لکھنؤ جیسے گہوارۂ علم و فن میں اُس لازوال شاعر کی لاش کو گھر سے قبرستان تک لے جانے والوں کی تعداد دس یا بارہ انسانوں سے زیادہ نہ تھی جب کہ اس تعداد میں یگانہ کے عزیز بھی شامل تھے۔

شمیم صاحب کا مقالہ کشمیری ادب میں رومانوی رجحانات بہت ہی تحقیقی اور مدلّل ہے۔ کہانیوں کے سلسلے میں اس بار آپ نے بہت بخل سے کام لیا ہے۔ خیر آئندہ سہی!

خیر اندیش۔ آپ کا اپنا : ساغر مہدی

محترم زاد عنایتہٗ۔ تسلیم۔ کافی دن ہوئے "تعمیر" کا ایک شمارہ (مارچ اپریل) ملا۔ آپ کی اس عنایت کا شکریہ۔ "تعمیر" کو ہند و پاک کے بہترین اُردو رسائل کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ آپ جس محنت سے اسے ترتیب دیتے ہیں وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

مخلص :۔ روحی دہلوی معرفت پوسٹ بکس ۱۵۰۳ دہلی ۶

مسلم لائبریری۔ ۳۰ [illegible] الہ آباد

محترم یوسف صاحب السلام علیکم۔ مارچ اپریل کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق دیکھتے ہی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا آزاد مرحوم کی اتنی شاندار تصویر شاید ہی کسی ماہ نامہ کے سرورق پر شائع ہوئی ہو۔ رسالہ ہر اعتبار سے اپنی خصوصیت پر مبنی ہے۔ میری لائبریری کے قریب قریب تمام ممبران وقارئین نے اس کو نہ صرف پسند کیا بلکہ مجھ کو مجبور کیا کہ میں آپ کو اس کامیابی پر مبارک باد دوں۔ بہرحال اب آپ کے "تعمیر" کی تعریف چاند کو روشنی دکھانے کے مانند ہے۔ مجھے آپ کا رسالہ ذاتی طور پر بہت پسند آیا۔ مضامین، کتابت و معیار کے اعتبار سے آپ کا ہر قدم پہلے قدم سے محتاط اور جچا تُلا ہے: [illegible]۔ شمیم صاحب نے جو بنیاد رکھی تھی اس پر آپ عظیم عمارت تعمیر کر رہے ہیں جس کے لئے آپ اور آپ کے شریک کار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نیازمند: خالد انعام لائبریرین ۲ رجون ۱۹۶۰ء

کان پور ۶ رجولائی ۱۹۶۰ء۔ محبی تسلیم

جون ۱۹۶۰ء کا "تعمیر" نظر نواز ہوا۔ اس سے قبل کہ میں پوسٹ مین صاحب کے ہاتھ سے لیتے ہی اوراق الٹنے شروع کر دوں نگاہیں ٹائٹل ہی پر ٹھہر گئیں۔ دیر تک مشاہدہ کرنے کے بعد عالم محویت کا مجسمہ بنا ہی تھا کہ ٹائٹل کے مختلف رنگوں نے کشمیر کی بہشتی فضاؤں سے میرے تصور کو روشناس کرانا شروع کر دیا اور میں احساس کے گہرے دریا میں ڈوب کر ابھرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ "تعمیر" کی فہرست میں بالترتیب دنیائے ادب کے تابناک ستارے اپنی جانب متوجہ کر رہے ہیں۔ مثلاً ارشد صدیقی، فضا ابن فیضی، اختر انصاری جن کے احساس وخیال کے سلسلے میں اردو ادب فروغ پا رہا ہے۔ ایسے پُرفضا ماحول کو دیکھ کر میرے ذوق نے جناب کی جانب اشارہ کیا اور بے ساختہ میری زبان سے یہ الفاظ وضع ہو گئے کہ واقعی جناب یوسف "تعمیر" میں شامل ہونے والے تابناک ادبی ستاروں کے ادا شناس ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں ہیں جب کہ "تعمیر" ہندوستان کے تمام اچھے ادیب وشاعر کو ایک مرکز پر لا کر ماہ بماہ اپنی انفرادیت کا پرچم کامیابی کی فضا میں لہراتا رہے گا۔

مخلص: مدل جائسی ۱۰۲/۹۵ کرنیل گنج کان پور
جولائی ۱۹۶۰ء

عمظہکشمیری غزل کو رسول میر کی تربت پر

وہ گوهر نایاب هیں اِس خاکِ میں جن سے
کم پایہ و ناچیز هے کسریٰ کا خزینہ









خالد کشمیر کی سالگرہ پر مدیر تعمیر محمد یوسف ٹینگ وزیراعظم کی خدمت میں تعمیر کا خاص نمبر پیش کر رہے ہیں ۔ تعمیر کے جنرل ایڈیٹر شری جانکی ناتھ زتشی بائیں جانب کھڑے ہیں ۔



وزیر اعظم تعمیر کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔

ماہنامہ

تعمیر

سری نگر

جلد ۵ | نمبر ۲۶

جنرل ایڈیٹر
جے، این زتشی
ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے | سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
محمد یوسف ٹینگ ایڈیٹر ماہنامہ "تعمیر" سرینگر

سرورق
وصال
فوٹو:- پیارے ناتھ

پیرزادہ محمد سعید پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گورنمنٹ پریس میں چھپا اور لالہ رُخ پبلیکیشنز نے شائع کیا

ترتیب

زاوئیے

قانون سازیہ کے حالیہ اجلاس کی اہم ترین بات تیسرے پانچ سالہ پلان کے مسودے کا پیش کیا جانا تھا۔ جیسا کہ وزیر اعظم نے اپنی مدلل اور پُر از حقائق جوابی تقریر میں فرمایا یہ مسودہ اس لحاظ سے ابھی حتمی نہیں ہے کیونکہ اسے مرکزی پلاننگ کمیشن کے سامنے پیش کیا جانا ہے جہاں اسے مرکز کے ذرائع اور باقی امور کے پیش نظر آخری منظوری عطا کی جائے گی۔ مسودہ کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسے مرتب کرتے وقت حکومت نے کس قدر کارگذاری اور عوامی مسائل سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مسودہ ہماری بڑھتی ہوئی اقتصادی قدوقامت کی ایک نمایاں تفسیر ہے اور اس کے ساتھ ہی نئی منزلوں کو حاصل کرنے کی تمنا کا اظہار۔ ایک ارب ۹۱ کروڑ روپیہ کے اس عظیم منصوبے میں زیادہ تر زور صنعتوں کے استحکام، ان کے لوازمات مثلاً کان کنی، برقی قوت کی پیداوار اور ذرائع آمد و رفت کی مزید ترقی پر دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری کثیر آبادی زراعت پیشہ ہے اور زراعت کی ترقی بجائے خود بڑی اہم ہے۔ مگر ہماری بہت سی مصیبتوں کا علاج صنعتوں کے قیام کے سوا ممکن نہیں ہو سکتا، جو ملک کی ہمہ گیر ترقی کے نقشے میں ہماری ہم آہنگ رفتار کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ بعض دوستوں کو پہلی نظر میں یہ پلان ضرور (Ambitious) معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر جب اس کے مقاصد اور اس کے نشانوں پر نظر ڈالی جائے تو اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر ہماری ریاست کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھتے رہنا ہے تو اسے مشقت اور جدوجہد کا یہ مرحلہ طے کرنا ہی پڑے گا — دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے آخر تک بجلی کے سلسلے میں ہماری پیداوار کوئی پچیس ہزار کلوواٹ ہوگی، مگر تیسرے پانچ سالہ پلان کے لئے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کلوواٹ بجلی کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ذرائع آمد و رفت، کان کنی، آبپاشی، صنعتوں، سوشل سروسز اور باقی میدانوں میں وہ نشانات مقرر کئے گئے ہیں جو ہر لحاظ سے ہماری ترقی کا لازمہ ہیں۔

خزاں کی آمد کے ساتھ ساتھ وادی میں ثقافتی سرگرمیوں پر بہار آ رہی ہے۔ گرمیوں کی شدت کم ہو جانے کے بعد خزاں میں وادی کا موسم کچھ اس قدر خوشگوار ہو جاتا ہے کہ اسے بجا طور ایک بقعۂ رنگ و نور بنا دیتا ہے اور اس رنگین فضا میں ثقافتی سرگرمیوں کے سوتے پھر ابلتے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے جشن بہار کے بعد اس سال ۱۰ ستمبر سے جشن خزاں منایا جا رہا ہے جس میں کئی رنگا رنگ تقاریب منائی جائیں گی۔ خود وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے یوم رسول میر اور یوم پر مانند منانے کا اعلان کیا ہے۔ امید ہے کہ جس طرح سنہ ۱۹۵۶ء کے جشن نے ریاست میں تمدنی سرگرمیوں کے احیائے نو میں ایک اہم حصہ ادا کیا تھا، آج کا جشن بھی اپنی افادیت اور دلچسپی کے اعتبار سے یادگار رہے گا۔

سرینگر میں کھیلوں سے دلچسپی لینے والے لوگوں کی کمی نہیں۔ لوگوں کے اسی شوق و ذوق کو نظر میں رکھ کر یہاں ایک سٹیڈیم بھی تعمیر ہو چکا ہے، جو اپنی بناوٹ کے اعتبار سے شمالی ہندوستان کا ایک بہترین سٹیڈیم ہے۔ اس میں ستمبر کے مہینے سے کھیلوں کا ایک ہنگامہ خیز پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ رانجی ٹرافی کے پرچم تلے کل ہند پیمانے پر اس سٹیڈیم میں کئی کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔

عالم صدیقی امروہوی

وادیٔ کشمیر

اے وادیٔ کشمیر
مجموعۂ صد حسن ہے اک عشق کی تصویر
ہر نور سے معمور ہے یہ زلف گرہ گیر
نیرنگیٔ فطرت کی نظر آتی ہے تفسیر
اے وادیٔ کشمیر

وہ پھیلے ہوئے دور تلک سلسلے ڈل کے
ہیں کیف میں ڈوبے ہوئے راتوں کے دھندلکے
راتوں کی سیاہی میں بھی ہے صبح کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

آنکھوں میں اتر جاتی ہے فردوس کی رانی
شاعر کے ترنم میں ہے منظوم کہانی
دیکھا ہوا ہر خواب ہے شرمندۂ تعبیر
اے وادیٔ کشمیر

خاموش فضاؤں میں بھی اک حسن بیاں ہے
سنسان نظاروں میں بھی اک کیف نہاں ہے
پھولوں سے بھی نازک ہے یہاں حلقۂ زنجیر
اے وادیٔ کشمیر

ایم حبیب خان

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان

اُردو داستان گوئی کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر سے ہوا۔ یہ قصہ گوئی کا دَورِ اوّل کہلاتا ہے۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج کے اہتمام میں جو قصے کہانیاں لکھی گئیں وہ اُردو ادب میں ایک گوناگوں خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان کا زمانۂ تصنیف ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں حیدری کی "آرائشِ محفل" اور "طوطا کہانی"۔ مظہر علی خان ولاّ کی "مادھونل اور کام کندلا" اور "بیتال پچیسی"۔ میر بہادر علی حسینی کی "نثرِ بے نظیر" اور "اخلاقِ ہندی" نہال چند لاہوری کی "مذہبِ عشق" یا "گلِ بکاولی" للولال کوی کی "سنگھاسن بتیسی" بینی نرائن جہاںؔ کا تذکرہ "دیوانِ جہان" اور "باغِ عشق" اور میر امّنؔ کی "باغ و بہار" جیسے مشہور قصے کہانیاں لکھی گئیں۔ ویسے کالج سے الگ ہٹ کر بھی بہت سے قصے کہانیاں لکھی گئیں۔ انشاؔ کی کہانی "رانی کیتکی" اس دَور کی ایک یادگار ہے۔ ۱۸۰۳ء میں انشاؔ نے یہ کہانی ہندوستان میں لکھ کر مختصر قصہ گوئی کی روایت کو ایک نیا رُوپ بخشا۔ کہانی کے نکھار اور اس کی دِلکشی نے قاری کے دِلوں کو جیت لیا۔ یہاں تک کہ یہ کہانی بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھی جانے لگی۔ اس کا شمار اُردو کی مشہور و معروف کہانیوں میں ہوتا ہے۔

انشاؔ بلا کے ذہین اور بزلہ سنج تھے۔ ظرافت اور بزلہ سنجی ان کا خاص مذاق تھا۔ مگر انہوں نے اپنی شوخی اور ظرافت کا بُری طرح خون کیا۔ اگر وہ درباری شاعری کے جھمیلے میں نہ پڑے ہوتے اور اظہارِ ظرافت پر ذرا بھی قابو رکھتے تو ان کی شاعری کا رنگ بالکل بدلا ہوا ہوتا۔ ویسے انشاؔ کی نظم و نثر دونوں شوخی اور ظرافت سے مالامال ہیں۔ ان کو کئی زبانوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ مشرق کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں کچھ کہا نہ ہو۔ اُردو زبان کے تو صحیح معنوں میں نبض شناس تھے اور عربی اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ انہوں نے اُردو زبان کا قواعد "دریائے لطافت"[1] فارسی زبان میں لکھ کر اُردو داں طبقے کو اس سے رُوشناس کرایا۔

لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی سخاوتوں نے دُھوم مچا رکھی تھی جو شاعر بھی دِلّی سے لکھنؤ گیا، پھر واپس نہیں پلٹا۔ انشاؔ بھی جوانی ہی میں دِلّی سے لکھنؤ چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ مصحفی پہلے ہی سے یہاں موجود تھے اور مرزا سلیمان شکوہ سلیمانؔ کے کلام پر اصلاح دینے کا کام ان کے سپرد تھا، لیکن انشاؔ کی ذکاوت اور طباعی کے آگے مصحفیؔ کا چراغ زیادہ دِنوں تک روشن نہ رہ سکا۔ ان کے پہنچنے سے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی کے بجائے انشاؔ سے اصلاح کا کام لینے لگے۔ غرضیکہ انشاؔ کی ساری زندگی نوابوں کی صحبتوں میں گذری اور نوابوں کے زیرِ سایہ خوب مزے اُڑائے۔ آخر میں نواب سعادت علی خان کو اپنی بزلہ سنجی اور عجیب و غریب لطیفوں سے ان کا دِل بہلاتے رہے۔ لیکن بقول سعادت یار خان رنگینؔ کے انشاؔ کی آخری زندگی بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذری۔ مگر انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

کہانی "رانی کیتکی" بڑی دلچسپ اور مؤثر ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرت اور سیرت کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں۔ اس کی دریافت کا سہرا مسٹر کلنٹ پرنسپل لا مارٹن لکھنؤ کے سر ہے۔ انہوں نے اس کو پہلی بار ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۵ء میں رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع کرایا تھا۔ لیکن اس وقت یہ بہت غلط چھپی تھی۔ بعد میں محترم مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی تصحیح کر کے رسالہ "اُردو" ماہ اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ اسی کے بعد پہلی بار کتابی صورت میں "داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کے عنوان سے انجمن کے مطبع اورنگ آباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں مولوی صاحب کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی۔ لیکن یہ امر تعجب خیز ضرور ہے کہ انشاؔ کی ساری

[1] اس کو انشاؔ اور قتیلؔ دونوں نے مل کر مرتب کیا تھا۔ اُردو ترجمہ پنڈت کیفی نے کیا تھا جو انجمن ترقی اُردو ہند اورنگ آباد دکن سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔

کہانی ہندوستانی میں ہے مگر مولوی صاحب نے جب اس کو کتابی صورت میں شائع کیا تو کہانی کا عنوان تجویز کرنے سے پہلے اس پر غور نہیں فرمایا۔ داستان فارسی زبان کا لفظ ہے اور کہانی ہندی کا۔ تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحب نے اس کا دوسرا ایڈیشن کافی ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا۔ دوسرے ایڈیشن میں اس کی ضخامت ۵۱ کے بجائے ۶۵ صفحات کر دی گئی اور عنوان میں داستان کے بجائے "کہانی" کر دیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ انشا نے اپنی کہانی کا نام خود کہیں نہیں لکھا لیکن لفظ کہانی اور اس کے لکھنے کا ذکر اپنی کہانی میں اس طرح کیا ہے :۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔" ۱؎

دوسرے ایڈیشن میں دیباچہ بجنسہ شائع کیا گیا ہے لیکن مولوی صاحب نے اس میں جو ترمیم و اضافے کئے ہیں اس کا ذکر دیباچہ طبع ثانی میں نہیں کیا۔ البتہ اختلافِ نسخ (جو حاشیے پر درج ہیں) کا ذکر دیباچہ طبع ثانی میں کیا ہے.

انشا ظریف الطبع اور آزاد مزاج تھے۔ کہانی میں بھی انہوں نے اسی آزادی سے جگہ جگہ کام لیا ہے۔ یہ کہانی ہندی کا ایک نادر نمونہ ہے اور اتنی سہل اور آسان ہے کہ اس کو ہندی والا بھی سمجھتا ہے اور اردو والا بھی۔ زبان نہایت صاف اور شگفتہ ہے۔ اس میں انشا کی انشا پردازی کے جوہر قدم قدم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی انشا پردازی اور جودتِ طبع کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ تاڑ سکے (بتا سکے) سچ ہے جو بنایا ہوا ہو' سو اپنے بنانے والے کو کیا کیا سراہے اور کیا کہے! یوں جس کا جی چاہے پڑا بکے سو سے لگا پانوں (پاؤں) تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں (برس) اسی دھیان میں رہیں جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے، کراہا کریں .... "

"ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے اپنے اسی اٹھکھیل (اٹکھیل) پنے اور الڑپن (الہڑپن) کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے (سامنے) آئی تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا۔ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکھا (بھوکا) پیاسا اونیدا جمھاتا انگڑائیاں لیتا ہکا بکا ہو کے لگا آسرا ڈھونڈھنے (ڈھونڈنے) اتنے میں کچھ امریاں دھیان چڑھیں اُدھر چل نکلا۔" ۲؎

یہ کہانی دوسری داستانوں کے مقابلے میں بے حد مختصر ہے لیکن مختصر داستانوں میں زبان و بیان اور شوخی و ظرافت کے اعتبار سے اس کا درجہ سب سے بلند ہے بلکہ اپنی طرز کی ایک نئی اور انوکھی داستان ہے۔ قصے کا مختصر خلاصہ ملاحظہ ہو۔

"کسی دیش کا ایک راجا تھا۔ اس کا نام سورج بھان تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام کنور اودے بھان تھا۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلنے کسی جنگل میں نکل گیا۔ وہاں اسے ایک ہرنی پر نظر پڑی۔ بس اس کا تعاقب کرتا ہوا راستہ بھول گیا۔ اس نے جنگل میں امریوں کے باغ میں چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولتے ہوئے دیکھا۔ ان ہی میں راجا جگ پرکاش کی حسین اور خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ یہیں کنور اودے بھان کی ملاقات رانی کیتکی سے ہوئی۔ کیتکی کی ایک سہیلی مدن بان اس کی ہمراز تھی۔ اس نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی انگوٹھیاں بدلنے کی ترکیب بتائی جو بہت پسند کی گئی۔ کنور کیتکی کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ بالآخر جب راز کھلا تو کنور کے باپ نے شادی کا پیام کیتکی کے باپ راجا جگ پرکاش کے پاس بھیجا۔ کیتکی کا باپ شادی پر رضامند نہیں ہوا۔ پھر کیا تھا دونوں راجاؤں میں لڑائی چھڑ گئی۔ کیتکی کے باپ نے جب یہ دیکھا کہ لڑائی میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس نے اپنے گورو مہندر گر کو، جو کیلاش پہاڑ پر رہتا تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ اس نے آتے ہی اپنے علم کے زور سے کنور اودے بھان اور اس کے والدین کو ہرن بنا دیا۔ اب کیا تھا رانی کیتکی نے بہیت آنکھوں

۱؎ کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۳
۲؎ " " " " ۹،۲

میں لگا کر جنگلوں کی راہ لی اور اپنے ہرن کو ڈھونڈنے لگی۔ ادھر اس کی گمشدگی پر اس کے والدین کے ہوش ہرن ہو گئے۔ آخرکار راجا جگ پرکاش نے اپنی مدد کے لئے جوگی مہندر گر اور راجا اندر کو بُلوایا۔ کنور اودے بھان اور اس کے والدین ہرنوں سے انسان بنا دئے گئے۔ بالآخر کنور اور کیتکی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کر دی گئی۔

کہانی بالکل سیدھی سادی ہے۔ کہیں پر بھی ہیر پھیر نہیں۔ قصے کو بھی بے جا طول نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ کہانی میں انشاؔ نے یہ التزام نبھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہ آنے پائے۔ سو یہ پابندی کوئی مشکل نہیں، اس لئے کہ قصہ ہندوانی ہے اور ہندوانی زندگی اور معاشرت سے تعلق رکھتا ہے۔ کردار بھی ہندوانی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قصے کے ہندوپن میں جو سادگی اور سلاست انشاؔ نے قائم رکھی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہانی میں اور بھی نکھار اور دِلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ کہانی میں جو روزمرہ کی بول چال کے محاورات استعمال کئے ہیں وہ انشاؔ کی قادرالکلامی اور وُسعتِ معلومات کا پتہ دیتے ہیں۔

کنور اودے بھان جب تھکا ہارا رانی کیتکی اور اس کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کسی پیڑ کے تلے رات بسر کرنے کے لئے پہنچتا ہے تو کیتکی اور اس کی سہیلیاں ٹھہرنے کے لئے منع کرتی ہیں۔ اس پر کنور نے جو عاجزی اور انکساری دکھائی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"اتنی رکھائیاں نہ دیکھئے۔ میں سارے دِن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانہ میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑا رہوں گا ——— ایک ہرنی کے پیچھے سب لوگوں کو چھوڑ کر گھوڑا پھینکا تھا۔ جب تلک اوجیالا (اُجالا) رہا اسی کے دھیان میں تھا۔ جب اندھیرا چھا گیا اور جی بہت گھبرا گیا ان امریوں کا آسرا ڈھونڈ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ کچھ روک ٹوک تو نہ تھی جو ماتھا ٹھنک جاتا اور رُک رہتا سر اُٹھائے ہانپتا ہوا چلا آیا۔" [1]

کنور کی یہ باتیں سُن کر کیتکی کا جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور وہ اُس کی انکساری اور میٹھے پن سے مرعوب ہو جاتی ہے۔ نیز کیتکی کو مسافر کی بے بسی پر بھی ترس آجاتا ہے۔ وہ اپنی سہیلی مدن بان سے اس کے بارے میں کہتی ہے۔

"نہ جی بولیاں ٹھولیاں نہ مارو۔ ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں سو انہیں پہنچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مار نہیں ڈالا۔" [2]

انشاؔ کی ذہانت اور آزاد خیالی نے کہانی میں حُسن پیدا کر دیا ہے۔ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان جب ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں تو کنور کے باپ کی طرف سے شادی کا پیام ایک باہمن کے ذریعہ کیتکی کے باپ کے پاس پہنچتا ہے۔ کیتکی کا باپ اس رشتے کی خبر سُن کر غصّے ہو جاتا ہے۔ بالآخر دونوں راجاؤں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ تب کنور اودے بھان کیتکی کو ایک خط میں بھاگ چلنے کے لئے لکھتا ہے۔ کہانی میں کیتکی کا کردار سب سے بلند اور جان دار ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی عزت کو اپنا دھرم سمجھتی ہے۔ وہ ان کی عزت قائم رکھنے کے لئے کنور کو خط میں لکھتی ہے کہ:۔

"اے میرے جی کے گاہک جو تُو مجھے بوٹی بوٹی کو چیل کوؤں (کوّے) کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھوں چین کلیجے سُکھ ہو۔ پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں۔ اس میں ایک باپ دادے کو بٹ لگ جاتی ہے۔ اور جب تک ماں باپ جیسا کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسی ڈول سے بیٹا بیٹی کو کسی پر پٹک نہ ماریں اور سر سے کسی کے چپک نہ دیں تب تک یہ ایک جی تو کیا جو کروڑ جی جاتے رہیں تو کوئی بات ہیں تو رہتی نہیں" [3]

کیتکی کنور کو بے حد چاہتی ہے لیکن وہ جذبات کی رَو میں نہیں بہتی۔ اس کے کردار میں جو صاف گوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ اس کو جائز طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے تاکہ دیکھنے والے اس پر غلط بیانی کا الزام نہ لگا سکیں۔ کنور اودے بھان بھی وفادار اور سیدھا سادا نوجوان ہے۔ اس کی گفتگو میں پُرانے زمانے کے راجکماروں کا بھولا پن ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جذبات کی رَو میں کھرے کھوٹے کی پرکھ اس کے بس کی بات نہیں۔

اُردو کی دوسری ضخیم اور مختصر داستانوں میں فوق فطرت کی کثرت نمودوں پر پائی جاتی ہے۔ ان میں جادوگر، دیو اور پری اپنے اپنے کرتب اس انداز سے

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۸

[2] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۹

[3] ،، ،، ،، ،، صفحہ ۱۹، ۲۰

دکھاتے ہیں کر دیکھنے والا اچنبھے میں رہ جاتا ہے، لیکن اس داستان میں نہ جادوگر دکھائی دیتے ہیں نہ دیو اور نہ پری، البتہ صرف ایک جوگی مہندر گر اور اس کے کچھ ساتھی ہیں جو کیلاش پہاڑ پر رہتے ہیں۔ ان کے بس میں ایک ایسا بھبوت ہے جسے آنکھ میں لگانے سے دوسرا نظر نہیں آتا۔ دوسرے آدمیوں کو ہرن بنانا وغیرہ طاقتیں ان کے بس میں ہیں۔ صرف یہی تھوڑا بہت فوقِ فطرت اس کہانی میں نظر آتا ہے لیکن یہ فوقِ فطرت بھی اُردو کی دوسری داستانوں سے بالکل جدا ہے۔ انشاؔ نے اس کہانی میں یہ التزام کیا ہے کہ وہ اپنی اصلی ڈگر سے قاری کو ہٹانا اور اس کو بھٹکا کر کسی اور طرف لے جانا قصہ گوئی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ کہانی کہتے کہتے قاری کے ذہن کو ماضی سے حال کی طرف اس طرح لے آتے ہیں کہ وہ ذرا بھی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا اور گذرے ہوئے واقعات اس کی آنکھوں میں اس طرح پھر جاتے ہیں جیسے وہ ماضی کے واقعات نہیں بلکہ حال کے ہیں۔ اس کہانی کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اس میں ایسے موقعے جگہ جگہ آئے ہیں لیکن انشاؔ نے ان کی دل کشی میں ذرا بھی فرق نہیں ہونے دیا۔ آپ بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لیجئے :۔

"مدن بھان رانی کیتکی کو اکیلا چھوڑ کر راجا جگت پرکاش اور رانی کام لتا جس پہاڑ پر بیٹھے ہوئے تھے وہاں جھٹ سے ادیس کرکے اُکھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے لیجئے آپ کا گھر نئے سرے سے بسا اور اچھے دن آئے۔ رانی کیتکی کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ اونہیں (اُنہیں) کے ہاتھ کی یہ چِٹھی لائی ہوں۔ آپ پڑھ لیجئے آگے جو چاہے سو کیجئے۔" [1]

انشاؔ نے کہانی کے درمیان میں اشعار بھی استعمال کئے ہیں لیکن ان شعروں میں کوئی خاص بات نہیں ویسے انشاؔ کی شاعرانہ قادر الکلامی سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کہانی میں جو شعر آئے ہیں ان میں دو چار ہی ایسے ہیں جن کے لئے واقعی مُنہ سے بے ساختہ واہ نکلتی ہے۔ آپ بھی مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے یہ شعر سُن لیجئے ۔

چُھپکے چُھپکے کراہتی تھی

جینا اپنا نہ چاہتی تھی

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۳۷، ۳۸

پان پیاس کیسے بھلا کیسے بھوک

دیکھوں ہوں وہی ہرے ہرے روکھ

امریوں میں اون (اُن) کا وہ اُترنا

اور رات کا وہ سائیں سائیں کرنا

کیونکر اُنہیں بھُولوں کیا کریں

ما (ماں) باپ سے کب تلک ڈروں میں ؟

یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے

ایک اوس سی مجھ پر پڑ گئی ہے [2]

انشاؔ کو زبان پر پُورا عبور حاصل ہے۔ ان کے ذہن میں بہت سے الفاظ کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس لئے کہانی میں انہوں نے بہت سی مُشکل اور دقیق باتوں کو آسان بنانے کی حتی الوسع کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کہانی میں بہت سے ایسے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو باوجود متروک اور فرسودہ ہونے کے وہ اس قابل ہیں کہ اگر انہیں بار بار پڑھا جائے تب بھی کانوں کو بُرے نہ معلوم ہوں۔ بعض ٹھیٹ ہندی الفاظ بھی اپنی کہانی میں اس خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ ان کو الگ کرنا ہم کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ انشاؔ نے کہانی میں تشبیہہ اور استعارے بھی کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

کہانی کا آخری حصہ بڑا ہی دِل کش اور رنگین ہے۔ اس میں انشاؔ کے تخیئل کی بلند پروازی اور ہندو معاشرت کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں لیجئے آپ بھی معاشرت کے سچے رنگ رُوپ میں رچی ہوئی تہذیب کی تصویریں ملاحظہ فرمائیے اور انشاؔ کے تخیئل کا باندھا ہوا ٹھاٹ دیکھئے :۔

"اور تین برس کا پیسا جو لوگ دیا کرتے تھے اس راجا کے راج بھر میں جس جس ڈھب سے ہو اکھیتی باڑی کر کے ہل جوت کے اور کپڑا لتا بیچ کھوچ کے سو سب ان کو چھوڑ دیا جو اپنے گھروں میں بناؤ کے ٹھاٹھ کریں اور جتنے راج بھر میں کنویں (کنوئیں) تھے کھنڈ سالوں کی کھنڈ سالیں لے جا ان میں انڈیلی گئیں اور سارے بنوں میں اور پہاڑ تلیوں میں لال ٹینوں کی جھم جھماہٹ راتوں کو دکھائی

[2] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۷، ۲۸، ۲۹

دینے لگی اور جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسنبھہ اور ٹیسو اور ہارسنگار پڑ گیا اور کیسر بھی تھوڑی تھوڑی گھولنے میں آ گئی اور پھننگ سے لگا جڑ تلک جتنے جھاڑ جھنکاروں میں پتے اور پتوں کے بندھے چھپتے تھے ان پر روپہلے سنہرے ڈانک گوند لگا لگا کے چپکا دئے اور سبھوں کو کہدیا گیا جو سوہی پگڑی اور سوہے بن کوئی کسی ڈول کا کسی روپ سے نہ پھرے چلے۔"[1]

انشا نے اودے بھان کے بیاہنے کی تیاری میں کیا کیا ٹھاٹ دکھائے ہیں ایک جھلک اس کی بھی دیکھ لیجئے :۔

"کیاریوں کے بیچ میں ہیرے پکھراج ان بندھے موتیوں کے جھاڑ اور لال ٹینوں کی بھیڑ بھاڑ کی جھم جھاہٹ دکھائی دے اور انہیں لال ٹینوں میں سے :پھول، پھلجھڑیاں جاہی، جوہیاں کدم، گیندا، چنبیلی اس ڈھب سے چھٹے جو دیکھنوں کی چھاتیوں کے کواڑ کھل جائیں اور پٹاخے جو اُچھل اُچھل کے پھوٹیں ان میں سے ہنستے ستارے اور بولتے پکھروٹے ڈھل ڈھل پڑیں۔"[2]

راجا اندر نے دُلہن کی مُنہ دکھائی میں جو چیزیں دی ہیں انہیں بھی دیکھ لیجئے۔ یہاں بھی انشا نے عبارت کی سادگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

"راجا اندر نے دُلہن کی مونہ (مُنہ) دکھائی میں ایک ہیرے کا اکڈال پھر کھٹا اور ایک پڑی پکھراج کی دی اور ایک پارجات کا پودھا جس سے جو پھل مانگئے سو ہی ملے دُلہن کے سامنے (سامنے) لگا دیا اور ایک کام دہین گائے کی پٹھیا بھی اس کے نیچے باندھ دی اور اکیس لونڈیاں انہیں اُڑن کھٹولے والیوں میں سے جن کے اچھی سے اچھی سنہری سے سنہری گاتی بجاتیاں سیتی پروتیاں سگھڑ سے سگھڑ سونپیں اور انہیں کہدیا رانی کیتکی چھٹ ان کے دولہا سے کچھ بات چیت نہ رکھیو۔ تمہارے کان پہلے ہی سے مروڑے دیتا ہوں۔ نہیں تو سب کی سب پتھر کی مورتیں بن جاؤگی اور اپنا کیا آپ پاؤگی۔"[3]

انشا کی اس کہانی میں ہندو معاشرت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی ہیں۔ مصنف نے قصے کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس میں عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ کرکے ہندوستانی کی ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہی خوبی اس کی شہرت کی سب سے بڑی ضمانت ہے اور انشا کا یہ کارنامہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن صفحہ ۴۱—۴۳

[2] " " " " " ۴۹

[3] " " " " " ۶۲، ۶۳

شفیق جونپوری

رنگِ تغزّل

سرور ہو کیف جاودانی تو دورِ مے بار بار کیوں ہو
جسے پلا جائے چشمِ ساقی وہ حشر تک ہوشیار کیوں ہو

خود اپنے جلوؤں سے باخبر ہو تو لالہ و گل کا پیار کیوں ہو
بہار سے جو بلند تر ہو وہ خاکِ راہِ بہار کیوں ہو

چمک رہا ہے ترے کرم سے دیارِ غربت کا ذرہ ذرہ
سلام اے دوپہر کے سورج یہ دھوپ ناخوشگوار کیوں ہو

انہیں سے پوچھیں گے اے صبا ہم کہ فصلِ گل ہے خوشی کا موسم
تو ان کے وحشت زدوں کا دامن بہار میں تار تار کیوں ہو

ترے ترانے کی دھن بھی جس کی رہینِ منت رہی ہو صدیوں
مرے مغنی بتا کہ تجھ کو وہی صدا ناگوار کیوں ہو

چمن میں ہوتی جو قدرِ نعمت تو یوں نہ برباد ہوتی نکہت
مہک اٹھے جس سے سارا گلشن وہی غریب الدیار کیوں ہو

ان آشیانہ بنانے والے غرض کے بندوں سے کوئی پوچھے
چمن میں رہنے کا حق ملا ہے تو شاخِ گل زیرِ بار کیوں ہو

ترانۂ عندلیب کیسا نظارۂ سرو و یاسمیں کیا
خزاں کی گودوں میں پلنے والا ادا شناسِ بہار کیوں ہو

ابھی ترے میکدے میں ساقی ہیں سینکڑوں اہلِ ظرف باقی
مگر حریفانِ عہدِ نو کی نگاہ میں اعتبار کیوں ہو

بہار کا ذوقِ خود نمائی ہے منتظر صاحبِ نظر کا
تو پھر کسی نکتہ بیں کا آنا نگاہِ نرگس پہ بار کیوں ہو

ہوا تو گدڑی میں لعل پیدا نگاہیں جوہر شناس کب ہیں
جہاں کہ بکتے ہوں جھوٹے موتی وہاں دُرِ شاہوار کیوں ہو

شفیق وہ بھی تمہارے نغمے کی دل پذیری کے معترف ہیں
مگر انہیں ناگوار یہ ہے کہ تم شریکِ بہار کیوں ہو

کب اس کی پاک بازی کو مے و مینا سے رغبت ہو
جسے اے چشمِ کوثر آفریں تیری ضرورت ہو

نہ فکرِ حشر و عقبیٰ ہو نہ ذکرِ حور و جنت ہو
پکارے کوئی اور آواز بے حرف و حکایت ہو

وہ بے پردہ سہی دیکھوں انہیں کیونکر یہ جرأت ہو
مبادا حسن کی غیرت کو نظروں سے شکایت ہو

ہو عاشق تو لطافت بھی مزاجِ حسن کی سمجھے
اگر وہ نازنیں ہیں عشق میں بھی کچھ نزاکت ہو

مرے ہی اشتیاقِ دید کو ناکام رہنے دے
سن اے بادِ صبا کیوں ان کے پردے کو اذیت ہو

اٹھا ہے کون بالیں سے جو نظروں کا یہ عالم ہے
کہ شام آتی ہو سورج ڈوبتا ہو دھوپ رخصت ہو

ہے جائز پاک نظروں سے کسی کو دیکھنا لیکن
کہیں ایسا نہ ہو یہ آرزو بھی بارِ عصمت ہو

نثار اس نامرادی پر مرادیں زندگی بھر کی
انہیں زلفوں کے سایے میں جو محوِ خوابِ راحت ہو

زباں پر آج یوں ہی آ گیا تقدیر کا شکوہ
تمہاری نرگسی آنکھوں میں کیوں رشکِ ندامت ہو

ہمیشہ حسن کی معصومیت کو رنج پہنچایا
الٰہی اور میری ناشکیبائی فضیحت ہو

شفیق اک طرفہ افسانہ ہے افسانہ محبت کا
سناؤں عمر بھر پھر بھی سنانے سے نہ فرصت ہو

حامدی کاشمیری
ایم اے

غنی کاشمیری ـــــ ایک مطالعہ

محمد طاہر غنی کشمیر کے وہ بڑے شاعر ہیں جن کی شہرت یہاں کے فارسی شعر و ادب کے حلقوں سے نکل کر ایران تک پہنچی اور انہیں فارسی شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ آپ سنہ ۱۰۴۰ھ میں سری نگر میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور انتالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ گور گڑی محلہ میں دفن ہیں لیکن وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ سرینگر میں آپ کا مدفن کس جگہ ہے۔ غنی نے اپنی عمر کے اس قلیل وقفے میں ہزاروں اشعار لکھے۔ آپ ازل سے ایک شاعرانہ دِل و دماغ لے کر آئے تھے۔ غیر معمولی ذہانت اور فکرِ رسا آپ کو ودیعت ہو چکی تھی۔ زندگی کے روزمرہ واقعات کا آپ توجہ اور دلچسپی سے مطالعہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے بیس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے۔ اس وقت کے مانے ہوئے عالم مولانا محسن فانی کی صحیح رہنمائی اور تربیت نے غنی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نیا آب و رنگ بخش دیا اور تھوڑی ہی دیر میں ان کے شعور میں پختگی اور رچاؤ آگیا۔

غنی کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے پہلے اس دَور کے تاریخی اور سیاسی پس منظر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جس دَور میں غنی شاعری کر رہے تھے اُس زمانے میں ایران سے لے کر ہندوستان تک فارسی شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ نظیری، صائب، غزالی، فیضی، طالب، بے دِل، جلال، محسن فانی، صرفی، ناصر علی اور دوسرے ممتاز شعرا جاگیرداروں اور بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ ہو چکے تھے۔ وہ عزت و تکریم کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی قدر دانی ہر جگہ ہوتی تھی۔ بادشاہوں اور امیروں کے ظاہری جاہ و جلال، عیش کوشیوں، مال و دولت اور چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ تو ہو جاتی تھیں لیکن ملک میں زندگی کے مختلف شعبوں میں جو تغیرات رُونما ہو رہے تھے اُن سے بالکل بے پروا نہیں رہ سکتے تھے۔ پُرانا نظامِ حیات زوال آمادہ تھا۔ ہر طرف بے چینی، انتشار اور انقلاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں عالم گیر کے عہد میں سیاسی حالات زیادہ ہی مایوس کُن صورت اختیار کر رہے تھے اور مرکز سے لے کر دُور و نزدیک کے صوبوں اور ریاستوں میں بھی یہی حال تھا۔ اگر اس دَور کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو کہیں نہ کہیں خارجی حالات اور واقعات کا پرتَو بالواسطہ یا بلاواسطہ نظر آئے گا، لیکن عام طور پر ایسے شعرا ملتے ہیں جو اپنے آقاؤں اور سرپرستوں کی قصیدہ خوانی میں مصروف رہتے ہیں، تصوّف کی موہوم وادیوں میں بھٹکتے ہیں یا خیالی محبوب کے عارض و گیسو کے رنگیں افسانے بیان کرتے ہیں۔

غنی ایک زبردست انفرادیت کے مالک ہیں، آپ کی دُور رَس نگاہوں کے سامنے حیات اور ماحول کے اسرار بے نقاب ہو چکے تھے، اور آپ نے اپنے لئے ایک الگ مسلکِ حیات متعین کر لیا تھا، آپ کی شخصیت نے زمانے سے ٹکر لی اور آپ کی عظمت مسلّم ہو گئی۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے غنی کے کلام کی شہرت سُنی تو اس نے حاکمِ کشمیر سیف خان کو حکم بھیجا کہ غنی کو عزّت و جاہ کے ساتھ اس کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ سیف خان نے غنی کو اپنے دربار میں بلایا اور شہنشاہ عالم گیر کی دعوت پیش کی۔ لیکن غنی نے اپنی انفرادیت کی آبرو پر آنچ نہ آنے دی اور اپنی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "شہنشاہ سے کہا جائے کہ غنی پاگل ہو گیا ہے۔" اور اُسی وقت غنی پر پاگلوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کپڑے

تار تار کر کے دربار سے نکل گیا۔ یہ واقعہ غنیؔ کی زندگی کا معمولی واقعہ نہیں ہے، یہ ان کی شخصیت اور شاعری کی ہم آہنگی اور انفرادیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپ کی طبیعت میں استغنا اور خودداری کا جوہر تھا۔ زندگی کو فقر و فاقہ میں بسر کرنا قبول کیا، لیکن خوشامد سے احتراز کیا۔ آپ کی شخصیت کا یہ اہم پہلو آپ کے اشعار میں مترشح ہے ؎

کاسۂ خود پُر مکن زنہار از خوانِ کسے
داغ از احسانِ خورشید است بر دلِ ماہ را

؎ ہر کہ چوں من زد قدم در راہ استغنا غنیؔ
اطلس گردوں بپای ہمتش پاتابہ ایست

یہ صحیح ہے کہ اس دَور میں شاعری جن بے جان روایتوں کی شکار ہو چکی تھی۔ ان روایتوں سے غنیؔ بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ چنانچہ ان کے بعض اشعار میں عامیانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ محبوب سے فراق کی شکائتیں، وصال کی خواہشیں، شکوۂ گردوں، زمانہ کی بے قدری، محبوب کے سراپا کی تصویریں، تصوف کے اسرار و رموز —— یہ فرسودہ خیالات غنیؔ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن "دیوانِ غنیؔ" کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غنیؔ کے خیالات میں محض شعرائے متقدمین کی صدائے بازگشت نہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کے یہاں اُپج ہے، اُن کے مشاہدۂ حیات میں قوت اور باریکی ہے۔ وہ زندگی کے گوناگوں تجربات سے اپنی شاعری کو توانائی اور زندگی بخشتے ہیں۔ اُن کے تخیل میں رفعت، وسعت اور رنگینی ہے۔ ان کے خیالات میں جدت اور تنوع ہے۔ ان کا شعور بیدار ہے، وہ زندگی اور کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ سے ان کے ذہن اور فکر پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کو وہ بڑی چابکدستی اور فنکاری کے ساتھ شعروں کے خدوخال میں اُبھارتے ہیں، یہی ان کا کمال ہے اور اسی لئے تمام عمر خانہ نشین رہنے کے باوجود ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی ؎

ہر چند غنیؔ ہیچ نگیں خانہ نشیں است
نامش نہ درِ بستہ بر آید چو تواں کرد

غنیؔ کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے سچے تجربات کی بوقلمونی ہے، تجرباتِ حیات کی سچائی اور رنگارنگی اگر فن کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں نکھر جائے تو عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ غنیؔ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے، عمر بھر مصائب اور مشکلات کا سامنا کیا، تلخ حقیقتوں سے آنکھ ملائی اور ہر بار ایک رجائی اور صحت مند نظریے نے آپ کو سہارا دیا، آپ کو جذبات کو سنبھالا۔ اور فکر و آگہی کے ساتھ آپ نت نئے تجربات سے دامنِ فکر و نظر پہ نئے نقوش اُبھارتے گئے۔

پای من یک لحظہ جا در گوشۂ داماں نکرد
گشت عمرم در سفر چوں رشتۂ سوزن تمام
بے تعب در منزلِ مقصود کس را بار نیست
نردبان ایں سرا جز راہ ناہموار نیست

ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

چوں طفلِ اشک گرچہ بہ ہر دم نشستہ ایم
خاکم بسر کہ داخلِ آدم نگشتہ ایم
خواندم تمام صفحۂ گیتی چوں آفتاب
بے ہودہ در قلمروِ آدم نگشتہ ایم
دائم جوانم از مردِ ہمت بلند
یعنی ز بارِ منتِ کس خم نگشتہ ایم

یہاں پر غنیؔ کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت پر نظر پڑتی ہے یعنی دعویٰ و دلیل کا عنصر۔ یہ عنصر صائبؔ، بیدلؔ اور غالبؔ کے کلام میں بھی کارفرما ہے، لیکن غنیؔ کے یہاں یہ عنصر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ شاعر ایک مصرع میں ایک دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ کی حمایت میں دوسرے مصرع میں ایک دلیل یا جواز پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں، جو کہ بنیادی طور پر لطیف جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے، استدلال داخل ہوتا ہے اور اس نازک مقام پر اگر شاعر فلسفے کو فن کی نزاکتوں اور لطافتوں میں نہ سمو سکے تو اس کی محنت اکارت ہو گئی۔ اقبالؔ کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ خیالات کو فن کے حسین سانچوں میں ڈھال دیا۔ غنیؔ اور ان کے ہم عصر شعرا جو خیال

بندی اور دعویٰ و دلیل کے قائل ہیں، ایک نئے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، ایک ایسا رجحان جو دراصل اس دور کے ذہنی اور ادبی زوال پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن غنیؔ نے اس رنگ میں بھی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آپ نے اپنی ذاتی کیفیات اور واردات کو آفاقی اور ہمہ گیر بنایا اور یہی ایک بڑے آرٹسٹ کی پہچان ہے۔ ہر دعویٰ کے ساتھ جو دلیل لائی ہے وہ ہمہ گیر ہے۔ اس میں شاعرانہ حسن اور صداقت ہے، اس میں ایک پختہ شعور کی جھلک ہے اور زندگی کی توانائی ہے۔

از کسے پنہاں نمے داریم راز خود چو شمع
ہرچہ در دل ہست ما را بر زباں مے آوریم

ہرچند تغافل کند ایمن مشو از خصم
پیوستہ بود پشتِ کماں سوی نشانہ

ہر کہ باشد در جہاں مشتاق ہم رنگ خود است
کاہ در پرواز مے آید چو بیند کہربا

سنگیں دل است ہر کہ بظاہر ملائم است
پنہاں درونِ پنبہ نگر پنبہ دانہ را

حرص اگر غالب شود خلوت گزینی مشکل است
تشنہ چوں گردد زباں از کام مے آید بروں

سوزِ دلے کہ دارم از گریہ کم نہ گردد
چوں شمع آب چشمم باشد غذای آتش

غنیؔ کے اشعار میں کشمیر کی گل پوش وادیوں کا حسن اور تازگی ہے آپ کے کلام میں بہار اور گل و گلزار کا ذکر جمیل جا بجا ملتا ہے بہار اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ آتی ہے، شاعر کے دل سے اداسی کے سائے کافور ہو جاتے ہیں اور وہ اظہارِ مسرت کرتا ہے۔

بیا ساقی شبستان مرا امشب منور کن
ز روزن تا در آید آفتابے بساغر کن

غنیؔ فصلِ بہار آمد گل عیشی تواں چیدن
بسوں آور چو نرگس زر ز خاک عرف ساغر کن

ہر زم گلشن گر کنی تا رفتہ در صحن چمن
سر بر آرد بہر دیدار تو از دیوار گل

پیکر ساقی سراپا گوئی از گل ساختند
دستِ گل پا گل بدن گل چہرہ گل رخسار گل

آپ کو کشمیری زندگی کے کئی پہلوؤں پر بھی نظر تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں یہاں کے لوگوں کے مجلسی عقائد، توہمات، خیالات اور طرزِ لباس وغیرہ کے بارے میں ان کے کلام میں اہم اشارے ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

در جوانی بہ طرب کوش کہ ایں موئے سیاہ
شب تار است و بہ افسانہ بسر باید برد

چوں آستیں ہمیشہ جبینم زمیں پُر است
یعنی دلم ز دست تو اے نازنیں پُر است

تا رزق خود رسد بہ دہانت چو آسیا
دائم خموش دار زبانِ سوال را

آپ کے خیالات میں ندرت اور شگفتگی ہے اور ساتھ ہی آپ کو فارسی زبان پر کامل قدرت حاصل ہے۔ غنیؔ کی قادر الکلامی نے ثابت کیا کہ انسان غیر زبان میں بھی وہ کمال حاصل کر سکتا ہے جو اہلِ زبان تصور میں نہیں لا سکتے۔ چنانچہ ایران کے ملک الشعراء صائبؔ نے جب غنیؔ کا یہ شعر سنا ؎

موی میان تو شدہ کرالہ پی۔ کرد جدا کاسۂ سر از تن

تو "کرالہ پی" لفظ کا معنی دریافت کرنے کے لئے وہ سفر کی بے شمار صعوبتوں کو برداشت کرکے ایران سے کشمیر آئے اور جب انہوں نے غنیؔ کا یہ شعر سنا ؎

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہم رنگ زمین بود، گرفتار شدم

تو صائبؔ نے بے قرار ہو کر یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش! اس ایک شعر کے بدلے غنیؔ اس کا سارا دیوان لے لیتا۔

غنیؔ کی طبیعت میں بے پناہ موزونیت ہے۔ ان کی زبان سادہ، شستہ اور شگفتہ ہے۔ ایک بار صائبؔ کو ایک شعر کا پہلا مصرع ذہن

واجد علی ہاشمی

حسرت موہانی کی ہندی شاعری

حسرت کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ باکمال شاعر بھی تھے اور انشاپرداز بھی۔ صحافی بھی تھے اور نقاد بھی۔ سیاست دان بھی تھے اور مردِ مجاہد بھی۔ عاشق مزاج بھی اور صوفیٔ باصفا بھی۔ ان کی سیرت کے گوناگوں پہلو ہیں اور ہر پہلو ہمارے لئے لائقِ توجہ ہے۔

اُردو رسالوں میں اُردو ادب اور رسالہ نگار کے حسرت نمبر نے حسرت کی زندگی کے لگ بھگ تمام پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا۔ حسرت جن نظریات کے پیرو تھے اس کا عکس ان کی سماجی زندگی میں جلوہ گر ہے۔ تہذیبی اختلاط کی بُنیادوں پر ان کے شعور کی نشوونما ہوئی تھی۔ ان کی ہندی شاعری بدلتے ہوئے سماج کے لئے شعور کا آئینہ دار ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حسرت اُردو غزل کے بادشاہ تھے لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ہندی کے بھی کامیاب شاعر تھے اور انہوں نے اس زمین میں بھی گل بوٹے کھلائے ہیں۔

حسرت پر دو عظیم تمدنوں کے اختلاط کا اثر اتنا گہرا پڑا ہے کہ کبھی کبھی اُن کی ہندی کویتاؤں کے سامنے ان کی اُردو شاعری پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگر حسرت کے صرف ہندی کلام کو سامنے رکھ کر اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو کسی طرح پختہ، مستند اور نرالا سے ان کا کلام کم مایہ معلوم نہیں ہوتا۔ ان کی کویتاؤں میں سور داس کا پریم اور رس پایا جاتا ہے۔ شری کرشن بھگوان کی محبت کا نغمہ جتنے دل سوز انداز اور میٹھے سُروں میں سور داس نے چھیڑا ہے اس کی بازگشت کی لہر حسرت کے کلام میں گم ہو جاتی ہے۔ حسرت نے محبت کے ابدی نغموں کے ذریعے انسانوں میں توانائی اور خودشناسی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ وہ محبت حقیقی نہیں ہو سکتی جو انسانوں کو مادّی اور جنسی انبساط کی طرف مائل کر دے بلکہ محبت وہ ہے جس میں سوز و گداز ہو۔ جو جسم کو نحیف و زار و تعمیر کر کے رُوح کو توانا بنائے۔ اس لئے فراق کی سختیاں وصل کی لذتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ایک میں تعمیرِ حیات ہوتی ہے اور دوسرے میں تخریب۔ ایک میں زندگی تپ کر نکھر اُٹھتی ہے تو دوسری میں لذّت اندوزی کے باعث اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔

حسرت کے ہجریہ اشعار میں زندگی بڑی تیزی کے ساتھ ضو فشاں ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

پُن ہوئے نہ شیام کی پریت کا پاپ۔ کوؤ کاہے کرت ہے پشچاتاپ
نینھ کی آگ ماں تن من مارے۔ کب لگ جلت رہی چپ چاپ
دین دیال بھئی دُکھ دائک۔ سب حسرت بھول کے میاں ملاپ

من موہن شیام سے نین لاگ۔ لِن دن سُلگ رہی تن آگ
برہ کی رین نپٹ اندھیاری۔ رو وت دھوت کٹت جاگ جاگ
پریم کا روگ لگائے کے حسرت۔ راگ رنگ سب دین تیاگ

کھتیاں چھلائے رہے گردھاری۔ اَور ان مل سدھ بھول ہماری
رووت دھوت تلپھت بلکت۔ برہ کی رین گئی کٹ ساری
جیا جات برکھا حسرت۔ دیکھ دیکھ جد یا کاری

کاسے کہی نہیں چین بنواری بنا۔ روئے کے ساری رین مراری بنا
کوؤ جتن جیا دھیر نہ دھارے۔ نیند نہ آوے نین گردھاری بنا
دیکھ سکی کوؤ چینھت نا ہیل۔ اس حسرت بھئے گین بہاری بنا

برہ کی رین کٹے نہ پہاڑ ۔ سونی نگریا پڑی ہے اُجاڑ
نردئی شیام پردیس سدھارے ۔ ہم دکھیارن کا چھوڑ چھاڑ
کاہے نہ حسرت سب سُکھ سمپت ۔ تج بیٹھن گھربار کو واڑ

من توسے پریت لگائی کنہائی ۔ کاہو اور کی سُرت اب کاہے کا آئی
گوکل ڈھونڈھ بندرابن ڈھونڈو ۔ برسانے گھوم کے آئی
تن من دھن سب وار کے حسرت ۔ متھرا نگر چل دھونی رمائی

من لاگی پریم کر چوگن پاٹ ۔ رنگ بھبھوت بسے برج گھاٹ
شیام نگر کی بھیک بھلی ہے ۔ کا کرے لے راج پاٹ
پھولن سیج بسار کے حسرت ۔ کری اوڑھ بچھاوت ٹاٹ

تم بن کون سنے مہاراج   راکھو بانہہ گہے کی لاج
برج موہن جب سے من بسے   ہم بھولن سب کام کاج
کوؤ راج سوراج سب بھول کے حسرت   اب مانگت پریم راج

بغدادی دیالو کھوتیا   ہم ہول گریب ہیں پار جوتیا
برہ کی ماری نپٹ دکھیاری   تاکن کب لگ دُور سے نیا
پار اتار پیا سے ملاؤ   رزاق پیا بانسے نگر کے بستیا
بانسے نگر کے فرنگی محل کے   اِک ہی نام کے دُوئی دُوئی کنہیا
رزاق واب پیا بن حسرت   ہری بتھا کاہے کون سنیا

حسرت نے تہذیبی اتحاد کے ہر خدوخال کو ایسے وقت میں اُبھارا ہے جب کہ انگریزی راج نے ہمارے تہذیبی اختلاف کے تمام نقش و نگار پر دو قومیت کا پردہ ڈال دیا تھا اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد جو ثقافتی نقوش اُبھرے تھے ان کو رجعت پرستی کے پیروں سے مٹانا شروع کر دیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسلمان ہند آریائی ادب سے دُور ہو چکے تھے اور ہندو آرین کلچر سے متنفر نظر آنے لگے تھے۔ حسرت نے اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا صحت مند شعور پیدا کیا اور اسی کی بنیاد پر ادب کی عمارت کھڑی کی۔ ہند ایرانی تہذیب و تمدن
تعمیر

کا احیا کیا۔ دو کلچروں کے امتزاج سے جو نئے ثقافتی اقدار پیدا ہو چکے تھے اس کو اور آگے بڑھایا اور افتراق کی خلیج کو توانا کلچر اور صحت مند احساس کے ذریعہ پر کیا اور زبان کو واسطۂ اظہار ٹھہرایا۔ جس سے دو عظیم فرقوں میں پیدا کی ہوئی اجنبیت باقی نہیں رہی۔

حسرت کی ہندی شاعری کے پس منظر میں جنگ آزادی کی ایک طویل داستان ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں ان کے دِل کی خلش اور چبھن ہے جس جذبہ نے انہیں ہندی کلچر کے اپنانے پر اُبھارا ہے وہ جذبہ ایک ایک چھند سے اُبلا پڑتا ہے۔ اُردو شاعری پر سب سے بڑا الزام کبھی یہی عائد ہوتا تھا کہ وہ مقامی آب و رنگ کی آئینہ دار نہیں ہے۔ یہاں کی روایات اور معتقدات اس کی خصوصیات اور گرد و پیش کے اثرات کی ترجمان نہیں ہے۔ اس ایراد کی اس وقت تو کوئی اہمیت نہیں ہے مگر ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۹ء کے درمیانی زمانے میں اُردو کے مخالفین نے اسی کو آلۂ کار بنا کر عوامی زبان کی جڑ کھودنی شروع کر دی تھی۔ حسرت نے عوامی زبان کو اپنا کر اس میں مقامی آب و رنگ پیدا کر کے مخالفین اُردو کا منہ بند کر دیا تھا۔

حسرت کو صرف اپنے وطن ہی سے محبت نہ تھی بلکہ وہ ہندوستان کی معاشرت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور ہندوؤں کے مذہب، ان کے پیشواؤں اور ان کے مقدس تیرتھ گاہوں کو بھی عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ رواداری کی اس سے بہتر مثال دوسری شاید نہ مل سکے کہ متھرا کے مخصوص دِنوں میں سری کرشن جی کے درشن کو ہر سال یہ کہتے ہوئے جایا کرتے ؎

مسلکِ عشق ہے پرستشِ حسن ۔ ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

حسرت کی ہندی شاعری میں نیا ہندوستان جلوہ گر ہے۔ انہوں نے ہندوؤں کے مذہبی خیالات و عقائد کو اپنا کر وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

کہاں گئے موہے باوری بنائے کے ۔ باوری بنائے کے جھلکیا دِکھائے کے
آنسوؤں بھیج بیٹھی ہے سگری ۔ تڑکت رنگ بھبھوکا چنری
حسرت کون بتھا سب ہری ۔ آئے ستئے کہے شیام سے جائے کے

موسے چھیڑ کرت نند لال ۔ لئے ٹھاڑے ابیر و گلال
ڈھیٹھ بھئی جن کی برجوری ۔ اوروں پر رنگ ڈال ڈال (بقیہ بر صفحہ ۴۹)

باوا کرشن گوپال مغموم

سکائی لارک

——— انگلستان کے مشہور شاعر پی۔ بی شیلے کی شہرۂ آفاق نظم To a skylark کا منظوم اُردو ترجمہ

حبذا! اے رُوحِ راحت! اے پرندِ خوش نوا
تُو پرندہ ہی نہیں کہتی ہے یہ عقلِ رسا

کنجِ فردوسِ بریں سے نغمے برساتا ہے تُو
غیر فانی، دِل نشیں انداز میں گاتا ہے تُو

رِفعتوں پر تُو مثالِ شعلۂ آواز ہے
سوئے چرخِ نیلگوں تُو مائلِ پرواز ہے

ہو کے سرمستِ مے نغمہ اُڑا جاتا ہے تُو
دِل نشیں انداز میں اُڑتے ہوئے گاتا ہے تُو

تیرتا ہے صبح کے رنگیں شفق زاروں میں تُو
وہ، جہاں ہیں بادلوں کے ٹکڑے ہائے شعلہ رُو

رُوحِ عشرت سرخوشی میں جیسے ہو گرمِ سفر
ہے یُوں ہی تیری پَر افشانی ہوا کے دوش پر

تابشِ اختر ہو جیسے محوِ مہرِ ضو فشاں
دُور نظروں سے شفق کے رنگ میں تُو ہے نہاں

دیدۂ نظارہ جُو سے گرچہ تُو رُوپوش ہے
اب بھی لذت کش ترے نغموں سے میرا گوش ہے

مشعلِ نورِ قمر کی وہ سرور آگیں ضیا
کب سرور افزا ہے اتنی جس قدر تیری صدا

روشنی صبحِ صادق میں ہو جیسے گُم قمر
یُوں ہی تُو بھی ہے نہاں آنکھوں سے میری سربسر

مُرتعش ہے تیرے نغموں سے فضائے آسماں
کیف افشاں ہیں زمیں پر تیری نغمہ سنجیاں

ابر سے چھنتا ہو نُورِ ماہ جیسے رات کو
تیرے نغمے گُدگُداتے ہیں یُوں ہی جذبات کو

کون ہے تُو؟ آج تک یہ راز میں سمجھا نہیں
کِس سے دوں تشبیہ تُجھ کو؟ ذہن میں آتا نہیں

کب ہیں رنگیں اس قدر قطراتِ ابرِ لالہ رنگ
جس قدر رنگین و دِل کش ہے ترے نغموں کا چنگ

ایک شاعر کی طرح تیرا جہاں میں ہے وجود
جو تخیّل کے جہاں میں چھُپ کے ہو وقفِ سرود

ایک وہ شاعر کہ ہو بس نغمہ سنجی جس کا کام
اور جو ہو بے نیازِ عظمت و توقیر و نام

جیسے اِک دوشیزۂ عالی نسب، فُرقت نصیب
قصر کے مینار میں وقفِ ترنّم ہو غریب

اور اُس کا قصر ہو پُر از صدائے جاں گداز
کیفیت تیری وہی ہے مُطربِ نغمہ نواز

یا وُہ جگنو، شب کی تاریکی میں ہو جو ضَوفشاں
چھُپ کے دِل کش روشنی پھولوں پہ برساتا ہے جو
یا وُہ گُل ہو پتیوں کا جس کے ہر جانب حصار
پتیوں سے اُس کی وہ نِکلے شمیم دِل کُشا
فصلِ جوشِ گُل میں وہ ابرِ بہاراں کی پھوار
وہ شگوفہ ہائے رنگیں کے چٹکنے کی صدا
کچھ تو سمجھا رُوحِ عشرت! طائرِ رنگیں نوا
یہ کرشمہ عشق اور صہبا دِکھا سکتے نہیں
نالہائے ماتمی ہوں یا نوا ہائے نشاط
تیرے نغموں کے مقابل اُن کی کچھ وقعت نہیں
تیرے اس جذبے کی تحریکوں کا مخزن ہے کہاں
چرخِ نیلی کے کوئی طبقات ہیں پیشِ نظر
شائبہ غم کا نہیں جذباتِ عشرت میں ترے
تو مگر لذت کشِ صہبائے اُلفت ہی رہا
رات دِن ہم فانیوں کو موت سے ہے خوفِ جاں
زندگانی کے حقائق ہیں ترے پیشِ نظر
اپنی تو ماضی و مستقبل پہ رہتی ہے نگاہ
قہقہوں میں بھی ہے اپنے پہلوئے سوزِ نہاں
گر تکبّر اور نفرت کی ہمیں عادت نہ ہو
راز تیری شادمانی کا ہو ہم پہ آشکار
سارے نغموں سے ہے اِک نغمہ جُداگانہ ترا
کب تصانیفِ ادب میں ہے یہ لُطفِ بے کراں
تیری بہجت کا کھُلے مجھ پہ اگر آدھا بھی راز
جیسے میں سرمست و بے خود ہوں صداؤں سے تری

شبنمستاں میں ہوں پیدا جس کی ضَو سے بجلیاں
گھاس اور پتوں کی شبنم کو ہنسا جاتا ہے جو
صدمۂ صرصر سے ہو یک لخت جس کا انتشار
تِتلیاں ہو جائیں سرمستِ مئے راحت فزا
مینھ کے تھم تھم کر برسنے کی صدائے خوشگوار
سب صداؤں سے ہے بڑھ کر مجھ کو اِک تیری نوا
کون سے جذباتِ پنہانی ہیں تیرے رہنما
تیرے نغموں کا سرور و کیف لا سکتے نہیں
دِل پہ داغِ غم ہو جن سے یا ہو نقشِ انبساط
یہ کشش، یہ جاذبیت، یہ شبابیت نہیں
وہ بیاباں کس طرف کو ہے وہ گلشن ہے کہاں
لوٹ ہے یا رُوح تیری مزرعۂ زرخیز پہ
رنج کی ظلمت نہیں کُنجِ مسرت میں ترے
دِل ترا نا آشنائے رنجِ فرقت ہی رہا
جاگتے، سوتے ہے اِک اندیشۂ سود و زیاں
ورنہ کب ہوتے ترے نغمے مؤثر اس قدر
توسنِ حرص و ہوا پہ ہیں رواں شام و پگاہ
شادمانی کے ترانوں میں ہے تاثیرِ فغاں
بُزدِلی سے اشک برسانے کی گر فطرت نہ ہو
زندگی کے باغِ ویراں میں ہو رنگِ نوبہار
فطرتاً شاعر کا دِل ہوتا ہے دیوانہ ترا
سِحر ہے، جادُو ہے، افسوں ہے یہ اندازِ بیاں
تیرے نغموں کی طرح ہوں میرے نغمے بھی رواں
کُل جہاں مسحور ہو جائے نواؤں سے مری

نرملیش کمار شاد

سرقہ اور توارد

سرقہ اور توارد ہماری شاعری کی دو اصطلاحیں ہیں۔ دونوں عربی کے الفاظ ہیں اور لغوی اعتبار سے دونوں کے معنی میں فرق یہ ہے کہ سرقہ چوری اور دُزدی کو کہا جاتا ہے اور توارد باہم ایک جگہ اُترنے کے لئے یعنی شاعروں کے جزوی یا کُلی طور پر ایک ہی مضمون کو باندھنے کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے لغوی معنی کے اس تفاوت کے باوجود دُنیائے شعر میں عملی طور پر ان میں چنداں فرق نہیں ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف لب و لہجہ کا۔

چشمِ انصاف سے دیکھا جائے تو توارد بھی سرقہ ہی کی مہذب شکل دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرقہ اور توارد میں حدِ فاصل قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ مذاقِ سلیم کو معیار بنا کر اگرچہ ان میں امتیاز پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن مذاقِ سلیم کا اپنا معیار بھی تو بجائے خود واضح اور غیر مبہم نہیں ہے۔ کیونکہ مذاقِ سلیم بہرحال ایک انفرادی ذہنی عمل ہے اور مختلف اعلےٰ درجہ کے شاعرانہ مزاجوں میں بھی اختلاف کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

غزل میں بالعموم مصرعوں کا لڑجانا تو خیر اس لئے توارد کی ذیل میں آسکتا ہے کہ غزل کے اسلوب کے کچھ بندھے ٹکے سانچے مقرر ہیں اور ان سانچوں میں جب مختلف شاعر اپنے تاثرات ڈھالتے ہیں تو ان کے مصرعے اپنے آپ لفظ بلفظ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جیسے

فکرِ معاش، عشقِ بُتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے (سودا)

فکرِ معاش، عشقِ بُتاں، یادِ رفتگاں
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی (اقبال)

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
ان مشکلوں سے عہدہ بر آئی نہ ہو سکی (محرومؔ)

محبت میں اِک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر (سیمابؔ)

محبت میں اِک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی (جگرؔ)

فقط بہار میں پیتے ہیں ہم نہیں پیتے
کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد (نوحؔ)

گئے ہیں ہم بھی گلستاں میں بارہا لیکن
کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد (عدمؔ)

کبھی نہ اشک بہائے نہ آہ کی میں نے
بکھرنے دی نہ محبت کی روشنی میں نے (ادیب سہارنپوری)

تیرے حساب سے کتنی نباہ کی میں نے
بکھرنے دی نہ محبت کی روشنی میں نے (عدمؔ)

اگرچہ یہ ہم آہنگی صرف مصرعوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ غزل میں بندھے ٹکے سانچے کی وجہ سے اندازِ بیان کی خفیف سی تبدیلی کے ساتھ پورے کا پورا شعر بھی ٹکرا سکتا ہے اس لئے اس ٹکراؤ سے بھی سرقہ اور توارد کے سلسلہ

میں کوئی تشبیہ برآمد نہیں کیا جا سکتا جیسے

زیست کا اعتماد کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا (امیر مینائی)

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا (حالی)

تارے گنتے ہو شام سے شبِ ہجر
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی (داغ)

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی (عزیز لکھنوی)

خوشبو اڑا کے لائی نہ زلفِ نگار سے
مجھ کو شکائتیں ہیں نسیمِ بہار سے (اختر شیرانی)

لائی نہیں پیام کوئی زلفِ یار سے
مجھ کو شکائتیں ہیں نسیمِ بہار سے (سراج الدین ظفر)

اس ضمن میں جوش ملسیانی کے ایک مضمون "شعرا کے ذہنی ارتقا" کا یہ اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا:-

"ایک دوسرے سے دور صدہا میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے شعرا کے نتائج فکر کا لڑ جانا قابلِ تعجب نہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کسی رسالے میں یہ طرحی مصرع شائع ہوا تھا؂

اب اس کی آرزو ہے اور میں ہوں

اس زمین میں آٹھ دس شعرا کا مطلع یہ تھا:-

کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں
عدم کی آرزو ہے اور میں ہوں"

طرحی مشاعروں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ کئی شعرا کے مصرعے اور شعر محض چند الفاظ کے ہیر پھیر سے دوسرے شاعروں کے مصرعوں اور شعروں سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ اس تصادم کی ذمہ داری صرف قوافی اور بحر کی یکسانیت پر ہی عائد کی جا سکتی ہے۔ غزلیہ شاعری میں چونکہ ہر قافیہ ایک انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اور اس سے مخصوص خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات بیک وقت کئی شعرا کے ہاں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دو علیحدہ علیحدہ بحروں کے شعر بھی محض قافیہ کی یکسانیت کی وجہ سے باہم ٹکرا سکتے ہیں جیسے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (میر)

لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں
ہم کلیجے کو تھام لیتے ہیں (سید امام اثر)

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم زمین اور ہم قافیہ شعروں کے علاوہ جب مختلف زمینوں اور قافیوں میں بھی الفاظ اور بیان کے معمولی سے فرق کے ساتھ اشعار کے مضمون اور خیال لڑ جائیں تو کیا انہیں سرقہ قرار دیا جائے گا یا توارد جیسے

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا (میر)

پیری میں آئی موت جوانی گزر گئی
جاگا تمام شب میں دمِ صبح سو گیا (مصحفی)

بالیں پہ میرے گھر سے تو آوے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک (میر)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے (غالب)

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی (ذوق)

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں (غالب)

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا (مومن)

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا (ذوق)
کیسے عدم کے لوگ مسافر نواز ہیں
کوئی یہاں سے جا کے وہاں سے پھرا نہیں (آتش)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا (غالب)
تصدیق ہوئی دیکھ کے وہ قامتِ زیبا
سنتا تھا کہ فتنے ہیں قیامت کے سوا بھی (اکبر)

یہ کہہ کر جسم کا پشتارہ پھینکا روح نے آخر
مرے سر مفت کی آٹھوں پہر بے گار کیسی ہے (آتش)
اس مشقت سے اسے خاک نہ ہوگا حاصل
روح کیوں جسم کی بے گار لئے پھرتی ہے (خلیل)
اے اجل دی تو نے بارِ جسم سے آخر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا (ناسخ)

جو موت آئے تو پہچانے نہ مجھ کو
ہوا ہوں ہجر میں لاغر یہاں تک (جرأت)
لاغر ہوں اس قدر مجھے پہچانتی نہیں
رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک (امیر مینائی)

دونوں جہاں میں تو نہ سمائی ہوئی تری
اے حسنِ یار اب مرے دل میں سما کے دیکھ (جلیل)

کیا تماشا ہے مرے دل میں سمٹ کر آگیا
وسعتِ ارض و سما میں جو سما سکتا نہیں (جوش ملسیانی)

ہنگامِ ازل مجھ کو جو ساقی نے دیا تھا
اس جام کا ہے کیف ابھی تک مرے سر میں (صفی لکھنوی)
ایک ساغر پیا تھا روزِ اوّل
آج تک لڑکھڑا رہا ہوں میں (عدم)

ہمیں کچھ ہوش نہیں یہ تو سچ کہا لیکن
جھجک کے بات نہ کرتے اگر پئے ہوتے (مخشب جارچوی)
وہ پئے بھی تو اک جھجک سی رہی
کاش تھوڑی سی ہم پئے ہوتے (عدم)

ظاہر ہے کہ ان شعرائے کرام میں سے کسی پر یہ الزام عائد کرنا آسان نہیں کہ اس نے دوسرے شاعر کے شعر کا سرقہ کیا ہے۔ حالانکہ مذکورہ مثالوں سے کافی حد تک یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ اس مقام پر مجھے بے اختیار ایک امریکی شاعر اور مصنف ہالمس کی یہ بات یاد آرہی ہے کہ

Honest thinkers are always stealing unconciously from each other.

پھر بھی ہماری شاعری کی مہذب اصطلاح میں اس سرقہ کو توارد پر ہی محمول کیا جائے گا۔ دراصل اس سرقہ یا توارد کی بنیادی وجہ غزل کی صنف ہے جو غالب کے بقول ع بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

غزل میں وسعتوں کی ہزار گنجائش سہی، لیکن اس کی داخلی اور حقیقی فضا کے محدود ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اس فضا میں بڑے سے بڑا منفرد اور طباع غزل گو بھی سو فیصدی طبع زاد شعر نہیں کہہ سکتا۔ ہزار احتیاط اور کوشش کے باوجود وہ ایسے شعر کہنے پر مجبور ہوگا جن میں غزلیہ شاعری کی کوئی نہ کوئی روایت اپنے آپ ابھرے گی اور اس کے شعروں میں پہلے سے کہے ہوئے اشعار کی گونج واضح طور پر لہراتی ہوئی محسوس ہوگی۔

نہ صرف ایسا ہو سکتا ہے بلکہ جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک خیال جسے کوئی شاعر اپنی غزل کے کسی شعر میں پیش کر چکا ہے اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ کسی دوسرے شاعر کے ہاں بھی مل گیا جب کہ دونوں شاعر اپنی اپنی جگہ اسے اپنا اور محض اپنا تخلیقی کارنامہ قرار دیتے رہے۔

لہٰذا اس امر کے امکان سے تو کسی طرح انکار ممکن نہیں کہ ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی فضا اور داخلی اور باطنی کیفیت جس میں کوئی شاعر اپنے کسی نفسیاتی عمل یا تجربے کو شعر کا رُوپ بخشتا ہے وہی فضا اور کیفیت اسی عمل اور تجربے کی آنچ کے ساتھ پھر کسی شاعر کے دل و دماغ پر طاری ہو کر اسے بھی اسی قسم کے شعر کی تخلیق پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر غزلیہ شاعری میں سرقہ اور توارد دونوں ہم معنی یا بے معنی ہو جاتے ہیں لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاعروں کا آپس میں ایک دوسرے سے متاثر ہونا عین فطری اور ارتقائی تقاضا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہر دَور میں ہر شاعر اپنے پیش رَو اور ہم عصر شعرا سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ خواہ یہ اثرات اس نے شعوری طور پر اپنائے ہوں یا غیر ارادی طور پر اس کی شاعری میں در آئے ہوں۔ بہرکیف میرؔ و غالبؔ سے لے کر آج کی نسل کے شاعروں تک دوسروں کے اثرات کی پرچھائیاں واضح اور نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

نہایت مشہور اور صاحبِ طرز اُردو شاعروں نے فارسی شعرا سے دیدہ و دانستہ بے حد و حساب استفادہ کیا ہے اور اپنے اُردو شعروں میں فارسی شعروں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا ہے۔ نہ صرف ایرانی شعرا کے کلام کا ترجمہ کیا ہے بلکہ اُردو شاعروں نے تو ہندوستان کے فارسی شعرا کا کلام بھی اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ ایسی بے شمار مثالوں سے قطع نظر میں صرف اُردو کے نامور قدیم و جدید شعرا کے اشعار کی چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر دوسرے شاعروں کے گلدستۂ کمال سے خوشہ چینی کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض نے استفادہ کرتے ہوئے اصل شعر کی نسبت اپنے شعر کو اپنی انفرادیت کی طرفہ کاری سے زیادہ چمکا دیا ہے (انفرادیت کی طرفہ کاری کا راز بھی غزلیہ شاعری میں زیادہ تر اسلوب ہی میں مضمر ہے) اور اپنے پیش رَو کے مقابلے میں اپنے شعر میں زیادہ دل کشی پیدا کر لی ہے اور بعض کے خام اور ناقص اسلوب کی وجہ سے ان کی بھونڈی نقالی کو اصل شعر کا مُنہ چڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان دونوں قسم کے شاعروں میں جو فرق ہے درحقیقت وہی سرقہ اور توارد کے معنی میں ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں عرض کیا کہ توارد اور سرقہ میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر ان میں لب و لہجہ کی پختگی اور خام کاری کا پردہ حائل نہ ہو تو عملی طور پر یہ مترادف الفاظ ہیں۔

چراغ سے چراغ تو ہر دَور کے تقریباً ہر قسم کے شاعر نے جلایا ہے لیکن خام کار نے جب جلایا اور اس کی خام کاری آڑے آ گئی تو اس پر سرقہ کا اطلاق ہو گیا اور ذہین اور مشّاق شاعر نے یہ کام کچھ ایسی گمبھیرتا اور لطافت سے کیا کہ اس کے سرقہ پر بھی توارد کا گمان ہونے لگا۔

دونوں قسم کے شاعروں کی چابک دستی اور دست درازی کو واضح کرنے کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں اور اگر تلاش کی جائے تو پرانے اور نئے شعرا کے دواوین میں ایسی اور بھی کئی مثالیں دست یاب ہو سکتی ہیں۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ گئی یہ آگ ناگاہی کہ سب گھر پھُک گیا (میرؔ)

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا (غالبؔ)

کو گُل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا (میرؔ)

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالبؔ)

ناحق سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا
لہو لگا کے یہ بھی شہیدوں میں مل گیا (میر)
گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا (ذوق)

مت جانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دین
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا (میر)
جھوٹ ہی جانوں کلام اس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آوے اگر قرآن کا (ذوق)

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی
ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں بہت کام مجھے (میر)
رات دن رونا تڑپنا، تلملانا، پیٹنا
ہیں تو ہم ناکام پر رہتا ہے کاموں کا ہجوم (امیر مینائی)

کیا کہوں میں میر اپنی سرگذشت
ابتدا ہی قصے میں وہ سو گیا (میر)
آپ کو نیند آئی جاتی ہے
ختم ابھی دل کی واردات نہیں (جوش ملیح آبادی)

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں (میر)
میرے سکوتِ یاس پہ اتنا نہ ہو ملول
مجھ کو خدانخواستہ تجھ سے گلا نہیں (فراق گورکھپوری)

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے (غالب)
سب تمنائیں ہماری مر چکیں
ایک مرنے کی تمنا رہ گئی (جوش ملسیانی)

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں (ظہیر دہلوی)
کچھ غمِ عشق بھی کر دیتا ہے مجنونِ عدم
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں (عدم)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے (آتش)
سایہ بہت ملے گا درختوں کی راہ میں
گھر سے نکل کے دھوپ میں کچھ اور جل کے چل (حفیظ جونپوری)

پینے سے کام رکھتے ہیں رندِ سیاہ مست
کمبل ہی تان لیں گے جو ابرِ کرم نہیں (جلال)
فقیر مست کسی فصل کے نہیں پابند
پئیں گے تان کے کمبل سحاب ہو کہ نہ ہو (حفیظ جونپوری)

کیا کہیے کسی طرح سے جوانی گذر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی (داغ)
دو روز میں شباب کا عالم گذر گیا
بدنام کرنے آیا تھا بدنام کر گیا (حفیظ جالندھری)

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں (حالی)
بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں! (جوش ملیح آبادی)

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا (فانی بدایونی)
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں (جگر مرادآبادی)

مصیبت اور لمبی زندگانی
بزرگوں کی دُعا نے مار ڈالا (مضطر خیر آبادی)

میرے بزرگ کہہ گئے عمرت دراز باد
میری شرارتوں کی سزا دے گئے مجھے (حفیظ جالندھری)

دِل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اِک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں (سیماب اکبر آبادی)

بِلا نہ دِل کا کوئی قدر داں زمانے میں
یہ شیشہ ٹوٹ گیا دیکھنے دِکھانے میں (قیصری فیروز پوری)

جیسے دوزخ کی ہوا کھاکے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکّار ڈراتا ہے مجھے (یاس یگانہ)

کچھ اس انداز سے تشریح فرماتے ہیں دوزخ کی
کہ جیسے حضرتِ واعظ وہیں کے رہنے والے ہیں (سرشار سیلانی)

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری (اقبال)

ایسی محفل میں آگیا ہوں جہاں
بولنے کو زباں ترستی ہے (ساحر ہوشیار پوری)

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسّم کا جواب
پھُول کھِل کر بھی حریفِ رُخِ جاناں نہ ہوا (اختر شیرانی)

برقِ چمک کے بھی اس حُسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھُول کھِل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا (جگن ناتھ آزاد)

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو مگر ہے پاسِ شباب پہلے
حساب ہوتا رہے گا یا ربّ ہمیں منگادے شراب پہلے
(اختر شیرانی)

طلوعِ حشر ہے یا ربّ یہ جلد بازی کیا
شراب پی لیں ذرا ہم حساب دیتے ہیں (عدم)

چمن میں گریۂ شبنم غلط سہی لیکن
سوال یہ ہے کہ پھُولوں کو کیوں ہنسی آئی (احسان دانش)

چمن میں کون تھا پُرسانِ حالِ شبنم کا
غریب روئی تو پھُولوں کو بھی ہنسی آئی (عرش ملسیانی)

چل اے غمِ دوراں درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے کوئی بات کریں گے (عدم)

مے خانہ بہت دُور نہیں دیدۂ نم سے
چل اے غمِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا (قتیل شفائی)

فقط زخمِ نظارہ حصّہ مرا
بہاریں تری آشیانے ترے (عدم)

گلشن بھی ترا اور بہاریں بھی تری ہیں
آزاد کا حصہ ہے فقط زخمِ نظارہ (جگن ناتھ آزاد)

آخر میں، اس سلسلہ میں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اسے سرقہ قرار دیا جائے یا توارد، متاثر ہونا کہا جائے یا استفادہ کرنا۔ پر ایسے تفکر یا تاثر کی شراب کو اپنے الفاظ و بیان کے آبگینے میں آتارنے کی کوشش شعوری یا اِرادی سمجھی جائے یا محض اتفاق پر محمول کی جائے، اسے معیوب ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر یہ معیوب ہے تو اُن شاعروں کے لئے جن کی قوتِ اظہار کمزور ہے اور جو زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کا بھرپُور شعور نہیں رکھتے۔ یہاں تو میں نے اُردو شاعروں میں محض غزل گو شاعروں ہی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن اگر وسعتِ نظر سے کام لے کر دیکھا جائے تو دُنیا بھر کی شاعری میں ایسی ایک آدھ نہیں، کئی مثالیں مِل سکتی ہیں جو ایک زبان یا ایک مُلک ہی کے نہیں بلکہ مختلف اَدوار اور مختلف لِسانی ماحول میں پلے ہوئے شعرا کو بھی نقّال اور سارق بنانے کے لئے کافی ہیں۔

غزل

حدیثِ غم بھی نہیں حرفِ مدعا بھی نہیں
ہماری بات سزاوارِ اعتنا بھی نہیں

جبیں خراج اُسے دے تو ناروا بھی نہیں
وہ ایک شخص جو بُت بھی نہیں خدا بھی نہیں

ابھی تو اور بھی نکھرے گی انتظار کی رات
ابھی تو لب پہ کوئی آہِ نارسا بھی نہیں

کہاں سے لائیں گے اہلِ حرم مذاقِ سجود
مری جبیں بھی نہیں تیرا نقشِ پا بھی نہیں

کسی غریب کی تقدیر بن گئی آخر
وہ اِک ادا جو تجاہل نہیں حیا بھی نہیں

کہاں کے لطف و کرم کیسی دل دہی تاباںؔ
مرے لئے تو ستم ہائے برملا بھی نہیں

●

"ہوس تہ حاصِل" — ایک اہم تجربہ

۸ جون کو محکمہ اطلاعات کے کلچرل یونٹ کی طرف سے جو پروگرام پیش کیا گیا، میں اسے اپنی تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود کشمیر کی تمدّنی تاریخ میں ایک اہم تجربہ سمجھتا ہوں اور یہ دیکھ کر مجھے مسرّت ہوئی ہے کہ ایک سرکاری ادارے کی طرف سے اس قسم کے جرأت مندانہ تجربات کا آغاز کیا گیا ہے۔ ہم جب اپنے یہاں کی روایات اور شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی تمدّنی روایات عظیم ہیں اور یہ کہ ہمارا ماضی اس اعتبار سے شاندار رہا ہے لیکن ابھی تک ہم تحقیق اور تنقید کو جذبۂ حبّ الوطنی کی گرفت سے آزاد نہیں کر پاتے ہیں۔ جب کبھی اپنی روایات کو آگے بڑھانے یا اپنے تمدّنی وِرثے میں کوئی اضافہ کرنے کی تجویز پیش ہوتی ہے تو ہماری تمام تر توجّہ اس بات پر صرف ہو جاتی ہے کہ کہیں اس سے ہماری مقدّس تمدّنی میراث میں کسی قسم کی تحریف تو نہیں ہو پاتی۔ نتیجہ یہ کہ ہم آزادی کے بارہ سال کے بعد بھی اس میدان میں وہیں ہیں جہاں آزادی سے پہلے تھے۔ میں کلچرل یونٹ کے پیش کردہ پروگرام کو اس اعتبار سے ایک حوصلہ افزا اور جرأت مندانہ تجربہ سمجھتا ہوں کہ یہ یہاں کی کلچرل روایات کو آگے بڑھانے کی ایک صحت مند کوشش ہے۔ سب سے پہلے میں اس بیلے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کلچرل یونٹ کے فن کاروں نے "ھوَس تہ حاصِل" کے نام سے پیش کیا۔ فنّی اعتبار سے اسے بیلے کہا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے اور کلچرل آفیسر نے ابتدا ہی میں بتایا کہ کشمیر میں بیلے کی کوئی روایات نہیں ہیں اور ہم جس چیز کو بیلے کے نام سے پیش کر رہے ہیں اسے تعبیر

بیلے کے مقرّرہ معیاروں سے نہیں جانچا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ "ہوس تہ حاصِل" کو فنّی اعتبار سے بیلے کہنا صحیح نہیں، لیکن یہ بیلے کی تیکنیک اپنانے کی ایک اچھی کوشش ضرور ہے۔ سب سے پہلے "ہوس تہ حاصِل" کے موضوع کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ اس کا موضوع کشمیری کسان کی محنت اور اس کی جد و جہد ہے۔ مظفر عازم نے جس حسن اور سلیقے سے اس موضوع کو شعریت کا لباس پہنایا ہے وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ اس موضوع کا انتخاب بجائے خود قابلِ داد ہے اور پھر اس کا شعری پیکر کشمیری شاعری میں ایک اہم اور خوش گوار اضافہ ہے۔

کشمیری موسیقی کو عام طور پر حزن و ملال کی موسیقی کہا جاتا ہے۔ اور کشمیر اور بیرونِ کشمیر میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کشمیری موسیقی کی ابتدا بھی چھکری ہے اور انتہا بھی چھکری — اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ صوفیانہ کلام ہے جسے صوفی لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ خیال بہت حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ موسیقی میں کسی قسم کا تجربہ کرنے میں ہم نے خاص طور پر احتیاط برتی ہے۔ ریڈیو کشمیر کے تجربوں نے بہت حد تک ہمارے ہاں کی موسیقی کی یکسانیت کو ختم کر دیا۔ لیکن یہ تجربہ اپنی نوعیت اور کردار کے اعتبار سے بہت محدود تھا۔ "ہوس تہ حاصِل" کی موسیقی اس میدان میں ایک اہم قدم ہے۔ مجموعی طور پر "ہوس تہ حاصِل" کی موسیقی اتنی جاندار اور متنوع ہے کہ اس کی ترتیب دینے والوں کو مبارک باد دی جانی چاہیئے۔ اس میں صرف ایک منظر میں چھکری پیش کی گئی ہے اور ان لوگوں کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں جو کشمیری موسیقی کو صرف چھکری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ شروع سے آخر تک موسیقی سنیے "ہوس تہ

حامِل " میں جو زیر و بم قائم کیا ہے اس نے جہاں کشمیری موسیقی کو ایک تنوع دیا ہے وہاں بیلے میں ایک جان ڈال دی ہے۔

کرداروں کے لباسوں کے متعلق یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سٹیج کے لئے شوخ رنگوں کا ہونا بہت ضروری ہے اور عام طور پر ہمارے ہاں کسان کا تصور صرف "فرن " پہنے ایک نحیف و نزار انسان کا ہی ہوتا ہے۔ "ہوس تہ حامِل " میں کسان کو جن ملبوسات میں پیش کیا گیا تھا وہ ہو سکتا ہے کہ Authentic نہ ہوں، لیکن Visual effect کے لئے جدید سٹیج میں اس قسم کے شوخ رنگ استعمال کرنا ضروری ہے اور پھر کشمیری کسان کو " فرن " کے لبادہ کی بجائے کرتے اور شلوار میں پیش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ لباس میں یہ تبدیلی خوشگوار بھی ہے اور ایک اہم ضرورت بھی!

مختلف کرداروں کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کی اداکاری اور نغمہ و موسیقی کے ساتھ ان کی ہم آہنگی تسلی بخش نہیں تھی۔ اس پر مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض کردار غیر معمولی طور پر سٹیج conscious تھے۔ روشنیوں کا انتظام خاطر خواہ نہیں تھا اور سٹیج کی سیٹنگ بے جان اور کئی جگہوں پر بے ہنگم تھی۔ سادہ اور مختصر سیٹنگ استعمال کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔

تمام فنی خامیوں کے باوجود میں "ہوس تہ حامِل " کو ایک کامیاب تجربہ سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی نمائش شہر تک محدود نہیں رہنی چاہیئے بلکہ دیہات کے لوگوں میں یہ بہت زیادہ مقبول ہوگا۔ محکمۂ اطلاعات کو اس کی نمائش دیہات میں ضرور کرنا چاہیئے۔ لوک ناچ کی نئی ترتیب کے بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں کا لوک ناچ "بچہ نغمہ " اتنا روائتی ہو کر رہ گیا ہے کہ اب اس میں کوئی جان باقی نہیں رہی ہے اور پھر اس میں کسی قسم کے ضبط و نظم کا فقدان ہے۔ ہر رقاص اپنی "من مانیاں" کرتا ہے۔ کلچرل یونٹ کی طرف سے اس ناچ کو جو System دیا گیا ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ رقص سے متعلق میری معلومات محدود ہیں، لیکن میں نے ذاتی طور پر یہ ضرور محسوس کیا کہ ڈانس میں ایک Rhythm اور ایک تعمیر

کوشش ضرور ہے جو کشمیر کے دیہات میں بھی اور کشمیر کے باہر بھی اس ناچ کو مقبول بنا سکتی ہے۔ لوک ناچ میں اس قسم کی تعریف اور اس قسم کا تنظیم جائز ہے یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے۔ لیکن کشمیر کے لوک ناچ "بچہ نغمہ " میں اصلاح کی بے حد ضرورت ہے اور کلچرل یونٹ نے اس کا احساس دلا کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ کشمیر کے رقاصوں نے مردانہ لباس زیبِ تن کیا تھا اور اس طرح اس بدعت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ایک لڑکا زنانہ لباس پہن کر رقص کرتا ہے۔ اس طور سے یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے جس کے لئے کلچرل یونٹ مبارک باد کا مستحق ہے۔

کلچرل یونٹ سے زیادہ یہ کام ریاست کی کلچرل اکاڈمی کا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل یونٹ نے جس کام کی ابتدا کی ہے اُسے اکاڈمی کو آگے بڑھانا چاہیئے۔

تعلیم عوام کے لئے

- دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے چار برسوں میں تعلیمی ترقی کے میدان میں مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں :-
- ۴۸-۱۹۴۷ء میں تعلیم پر صرف ۲۳ء۴۷ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے تھے جبکہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۶۲ء۴۹ لاکھ روپے صرف کئے جا رہے ہیں۔
- ریاست میں ۱۱۱۸ بیسک ایجوکیٹی سکول قائم کئے جا چکے ہیں اور منصوبہ کے اختتام تک ان سکولوں کی تعداد ۱۵۰۰ تک پہنچ جائے گی۔
- ۷۵ پرائمری سکولوں کو بیسک ایجوکیٹی سکولوں میں منتقل کیا جا چکا ہے اور ۶۱-۱۹۶۰ء میں مزید ۷۵ پرائمری سکولوں کو بیسک ایجوکیٹی اسکولوں کا درجہ دیا جائے گا۔
- چار پوسٹ میٹرک تربیتی اسکول کھولے گئے ہیں اور سات ریفریشر کورس کلاس منعقد کئے گئے تاکہ مقامی اساتذہ ہند کے دوسرے حصوں کے تعلیمی طریقوں سے فیض یاب ہو کر یہاں تعلیم کو بہتر بنا سکیں اور موجودہ زمانے کے تازہ ترین تعلیمی رجحانات اور میلانات سے باخبر ہو سکیں۔
- سرینگر میں ایک پالی ٹیکنیک ادارہ قائم کیا گیا جس میں ۱۲۰ طلبا تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

جی ڈی شرما
پرنسپل انفارمیشن آفیسر

لداخ کی بدلتی فضائیں

بودھ تہذیب وتمدن کا ایک قدیمی مرکز لداخ، جو کہ صدیوں سے ریاست کا ایک پس ماندہ اور پچھڑا ہوا علاقہ رہا ہے، آج ایک نئے انداز سے انگڑائی لے رہا ہے۔ ایک ایسی مخمور انگڑائی جس میں آنے والے کل کی تابناکی، پہاڑی عزائم کی توانائی اور منزل پالینے کی تڑپ رچی بسی ہوئی ہے۔

ضلع لداخ وادیِ کشمیر کے شمال ومغرب میں کوہ ہمالیہ اور کیون لیون کی آغوش میں ۹ ہزار سے ۲۴ ہزار فٹ بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ عام طور پر یہ سارا علاقہ پہاڑی ہے۔ یہاں سالانہ دو انچ سے تین انچ تک بارش ہوتی ہے اور لوگوں کا سب سے اہم پیشہ زراعت ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۰ ہزار مربع میل اور آبادی ۸۰,۰۰۰ ہے۔ لوگ مختلف نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑے امن پسند، سادہ اور مشاق ہیں۔ صدیوں سے ان کے رسم و رواج میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

یہ سرحدی ضلع لیہہ اور کرگل کی تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ لیہہ کی تحصیل میں ۱۰۰ گاؤں ہیں جب کہ تحصیل کرگل میں ۱۲۷ دیہات ہیں۔ کرگل تحصیل کے دیہات میں سے دراس، کرگل، بدھ کھربو اور گارکن اور لیہہ کے تحصیل کے گاؤں میں سے لامایارو، کھلسی، شپول، نرولا، نمو، چیری، پھیانگ، نکر، سابو، سکتی، چھوڈ، ہمس، مٹسک، ماٹھو ڈشکٹ، پانامک، چشول اور پادام کی جگہیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ضلع لداخ سطح سمندر سے نو ہزار سے ۲۴ ہزار فٹ تک بلند ہے۔ لداخ کی ہیئت ترکیبی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے شمال ومغرب اور شمال ومشرق میں سلسلہ ہائے کوہ دُور دُور تک ایک دوسرے کے متوازی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلے جہاں دریاؤں کے رُخ متعین کرتے ہیں وہاں ان کی بدولت ضلع کی قدرتی حد بندی بھی ہوئی ہے۔ لداخ کی آب وہوا اجتماعِ ضدین ہے۔ یعنی گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد۔

ضلع کی قابل کاشت زمین کا کُل رقبہ ۴۱۲۰۴ ایکڑ زمین ہے۔ چونکہ یہاں سالانہ تین انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی ہے اس لئے آبپاشی کے بغیر یہاں کوئی فصل کاشت نہیں کی جاسکتی ہے۔ قابل کاشت اراضی کا ایک ایک انچ اُن زمین داری کوہوں سے سیراب ہوتا ہے جو سندھ اور دوسرے دریاؤں یا برفانی پانی کے ذخیروں سے نکالی گئی ہیں۔ تحصیل لیہہ دریائے سندھ، شیوک، نوبرا اور زانسکار کی پانیوں سے آبپاشی ہوتا ہے۔ اور تحصیل کرگل دریائے سورو، دراس اور سندھ سے سیراب ہوتا ہے۔ تحصیل لیہہ میں دو بڑی وادیاں ہیں جب کہ کرگل کی تحصیل میں صرف دو بڑی وادیاں ہیں۔ لیہہ کی وادی سندھ کو، جو کہ تقریباً ۷۰ میل لمبی اور اوسطاً چار میل چوڑی ہے ½ ۱۸۸ فٹ بلند درّہ چانگا جنوب ومشرق میں وادیِ چشول سے علیحدہ کردیتا ہے اور ۱۸۳۰۰ فٹ اونچے کھردنگ اور دیگر درّے وادیِ لیہہ کو شمال ومشرق میں نوبرا وادی سے جُدا کردیتے ہیں اور ½ ۱۲ فٹ درّہ فتولا لیہہ کو کرگل سے الگ کرتا ہے۔ لداخ کے لوگ صحت مند، مضبوط اور محنتی ہیں۔ لیکن تاہم وہ فی ایکڑ زمین سے ۵ من سے زیادہ پیداوار حاصل نہیں کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کی زمین ریتلی ہے اور کھاد کافی ڈالنی پڑتی ہے۔ اس ضلع کی ہمہ جہت ترقی کے لئے تین چیزیں شرطِ اوّلین کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک سڑکوں کی توسیع وترقی، دوسرے آب پاشی کی سہولیات

کی فراہمی اور تیسرے جنگلات اُگانے کی زور دار مہم۔

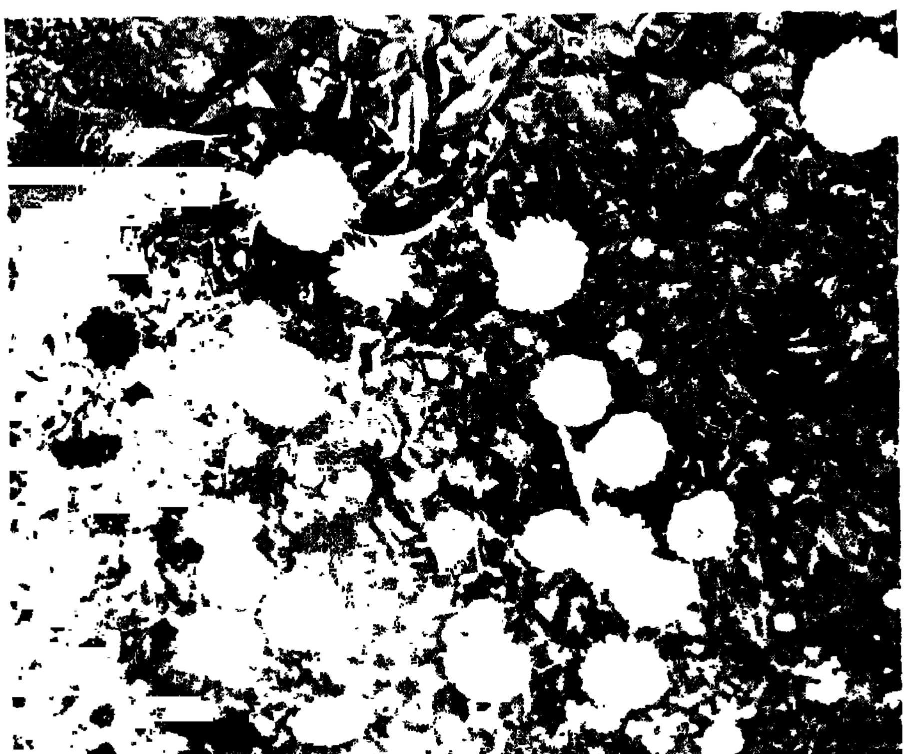
حکومت ان تینوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ ۱۵۰ میل لمبی لیہہ کرگل سڑک کو تیزی سے مکمل کرنے کی جانب خاص دھیان دیا جا رہا ہے۔ سڑک قریب قریب تیار ہے، صرف کھلسی اور لامایارو کا پندرہ میل لمبا درمیانی قطعہ نامکمل ہے۔ سڑک کے اس حصے میں اڑھائی میل تک کھدائی ہو رہی ہے۔ توقع ہے کہ راستہ کا یہ نامکمل حصہ بھی کچھ دنوں تک مکمل ہو جائے گا اور اس طرح یہ سڑک عنقریب ہی آمد و رفت کے قابل بن جائے گی۔ اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ کہیں سردیوں میں سڑک پر ۱۳،۴۰۰ فٹ بلند فتو لا اور ۱۲،۲۰۰ فٹ اُونچا نامیلا کی موجودگی میں ٹریفک معطل نہ ہو جائے۔ لیکن انجینئروں کا خیال ہے کہ سڑک ہر سال کم سے کم دس مہینوں کے لئے آمد و رفت کے لئے کھُلا رکھی رہے گی۔ ضلع کے صدر مقام اور بودھ تعلیمات کے ایک اہم مرکز لیہہ کو پہلے ہی ہمیس کے ساتھ ایک جیپ سڑک کے ذریعہ مِلا دیا گیا ہے۔ ہمیس لیہہ سے چوبیس[۲۴] میل دُور ہے اور یہ بودھوں کے ایک قدیمی خانقاہ کے لئے مشہور ہے۔ اسی طرح چشول کے راستے پر دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ایک اور اہم گاؤں کو بھی چودہ میل لمبے راستے کے ذریعہ مِلا دیا گیا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے حال ہی میں اس سڑک کو رضاکارانہ تعاون سے آٹھ میل دُور سکتی کے مقام تک وسعت دی ہے۔ محکمہ رفاہِ عامہ کے سامنے تجویز ہے کہ اس سڑک کو چیانگلا کے دامن تک پہنچانے اور پھر اسے درّے کے اُوپر سے لے جا کر چشول تک پہنچایا جائے۔ اس کے علاوہ محکمہ دیہات سُدھار کے اہتمام میں چشول کے لوگوں نے "اپنی مدد آپ کرو" کی مہم کے تحت چشول سے دِن کنائی کے جہاں سے ہند و تبت سرحد صرف اٹھائیس میل دُور ہے راستے پر ایک اہم پڑاؤ زاکالا تک ایک بیس میل لمبی سڑک تیار کی ہے۔ لیہہ سے کھرڈنگلا کے دامن گینگلز تک چھ میل سڑک تیار کی گئی ہے جو کہ وادیٔ لیہہ کو نوبرا کی وادی سے جُدا کرتی ہے۔ آج کل وادیٔ نوبرا میں تھوسے سے ڈسکٹ تک چودہ میل لمبا راستہ تعمیر کرنے کے لئے ایک ہزار انسانی رضاکارانہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ سڑک آئندہ مہینے کے

تعمیر

اندر اندر مکمل ہو جائے گی۔ محکمہ دیہات سُدھار کے سامنے لیہہ کو ماتھو، سٹوک اور پھیانگ کے ساتھ مِلانے کی بھی تجویز ہے۔ محکمہ رفاہِ عامہ نے تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران علاقہ میں ذرائع نقل و حمل کو توسیع دینے کے بارے میں جو پروگرام مرتب کیا ہے اُس کے مطابق نوبرا اور چشول کو لیہہ سورو اور زانسکار و سراپ چو کو کرگل کے ساتھ مِلا دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ آئندہ پانچ برسوں میں علاقہ میں سڑکوں کا ایک جال بچھا دیا جائے گا۔ اس طرح ان دِقتوں پر بہت حد تک قابو پا لیا جائے گا۔ جو اس علاقہ کی ترقی کی راہ میں صدیوں سے حائل تھیں۔ دریاؤں پر پُل تعمیر کرنا، سڑکوں کو توسیع و ترقی دینے سے کچھ کم اہم نہیں۔ سالِ رواں کے دوران اس علاقہ میں چھ عارضی اور دو لکڑی کے پُل بنانے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ دریائے سندھ پر الچی اور مارشیلانگ کے مقامات پر بھی دو لاکھ تین ہزار روپے کی لاگت سے دو پُل بنائے جائیں گے جو کہ علی الترتیب ۱۳۰ اور ۱۴۰ فٹ لمبے ہوں گے۔ اسی طرح زانسکار پر ٹینگ زنگ کی جگہ پر تین لاکھ روپے کے خرچ سے ۱۳۰ فٹ لمبا پُل تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۵ لاکھ ۳۵ ہزار روپیہ کے خرچ سے دریائے سورو پر گیا لنگ اور گیا لنگ کتا پا اور کانیار کے مقامات پر تین اور پُل بنائے جائیں گے جن میں سے پہلے دو پُل ۱۳۶ اور تیسرا پُل ۱۱۰ فٹ لمبا ہو گا۔ اس کے علاوہ دریائے دراس پر پالیو کے نزدیک ۲۰ ہزار روپے کی لاگت سے ایک اور پُل بنایا جائے گا۔

ضلع میں گذشتہ پانچ سال کے دوران ضلع ہسپتال کے لئے ایک، سکولوں کے لئے ۱۴، اور دواخانوں کے لئے ۲ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سالِ رواں میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے لئے عمارت تعمیر کی جائے گی۔ پولیس سٹیشن کے لئے بلڈنگ، ڈپٹی کمشنر کے عملہ کے لئے رہائشی کوارٹر اور انجینئرنگ سٹاف کے دفتر کے لئے عمارت پر کام جاری ہے۔ اس کے علاوہ لیہہ کرگل روڈ پر نصف درجن کے قریب انسپکشن بنگلے بنائے جا رہے ہیں۔







جالنا هو رو حمن دو چلے -





پروفیسر ایم اے حفیظ

تاج محل

ساحر لدھیانوی اور ان کے ہم خیالوں سے معذرت کے ساتھ ——

شمع کا نور کہ سوزِ دلِ پروانہ کہوں　　دیدۂ شوق کہوں جلوۂ جانانہ کہوں
آبِ کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ کہوں　　دودھ کی نہر کہوں کرنوں کا شانہ کہوں
حسن کی شان میں یا عشق کا نذرانہ کہوں
اے حسیں تاج میں کیونکر ترا افسانہ کہوں

شکلِ مرمر میں تو کوئی بتِ مرمر تو نہیں　　چاندنی شب میں کوئی حورِ لب جو تو نہیں
جس کا کچھ نام نہیں ہے تو وہ خوشبو تو نہیں　　عشق کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو تو نہیں
کارنامہ ہے فرشتوں کا کہ انسانی ہے
اہلِ عالم کو تجھے دیکھ کے حیرانی ہے

تیرے محراب کو ابروئے حسینہ کہیئے　　تیرے مینار کو فردوس کا زینہ کہیئے
جس کا ثانی نہیں کوئی وہ نگینہ کہیئے　　لبِ جمنا تجھے چاندی کا سفینہ کہیئے
ذرہ ذرہ سے ترے بوئے وفا آتی ہے
دیکھ کر تجھ کو نگاہوں میں حیا آتی ہے

سحر صناعی ہے تخلیق کا اعجاز ہے تو　　جانے کس شوخ کی انگڑائی کا انداز ہے تو
کسی شاعر کے تخیل کا حسیں راز ہے تو　　فکرِ فن کار کی یا آخری پرواز ہے تو
شمع ضوبار ہے، انوار کا گنجینہ ہے
چاند منہ دیکھے ہے جس میں تو وہ آئینہ ہے

ایک شعلہ سا لپکتا ہے ابھی تک تجھ میں　　کوئی گل ہے کہ مہکتا ہے ابھی تک تجھ میں
شاہ کا پیار چمکتا ہے ابھی تک تجھ میں　　دلِ ممتاز دھڑکتا ہے ابھی تک تجھ میں
سینکڑوں سال ہوئے تیرا لشاں باقی ہے
تیری رعنائی ترا حسنِ جواں باقی ہے

سینۂ ارض پہ اِک نقشِ حسیں کہیئے تجھے — چاند کا رُوپ ستاروں کی جبیں کہیئے تجھے
مطلعِ مہر سرِ عرشِ بریں کہیئے تجھے — کعبۂ ذوقِ نظر خُلدِ یقیں کہیئے تجھے

صرف دولت کا نہ اُلفت کا پتہ چلتا ہے
تجھ سے فن کار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے

عمر گذری ہے مگر تیری جوانی اب بھی ہے — تجھ میں محفوظ محبت کی کہانی اب بھی ہے
خونِ مزدور کی رگ رگ میں التہاب بھی ہے — اور تو شوکتِ شاہی کی نشانی ابھی ہے

کیا حسیں رابطۂ شام و سحر ہے تجھ میں
شاہ کے ساتھ ہی غربت بھی ابھرے تجھ میں

چشمِ عبرت سے کہ حسرت کی نظر سے دیکھے — کیوں تجھے کوئی حقارت کی نظر سے دیکھے
آرٹ اور اُس سے محبت کی نظر سے دیکھے — چاہیئے یہ تجھے صنعت کی نظر سے دیکھے

یہ مُنقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اپنے معمار کا کیوں آخر اُڑائیں گے مذاق

اَن گنت لوگوں نے سپنا تِرا دیکھا ہوگا — دِل میں کتنوں نے تِرا خاکہ بنایا ہوگا
مقبرہ ایسا بنے کتنوں نے چاہا ہوگا — چاہنے ہی سے مگر تاج بنا کیا ہوگا

حُسن اور عشق ملے دولت و تدبیر ملی
تب زمانے کو کہیں جاکے یہ تعمیر ملی

ریاست جموں و کشمیر ترقی کی شاہراہ پر

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں :-

(۱) ۴۸-۱۹۴۷ء میں تعلیم پر صرف ۳۳ء۴۷ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے تھے جبکہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۶۲ء۹۴ لاکھ روپے صرف کئے جا رہے ہیں۔
(۲) ریاست میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا ہے۔
(۳) زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے ۳۱ء۲ لاکھ من کھاد تقسیم کی گئی
(۴) دوگلا مکئی کے بیجوں کی پیداوار کے لئے ۳۴ فارم قائم کئے گئے۔
(۵) چھ لاکھ سے زائد پھل دار پودے زمین داروں میں تقسیم کئے گئے۔
(۶) پھل دار پودوں کی ۵۴ نرسریاں قائم کی گئی ہیں۔
(۷) ۲۴ء۷ لاکھ پونڈ یوروپین سبزی کے بیجوں کی پیداوار ہوئی۔

وید راہی
ڈوگری سے ترجمہ: ودشی

کالے ہاتھ

مُنہ کے آگے بندھی ہوئی پٹی کھول کر اُس نے ایک طرف دے پھینکی اور خود تیر کی طرح اوپریشن روم سے باہر نکل گئی ——— نرسیں حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

ہسپتال کے کوری ڈور میں رات کے اندھیرے میں وہ اس طرح دوڑ رہی تھی جیسے کوئی پرچھائیں بھاگتی ہوئی جارہی ہو۔ اپنے دفتر کے کمرے کے پاس پہنچ کر اُس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور اندر داخل ہو کر دھڑام سے صوفے پر گر گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ کھڑکی میں سے ہوا دھیرے دھیرے اندر آ رہی تھی۔ باہر درختوں پر سے جھڑتے ہوئے سوکھے پتوں کی ہلکی ہلکی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہی دُور ٹم ٹم کرتے تارے اندر جھانک رہے تھے اور وہ سِسک رہی تھی۔

پھر کچھ دیر کے بعد ———

"ڈاکٹر" کسی نے کمرے کی بتی جلائی۔

جھٹ سے اُس کا سِسکنا بند ہو گیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر گپتا اُس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے اُس کی گیلی آنکھوں اور گالوں پر پھسلتے ہوئے آنسو دیکھے۔

"آپ رو کیوں رہاہیں ڈاکٹر نشی ؟"

نشی کے ہونٹوں پر ایک مسکان بکھر گئی۔ پھر دفعتاً اُس کے چہرے کا رنگ کالا پڑ گیا۔

"میں نے وہ اوپریشن کر دیا۔ آپ وقت پر نہیں پہنچے اور مریض کی حالت بہت ہی نازک تھی۔" نشی نے کہا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا۔" ڈاکٹر گپتا بولے۔ "راستے میں میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پر آپ نے وقت پر کیس ہاتھ میں لے کر سنبھال لیا۔ اور مریض کی جان بچالی۔ میں بھی ابھی اوپریشن روم سے آرہا ہوں۔ مریض کا سانس ٹھیک سے چلنے لگا ہے۔ اب اُس کی بیوی بھی وہاں آگئی ہے۔"

"آشا ؟"

"شاید آشا ہی نام ہے۔ آپ اُنہیں جانتی ہیں ؟"

یہ بات سُن کر ڈاکٹر نشی کے آنسو پھر بہنے لگے۔ وہ صوفے پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آگئی۔

"آج آپ نے بہت ہی کامیاب آپریشن کیا۔ بہت کامیاب! ہو سکتا ہے میں بھی اُس کی جان نہ بچا پاتا۔ آپ کے ان ہاتھوں نے آج جادُو کا سا کام کیا ہے۔"

"ہاتھ ؟" کھڑکی کے سہارے کھڑی نشی دوبارہ سِسکنے لگی ——

ڈاکٹر گپتا اُس کے بالکل قریب آ کھڑے ہوئے۔ "آپ رو کیوں رہی ہیں؟ پہلے تو کبھی آپ کو روتے نہیں دیکھا۔"

آنسو پھر تھم گئے۔

"یہ ہاتھ کیسے ہیں ڈاکٹر گپتا ؟"

"بہت خوبصورت !" نشی کے ہاتھ گپتا نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" نشی نے اُس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ "یہ کالے ہاتھ ہیں۔"

"لیکن ان ہاتھوں میں کسی کی جان بچانے کی توفیق تو ہے۔"

"نہیں۔ ان ہاتھوں کی وجہ سے کسی نے اپنی زندگی بھی ہاری ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"یہاں آئیے ڈاکٹر۔ اس کرسی پر بیٹھیں۔ آپ کو اپنے بچپن کی ایک

کہانی سُناتی ہوں۔"

ڈاکٹر گپتا تصویر کی مانند اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور وہ سُنانے لگی ——

"بچپن سبھی کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ شوخ، بے فکر اور اُمنگوں سے بھرا ہوا۔ میں بھی چھوٹی تھی تو ایسی ہی تھی۔ گڑیا گڈے کا کھیل بہت کھیلتی تھی۔ بہت دیر سے مجھے چاؤ تھا کہ اپنی گڑیا کا بیاہ رچاؤں۔ میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت گڑیا تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں اُس کی۔ لمبے لمبے کالے بال۔ بِندی بھی لگی ہوئی تھی اُس کے ماتھے پر۔ گہا گرہ اور چولی پہنا رکھی تھی میں نے اُسے۔"

ڈاکٹر گپتا کہانی سُنتے سُنتے جیسے کھو سے گئے تھے — وہ رات کا سماں۔ وہ ہسپتال — آپریشن روم میں موت کے چنگل میں پھنسا مریض — اور ڈاکٹر نِشی بھی پتہ نہیں کہاں کھوئی ہوئی کہے جا رہی تھی ——

"پھر ایک روز میں نے ماں کو منا لیا کہ گڑیا کا بیاہ ہوگا اور بہت دُھوم دھام سے ہوگا۔ بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا۔ بہت تیاری کی گئی تھی۔ جہیز بنا ہوا تھا۔ کپڑے، زیور اور دوسرا سارا سامان گڑیا کے ساتھ دینا تھا۔ برات بھی آنے والی تھی۔ ماں نے دالیں، سبزیاں اور بھات بنا کر رکھ دیا ہوا تھا۔ آخر ایک بار ہی تو گڑیا کا بیاہ کرنا تھا۔ برات پچھلی گلی سے آنی تھی۔ جس لڑکی کا گڈا تھا وہ میری چھوٹی بہن کی سہیلی تھی۔ یہ رشتہ میری چھوٹی بہن نے ہی ڈھونڈا تھا۔ برات آنے کا سماں ہوا۔ گلی محلے کے لڑکوں نے کاغذ اور گتے کے باجے بجا بجا کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ گڈے کی طرف سے آئے ہوئے سبھی لڑکے لڑکیوں نے بھات کھایا اور پھر لگن کا مہورت آیا۔ منڈپ میں گڈے اور گڑیا کو بٹھایا گیا۔ گڑیا نے گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور گڈا کسی راج کمار کی طرح بنا ٹھنا تھا۔ ہر طرف بڑی دُھوم دھام اور شور و غُل تھا۔ میرے دِل میں خوشی کی ترنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ اچانک ہی سب چُپ ہو گئے۔ گڈے والی لڑکی نے کہا —— "اِس گڑیا کے ہاتھ کتنے گندے ہیں۔ کالے سیاہ۔ میں تو اپنے راج کمار گڈے کا بیاہ اس سے نہیں کروں گی۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے گڈے کو منڈپ سے اُٹھا لیا۔

میں کیا کر سکتی تھی۔ ماں کے پاس جا کر رونے لگی۔ آخر میری گڑیا کے بجائے میری بہن کی گڑیا کو منڈپ میں بٹھا دیا گیا۔"

یہ کہہ کر نِشی کچھ دیر کے لئے چُپ ہو گئی۔ جیسے کہانی سُناتے سُناتے بیتی ہوئی زندگی کے دُھندلکوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ڈاکٹر گپتا بھی اُسی کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے جیسے اُلجھے ہوئے دھاگوں کو سنوار رہے ہوں۔ نِشی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اُس واقعے کے ٹھیک آٹھ برس بعد پھر ایک ایسا ہی واقعہ ہوا — اُس دِن ہمارے گھر میں پہلی بار باجے بج رہے تھے۔ ہماری بیوہ ماں نے پتاجی کے مرنے کے بعد خوشی کا کبھی کوئی دِن نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ایک سکوت سا طاری رہتا تھا۔ بھیانک سا سناٹا۔ کبھی کبھی تو سانس گھٹنے لگتا تھا۔ وہاں اور دِل گھبرا جاتا تھا اُس گھر سے۔ ماں نے ہم دونوں بہنوں کے کسی امتحان میں پاس ہونے کی کبھی خوشی نہیں منائی تھی اور کبھی فیل ہونے کا غم نہیں کیا تھا۔ دھوئیں سے بھری رسوئی میں آگ جلانا اور پھر اُس پہ دال، چاول کی پتیلی رکھ دینا ہی اُس کا کام تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا جیسے دُنیا سے الگ تھلگ کسی اور ہی جگہ رہ رہے ہیں ہم۔ اور گھر سے باہر نکلنے پر لگتا جیسے ہم کسی اور ہی دُنیا میں آ گئے ہیں۔ اِسی طرح کئی برس بیت گئے اور ہم دونوں بہنیں جوان ہو گئیں۔ ہمارے کسی دُور کے رشتہ دار نے کہیں میرے بیاہ کی بات پکی کر دی۔ وہ میری شادی کا دِن تھا۔"

یہاں تک سُنتے ہوئے ڈاکٹر گپتا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جیسے باہر کا سانس باہر اور اندر کا اندر رہ گیا ہو۔

اور نِشی کہتی جا رہی تھی ——

"مجھے تو اپنے گھر سے رتی بھر پیار نہیں تھا۔ میرا تو سانس گھٹتا تھا وہاں۔ لیکن پھر بھی اُس دِن میری آنکھوں سے لگاتار آنسو بہے جا رہے تھے۔ اُس دِن مجھے اپنے گھر کے ذرّے ذرّے میں اپنی رُوح چھپی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خوشیوں بھرا شور اور باجے کے گیت مجھے ذرا بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی مجھے پتہ تھا کہ میری سوچ کی حدوں سے دُور ایک نئی دُنیا میرا انتظار کر رہی ہے۔ کسی کی باہیں، کسی کی آنکھیں، کسی کا گھر، کسی کا دِل میرے قدم لینے کے لئے بے چین تھے۔ میرا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خوشی اور غمی کے دو جذبے مجھے ایک ساتھ گھیر رہے تھے۔ مجھے نہیں

معلوم تھا کہ میں کسی جگہ پر کھڑی ہوں۔ صرف یہ معلوم تھا کہ میں کھڑی ہوں گر نہیں رہی ہوں —— پھر وہ گھڑی بھی آئی —— وہی گھڑی جس کی اُمید ہر لڑکی کو ہر وقت ہوتی ہے۔ لیکن کوئی بھی لڑکی جس کے بارے میں ٹھیک سے کچھ سوچ نہیں سکتی۔ یہ وہی گھڑی ہوتی ہے جب چاؤ پورے ہوتے ہیں۔ جب دھڑکن تیز ہوتی ہے، ہاتھ کانپنے لگتے ہیں ٹانگیں سنبھالی نہیں جاتیں۔ جسم پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے۔ میں کتنے ہی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ پھر بھی ایک ایک چیز دیکھ رہی تھی — دیکھ رہی تھی کہ وہ آکر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے حرکت کی۔ اب ہَون شروع ہوا۔ آگ تیز ہو اُٹھی۔ اُن کی نظر گھونگھٹ کے بیچ سے ہوتی ہوئی میری چٹکیاں لے رہی تھی۔ سب مجھے نظر آر ہا تھا — اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ لیکن یہ کیا ؟ وہ اچانک ہی یوں اُٹھ کھڑے ہوئے کہ میرے، اُن کے بندھے ہوئے آنچل کھُل گئے۔ ہر طرف ایک شور مچ گیا۔ ”لڑکی کے ہاتھ کالے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ کالے ہیں۔“ ہر طرف سے یہی آوازیں آرہی تھیں۔ ہے بھگوان ! اب میں کیا کروں ! میں نے اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھایا۔ لیکن کسی کے دِل پر اس کا کیا اثر ہوتا۔

وہی رات، وہی منڈپ، وہی آگ، وہی پنڈت، وہی منتر، وہی دُولہا۔ مگر دُلہن وہ نہیں تھی۔ میری چھوٹی بہن میری جگہ پر گھونگھٹ کاڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھوں میں سہاگ کی چوڑیاں نہیں تھیں۔ میرے جسم پر وہ لباسِ عروسی نہیں تھا۔ دِل کی وہ تیز دھڑکنیں نہیں تھیں ہاتھوں میں کپکپی، ماتھے پر پسینہ نہیں تھا۔ میں تھی، وہ اندھیری کوٹھڑی تھی اور زندگی کا ساتھی وہ اندھیرا تھا۔“

یہاں تک کہہ کر نِشی خاموش ہو گئی جیسے تھک گئی ہو۔ ڈاکٹر گپتا محو ہو کر سب سُن رہے تھے۔ تھوڑی دیر ایسے ہی خاموشی طاری رہی۔ پھر نِشی نے ڈاکٹر گپتا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ آج کا مریض وہی شخص ہے جس نے میرے کالے ہاتھ دیکھ کر مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ برسوں کی بات آج پھر میرے دِل کو گھائل کر گئی۔ اب بتائیے ڈاکٹر یہ ہاتھ کیسے ہیں ؟“

”بہت ہی خوبصورت !“ ڈاکٹر نے بڑھ کر نِشی کے ہاتھوں کو پھر تھامنا چاہا۔ ”آج ان ہاتھوں نے اُسی مریض کی جان بچالی۔ نِشی، تم اپنے یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھوں میں دیدو۔“

”تعمیر“ میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) باتصویر مضامین اور فیچر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ان نگارشات میں ظاہر کی گئی آرا سے حکومت جموں وکشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے تنقیدی مضامین ترجیحی طور طلب کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر جیالال کول

کشمیری زبان اور رسم الخط

آپ کے معیاری رسالے میں اس موضوع پر میری نظر سے دو مضمون گذرے ایک اس سال اور دوسرا غالباً پچھلے سال۔ ان میں لکھنے والوں نے رسم الخط کے بارے میں اپنی اپنی رائے دی تھی اور کئی نئی علامتیں بھی تجویز کی تھیں۔ مجھے یہاں یہ کہنا نہیں ہے کہ اُن کی رائے کہاں تک قابل قبول ہے اور جو علامتیں اُنہوں نے تجویز کی ہیں وہ صحیح علامتیں ہیں بھی کہ نہیں۔ یہاں میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان مضامین سے جان پڑتا ہے کہ ان اصحاب کو معلوم نہیں کہ حکومت نے ۱۹۴۸ء میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اس موضوع پر ایک مفصل رپورٹ دی جس میں نئے حروف اور علامتیں تجویز کی گئی تھیں۔ حکومتِ وقت نے اس رپورٹ کو منظور کیا اور ہدایت کی کہ فی الحال پرائمری سکولوں کی پانچ جماعتوں کے لئے تدریسی کتابیں کشمیری میں لکھوائی جائیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کو ہدایت ہوئی کہ وہ ان تین چار سال کے اس تجربے کا جائزہ لے اور جہاں ایسا کرنا ضروری سمجھے، خاص کشمیری آواز کے لئے مروجہ حروف اور علامتوں کی ترمیم بھی تجویز کرے۔ اس کمیٹی نے ساری وادی کا دورہ کیا اور اساتذہ سے خاص کر اور دوسرے ایسے اشخاص سے بالعموم تبادلہ خیال کیا جو کشمیری رسم الخط سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے بعد بھی دو اور کمیٹیاں بنائی گئیں۔ الغرض رسم الخط کے سوال پر بہت اچھی طرح غور و خوض کیا گیا اور اس مفصل غور و خوض کے بعد جو رپورٹ حکومت کو پیش کی گئی اُس میں تجویز کئے گئے رسم الخط کی بنا پر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک کشمیری قاعدہ "بول بوش" شائع کیا گیا۔

میرے خیال میں یہ مفید بھی ہوگا اور مناسب بھی کہ میں یہاں کشمیری رسم الخط کی خاص خاص علامتوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کروں تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یہ جان سکیں کہ یہاں کشمیری زبان کے لئے پہلے ہی ایک رسم الخط موجود ہے جس میں یہ زبان اچھی طرح لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔

یہاں شاید یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ کشمیری زبان کے لئے اگر عربی فارسی الف بے استعمال میں لایا جائے تو نسخ خط زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ کشمیری میں حروف علت کی تعداد زیادہ ہے جو نستعلیق خط میں وضاحت کے ساتھ الگ الگ ظاہر نہیں ہوتیں۔ نسخ خط میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ ٹائپ کیا جاسکتا ہے۔ مگر چونکہ یہاں لکھنے پڑھنے والے بالعموم اُردو فارسی کے نستعلیق خط سے زیادہ مانوس ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ کشمیری کا رسم الخط اُردو کے نستعلیق خط کے بہت قریب ہو اور اُس سے ملتا جلتا ہو۔ اس لئے ۱۹۴۸ء میں کمیٹی کا مجوزہ اور منظور شدہ نسخ خط کی بجائے نستعلیق خط کشمیری زبان کے لئے اپنایا گیا اور اسی خط کے لئے مناسب نئی علامتیں اور حروف تجویز کئے گئے۔

پڑھنے اور سمجھنے کی سہولت کے لئے میں کشمیری کے حروفِ علت اور خاص خاص علامتیں ذیل کے چارٹ میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) حروفِ علت

نمبر	حرف	علامت	کشمیری لفظ بمعہ اُردو معنی	کشمیری نام
(چھوٹے) (۱)	اَ	ـَ	اَکھ (ایک)	
(لمبے) (۲)	آ	ـآ	آکھ (نشان)	
(چھوٹے) (۳)	أ	ـٔ	أچھ (آنکھ) نٔر (بازُو)	(ہمزہ زبر)
لمبے (۴)	اٲ	ـٲ	اٲس (مُنہ) نٲر (بدھنی)	[ہمزہ مد]
چھوٹے (۵)	اِ	ـِ	چِھٹھ (چھینٹ)	
لمبے (۶)	اِی	ـِی	تِیل (تیل)	

تعمیر

نمبر	حرف	علامت	کشمیری لفظ بمعہ اُردو معنی	کشمیری نام
(۷) چھوٹے	اِ	ـِ	تِر (چیتھڑا)	[ہمزہ زیر]
(۸) بڑے	اِی	ـِ ٖ	تیر (سردی)	[زیٖٹھ ہمزہ زیر]
(۹) چھوٹے	اُ	ـُ	گُرُ (گھوڑا)	
(۱۰) بڑے	اُو	ـُو	گوٗرُ (گوالا)	
(۱۱) چھوٹے	ـےٚ	ـہ	مہ (مجھے)	[ژھوٚٹ یے]
(۱۲) بڑے	اے	ـے	سیر (سیر)	
(۱۳) چھوٹے	اوٚ	ـوٚ	اوٚن (اندھا)	[ژھوٚٹ واو]
(۱۴) بڑے	او	ـو	نوٚٹھ (کنارہ) اول (گھونسلا) مول (باپ)	
(۱۵) چھوٹے	ـٛ	ـٛ	دوٗد (دودھ)	[وُٹھِتھ واو]
(۱۶) بڑے	ـٗ	ـٗ	وٚیتھ (جہلم دریا)	[لوٚنت واو]
(۱۷) چھوٹے	ـٕ	ـٕ	کھاٗسو (پیالے)	[اوٚڈ یے]

حرفِ علت نمبر ۱۱ "یول بوش" میں شاید سہوًا درج نہیں۔ مگر اِس خاص کشمیری آواز کے لئے علامت کا ہونا ضروری ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے یہ علامت متعلقہ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی تجویز کی گئی تھی۔ آواز نمبر ۱۶ مندرجہ بالا کو خفیف آواز کہا جاتا ہے اور اس کی مثال ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی انگریزی اُردو ڈکشنری میں انگریزی لفظ " met " کے حرفِ علت " e " کی آواز جتائی گئی ہے۔

(ب) حروفِ صحیح

(۱) ژ، ژور (چار)   (۲) ژھ، ژھانٹھ (تیراکی)

(نوٹ) جزم (ـْ) ترام (تانبا) جب جزم کی علامت (ـْ) کسی حرف کے اُوپر درج ہو تو وہ حرف ساکن ہوتا ہے۔

یہاں یہ کہنا بھی لازمی ہے کہ جو کشمیری نام میں نے اُوپر بریکٹ میں درج کئے ہیں وہ منظور شدہ نام نہیں ہیں۔ یہ نام اس لئے درج کئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہاں لوگ عموماً حروفِ تہجی کو ایسے ہی ناموں سے پُکارتے ہیں۔ مثلاً زبر، زیر، پیش، مد۔ کشمیری میں چھوٹی آواز کو "ژھوٚٹ" اور لمبی آواز کو "زیٖٹھ" کہتے ہیں۔ مثلاً زیٖٹھ زبر، زیٖٹھ زیر۔ زیٖٹھ یا زیوٗٹھ پیش۔ زیوٗٹھ یے، زیوٗٹھ واو۔ علاوہ بریں یہ بھی درج کرنا ضروری ہے کہ الفاظ کی شکلیں اور اُن کے حروف کے لکھنے کے ڈھنگ لکھنے سے ہی صحیح طور مقرر ہو سکتے ہیں۔ میری رائے میں ہمیں کشمیری لکھنے کے لئے "ہائی فن" (hyphen) کے استعمال کرنے کی بھی کبھی کبھی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا یُوں کہیں کہ اس کے استعمال سے ہمیں سہولت ملتی ہے۔ مثلاً "میون قلم" (میرا قلم) "مہ وَن" (مجھے کہو) "مے وَن پیو ڈوڑھ" (میوؤں پر اولا پڑا) اگر یہ حروف ایسے نہ لکھے جائیں اور تینوں الفاظ محض "میوٗن" کی شکل میں لکھے جائیں تو ہمیں پڑھنے ہی میں نہیں بلکہ ان کے معنی سمجھنے میں بھی دشواری ہوگی۔

اب کشمیری زبان رسم الخط کی محتاج نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں کی محتاج ہے۔ جتنے زیادہ لوگ اس کو پڑھیں، جتنی زیادہ اس کی اشاعت ہو، اُتنی جلدی اور اُتنی زیادہ یہ زبان پھلے پھُولے گی اور اس کا حق ہے کہ ہماری مادری زبان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی ہندوستان کی اور علاقائی زبانوں کی طرح پھلے پھُولے!

حسرت موہانی کی ہندی شاعری

(صفحہ ۵ سے آگے)

ہم ہوں جو دئے لپٹائے کے حسرت   ساری یہ چھل بل نکال
موپہ رنگ نہ ڈار مراری   منتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرن کا جائے نہ دیہیں   شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجس حسرت   دیکھت ہیں نر ناری

حسرت اس دَور کے سب سے اُونچے اُردو کے شاعر اور ہندوستان کے بے مثل گوئی۔ ان کی شاعری میں قدیم اور جدید رنگوں کا ایسا لطیف امتزاج ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ان کا ہندی کلام بھی بہت بڑی حد تک منفرد ہے اور حسرت کی طبیعت کی انفرادیت کا گہرا اثر ان کے ہندی کلام پر پڑا ہے، آئندہ نسلیں حسرت کی ہندی شاعری سے سبق حاصل کریں گی اور ہند آریائی کلچر کو، جس کی بُنیاد چودھویں صدی میں رحیم وغیرہ نے رکھی تھی، حسرت نے رجعت پرستی کے دَور میں اپنی تہذیبی روایات کو آگے بڑھایا۔ اسی کو آنے والی نسلیں نئی توانائی کے ساتھ اپنائیں گی۔

باسط بھوپالی

غزل

چھنتے رہیں انوارِ شباب اور زیادہ — روشن ہو ترا طرفِ نقاب اور زیادہ
تو آپ ہی ہو اپنا جواب اور زیادہ — چمکے تری تقدیرِ شباب اور زیادہ
تو زینتِ پہلو ہو تو اے زینتِ پہلو — ہو لطفِ مے و شعر و شباب اور زیادہ
کچھ اور بہکتے رہیں رندانِ سیاہ مست — تابندہ ہو موجِ مئے تاب اور زیادہ
اے مطربِ احساس کوئی تازہ ترنّم — دل دوز ہو آہنگِ رباب اور زیادہ
رہنے دے انہیں سامنے اے داورِ محشر — دینا ہے ابھی مجھ کو حساب اور زیادہ
واماندہ یک عمر ہوں اے شورِ قیامت — ملتی تھی مجھے فرصتِ خواب اور زیادہ
آغوشِ اجل ہے کہ نمائش گہِ ہستی — طوفان میں اٹھتے ہیں حباب اور زیادہ
منزل کا تصوّر ہوا دھندلا تو کیسے غم — لپٹا کریں قدموں سے سراب اور زیادہ
اس طرح کہ ڈوبی ہی رہے سطحِ تلاطم — بے تاب ہو موجِ تہہ آب اور زیادہ
باسط درِ میخانہ پہ یہ کس نے لکھا ہے — آئے جسے ہونا ہے خراب اور زیادہ

نئے بھارت کے معمار

بچت سے دوہرا فائدہ



راج کوٹ، ریاست گجرات کے ایک کالج کے طالب علم بھیکھالال بخشی نے ایک پنتھ سے دو کاج سنوارے — اپنے اخراجات کے لئے روپیہ کمایا اور قوم کی ترقی میں مدد دی۔

بخشی چھوٹی بچتوں سے متعلق ادارے کا ایجنٹ بن گیا۔ محض چند گھنٹے باقاعدگی کے ساتھ کام کرکے اور گرمیوں کی چھٹیوں سے فائدہ اٹھا کر بخشی نے چھ ماہ کے عرصے میں اٹھارہ سو روپے کمیشن کی صورت میں کمائے۔

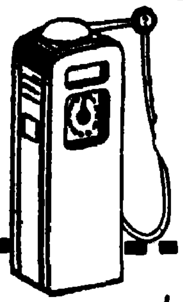
لوگوں میں بچت کی عادت کو مقبول بنا کر بخشی جیسے ہونہار کارکن نئے بھارت کی تعمیر کے سلسلے میں انتہائی اہم کام سرانجام دے رہے ہیں۔

پلان سے مضبوطی

پلان سے خوش حالی

پلان کو کامیاب بنائیے، محنت سے بچت سے۔

DA/60/202

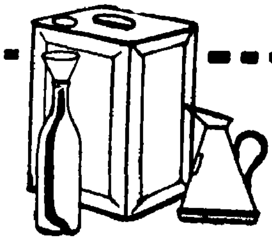


پٹرول

مٹی کا تیل

اب لیٹروں

میں بکتے ہیں



پٹرول کی صنعت نے چونکہ میٹرک نظام اپنا لیا ہے لہذا پٹرول اور مٹی کا تیل اب لیٹروں کے حساب سے فروخت ہونے لگے ہیں۔
اس تبدیلی کا قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

گیلن	لٹر	گیلن	لٹر	لٹر	گیلن	لٹر	گیلن
۱	۴٫۵۵	۲۰	۹۰٫۹	۱	۰٫۲۲	۲۰	۴٫۴
۲	۹٫۱	۳۰	۱۳۶٫۴	۲	۰٫۴۴	۳۰	۶٫۶
۳	۱۳٫۶	۴۰	۱۸۱٫۸	۳	۰٫۶۶	۴۰	۸٫۸
۴	۱۸٫۲	۵۰	۲۲۷٫۳	۴	۰٫۸۸	۵۰	۱۱٫۰
۵	۲۲٫۷	۶۰	۲۷۲٫۸	۵	۱٫۱۰	۶۰	۱۳٫۲
۶	۲۷٫۳	۷۰	۳۱۸٫۲	۶	۱٫۳۲	۷۰	۱۵٫۴
۷	۳۱٫۸	۸۰	۳۶۳٫۷	۷	۱٫۵۴	۸۰	۱۷٫۶
۸	۳۶٫۴	۹۰	۴۰۹٫۱	۸	۱٫۷۶	۹۰	۱۹٫۸
۹	۴۰٫۹	۱۰۰	۴۵۴٫۶	۹	۱٫۹۸	۱۰۰	۲۲٫۰
۱۰	۴۵٫۵			۱۰	۲٫۲۰		

۱ گیلن = تقریباً ۴½ لٹر

میٹرک نظام

آسانی اور یکسانی کے لئے

جاری کردہ بھارت سرکار

شاکر پُرشارمی

یہ پُراسرار سرزمین

جدید تحقیق کی روشنی میں یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ معاشرتی نظام کی تشکیل کے عہدِ آغاز میں "عورت" کو ہی کُلی اختیارات ودیعت ہوئے تھے اور ایک طویل مدت تک عورت ہی خانگی مسائل، معاشی ضروریات اور اجتماعی سرمایہ کی محافظ کے طور پر جُملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئی۔ قبائلی نظام میں بعد میں رفتہ رفتہ یہ اختیارات عورت سے مرد کو منتقل ہوتے گئے اور قبائلی معاشرہ میں عورت کی پوزیشن کم سے کم تر ہوتی گئی۔ لیکن مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے زیرِ اختیار سماج کُلی طور پر ایک قدیم اشتراکی سماج تھا۔ یعنی اس سماج میں ذاتی سرمایہ کو کوئی دخل نہیں تھا عورت کے مقابلہ میں مرد کی برتری کے عہدِ مابعد میں قبائلی نظام کی یہ اشتراکیت قائم نہ رہ سکی۔ ذاتی سرمایہ معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی سماج طبقات میں منقسم ہو گیا۔ دیگر اشیا کے ساتھ ساتھ "عورت" بھی صاحبِ اقتدار کی ذاتی ملکیت تصوّر کی جانے لگی۔ موت کے بعد بھی مرد کی ہر مِلک اسی کی ملکیت بنی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی جان دار منجی ملکیت "عورت" کو اس کے ساتھ ہی چتا میں جل مرنا پڑتا تھا یا قبر میں اُترنا پڑتا تھا۔ اب تک بیوہ کو مُردہ شوہر کے ساتھ جلا دینے کی رسم ہمارے ملک ہی تک محدود سمجھی جاتی تھی مگر جدید تحقیق نے عہدِ قدیم کے یورپ میں بھی اس کے ثبوت کھوج نکالے ہیں۔[1]

ہر چند زمانہ کے نشیب و فراز نے عورت کی پوزیشن کو صدیوں تک نہایت کم تر بنائے رکھا۔ مگر تاریخ کے صفحات اور انسانی ذہن کی گہرائیوں سے "با اختیار عورت" کے عہد کی جملہ روایات اچانک محو نہیں ہو سکیں۔ ان کا محو ہو سکنا تھا بھی غیر ممکن۔ اس امر کے کتنے ہی واضح ثبوت آج بھی ہمارے ملک میں اور غیر ملکی رسوم و روایات اور عقائد کی صورت میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر برسوں کی تحقیق کے بعد مشہور مؤرخ برفلٹ نے ایک نہایت اہم اور مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے۔[2] یہاں ہم عہدِ قدیم سے مروّج ایک ایسے قابلِ ذکر عقیدہ پر بحث کریں گے جس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر دَور کے ذہنِ انسانی پر اپنا جادو جگائے رکھا ہے —— یہ عقیدہ ہے "عورتوں کی حکومت" کا عقیدہ۔ مختلف ممالک کی روایات اور تاریخی اور مذہبی کتب کے شواہد کی روشنی میں یہاں ہم اس دِل چسپ عقیدہ پر گفتگو کریں گے۔

اگرچہ خود عورتوں کو بھی اس بات پر یقین نہیں آتا لیکن یہ خیال بہت پُرانا ہے کہ دُنیا میں ایک مُلک ایسا ضرور ہے جہاں عورتیں ہی عورتیں رہتی ہیں۔ مرد کہیں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتا۔ اس خیال نے پہلے پہل ایمزن عورتوں کے قصّہ کی صورت میں جنم لیا جس کی تاریخی حیثیت آج تک مابہ النزاع چلی آتی ہے۔

یونان کے شہرہ آفاق قدیم شاعر ہومر کے ہاں ان کے متعلق معمولی سے اشارات مِلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایمزن (علاقہ تاتار) کی دیو پیکر عورتوں نے یُونانیوں سے جنگ کی۔ ایٹکا پر حملہ کیا اور سکندر (اعظم) کے زمانہ تک بر سرِ پیکار رہیں۔ روایت ہے کہ یہ جنگجو عورتیں، اپنا دایاں پستان

---

[1] وی، جی چائیلڈ کی تصنیف "SOCIAL EVOLUTION" صفحہ نمبر ۶۶ (لندن ۱۹۵۱ء)

[2] آر، برفلٹ کی تصنیف "The Mothers" جلد سوئم (نیویارک ۱۹۲۷ء)

دیتی تھیں۔ تاکہ انہیں (نیزہ پھینکنے میں) آسانی ہو سکے۔ یہ عورتیں تیر کمان کلہاڑے اور ڈھالیں استعمال کرتی تھیں اور لڑائی میں جانوروں کی کھال کا لباس پہنتی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لڑائی کے زمانہ میں یہ عورتیں اپنے مردوں سے بالکل علیحدہ رہنے لگتی تھیں۔ وہ اپنے ہمراہ صرف لڑکیوں کو رکھتی تھیں اور لڑکوں کو ان کے باپ کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ مرد گھروں میں بچوں کی نگہداشت کرتے تھے، اور عورتیں حکومت کا کاروبار چلاتی تھیں۔

ایزن کی عورتوں کے متعلق اس قسم کی کلاسیکی روایات ہیں۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ قرون وسطیٰ اور پھر عہد جدید میں یہ داستان کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ان حیرت انگیز عورتوں کی جنگ جوئی پر اس قدر زور نہیں دیا جاتا بلکہ ایک ایسے ملک کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں صرف عورتیں ہی آباد ہیں اور مرد عورتوں کی چشم پوشی کی بنا پر مختصر مدت کے لئے وہاں آجاتے ہیں۔

عرب جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ "عورتوں کا شہر" بحر مغرب کے ایک جزیرہ میں واقع ہے۔ وہاں عورتیں مردوں کی حکمرانی سے بالکل آزاد ہیں اور لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں عورتیں اپنے غلاموں کی صحبت میں مائیں بنتی ہیں۔ لیکن گیارھویں صدی کا وقائع نگار ایڈم آف بریمن لکھتا ہے کہ یہ عورتیں جادو کی شراب پیتی ہیں یا "دیووں" کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ ان کے ہاں اگر لڑکی پیدا ہو تو وہ بہت خوبصورت ہوتی ہے لیکن لڑکوں کا سر جسم میں اس جگہ ہوتا ہے جہاں ہمارا سینہ ہے۔

قدیم چین میں یہ روایت تھی کہ عورتوں کے ایسے تین ملک ہیں جو بالترتیب چین کے مغرب، جنوب اور مشرق میں واقع ہیں۔ ایک چینی مصنف ہوتی چین نے لکھا ہے کہ یہ عورتیں خوش رو ہوتی ہیں اور ان کے سارے جسم پر لمبے بال ہوتے ہیں جو چلتے ہوئے دنبالہ کی طرح زمین پر لٹکتے جاتے ہیں۔ ان کا سینہ نہیں ہوتا اور یہ سمندری گھاس پر گذارہ کرتی ہیں اور آدمی کو دیکھ کر اس قدر دہشت زدہ ہوتی ہیں کہ فوراً بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک سیاح کا کہنا ہے کہ ان عورتوں کی آواز بہت بلند ہوتی ہے اور آواز کی تیزی کتے کے بھونکنے سے مشابہ کی جا سکتی ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں جدید نقاد کی یہ رائے حیران کن نہیں کہ عورتیں در اصل دریائی بچھڑے ہیں۔

کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے بعد مندرجہ صدر "ایزن کی عورتوں" کی داستانیں پھر زندہ ہو گئیں اور امریکہ کے عظیم دریا کا نام بھی انہیں کے نام پر رکھا گیا۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ ان عورتوں کی بستیاں اندرون ملک اسی دریا کے کناروں پر آباد ہیں۔ افریقہ میں بھی بعض روایات تھیں اور ممکن ہے کہ ان میں بعض حقائق پر بھی مبنی ہوں۔

ڈھومی کے ایک حکمران کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس عورتوں کا ایک دستہ تھا جسے اس نے اپنے حرم کی ان چھ ہزار عورتوں میں سے چن کر بھرتی کیا تھا جو بیس سال کی عمر ہونے پر اس کے حرم سے علیحدہ ہو گئی تھیں۔ اس قسم کی داستانیں نیوگنی، مدراس اور مینا ڈے کے جزیروں اور دیگر علاقوں سے بھی جمع کی گئی ہیں۔ انہیں لوگوں میں بعض روایات ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ عورتیں جنوبی ہوا میں اپنے جسم عریاں کر دیتی ہیں اور اس طرح انہیں حمل قرار پا جاتا ہے۔

ہندوستان میں بھی عورتوں کے ملک سے متعلق عہد قدیم سے اس قسم کی روایات چلی آتی ہیں۔ سب سے پہلے اس کا ذکر مہابھارت میں اس گھوڑے کے حصہ میں آتا ہے جسے اشوسیدھ یگیہ کی رسم کے موقع پر چھوڑا گیا تھا۔ یہ گھوڑا ایک ایسے ملک میں داخل ہوتا ہے جہاں عورتیں ہی عورتیں آباد ہیں۔ ان کی ایک رانی بھی ہے جس کا نام "پرمیتا" ہے۔ مہابھارت میں اس امر کے اشارات بھی موجود ہیں کہ یہاں عورتیں صرف پردیسیوں سے مل کر ہی بچوں کی مائیں بنتی ہیں۔ اگر کوئی مرد اس ملک میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ قیام پذیر رہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

"ستیہ پُران" کی ایک کتھا میں ایک تفریحی باغ کا ذکر ہے جس کا نام سرآون ہے۔ لکھا گیا ہے کہ یہ باغ بہت خوبصورت ہے اور اس میں ہر قسم کا درخت موجود ہے۔ شنکر اور پاروتی بہ غرض تفریح اسی باغ میں جاتے ہیں۔ اور ان کا حکم ہے کہ اگر کوئی مرد باغ کے قریب آئے گا تو وہ عورت بن جائے گا۔ چنانچہ جب منوجی کا لڑکا ایلا اس باغ کے قریب پہنچا تو اس کی ہیئت بالکل تبدیل ہو گئی۔ یہ پر اسرار افسانوی روایات آج تک چلی آتی ہیں اور دور جدید میں بھی بہت سی ہندو قوموں کے مذہبی قصص میں یہ چیزیں اسی طرح موجود ہیں۔ سنتھال لوگوں کے یہاں عورتوں کے ایک ملک کا ذکر ہے جسے وہ اپنے

گورو کے نام پر کام روپ کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک سنتھال کام روپ چلا گیا تھا۔ جہاں عورتوں نے اسے پانچ سال تک رکھا۔ دن کے وقت وہ اسے بانس کے ایک بڑے ٹوکرے کے نیچے دبا دیتی تھیں اور رات کو اس پر جادو کرتی تھیں۔ جب اسے پوری تعلیم مل چکی تو پھر اسے جادو کے زور سے ایک چیل بنا دیا گیا اور وہ اُڑ کر اپنے وطن واپس آگیا۔

آدی واسی سنتھالوں کے ہاں ہی ایک اور کہانی رائج ہے کہ ایک گِدھ ایک سنتھال بچہ کو اُڑا کر کام روپ لے گیا۔ یہاں اُس نے کام روپ کی عورتوں کے نوکر کی حیثیت میں پرورش پائی اور آخر میں اسے ایک عورت سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ پھر اُس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن جس جگہ وہ چلتا، آخر میں پھر وہیں پہنچ جاتا تھا۔

سنتھال لوگ مزدوری وغیرہ کرنے آسام کے چائے کے باغات میں جاتے ہیں اور راستہ میں انہیں ضلع کام روپ سے گذرنا پڑتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ضلع کا نام اپنے گورو سے منسوب کیا ہے اور اسی لئے ان کا عقیدہ ہے کہ عورتوں اور جادو کی یہ سرزمین مشرقی سمت میں واقع ہے۔ ناگا قبائل میں بھی ایسے ہی کئی قصے مروّج ہیں۔ وسط ہند کے آدی باسیوں کے خیال میں جادو کا یہ پُر اسرار اور خطرناک ملک کہیں بنگال میں ہی واقع ہے۔ ان کے ذہنِ رسا میں بنگال صرف جادو کا گھر ہی نہیں بلکہ وہ ایک ایسا ملک بھی ہے جہاں ہر قسم کی شراب ملتی ہے۔ وہ بنگال کو "بارہ بھئی جگہ" (بارہ خرابیوں کا بنگال) کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں عورتوں کی بستی یہیں کہیں موجود ہے۔ ایک کہانی اور مشہور ہے کہ بنگال میں جادو کا دَور دورہ تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہاں کُل تین عورتیں باقی رہ گئیں۔ چونکہ انہوں نے اپنے جادو کے زور سے تمام باشندوں کو بلّیاں بنا دیا تھا ...... پھر ایک گورو اپنے بارہ چیلوں کے ہمراہ وہاں پہنچے تاکہ وہاں اصل صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں۔ ان میں سے ہر شخص کے پاس اپنی حفاظت کے لئے جادو کے ایک لوہے کا ٹکڑا تھا۔ لیکن ان جادوگرنیوں نے گورو کو بھی بلّی بنا کر چھوڑ دیا۔ اور ان کے بارہ چیلے پتھر کے بُت بن گئے۔ جب کچھ دن اسی طرح گذر گئے تو ایک اور گورو مکھی کا رُوپ دھار کر وہاں پہنچے اور انہوں نے مسلسل کوششوں سے ان بلّیوں کو انسانی شکل میں تبدیل کیا۔

آدی باسیوں کے گونڈ قبائل میں یہ قصہ مشہور ہے کہ عورتوں کی سلطنت طلوعِ آفتاب کی سمت میں واقع ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں غالباً کوئی مرد نہیں رہتا۔ اگر کوئی مرد غلطی سے اس مملکت میں داخل ہو جائے تو عورتیں اسے گرفتار کر لیتی ہیں اور پھر اسے جادو کے ذریعہ بیل بنا کر اس سے کھیتوں میں کام لیا جاتا ہے۔

اوڑیسہ کی بعض قوموں میں یہ روایت ہے کہ ایک اندھے فقیر نے ایک راجہ کو، جس نے کہ اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تھا، بددعا دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی رعایا کا ہر مرد اور لڑکا پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد سے وہاں صرف عورتیں رہتی ہیں۔ یہ جگہ مایا کنڈ میں شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ اس ملک کا محلِ وقوع کا پتہ چلانے کے لئے بارہا کوششیں کی جا چکی ہیں۔ کیونکہ پرانے زمانہ کے محققین کی طرح عہدِ حاضر کے محققین کا ذوقِ تجسس بھی ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ مشہور مصنف ہیملٹن رقم طراز ہے کہ عورتوں کی یہ سرزمین پیگوئی اور بریلی کی پہاڑیوں کے مشرق میں واقع ہے۔ ہیون سانگ نے اسے مشرقی عورتوں کا ملک کہا ہے جسے مالابار کے ساحلی علاقہ کے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔

مارکوپولو اور لوگاں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ جگہ جزیرہ منی کائے میں ہے جو سیاسی طور سے جزائر لکادیپ اور تمدنی لحاظ سے جزائر مالدیپ میں شامل ہے۔ اس جزیرہ کے مرد، جو زیادہ تر مسلمان ہیں، اکثر و بیشتر بحری سفر پر رہتے ہیں اور عورتیں حکومت کا کاروبار چلاتی ہیں۔ یہ عورتیں بے نقاب رہتی ہیں۔ جہازوں پر جو لوگ یہاں پہنچتے ہیں ان کا استقبال عورتیں کرتی ہیں۔ کیونکہ اگر مرد گھر پر بھی ہوں تو وہ بحری ڈاکوؤں کے ڈر سے باہر نہیں آتے۔ غالباً اسی لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کا جزیرہ اسی جگہ واقع ہے۔ عورتوں کی حکومت کا یہ تصور بعض ہندوستانی قبیلوں میں ٹھوس عقائد کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ گونڈ اور بھیل قوموں میں یہ دستور رہا ہے کہ عورتیں مردوں کا لباس زیبِ تن کرتیں اور بھالے اور کلہاڑیوں وغیرہ سے مسلح ہو کر رسمی شکار کے لئے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتی تھیں۔ ہر مقام پر وہ ایک خنزیر پکڑ کر اسے ہلاک کرتی تھیں اور یہ رسم عورتوں کے احترام کا نتیجہ تھی۔ اس رسم کو "استری سہج" یا عورتوں کا راج کہا جاتا تھا۔ عموماً یہ

آئی بھٹناگر ایم اے

ریاست کشمیر کے تجارتی ادارے

ہندوستان میں جموں و کشمیر ایک واحد سٹیٹ ہے جو ریاست کے باہر تجارتی ادارے قائم کئے ہوئے ہے۔ یہ تجارتی ادارے پٹھان کوٹ، امرت سر، دہلی، کلکتہ اور بمبئی میں قائم ہیں۔ ان اداروں کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ریاستی حکومت کے لئے اشیا کی خرید و فروخت

(۲) ریاست کی تجارت اور دست کاری کے متعلق ہر اطلاع بہم پہنچانا۔ ریاستی سوداگروں کو غیر ریاستی سوداگروں سے تعلق میں لانا۔ امپورٹ لائسنس کا انتظام اور تجارتی جھگڑوں کو سلجھانا

(۳) ریاستی ایمپوریا کا لوکل انتظام

(۴) پبلک ریلیشنز یعنی ریاست کے متعلق ہر اطلاع کو سپلائی کرنا

(۵) ریاست کے اندر سیاحت کو ترقی دینا اور باہر سے آنے والوں کے لئے پرمٹ وغیرہ کا انتظام (۱۹۵۹ء میں ریاست میں پرمٹ سسٹم ختم ہو جانے کے بعد تجارتی اداروں کا یہ فرض ختم ہو جاتا ہے)

(۶) ریاستی شرنارتھیوں، کشمیری حاجیوں، مزدوروں اور طالب علموں کی دیکھ بھال

(۷) ریاست اور حکومت ہند کے درمیان ناطہ

(۸) ریاستی جائداد کی دیکھ بھال

(۹) کچھ متفرق فرائض۔ مثال کے طور پر امرت سری ادارہ پنجاب بھر میں کشمیری مسجدوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کلکتہ کے منیجر ادارہ نے آل انڈیا ہینڈی کرافٹ بورڈ کی میٹنگ سمت ۲۰۱۱ میں ریاستی ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کی بجائے خود شمولیت کی۔

۱۹۴۷ء میں ہند کی تقسیم نے ریاست کی تجارت پر بہت برا اثر ڈالا۔ معمول تجارتی راستے مسدود ہو گئے۔ ٹرانسپورٹ کو ایک بڑا دھکا لگا اور تجارت اور کاروبار تقریباً تباہ ہو گئے۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ریاست کی ایمرجنسی گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ہند کے دارالخلافہ میں ایک ریاستی ٹریڈ ایجنسی کھولی جائے تاکہ اس عظیم نقصان کی، جو ۱۹۴۷ء کے واقعہ سے ہوا، تلافی ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں ٹریڈ ایجنٹ کا دفتر نئی دہلی میں کھول دیا گیا۔ یہ ایجنسی جلد ہی اپنی اہمیت کی وجہ سے ٹریڈ کمیشن میں بدل دی گئی۔ اس ایجنسی کے کھلنے کے بعد تجارتی ادارہ جات پٹھان کوٹ، امرت سر، کلکتہ اور بمبئی میں بھی کھول دئے گئے۔

پبلک کے کچھ آدمیوں اور پریس کے کچھ حصہ نے وقتاً فوقتاً ان ایجنسیوں کے اخراجات پر کافی نکتہ چینی کی ہے۔ ان ادارہ جات کے سمت ۲۰۱۰ سے سمت ۲۰۱۲ تک کے اخراجات کے اعداد مندرجہ ذیل ہیں:۔

۲۰۱۰	۲۰۱۱	۲۰۱۲	۲۰۱۳
اصل خرچ	اصل خرچ	تخمینہ	تخمینہ ثانی
۲,۵۰,۷۸۸	۲,۶۸,۹۵۷	۲,۵۶,۴۰۰	۲,۹۷,۶۰۰
روپیہ	روپیہ	روپیہ	روپیہ

شاید ۵۲-۱۹۵۱ء میں پریزیڈنٹ چیمبر آف کامرس جموں نے ایک پمفلٹ "Why abolish Customs" (محصول درآمد کیوں ختم کیا جائے) میں ان ایجنسیوں کے اخراجات پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کی تھی:۔

> "ریاست نے جو ٹریڈ ایجنسیاں کھول رکھی ہیں وہ صرف وزرا اور اعلیٰ افسران کی خاطر و مدارات کے کوئی بہتر مقصد سرانجام نہیں دیتیں۔ ایک چھوٹی ریاست کے لئے یہ ایجنسیاں صرف ایک عیش پسندی ہے۔ ان اداروں کے تقریباً تین لاکھ روپیہ سالانہ کے

اغراجات کو بہت آسانی سے بچایا جاسکتا ہے۔"

بلاشبہ ہندوستان میں کسی اور صوبہ کی حکومت نے تجارتی ادارے قائم نہیں کئے ہیں تاہم ہند میں ریاست جموں وکشمیر کے حالات کچھ ایسے ہیں جن کے باعث ان اداروں کا ہونا لازمی ہوگیا ہے۔

(۱) ریاست ہند کے تجارتی مراکز سے بہت دور واقع ہے۔ ہر سال برف باری کے دنوں میں ریاست کا صوبہ کشمیر کچھ عرصہ کے لئے باہر کی دنیا سے الگ تھلگ ہوجاتا ہے۔ اگرچہ جواہر ٹنل کے مکمل ہونے پر اس جغرافی پوزیشن کے بہتر ہونے کی توقع ہے۔

(۲) قدرتی آفات جیسے زلزلہ، طوفان اور دوسرے حادثات ریاست میں کافی واقع ہوتے ہیں اور ریاست میں سپلائی پوزیشن کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں۔ پٹھان کوٹ نزدیک ترین ریل ہیڈ ہے۔ جہاں ایک ٹریڈ ایجنسی ہے جو کہ ایسے نازک حالات میں اشیائے ضروریہ کو فوراً ریاست میں پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔

(۳) ریاست کی اقتصادیات میں سیاحت کا ایک اہم پارٹ ہے اور سیاحت کی ترقی میں ان اداروں کا بڑا دخل ہے۔

(۴) ریاست کے ایمپوریا کے انتظام سے اور ریاست کے متعلق اقتصادی و تجارتی اطلاعات بہم پہنچانے کے ناطے سے ان ایجنسیوں نے بہت مفید کام کیا ہے۔

(۵) ہزاروں کشمیری مزدور ریاست سے باہر دوسرے صوبوں میں محنت مزدوری کرکے پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے خاص خاص جگہوں (مثال کے طور پر شملہ) میں مستقلاً آتے جاتے ہیں اور انہوں نے وہاں مکانات کرایہ پر سارا سال کے لئے لئے ہوئے ہیں۔ تجارتی ادارے ان کشمیری مزدوروں کے مفاد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے اوپر لکھے ہوئے خاص حالات کی بنا پر اور اپنے اہم فرائض کی وجہ سے یہ تجارتی ادارے اپنی موجودگی کو بجا ثابت کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ ادارے ریاست کی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں ایک اہم کڑی ہیں۔ اس بات کی پرکھ کہ ان اداروں پر ضرورت سے زیادہ خرچ ہوتا ہے، اکاؤنٹس کے ماہران کا کام ہے لیکن یہ کہنا کہ ریاست کے لئے ان تجارتی اداروں کو قائم رکھنا ایک تعیش ہے، بجا نہیں۔

غنی کاشمیری

(بقیہ از صفحہ ۱۳)

میں نہیں آرہا تھا۔ وہ انجمن میں تھا، دوسرا مصرعہ یہ تھا:۔

کہ از لباس تو بوی کباب مے آید

غنی نے جب یہ مصرع سُنا تو فوراً پہلا مصرع کہا:۔

کرام سوختہ جاں دست زد بدامانت
کہ از لباس تو ... ...

غنی کے کلام میں مضامین کا تنوع ہے۔ آپ نے تصوف کے رموز بھی آشکارا کئے ہیں۔ حسن وعشق کے لطیف جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ درس خودی، اخلاق، دنیا کی بے ثباتی، احباب کی بے مروتی اور اس نوع کے دوسرے خیالات بھی حکیمانہ فکر ونظر کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو؎

بسکہ بلندی و پستی شُد ز شعرم برطرف
مے شود ہر مصرعم با مصرعہ دیگر طرف
سرکشی با زیردستاں باعثِ شرمندگی است
آبرو ریزد چو گردد شیشہ با ساغر طرف
آخر از بے جوہری باید سپر انداختن
گو مشو آئینہ ہر دم با رُخِ دلبر طرف
عزتے داریم در شہر جنوں کز راہ دور
سنگ مے باید باستقبالِ ما از ہر طرف
سوزِ عشقے ما ز حرفِ سرد ناصح کم نشد
گرمیٔ آتش نمے گردد ز سرما برطرف
نیک و بد را امتیازی نیست در بازارِ دہر
مے شود در ہر ترازو سنگ با گوہر طرف

سادہ لوحاں را نباید تربیت کردن غنی
گشت چوں آئینہ روشن شد بر دشمن طرف

مانی جائسی

نذرِ غالب

محبت میں وفا کا نام ہی پھر درمیاں کیوں ہو   جسے غم ٹھوکروں کا ہو وہ سر بر آستاں کیوں ہو
جفائے دوست کا شکوہ، نصیبِ دشمناں کیوں ہو   کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ ہیں مختار، حق ناحق سزا جس طرح چاہیں دیں   گناہِ عاشقی کا بے محابا ہم سے بدلہ لیں
یہاں سودا وفا و عشق کا ہے جوش زن سر میں   وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا گہرائی میں دل کی رازِ الفت کو   مگر دھوکے میں فاش اک دن کیا اس رمزِ فطرت کو
کہا کیوں حالِ دل، اب رو رہا ہوں اپنی قسمت کو   کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو

ستم تیرا جب اے بے درد، دردِ لا دوا ٹھہرا   سکونِ یاس ہی جب زندگی کا آسرا ٹھہرا
یہ کہہ کر منزلِ غم میں دل نے مدعا ٹھہرا   وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ادھر تو ہے بہت نازک ترا احساسِ درد و غم   بلاؤں میں ادھر گزری ہے میری عمر بیش و کم
مگر ہر بات تو ہوتی نہیں دیباچۂ ماتم   قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جو تم سے کہہ رہا ہو یہ کہ میرے دل میں آ جاؤ   اسی اک خام کارِ عشق سے یہ بات فرماؤ
گریز اچھی نہیں، پھر بھی محل کہنے کا جب پاؤ   یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

تغافل کے لئے حیلہ اگر یہ ہے تو اچھا ہے — مگر پھر بھی کہوں گا میں کہ یہ انداز بے جا ہے
کسی کو بے خطائیوں بھی کوئی الزام دیتا ہے — غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو، گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو

فلک کی فتنہ سامانی سے دِل ایمن ہے بے غم ہے — سرِ چرخِ جفا پرور تمہارے پاؤں پر خم ہے
تباہی کے لئے کافی تمہارا لطفِ مبہم ہے — یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ آنسو رُخ پہ بہتے ہیں — بنامِ آزمائش اہلِ دِل خاموش رہتے ہیں
جو کچھ کہتے بھی ہیں میری طرح اِتنا ہی کہتے ہیں — یہی ہے آزمانا تو ستانا کِس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ہے نامِ نیک کی دشمن ہوس کی بزم آرائی — بُری لیکن کہاں وہ بات جو تم کو پسند آئی
تمہاری گفتگو ہے مصلحت کی کارفرمائی — کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے مِلنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو!

ہے مانی کی طرح تو بھی ہلاکِ جستجو غالب — مگر یوں بھی کہیں ہوتی ہے عرضِ آرزو غالب
یہ گستاخانہ باتیں اور اُس کے رُوبرو غالب — نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

ریاست جموں وکشمیر میں زراعتی ترقی

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے چار سالوں میں زراعتی ترقی کے میدان میں مندرجہ ذیل کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں:-

(۱) زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے دوسرے پانسالہ منصوبہ کے پہلے چار سالوں میں ۲۱ء۲ لاکھ من کھاد تقسیم کی گئی۔

(۲) باغبانی کو وُسعت دینے کے لئے پھل دار پودوں کی ۴۵ نرسریاں قائم کی گئیں

(۳) مالیوں کو باغبانی کی تربیت دینے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں ۱۸۸ مالی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

(۴) چھ اضلاع کو پودوں کی حفاظتی سکیم کے تحت لایا گیا۔

(۵) مکئی کی نشوونما کے لئے ایک سٹیشن قائم کیا گیا۔

(۶) دھان کی دوہری فصل حاصل کرنے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ (۷) ۲ زراعتی کالج سوپور کشمیر اور رنبیر سنگھ پورہ جموں میں قائم کئے جائیں گے۔

سراب

پت جھڑ کے دن تھے۔ سورج کی کمزور ترچھی کرنیں اپنا دامن سمیٹ رہی تھیں اور سایے پھیلتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سرد ہوا کا جھونکا آکر زرد خشک پتوں کو کپکپا دیتا اور وہ دبی سی سسکیوں کے ساتھ شاخوں سے الگ ہوکر زمین پر آگرتے۔

سفید برفاب سا کبوتروں کا جوڑا دیر تک بلندیوں پر پرواز کرتا رہا۔ دونوں پرندے ایک دوسرے کا طواف کر رہے تھے ... ... معصوم آج بھی اسی کھڑکی پر کھڑا کبوتروں کے جوڑے کو انہماک سے تک رہا تھا، جس کے سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک لمبی اونچی پختہ دیوار تھی۔ کسی قلعے کی فصیل کی طرح سخت اور مضبوط، جس میں کوئی سُراغ نہیں تھا، کوئی دروازہ نہیں تھی۔

کتنی بار معصوم کی نظروں نے اس کو بھید کر دیوار کے اُس پار کی دُنیا میں جھانکنا چاہا تھا۔ لیکن ہر بار اُس کی نظریں دیوار سے ٹکرا کر زخمی زخمی سی ناکام لوٹی تھیں۔

"اُس پار کی دُنیا کتنی حسین ہوگی!" ناکامی کے اس احساس کو کم کرنے کے لئے وہ غیر شعوری طور سوچنے لگتا۔ تصور میں کچھ خاکے سے اُبھرنے لگتے۔ اور وہ ان خاکوں میں طرح طرح کے رنگ بھرتا۔ تصویر مکمل ہوجاتی! معصوم کا سارا وجود پگھل کر احساسات کا ایک مجسمہ بن جاتا اور وہ دیوار کو پھلانگ کر، دھیرے دھیرے اُسی وادی میں اُترتا جہاں اُجلے دن تھے اور سہانی راتیں۔ پھول تھے، کلیاں تھیں، شہد کے چھتے تھے اور بادام کے شگوفے۔ جہاں ہر شام نیلے سرمئی آسمان پر ایک قوسِ قزح اُبھرتی ہے اور ہر صبح بادۂ گل رنگ کی طرح دمکتی ہے اور ساری فضا پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے۔ جہاں کسی ماتھے پر سلوٹ نہیں، کسی دل پر داغ نہیں اور کوئی جسم ننگا نہیں!

لیکن دھیرے دھیرے ایک دُھند سی چھا جاتی۔ دُھواں سا اُٹھتا۔ اور پھر معلق ہوکر ایک سخت دیوار کی صورت اختیار کرتا۔

کبوتروں کا جوڑا اب کافی اوپر پرواز کر رہا تھا۔ نیلے آکاش کی یہ لامتناہی وسعتیں اور سیماب کی طرح تھرکتا ہوا پرندوں کا جوڑا ——— معصوم کچھ دیر کے لئے دیوار کی سختی اور اُس پار کی دُنیا کو بھول سا گیا۔

جب سے معصوم یہاں قیام کرنے آیا تھا اور جب سے اُسے اس دیوار کی سختی اور اُس پار کی کسی حسین وادی کا احساس ہوگیا تھا تب سے اُس کی زندگی میں ایک عجیب سا لاابالی پن اور ایک عجیب سی بے ترتیبی آئی تھی۔ کمرہ دیکھو تو عجیب ویرانی سی ٹپک رہی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر، جوتے پالش کرنے کا برش ہے اور دانتوں کا برش، ایک کونے میں پالش کی ڈبیا کے ساتھ چپٹا پڑا ہے۔ لکھنے کی میز پر کوئی تصویر اوندھی پڑی ہوتی ہے — کتابیں، کاغذات فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں۔

پروین اب اُس کی اس بے دلی سے کافی تنگ آچکی تھی۔ کبھی کبھی اُسے معصوم پر اتنا غصہ آتا کہ وہ لڑنے جھگڑنے کے لئے تک تیار ہوجاتی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے، اُس کی یہ کیفیت ہمدردی میں بدل جاتی جب وہ معصوم کے چہرے کے اُلجھے ہوئے نقوش دیکھتی جن سے انتہائی کرب اور بے بسی جھلکتی ہوتی۔ اور وہ بغیر کچھ کہے ہی معصوم کے کمرے کو پھر سے آراستہ کرتی۔ کپڑوں کو قرینے سے رکھتی۔ کتابیں شلف میں سجاتی، لیکن کمرے کی یہ حالت تب ہی تک رہتی جب تک معصوم کے قدم کمرے سے باہر رہتے۔

اُس کی ذہنی کیفیت تھی بھی عجیب۔ دیوار کے اُس پار کی دُنیا کے بارے میں سوچتے ہی اُس کی طبیعت میں ایک نامعلوم سا والہانہ پن بیدار ہوجاتا۔ اور وہ اردگرد کی تمام چیزوں سے بے نیازی برتنے لگتا، یہاں تک کہ پروین سے بھی!

دفعتاً کبوتروں نے پرواز کرنا بند کی۔ اُن کے پروں کی برقی حرکت بند ہوگئی اور وہ ایک خاص رفتار کے ساتھ نیچے آنے لگے۔ نیچے اور نیچے۔ اور ساتھ ہی معصوم کی نگاہیں بھی جھکتی گئیں، جھکتی ہی گئیں، ایک رفتار کے

حافظہ۔ کبوتر دیوار کے اُس پار جا پہنچے۔ معصوم کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور نظریں دیوار سے ٹکرا کر پلٹ آئیں، جیسے کوئی اندھا اپنے اندھے پن کو بھول کر دوڑتا چلا جائے اور اچانک میں ایک آہنی دیوار سے ٹکرا جائے اور اُسے اپنے بے نُور وجود کا شدید احساس ہو جائے۔

اُس کے ہونٹ خود بخود بھینچ گئے اور وہ بے قراری کی سی حالت میں ناخنوں سے کھڑکی کی چوکھٹ کھرچتا رہا۔

"قسم کھا کر کہتی ہوں، کل ہی ترکھان کو بُلوا کر یہ کھڑکی بند نہ کروا دی تو کنیز کو پروین نہیں سمجھنا ــــــ" پروین نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایک ادا سے کہا۔

معصوم کھڑکی سے ہٹ کر عجیب انداز سے مسکرایا۔

"پروین تم سمجھتی ہو کہ حقیقت پر پردہ ڈالنے سے اُس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں موند کر روشنی کی حقیقت کو جُھٹلایا تو نہیں جا سکتا پروین!"

"اور آپ کی ہم سے یہ بے نیازی!" پروین کہنے لگی۔ "کیا مجبوری اسے؟ یہ کہ ہماری کوئی حقیقت نہیں؟ ہماری دُنیا دُنیا نہیں، سراب ہے جہاں سُورج نہیں چمکتا، چاند نہیں کھلتا؟"

"نہیں پروین ایسی بات تو نہیں ــــــ" معصوم عاجزی سے کہنے لگا۔ "لیکن ہماری دُنیا اتنی محدود، اتنی تنگ ہے کہ انسان آسانی سے [illegible]

بھر مار ہے کہ ان میں ایک اُلجھاؤ سا پیدا ہو گیا ہے اور ایک بے ترتیبی سی آ گئی ہے۔ کوئی قرینہ نہیں، کہیں کوئی ترتیب نہیں اور تبھی ..."

پروین بات کاٹ کر بولی ــــــ "اور تبھی آپ اس سب سے ڈر کر سراب کے پیچھے بھاگنے میں کوشاں ہیں۔ اور تبھی آپ حقائق سے خوف زدہ ہو کر سپنوں کی کسی انجان دُنیا میں رین بسیرا کھوجتے پھرتے ہیں۔ کیوں؟"

معصوم کے ہونٹوں کے کونے اس انداز سے پھیل گئے جیسے پروین نے کوئی نہایت ہی ہلکی بات کہی ہو۔

"پروین" ــــــ وہ ایک عجیب انداز سے کہنے لگا۔ "تمہاری یہ باتیں عام انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ انسان اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لئے عموماً ایسے ہی بہانے تراشا کرتا ہے، کیونکہ فطرتاً وہ شکست کھانے کے لئے تیار نہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو آج تک ترتیب پا سکی ہو۔ جسے گھٹن کا احساس نہ ہو۔ اور اسی احساس کی شدت نے میرے شعور کو ٹٹولا ہے۔ لیکن تم سمجھتی ہو کہ میں ہنگاموں سے ڈر کر کسی سُراب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر رُکا۔ تب دوبارہ کہنے لگا۔ "لیکن پروین جس دن یہ دیوار وقت کی گرفت سے آزاد ہو کر ڈھ جائے گی اُسی دن تمہارا سارا بھرم ٹوٹ جائے گا۔" کہتے کہتے وہ رُک گیا۔

پروین غیر متاثر سی چھیڑتے ہوئے کہنے لگی۔ "آپ رُک کیوں گئے؟ کہیئے نا، آپ کی یہ باتیں بڑی پُر لطف ہیں جو صرف آپ کی حساس طبیعت کی پیداوار ہیں۔ جس سے صرف شدتِ احساس جھلکتا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے شعور کو کس چیز نے ٹٹولا ہے۔ ورنہ حق بات تو یہ ہے کہ آپ فطرتاً حساس آدمی واقع ہوئے ہیں۔ چیزوں کی اس بے ترتیبی کو جس شدت سے محسوس کرتے ہیں اُس رفتار کے ساتھ آپ اُنہیں ترتیب نہیں دے سکتے۔ حالات جس تیزی سے کروٹ بدلتے ہیں اُس تیزی سے آپ اُن کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس سے آپ کے ذہن میں ایک اُلجھن سی پیدا ہوتی ہے اور نتیجہ کے طور پر آپ اس سب سے بھاگ کر سپنوں کے کسی تنہا گوشے میں پناہ لیتے ہیں۔"

پروین کی ان باتوں سے معصوم [illegible]

بوجھ محسوس ہوا۔ بڑی عاجزی سے کہنے لگا ــــــ "پروین تمہاری ان باتوں میں کسی فلسفے کی موٹی کتاب کا سا وزن اور اُلجھاؤ تو ہے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں جو دِل کو چھُو جائے۔ جس سے دھڑکنیں تیز ہوں اور ..."

"اسے ہے!" ــــــ پروین کو اُس کی اس بے بسی پر پیار سا آ گیا۔ اور اُس نے اُس کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے بات کا رُخ بدل دیا۔ "آپ تو ایسی باتیں کرتے ہیں جو عورت ہونے کے ناطے میری سمجھ سے بھی جاتی ہیں ــــــ" معصوم مسکرایا اور دونوں کمرے کے باہر چلے گئے۔

اُس رات معصوم مسہری پر دیر تک کروٹیں لیتا رہا۔ اُسے اپنا سر

[illegible] محسوس ہو رہا تھا۔ پروین کی باتوں نے اُس کے دل پر جیسے ایک یخ بستہ وزنی پتھر رکھ دیا تھا اور سب کچھ منجمد ہو گیا تھا۔ ایک حسین تصویر کی نقاب کُشائی سے پہلے ہی۔ جیسے پروین نے اُس پر فراشیں ڈال دی تھیں۔ معصوم دیر تک یخ بستہ تصورات میں حرارت لانے کی سعی کرتا رہا اور اس کوشش میں اُس کی کلپنا نے کئی بار کھڑکی کے سامنے کھڑی دیوار کو پھلانگا، یہاں تک کہ وہ تھک گیا اور اُس کے انگ انگ سے ٹیس سی اُٹھنے لگی۔ ماتھے پر کچھ سلوٹیں اُبھریں اور پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔

باہر پت جھڑ کی خشک ہواؤں نے خاصا زور پکڑا تھا اور کالے کالے بادل چاندنی کے زینوں کو آہستہ آہستہ توڑ کر زمین سے الگ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ آخری زینہ بھی ٹوٹ گیا اور چاند بادلوں میں کہیں کھو گیا۔ تب گرج کے ساتھ بوندا باندی شروع ہو گئی ـــــ آسمان پر بادلوں کی ایک اور موٹی تہہ بچھ گئی اور بارش طوفان کا زور پکڑ گئی۔ کوندا لپکا اور بجلی کسی ٹھوس چیز پر گری۔ معصوم کے ماتھے پر بے ترتیب سلوٹیں اُبھریں اور غائب ہو گئیں!

صبح جب وہ جاگا تو پروین اُس کے سرہانے کھڑی عجیب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ معصوم کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ پروین اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑکی کی طرف لے آئی۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رُکی۔ پھر کھڑاک سے کھڑکی کھولی ـــــ

معصوم پر جیسے بجلی سی گری۔ ایک دھماکہ ہوا۔ اور اُس کے تصورات کا خزینہ لُٹ گیا۔

دیوار گر کر چُور چُور ہو گئی تھی اور سامنے ایک وسیع قبرستان تھا۔ بارش کی وجہ سے کچھ قبریں دھنس گئی تھیں اور جگہ جگہ زمین میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اُس نے بھیگی ہوئی نگاہوں سے پروین کی طرف دیکھا اور جواباً پروین نے مسکرا کر اُس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

کبوتروں کا جوڑا آج اُن کے چھجے پر تھا!

یہ پُر اسرار سرزمین

(صفحہ ۳۹ سے آگے)

یہ رسم خشک سالی کے زمانہ میں ادا کی جاتی تھی۔ ماریہ یا موریہ قبائل کی عورتیں بھی آج کل نقلی مونچھیں لگا کر مردوں کے لباس میں باہر جاتی ہیں اور بکروں، خنزیروں کا گوشت دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ اس عرصہ میں مرد عورتوں کا کام کرتے ہیں۔ گونڈ قبیلہ کی عورتیں مردوں کا لباس پہن کر جنگلی پرندوں کو بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ چھوٹا ناگ پور، اوراؤں اور کول کے علاقوں میں آج بھی اس قسم کی رسمیں آدی باسیوں میں موجود ہیں۔

عورتوں کی سرزمین کے قصص اور مذہبی کہانیاں کے متعلق دَورِ حاضر کے ایک مشہور نقاد اور محقق ڈبلیو، بی مائٹ نے لکھا ہے کہ ان کے رائج ہونے کی وجہ ایک نفسیاتی ضرورت کی تکمیل ہے۔ ان داستانوں میں دراصل مرد کو نشانۂ تضحیک بنایا جاتا ہے اور ان کی نااہلیت ظاہر کر کے مردوں اور عورتوں کی مساوات پر زور دیا جاتا ہے۔ ان میں معنوی طور پر یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ ملک اور اس کی املاک پر مردوں کی طرح عورتوں کے بھی مساوی حقوق ہیں۔ اس نظریہ سے قبائل کا جذباتی توازن برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ نفسیاتی ماہرین کی رائے میں ان قصّوں کی دل چسپی کے ساتھ ہی ان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان سے قبائلی معاشرہ میں عورتوں کی اپنی موجودہ پوزیشن مستحکم ہوتی ہے جو یقیناً آج بھی مردوں کے مقابلہ میں کافی بلند ہے۔

ریاست میں اُردو کی ترویج

جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے حالیہ اجلاس کے دوران وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد نے ترقیِ اُردو کے لئے کئے گئے اقدامات سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "مڈل سٹنڈرڈ تک تعلیم کا ذریعہ اُردو ہے۔ ریاست کی کلچرل اکاڈمی بھی اُردو کی ترقی کے لئے مؤثر اقدامات کر رہی ہے۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ محکمہ اطلاعات کے زیرِ اہتمام اُردو کا معیاری ماہنامہ "تعمیر" شائع کیا جا رہا ہے۔ جس کی مُلک بھر میں تعریف کی جا رہی ہے۔"

رسا جاودانی

مدنو

پیٛنہٕ چانِہ چھم یُتھ آشں مدنو
لٹہ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو
زالہٕ گلِ لیُچ تی ادس کارِ تقدیر   تقدیرس لوگ نسہ کینْہہ ترٕ تدبیر
کوٗت کالاہ تھاوٕہن بستہٕ نخچیر   استہٕ ڈج کرِ منی دستہٕ زنجیر
زالی زُلفن کرِ زہے واش مدنو
لٹہِ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو
رازِ عشقُن تھاوُن گژھہٕ مستور   سیرِ پنُنُی باوُن چھُنہٕ دستور
نتہٕ عاشق ہرگز چھُنہٕ معذور   تمہِ فیصلے دارس کھوٗت سہٕ منصور
رازِ عشقُن کوٗر تمی فاشں مدنو
لٹہِ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو
شمع رودیس میٛنہٕ کرُسے پوپرِ گتھ
گنجِ حسنس گژھی کیٛژاہ چھتھ   یُدٕ ژہٕ کرہک امہِ ونہٕ نگہ اکہ کتھ
بوہ ترِ ونہا چھک ژہٕ خوش باش مدنو
لٹہِ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو
خط و خالس لوبن دِل چھم اکثر   عقل حیران دِلِ شیٛشہٕ شکل
نقلِ آخر اصلس کوٗچ چھُ رہبر   یہٕ چھہ صورت ترٕ کینْہہ تھا آسہٕ صورتگر
پان نقشک کیتھو نقاشں مدنو
لٹہِ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو
جلوہ ہاوِتھ لازِم چھُنہٕ پرہیز   خارِ عشقُن ژیٛنہ کوٗر تمہ داریاہ تیز
پیالہٕ صبرک رودُس از چھہ لبریز   شہ ترِ غزلاہ ونہے شِکوہ آمیز
چھُنہٕ لفظن تیژ گنجائش مدنو
لٹہِ انتم گژھہِ منز گاشں مدنو

اگست ۱۹۶۰ء   ۶۷   میر

سام چند درٗ
لائبریرین ریسرچ ڈیپارٹمنٹ

رٛیشہ پیر پنڈت

مُلکِ کشمیر چھُ پرانہِ زمانہٕ پیٹھٕ اہلِ سخنو علاوہ خدا دوست اہل اللہ بُزرگن ہنز تہِ جائے اوسمُت۔ یِمن خدا دوست بُزرگن ہنزد عبادژ تہٕ کشف و کراماژ و کِن تہٕ چھہ یِہُ لوکٕو مُلکن سٕنٛیٹھاہ شہرت حاصِل کرٕمژ۔ یتہٕ مُلکس منز چھہ تعدٕ تعدِ دزِکٕو مشائخ تہٕ عارف اٰسی مٕتی۔ یِہنز مثال کُنہِ دوٛیمِس مُلکس منز ژھانڈنٕ چھہ سٕنٛیٹھاہ مُشکل۔ چنانچہٕ دُنیکِس چھس بہٕ توٚہہ یتہٕ ہِسی اکِس تعدٕ پایہٕ کِس خدا دوست بُزرگ تہٕ مجذوب کاملہٕ سٕندو حالاتِ زندگی تہٕ کارنامہ مختصر پاٹھی باوان یِہند ناو سٕنٛیٹھی مشہور بُزرگ آسنہٕ کِن چھہ کم از کم ساریٕ زانان۔ مگر یِہنزِ زندگی ہندیٚو حالاتو نِشہِ چھہ بے خبرتہٕ ژٕریٕ پاٹھی۔

یِہند … … بِر مذب۔ گ … اٰسکھ "پیر پنڈت پادشاہ ہر دو جہاں مُشکل آسان۔"

یِہند والد صاب یِسند ناو پنڈت گوٚندہ کول اوس، اٰسی روزان عالی کدلکِس بٹہ یارٕ محلس منز۔ اگرچہ یِم اٰسی پننہِ وقتہٕ سٕنٛیٹھاہ دولتمند تہٕ متمول مگر بدٕ قسمتی تہِ اوس نہ یِمن محاندر بنیوٚمُت۔ آخر وارِیاہ کوشش کرِتھ کوٚر یِمو اکِس منزِم یارنہٕ ہندِ ذریعہ ہندہ وارہٕ علاقہ کِس گُشہ ہندِس گامس منز پانس نیتھر مقرر[1]

وننہ چھہُ آمُت زِ یلہِ پنڈت صاب ہیرازہ بنیتھ خاندر کرِنہ گے تتہِ یلہِ پننہِ ہشِ ماجہِ یِمن کُنہ نظر ترآو۔ تہٕ تمِس گُشہ ہنزِ بچہِ سٕنٛد اُوسِندو چھٕتو دال وُچھت عنش۔ لیکن وعدہ قرار اوس سٕنٛدمُت پٕزرک زمانہ آسنہٕ کِنو سٕنٛد کارِ طریوہ توہ انجام۔ مگر پنڈت صابنہٕ ہمُش ماجہِ اوس جگرس زامتِر وسندِ بجرک دودنوی۔ ہر وقت اُمس کوریہ ہندِ اولاد بنہٕ نچہِ فکرے کران۔

روایت چھہ زِ اتھ گامس منز اوس اکھ ناگہ رادا۔ یوٚت زِن امہ علاقکٕو ہیندو تہٕ مسلمان اٰسی گژھان پننیٚن مُشکلاتن ہندِ حل گژھنہٕ بابت۔ حسبِ روایت ہیوٚتھ امہِ بچہِ تہٕ اتھ ناگہٕ رادس پیٹھ یِن گژھن۔ کینٛہہ وقتاہ چھہُ گژھان تہٕ اکِ دوہہ چھہ یِہ … … اتھ ناگہ رادس پیٹھ داتھ بھگوانس کیٚہ سٕنٛیٹھاہ زار عاجزی کران تہ اچانک گیہِ امس بچہِ کنن منز یِہ آواز زِ "اے بٕڈٕ ماجہِ! ژٕ گژھ گرٕ۔ تتہِ اتُن پھٕٹو کوٚر یتھ ناگس پیٹھ۔ یتہِ نیرِی اکھ پوشہٕ گونڈ۔ سو پوشہٕ گنڈو ہن گژھ کھاون یِمہِ ناگہ منزو تہ پننہِ کورِ گژھ تتھ دِینہٕ مُشک ہیوٚن۔ تمی سیتو سپدِہ چون مُشکل حل۔ تمِس کوریہ دِیا بھگوان رٕتہ اولاد۔ بچہِ ییتھوی یِہ

نٲگہاں از دور آمد بر درِ او بار خواہ
گفت باوئے گر بخواہی دلبرے گل پیرہن
آرم اندر عقدِ تو بخشی تو گر نقدی بمن
چند روزے شد رواں باسوزِ دل در دشتِ دور
تا فتادش در سوادِ موضعِ گُشن رہگذر

[1] بُود مردے فردِ عالم محتشم از احتشام
بندۂ گویند میگویند بُدٕ گویند نام
طاق از بے جفتی خود درویش اندوہ صفت
کوہِ غم بر دِل گرفتہ شب بدرو جفت جُفت
دیر زائے کور رعشہ موسفید و زُو سیاہ

تعمیر

آواز بُوز تہ سو وڈیِنہ کنِہ تہٕ گیہ گھرٕ پنُن۔ کینْہہ دوٕہ گژھت زیَن پَنُنْ کوٗر یعنی گوندہ کولِنْز زنانہٕ اتھ ناگہ ہنِہ پیٹھ پیٚتھ پھیرن۔ یتھوٗی یمہٕ ماجہ کورِہ اتھ ناگس پیٹھ واتِہ، تیتھوٗی گوٚو امہِ ناگہ منزٕ اکھ رنگابرنگ پوشہٕ گوندا پیٚدہٕ۔ بجہٕ ماجہ کھور یہ پوشہٕ گوندٕ ناگہ منزٕ تہٕ پننہِ کورِہ دِتُن اتھ مُشک ہیُن۔ مُشکاہ ہیٚنتھ درایہِ دوٚشوَے گھرٕ کُن۔ گھرٕ واتِتھ سوزِن یہ پنُنْ کوٗر پننِس خانہ دارس نِش سری نگر۔

ریٚتھاہ پتہٕ گژھان اما تہٕ گوندہ کولِنْز زنانہٕ چھہ دوزان بیٚنہٕ زِوہ۔ یہ بلہٕ بجہٕ ماجہ بُوز تہٕ سوٗ آیہِ گُتشہٕ پیٹھ زیَن پنُنْ کوٗر پنُن گھرٕ۔ اُمِس چھہ پننہِ حسابہٕ خلاص گژھنس کِنی دوٕہ روزان تہٕ نابہِ چھہ اُمِس ناوہِ کیٚنتھ سوپورہ کِنْز سری نگر سوزان۔ قدرتہٕ واٚلِ ہنز قدرتاہ پزِھ زِ اُمِس چھہٕ وتی آزار کران تہٕ سوپور کٲلِس نکھے چھہ یہ ناوہٕ منزی غلام سیدان۔ تہٕ چھس لڑکہٕ ہنا زیوان[۲] امہِ دوٕہ اوس سنہ ژور ساس ستھ ہتھ ترادہ (۴۷۱۳) دِیکہ گٹہٕ بیچہ شیمہ اُس زن عیسایِن ہندِس سنہ شراہ شتھ ستہ ترہٕس (۱۴۳۷ء) اپریلس ہیتو چھہٕ ہشر تھاوان۔ ریٚشہ بندہٕ دُعایہ خیرٕ کِنْز بنیمتِس نیچوِس چھہٕ ''ریوشوٗہ'' ناو تھوان۔ اتھ اُمسنزہ زینہٕ جایہ نزدیکی چھہٕ ویٚتھہِ نٚبطِس پیٹھ سوپورس منز ہیٚندیوٗ اکھ مندر تہٕ بنومُت۔ یتھ زن ''پیرہ شند مندر'' چھہ وَنان۔ آخر واتہٕ نأد ناو ہأنزہ لمان لمان سری نگر بشہ یار۔ گوندہ کولن ہلہٕ یہ نیوٗہ ترادہ دُن ستناہ تہٕ چھہ تہٕ خوشلی سیتی ویٚتھیٚوٗ یوت زہٕ جہان ژھنس تِن۔

دوٕہا دوٕہا چھہٕ گژھان تہٕ ''ریوٚش'' تہٕ چھہٕ لبان پَے غرٗہ کہٕ ہلالکی پأٹھو۔ یوتاہ زست ودہہ چھاوِن تہٕ ماٚلی ماجہ کوٚرِس خاندر۔ گوندہ کولس پیٚیہِ نہ لوٚش فرژِھ کیتھہ تہٕ خاندر کرنہٕ کیچھہ ریٚتہ پتے دوچھ تمہٕ اُچھ تہٕ ریوٚش گوٚو ببہٕ یتیم۔ گٲدران گٲدران گے بیٚیہِ دری پولِسہٕ،

ع۲ ساعتے خوش کردہ تا بہ سوپور آمدند
ہمچو دریائے روان باسُرعت وشتاب آمدند
بُود پاسِ شب گزشتہ زاد مہرِ خوش جمال
اخترے از برجِ بطن دختر فرخ خصال
تعیر

تہٕ ریوٚش ووت باہ[۱] وُہر۔ مگر دُنیاہکِس لوہ لگرس سیتی چھنہ کیٚنْہ لوی گوٚی تھاوان۔ یہ اوس صرف استانن تہٕ مندرن منزی سادن تہٕ فقیرن ہنزی صحبت کران۔ ماجہ کیاہ اُمس خبر زِہ میٚون ییچوٗ لبہٕ شہرتِ عام تہٕ لقایہ دوامیچ زینت۔ سو اُمس اُمِس ہر وقت دربدر پھیرنس پیٹھ پننِہ کِنْز روکان تہٕ ٹوکان۔ مگر ازلہٕ مقبول ریوٚش اوس نہ پننِہ ہنہ کینْہہ باز یوان تہٕ کیازِ اُمس اوس نہ خُدا دوستی ورأسی اندر کینْہی تران۔ یہ اوس مُرشدہ بندِس تلاشس منز جایہ جایہ پھیران۔

آخر تھوٗ اُمی پننِس دِلس منز ژتجہ ہن دوٕہن کوٹھہٕ کھوکھشہِ پتھہٕ پھیرن ہارہِ پربت گژھت دیوی طواف کرنک شرط۔ یہ شرط پالنہٕ خاطرٕ گوٚو ییتھے پأٹھو برابر کنہ تامہ[۳۹] ہن دوٕہن پربت۔ ژتجہہمہِ دوٕہ یلہٕ یہ ہارہِ پربتکِس دیوی آنگنس منز ووت تہٕ ہنگہ تہٕ منگہ دیوت اُمِس ماجہ شارکایہ درشُن تہٕ پرژھنس: ''ژہٕ کیاہ باگژھی؟'' ریٚشہ کوٗرس کھورن بوسہ تہٕ عرض کوٚرُن زِ ''ماتا میٚہ گژھہ گرُ!'' حکم سپدُس زِ ییٚس ژہٕ ونکِنس پتہٕ گوڈنی وُچھہ ہن سوٗی چھا گوٗی ژہٕ گرُ۔ آخر ووت کھوکھش کران کران ریوٚش ہاری آنگنس منز تہٕ اتہٕ چھہٕ وُچھان اکھ مستاناہ یلس اُکِس پیٹھ بہتھ۔ ریٚشہ کرٕ کھوکھشہِ منز تیزی ہنا تہٕ ووت اُمِس مستانس نِش تہٕ پیوس پیٚرن تہٕ کھورن۔ مختصر زِہ اتہٕ سکھیوس نہ مستانہ کینْہہ ژول تہٕ ووت ریٚشن گھرٕ۔ اوت واتِتھ وُدنُن ریٚشنہِ ماجہ۔ ''تلے ریٚشن جِگر دِتہٕ یوٗری یہ چھہ ہا تمأکو داماہ۔'' امہِ دھرم ماجہ دِژِس جِگر بر وہنہ کُن چِلمہ تیٚنگلاہ لَدِتھ۔ مستانن چیوٗ اکھ داماہ تہٕ وُونُس: یہِے دِزِہ ریٚشِس۔ تہٕ پانہ ژول۔ ییٚتِس وقتس تاز ووت ریوٚشی تہٕ گھرٕ۔ بتہ اتھہ ولوٚی وُدنِس ماجہ۔ ''ہتاکس تاز موٚتاہ اوسوٚی آمت۔ چِلمہ تھویتھے تموک برِتھ۔ دوٚپنے چوٚن۔'' ریٚشہ اُزِ ژکھ بسوہنہ کُن تہٕ پیٚنُن اتھہ لمُن، اکھ داماہ دیوتُن تہٕ کینْہہ نہ۔ دوٚیم دیوتُن تہٕ ریٚشِس پیٚیہِ معرفتُچ تِنْبراہ تہٕ کھولیس اُچھ ہشہِ تہٕ سپُد محمود۔ اتہٕ چھہٕ سوال پیدہ سپدان زِ یہے مستانہ اوس تہٕ کُس اوس تہٕ کتھ کُک اوس؟

ماؤز جایہ اوس بتہ کالہ اکھ دولت مند بٹ میًا روزان۔ تمس اوس ناو لالہ کاک۔ یہ اوس حاجت مندن دِوان اوزم دیار تہٕ پتہٕ اوس گژھان تہنٛد گھرٕ دِتھ دیار اوگراوُنہٕ۔ اکھ دوہ اکھ چھُ بنان زِ یہ بٹ صاب گو پرگنہ نچلی ہندِس اکِس گریستس اوگرایہ۔ اُمس گرِسیس بأیِس سیتھٕ تچکاو مکاو کرِتھ چھُ گھرٕ کُن واپس نیران۔ وتہٕ چھُ وُچھان معجزہ زِ اکھ دانہٕ ہورا داندہ وأکُلی سندِہ ورأمو پانٕٹے زمین تلّان تہٕ سیتی چھُ وُچھان امہِ زمین ڈُوُرِہ چھ بیرہٕ پیٹھ اُمِس زمیندارہ سُند، یس یہ اوگرایہ گومت اوس، موہینو کوٹ چھنین جندن ٹیبہ دِوان۔ پنڈت گو یہ نظارہ وُچھِت حیرانی۔ مگر ژاٹن ووُل اوس۔ سوچناہ کرِتھ وُٹُن پانسی سیتھٕ زِ مُیس گھرس منز چھُ کیاہ تاز سِر۔ یہ سوٗچِتھ پھِرُن گرِس جلو تہٕ گو گرِیس سُند گھرٕ واپس۔ گریستس کھُژ باپأرِ وُچھِت اُندرو کِنہٕ تیرِی گمر پینٛرِ کِنہٕ سیٹھی عزت کرِتھ پرژھنس زِ توہہ کیازِ دھراو آو واپس۔ پنڈت صیُبن وُونُس زِ یس ژنٛہ موہینو کوڑہن چھےَ سہ دِن سہ مینہ سیتھ۔ کیازِ بُہ چھُس نہ بجرہ کِنہٕ ہیکان لاکمہ تعف کرِتھ تہٕ سہ پکِیم گرِس بروٗنہہ بروٗنہہ۔ پِیٹھ زن بُہ آسائشہ سان گھرٕ پنُن واتہٕ۔ زمین داران وُونُس واپس۔ "بوٗن دھراہ تہنٛد اتھہٕ کِنہٕ چھ ژٹھتو۔" یہ وُنِتھ انہٕ نوٗن آلو دِتھ تہٕ کورُن اُمِس بٹ صأبس حوالہ۔ گرِس سندِہ گھرٕ پیٹھہ زمینہ مُہاراو کِتھ وُنِتھ پنڈت صیُب گرِہ پیٹھہ بوٗن تہٕ چھُ دیان اُمِس لُڑکس۔ کھس سہ گرِس تہٕ بُہ کرےَ بروٗنہہ بروٗنہہ تعبِہ ہن۔ اُمو ہیٛوتھ وُدن تہٕ گو گنٛدرِتھ چھُس کران نارہٕ پارہٕ "نہ بنہٕ واز تہٕ کتھ پأٹھو بنہٕ۔ اگر مینٛہ کانہہ غلطی گیہ تہٕ معافی گرٛھیم دِزِ۔ پنڈت صیُب وُتھُس واپس زِ ہے بجایا — اگر ژٕہ ہند وجھل کرکہ تہٕ بُہ کرےَ سیرس فاش۔ آخر زون اُمو فقیر پوشیدن زِ یہ بٹ صیُب چھُ میانِس سیرس کتھہ تاز پأٹھو واقف گومت۔ یہ بوزِہ نہ دوہ ذ کینہہ۔ پنڈت صیبس کُن وُونُن زِ "تیلہٕ کھسو دوہشوےَ۔ کھتو دوہشوےَ گرِس۔ لالہ کار کھوت پتہ کِنہٕ تہٕ یہ لُڑکہ ہن رُٹُن بروٗنٹھہ کِنہٕ۔ واتان واتان وأتی پرٛن دور پنڈت صیُبن گھرٕ۔ مگر

تعبیر

یتیمہ چھُ خیال پیوان زِ آخر یہ لُڑکہ کُس اوس۔ روزن وول کتیوک اوس تہٕ مول مأجو کُس اوسس ؟"

پرگنہ نچلی ہندِس گامس منز اوس اکھ کھتریاہ روزان یُس سُند ناو نرنجن کھترہ اوس۔ سیٹھاہ دیارہٕ وول آسِتھ تہٕ اوس نہ اُمِس اولاد کینہہ، ہر وقت اوس فکرےَ کران۔ دوہ اکھ بیٹھ زِ یہ چھُ پنٛنِس دُکانس پیٹھ بِہتھ تہٕ پیرِ مرداہ اکھ گو پیدہ۔ نرنجن چھُ اُمِس پیرِ مردس پرژھان زِ وُنو دھراہ کیاہ چھُ حکم۔ کتہٕ پیٹھہ آوہ پیرِ مرد وُتھُس زِ ژٕہی وننہٕ ژٕ کیاہ گژھی ؟ نرنجنس ژوُل ہکہ نیرتھ زِ اولاد دھراہ گژھم۔ پیرِ مرد وُتھُس زِ فلأنِس کوہس پیٹھہ چھُ اکھ فقیر کامِلاہ ریاضتس منز مشغول آسان۔ توٗہی گژِھو دوہشوےَ بأژ تُرِ تہٕ تمِس کرِو زارہ پارہ۔ دِیُوہ بھگوان تہنٛد مطلب انجام انہٕ۔ یہ وُبراوِت گو وُچھان وُچھان غائب۔ پگاہ پھوٗل گاشہ تہٕ نرنجن ترٛچ پننٛو زنانہ سیتھٕ تہٕ وأتی تتھ کوہس پیٹھ یتہٕ یہ پیرِ کامِل اوس روزان۔ کُنہ کال تاز بِہتھ تہٕ چھُنہ فقیر کامِل یمن کُن نظرِ کران۔ آخر قدرتہٕ دأکُل سُند کرُن زِ اُمو فقیرن وُون یمن اورےَ "گژِھو خدا صیُبن کوز تہنٛد مشکل حل۔" تو ہہ بنہٕ دِہ تیٛوتھ اولادیُس سُند ناو قیامہِ دُنیاہس تاز روزِہ زِندےَ یہ بُوزِتھ گے نرنجن کھترِ ذ دوہشوےَ بأژ خوشش تہٕ گھرٕ پنُن گے اسان تہٕ وِیسان۔ نو ژنٛتھ گے ادا تہٕ یمن زاو نیچوا تہٕ ناو کورہس "میان شاہ"۔ یم چھ اُمِس للہٕ منزُل کران۔ کینٛہہ وُری گے تہٕ یم کھترِ سندِہ دوہشوےَ بأژ گے مرِتھ۔ یہنٛد یہ مُنگو مُنگو اونمت نیچُو گو یتیم۔ خدایہ سُند کرُن زِ یہ لُڑکہ اوس بروٗنٹھی اُمِس دوستِ خدایس نِشہ تمِس ماجہ سیتھٕ کُنہ کُنہ یوان گژھان۔ امی کِنہٕ یلہٕ نہ اُمِس دُنیاہس منز او پنُن کُھنی بوز نہ تہٕ یہ گو اُمی فقیر کامِلس نِشہ یمہِ سندِہ دُعایہ خیرہ کِنہٕ یہ عالم وجودس منز اوس آمت۔ اُمو فقیرن ڈول اُمِس پنُن اتھہٕ تہٕ کرُنس بیعت۔ امہِ پتہٕ کینٛہہ وقتاہ گژھِت کورُن اُمِس زمیندارس حوالہ۔ وُتھُس زِ یہ ژٕہی زن کامہِ کو چھِ یی بکار۔ اُمِس اوس اُمو فقیرِ کامِلن بیعت کرِتھ عبدالرحمٰن

مانک شاہ ناو تھوومُت۔ یہوّی لڑکہٕ واتہٕ نوو لالہ کارن رٕنیٖ دور
چِنُن گمرہ تہٕ بیٛہہ لوٗن کنھِس اکِس اندر تہٕ پزٕھ پانٛٹھو
پدس خدمتھاہ کران۔ مانک شاہ صیٛب اوس دوہس نیٖندرہ
کران تہٕ راتس پننِس ریاضتس تہٕ یادِ خدااہس سیٖتؠ مشغول
اسان۔ تہٕ کیازِہ سہ

عارفوں کا روزِ روشن جاہلوں کی رات ہے
جاہلوں کا روزِ روشن عارفوں کی رات ہے[۳]

کینٛہہ وقتاہ چھُ گذران تہٕ لالہ کارس تہٕ چھُ ینیو زٕیوان سیٖٹھاہ
لٕہمَن آسنہٕ کنٛز چھُ مانک شاہ صأب اُمِس "کرشنہٕ" ناو کران۔
ذات اُمِس کار۔ یہ اوس ہر وقت مانک شاہ صأبس نِشے
دوتھان، بہان تہٕ گنڈان۔ واتان واتان ووت یہ ستھ وُہر تہٕ
لالہ کار گو مرِتھ۔ لالہ کارنہٕ زنانہٕ کوٚر وَدنہٕ پِدنہٕ روٚستوی جُرتھاہ
یہ اُمِس نیٚنِس خانہ دارہ بینٛز لاشہٕ ترأون مانک شاہ صیٛبس
بروٚنٛہہ کنہٕ تہٕ چھس زارہ پارہ کران زِ یُمِس کُنِس نیچوِس کُس
صیٛبہ لاگیم یونہٕ۔ امرِ خدای تہٕ بیٛیہ مانک شاہ صیٛبنہ کراماتہٕ ہنٛزہ
مہربانی کنہٕ گو لالہ کار بیٛیہ زِندہ تہٕ تمہِ پتہٕ رُود وُری وُہنۍ مرہ
بندٕے۔ مگر یہ کرشنہ جی اوس مانک شاہ صیٛبنہ صحبتہٕ منٛزی ہردم
روزان۔ یمہ کنٛز بتہٕ بنیوٚ مستانہٕ تمسنٛزہ مہربانی کِن۔ لالہ کارنہٕ
ہنٛز پتہٕ دروار امہِ مکانہٕ منزہ، یُس مکانہ وُنہٕ تہٕ اڈہ لیوٚک
وجوٗدی چھُ۔ مانک شاہ صیٛب تہٕ ہیوٚتھ اتھ محلس منز مأرہ ہندِس
طرس پیٛٹھ۔ اتھ مأر تھرس پیٛٹھ چھُ وُنکیس تہٕ اکھ مندر تہٕ
شید۔ یمن زن عام لُوک چھِ ونان "میشاہ صأبُن مندر" تہٕ "میشاہ
صأبنہٕ مُشید۔ تہٕ سأرِسی محلس چھِ ونان "میشاہ محلہ"۔ پوہہ گٹہٕ
ہ ستیوٚم دوہہ چھُ اتہٕ آسان عُرس۔ (تاریخ ۲۰ رمضان ۱۰۲۱ھ
ات یافت۔ تاریخ وفات شیخ مانک (واقعات کشمیر از محمد اعظم
دیدہ مری)

[۳] شریمد بھگوت گیتا ادھیای ۲ شلوک ۶۹
("مخزنِ اسرار" ترجمہ گیتا جی از محو دہلوی)

یہ ہو اکھ بوٚڈ دوہہ چھُ یُس زِن سرینگرکہٕ ہیٚندو تہٕ مسلمان اکے
دوہہ تہٕ یکہٕ وٹہٕ چھِ مناوان۔ مختصر یہ زِ یہ ہو لالہ کارُن نیچو تہٕ
میشاہ صیٛبُن ٹوٹھ تہٕ زوچھُت ژاتھ کرشنہٕ کار اوس سہ مستانہٕ
بیس ماہ شارکایہ سوز دِتُھس گرٕ وٚنتُس پامرشد[۵]
کرشنہٕ کارس گرٕ حاصل سپدِتھ کرٕ پیر صیٛبن سارٕمن ژھ واہ
وُرِین اکِسی جایہ بہِتھ ریاضت۔ ونہ چھُ یِوان زِ پتھ میٛچن
اسہ کٔلہ کٔڈِتھ تِمہِ سی جسمس پیٛٹھ ٹھ نارہ چھِ ساڑہ ژھ واہ کانگرہ
ٹیکیو دوہس پیٛٹھ تراوان۔ یِژھی پڑھی سخت ریاضت کرنہٕ کنٛز
کرٕ اُمی اکِس مجذوبِ کاملِس سند درجہ حاصل۔

کأشرِین بٹن منز چھِ یہ روایت مشہور زِ پیر صیٛب اُسہ پننہٕ
عبادژ کنٛز بیتہٕ سیٖٹھاہ کامل بنیمتی زِ ہیٚندو تہٕ مسلمان اُسہ بنے دلہٕ
پانٛٹھو واتان، یمن لِس پننین مشکلاتن ہندہ حل کرنہٕ باپت۔ سیٖٹھاہ
کشف و کراماتہٕ تہٕ معجزہ[۶] ہاوِنہٕ کنٛز سپدو پیر صیٛب کشیرِ منز یِیتہٕ
مشہور زِ یمہ کنٛز لُوکو ہیوٚتھ یمن وَنُن "پیر پنڈت پادشاہ۔" یہ خبر
وُزِتھ ژاو اورنگ زیب عالمگیرس، یُس تمہِ وقتہٕ ہندوستانک شہنشاہ
اوس، الغرض اکھ بٔ پادشاہ تہٕ بیٛیہ ریشہِ پیر۔ تمہٕ سوزِی دِلہِ پیٛٹھ پیر
صیٛبس رٔژِتھ نینہٕ خأطرٕ ینڈیل[۷]۔ پیر صیٛبس نِش یُتہٕ تمہٕ ینڈیل واتی
تہٕ تمو کرہ نوو تہندِ کھینہٕ چینک انتظام تہٕ دٔوپنک پگاہ گاشہ فولتہٕ

[۵] درمکانِ سیٛدہ پنڈت از دُور آمد در نظر
برسرِ سنگِ گران مستانۂ شوریدہ سر
در شرابِ معرفت مست و بدل ہوشیار بود
کرشنہ کارش نام عوشدل زندۂ بیدار بود

[۶] کشف و کرامات کے کرنے کی بنا پر ہی مولوی بھولی صاحب نے پیر صاحب کے
متعلق یہ عارفانہ تاثرات فرمائے ہیں کہ دِتِس یہ بیٛیہ تبرا۔ مگر وُہہ ناچن
گیٛس۔ آخر دژاو لایہ گرٕمی"

[۷] تاریخ گلدستہ کشیر از پنڈت ہرگوپال کول خستہ۔ جناب خستہ
مؤرخ ہی نہیں تھے بلکہ شاعر بھی۔ انہوں نے مثنوی "ہیمال و ناگی رائے"
کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا ہے۔

پھوہ پرٛ تہٕ ہہٕ سیٹھاہ تہندس پادشاہس نِش)۔ از گو آیہ۔ رات کیتھہ تھوٚو کوٚر پیر صٲبن پننہٕ کمالہ کنہٕ کراماتھاہ زِہ یم پے راتھ منٛزی اورنگ زیبس نِشہ واتھتھ تہٕ پرٛژھہ ہس زِہ "دوہ سہ کیاہ گۄڈھی؟" اورنگ زیبن یتھوٚی رٚیشہ پیرٕ وُچھ تہٕ سیٹھاہ کانپیوو۔ شرمی تہٕ مُتقی مسلمان آسِتھ تہٕ سیٹھہٕ پیر صٲبنہٕ ریاضتہٕ تہٕ کشف وکرامژن ہُند مایِل۔ لیکھت دِیتُن زِہ "رٚیشہِ پیر پنڈت پادشاہی"، یُت نہ بلکہ "شوٗ بہِ رٚیشہِ پیر پنڈت پادشاہ ہر دو جہاں مُشکل آسان۔"[8] تہٕ لیوٚ کھوٚن تہِ وقتہٕ کِس کشیرہِ ہندِس صوبہ دارس، یُس زن سیف خان ناو اوس یمن گژھہ تھوٚن دیوہ سر پرگنس منٛز جاگیر مُقرر۔

پیر پنڈت پادشاہن اوس پانس کُن تمہِ وقتک سارٕی ژٕ دواہ پوٚنچی زر نیاز مقرر تھوٚومت۔ یُس رِواج دوٚنہٕ تہِ کانٛسِرین ٹبن منٛز چھُ مروج۔ مرحوم پنڈت آنند کول بامزیٚ چھہ ای برزُک تصدیق کرنہٕ خاطرہ "لائف آف رٚیشہ پیر پنڈت پادشاہ" کِتابہٕ منٛز لیکھان زِہ اکہِ دوہہ دُراے پیر صٲب بہوری کدلہٕ کس بازرس منٛز وانہٕ والین پیٹھہٕ تمام مرید ہیتھ زرنیاز جمع کرنہِ۔ لیکھنہٕ چھُ آمُت زِہ اتھ بازرس منٛز یم وانہٕ وٲلی اُسی یمن گو یہِ باج دِیُن ناگوار تہٕ نقد دِنہٕ بدلہ آیہ اُمِو بُکھ اُمین پیر صٲبس اَسس منٛز۔ یہِ حال وُچھتھ اَکہِ دوہہ گوٗری اَکہ تہٕ موٗ اُذن دوہہ لوٗٹاہ، بادام تہٕ خشبر ملہٕ ناویتھ تہٕ ہیوٗن پیر صٲب۔ یہِ وُچھت گے پیر صٲب اُمِس دوہہ گوٗرِس سیٹھاہ خوش تہٕ باقین پیٹھہٕ ناراض۔ مرحوم کول صٲب چھہ امہِ پتہٕ لیکھان زِہ امہِ یہنٛزہ ناراضگی ہُند نتیجہ دُراو یہِ زِہ سارٕسی بہوری کدلہٕ بازرس ہیوٚتُن ژٕ پاری نار تہٕ تمن سارنی وانہٕ والین ہندی وان سِوایہِ اُمِس دوہہ گوٗری سِندہ وانہٕ دِدی سارٕی۔ امہِ نارک تاریخ چھُ مرحوم ٹھاکر بھوٗ بھانی[9] سوانح حیات پیر پنڈت فارسی منظومس[10] منٛز "آتش زرگیر"[11] لیوٚکھمُت، یتھ بحسابِ ابجد ۱۱۳۸ ہجری سنہ چھُ نیران۔ یُس سنہ پیر صٲبنہٕ زیٚنک تہٕ مرنک سنہ درنظر اَنِتھ چھُ بالکل غلط۔ امہِ علاوہ چھُ مرحوم بامزیٚ اتھ ۱۱۳۸ اَکسَن ہجریس ۱۷۲۶ بکرمی سنس سیتھ ہشر ہاوان۔ یُس غلط چھُ۔ یہِ واقعہ یہنٛزِ کِتابو منٛزہ پرٛتھ چھُ تحقیق کرن والین نِشہ یا اپزٕ نتہ چھُ مرحوم پنڈت صٲبو تحقیق کرنہٕ ورٲی غلط سنہ مقرر کوٚرمُت۔ مگر کشیرِ ہندیو تاریخو منٛزہ چھُ نیان زِہ سنہ ۱۶۷۵ عیسوِیس (۱۰۸۶ھ) منٛز چھُ ملہِ افتخار خان صوبہ دار کشمیر اوس سرینگرس منٛز ۱۲۰۹۰ لرہ نارہ سیتھ دزمٕژہ، یتھ پیٹھہٕ ونُنہ چھُ آمُت زِہ

آں چناں آتش زِ قہرِ ایزدی آں شب فروخت
ہم دہ وہم دو ہزار و ہم نود خانہ بسوخت

پیر پنڈت اُسی سیٹھاہ جان فارسی خواندہ تہِ۔ یمہٕ کنہٕ کُنہِ موقعس پیٹھہٕ اُسی فارسی بیتہٕ بازی تہٕ کران[12] مثالہِ پاٹھو چھُ زِہ مُلا اخوند بدخشانی اُسی تہندی ہم عصر۔ تمن سیتھ چھُ یمو عارفانہ گفتگو فارسی نظمن منٛزی کوٚرمُت۔ چنانچہ اَکِس خاص واقعس پیٹھہٕ چھِک مُلا صٲبس دوٚپمُت زِہ سہ

عشہ (و) تاریخ کشمیر جلد دوم از محمد دین صاحب فوق صفحہ ۲۱۶، ۲۱۷
(ب) پنچایتن۔ پچستوی (رٚیشہ پرٕ ویر سنکھیپت چرتیمہ) از زنار دان بٹ مطبوعہ (سنسکرت) صفحہ نمبر ۳۶ شلوک نمبر ۳۰، ۳۱

عہ پنڈت صاحب مرحوم محلہ بدھر گیر (عالی کدل) میں بود و باش رکھتے تھے یہ پروفیسر تریلوکی ناتھ صاحب بھان کے دادا تھے۔

عنلہ پنڈت صاحب موصوف نے سنہ تالیف "چہ نظم دِل پذیر" دی ہے (۱۹۴۴ = ۹۱۲ + ۹۹۰ + ۸ ب)

سالِ طبعش باز جستم چون ز پیرِ بے نظیر
پیرِ عالم گیر گفتا دہ " چہ نظمِ دِل پذیر"

علہ گشتہ باخاکِ سیاہ یکساں نماند یک نشان
آتشِ زرگیر شمارِ سالِ آتش شد عیاں

۷۰۱ + ۲۰۷ + ۲۳۰ = ۱۱۳۸ھ

عہلہ بہارِ گلشن کشمیر جلد دُوئم از جناب برج کشن کول بے خبر مطبوعہ ۱۹۳۱ء

در مذہبِ گدایانِ مرسل نبی نگنجد
سامانِ بے نوایانِ القمان شد است مارا عسلی[۱۳]

روایت چھہ زِ مُلا مئیبس اوس شہزادہ داراشکوہ مُرید۔ مُلا مئیبس اوس پیر صاحبنہِ صحبژ سیتی یوُت اثر گومُت زِ اُمس ونہ کنِز کوٗر داراشکوہن، یُس زن علم سنسکرتک سُنجتہ عالم تہٕ اوس، ہندو مذہبہِ چہ فلسفی کتابہٕ، یِمن زن اُوپنشد چھہ وَنان، پرگنہِ پھاکہِ کس اُکس گامس منٛز بہتھ، یتھ ملہٕ شاہی باغ ناو چھُ، فارسی نثرس منز ترجمہ تہٕ ناو تھووُن "سِرِ اکبر"۔ امہِ مخطوطک ترٛیہ نُوٗر نسخہ چھہ ریاست جموں وکشمیرُکس محکمۂ ریسرچس منٛز محفوظ۔ یہ دُنیا چھُ آخر فنایی ہنٛزِ جاے۔ یمہِ کنِز ٹھاکور بوٗ بھانس چھُ پیوٗمُت ونُن زِ

میخورد از بازیٔ دورانِ چرخِ بدلگام
زخمِ شمشیرِ اجل گرمیر باشد یا غلام

پیر مئیب سپدی "بادشاہِ ہردوجہاں" لقب حاصل کرِتھ تہٕ شیشہٕ وُہر واٗنس چھاوِتھ سنہ ۱۶۹۷ عیسوییس (۱۱۰۹ھ) منٛز یمہِ دُنیاہ وِہکہ گنٛڈ پتھ چھہِ شیم دوہ لیئنسپہِ دوہ نہ امتہٕ امسی' انتر دھان۔

سال عمرش شصت بود کامدش پیکِ قضا
بر سرِ حکمِ قضا بنہاد گردن بر رضا

امہِ زمانہٕ اوس کشیرِ ہُند صوبہ دار ابو نصر خان۔ یِمہِ مرحوم بھان میئب چھہ کہِ تانِ غلط فہمی کنِز لیکھان زِ تمہٕ وقتہ اوس سیف خان کشیرِ ہُند صوبہ دار۔ یُس زن تاریخی حوالہٕ کنِز بالکل غلط چھُ۔ بہرحال ۲۶۳ وُری گذرِت تہٕ چھُ پیر میئبُن ناو تہٕ اعتقاد رٹہنز عبادژ تہٕ کشف وکراماژ کنِز لُکن منز موجود۔ تہٕ کمہٕ کنِز:۔

از عبادت پایۂ مردان رسد بر آسمان
لذ عبادت شیر مردان دیدہ ام بر لامکان

عسلہ سرمدؔ نے جو کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ایک قلندر گذرا ہے، اسی انداز کی ایک رُباعی اورنگ زیب کو کہی ہے ؎

تعمیر

علم دوست اصحاب سے!

آپ بھی ہاتھ بٹائیں تو کئی نایاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کی نشان دہی اور حفاظت آسان ہو جائے۔ ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز ڈیپارٹمنٹ معقول معاوضے قلمی نسخے اور تصویریں، پٹے اور دستاویزیں خریدتا ہے اور جدید سائنسی ڈھنگ پہ اُن کے رکھ رکھاؤ کا انتظام بھی کرتا ہے۔ آپ کے پاس ایسی کوئی چیز ہو تو ہمیں اس کی جھلک دکھائیے۔ اپنے آس پاس کہیں اور آپ نے ایسی کوئی چیز دیکھی ہو تو ہمیں سراغ بہم پہنچائیے۔ کسی بھی قلمی نسخے کو ردّی کے طور بیچنے سے پہلے ہمیں اس کی پہچان بین کا موقع ضرور دیجئے۔ کون جانے کام کی چیز نکل آئے اور آپ کو معقول معاوضے کا حق دار بنائے۔ گذشتہ دس برسوں میں محکمے نے ہزاروں روپے خرچ کر کے کئی نایاب نسخے حاصل کر لئے ہیں۔ آج کل ہمیں مندرجہ ذیل نسخوں کی خاص تلاش ہے

سنسکرت:۔ بِیل راج کی پارتھاولی (۱) بھچولاکر، پدم مہرا اور سوریت کی راجاولیاں (۳)، رتناکر کا رتن پُران (۴)، کھشیمیندر کی بیتاولی اور سنسکرت ناٹک وغیرہ (۵)، پراجیہ بھٹ کی راجاولی پتاکا (۶)، شری ور کا کتھا کوتک (۷)، گیستا پروس گپت لی ٹیکا (۸)، آبیل کی ترٹ بھگیا ورتہ (۹) چھم پرکاش

فارسی:۔ (۱) مُلا نادری، قاضی ابراہیم، محمد زمان نافع، مُلا بدیعی اور مفتی خیر الدین کی تواریخ کشمیر (۲) مفتی نظام الدین کا نظام الوقائع (۳) مرزا سیف الدین کا خلاصۃ التواریخ (۴) مُلا اشرف ڈیری اور مفتی صدر الدین کی ہیہ مال (۵) دیوانِ آذر کے مختلف نسخے (۶) رامائن (کسی ریاستی شاعر کی تخلیق) (۷) شہر آشوب، سفر نامے، بیاضیں اور تذکرے

کشمیری:۔ للہ واکھ (بہت قدیم نسخے) کلامِ نور الدین (بہت قدیم نسخے) بھشا و مار کا باناسر و دھا ور زین وِلاس، سوم بھٹ کا زین چرت، یودھ بھٹ کا زین پرکاش حبہ خاتون کا کلام (بہت پُرانے نسخے) ارنمال کا کلام (بہت پُرانے نسخے)

(اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمۂ تحقیق و اشاعت سرینگر)

سُلطان منم و منتِ سُلطان نکشم
از بہرِ دو نان منتِ دو نان نہ کشم
نفسم چو سگ است و من مثالِ سگبان
از بہرِ سگ منتِ سگ بان نکشم

(رباعیاتِ سرمدؔ)

اگست ۱۹۶۰ء

رباب

بوٚادٕسس زندگی ہندین غمن فکرن دوا ژھارن — بہ یکدم چاۓ مِضرابن رٕبابس زندگی بخشاوٕ

دٕزن ہیوٚ تہ ساز دسنطورن گٔژھتہ ہیوٚتہ سوٚدٕ گرچھِ حورن — ہواون چاۓ لے بوٗزِتہ نوٚ دی پیغام نیوٚ یارس

میٚہ چاۓ یِم تارہ دِلکس اضطرابس اتھ ربابس سیتۍ — کنن منز چاۓ لے ہنیتہ ناگہ سبزارس اکِس ودتس

ہنالوٚت کرتہ فن کارو بوٚ یارس پرارہ ہا ساتھاہ — ندمرس چانہ سازٕک شیرہ ہا تس لولٕ کین تھالن

ژٕہ یٚدٕ تیزی کرکھ سازس یِہ میچھر داوہ، جلدی — ژٕسے ژٕہی زندگی ہندہ باغوانو لولہ دیوانو

ون لوٚ سیتہ بوٚ یِہ مشبہارس کرِتھ شہلاہ مکو بندو نہ کن — ژٕہ گژھ وایَن تِتھوٚی سوزاہ دِلس یِمہ سیتۍ سرٕ پہ ہم

چھوٚ کن مہلامہ چھم چانے رباب چ تار زَن لاگان — ژٕہ یٚتھو تلک کرکھ ہا لالہ میانیو وادے وایان گژھ

چھُ مشکل دِل کڈن وابس لیے ذاۓ ژٕہ لیس وٕنہِ — چھِ زن چانِس بسں سیتۍ میانہ جانک دَم

میٚہ زن مستی چھِ باسان عالماہ پرٕیزہ لان — چھِ زن بترا تہ چانے تالہ پٕیتہ شوقس اندریتھ پرٕ میتراونٕ

ژٕہ یٚدٕ ٹھہرک میٚہ باسیم زندگی ٹھہر سیے — ربابس سیتۍ مِضرابس چھِ کُس یارانہ وتہ میے

مزٕ بکمنیتھ خونِ دِل ہاران چھِ مکُس سی بے قرار منزٕ — چھِ ما مِضرابٕ بی ژھاران چھِ ما مجبوٗریی گاران

حدیثِ دیگراں

بمبئی ۲۰ - عزیز محترم یوسف صاحب

عظیم ہستیوں کے عظیم کارناموں کا چرچا کرنا بھی کارِ ثواب ہے۔ آپ نے خالدِ کشمیر کی داخلی اور خارجی زندگی کا جو عکس اس بار "تعمیر" کے صفحات پر پیش کیا ہے اُس کے لئے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

"تعمیر" کا خالدِ کشمیر نمبر پسند آیا۔ اچھے اور مفید مواد کی فراہمی کے سلسلے میں آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ اب تک بخشی صاحب کو جو محض اچھا سمجھتے تھے وہ اس نمبر کو پڑھ کر انہیں اور اچھا سمجھنے لگیں گے۔ کیونکہ آپ نے بخشی صاحب کو "تعمیر" کے ہر پڑھنے والے کے بہت قریب لاکھڑا کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میری عقیدت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

اپنی تمام نیک آرزوؤں کے ساتھ! خلوص کار: سلمٰی کول

فسٹ فلور ۵ وکٹوریہ تھرڈ ایکس لین بمبئی ۲۰

جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "تعمیر"

السلام علیکم۔ جولائی کا شمارہ آپ نے عالی جناب بخشی غلام محمد کے لئے ان کی سالگرہ کے مسرت افزا موقع پر وقف کیا ہے۔ اس کے لئے آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ نے ملک کے بہت سارے لکھنے والوں کو عالی جناب وزیر اعظم کی سوانح حیات اور اُن کی مختلف النوع جاذب توجہ شخصیت پر لکھنے کے لئے مامور کیا۔ یہ آپ کی مدیرانہ کامیابی کا ثبوت ہے۔ ان لکھنے والوں نے دھیان اور توجہ سے اپنے موضوع پر خوب لکھا ہے، مگر جہاں ایک مقامی شاعر نے عالی جناب وزیر اعظم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہاں اس نے توجہ اور غور و خوض کو بالکل خیر باد کہا ہے۔ صفحہ ۷۳ پر ماسٹر زندہ کول کی کشمیری نظم "ترنم مکرر" کے عنوان کے تحت چھپی ہے۔ اس نظم میں جہاں شاعر نے اپنے ممدوح کی سالگرہ کی تاریخ نکالی ہے وہاں اُن سے غلطی ہو گئی ہے۔ "گیسو مطرب ترنم" یعنی مطرب نے ترنم گایا۔ بھلا اس فقرہ کا کیا مطلب ہے۔ ترنم سے کوئی شعر پڑھا جاتا ہے۔ "ترنم" گایا نہیں جاتا۔ یہ وہی بات ہوئی کہ فلاں شخص نے اتنے اخراجات خرچ کئے یا "از پیش عند اللہ علما" سے "تہین اجوطے"۔ ماسٹر جی کہنہ مشق شاعر اور پڑھے لکھے بزرگ ہیں۔ جانے انہیں کیا ہوا جو یہ لایعنی فقرہ لکھ گئے۔

اور پھر تاریخ نکالنا بھی کا دشت طلب والا معاملہ ہے۔ یہاں بھی شاعر بھٹک گیا ہے۔ نکتہ داں کافی زور لگائے گا۔ پھر بھی اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ تاریخ کہاں سے اور کیسے نکالنی ہے۔ "مطرب نے ترنم گایا۔ سننے والوں نے مکرر کہا۔ میں نے اسی سے تاریخ نکالی۔ کس سے یہ شاعر ہی جانے اگر آپ نے نظم کے نیچے ترنم کے اعداد ۹۹۰ کو دو پر ضرب نہ دی ہوتی پڑھنے والا بیچارہ تلاش و جستجو کے بعد بھلا یہ کیسے پاتا کہ ترنم کے اعداد دو دفعہ محسوب کرنے ہیں!

والسلام آپ کا اپنا: بشیر احمد شال

محترمی یوسف صاحب آداب!

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ جناب کی عنایت سے "تعمیر" بڑی پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ "تعمیر" شمارہ جون ۱۹۶۰ء کے بارے میں عرض ہے کہ آپ کا یہ شمارہ سارے اگلے پچھلے شماروں سے بہت اچھا، بہت شان دار، بہت بھاری بھر کم اور بہت زیادہ معیاری ہے خصوصاً پروفیسر اختر انصاری کے مقالے "اُردو ڈرامہ اور انارکلی" نے پرچہ کا وزن اور وقار بہت بڑھا دیا ہے۔ یہ مقالہ بے حد جامع اور بہت جانکاری سے لکھا گیا ہے اور کئی سال کے بعد اتنا اچھا آپ کے توسط سے نظر سے گذرنے کے سلسلہ میں جناب کا بے حد شکر گذار ہوں۔ (عمر انصاری - امین آباد پارک لکھنؤ)



'میرا ننھا جواں ہوگا'

میرا چھوٹا سا بھی ہے ننھے کی نظروں میں لکڑی کا گھوڑا،
کوئی چھوٹا موٹا سا باجا بجاتے ہیں اس کے لئے تار بجلی کے کھمبے!
ہوائی جہازوں کی آواز بھی، دور دیسوں کا ایک اجنبی گیت ہے،
ہر ایک بات میں نقل آبا کی کرنا۔ یہ معصوم بچپن کی ایک ریت ہے!

مگر کل سنبھالیگا جب یہ وطن تو کھیل سارے یہ، اپنے صحیح روپ میں
نمودار ہوتے چلے آئیں گے، زندگی کی کڑی دھوپ میں!
یہی چھوٹا سا اس کے ہاتھوں میں محنت کا اوزار بن جائے گا،
یہ زندگی بھی پھر اس کی توجہ کا کچھ کچھ طلبگار بن جائے گی!

ہماری یہ جدوجہد آج کی نذر اک عالم نو ہے...
... جس میں سنبھالے گا کل یہ وطن ننھا!
وہ اک عالم نو ذرا اور بھی دور ہوگا جو تم سے،
جہاں جہل کی خوشیاں ذرا اور نزدیک تر سے!

آج بھی پہلے کی طرح ہماری مصنوعات آپکے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم...
بجلی کے لئے کام کر رہے ہیں تاکہ آنے والی نسل کی بجلی کی ضروریات اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہوگی۔ اور ہم زیادہ ... ہماری مصنوعات اس وقت بھی آپکی خدمت کے لئے تیار پائی جائیں گی!

PH. 5-...

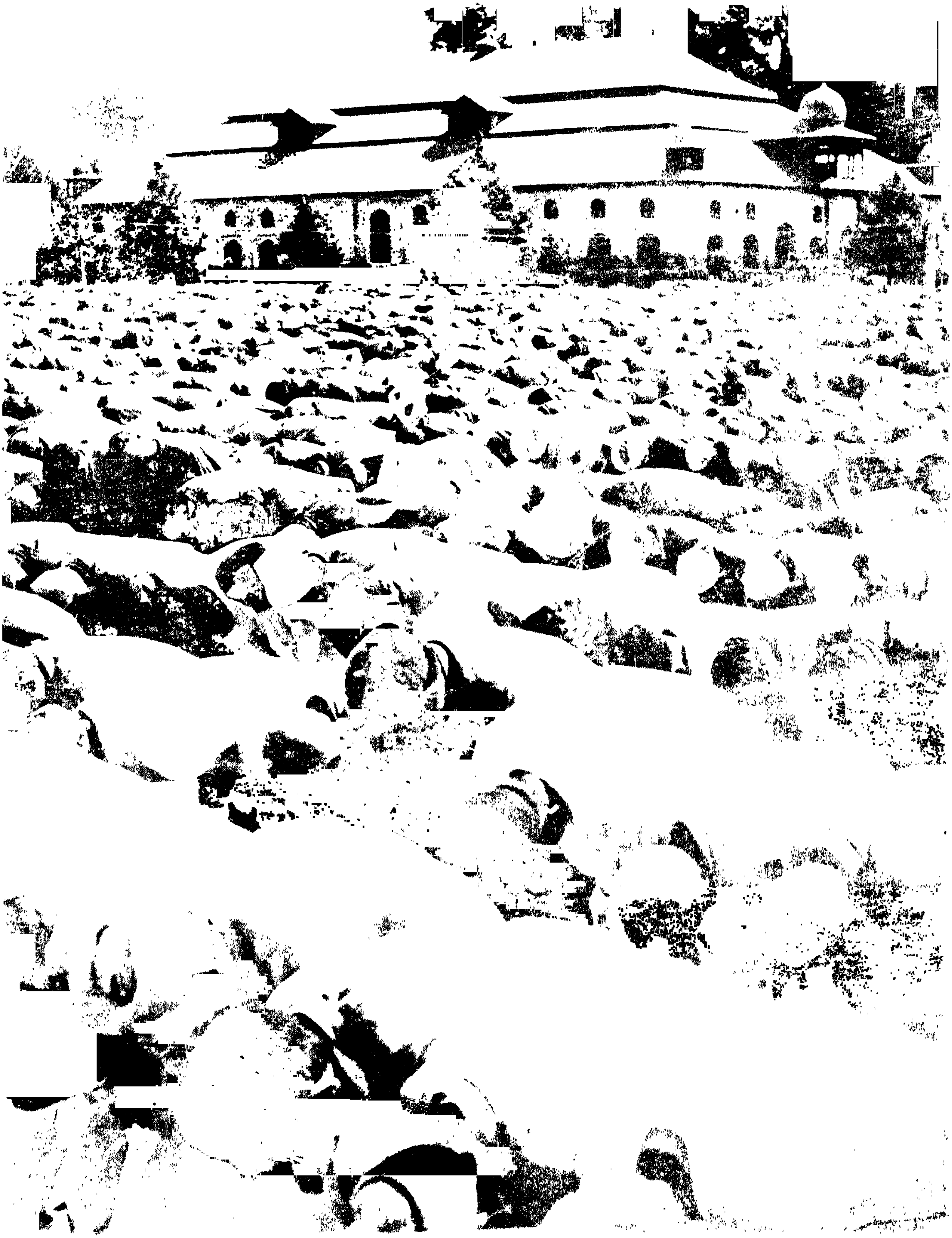


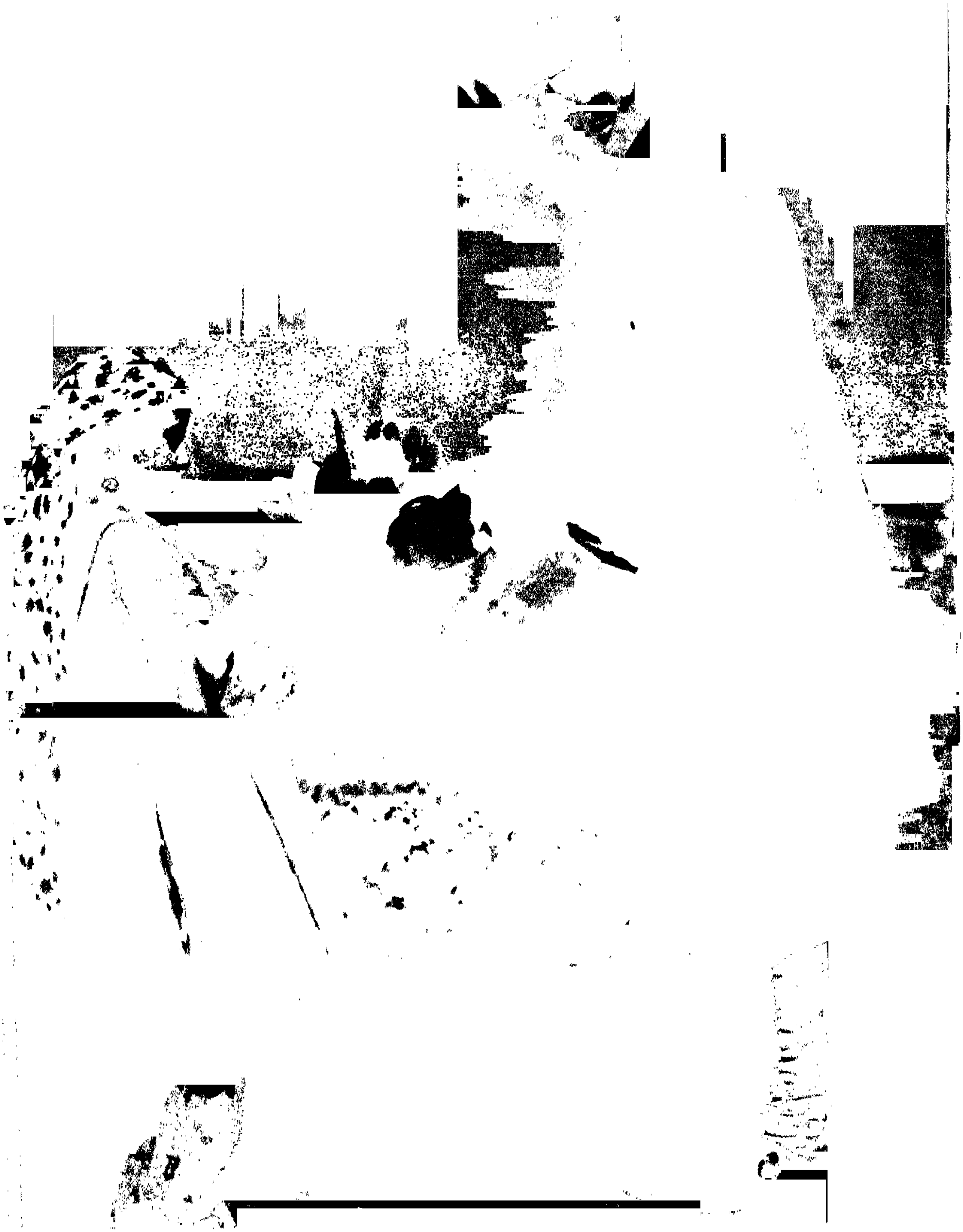
چراغ منزل

یہ ہاتھ یہ، چہرے پہ یہ جھریاں یا بڑھاپے کا پھیلا ہوا جال ہے!
انہی جھریوں میں مگر عقل و دانش کے کچھ ایسے نکتے نہاں ہیں،
جو اِس طفلِ کمسن کو محنت، محبت کے دستور سکھلائیں گے،
چراغوں کی مانند جو منزلوں کی اسے راہ دکھلائیں گے!
جواں ہو کے اپنے تجربوں سے سیکھے گا، ڈھونڈے گا خود اپنی راہیں۔
پھر آئے گا وہ دن جب اِس نوجواں کی تنومند و مضبوط باہیں،
ہمارے جواں بازوؤں کی رفیق و مددگار بن جائیں گی...
وہ بازو جو مصروفِ محنت ہیں اک عالمِ نو کی تعمیر کے واسطے
وہ اک عالمِ نو ذرا اور بھی دُور ہوگا تو غم سے،
جہاں ہونگی خوشیاں ذرا اور نزدیک ہم سے!

آج بھی، پہلے کی طرح، ہماری مصنوعات آپ کے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم...
کل کیلئے کام کر رہے ہیں، جب زیادہ آرام دہ زندگی کیلئے آپکی بڑھتی ہوئی ضروریات اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہونگی۔ اور ہم زیادہ وسیع ذرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اُسوقت بھی آپ کی خدمت کیلئے **تیار پائے جائینگے!**

آج اور کل... ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت۔







احمد امين (صفحة ٢٥)



مظهر عازم (صفحة ٥٩)

شاذ تمکنت

شہرِ وفا میں

کہا تھا یہ دل نے پسِ دردِ ہجراں
چلو چل کے شہرِ وفا دیکھ آئیں
نہ جانے در و بام کس حال میں ہوں
فقط دور سے دیکھ کر لوٹ جائیں
ہوائیں قدم لیں تو انجان بن کر
بڑی بے نیازی سے دامن چھڑائیں
کوئی یارِ دیرینہ گر مِل بھی جائے
تو آنکھیں مِلائیں نہ آنسو بہائیں
کچھ اس طرح جائیں کہ طاقوں کی شمعیں
ہمیں دیکھ کر خود بخود جل نہ پائیں
چلو اب جبیں سے لہو تھم گیا ہے
وہاں اپنے سجدوں کا ناموس دیکھیں
اُٹھو رقصِ جام و سبو تھم گیا ہے
پسِ بزمِ شب رنگِ فانوس دیکھیں
نقوشِ قدم اب نہ جانے کہاں ہوں
وہ قول و قسم اب نہ جانے کہاں ہوں

وہ گفتارِ معصوم آیات کی سی
وہ لہجے کی نرمی مناجات کی سی
وہ راتوں کی آوارہ گردی کے چرچے
وہ صبحوں سے آنکھیں چرانے کے قصے
غرض عہدِ رفتہ کے شانے ہلائیں
چلو چل کے شہرِ وفا دیکھ آئیں
جنوں آفرینی تھی شہرِ وفا میں
وہ اِک نکہتِ خونِ تازہ ہوا میں
نئے پائے سرکش نئے آبلے تھے
نئے وصل و ہجراں نئے مرحلے تھے
عروسِ فضا کی تھی پوشاک دھانی
نہ تھی اپنے ماضی کی کوئی نشانی
مگر پھر بھی اس تازہ صبح و مسا میں
فقط ایک کہنہ روایت تھی باقی
عجب وضع داری ہے شہرِ وفا میں
کہ آنسو بہانے کی رسم آج بھی تھی

ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

اکتوبر، نومبر ۱۹۶۰ء

جلد ۵ ———— شمارہ ۲۷

جنرل ایڈیٹر
جے، این زتشی
ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے   سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط و کتابت کا پتہ :-
محمد یوسف ٹینگ ایڈیٹر ماہنامہ "تعمیر" سرینگر

سرورق

۱۴ نومبر کو شری نہرو کا ۷۱ واں جنم دن منایا گیا
ایک کشمیری لڑکی شری نہرو کو تحفۂ عقیدت پیش کر رہی ہے

رسالے کی پشت پر

پانڈریٹھن کا تاریخی مندر

پیرزادہ محمد سعید پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گورنمنٹ پریس سرینگر میں چھپا اور لالہ رخ پبلی کیشنز نے شائع کیا

ترتیب

زاویے

چودہ نومبر کے دن کی عظمت میں ہر سال ایک نئی ضیا اور نئی جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس ارجمند ہندوستانی نے اس دِن جنم لیا ہے اُس کے کارناموں کی کتاب میں ہر سال نئے اور اور بھی عظیم باب پیوستہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شری نہرو اب عظمت و بزرگی کی اُس فلک رفعت چوٹی پر پہنچ گئے ہیں جہاں اُن کے بہت سے ہم عصروں کی نگاہیں بھی کاوش کے بعد ہی رسائی پاتی ہیں۔ موجودہ دَور میں رہنے والے لاکھوں انسان اس بات کو اپنی خوش بختی کا شگون قرار دیتے ہیں کہ اُن کے وقت میں بھی شری نہرو جیسی عظیم شخصیت موجود ہے۔ شری نہرو اپنی زندگی میں ہی ایک روایت بن گئے ہیں۔ ہر ہندوستانی آج کے دِن اُن کی سلامتی کی پُرخلوص دُعائیں مانگ رہا ہے اور اس میں دُنیا کے اُن کروڑوں عوام کی آمین بھی شامل ہے جو نہرو اور امن کو مترادف الفاظ سمجھتے ہیں۔

دو سال جھلملانے کی کیفیت سے گذرنے کے بعد آخر ہماری شاعری کی وہ شمع بھی بجھ گئی جو ایک دَورِ رفتہ اور صحبتِ نشاط کی یادگار تھی۔ جگر صاحب کو اپنے جیتے جی جو مقبولیت حاصل ہوئی، اُردو شاعری کی تاریخ میں اس کی کم ہی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اُن کا سوگ جس طرح اُردو والوں کے علاوہ دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والوں نے ہندوستان گیر سطح پر منایا اُس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اُن کے فن کا جادو کتنا ہمہ گیر اور بے پناہ تھا۔

کشمیر کے ساتھ جگر صاحب کو ایک نسبتِ خاص تھی۔ ۱۹۵۶ء کے جشنِ کشمیر میں وہ آخری بار واردِ کشمیر ہوئے اور یہاں کی ادبی محفلوں کو اپنے دم قدم سے ایسی رونق بخشی کہ اُن کی یاد کافی مدّت تک دِلوں کو گرماتی رہے گی۔

کشمیر والوں کے لئے جگر صاحب کی موت کتنا رُوح فرسا سانحہ ہے اُس کا اندازہ وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد اور وزیرِ تعلیم و اطلاعات جناب میر غلام محمد راج پوری کے تعزیتی بیانات سے ہو سکتا ہے۔ جناب بخشی غلام محمد نے جگر صاحب کی موت کو ناقابلِ تلافی بتایا ہے اور کہا ہے کہ اُن کی حیثیت کا شاعر شاید کئی صدیوں تک پیدا نہ ہو سکے۔ راج پوری صاحب نے جگر کی شاعری کو ہندوستانی نوجوانوں کے شباب آور لمحات کا ترجمان بتایا ہے اور کہا ہے کہ جگر کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے فن کو عوام سے الگ تھلگ نہ کیا اور اپنا فنی معیار بلند رکھتے ہوئے عوامی مذاق کی تسکین کرتے رہے۔

اس شمارے سے "تعمیر" کی ترتیب میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مقالات کی تعداد بڑھانے کے ساتھ ساتھ کہانیوں کی تعداد بھی بڑھائی گئی ہے اور مزاحیہ مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری حصے کو ذرا زیادہ متنوع اور طویل بنایا گیا ہے۔ اس شمارے سے کشمیری ادیبوں کو متعارف کرنے کے سلسلے میں ایک خاص سلسلہ "   " شروع کیا جا رہا ہے۔ اس عنوان کے تحت ہر شمارے میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک ادیب، خواہ وہ اُردو میں لکھتا ہو یا کشمیری میں، کی تصویر، اُس کی چند نمائندہ تخلیقات ایک مختصر سوانحی اور تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہونگی۔ اس سلسلے کا آغاز کشمیری زبان کے جواں سال مگر بلند مرتبہ شاعر مظفر عازم سے کیا جا رہا ہے۔ عازم کی شاعری ابھی بہت نوخیز ہے مگر اُس پر جو نکھار آ رہا ہے وہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ وہ بہت جلد اپنا منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اُن کی ذات سے اس سلسلے کے آغاز کو میں نیک شگون سمجھتا ہوں۔

شوکت مجید

شوالوں کا وطن

اے نکھرتے ہوئے شاعر کے خیالوں کے وطن
گل عذاروں کے وطن زہرہ جمالوں کے وطن
لالہ رُخ، شوق نظر مست غزالوں کے وطن
رشک فردوس مناظر کے شوالوں کے وطن

سب کے سب خطۂ کشمیر تجھے کہتے ہیں
ہر حسیں خواب کی تعبیر تجھے کہتے ہیں

دِل فریبی کا ہر انداز نہاں ہے تجھ میں
زعفراں زار کا پُرکیف سماں ہے تجھ میں
سنبل و سرو و صنوبر کا مکاں ہے تجھ میں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا جہاں ہے تجھ میں

مست ناگن ہے کہ اِٹھلاتی ہوئی جھیلیں ہیں
برف کے ٹکڑے ہیں یا نور کی قندیلیں ہیں

تیری آغوش میں سرسبز چمن مِلتا ہے
تیرے نظاروں میں فن کار کو فن مِلتا ہے
سنگریزوں میں ترے لعلِ یمن مِلتا ہے
تیرے رستوں میں محبت کا چلن مِلتا ہے

حُسنِ فطرت نے دیا ہے تجھے وہ ہار سنگار
اِک نظر جس نے بھی دیکھا وہ ہوا تجھ پہ نثار

یہ نہیں ہے کہ فقط خطۂ کشمیر ہے تو
ہم تو کہتے ہیں کہ دراصل جہانگیر ہے تو
ہند والوں کے لئے باعثِ توقیر ہے تو
جس پہ بُنیادِ وطن ہے وہی تعمیر ہے تو

تیری چوکھٹ پہ ہے صف بستہ پہاڑوں کی قطار
سلطنت والے بھی رہتے ہیں ترے باج گذار

آبشاروں کی زباں پر ہے کہانی تیری
کوہساروں سے نمایاں ہے جوانی تیری
دِل سے محکوم ہوئی رات کی رانی تیری
کچھ لُٹیروں نے مگر قدر نہ جانی تیری

آڑ مذہب کی لئے تنگ نظر آئے ہیں
ٹکڑے ٹکڑے تجھے کرنے پہ اُتر آئے ہیں

تیرے باغ کی پھیلی ہوئی خوشبو کی قسم
ابر کے بھیس میں چلتے ہوئے جادو کی قسم

سورماؤں کی قسم خنجر ابرو کی قسم !   تجھ پہ مٹ جائیں گے کھا کر ترے گیسو کی قسم
جیتے جی تجھ پہ کوئی آنچ نہ آنے دیں گے
ہم لٹیروں کی طرف تجھ کو نہ جانے دیں گے

ہم نے دُنیا کو دیا امن و اماں کا پیغام   ہم نے بخشا ہے زمانے کو محبت کا نظام
آسمانوں نے کیا ہے ہمیں جھک جھک کے سلام   لے سکے گا نہ کوئی اب تری تقسیم کا نام
تیری پیشانی پہ آجائے گی جس وقت شکن
بڑھ کے دہرائیں گے تاریخ کے اوراقِ کہن

سورماؤں سے نہیں آج بھی خالی یہ وطن   سرفروشوں سے ہے آباد ابھی اپنا چمن
بڑھ سکے گی نہ تری زُلفِ حسیں کی اُلجھن   سُن نہیں سکتے کبھی ہم ترے دِل کی دھڑکن
ہم جو اُٹھیں گے تو اُمڈے ہوئے بادل کی طرح
خونِ اغیار بہا ڈالیں گے جل تھل کی طرح

تیرے جانباز الاپیں گے فقط تیرا ہی راگ   تیرے دامن پہ نہ دیکھیں گے کبھی پھوٹ کی آگ
بڑھ سکے گا نہ تری سمت کبھی ظلم کا ناگ   جگ کی دیوی کے سر پہ نہیں رہ سکتا سہاگ
تجھ کو خوشحال ہر اِک حال میں ہم دیکھیں گے
تیری آنکھیں نہ کسی طرح بھی نم دیکھیں گے

آن پر تیرے نگہبان نچھاور ہوں گے   کر کے خود تجھ کو بھی حیران نچھاور ہوں گے
دیش کے سارے ہی انسان نچھاور ہوں گے   یعنی ہر گام پہ عثمان نچھاور ہوں گے
لُوٹنے پائے گا کوئی نہ ترا حُسنِ شباب
آئے گا جو بھی مِلے گا اُسے مُنہ توڑ جواب

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

کشمیر کے پھول اور پھل

(تاریخ کی روشنی میں)

کشمیر اپنی رعنائی، دِل آویزی اور دِل کشی کی وجہ سے ہر زمانہ میں جنت بے نظیر رہا ہے۔ اکبری عہد کے مشہور شاعر عرفی شیرازی نے اپنے قصیدہ میں کہا ہے ؎

فردوس بہ دروازۂ کشمیر رسیده است   کو مدعی گر نگرنده است در آید
زیبائی کشمیر گرش باعثِ عشوه است   من می خرم از زال فلک عشوه گر آید

پھر یہاں کے سبزہ، چشمہ اور پھولوں کے بارے میں کہتا ہے ؎

این سبزه و این چشمه و این لالہ و این گل
آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید
آں چشمہ کہ رضواں بود دو تشنہ بسویش
کوثر بسرش تیز تر و تشنہ تر آید

اور پھر کہتا ہے کہ کشمیر کی رنگا رنگی طاؤس کی ایسی ہے اور جمال دُلہن کی طرح ہے ؎

طاؤس مثالی کہ دو افشانده پر و بال
ہر لحظہ برنگ دگر اندر نظر آید
زیبنده عروسیکہ بیفزوده جمالش
ہر دم بہ نظر نو تر و شاداب تر آید

ابوالفضل نے اکبر نامہ جلد سوم (صفحہ ۷۳۳) میں لکھا ہے کہ یہاں کا خزاں دوسری جگہ کی بہار سے زیادہ رنگین ہوتا ہے۔ سیب، شفتالو، چنار اور انگور کے پتے جب یہاں گرتے ہیں تو اپنی دلاویزی میں اور گلبوٹا کے موسم بہار کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔

تعیر

ذوق فنا نیافتہ ورنہ در نظر۔ رنگین تر از بہار بود جلوهٔ خزان

جہانگیر اپنی تزکِ جہاں گیری میں لکھتا ہے کہ کشمیر ایک "سدا بہار باغ" اور ایک "عشرت افزا گلشن" ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کے دِل کش چشموں اور آبشاروں کی قلمی تصویر کھینچنا ممکن نہیں۔ یہاں اتنے چشمے ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جدھر نظر اُٹھتی ہے، سبزہ ہی سبزہ دِکھائی دیتا ہے۔ ہر جگہ آب رواں ہے۔ گُل سُرخ، بنفشہ اور نرگس خود سے اُگتے ہیں۔ میدانوں میں طرح طرح کے پھول دکھائی دیتے ہیں اور خوشبودار بُوٹیوں کی تو کوئی حد نہیں۔" (تزکِ جہانگیری صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴)

اقبال نامہ جہانگیری کا مصنف کشمیر کے چشموں اور آبشاروں کا ذکر کرنے میں مست ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ دریائے بہت کا سرچشمہ ویرناگ ہے۔ جہاں سے شہر تک تمام راستوں [illegible] سیرگاہیں اور نہایت شیریں، لطیف اور جان فزا چشمے ہیں۔ پھر بیج بہاڑہ میں ایک بہت صاف اور پاکیزہ چشمہ ہے جو بہت ہی عمدہ سیرگاہ ہے۔ یہاں چنار کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے ہیں اور اس کے کچھ فاصلہ پر ایک نہر ہے۔ بیج بہاڑہ سے آگے چل کر انچ کے دامن کوہ میں ایک بہتا ہوا چشمہ ہے جس کے اوپر حوض اور عمارتیں ایک دوسرے کی شکل سے ملتی ہوئی بنی ہوئی ہیں۔ یہ بھی بہت ہی پُر تکلف سیرگاہ ہے۔ اس چشمہ سے نصف کوس آگے بھی بھون کا چشمہ ہے جس کا پانی اور بھی زیادہ صاف اور شفاف ہے۔ اس کے چاروں طرف چنار، سفیدے اور سیاہ بید کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس میں بکثرت مچھلیاں رہتی ہیں۔ اس کا پانی اس قدر صاف ہے کہ اگر ایک پیسے کا دانہ پانی میں گر جائے تو نظر آ جاتا

ہے۔ مچھی بھون کے آگے اچھول ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا آبشار ہے۔ چنار اور سفیدار کے درخت ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان سے یہاں ایک بہت ہی دلکش نشیمن بن گیا ہے۔ ایک صاف ستھرا باغیچہ بھی ہے جہاں جعفری کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور یہ گویا بہشت کا ایک قطعہ ہے۔"

(ص ۱۶۵—۱۶۴)

یہی مؤلف ویرناگ کا مزید ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ دریائے بہٹ کا منبع ہے اور دامن کوہ میں واقع ہے۔ یہاں سبزہ، درختوں اور پھولوں کی اتنی کثرت ہے کہ زمین نظر نہیں آتی۔ یہاں جہانگیر نے ایک عمارت بنوا کر اس میں ایک حوض بھی بنوایا ہے۔ پہاڑ پر جو سبزہ اور پھول اُگے ہیں۔ ان کے عکس سے حوض کا پانی رنگین نظر آتا ہے۔ اس میں مچھلیاں پیرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے آگے ایک باغ ہے۔ اب حوض سے باغ کی انتہائی حد تک ایک نہر چار گز چوڑی، ایک سو چھیاسی گز لمبی اور دو گز گہری ہے۔ اس کے دونوں طرف پتھر کی کیاریاں بنی ہوئی ہیں۔ نہر، سبزہ اور پانی کے نیچے کی گھاس کی صفائی کی دلکشی بیان نہیں کی جا سکتی ہے۔ بعض سبز تلخ (؟) بعض فستقی (؟) اور بعض سیگی (؟) ہیں۔ سبزہ ایک دوسرے سے دُمِ طاؤس کی طرح منقش معلوم ہوتا ہے اور وہ موجِ آب سے متحرک نظر آتا ہے۔ جابجا پھول کھلے ہوئے ہیں۔ درحقیقت کشمیر میں ایسی خوش نما اور دلفریب سیرگاہ کوئی اور نہیں۔ (ص ۱۲۶)

شاہ جہانی دور کے مورخ محمد صالح کنبوہ کا قلم کشمیر کے "مشاہدہ جلوۂ رعنائی" اور "زیبائی شاہد شور انگیز" شگوفہ و گل اور لالہ و سنبل، "سرسبزی سبزہ ہائے نوخیز" اور "ہوش ربائی من زار عبیر بیز" کے ذکر میں رقص کرنے لگتا ہے اور وہ کشمیر کو "روکش گلزار افلاک"، "آبروئے عالم خاک"، "گلشن خلد آفرین" اور "جاوید بہار" بتاتا ہے (عمل صالح ص ۱۲۹—۱۳۵)

شاہ جہانی دربار کے ملک الشعرا محمد جان قدسی کشمیر کی دلآویزی کا ذکر ایک قصیدہ میں کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

خوشا کشمیر و خاکِ پاک کشمیر — کہ سر بر زد بہشت از خاکِ کشمیر
سواد مشک ترش چشم بہار است — بہشت و جوئے شیرش آب کار است

عرفیؔ اور قدسیؔ دونوں نے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے کہ یہاں کی ہوا اور مٹی میں یہ اثر ہے کہ یہاں پھول بکثرت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے

دنگِ بچمن فصل کہ در ساخت گلزار
از لطف ہوا چاشت نسیم سحر در آید
ز شگفت گل اما بشل بر رگ شاخے
گر پائے نہم خون گلم تا کمر آید

قدسی نے کہا ہے:۔

ز فیض ابر می روید درین کاخ — ز تار شمع گل بیش از رگ شاخ
کند گل بر سر دیوار ریشہ — شود فولاد سبز از آب تیشہ
نگارے بر ورق گر صورت خار — ز تاثیر ہوا گل آورد بار
گر افتد از کف ساقی پیالہ — دواند ریشہ در گل ہمچو لالہ

جہانگیر نے کشمیر کے پھولوں میں لالہ کا ذکر خاص طور پر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بہار میں پہاڑوں، میدانوں، دیواروں، صحنوں اور کوٹھوں پر لالہ مشعل کی طرح بزم افروز رہتا ہے۔ وہ یہ بھی رقم طراز ہے کہ عام طور سے شگوفوں کے آنے کا وقت اسفندیار (یعنی فروری) میں ہوتا ہے۔ لیکن کشمیر میں فروردین (یعنی مارچ) میں آیا کرتا ہے۔ کشمیر میں عمارتیں زیادہ تر لکڑی کی ہیں جو دو دو تین تین اور چار چار منزلوں کی ہوتی ہیں۔ کوٹھوں پر مٹی ہوتی ہے جہاں لالۂ چوغاشی موسم بہار میں بہت ہی خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ باغوں اور مسجدوں میں بھی اس کی بہار خوب دکھائی دیتی ہے اور لالہ کا ایسا خوشنما منظر کشمیر کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔

جہانگیر کو کشمیر میں چنبیلی کی بہت سی قسمیں دکھائی دیں۔ لکھتا ہے کہ نیلے رنگ کی چنبیلی کشمیر میں بہت ہوتی ہے۔ سفید چنبیلی میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ صندلی رنگ کی چنبیلی کشمیر کی خاص چیز ہے۔ اس میں بھی خوشبو بہت ہوتی ہے۔ جہانگیر نے کشمیر میں گلاب کی بھی کئی قسمیں دیکھی تھیں۔ لیکن صرف دو ہی کی تفصیل بیان کی ہے۔ ایک کا رنگ بالکل سرخ بتایا ہے جو بہت خوشبودار ہوتا ہے۔ دوسرے کا رنگ صندلی لکھا ہے اور اس کی لطافت اور نزاکت کی تعریف کی ہے۔

سوسن کی بھی دو قسمیں کہی ہیں۔ ایک تو باغ میں اُگتا اور دوسرا صحرائی ہوتا ہے جس میں رنگینی تو نہیں لیکن خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ باغ میں اُگنے

والے سوسن کا رنگ سبز ہوتا ہے۔

گُلِ جعفری کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ بڑا بھی ہوتا ہے اور خوشبودار بھی۔ اس کا تنہ آدمی کے قد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں کیڑے بھی پڑ جاتے ہیں۔ (تزکِ جہانگیری ص ۳۰۴)

اقبال نامہ جہانگیری کے مؤلف معتمد خان بخشی نے بھی مذکورہ بالا پھول کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی کشمیر کو لالہ زار بتاتا ہے اور رقم طراز ہے کہ کشمیر میں کوٹھوں کو خاک پوش کر کے پیاز لالہ چوغاشی بو دیتے ہیں جو سال بسال موسمِ بہار میں کھلتی ہے اور نہایت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ یہ چیز اہلِ کشمیر کے ساتھ مخصوص ہے۔ عرفی نے بھی یہاں کے لالہ کے جوشِ نمو کی تعریف کرتے ہوئے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے کہ سخت پتھر پر تیشہ کی ضرب پڑتی ہے تو اس سے بھی لالہ ہی نمودار ہوتا ہے۔

آں لالہ کہ ہنگام تراشیدن خارا
از رخنۂ سنگ و دہن تیشہ برآید

اقبال نامہ جہانگیری کے مؤلف نے نیلے اور سفید رنگ کی چنبیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صندلی رنگ کی چنبیلی کشمیر کی خاص چیز ہے۔ صندلی اور سرخ گلاب کے بارے میں لکھتا ہے کہ دونوں کے پتے ایک قسم کے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ صحرائی سوسن کے متعلق رقم طراز ہے کہ اس کا رنگ کسی قدر ہلکا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں خوشبو بہت ہوتی ہے۔ گلِ جعفری کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ جس سال کمال کو پہنچ کر پھولتا ہے اس میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کے پتوں پر مکڑی کے جالے کی طرح پردہ پڑ جاتا ہے جو تنے کو خشک کر دیتا ہے۔" (اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۵۰)

اقبال نامہ جہانگیری کا مؤلف پونچھ کی گھاٹی کے ایک تالاب کے پھول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"یہاں ایک عجیب پھول نظر آیا جو اب تک نہ دیکھا گیا تھا۔ تین رنگ کا شاندار پھول ہے، ایک رنگ بہت ہی سرخ گلِ انار کی طرح ہے۔ دوسرا جگر جگر شفتالو کی طرح ہے اور تیسرا رنگ سیر دنیم سیر (؟) ہے۔ دور سے ہندوستان کے پھول گڑھل کی طرح معلوم ہوتا ہے، لیکن گڑھل سے بڑا ہے۔ نزدیک سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطمی کے چھوٹے اور بڑے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ خوش رنگی اور نظر فریبی میں بے نظیر ہے۔ اس کا درخت توت اور امرود کے درختوں کی طرح بڑا ہوتا ہے، لیکن پتہ کی مشابہت بیدمشک کے پتہ سے ہے۔ بیدمشک کے پتہ میں تیز نوک ہوتی ہے، لیکن اس کا پتہ چوڑا ہوتا ہے۔ پھول اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں بھی نہیں سماتا۔ اس کا درخت سر سے پاؤں تک پھولوں سے لدا رہتا ہے اس کو اہلِ کشمیر کلہ پوش کہتے ہیں۔ نیکلی اور دھمتور میں لوہ بہول کہلاتا ہے۔ یہ صرف ان ہی پہاڑوں پر ہوتا ہے جہاں برف سات آٹھ دِن سے زیادہ نہیں ٹھہرتی۔"

(اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۴۱-۲۴۲)

جہانگیر نے زعفران کی کھیتی کا ذکر بہت ہی شوق سے کیا ہے اور لکھتا ہے کہ موضع پنپر میں جتنا زعفران ہوتا ہے، کہیں اور نہیں ہوتا۔ یہاں جدھر نظر اُٹھاؤ زعفران ہی زعفران نظر آتا ہے اور اسی سے چھن چھن کر ہوا دماغ تک پہنچتی ہے اور اس کو معطر کرتی رہتی ہے۔ اس کے پھول میں چار پتیاں ہوتی ہیں اور اس کا رنگ بنفشی ہوتا ہے۔ پھول ہی کے بیچ سے زعفران کی تین شاخیں نکلتی ہیں۔ جس سال خوب پیداوار ہوتی ہے تو یہ چار سو (۴۰۰) من تک پیدا ہوتا ہے۔ دس روپے میں ایک سیر ملتا ہے۔ گو قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں کے باشندے نمک کے بدلے زعفران دے دیتے ہیں، کیونکہ یہاں نمک نہیں ہوتا ہے۔ یہ پھول اس وقت دینے لگتا ہے جب اس کا پودا زمین سے دو انچ اُوپر ہو جاتا ہے، اس کی کھیتی ایک ایک کوس تک پھیلی ہوتی ہے اور نظروں کو بھلی لگتی ہے۔ اس کی خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ سر میں درد ہو جاتا ہے، لیکن کشمیریوں کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔" (تزکِ جہانگیری سال دوم ص ۳۱۳)

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس کی کھیتی کا ذکر کچھ اور تفصیل کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اردی بہشت کے شروع میں اس کا بیج بویا جاتا ہے۔ بارش کے پانی سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اس کا بیج پیاز اور لہسن کی گٹھی کی طرح ہوتا ہے۔ پھول ڈنٹھل پر نمودار ہوتا ہے جس میں چھ پتیاں اور چھ بڑے ریشے ہوتے ہیں۔ ان چھ پتیوں میں تین پتیاں بہت شاداب ہوتی ہیں۔

اور ان کا رنگ بنفشی ہوتا ہے اور ان ہی بنفشی رنگ کی پتیوں میں تین اور پتیاں ہوتی ہیں۔ ان کے ریشے زرد ہوتے ہیں جن کی آغوش میں تین اور ریشے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان ہی ریشوں کو زعفران کہتے ہیں زعفران کا پودا چھ سال تک پھول دیتا ہے، بشرطیکہ اس کی آب پاشی برابر ہوتی رہے۔ پہلے دو سال پھول کم آتے ہیں، لیکن تیسرے سال سے بہت پھولنے لگتا ہے۔ چھ سال گزرنے کے بعد اگر گٹھی کو زمین سے نہ نکالیں، تو سڑ جاتی ہے۔ اس لئے ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ اس کو لگاتے ہیں اور اس زمین کو پانچ سال تک غیر مزروعہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ زعفران کی کھیتی سب سے زیادہ پانپور میں ہوتی ہے جو سرینگر کے جنوب میں مارراج کے توابع میں واقع ہے۔ یہاں دس کوس تک زعفران کی کھیتی نظر آتی ہے۔ اس کی کاشت پرگنہ پرسپور میں بھی ہوتی ہے۔ یہاں ایک کوس تک اس کی کھیتی پھیلی ہوئی ہے۔"

(آئین اکبری جلد اول آئین ۳۱)

اقبال نامہ جہانگیری کا مؤلف رقمطراز ہے کہ طبی کتابوں خصوصاً ذخیرہ خوارزم شاہی میں لکھا ہے کہ زعفران کھانے سے ہنسی آتی ہے اور اگر کوئی شخص زیادہ کھالے تو اس کو اتنی ہنسی آتی ہے کہ اس کے مرجانے کا خطرہ رہتا ہے۔ حضرت شاہنشاہی یعنی جہانگیر نے ایک گردن زنی چور کو قیدخانہ سے طلب کر کے اپنے سامنے پاؤ بھر زعفران کھلایا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسرے دن اس کو دوگنی مقدار کھلائی گئی۔ اس کو تبسم بھی نہ آیا اور مرنے کا تو سوال ہی نہیں۔"

(اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۴۳)

شاہجہانی عہد میں ظفر خان عرصہ دراز تک کشمیر کا گورنر رہا۔ اس کو وہی امتیاز حاصل تھا جو جہانگیری عہد میں عبدالرحیم خان خاناں کو تھا۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر صائب کا بڑا سرپرست رہا۔ کلیم، قدسی، سالک یزدی، دانش اور میر صیدی بھی اس سے فیض یاب ہوتے رہے۔ وہ خود بھی شاعر تھا، ایک مثنوی کشمیر پر بھی لکھی۔ جس میں وہ یہاں کے پھولوں اور پھلوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بولسری کے بارہ میں کہتا ہے :-

نہال بولسری زیب گلشن

کزو گل می تواں بردن بخرمن

کیوڑہ کے متعلق کہتا ہے کہ اس میں خوشبو ایسی لپٹی رہتی ہے جیسے ساز میں نغمہ رہتا ہے۔

زگل ہا کیوڑہ گردید بمت : درو پیچیدہ بوچوں نغمہ درساز

کچنار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب یہ پھولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی ہوئی ہے۔

شگفتہ آن چنان گلہائے کچنار

کہ گوئی آتش افتادہ بہ گلزار

جوہی اور بیلے کے بارے میں لکھتا ہے :-

زجوش بیل و از جوہی و جاہی

نگہ راہی شود کشتی تباہی

اور پھر کنول کے متعلق کہتا ہے :-

گرفتہ یک قلم اقلیم دل را جہانگیری مسلم شد کنول را

جہانگیر کو کشمیر کے پھولوں میں بادام اور شفتالو کے پھول بہترین معلوم ہوتے تھے، وہ لکھتا ہے کہ کشمیر میں اتنے پھول ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا ہے اور جب میں نے نادر العصر منصور کو ان کی تصویریں بنانے کو کہا تو وہ سو سے زیادہ پھولوں کی تصویریں نہ بنا سکا۔ اقبال نامہ جہانگیری میں بھی ہے کہ جو پھول کشمیر کے گرم علاقوں میں نظر آئے وہ حساب اور شمار سے باہر ہیں۔ استاد نادر العصر منظور نقاش نے، جن کی تصویر کھینچی ہے، سو سے متجاوز ہیں۔" (ص ۱۵۰)

اگر جہانگیر یا اقبال نامہ جہانگیری کا مؤلف صرف پھولوں کے نام لکھ دیتا تو آج یہ پتہ چل جاتا کہ اس زمانہ میں کون کون سے پھول ہوا کرتے تھے۔ ابوالفضل نے ہندوستانی پھولوں کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک تو وہ، جو خوشبودار ہوتے ہیں، مثلاً سیوتی، چنبیلی، رائے بیل، مونگرا، چمپا، کیتکی، کیوڑہ، چلتہ، گلال، تسبیح گلال، بھول سری، سنگار ہار، کوزہ، پاڈل، جوہی، نواری، نرگس، گل شگوفہ، گل کرنہ، کپور بیل، گل زعفران۔ جن پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی ہے، ان کے نام یہ لکھے ہیں :-

گل آفتاب (سورج مکھی)، کنول، جعفری، گڑھل، رتن منجنی، کیسو، کنیر، کدم، ناگ کیسر، سرپن، سری کھنڈی، گل حنا، دوپہریا، بھون چمپا، سدرسن، سینبل، رتن مالا، سون زرد، گل مالتی، کریل، جیت، لاہی، کروندا، دھنتر، کنکلانی وغیرہ۔

ایران و توران سے جو پھول ہندوستان میں لاکر لگائے گئے اور یہاں عام طور سے ہونے لگے۔ ان کے نام ابوالفضل نے یہ لکھے ہیں:۔ گل سرخ، گل ر، یاسمن، کبود، سوسن، ریحان، رعنا، زیبا، شقایق، تاج خروس، قلغہ نافرمان، خطمی وغیرہ۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ مذکورہ بالا تمام پھولوں میں کون کون پھول کشمیر میں ہوتے تھے اور کون کون نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ان میں اکثر پھول اب بھی وہاں دکھائی دئے جاسکتے ہیں۔ قدسی نے بھی کہا تھا ؎

بجز آن گلہا کہ مشہور جہاں ست

گل این جا بوستان در بوستان ست

کشمیر کے پھلوں میں جہانگیر نے شاہ آلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں یہ پھل نہیں ہوتا تھا، لیکن عہد اکبری میں محمد قلی افشار نے اس کو کابل سے لاکر یہاں اس کا پیوند لگایا تو یہ عام طور سے پیدا ہونے لگا۔ اور محمد قلی افشار ہی کے ذریعہ سے ہندوستان میں پھلوں میں پیوند لگانے کا عام رواج ہوا، جس کے بعد قلمی آموں کی طرح طرح کی قسمیں پیدا کی گئیں۔ کشمیر میں اسی زمانے میں زرد آلو کا بھی پیوند لگایا گیا۔ اور یہاں بکثرت ہونے لگا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ یہاں زرد آلو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ کابل میں "میرزائی" بہت عمدہ ہوتا ہے، لیکن کشمیر کا "میرزائی" بھی کم تر درجے کا نہیں ہوتا۔ یہاں کی ناشپاتی کے بارے میں وہ رقم طراز ہے کہ یہ کابل اور بدخشان کی ناشپاتی سے بہتر اور سمرقند کی ناشپاتی کے برابر ہوتی ہے۔ یہاں کے سیب کے متعلق لکھتا ہے کہ اپنی خوبی میں ہر جگہ مشہور ہے۔ البتہ امرود کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نہ اچھا اور نہ برا ہوتا ہے اور دوسرے پھلوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہاں کے انگور میں ترشی ہوتی ہے اور اچھا نہیں ہوتا ہے۔ انار بھی اچھے نہیں ہوتے۔ لیکن تربوزے بہت عمدہ ہوتے ہیں اور خربوزے بھی بہت میٹھے اور لطیف ہوتے ہیں بشرطیکہ کیڑوں سے محفوظ رہ جائیں۔ یہاں شہتوت تو نہیں ہوتا ہے، لیکن توت ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ گو یہ کھانے کے لائق نہیں ہوتا ہے۔ اس پر کرم پیلہ کی پرورش ہوتی ہے۔" (تزک جہانگیری ص ۳۰۰)

شاہجہانی عہد کا مؤرخ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں لکھتا ہے کہ کشمیر میں شاہ آلو کو گیلاس بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنی شادابی اور شیرینی میں کابل کے شاہ آلو سے بہتر ہوتا ہے۔ یہاں کے سیب میں بڑی رنگینی اور بالیدگی ہوتی ہے۔ ناشپاتی اپنی نزاکت کے لئے مشہور ہے۔ خربوزے پر آفت نہ آئے تو کابل کے خربوزے ہی کے ایسا ہوتا ہے۔ تربوزے میں بڑی شیرینی ہوتی ہے۔ انگور بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں، لیکن رطوبت کی وجہ سے یہاں کے انگور میں مٹھاس نہیں ہوتی ہے۔ شفتالو اپنی لطافت اور نزاکت میں کابل کے شفتالو ہی کی طرح ہوتا ہے۔ زرد آلو کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن کابل کے میرزائی اور سفیدچہ یہاں کے زرد آلو سے اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں بیدانہ بھی ہوتا ہے، لیکن کابل سے اچھا نہیں ہوتا۔ نارنج خراب ہوتا ہے۔ بادام کی بڑی فراوانی ہے۔ پستہ کے درخت کم ہیں۔ گردکان (؟) کی بڑی فراوانی ہے۔ یہاں کے علاوہ کہیں اور نہیں ہوتا۔ اسی کا تیل چراغ میں جلایا کرتا ہے (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۰) یہاں بعض پھل قد میں بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ شاہجہاں جب کشمیر گیا تو وہاں اس کے سامنے ایک مثقال کا شاہ آلو، ۸۵ مثقال کا سیب، ۹۵ مثقال کا سفرجل (؟) اور نوے مثقال کا زرد آلو لایا گیا (بادشاہ نامہ جلد اول، حصہ دوم ص ۳۰) ایک مثقال ستائیس اٹھائیس رتی کے برابر ہوتا ہے۔

اقبال نامہ جہانگیری کے مؤلف نے پونچھ کی گھاٹی کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہاں نارنج بھی ہوتا ہے اور ایک درخت میں ہزار ہزار نارنج پھلتے ہیں (ص ۲۴۲)

ظفر خان کٹھل، کمرک، فالسہ، بیر اور جامن کے بارے میں لکھتا ہے:۔

ز کٹھل دیدہ تا رنگ اصالت — بود در رنگریزی از خجالت

ز کمرک بزم مستان گشت روشن — ز شمع او گلستان گشت روشن

بود از فالسہ و ز بیر و جامن — بگلشن باغبان را چشم روشن

کشمیر کے فطری حسن و جمال سے متاثر ہوکر اور یہاں کی زمین کی قوت نمو سے فائدہ اٹھاکر مغل بادشاہوں اور ان کے امراء نے یہاں بہت سے باغات لگائے۔ جہاں پھول اور پھل بکثرت ہوتے تھے۔ اکبر نامہ میں باغ نور افزا، تزک جہانگیری میں باغ ویرناگ، کلیات قدسی میں باغ عیش آباد، باغ الٰہی۔ قزوینی کے بادشاہ نامہ میں باغ آصف آباد، باغ بیگم آباد، باغ لوکا بھون، باغ پمپور، باغ اسلام آباد، باغ شہاب الدین پور اور عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ میں باغ شالامار (فرح بخش و فیض بخش) باغ نور افزا، باغ جہارا، باغ نور افشاں،

باغ صفا، باغ شاہ آباد، باغ مُراد، باغ نشاط، باغ نسیم، باغ افضل آباد، باغ ظفرخان، باغ فیروزخان اور باغ خدمت خان وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔

ان تمام باغوں میں سب سے زیادہ حسین، رنگین، دل کش اور دل آویز شالامار باغ تھا۔ اس کو "گلشن فردوس آئین" اور "رشک افزائے بہشت برین" سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ نامہ کے مؤلف عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے کہ یہاں کے پھول و پھل جنت کے پھول اور پھل معلوم ہوتے تھے یہاں کی نہر سلسبیل اور کوثر کی طرح بہتی نظر آتی تھی اور عمارتوں میں فردوس برین کی دل کشی تھی۔ شاہ جہاں نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں اس کی بنیاد ڈالی اور اس میں دس دس گز پر چنار اور سفیدار کے درخت لگائے۔ اس وقت یہ باغ جس جگہ لگایا گیا تھا اس کا نام شالامار تھا۔ اس لئے باغ بھی شالامار کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن چودہ سال کے بعد جب اس باغ کے درختوں میں "تنومندی"۔ "سرسبزی"۔ "رنگینی" اور "شادابی" آئی جس سے آنکھوں کو فرحت پہنچنے لگی تو شاہ جہاں نے اس کا نام فرحت بخش رکھ دیا۔ اور یہاں ایک حمام بھی بنایا۔ باغ کی پشت پر سے ایک دس گز چوڑی نہر باغ میں آتی تھی۔ اس کا نام شاہ نہر تھا۔ یہ کیاریوں اور روشوں سے ہوتی ہوئی باغ کے درمیانی حصہ میں آتی تھی، جہاں ایک خوبصورت عمارت تھی۔ اس سے ہوتی ہوئی یہ نہر دس گز چوڑے آبشار کی شکل میں ایک حوض میں گر جاتی تھی۔ اس حوض کے بیچ میں ایک چبوترہ اور آٹھ فوارے تھے۔ نہر حوض کے نچلے حصہ کی طرف اور دوسری عمارتوں سے ہو کر گذرتی۔ اور ایک ایسے آبشار تک پہنچتی جہاں نو (۹) فوارے تھے۔ حوض سے نکل کر ایک دوسرے آبشار کی طرف بہتی اور کیاریوں سے ہوتی ہوئی ڈل میں مل جاتی، جہاں سے کشتیاں باغ کی عمارتوں تک آتی جاتی رہتیں۔ (۱۰) کیاریوں کے آخر اور شاہ نہر کے بالائی حصہ میں ڈل سے متصل شاہ جہاں نے ایک عمارت بنائی تھی جس کے ایک طرف ڈل تھا اور دوسری طرف چمن کی روشیں تھیں۔ یہاں بھی کشتیاں آتی جاتی رہتیں۔ شاہ نہر کے مدمقابل دو اور عمارتیں تھیں۔ حوض کے دونوں اطراف بھی دو عمارتیں تھیں۔ ایک میں شاہی ملازمین رہا کرتے تھے۔ شاہ جہاں نے شہزادگی کے زمانے میں سفیدار اور چنار کے جو درخت شاہ نہر کے پاس لگائے تھے، ان دونوں کے نیچے ایک چبوترہ کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ پھر

شاہ جہاں ہی کے حکم سے باغ فرح بخش کے پیچھے ایک دوسرا باغ لگایا گیا جس کا نام فیض بخش رکھا گیا۔ اس میں سے شاہ نہر پندرہ گز چوڑی ہو کر گذرتی اور فواروں کی تین قطاریں چھوٹتی رہتیں۔ یہاں بھی باغ کے بیچ میں ایک حوض ۶۰ × ۶۰ گز کا تھا۔ اس میں شاہ نہر دو گز کی بلندی پر سے ایک آبشار ہو کر گرتی رہتی۔ اس میں ۱۴۴ فوارے تھے۔ اس حوض کے بیچ میں ایک عمارت بھی تھی جس کے دو ایوان پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ شاہ نہر یہاں سے ہوتی ہوئی گذرتی تو تین طرف تین آبشاروں کی شکل میں گرتی۔ ہر آبشار دس گز چوڑا تھا۔ اور فرح بخش کے دروازہ تک چلا جاتا، جہاں تین فوارے تھے۔ ایک دوسری عمارت باغ جھروکہ دولت خانۂ خاص و عام کی دیوار کے نزدیک تھی۔ باغ فرح بخش کی عمارتیں محل کی بیگمات کے لئے تھیں۔ فیض بخش کے بیچ کی عمارت "دولت خانۂ خاص" کے لئے تھی اور جھروکہ کے آگے کی عمارت دولت خانۂ خاص و عام کے لئے استعمال ہوتی۔ یہ تمام تفصیلات عبدالحمید لاہوری کی بادشاہ نامہ جلد اوّل حصہ دوم (ص ۲۴ تا ۲۶) میں درج ہیں۔ قزوینی کی بادشاہ نامہ میں ہے کہ اس باغ میں انگور، سیب، بادام اور شفتالو وغیرہ بہت ہوتے تھے۔

اور دوسرے باغوں کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ نامہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ نور افزا باغ میں پھل بکثرت ہوتے تھے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں اس باغ میں شاہ آلو کم ہوتا تھا، لیکن شاہ جہاں کے عہد میں بکثرت ہونے لگا۔ یہی مؤلف رقم طراز ہے کہ باغ بحر آرا میں چنار کے بڑے اونچے اونچے درخت تھے۔ چنار کے درختوں کے درمیان مچان (تالار) بنائے گئے تھے۔ یہ باغ جھروکہ درشن کے سامنے تھا۔ باغ نور افشاں میں بھی چنار کے درخت بہت تھے۔ اس کو نور جہاں نے دریائے بہٹ کے کنارے لگایا تھا۔ باغ الٰہی میں بھی بہت بڑے بڑے خوبصورت چنار کے درخت لگے ہوئے تھے۔ اس کو مرزا یوسف خاں نے اپنے عہد حکومت میں لگایا۔ لار سے تین گز کی چوڑی نہر یہاں آتی اور ایک ۱۰ × ۱۰ گز کے حوض میں آکر گرتی۔ یہاں تین چبوترے بھی بنے ہوئے تھے۔ باغ شہاب الدین پور میں چنار کے سو تناور درخت تھے جن کے سایے دریائے بہٹ میں پڑتے رہتے۔ جزیرہ بہنت میں ایک باغ گنگا دیشی تھا جس میں گوناگوں سبزے، طرح طرح کے پھول اور قسم قسم کے پھل تھے۔ (بادشاہ نامہ جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۲۵ تا ۲۹)

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

سوئی ہے کلی دِل کی، اس کو بھی جگا جانا
اس راہ سے بھی ہو کر اے بادِ صبا جانا

ہم بھولتے جاتے ہیں اُس چہرۂ زیبا کو
اے خواب ذرا اُس کی صورت تو دِکھا جانا

جب موسمِ گُل آئے اے نکہتِ آوارہ
آ کر درِ زنداں کی زنجیر ہلا جانا

پھر ہاتھ چھڑاتی ہے مجھ سے مِری تنہائی
پھر دِل کے سنبھلنے کے انداز بتا جانا

کس ناز سے پالا ہے ہم نے غمِ ہجراں کو
اس غم کو ذرا آ کر سینے سے لگا جانا

اوروں کے لئے یوں تو اِک سنگ گراں ہم ہیں
ہاں تم جو کبھی چاہو مٹی میں مِلا جانا

آنکھوں سے بھی اب دِل کی رُوداد نہیں کہتے
اب ہم سے کوئی سیکھے ہر بھید چھپا جانا

اپنے ہی خرابے میں ہم عمر گزاریں گے
جب تم کو مِلے فرصت یہ گھر بھی بسا جانا

شہاب جعفری

○

جہاں میں حوصلۂ روزگار کھو دیتے
جو تیرا غم بھی نہ ہوتا تو آج رو دیتے

پِلا وہ جام کہ ہر نوش پر سراب پِلا
بجھی نہ پیاس بھی دامن تو کیا بھگو دیتے

گلوں نے پھینک دی شبنم تنک مزاجی سے
یہ چند قطرے بھی زخمِ بہار دھو دیتے

دلیلِ ترکِ محبت میں سچ کہا تو نے
ہم ایسے تھے کہ تِرا اعتبار کھو دیتے

نہیں کسی میں تری بے وفائی بھی ورنہ
یہ درد آج بھی ایسا نہ تھا کہ رو دیتے

ابھی کہاں کوئی ساحل تِری صدا کے سوا
یہ ہم نشیں تو نہ جانے کہاں ڈبو دیتے

وہ بیخودی ہو، خودی ہو کہ اشتراکِ عمل
دلیلِ عشق ہے خود کو کہیں تو کھو دیتے

ہمیں شہاب یہ دُنیا بنا رہی ہے مجاز
وہ غم نصیب جو مِلتا تو دِل کے رو دیتے

محمد اقبال سُہیل

جگر — شخصیّت اور فن

"شعلۂ طور" کی چمک سے دِلوں کو تڑپانے، "آتشِ گُل" کی آنچ سے رُوحوں کو گرمانے اور اپنی مترنم اور پُر کیف کلام سے نُور و سرور کا دریا بہانے والے شہنشاہِ متغزلین حضرت علی سکندر جگر مُراد آبادی ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو دُنیائے آب و گِل سے عالمِ ارواح میں جابسے۔ انا للہ

شہنشاہِ متغزلین کو ہم سے جُدا ہوئے ابھی زیادہ دِن نہیں ہوئے ہیں، ان کی جُدائی پر دُنیائے ادب میں ایک قیامت برپا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایک واویلا مچا ہوا ہے۔ اُردو سماج کا ہر فرد متاثر و مغموم ہے۔ تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں۔ قرار دادیں منظور کی جارہی ہیں۔ خراجِ عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ جگر کا ماتم عارضی نہیں ہے دائمی ہے۔ (۳) کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم دورِ حاضر کے بہت بڑے شاعر ہی نہیں، بہت بڑے انسان بھی تھے۔

بیسویں صدی کے اوّلین نصف صدی کے مشاعروں کی کامیابی کا انحصار جگر کی شرکت سے وابستہ رہا ہے۔ جن لوگوں نے جگر کا کلام جگر کی زبانِ مبارک سے ان کے والہانہ انداز میں سُنا ہے ان کی نگاہیں آئندہ ہونے والے مشاعروں میں جگر کو تلاش کریں گی۔ کان ان کے ترنم کے سحرِ حلال کی آرزو کریں گے اور دِل بھی ان دونوں کی تمناؤں میں برابر کا شریک ہوگا مگر محرومی کی بنا پر نظر میں خلش، سماعت میں بے کیفی اور دِل میں اُلجھن پیدا ہوگی۔

جگر ناک نقشے کے کچھ خوبصورت نہ تھے۔ ان کو اپنی آراستگی کا کبھی خیال نہیں آیا۔ مزاج میں لااُبالی پن تھا۔ بیشتر پائجامہ، سیاہی مائل شیروانی اور سر پہ اُونچی سیاہ ٹوپی پہنتے تھے۔ سر پہ لمبے بال، جن کی لٹیں ٹوپی کی حدود سے نکل کر اِردگرد بکھر کر مرحوم کی آشفتہ مزاجی کی چغلی کھاتی تھیں۔ اس سج دھج سے مشاعرے میں بیٹھتے تو سنکلف لباس میں ملبوس خدوخال کے دُرست حسین و جمیل شعرا پر چھا جاتے تھے۔ جب پڑھتے تو جھُوم جھُوم کر اور مُسکرا مُسکرا کر کہ دانت نمایاں ہو جاتے۔ آواز میں رس اور لئے میں لوچ تھا۔ جس سے کلام کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ سامعین کے جذبات کا احترام کرتے تھے اور سُنانے میں بخل نہیں کرتے تھے۔ لیکن عُمر کے آخری حصّے میں ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ زیادہ پڑھنے سے مجبور تھے۔ بیشتر دو غزلیں پڑھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتے کہ "بھائی اب پڑھا نہیں جارہا ہے۔" دو ایک بار کھانستے، دو ایک شعر اور سُناتے اور پھر معذرت کر کے اُٹھ جاتے تھے۔

جگر مرحوم کا تعلق ایک ذی علم اور ذی عزّت خاندان سے تھا۔ بُزرگوں کا وطن دہلی تھا جو شاہزادگانِ دہلی کی تعلیم و تربیت پر مامور تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں کے اتالیق تھے۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں ان کے بُزرگ مراد آباد میں آبسے تھے۔

مُراد آباد کو مرحوم کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن ان کی پیدائش بنارس میں ہوئی۔ یہاں ان کے والد مولوی علی نظر صاحب والئ ٹونک کے ساتھ رہتے تھے۔ جگر کا بچپن مراد آباد میں گذرا۔ زندگی کے کوئی چودہ سال یہاں گذارے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد اور کروی (باندہ، یُوپی) میں ہوئی۔ باندہ میں ان کے چچا مولوی علی ظفر صاحب انسپکٹر آف پولیس تھے۔ پھر لکھنؤ منتقل ہو کر آگئے۔ یہاں جگر نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ جگر کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن قدرت سے

ان کو ذوقِ سلیم عطا کیا تھا جس کی رہنمائی میں انہوں نے عربی، فارسی اور کسی قدر انگریزی کا صحیح مذاق حاصل کیا۔ تعلیم سے محرومی کی وجہ والد صاحب کی وفات تھی۔ جگر کوئی پندرہ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ جب وہ پچیس برس کے تھے تو ان کی والدہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ تلاشِ معاش میں گھر سے نکلنا پڑا۔ انہوں نے چشمے کی ایجنسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا اور آگرہ میں بے جل کمپنی سے متعلق ہو گئے۔ آگرہ میں ان کا قیام کوئی پانچ سال رہا۔ یہاں ان کو وحیدن بی سے محبت ہوئی۔ پھر شادی کرلی۔ وہ بیچاری کچھ ایام تک جگر کا ساتھ دے کر ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگئیں۔ یُوں تو جگر کا قیام مستقل طور پر آگرہ میں تھا، لیکن کاروبار کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ اسی کاروبار کی بدولت ان کا تعارف پیر حضرت اصغر گونڈوی سے ہوا۔ اس وابستگی نے جگر کی ذہنی، رُوحانی اور ادبی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ ایسی صورتیں پیدا ہو گئیں کہ جگر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرزمین گونڈہ سے وابستہ ہوگئے۔ اگرچہ درمیان میں وہ مین پوری چلے آئے تھے۔ اسی سرزمین سے جگر کی حیاتِ معاشقہ کا ایک دلچسپ واقعہ متعلق ہے۔ لیکن گونڈہ کی خاک میں ایسی کشش تھی کہ جگر کو پھر واپس جانا پڑا۔ ۱۹۴۱ء میں اُنہوں نے حضرت اصغر مرحوم کی بیوی سے عقد کرلیا اور تادمِ واپسیں گونڈہ ہی میں رہے اور وفات کے بعد گونڈہ ہی میں مدفون ہوئے۔

جگر کا سنِ پیدائش جگر صاحب کی یادداشت کی بنا پر ۱۸۹۰ء ہے۔ اُنہوں نے زندگی کی کوئی ۶۲ بہاریں دیکھی تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں ان کو حرمین شریفین کی زیارت کا شرف ملا تھا۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق جگر کی موت بہت ہی مُبارک موت ہے۔ ان کا انتقال دن کے بہترین وقت کوئی ۶ بجے صبح اور ہفتہ کے مسعود ترین یوم جمعہ کو ہوا۔

جگر بہت بڑے شاعر ہی نہیں، بہت بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں ؎

انہیں میں کھینچ کر رُوحِ محبت میں نے بھر دی ہے
مرے اشعار دیکھیں گے مِرا دل دیکھنے والے

جگر کی شاعری محبت ہی محبت ہے۔ ان کی شخصیت بھی محبت ہی محبت ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں یکساں دلآویزی اور دلکشی ہے ــــ بانکپن سے جینا اور بانکپن سے مرنا ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ وہ "لاکھ رسوا سہی" مگر "خوش نظر" بھی تھے اور "خوش خیال" بھی۔ کبھی وہ "ننگِ میخانہ" تھے، لیکن ساقی کے فیض نے ان کو "پیرِ میخانہ" بنا دیا تھا۔ مجھے جگر سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کا شرف کئی بار حاصل ہوا ہے۔ جن بزرگوں کو ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے بیان اور اپنے مشاہدے کی بنا پر میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جگر میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو اُنیسویں صدی کے ایک مہذب اور مشرقی روایات کے حامل خاندان کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔ وہ خوش مزاج، خندہ جبین، عالی ظرف اور خلیق انسان تھے۔ وہ خوددار بھی تھے اور منکسر المزاج بھی۔ طبیعت میں جس قدر بے نیازی تھی اسی قدر نیازمندی بھی تھی۔ وہ جتنے لاابالی تھے اتنے ہی وضع دار بھی تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ دوسروں کے جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے کردار کا یہ پہلو ان کی شاعری میں بھی جاری و ساری ہے ــــ اُردو شاعری میں رقیب، رُوسیاہ اور زاہدِ خشک کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا گیا ہے لیکن جگر نے کوئی ایسا شعر نہیں کہا ہے جس سے رقیب کی تذلیل اور زاہد کی تضحیک ہو۔ رقیب ہزار دُشمنِ جاں سہی لیکن وہ جگر کو عزیز ہے ؎

وہ ہزار دُشمنِ جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

ان کو ناصح سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ناصح ان کو ترکِ اُلفت کی نصیحت کرتا ہے لیکن وہ چیں بر جبیں بھی نہیں ہوتے بلکہ اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ترکِ اُلفت بجا سہی ناصح
لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی

جگر نے "بجا سہی" کا لفظ محض ناصح کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے استعمال کیا ہے۔

جگر کو کسی سے شکایت نہیں ہوئی۔ اگر شکایت ہوئی تو ایسے لوگوں سے جو بد باطن اور کوتاہ بین تھے۔ ان کو زمانے کے اس انقلاب سے شکایت

تھی جس میں انسان انسان نہیں رہا۔ اس کی شکل آدم کی اور رُوح شیطان کی ہو گئی۔ انسانیت کا فقدان جگر کو ہمیشہ تڑپاتا رہا ؎

اب کہاں انسان جیسے انساں کہیں
چلتی پھرتی دیکھ لو پر چھائیاں
اس زمانے کا انقلاب نہ پُوچھ
رُوحِ شیطان کی شکل آدم کی

جگر حُسن پرست تھے۔ حُسن مجازی ہو یا حُسن حقیقی، ان کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ انہوں نے محبت کی اور ان سے محبت کی گئی۔ انہوں نے ناز اُٹھایا اور غرورِ عاشقانہ دِکھایا۔ وہ ایک عرصہ تک رِند دریا نوش رہے۔ انہوں نے گناہ کئے لیکن زندگی کو گناہِ آدم کبھی نہیں سمجھا۔ انہوں نے خطائیں کیں لیکن رحمت سے مایُوس نہیں ہوئے۔ ان کی قابلِ توجہ خُوبی یہ تھی کہ وہ فکر و عمل کے احتساب سے کبھی غافل نہیں رہے ؎

مرے گناہوں کا کیا ٹھکانا خیال سے شرم آرہی ہے
رواں ہیں آنکھوں سے اشکِ پیہم حیات گنگا بہا رہی ہے

مشرقیت اور مذہبیت نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔ وہ خدا کے وجود کے ہمیشہ قائل رہے۔ مذہبی رہنماؤں اور رُوحانی پیشواؤں کا اُنہوں نے ہمیشہ احترام کیا ہے اور عالمِ سرخوشی میں ان کے سامنے آنے سے ہمیشہ گُریز کیا ہے۔ وہ رِند تھے مگر سلطانِ مدینہؐ کی مدحت سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ اصغر گونڈوی کے توسط سے وہ الحاج قاضی عبدالغنی شاہ منگلوری نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے۔ اپنے اعمال کے احتساب، بُزرگوں سے عقیدت اور مذہبیت کی بنا پر ان کو شراب سے توبہ کرنے کی توفیق مِلی۔ ان کے مزاج میں کسی قدر شدت تھی۔ جب تک پی تو خوب چھک کر پی اور جب ۳۸-۱۹۳۹ء میں توبہ کی تو پھر کبھی مُنہ سے نہیں لگائی۔ یہ اور بات ہے کہ ترکِ شراب کے بعد وہ مینائے فطرت کی شرابِ لطیف پیتے رہے ؎

ترکِ مے سے اور بھی میں تو شرابی بن گیا
روز آجاتا ہے مینائے سحر میرے لئے

وطن دوستی جگر کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اگرچہ انہوں نے جنگِ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن ان کے کلام میں غلامی کی زندگی

تعبیر

سے نفرت کا اظہار جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد بہت سے ہندوستانی ترکِ سکونت کرکے پاکستان پہنچے۔ ان میں بہت ایسے تھے جن پر مُلک کی زمین بھاری تھی مگر کچھ ایسے بھی تھے جن کو مُلک نے دولت و عزت سے نوازا بھی تھا۔ کچھ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگے اور کچھ کو سبز خواب دِکھلائے گئے۔ جگر کو بھی اہالیانِ پاکستان اور وہاں کے اربابِ حل و عقد نے کئی بار لالچ دیا۔ ملک الشعرا بنانے کا وعدہ کیا مگر جگر کی وضع دار، حسن پرست اور وطن دوست طبیعت نے ترکِ سکونت انسانیت کے منافی سمجھا۔ سوادِ ساحلِ گنگا اور گلگشتِ جمن سے قطع تعلق ان سے نہ ہو سکا۔ انہوں نے ورغلانے والوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا ؎

گُلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

جگر خوش نصیب انسان ہی نہیں تھے، وہ خوش نصیب شاعر بھی تھے۔ عوام و خواص میں وہ جس قدر مقبول و محبوب ہوئے، اس کی مثال اس عہد میں مِلنی ناممکن ہے۔ قوم اور ملک نے ان سے محبت کی، ان کا احترام کیا۔ ان کے ناز اُٹھائے اور ان کا اعزاز بڑھایا۔ جگر کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شعلۂ طور اور آتشِ گُل کے کئی کئی ایڈیشن ہندوستان و پاکستان سے شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بِک گئے۔ مشاعرے میں شرکت کے لئے وہ کڑی سے کڑی شرطیں رکھتے تھے۔ مگر پرستارانِ جگر ان کی ہر شرط کی تعمیل کرتے تھے۔ خاتمۂ زمین داری سے قبل جگر کو ریاست بھوپال سے ایک سَو روپیہ ماہوار مِلتا تھا۔ اب سے تین سال قبل ان کی علالت کے زمانے میں عوام نے ان کی صحت کی دُعائیں مانگیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ مُلک کی ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے الگ الگ ماہانہ وظائف مقرر کئے۔ ۱۹۵۸ء میں ساہتیہ اکاڈمی ہند نے "آتشِ گُل" پر اُردو کی بہترین کتاب ہونے کی بنا پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کی فنی اور علمی صلاحیتوں کی بنا پر ان کو ۱۹۵۸ء کے کانوکیشن میں "ڈکٹور ادب" کا اعزاز عطا کیا۔ نہ جانے کتنے اداروں نے جگر کی گولڈن جوبلی منانے کا پروگرام بنایا لیکن جگر کا

انتقال ہوگیا اور گولڈن جوبلی کی جگہ تعزیتی جلسوں نے لی۔ ہندوستان اور پاکستان میں کوئی بھی ایسا شہر نہیں جہاں مختلف اداروں اور حلقوں نے جگر کا سوگ نہ منایا ہو۔ کیا ہندوستان کی کسی زبان میں آج کوئی ایسا شاعر موجود ہے جو اتنا ہی محبوب ہے جتنا جگر تھے اور کیا کوئی ایسا سخن ور ہے جس کو قوم و ملک نے اتنے اعزازات عطا کئے ہوں ؟

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جگر کی شاعری اکتسابی نہیں، فطری ہے۔ شاعری ان کو ورثے میں ملی ہے۔ ان کا خاندان شعر و سخن کا گہوارہ تھا۔ قیس الفاروقی کی نگارشات سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جگر کے والد علی نظر، چچا علی ظفر، تایا علی اکبر، دادا حافظ، مولوی امجد علی اور پردادا حافظ نور محمد سب ہی شاعر تھے۔ جگر نے جب آنکھیں کھولیں تو گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ماحول نے شاعرانہ صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے فارسی غزل کہی تھی۔ غزل سے فطری لگاؤ تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ ابتدائی کلام اپنے والد [illegible] بعد داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں داخل ہوئے۔ داغ کے بعد رسا سے اصلاح لی۔ انہوں نے ان کو امیر اللہ تسلیم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ جگر اصغر سے متاثر ہیں۔ انہیں کی فیضِ صحبت نے جگر کو جگر بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاعرِ فطرت تھے۔ فطرت [illegible] آئینہ اور قدرت ان کا شانہ تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جگر کی شاعری کے خط و خال درست کرنے میں اصغر کی فکر و نظر شامل ہے جس کا اعتراف جگر نے "شعلۂ طور" کو ان کے نام معنون کرکے کیا ہے۔ جگر نے اپنے کلام میں اگر کسی سے عقیدت کا اظہار کیا ہے تو وہ "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" کے شاعر حضرت اصغر گونڈوی ہی ہیں ؎

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہوکر تو اٹھو باخبر ہوکر

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

جگر کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دورِ اوّل کا کلام "داغِ جگر" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ۱۹۳۲ء میں "شعلۂ طور" کی صورت میں اور تیسرا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں "آتشِ گل" کے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ اسی تیسرے مجموعہ کو ۵۷ - ۵۶ - ۱۹۵۵ء کی بہترین اردو تصنیف تسلیم کرکے ساہتیہ اکاڈمی نے پانچ ہزار روپے کا اعزاز بخشا تھا۔ جگر نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا سرمایۂ افتخار ان کی غزلیات ہیں۔ وہ لیلائے غزل کے قیس اور عذرائے تغزل کے وامق ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر کچھ اوپر چالیس سال کی ہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے عروسِ غزل کی زلف کو سنوارا [illegible] خد و خال درست کئے اور اس کے حسن کو دلآویز بنا کر عوام و خواص میں مقبول بنایا۔

جگر رومانی شاعر ہیں۔ انہوں نے فسانۂ حسن و عشق کی زبان میں بیان کیا ہے۔ جگر کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی محبت ہی محبت ہے۔ وہ پیغمبرِ اسرارِ محبت ہیں۔ وہ صاحبِ کتاب ہیں۔ ان پر صحیفۂ عشق نازل ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا پیکر عشق و مستی، حسن و شباب کے اربعہ عناصر سے تیار ہوا ہے۔ جذبات و تخئیل کی آمیزش نے اس کی دلکشی اور رعنائی میں اضافہ کیا ہے۔ وہ کشتۂ خیام نہیں، حافظ شیرازی کے بسمل ہیں۔ وہ اردو کے حافظ ہیں۔ حسن و عشق کی رعنائیاں، رندی و سرمستی کی دلربائیاں، کیف و سرور، سرشاری اور والہانہ پن، حقائق و معارف کے رموز جو حافظ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہیں، جگر کے یہاں بھی ایک رچاؤ کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جگر رند ہیں، ان کی غزل بھی رندانہ ہے۔ یہاں "معنی و مطلب نہیں بادہ و پیمانہ ہے"۔ ان کا کلام "حسن دوست کی [illegible] داد" اور ہر لفظ سرمایہ دارِ عشق کا راز ہے۔ جگر کے کلام کی تازگی اور رنگینیٔ محبوب کی توجہ کی گلکاری کا نتیجہ ہے ؎

کہاں میں، کہاں تازہ اشعارِ رنگیں
تری اِک توجہ کی گلکاریاں ہیں

جگر کے کلام میں جو تازگی اور دلکشی ہے وہ ہر زمانے اور ہر عہد میں باقی رہے گی۔ اس میں ہر انسان کے دل کی دھڑکن شامل ہے۔ محبت ایک لطیف ترین جذبہ ہے جو تمام بنی نوعِ انسان میں مشترک ہے۔ جہاں اور جب تک حضرتِ انسان کا وجود ہے عشق و محبت کا سرور اور حسن و شباب کا نور بھی ہے۔ دوسرے تمام نکات مدھم اور جذبات سرد ہوسکتے ہیں، لیکن حسن

کی دل کشی اور عشق کی رعنائی میں نہ کمی آئی ہے اور نہ آئے گی۔ اسی لئے جہاں کہیں اور جب کبھی یہ نغمات گائے جاتے ہیں فوراً آدمی کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی اس ہمہ گیری سے جگر کے کلام کی عظمت اور آفاقیت بڑھ جاتی ہے۔

غزل اُردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ اگرچہ غزل کو بڑے ہی آزمائشی دَور سے گذرنا پڑا ہے، اس کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ اس کو بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ کسی نے "بے وقت کی راگنی" تو کسی نے اُردو کے جسم پر "ناسور" بتایا ہے۔ ایک طبقہ نے غزل کو جاگیردارانہ تہذیب کا نمائندہ کہہ کر اس کو گردن زدنی قرار دیا۔ لیکن تعجب ہے کہ غزل آج بھی زندہ ہے بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ جوان ہے۔ قدیم دَور میں غزل جتنی محبوب اور مقبول تھی آج بھی محبوب اور مقبول ہے۔ اس کا سبب غزل کے حسن کا سحرِ حلال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک دَور ایسا بھی آیا جس میں غزل کے حسین جسم کو بدنما اور گندے لباس سے ڈھک دیا گیا۔ لیکن اس میں غزل کا قصور نہ تھا۔ یہ جرم سخن طلان غزل کا تھا؛ غزل سے نفرت نہ کرنی چاہیئے۔ یہ ہماری تہذیب کا ایک پہلو ہے۔ یہ ہر حال میں ہمارے ساتھ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے وہی شعرا مقبول ہوئے ہیں جنہوں نے غزل کو سنوارا ہے۔ جگر کی مقبولیت کا بھی یہی راز ہے۔ اُردو غزل کا معیاری پیکر ولی، میر درد، میر تقی میر اور سودا نے تیار کیا تھا۔ مومن، غالب، مصحفی اور آتش نے اس کے خدو خال کو دُرست کر کے اس کو کچھ اور حسین بنایا۔ مگر متاخرین شعرا کا ایک گروہ ایسا بھی آیا جو سماج کے اشارے پر اپنی ذہنی کثافت کے چھینٹوں سے اس کے چہرے کو بدنما کر کے اس کو بدنام کر گیا جس کا انجام یہ ہوا کہ غزل مردود ہونے لگی۔ ضرورت تھی کہ اس صنفِ شریف کے چہرے کی کثافت کو دُور کر کے اس کے اصلی حسن کو پیش کیا جائے۔ جن لوگوں نے اس خوش گوار فرض کو انجام دیا اُن میں حسرت، فانی، اصغر اور جگر قابلِ ذکر ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں "بیسویں صدی کے ایوانِ غزل گوئی کے یہی چار ستون ہیں۔" غزل کو زندہ اور مقبول بنا کر ان حضرات نے ہماری تہذیب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ان شعرا میں جگر کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے غزل کو عوام و خواص میں مقبول بنایا اور محلوں سے لے کر جھونپڑوں تک پہنچا دیا۔

تعبیر

جگر کا ایک انفرادی رنگ ہے۔ اسی انفرادیت کی بدولت وہ ولی اور میر سے لے کر فراق اور فیض تک لاکھوں متقدمین و متاخرین شعرا میں جہاں کہیں بیٹھے ہوں، فوراً پہچان لئے جائیں گے۔ جگر کی انفرادیت ان کے جذبے کی لطافت، تخئیل کی نزاکت، اسلوب کی دل کشی انداز بیان کی حسین سادگی میں پنہاں ہے۔ جگر کے یہاں میر کا سوز نہیں، غالب کا تنوع نہیں، اصغر کے تخئیل کی بلندی اور فانی کی یاس انگیزی بھی نہیں ہے۔ ان کے یہاں نہ تو حسرت کی شوخی ہے اور نہ فراق کی جدیدیت ہے، لیکن جگر کے یہاں جذبے کی گرمی اور بیان میں والہانہ پن ضرور ہے۔ شعرا کے کلام کا فرق ان کی زندگی اور مزاج کا فرق ہے۔ میر کو زمانے نے پراگندہ روزی پراگندہ دل رکھا۔ محرومیوں اور ناکامیوں نے ان کے دل کو پرخون کر دیا۔ وہ دلِ پرخون کی گلابی سے عمر بھر شرابی رہے۔ اسی عالم میں ان کے دل کی کسک لبوں تک آتی اور شعر بنتی رہی۔ انہوں نے لاکھ دردِ دل جمع کئے تو دیوان تیار ہوا۔ فانی کی زندگی کا یہی حال ہے۔ زندگی کی محرومیوں اور تلخ کامیوں نے ان کو "یاسیات کا امام" بنا دیا۔ غالب کا تنوع ان کی رنگا رنگ طبیعت، فلسفیانہ مزاج اور زمانے کے نشیب و فراز کا فیض ہے۔ اصغر کے یہاں حسن کا ماورائی تصور اور اسلوب کی سنجیدگی و دلاویزی تصوف کی بدولت ہے۔ حسرت کی شوخی ان کے مزاج کے بانکپن اور "بنتِ عم" سے عشق کا عطیہ ہے۔ لیکن جگر کا مزاج اور ان کی زندگی ان سب سے جُدا ہے۔ جگر حسن پرست تھے۔ جوانی آئی تو عشق کی سرمستی ساتھ لائی۔ اس کے ساتھ ہی بادہ پرستی بھی رنگ لائی۔ حسن، عشق اور شراب ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گئے کہ گردشِ دوراں پہ دل گرفتہ ہونے اور چشم پُرنم ہونے کا احساس تک چھن گیا۔ ان کی پرورش ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جہاں بے حجابی اور بے نقابی کی گنجائش نہیں تھی۔ جگر کی شاعری اور جوانی کا ابتدائی دَور تھا کہ ان کو اصغر جیسا مخلص انسان اور صوفی شاعر مل گیا۔ اصغر کی غزل ایک شرارِ معنوی ہے جو گردش میں ہے۔ یہاں فریاد و ماتم کی گنجائش نہیں۔ اصغر نے جگر کے شعری ذوق، رُجحانات، اور زندگی کو اتنا سنوارا ہے کہ وہ ان کو اپنا مولا و آقا مانتے ہیں۔ جگر کا رچا ہوا تغزل اصغر کی فیضِ تربیت کا نتیجہ اور ان کے اسلوب میں باوقار سادگی اور سنجیدگی ان کے خاندان کی دین ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر

جگر کو کاشانۂ اصغر کے حریمِ حسن معنی میں باادب بیٹھنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو وہ اتنے باخبر نہ ہوتے اور ان کا مذاق اتنا ستھرا اور پاکیزہ نہ ہوتا۔ جگر کو حسن کا احترام، عشق کی عظمت، اسلوب میں سنجیدگی اور اندازِ بیان میں دلکشی اصغر ہی سے ملی ہے، ورنہ وہ داغ کے رنگ میں ہلکی پھلکی شاعری کے دام میں گرفتار ہو کر رہ جاتے۔

جگر نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ انہوں نے صحت مند اور خوشگوار روایات کا اضافہ کیا ہے۔ اُردو کے شعرا محبوب کی تغافل شعاری اور سنگ دلی کا گلہ کرتے آئے ہیں۔ اُردو غزل کا محبوب بے وفا، جفاشعار، ظالم اور قاتل ہے۔ یہی نہیں وہ غیر کے گھر سوتا اور رقیبوں کو جمع کرتا ہے۔ وہ اتنا بے حس اور بے مروّت ہے کہ عاشق اس کے ہجر میں نالہ، فریاد، آہ و زاری کرتا ہے اور صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے جان سے گذر جاتا ہے۔ لیکن محبوب پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ محبوب کا یہ تصور غلط اور بے بُنیاد ہے۔

جگر کو ان شعرا سے شکایت ہے جنہوں نے پیکرِ حسین کو قاتل بنا دیا ہے

ان شاعرانِ دہر پہ ہو لعنتِ ہی کی مار
اِک پیکرِ حسین کو قاتل بنا دیا

جگر نے محبوب کا صحیح تصور پیش کیا ہے۔ ان کا محبوب دل رکھتا ہے اور عاشق کے دل کی خبر رکھتا ہے۔ وہ عاشق کی آہ اور واہ میں برابر کا شریک ہے۔ وہ تمام انسانی جذبات و احساسات کا حامل ہے۔ وہ شریف ہے اور وضع دار ہے

جگر وہ بھی ز سرتاپا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

کوئی تو دردمند دلِ ناصبور تھا
مانا کہ تم نہ تھے کوئی تم سا ضرور تھا

اُف وہ رُوئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
ہائے وہ زُلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلابِ افشاں جبیں
وہ دھڑکتا دل، وہ گھبرائی نظر میرے لئے
اُف وہ کہنا اس کا پھر باہوں میں باہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

جگر کے معشوق کی طرح ان کا عاشق بھی قابلِ احترام ہے۔ وہ ایسا نہیں جو سراپا ناز کے ساتھ پیش دستی کرے۔ وہ "تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کا بھی قائل نہیں۔ وہ اپنے جذبۂ عشق اور اپنے محبوب (دونوں) کا احترام کرتا ہے۔ اس کو اپنے محبوب کی رسوائی گوارا نہیں۔ پیش دستی کرنا تو درکنار، وہ آنکھ بھر کر بھی دیکھ نہیں سکتا اور اگر دیکھتا ہے تو اسی وقت جب وہ محبوب کا اشارہ پاتا ہے

تو جگر جو رسوا ہے، آہ تو ہی رسوا رہ
نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب ان کا

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر ان کے رُوبرو
نادیدہ اِک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

آئے زباں پہ رازِ محبت محال ہے
تم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے

بس اِک نگاہِ محبت سے دیکھ لینا ہے
مگر جو خاطرِ نازک پہ کوئی بار نہ ہو

جگر نے عشق اور محبت کا صالح تصور پیش کیا ہے۔ عشق میں حسن کا احترام اور محبوب کے جذبات کا خیال رکھا ہے۔ وہ مصائب میں شکوہ کرنا توہینِ عشق سمجھتے ہیں۔ وہ نالہ و فریاد کے قائل نہیں۔ چاک دامانی اور شوریدہ سری ان کو گوارا نہیں۔ عشق میں ضبط شرط ہے۔ جگر کے تغزل کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ عشق کو عینِ حقیقت مانتے ہیں۔ حسن کی عظمت تسلیم کرتے ہیں لیکن عشق کو حسن سے کم تر نہیں سمجھتے۔ انہوں نے عشق کو خودداری سکھائی ہے۔ عشق میں شانِ دلبری پیدا کر کے حسن کو عشق کا گرویدہ بنایا ہے

وہ ناز آفریں تھے انہیں اس پہ تھا غرور
میں تھا نیازمند مجھے اس پہ ناز تھا

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست
دل بھی ہے اِک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

خوشا یہ بیمارئ محبت زہے یہ خودداریٔ طبیعت
وہی ہیں مصروفِ دل نوازی، وہی جھجکتے ہیں جو تڑپتے

جگر کے یہاں عشق میں اضطراب و بے چینی ہی حاصلِ عشق ہے۔

زندگی ہے۔ اسی لئے وہ ہجر سے شاد اور وصل [illegible] شاد ہوتے
- وہ ایسے ایذا پسند ہیں کہ سحر کو شام جدائی سے تبدیل کرتے ہیں۔ ایس
سے کہیں ان کی مشکل شوق آسان نہ ہو جائے، دُعا اور اثر دونوں بیچتے
رشید احمد صدیقی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ وہ دُوری اور مہجوری کے
عر ہیں ۔

اِک شاہدِ صورت و معنیٰ سے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

وعدہ تو کیجئے مگر ایفا نہ کیجئے
محدود وصل شوق کی دُنیا نہ کیجئے

ازل سے ہوں خوں کردۂ یاس و حرماں
مری طبع خود دار ہے ناپشیماں
مبادا کہ ہو مشکل شوق آساں
من آں دردمندم کہ درد ور درماں
دُعا می فروشم اثر می فروشم

محبوب کے جذبات کا احترام کرتے کرتے جگر کا مزاج کچھ ایسا بن گیا
وہ ہر ایک کے جذبات کا احترام کرنے لگے۔ اسی لئے انہوں نے زاہد خشک اور
ناداں سے کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ ان کے یہاں رقیب بھی کا گذر نہیں
ان کا محبوب با عصمت ہے۔ غیر ہزار دُشمن جاں سہی مگر وہ ان کو
نہیں ہے۔ وہ دُشمنوں کے لئے سرِ تسلیم خم کئے تیار رہیں کیونکہ ایسے ہی
ن کا بانکپن دلِ خوباں میں چبھتا ہے۔

بعض ناقدین کی رائے ہے کہ جگر کے کلام میں ایسی گہری نفسیات
و عشق نہیں ملتی جو حسرت کے یہاں پائی جاتی ہے لیکن "شعلۂ طور"
"آتش گل" کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کا
و عشق کی نفسیات سے معمور ہے۔ انہوں نے محبت کی ہے اور
محبت کی گئی ہے۔ انہوں نے ناز اٹھایا ہے اور غرورِ عشق بھی
ہے۔ اسی لئے ان کو حسن و عشق کی نفسیات کا گہرا علم ہے۔ ان
م میں محبت کی ابتدائی منزل سے لے کر انتہائی منزل تک کے حقائق

محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ
منہ چھپائے نہ بنے سامنے آئے نہ بنے

حاصلِ حسن و عشق اسے سمجھو
وہ جو پہلی نگاہ ہوتی ہے

تجاہل، تغافل، تبسم تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گذرے

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ترکِ شراب کے بعد جگر کے کلام میں وہ گرمی باقی نہیں رہی۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ "شعلۂ طور" میں جذبات کی شدت ہے مگر "آتشِ گل" میں جذبات کی شدت میں تخیل کی لطافت شامل ہو گئی ہے۔ اس سے کلام میں حسنِ معصوم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ عمر کے ساتھ یہاں کلام میں گہرائی اور گیرائی آگئی ہے۔ "شعلۂ طور" کے دور کی شاعری "ربِ ارنی" اور "لن ترانی" کی کشمکش اور جذبات کی شدت سے عبارت ہے اور "آتشِ گل" کی شاعری میں جو وقار اور بلندی ہے وہ طور کی تجلیات سے ہم آغوشی ہو کر پیدا ہوئی ہے۔

جگر اگرچہ حسن و عشق کے ترجمان ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے دل و دماغ کو ہمیشہ بیدار رکھا ہے۔ وہ اپنے عہد کے خارجی واقعات سے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ غمِ جاناں کے برابر غمِ روزگار بھی لئے بیٹھے رہے۔ ان کی ہر دور کی شاعری میں ان تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے البتہ غمِ روزگار کے لئے عشق کی زبان استعمال کی ہے۔ "آتشِ گل" میں یہ اثرات بہت نمایاں ہیں۔ یہاں روحِ عصر جلوہ گر ہے اور وقت کی رفتار کی آواز اور عہدِ جدید کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ جگر نے کسی سیاسی گروہ سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔ ان کے نزدیک شاعری اور سیاست دو متضاد راہیں ہیں۔ سیاست کی بنیاد نفرت اور خود غرضی پر ہوتی ہے اور شاعری ایک فن

لطیف ہے جس کا مقصد روح کی شگفتگی اور بالیدگی ہے۔ جگر اہلِ سیاست پر طنز نہیں کرتے، ہاں اپنے فرض کا احساس ضرور رکھتے ہیں ؎

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر کے یہاں مسلسل غزلیں ہیں جن میں کیفیاتِ حُسن اور وارداتِ عشق کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کے کلام میں تصوّف کے رموز و حقائق کی چاشنی ملتی ہے اگرچہ وہ میر دردؔ یا اصغرؔ کی طرح ہمہ گیر نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی اور زندگی کے دیگر حقائق و تجربات بھی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک حادثہ ہے مگر ایسا حادثہ ہے جس کا سلسلہ موت سے بھی ختم نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک زندگی مر مر کے جیئے جانے کا نام نہیں۔ قیدِ حیات و بندِ غم یہاں ایک نہیں ہیں۔ جگر کی زندگی بادۂ و ساغر لئے ہوئے اور ہر لحظہ سرِ مدمیتر لئے ہوئے ہے۔ وہ موت کی آغوش کو ماں کی آغوش سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ موت سے گھبراتے نہیں ہیں۔ جگر نے زندگی اور موت دونوں کو حسین بنا دیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جگر ترقی پسند ہیں یا نہیں لیکن اگر انسانیت اسے محبت اور شیفتگی سے نفرت ترقی پسندی کی دلیل ہے تو جگر یقیناً ترقی پسند ہیں۔ ان پر رجعت پسندی اور فراریت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ وہ علی الاعلان دلِ سکون دشمن کو سکون تلاش کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ کارزارِ حیات ہر لمحہ درپیش رہتے ہیں۔

جگر کا اسلوب سادہ، دِل کش اور پرکار ہے۔ اس میں نِشتر کی سی تیزی اور شعاعِ آفتاب کی تیزی اور گرمی اور زُود اثری ہے۔ جس طرح آفتاب کی کرنوں سے کائنات کا گوشہ گوشہ بیدار ہو جاتا ہے اور ساری فضا نور سے معمور ہو جاتی ہے اسی طرح جگر کا کلام سُن کر نُور و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے بے شمار شُستہ اور پاکیزہ تراکیب اختراع کی ہیں۔ ان کا اسلوب تکلّف اور تصنع سے بری ہے۔ صنائع لفظی اور معنوی کا استعمال تو درکنار وہ تشبیہات اور استعارات کا سہارا لینا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ان کے خیال سے زیادہ کوئی دوسری شے لطیف تر نہیں ہو سکتی۔ جگر نے فرمایا ہے ؎

وہ نوائے عاشقی ہو کہ ادائے دِلبرانہ
جو دِلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

جگر کی انسانیت نے ان کو محبوب اور ان کی شاعری نے ان کو پاکستان اور ہندوستان میں مقبول بنایا ہے۔ اپنے رچے ہوئے تغزّل، دِل آویز اسلوب کلام کی حسین پرکاری کی بدولت وہ زمانے پر چھا گئے۔ انہوں نے اپنی نوائے عاشقی اور ادائے دلبرانہ کی ترجمانی سے لوگوں کے دِلوں کو فتح کر لیا اسی لئے وہ فاتحِ زمانہ ہیں۔ عہدِ حاضر کا ہر شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر جگر سے متاثر ہے۔ ان کے اندازِ غزل خوانی کی تقلید کی گئی۔ ان کے نظریات حسن و عشق کو اپنایا گیا۔ جگر خود ایک اسلوب ہیں۔ وہ ایک دور آفریں تغزل کے خالق ہیں۔ اُردو ہی پر نہیں، ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب پر بھی جگر کا اثر پڑا ہے۔ امرت لال ناگر نے جگر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ "جگر بیسویں صدی کے مہاکوی تھے۔ مہاکوی نے صرف اُردو کے شیدائیوں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ کروڑوں ہندی بھاشا جاننے والے بھی ان کے بھگت ہیں۔" اُردو اور ہندی سماج میں جگر کی مقبولیت نے ان کو فخرِ ہندوستان بنا دیا ہے۔

غالبؔ نے فرمایا تھا ؎ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن۔
غالبؔ کی پیشین گوئی ان کے حق میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ جگر نے بھی پیشین گوئی کی ہے ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ مئے خانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

یہ تعلّی نہیں، حقیقت ہے۔ جگر کی شاعری جن کی روایات و رُجحانات کی حامل ہے، اس کی نظیر مستقبلِ قریب میں ملتی نظر نہیں آتی اور اسی لئے جام و پیمانہ ان کو مدّتوں رویا کریں گے۔

نہالؔ رضوی

نذرانۂ خلوص

(تضمین بر غزل حضرت جگرؔ مُرادآبادی مرحوم)

مان کے شائستہ آدابِ رندانہ مجھے
دیکھ کر ناظورۂ اُردو کا دیوانہ مجھے
یاد فرمائیں گے سب بے اختیارانہ مجھے
"جان کر منجملۂ خاصانِ مےخانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"

ساغرِ تخیل کو بادہ اثر پرور دیا
دامنِ افکار کو حسنِ عطا سے بھر دیا
عام نغمے کو قبولِ خاص کا جوہر دیا
"تنگِ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اُٹھے یا پیرِ مےخانہ مجھے"

ساز و مطرب، سبحہ و زُنّار، دیر و خانقاہ
گلشن و شبنم، فضا، نکہت، نسیمِ صبح گاہ
کہکشاں، ناہید و زہرا و شفق، شام و پگاہ
"لالہ و گل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ
اِک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے"

کیا بیاں کیجئے حدیثِ التفاتِ ناگہاں
یک بیک خود اُٹھ گئے سب پردۂ ربطِ نہاں
بے توقع، بے ارادہ، بے اُمید و بے گماں
"زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ امتحاں
اُس نے دیکھا ہے جگر بے اختیارانہ مجھے"

اس غزل پر اس لئے تضمین کا آیا خیال
اُس جگر کی جو شہنشاہِ تغزل تھا نہالؔ
جس کے مرنے سے غزل کا ہو رہا ہے دل نڈھال
"اُس کی خدمت میں بنامِ رنج و غم، حزن و ملال
پیش کرنا تھا خلوصِ دل کا نذرانہ مجھے"

غالب کا خط عرشی رامپوری کے نام

اے حضرت! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ میرا دیوان مرتب کرکے اُس پر وہ مقدمہ دائر کیا ہے کہ میری جان پر بنی ہے۔ مقدمہ وہاں دائر ہوا ہے اور پیشیاں یہاں ہو رہی ہیں ؎

بہا کہیں پہ ٹوٹا پانی بہا کہیں پر

سویرے سے شام تک یہاں سخن فہموں اور سخن سنجوں کا ایک تانتا بندھا ہے۔ ایک پر ایک گرا ہے۔ تمہارے مقدمہ کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملائے جا رہے ہیں اور مبارک باد دینے والے مجھ پر یورش فرما ہے ہیں۔ ان مبارکباد دینے والوں میں بیشتر ادب نواز اور انشا پرداز ہیں۔ کچھ افیون نوش اور حقے باز ہیں۔ جو آتا ہے دو ایک حقے کے کش لگاتا ہے۔ اور دھواں چھوڑ چلا جاتا ہے جس سے کوئلے کا ذخیرہ گھٹتا جاتا ہے۔ وہ تو کہو مرتے وقت مجھے خیال آ گیا اور میں نے دس بیس من کوئلہ جو کلکتے سے لایا تھا، قبر میں حفظِ ماتقدم کے خیال سے رکھوا لیا تھا۔ ورنہ یہاں پہنچ کر دوبارہ حقّہ کی خاطر موت سے دوچار ہونا پڑتا اور دو دو بار ملک الموت سے ہم کلام ہونا پڑتا۔ عربی صیغوں کی گردان رٹنا پڑتی اور اگر ایسی ویسی بات منہ سے نکلتی تو مرے پر اور مار پڑتی۔ یہاں کوئلہ مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ سارا کوئلہ سقر وہاویہ ڈھل جاتا ہے۔ یہاں قیامت کی تیاریاں ہیں اور حشر ونشر کے بعد پیش ہونے والے واقعات کے لئے احکام جاری ہیں۔ جوں جوں چودھویں صدی منزل سے قریب تر ہوتی جاتی ہے میری جان نکلی جاتی ہے کہ دیکھو کیا ہوتا ہے؟ اور میرے قیام کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ ذرا دریافت کرکے لکھو کہ اصفہان میں دجال پیدا ہو یا ہنوز انتظار ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جنگ شنتا ہوں کہ قیامت کے آثار ہیں اور عوام حددرجہ ہراساں اور بے قرار ہیں۔

یہ ساری آفتیں تمہاری لائی ہوئی ہیں۔ نہ تم مجھے اتنا گھسے پر چڑھاتے اور نہ سخن فہموں کے پرستے پرے کوئلوں کے ذخیرے پر یہ آفت ڈھاتے۔ کتب خانہ کا احوال لکھو۔ میں جب ایک بار رام پور گیا تھا اُس وقت بھی اس گہوارۂ علم و ادب میں ایسی ایسی نایاب چیزیں دیکھی تھیں کہ نظر خیرہ تھی۔ عقل تیرہ تھی۔ اب اتنی مدت میں تو وہاں علوم و فنون کے خزانے بھر گئے ہوں گے۔ نایاب کتابوں کے پہاڑ بن گئے ہوں گے۔ ذخائر کا انبار ہوگا اور ہر گوشہ کتب خانۂ بغداد بنا ہوگا۔ سنتا ہوں کہ تم دن بھر اُسی انبار میں دبکے رہتے ہو اور ادب کی شیرینی چاٹتے رہتے ہو۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ یاجوج ماجوج کہاں ملیں گے تو میں کہدوں گا کہ ایک بھائی ماجوج کتب خانہ رام پور میں کتابیں چاٹنے پر معمور ہیں۔ نام امتیاز علی خان رکھ چھوڑا ہے اور عرشی تخلص جوڑا ہے۔ تمہارے رام پور کے کچھ حضرات ایک دن ملاقات کو آئے تھے۔ تمہاری شکل و صورت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ داڑھی رکھتے ہیں۔ پنج وقتہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کے سارے اوقات کتب خانہ کے اندر ہی گزرتے ہیں۔ ہر وقت کتابیں لئے کرسی سے لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ چونکہ صاحب اولاد نہیں ہوتے اور بسا اوقات شادی تک نہیں کرتے۔ مگر معلوم ہوا کہ اگرچہ تم حصولِ علم میں کتابوں کے گلے کا ہار ہو مگر بکارِ خویش ہشیار ہو۔ ایسی اولادیں پیدا کی ہیں جو جوانی میں اہلِ دانش کی دُموں پہ پیر رکھتی ہیں۔ میرے یہاں بھی بچے ہوئے مگر کوئی نہیں بچے۔ کچھ گندے نکل گئے۔ کچھ چوں چوں کرتے ٹہل گئے۔ اگر کوئی جیتا تو اُسے تمہارے سپرد کرتا تاکہ یہاں آنے کے بعد تمہاری زیرِ تربیت میرا جانشین بن پاتا۔ تم تو پچپن سال کی عمر میں علم و ادب کے پیرِ مغاں بن بیٹھے۔ کاروانِ ادب کے میرِ کارواں بن بیٹھے۔ ادھیڑ عمر سے پہلے بال سفید کر لئے اور خضاب لگا کر لوگوں کو

چکمے دیتے رہے۔ وسمہ کا خضاب ایک اچھا بھلا عذاب ہوتا ہے مگر تم اس صفائی سے لگاتے ہو اور سفیدی کو اس طرح سیاہی سے چھپاتے ہو کہ تمہیں دیکھ کر نوح کے ہم عمروں کو بھی اپنا شباب یاد آجاتا ہے۔ میں نے بھی جوانی ڈھلے پر ایک مرتبہ ایسا کرنا چاہا تھا۔ مگر ؏

اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

اوّل یہ کہ پہلے پوتا بنائیے پھر سپتے کس کر داڑھی اور بالوں کے گھونگھٹ میں صبح سے شام تک پڑے رہیئے۔ اس مصیبت کو کون جھیلے۔

؏ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کیوں صاحب۔ جب آپ پرانے نسخوں کی خریداری کے سلسلے میں سندیلہ گئے اور وجاہت سندیلوی کے دولت کدہ پر آموں کے ٹب میں دسہری اور سفیدی کے جھوٹے ڈالے پڑے تھے تو بھلا کسی سے ہماری آم خوری کا ذکر بھی کیا یا صرف اپنے ہی کو اس کوچے کا مردِ میدان بتایا۔ تم وہاں آم کھا رہے تھے میں یہاں ڈکاریں لے رہا تھا۔

ذکر العیش نصف العیش

اسی کا نام ہے۔ مرنے میں اذیت تو بڑی ہوتی ہے مگر آموں کی خاطر میں دوبارہ زندہ ہونے اور مکرّر مرنے کو تیار ہوں اور صاحب میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ جنت میں اگر ثمر بہشت اور چوسے کی فصل ختم ہوگئی تو بندہ دوسری فصل کے انتظار میں عالم برزخ ہی میں پڑا رہے گا۔

میں جب تمہارا تصور کرتا ہوں تو پہروں اس سوچ میں پڑا رہتا ہوں کہ آدم کو تو گندم کے ایک دانے نے عرش سے فرش پر پہنچایا تھا مگر تم کس تقصیر میں وہاں سے یہاں لائے گئے۔ اکثر ملائکہ میں جب تمہارا ذکر خیر آیا تو میں نے اُنہیں یہ کہہ کر بتایا کہ تم نے جس کو عرش سے فرش پر بھیجا تھا۔ وہ فرش پر آنے کے بعد بھی عرشی کہلایا۔ جب فرش پر عرشی ہو تو یہاں آنے پر تو مقام علیین کے جملہ حقوق تمہارے نام محفوظ ہوں گے ؏ یا رب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی

کیوں صاحب کبھی آپ نے میرزائیوں اور خانوں کی چپقلش پر بھی غور کیا۔ میں میرزا اور تم خان۔ دونوں کے اجداد رزم کے مردِ میدان مگر اب اترا شہرہ مرد کی نام سے شمشیر و سناں اجداد کے ہاتھوں میں تھی جس سے وہ غازی اور شہید بنتے تھے۔ ہمارے تمہارے بازو تک آ
تعمیر

ہوئے تو شمشیر و سناں کیوں نہ تحلیل ہوئے۔ ہم نے قلم لیا اور اس سے غازی کہلائے۔ دنیا میں فرہاد بن کر آئے اور عشق و محبت کے شگوفے کھلائے۔ تم نے کتب بینی کا سہارا لیا اور میدان ادب کو تہہ و بالا کیا۔

صاحب! ایک لطیفہ سنو۔ میں تو ہنس چکا۔ اب تم ہنسو۔ روزِ ازل جب صلاحیتیں بٹنے لگیں اور روحیں جسمانی ڈھانچوں سے نپٹنے لگیں تو میری نگاہ اس کھوپڑی پر تھی جو تمہارے ہاتھ لگی اور جس کے نتیجے میں صرف شاعری میرے متھے چڑھی۔ مگر مجھ سے چوک ہوگئی۔ وہ کھوپڑی جس میں علم و ادب کے بڑے بڑے خانے تھے اور جس کے حصول کے لئے صدہا اہلِ علم دیوانے تھے وہ تم نے انتخاب کرلی اور لپک کر اپنے جسم پر دھرلی۔ یہی سبب ہے کہ رام پور کا پورا کتب خانہ دماغ میں لئے بیٹھے ہو اور اس کے جملہ حقوق غصب کئے ہو۔

غرض ؏ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی
تمہاری ذہانت نے ؏ اک تیر ایسا سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
نہ پوچھ کہ دل پر کیا سانپ لوٹ گئے۔
؏ پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

کاتب تقدیر نے میری قسمت چلتے چلاتے ایسے قلم سے لکھی کہ اس لکھے پہ زندگی بھر روتا رہا اور آنسوؤں سے منہ دھوتا رہا۔ دارو پی پی کر غم غلط کیا اور تقدیر کے چاک کو خود فراموشی کے سوزن سے سیا۔

تم نے چنگیز خانی دشتے سے میری عزت و آبرو کا پاس کیا اور میرا دیوان ترتیب دیا۔ میرا رواں رواں تمہارے اس احسان پر اٹھا بیٹھی کرتا ہے اور تمہاری بخشش کے لئے دست بدعا رہتا ہے۔ رام پور سے میرا تعلق پرانا ہے۔ نواب کا نمک خوار رہا ہوں۔ ان کے وظیفے پر پلا بڑھا ہوں۔ خلد مکانی بھی یہیں مقیم ہیں۔ دنیا کے جنت مکانیوں کو بھی پہلے برزخ مکانی ہونا پڑتا ہے۔ پھر دوسرے ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس پہلی منزل میں محمود و ایاز کی تخصیص نہیں۔ ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ تمہارے بارے میں میرا خیال ہے کہ ہر دور میں قطب پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پھر تم تو پڑھے لکھوں کے قطب الاقطاب ہو۔ اگر دلی میں ہوتے تو قطب مینار سے دلی والوں کو محروم کرجاتے۔ اچھا ہوا جو سرکاری کتب خانے میں قطب کی لاٹ بن گئے ورنہ کتنوں کے چراغ گل کرجاتے!

تمہاری خیریت کا طالب : اسداللہ خان غالب

اکتوبر نومبر ۱۹۷۰ء

اختر انصاری

قطعات

اندوہِ طرب

فکر کے قہر و غضب نے مارا
سوچنے کے نئے ڈھب نے مارا
عیش بھی وجہِ الم ہے، یعنے
ہم کو اندوہِ طرب نے مارا

دعوتِ عمل

تُو بھی نشے میں مدہوش و گرداں
میں بھی سراپا مکر و خرابی
آ چرخ اِسے میں عالم ڈبو دیں
میں بھی شرابی، تُو بھی شرابی

تباہیِ دِل

شبِ غم کی سیاہی اور یہ دِل
فغانِ صُبح گاہی اور یہ دِل
تجھے اے چرخ! شرمانا نہ آیا
تباہی سی تباہی اور یہ دِل

خونِ تمنّا

نفس نفس ہے گراں بارِ آرزُو اب تک
نوا نوا ہے طرب زارِ کیف و بُو اب تک
بیاضِ درد کی رنگین سُرخیوں کی قسم
ٹپک رہا ہے تمناؤں کا لہُو اب تک

چارۂ غمِ دِل

غمِ دِل کا علاج دُنیا میں
شاید اس کے سوا کچھ اور نہ ہو
کہ زمانے کے سارے تیرِ ستم
اپنے دِل میں پرو کے بیٹھ رہو

ضبطِ اشک

ٹپک جانا نہ ہو تقدیر جس کی ہائے وہ آنسو
پلٹ کر آنکھ سے ظالم اُتر آتا ہے سینے میں
سما جاتا ہے پھر دِل میں کچھ اس انداز سے جیسے
لہو بھر جائے شیشے میں، ہلاہل آبگینے میں

جموّں و کشمیر کے قدیم مندر

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان خاص میں مندر کی تعمیر بہت قدیم زمانہ میں ہوئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ شروع شروع میں لوگ پتھروں کا ایک ذخیرہ جمع کر لیتے تھے۔ یا پتھروں کو ایک گول ڈھیر میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے ذخیرے جموں و کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں اب بھی اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ ذخیرے بچوں اور بوڑھوں نے اپنی فراغت میں جمع کئے ہوئے ہیں۔ ان کو پہاڑی لوگ اپنی زیارت گاہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی ملک کی تمدنی ترقی کا اثر اس کی فنِ عمارت و دیگر فنون سے براہ راست وابستہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی زیارت گاہوں اور مندروں کی تعمیر کا بلند درجہ بھی وہاں کی اُس زمانہ کی بلند تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ جیسے کہ تہذیب کا عروج و زوال زمانۂ قدیم میں ظہور پذیر ہوا، ویسے ہی مندر کا فنِ تعمیر بھی اس تاریخی دَور سے متاثر ہوا۔ مثلاً کھاجوراہو اور بونیشور کے لاثانی مندر وادیٔ گنگا کی تہذیب کے عروج کے گواہ ہیں۔ ملک کے تاریخی دَور میں کچھ وقت ایسے تھے جب ہندوستان کے بادشاہ چاہے ان کا پایۂ تخت وسطی بھارت ورش میں تھا یا قندھار یعنی شمال مغربی ہندوستان میں ان کی سلطنت کی وُسعت جموں و کشمیر تک تھی۔ ان دِنوں کے مندر جو کہ ریاست جموں و کشمیر میں قائم کئے گئے ہیں، عین ہندوستانی مندروں کے فنِ تعمیر کے ضامن ہیں۔ مثلاً کرمچی کے قصبے میں، جو کہ اودھم پور کے شمال مغرب میں کوئی پانچ میل کی دُوری پر ہے، ایسے مندروں کا ایک مجموعہ موجود ہے جو کہ بھونیشور اور کھاجوراہو کے مندروں سے، جو کہ اوڑیسہ اور بندیل کھنڈ میں زمانۂ قدیم میں تعمیر کئے گئے تھے، سو فیصدی مشابہت رکھتا ہے۔ مُغل بادشاہوں کے وقت کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لاہور کے مُغل باغات اور

تعمیر

کشمیر کے باغات آپس میں مشابہت رکھتے ہیں۔ دہلی کا لال قلعہ اور ہری پربت سرینگر کا قلعہ ایک ہی شکل کے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی اشوک کی لاٹھ جو کہ دہلی میں نصب کی گئی تھی اور سدھ دہاں دیو کی لاٹھ بالکل ایک جیسی ہیں۔ لیکن بھارت ورش کی تاریخ میں ایسی مثالیں عام نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی بادشاہ نے کشمیر، جموں اور ہندوستان میں کوئی عمارتیں اپنے عہدِ حکومت میں تعمیر کیں، تو ہو سکتا ہے کہ ان تین جگہوں میں سے صرف ایک ہی جگہ میں وہ عمارت ہمیں آج مِل سکے اور دوسرے مقامات پر وہ عمارتیں کسی وجہ سے وجود میں نہ رہی ہوں۔ مثلاً مارتنڈ کا مندر، جو کہ کشمیر کے قدیم کھنڈرات میں ایک نمایاں ہستی رکھتا ہے، للتا دتیہ کے عہدِ حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قوی ہیکل زیارت گاہ کشمیر کلاں کے زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شاہِ کشمیر للتا دتیہ شمالی ہندوستان کا ایک بہادر فاتح ہو گذرا ہے۔ جس کی سلطنت کی وُسعت جنوب میں کوہِ بندھیاچل اور اُوڑیسہ اور شمال میں چینی ترکستان تک تھی۔ لیکن مشاہدے میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ مارتنڈ جیسا مندر کشمیر کے علاوہ کسی اور علاقے میں بھی معمور ہو۔ اسی طرح سے سرینگر کا قدیم مندر جسے پنڈرے تھن کا مندر کہتے ہیں، اشوکا نے بنوایا تھا۔ اس شکل کا مندر ہندوستان کے کسی اور حصے میں ابھی تک نہیں مِلا ہے۔

جموں پرانت کے مندر دو حصوں میں آسانی سے بانٹے جا سکتے ہیں۔ یعنی قدیم اور جدید۔ قدیم مندر تو سوالک کی پہاڑیوں میں بکھرے ہوئے آج بھی نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن جدید وہ ہیں جو کہ زمانۂ ازمنۂ وسطٰی کے درمیان سے لے کر آج تک جموں کے مختلف حصوں میں تعمیر کئے گئے تھے۔ قدیم مندر پرانت میں قدیم مہاراجوں و ہندوستان کے شہنشاہوں نے، جن کی سلطنت کی وسعت

جموں پرانت تک رہی ہے، بنائے تھے۔ مثلاً کرمچی، جبور، سدھ مہادیو، بلاور، بسوہلی، پرمنڈل، اُترینی۔ بھدرواہ کے پرانے مندر اور باسک ناگ کے بُت، وغیرہ سب قدیم زمانہ کی تعمیرات ہیں۔ لیکن جدید مندر پرانت کے بے شمار حصوں مثلاً سدھ مہادیو، رام نگر، اودھم پور جموں وغیرہ میں ہندو راجاؤں اور مہاراجوں نے اپنے عہدِ حکومت میں تعمیر کروائے تھے۔ ان مندروں میں کنول کے پھول کے پتے، جو کہ پتھر سے بنائے ہوتے ہیں اور مندر کی چوٹی میں سیمنٹ سے یا کسی دوسرے طریقہ سے نصب کئے ہوتے ہیں، غائب ہیں۔ قدیم مندروں میں انہیں نصب کیا گیا ہے۔ کرمچی کے مندر شروع میں کوئی پانچ کے لگ بھگ ہوں گے۔ چار مندر ایک مستطیل کھیت کے چاروں کونوں میں نصب ہیں۔ ان میں سے ایک تو مکمل طور پر گر چکا ہے۔ دوسرا ایک جو ٹھیک شمال و مشرق میں ہے، کسی بھی وقت گر سکتا ہے۔ جنوب مغرب اور درمیانی حصہ کے مندر دیکھنے کے قابل ہیں۔ درمیانی مندر میں ایک کشادہ اور چوڑا جنگلہ ہے۔ ان تمام مندروں کی باہر کی دیواروں کا نقش و نگار زمانہ کے عمل فرسودگی کی تباہ کاریوں کی زد میں آچکا ہے۔ لیکن پھر بھی تعریف ہے قائم ہے۔ بتوں کو کوارٹنرائیٹ پتھر میں تراشا گیا ہے۔ یہ پتھر ساتھ والی وادیوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ مندر سینڈ سٹون سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ مندر شہنشاہ کنشک نے پہلی صدی عیسوی کے اختتام میں تعمیر کئے تھے اور یہ اُسی راستہ میں تعمیر کئے ہوئے ہیں جو ہندوستان کو کشمیر سے ملاتا تھا۔ کرمچی کے مندروں کا طرز انڈو آرین آرکیٹیکچر سے متعلق ہے۔ مندر کے گول مینار پر کنول کے پتوں کا نگار کیا ہوا ہے۔ بے شک یہ مندر پہلی صدی میں تعمیر کئے گئے تھے، لیکن ان کا طرز بناوٹ لنگا راجہ مندر جو کہ بونیشور اوڑیسہ اور کھاجو راہو مندر، جو کہ بندھیل کھنڈ میں نویں صدی کے بعد بنائے گئے تھے، سے ملتا جلتا ہے۔ کرمچی اودھم پور سے چار میل مغرب پر ہے۔

بابور قصبہ کو راج ترنگنی میں کلہن پنڈت نے بابا پُورا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ قصبہ ڈوگروں کا قدیم دارالخلافہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور تحصیل مانسر سے شمال مغرب میں کوئی سات میل کی دوری پر ہے۔ یہاں کے کھنڈرات ریاست جموں و کشمیر کے قدیم کھنڈرات میں ایک نمایاں رتبہ رکھتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قصبہ میں کوئی ایک درجن کے قریب مندر تھے۔ لیکن اس وقت ان میں سے صرف چھ یا سات ہی ظہور پذیر ہیں۔ ایک مٹی ہوئی شاردا زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مندر کوئی دسویں صدی میں تعمیر ہوئے تھے۔ کچھ مندروں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک بڑا ہال کمرہ پتھروں سے ہی بنایا ہوا ہے۔ اس کی دیواروں پر پتھر کے لمبے شہتیر مستطیل شکل میں رکھے ہوئے ہیں اور ان شہتیروں پر دوسری چھوٹی مستطیل پتھر کے شہتیروں سے بنائی ہوئی ہے۔ اسی طرح سے ایک دو اور مستطیلیں ان کے اُوپر تعمیر کی ہوئی ہیں اور آخری مستطیل کو پتھر کے بڑے بلاکوں سے ڈھکا ہوتا ہے اور اس طرح سے چھت کو مکمل کر دیا ہے۔ ان مندروں میں قوی ہیکل اور ٹھوس ستون چھتوں کو سہارا دئے ہوئے ہیں اور بہت خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام مندروں میں آنہ پُورنا دیوی کا مندر نہایت دلکش ہے۔ ان مندروں کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ ان میں کوئی سیمنٹ وغیرہ نہیں لگایا ہے بلکہ پتھر کے بلاک ایک دوسرے کے اُوپر نصب کر کے مندر کی عمارت کو کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ تمام مندر انڈو آرین طرزِ تعمیر سے ہیں لیکن نقش و نگار کشمیر کے مندروں کا سا ہے۔ یہاں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راج ترنگنی کے مؤرخ پنڈت کلہن کا یہ کہنا دُرست ہے کہ ان پہاڑی علاقوں کے سیاسی و اقتصادی رشتے نویں سے بارہویں صدی میں وادیٔ کشمیر سے وابستہ تھے۔

سدھ مہادیو کُد کے مشہور مقام سے کوئی سات میل مشرق میں واقع ہے۔ بسوہلی کا مندر، جو قصبہ کے مغرب میں واقع ہے، ایک پرانا مندر ہے جس میں کالے پتھر کے شوجی اور پاربتی کے بُت نصب ہیں۔ مندر کے بالکل مغرب میں لوہے کا ایک ترسول زمین میں نصب ہے۔ اس کا کوئی دس فٹ حصہ زمین کے اُوپر ہے۔ اس کی گولائی کوئی ایک فٹ محیط میں ہوگی۔ ایک اور لوہے کا ستون، جو کہ دہلی کے اشوکا کی لاٹ سے سو ۱۰۰ فیصدی مشابہت رکھتا ہے، پاس ہی زمین دوز ہے۔

بلاور کا قصبہ، جس کو راج ترنگنی میں بالا پورہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، کٹھوعہ کے شمال مغرب میں کوئی تیس میل کی دوری پر ہے

یہ بسوہلی کے پال حکمرانوں کا قدیم دارالخلافہ تھا۔ یہاں پتھروں کا بنایا ہوا ایک پرانا مندر ہے جو کہ نویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ البرونی مؤرخ نے اپنی کتاب میں اس مندر کا ذکر کیا ہے۔ یہ مؤرخ اس مندر کو قنوج اور کشمیر کے راستہ میں واقع ظاہر کرتا ہے۔

بسوہلی جموں سے کوئی ۸۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اپنے پینٹنگ کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہو چکا ہے۔ یہاں ایک شوجی مہاراج کا قدیم مندر قائم ہے۔ اسی طرح سے ہرمنڈل، جو کہ جموں سے ۸ا میل جنوب کی طرف واقع ہے، ایک قدیم مندر موجود ہے۔ یہ کوئی آٹھویں صدی کے درمیان میں تعمیر ہوا تھا۔

صوبہ جموں میں راجپوت حکمرانوں نے پچھلے تین سو برس میں جگہ جگہ پر مندر تعمیر کئے تھے۔ ان میں جموں کا رگھوناتھ مندر، جو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بنوایا تھا، بہت مشہور ہے۔ یہ مندر اٹھارہ مندروں کا مجموعہ ہے۔ راما اور وشنو کے بہت سے بت اس مندر میں نصب ہیں۔ ایک سنسکرت پاٹھ شالہ اور ایک سنسکرت لائبریری اس کے ساتھ شامل ہیں۔

زمانہ قدیم میں کشمیر کی وادی بدھ مت اور ہندو مت کی تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اس زمانہ کی یاد شنکر آچاریہ، پاندرنیٹھن، مارتنڈ، اونتی پورہ، ٹہن کے مندروں سے تازہ ہوتی ہے۔

شنکر آچاریہ کا مندر سرینگر شہر میں ایک پہاڑی کے اوپر واقع ہے اور وادی کے دور دراز حصوں سے بھی نظر آتا ہے۔ اس کا بنیادی حصہ اشوکا نے ۲۰۰ قبل مسیح میں تعمیر کروایا تھا۔ لیکن مندر کا باقی حصہ راجہ گوپادتیہ نے چھٹی صدی میں تعمیر کروایا تھا۔ مندر کا سارا حصہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ شوجی کے لنگم کے ارد گرد چار ستون ہیں۔ ان پر بعد میں گنبد بنوایا گیا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاحوں کا خیال ہے کہ شنکر آچاریہ کی پہاڑی دنیا کے ایک بہت خوشنما منظر پیش کرتی ہے۔

پاندرنیٹھن کا مندر سرینگر کے مقام بٹوارہ سے ایک فرلانگ مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ کشمیر کا قدیم دارالخلافہ تھا۔

مارتنڈ کا مشہور مندر ٹہن سے ایک میل مشرق کی طرف ایک پہاڑی حصہ پر واقع ہے۔ یہ کشمیر کے فنِ عمارت کا ایک مجسمہ ہے۔ اس کے قوی ہیکل ستون اور بلند ڈھانچہ اپنی مثال آپ ہے۔ صحن کی کشادگی اور دروازوں کی اونچائی قابلِ ذکر ہے۔ یہ مندر کشمیر کے مشہور بادشاہ للتادتیہ نے ساتویں صدی میں تعمیر کروایا تھا۔

اونتی پورہ کے مندر للتادتیہ کے فرزند اونتی ورمن نے مارتنڈ کے مندروں کے ڈھنگ پر بنوائے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے مارتنڈ کے دارالخلافہ کو بدلنے کی ضرورت سیاسی وجوہات پر محسوس ہوئی اور اس نے اونتی پورہ میں اپنا دارالخلافہ قائم کیا۔

"تعمیر"

کو خوبصورت سے خوب صورت تر بنانے کے لئے اپنے
قیمتی مشوروں سے نوازیئے!

"تعمیر" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
(۲) باتصویر مضامین اور فیچر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں
(۳) ان نگارشات میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں و کشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے تنقیدی مضامین ترجیحی طور طلب کئے جاتے ہیں

قیصر قلندر

لال چوک

زندگی مدتوں سے رہی مضطرب — پردۂ ساز میں جیسے نغموں کے دل
وقت کے جسم ہی میں دھڑکتے رہے — سخت حالات اور نرم لمحوں کے دل
گیسو و گل کی خوشبو پریشاں رہی — اور پتنگے جلے، جیسے شمعوں کے دل
دم بخود منتظر تھی کوئی مہ جبیں — شمعِ اُمید کو دل میں روشن کیے
آرزو سر بہ زانو تھی، مغموم تھی — چاک، تارِ نظر سے کسی نے سیئے
رات افسردہ تھی، چاندنی مضمحل — یا سسکتے تھے سینوں میں کتنے دیئے
اک سکوں تھا، سکوتِ اجل کی طرح — زندگی کا سمندر بھی خاموش تھا
کھِلتے رہتے تھے جب بھی گلاب و سمن — لطفِ نظارہ کا یاں کسے ہوش تھا
فکر کو رفعتوں کی طلب تھی مگر — ناطقہ بند تھا، حسن روپوش تھا
پائلوں کے مدھر گیت خاموش تھے — تھا نہ جشنِ شگوفہ، نہ رقصِ طرب
پرشکستہ تھے مرغانِ بزمِ چمن — شمعِ منزل تھی آنکھوں میں، نورِ طلب
جن کے اجداد مجبور و محکوم تھے — اُن کے افسردہ تھے زیست کے روز و شب
انجمِ شام سے منزلِ شب تلک — آدمی تھا یہاں نوحہ خواں نوحہ خواں
حسرتوں نے جلائے تھے دیپک کئی — اشک آنکھوں میں تھے کارواں کارواں
کشت زاروں میں زخموں کے جب گل کھلے — چارسو پھیلیں پھر سرخیاں سرخیاں
ہر نظارہ اگر جنت دید تھا! — اس پہ تھی دسترس میرے صیاد کی
حق جتاتا تھا [illegible] بریں پر کوئی — ملک زادی کی کیا طرح ایجاد کی
جبر کے کوہِ بے ستوں کے لئے — تھی ضرورت جگر دار فرہاد کی

دفعتہً زندگی پر تبسم کھلا — اُٹھی انگڑائی لے کر نگارِ چمن
پردۂ وقت سے رنگ پھوٹے کئی — پھر بہارِ چمن تھی، بہارِ چمن
صبرِ فرہاد پھر رنگ لانے لگا — دل کی شیریں تھی اور شاہکارِ چمن
چشمِ گرداب تھی ناگہاں بے بصر — اہلِ طوفاں نے موڑے تھے دھاروں کے رخ

زعفرانی ردائے خزاں جب اُٹھی
جن پہ کل تک تھی غم کی سیہ اوڑھنی
خوں میں تھا تر بتر آدمی کا جہاں
جب بھٹکتی گئی آہوئے آرزو
جشنِ انبوہ تھا پھر اسی چوک میں
نقش بر آب تھا وہ جفا کا محل
دِل کے فانوس میں شمعِ اُمید تھی
خاورِ آرزو پھر اسی چوک سے
بول رَوْف کے فضا میں بکھرتے رہے
جام اُٹھے بنامِ نگارِ چمن
پھر سے بانگِ درا کان میں، گونج اُٹھی
وقت زاروں سے عشرت کدے چھن گئے
کشتیاں لائے تھے کاسۂ آرزو
چشمِ خاموش سے پھر اسی چوک نے
ہاتھ بدلے حکومت نے اس چوک میں
سرزمینِ گل و لالہ کی کائنات
آرزو کا وہ شب خوں بھی جاتا رہا
مُدّتوں سے ترستے تھے جس کے لئے
ایک یلغار سے چھن چھنا کے گرے
ہر قدم پر اُجالے کا دھڑکا وہ دِل
شعر و نغمہ کی خوابیدہ کلیاں کھلیں
سوئے ارمان جاگے، تبسّم کھلا
پائلیں بج اُٹھیں پھر اسی چوک میں
فکر و فن کے کھلے پھول پھر جا بجا
شاہکاروں کو بخشی گئی زندگی
پھر اسی چوک سے اُٹھی آوازِ حق
آج یہ چوک ہے زندگی کا نشاں
محورِ جستجو، حسن کاروں کا دِل
زندگی رقص کر، زندگی گیت گا

تمتمانے لگے پھر بہاروں کے رُخ
کھِل اُٹھے پھر اُن ہی ماہ پاروں کے رُخ
ابرِ رحمت تھا اس جا ہی سایہ فگن
وادیٔ گل ہی اس کے لئے تھا، ختن
سازِ جمہور پر مرد و زن، نغمہ زن
جس کے سایے میں عفریت پلتے رہے
جس سے راہوں کے دیپک بھی جلتے رہے
جُونہی اُبھرا تو سایے بھی ڈھلتے رہے
پھر سنورتی رہی زندگی کی دُلہن
پھر تغزّل کا تھا چار سُو بانکپن
کارواں کارواں، انجمن، انجمن
کھو کھلے تھے محل عیش کے ڈھ گئے
مُدّتوں سے تھے تشنہ، تہی رہ گئے
دیکھا، ایوانِ پندار ہی بہہ گئے
چند افراد مختار تھے کل تلک
مُسکراتی رہی چشمِ پیر فلک
دیکھتے رہ گئے اہرمن اور ملک
پرچمِ رستگاری ہُوا وہ بلند
غم کے بھاری سلاسل، ستم کی کمند
ظُلمتِ غم کی رُک سی گئی جوز قند
رہ گذاروں پہ جمہور کے گیت تھے
تھم گئے جو بھی مجبور کے گیت تھے
شادمانی تھی، مسرور کے گیت تھے
شوق و اظہار کو زندگی مِل گئی
حسن کاروں کے دِل کی کلی کھِل گئی
پھر عمارت رعونت کی بھی ہِل گئی
مرکزِ آرزو، فکر و فن کا نشاں
عشق کی زندگی، بانکپن کا نشاں
جانِ اُمید ہے انجمن کا نشاں

کوثر چاند پوری

سولے لی

ارملا اور رمیش کئی برس چلتے رہنے کے بعد کامرانی کی اُس منزل پر پہنچے تھے جہاں سے ان کی ہنستی، مُسکراتی کامیاب گھریلو زندگی کا آغاز ہوتا تھا۔ وہ برسوں ہجر و فراق کی مصیبتوں میں مُبتلا رہے تھے۔ کبھی ایسے لمحات بھی آئے تھے جب ندی کے کنارے ٹھنڈے، پتھروں پر بیٹھ کر انہوں نے موجوں کے مدھم ساز پر محبت کے غم انگیز گیت گائے تھے اور ان کے آنسو ندی کی چنچل دھار میں مل کر بہہ گئے تھے، کبھی کسی سُنسان پارک میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے اور پھر وہیں کھڑے دلچسپ اور رنگین باتیں کرتے رہے تھے۔ اُس وقت جیون کی دھاریں الگ الگ بہہ رہی تھیں اور مستقبل کے مطلع پر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ آخر الگ الگ بہتی یہ دھاریں ایک دوسری میں گڈ مڈ ہوگئیں۔ شادی نے ایک حسین سنگم بنا دیا۔ ارملا اپنے نئے مکان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کا صاف سُتھرا اور ہوادار دو منزلہ گھر بڑے سلیقہ سے تیار کیا گیا تھا۔ سونے بیٹھنے اور کھانے کے کمرے الگ الگ تھے۔ ڈرائنگ روم خوب سجا ہوا تھا۔ سجاوٹ نہ بالکل مغربی ڈھنگ کی تھی نہ پرانے ہندوستانی طرز کی بلکہ دونوں انداز گلے مل رہے تھے۔ باتھ روم سنگِ مرمر سے بنایا گیا تھا، ان سب چیزوں کے ساتھ یہاں اس سے محبت کرنے والا رمیش تھا جو بیاہ کے بعد بھی اس سے عشق ہی کئے جا رہا تھا، ہنستی مُسکراتی ساس تھی جس کے چمکتے ہوئے ماتھے پر غصہ کی سلوٹوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مہذب اور اطاعت شعار نوکرانی تھی جو بہو رانی کے احکام پر ہر وقت کان لگائے رہتی تھی۔ باہر منشی گردھاری لال محرر تھے۔ وہ روزانہ شام کو کچہری سے لوٹتے وقت ضرورت کی سب چیزیں خرید لایا کرتے تھے۔ یہ گھر نہیں تھا، سچ مچ سورگ کا نمونہ تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ اس میں ہندی، اُردو اور انگریزی کی کتابیں بڑے حُسنِ ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں

ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے کاریگری کے ساتھ اپنے محبوب کا میک اَپ کر دیا ہو۔ رمیش کامیاب وکیل تھا۔ اگرچہ نیا تھا مگر تمام پُرانے اور تجربہ کار وکیل اس سے چوکنا رہتے تھے۔ کئی سنگین مقدمے جیت کر اس نے بار میں اپنے لئے بہت اُونچی جگہ بنالی تھی۔ جہاں وہ سینئر وکیلوں سے قانونی بات چیت کیا کرتا تھا۔ وہ بڑی محنت سے مقدمات کے لئے تیاری کرنے کا عادی تھا، لیکن قانون اس کی جمالیاتی حِس کو کچلنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ وہ کتنی ہی مصروفیت کے ساتھ نظیریں چھانٹ رہا ہوتا۔ مگر چائے یا کھانے کا وقت آتے ہی چونک جاتا۔ اُسے ارملا یاد آ جاتی۔ ارملا جو وقت سے پہلے ہی میز کے کنارے آ بیٹھتی اور رمیش کے انتظار میں کلائی پر بندھی سُنہری گھڑی دیکھتی رہتی۔ رات کو بھی رمیش دس بجتے ہی سونے کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ ارملا گلاب کی کلی کے مانند مُسکرا کر اور شاخِ گُل کی طرح جھُوم کر استقبال کرتی اور اس کی یہ ادائیں رمیش کے احساس سے دن بھر کی تھکن چوس لیتیں۔ اَن گنت خوشیوں کے ہجوم میں ارملا کو ایک شدید ذہنی تکلیف بھی تھی۔ رمیش سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ سگریٹ سے سگریٹ جلاتا ہے۔ اس کی اُنگلیاں کبھی سگریٹ سے خالی نہ ہوتیں۔ شعر و ادب کی دُنیا میں چراغ سے چراغ جلانے کی روایت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ گھریلو زندگی میں سگریٹ سے سگریٹ جلانے والی بات ارملا کو اس لئے ناپسند تھی کہ رمیش کے سُرخ اور پتلے ہونٹوں پر، جو دِل کش ہونے کے ساتھ ہی تازگی اور شادابی میں سیب کی قاشوں کو بھی مات کرتے تھے۔ ایک ہلکا سیاہ داغ پڑ گیا تھا جو غیر محسوس طور پر بڑھ رہا تھا۔ ارملا چاند میں اس دھبّے کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے سگریٹ کی بُو سے بڑی گھِن آتی تھی اور رمیش کی سانس میں تمباکو کی یہ بُو اس قدر بس گئی تھی کہ بعض اوقات ارملا ــــ سے اُٹھ کر

ذرا دیر کے لیئے کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لے کر طبیعت کو بحال کرتی۔ رمیش اس کی ہر بات میں کشش محسوس کرتا تھا۔ یہ بات بھی اُسے اچھی لگتی کہ ارملا اس کے پہلو سے نکل کر کھڑکی کے سامنے چلی جاتے اور خوب لمبے لمبے سانس لے، جیسے ہرنی دُور سے بھاگ کر آئی ہو۔ کبھی کبھی وہ ارملا کے دل پر ہاتھ رکھ کر پُوچھتا:

"تمہارا دل تو نہیں دھڑکتا؟"

"وہ تو ہر لمحہ دھڑکتا ہی رہتا ہے اور دھڑکنا ہی چاہیئے۔ یہ کوئی بیماری نہیں، تندرستی کی نشانی ہے۔ ہر چیز چلتی اور دھڑکتی رہے تو جیون ذرا اُبھرتا رہتا ہے۔ میرے سینہ میں دل ہے پتھر نہیں!"

پھر کیا بات ہے؟ — تم یہ اُکھڑے اُکھڑے سانس کیوں لینے لگتی ہو؟ — ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟

کوئی ضرورت نہیں، میرے ڈاکٹر آپ ہیں۔ آپ ہی کی توجہ سے یہ بات جاتی رہے گی۔

"پوری بات بتاؤ ارملا!"

"وقت آنے پر بتا دوں گی!"

ارملا اِدھر کئی دن سے گھر کے بجٹ پر بڑا دھیان دینے لگی تھی۔ بہت سی مدوں کو گھٹا کر اس نے چھوٹی بچت کے سلسلہ میں بڑی سمجھ کا ثبوت دیا تھا۔ آج اس کی توجہ لائٹ پر بھی ہوئی تھی۔ گھر میں کئی جگہ ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ پچیس بلب تھے جن میں سے اکثر ساٹھ واٹ کے اور کچھ سَو واٹ کے بھی تھے۔ تین ہیٹر تھے جن پر چائے اور کافی تیار ہوتی تھی دُودھ اور کبھی پانی بھی گرم ہوتا تھا۔ کپڑوں پر آئرن کرنے میں الگ بجلی خرچ ہوتی تھی۔ ارملا نے سوچا۔ نہ جانے بِل کتنے کا آتا ہوگا۔ اسی وقت اُس نے بِلوں کو چیک کرنے کے ارادہ سے منشی گردھاری لال کو بُلا کر پوچھا

منشی جی بجلی پر کتنا خرچہ آتا ہے؟

منشی گردھاری سابق مختار اور حال کلرک یہ بات سُن کر اتنے زور سے ہنس پڑے کہ ان کے مُنہ میں دونوں طرف سنہری تار چمک اُٹھے جیسے انہوں نے مُنہ میں سونے کی لگام چڑھا رکھی ہو۔ دراصل منشی گردھاری لال سائیکل سے گر پڑے تھے اور سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے انہوں نے نقلی دانت بنوا لئے تھے۔ ان کے دونوں جانب پیتل کے مُڑے ہوئے تار لگے تھے جو اصلی دانتوں میں خوب پھنس جاتے تھے اور ہنستے وقت دکھائی دینے لگتے تھے۔ ہنسی پوری کر کے وہ بولے:

"بِل بہت زیادہ کا آ رہا تھا۔ بہوجی پر اب میں نے اس کا بڑا اچھا بندوبست کر دیا ہے —

— کیونکر؟

میٹر بند کر دیتا ہوں اور میٹر ریڈنگ سے پہلے اُسے چالو کر دیتا ہوں۔ مہینے میں ڈیڑھ سَو، دو سَو یونٹ بجلی جلا کرتی تھی۔ اب بیس پچیس یونٹ ہی خرچ ہوتی ہے۔

ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟ — کیا اپنے صاحب کے مُنہ میں بھی سونے کی لگام دینا چاہتے ہیں؟

یہ بات نہیں۔ بہورانی وہ بولے۔ میں نے بچت کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ سرکار بھی تو چھوٹی بچت پر زور دیتی ہے۔ صاحب کی سگریٹوں کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ ایسا نہ کروں تو آدھی آمدنی بجلی اور سگریٹوں کے دھوئیں میں اُڑ جائے۔

بجلی میں دُھواں نہیں ہوتا منشی جی۔ اور اگر آپ کے صاحب شراب پینے لگیں تو کیا کریں گے آپ؟ — کیا اپنے موکلوں کی جیبیں کاٹنی شروع کر دیں گے؟

رام نام لو بہو رانی، بھلا ایسا پاپ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے کسٹمر سب ہمارے بھائی بند ہیں۔

اور الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ کیا آپ کے بھائی بندوں کا نہیں ہے؟

آپ کو نہیں معلوم، بہوجی وہ سرکار کا ہے۔

اور سرکار کس کی ہے؟

ہوگی کسی کی۔ ہم اتنی دُور کی باتیں کیوں سوچیں؟ ... .

... آئندہ میٹر بند نہیں کیا جائے گا منشی جی۔ یاد رکھیئے آپ بہت بڑا جرم کر رہے ہیں اور میں آپ کو قانون کے حوالے کر سکتی ہوں۔

آپ کو پتہ نہیں، اب میں ایک ایڈوکیٹ کا کلرک ہوں۔ پہلے مختار تھا اب قانون میرے گھر کی لونڈی ہے — انہوں نے غصّہ میں بھر کر کہا اور پھر زور سے سانس کھینچ کر چپ ہو گئے، جیسے وہ اس اِن سلٹ (insult) کی تاب نہ لا کر فوراً مر جانا چاہتے ہوں۔

سمجھ گئے آپ میری بات؟

آپ کی بات تو میں سمجھ گیا۔ مگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا بہو رانی۔

میں پہلے صاحب کے چچا کا منشی تھا۔ اب رمیش چند جی کا کلرک ہوں۔ مقدمے میں ہی لاتا ہوں۔ میں نے ہی صاحب کو کام سکھایا ہے۔ وہ صرف قانون پاس کرکے وکیل نہیں بنے۔ شروع میں عرضی دعویٰ بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ الف سے ی تک انہیں سارا کام میں نے سکھایا ہے۔ پہلے وہ صرف ایل ایل بی تھے اب وکیل ہیں۔ پھر بھی جتنا قانون ان کے دماغ اور کتابوں میں ہے اتنا میری انگلی کے اس ناخون میں بھرا ہوا ہے ——— انہوں نے بیچ کی انگلی دکھلاتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ٹھیک ہے ——— مگر بھگوان کے لئے بددیانتی کا سبق تو نہ پڑھائیے۔ ٹریجری کا تالا توڑ کر نوٹوں کی گڈیاں نکال لانے کا آرٹ بھی نہ بتائیے۔ فردوسی نے رستم کو پہلوان بنانے کا دعویٰ کیا ہے ——— قاتل یا لٹیرا بنانے کا نہیں۔ آپ اپنے صاحب کو ضمیر کا گلا گھونٹ کر پیسے بٹورنے کی تعلیم نہیں دے سکتے۔

منشی گردھاری لال کا سر چکرانے لگا۔ بہو رانی نے ان کے سر اتنے الزام تھوپ دئے تھے کہ آپ ہی آپ اُن کی گردن جھکی جا رہی تھی۔

بلیک میلر اور چار سو بیس مت بنائیے منشی جی صاحب کو !

اتنا کہہ کر ارملا چلی گئی اور منشی جی صوفہ میں دھنسے رہے۔ ان کا دماغ روسی راکٹ کی سی تیز رفتاری سے مختاری اور محرری کے چھوٹے سے دائرے میں چکر لگاتا رہا اور کانوں میں اس کی جھنجھناہٹ آتی رہی۔

ارملا نے فون کرکے پاور ہاؤس سے ایک آدمی بلایا اور اس سے میٹر ٹھیک کرنے کو کہا۔ پھر اس کے اُوپر لوہے کا جال لگا کر تالا ڈالا اور کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ سولہ کی جگہ چھپتر روپے کا بل آیا۔ ارملا بالکل نہ گھبرائی اور خوشی سے روپیہ بھیج دیا۔ اسی دن شام کی چلئے پر ارملا نے ایک دل فریب قہقہے سے رمیش کا خیر مقدم کیا۔ رمیش اس وقت بہت اُداس تھا۔ وہ ایک بڑا مقدمہ ہار گیا تھا اور منشی جی بھی کام پر نہ آئے تھے۔ ارملا کے نقرئی قہقہے کی کھنک نے اس کے حواس میں سیکڑوں پھول کھلا دئے۔ ان کی مہک سے دماغ تازہ ہوگیا۔ رمیش کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بہت خوش ہو ——— کوئی بہت بڑی چیز مل گئی کیا ؟

جی ہاں بہت خوش ہوں !

کیا پالی ؟

ایک چور پکڑا ہے۔

کون ہے ؟ ——— کیا نام ہے ؟

مسٹر رمیش چند ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ

کیا چُرا لیا تھا اس نے ؟

صرف چور ہی نہیں وہ بہت بڑا بلیک میلر بھی ہے۔

کیسے ؟

ارملا نے آٹھ مہینے کے بل اس کے سامنے ڈال دیئے اور نیا بل جس میں رسید بھی نتھی کردی گئی تھی، ذرا الگ کو رکھتے ہوئے بولی۔

دیکھئے ہر مہینے کتنے روپے بچائے جاتے رہے۔ میٹر بند کرکے یہ چوری اور بلیک میلنگ نہیں تو اور کیا ہے ؟

یہ سب کچھ کس نے کیا ؟

کیا تو منشی گردھاری لال نے، مگر ذمہ دار آپ ہیں۔ میں آپ کو اس کی سزا دوں گی۔

کیا سزا دوگی ؟

بہت بڑی !

میں تیار ہوں۔ جانتا ہوں اس رقم کا جڑاؤ نیکلس منگانے کو کہوگی۔

سنیئے ! ——— ارملا مسکرا کر کہنے لگی

مسمی رمیش چند ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ پر بلیک میلنگ کا جرم ثابت ہے۔ لہٰذا تعزیراتِ اخلاق کی دفعہ اوّل کے پیراگراف ۱ کے تحت اُسے سگریٹ چھوڑنے کی دائمی سزا دی جاتی ہے۔ لیکن اس کی قابلیت، خوبصورتی اور وفاداری کے صلہ میں یہ رعایت بھی دی جاتی ہے کہ حکمِ سزا ایک دم نافذ نہ ہوگا۔ روزانہ پانچ پانچ سگریٹ کم کرکے صفر تک نوبت پہنچائی جائے گی۔ سگریٹ نوشی لکزری میں داخل ہے اور لکزری ایک قومی جرم ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی اور معاشی بھی !

میں درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ نرمی نہ کی جائے۔ میں اسی وقت سے سگریٹ چھوڑتا ہوں۔

درخواست نامنظور کی جاتی ہے کیونکہ اس سے صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مُلزم زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ عدالت کو مرضِ عشق کے

[illegible]

ندرتِ خیال

فنا پذیر قیامِ بشر ہے کیا کہیئے
غمِ حیات بہت مختصر ہے کیا کہیئے

رہِ وفا میں ترا نقشِ پا نہیں ملتا
یہ رہ گذر کہ تری رہگذر ہے کیا کہیئے

رقیب ہو تو یہ کہیئے کہ دشمنِ جاں ہے
جو دوست ہے، وہی بیدادگر ہے کیا کہیئے

اُسی نگاہ سے دل نے فریب کھائے ہیں
اُسی نگاہ کے زیرِ اثر ہے کیا کہیئے

حریمِ دل میں بھی ملتے ہیں لامکاں والے
مگر نظر کو جنونِ سفر ہے کیا کہیئے

وفا کی راہ میں یکساں جو پڑ رہے ہیں قدم
نہ جانے کون، مرا راہبر ہے کیا کہیئے

یہ ان کی جلوہ نمائی کہ جائے رشک نہیں
برائے خاطرِ اہلِ نظر ہے کیا کہیئے

نہ پوچھئے کہ اسیروں پہ جانے کیا گذرے
کسے کسے، ہوسِ بال و پر ہے کیا کہیئے

نفس نفس ہمہ حزن و ملال ہے ندرت
یہ زندگی ہے کہ اک دردِ سر ہے کیا کہیئے

جی، ایم انصاری نشاط

رحیم سوپوری — ایک صوفی شاعر

کشمیر نے جہاں محمود گامی، وہاب کھار، احمد بٹہ واری، رسول میر، مقبول کرالہ واری، نادم کھویہ ہامی، مہجور اور آزاد جیسی ممتاز ادبی شخصیتوں کو جنم دیا وہاں چند ایسے صوفی منش شعرا کو بھی بساطِ ادب پر لا بٹھایا جنہوں نے زندگی نفس کشی میں گزاری اور فقر اور ریاضت کو اپنا شعار بنا کر دنیا میں بے نیازانہ سربلندی اختیار کی۔ خود خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ اس دنیا سے اُٹھے۔ لیکن علم و ادب کی جھولی میں بیش قیمت گہر ہائے آب دار ڈال کر چلے گئے۔ ایسے بزرگ کشمیری شاعروں میں رحیم صاحب سوپوری کا نام خاص طور قابلِ ذکر ہے۔

اُردو کی طرح کشمیری شاعری کی شروعات بھی تصوّف سے ہو چکی ہے تصوّف کی چھاپ صدیوں تک نہ صرف کشمیر ہی کے ادبا و شعرا کے احساس اور نظر پر پڑی رہی بلکہ برِصغیر ہندو پاک کے تمام مُفکّرین اور اہلِ قلم کے دِل و دماغ تصوّف ہی کے سانچے میں ڈھلتے رہے اور یہ چیز جہاں ہندوستان کی اپنی روایت میں داخل تھی وہاں ایران نے بھی اسے فلسفے کی صورت میں پیش کر کے ہندوستان میں زندہ جاوید بنا دیا۔ حکیم سنائی، فرید الدین عطّار، ور مولانا روم ایسے خُدا رسیدہ مُفکروں اور عالموں نے اپنے دِل کش انداز میں تصوّف کو ایک قابلِ قبول فلسفے کی شکل میں پیش کر لیا۔

کشمیر کے صوفی منش شعرا کے کلام کا کرّہ بھی، ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار" قسم کے محور پر گھومتا رہا۔ اس قبیل کے شعرا کی صف میں رحیم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ رحیم کی جائے ولادت اور ابتدائی مسکن کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کشمیر کے کچھ اور شعرا متقدمین کی طرح رحیم کے کلام کا بیشتر حصہ زندگی اور سنِ ولادت زمانے کی بے توجہی اور غفلت کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ سوپور کے کچھ سن رسیدہ اشخاص سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ رحیم دراصل علاقہ مراز (اسلام آباد) کے رہنے والے تھے اور جوانی کے عالم میں مراز کو خیر باد کہہ کر سوپور چلے آئے اور یہاں محلہ تیلیاں میں سکونت اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی پر فقر کا رنگ غالب تھا۔ پھر بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے اور حلال کی روزی پیدا کرنے کے لئے خود محنت و مشقت کرتے تھے۔ اپنی اس محنت و مشقت کو انہوں نے فنِ بافندگی اختیار کر کے تا دمِ مرگ جاری رکھا اپنے اس فن اور پیشے کا ذکر خود یوں کرتے ہیں ؎

رحیم بسیار شرمندہ کران اوس کارِ بافندہ
طمعت رُوسیاہی بے وفائی چھم ستھٹا ہ

اس شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بافندگی اُن کا مستقل پیشہ تھا۔

تصوّف، جس کی وجہ سے رحیم سوپوری بقائے دوام حاصل کر چکے، بچپن ہی سے اُن کے خمیر میں سرایت کر چکا تھا۔ چنانچہ اپنے اس صوفیانہ رجحان کی بالیدگی اور نشو و نما کے لئے اُنہیں ایک اعلیٰ پایہ کے صوفی منش بزرگ قادر صاحب کی صحبت کا فیض حاصل ہوا۔ قادر صاحب رَینن کے رہنے والے تھے اور تصوّف کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ چنانچہ اُس دور میں قادر صاحب کو ایک پہنچا ہوا فقیر مانا جاتا تھا۔ اُن ہی کی فرمائش پر رحیم سوپوری، وٹہ ون، (چوگل ہندواڑہ کے قریب) کے ٹیلے پر ایک تاریک غار میں خلوت گزین ہو گئے اور چلہ کشی اختیار کر لی۔ غار نشینی اور ترکِ دُنیا کی راہ پر پڑ کر رحیم نے رفتہ رفتہ عشق کے وہ تمام مقامات

طے کرلئے جو ایک سالک کے لئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے عارف باللہ اور سالک ہونے کی واضح نشان دہی اُن کے یہ اشعار کرلیتے ہیں ؎

مُجھکے عاشق تڑاؤ نیئر   سبع سمٰوات چھی کنیز
نکتہ سیاہ باریک چھُوی   چانہِ کنزوک چھُم مُقسّم

رحیم کا موضوعِ فکر عشق و محبّت سے کچھ جُدا نہیں تھا۔ لیکن اُس عشق و محبت کا دامن مجازی معشوق کے جلوؤں کی طلب سے آلودہ نہ تھا۔ رحیم کی عاشقانہ نظر ازل کے جلوۂ حقیقی کی متلاشی تھی۔ اپنی فکری دُنیا میں رحیم کو ازل اور ابد کے رشتوں کی تلاش تھی اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا مقصد سامنے رکھ کر برابر اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہے۔ خالق و مخلوق اور کائنات و مافیہا اور اس کے پیدا کرنے والے کے درمیان صحیح اور صاف صاف تعلق ظاہر کرنے کے ساتھ رحیم کائنات کی تکوین یعنی مسئلہ کُن فیکُون کو کس آسانی اور خوبی کے ساتھ سمجھاتے ہیں۔

لوح و قلم دوہ تہ رات
مُلکِ ارض و سمٰوات
کرُن پیدہ بیک ساعت
سُہ رحیمُ بے نیاز ویٖسے

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولائے کُل اور خاتم المرسلین ہونے کے بارے میں رحیم یُوں مدحت سرا ہیں ؎

کُل نبیّن چھُ افسر   محمدؐ سخی سرور
ملک سارِی چھِ مُضطر   رچھ سر انداز ویٖسے

اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دُنیا میں تشریف آور نہ ہوتے تو یہ دُنیا بھی پیدا نہ ہوتی۔ اس حقیقت کی وضاحت رحیم اپنے انداز میں یُوں کرتے ہیں ؎

سُہ آدِ عالم تہ آدمؑ ۔ سُہ رحیمُ آن دم تہ ایں دم
تِسندے سیتے ڑلیم غم ۔ رچھ در انداز ویٖسے

سادہ انداز میں رحیم نے " لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ " کا خلاصہ بیان کرکے سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی بات سمجھا دی۔ افسوس کہ یہ عظیم صوفی شاعر ناقدریٔ زمانہ کا شکار ہوکر اپنے دَور میں کس مپرسی کی گرد میں پڑا رہا اور اب بھی اس کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ کوئی شایانِ شان سلوک نہیں کیا جارہا ہے۔ جوانی کی بے ثباتی اور زندگانی کی فناپذیری کا فلسفہ خوبصورتی کے ساتھ سمجھا کر اور جوانی کے زمانے کو زندگی کا چمن اور زندگی کے گلستان کی بہار بتا کر شاعرانہ انداز میں اس کا ماتم بھی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ دماغ داد دئے اور دِل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

پانو فکراہ کر کوت گژھن چھی   ذکرِ حق مو مُشراو
شِنیاگژھتھی دُنیا ہو بیناو   یورِ کُس روزنہ آو

لولہ کِس زمینس الہ دِیو بیوْن بیوْن
ژھل چھے سونچ کراو

لَے تھاوتھ سیتہ بوس چھے پکھ وُنی
سُوی وکھ مو راوہ راو

دِلہ کِس زمینس بیٚنہ پھیوُر وارہ دِیو
رسلکٔ بیوُل اَدہ تراو

کچھ گال ذرہ ذرہ پھٔلہ گو وارہ رچھ
ہیٚتھ یہ تورہ کینژھاہ آو

لولہِ چھی گرمی سُنجتہ چھی سپدان
مختہ چھی در دُریاو

دُوِتھ بندہ کر کمایی اتھ نیٚندرہ وقتس
کیاہ طمائے دُنیا تراو

لعلن مالے اِدہ ہو کرکھ ژہی
یادِ حق ژہ مو مُشراو

تفصیل کشتِ کال چھی ونان رحیم شاہ
وترپک تہ کیتھ کن تھاو

یمُہ نہ یتہِ زان تھو و یارس سیتہ
کیاہ کرنہ دُنیہس آو

(بقیہ بر صفحہ ۴۴)



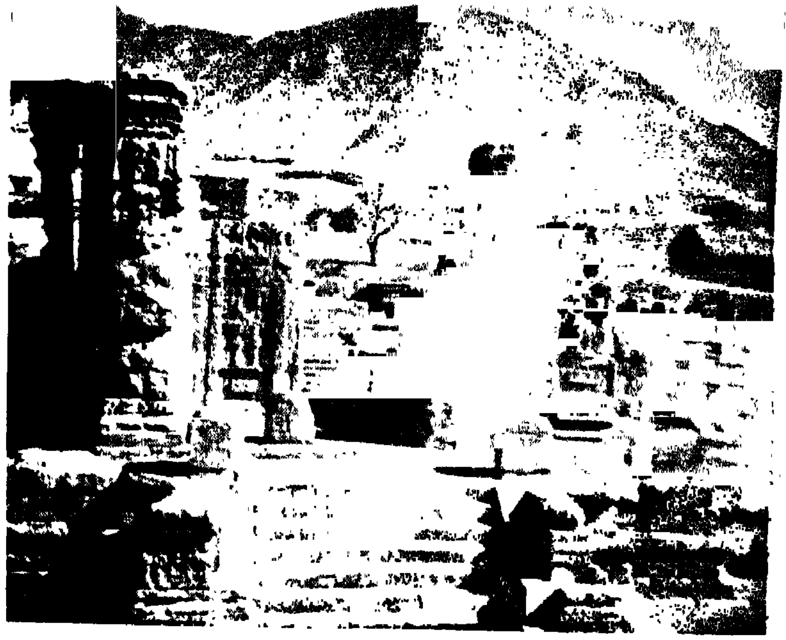
ولادت ۱۸۹۰ء وفات ۱۹۶۰ء

حضرت جگر مراد آبادی مرحوم

بجھ گیا شعلۂ طور آتشِ گل سرد ہوئی

جام افسردہ ہیں مینائے غزل ٹوٹ گئی

جموں و کشمیر کے مندر



فی :یرو کے مندر



سری نگر میں شنکر اچاریہ کا مندر



اداخی مندر کی ایک قدیم مورتی

مندروں کا پتھر چمن





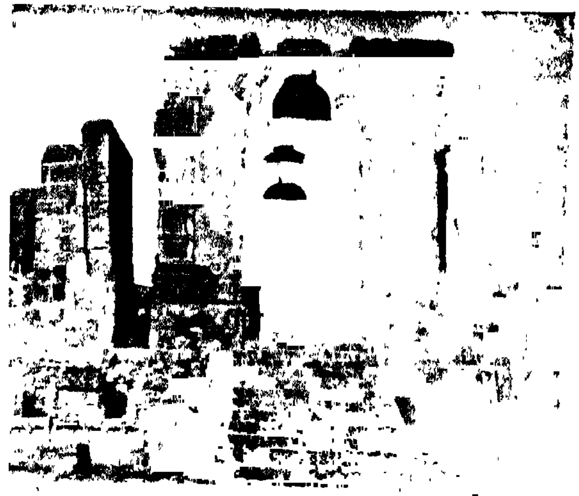
[illegible]



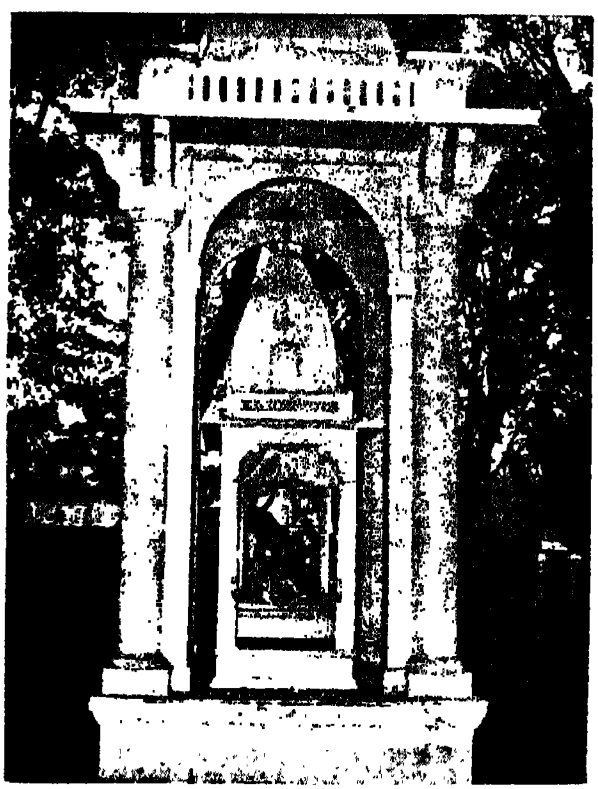
[illegible]

خواتین مورتی پر پھول چڑھارہی ہیں





مارتنڈ کا سورج مندر



دیوی بھوانی [کشمیر]



دور کے اندر

[illegible] آذر لکھنوی

صدمۂ جگر

(نظمِ مُنتشر[1])

پھر اہلِ دِل اس طرح سے کوئی غزل کبھی گنگنا سکے گا
اُفق پہ ایسا ستارہ لیکن نہ جانے کب جگمگا سکے گا
لطیف نیت نفیس فطرت خیال نازک مزاج نازک
جگرؔ کا ایسا جمیل شاعر نظر میں آیا نہ آسکے گا

~~~

ہر ایک مرکزِ فکر و نظر کو چھین لیا
متاعِ علم و متاعِ ہنر کو چھین لیا
ابھی یگانہؔ کا غم بھی بھلا نہ پائے تھے
کہ ہم سے دستِ اجل نے جگر کو چھین لیا

~~~

یہ کون جادہ یہ کیسا مقامِ غم آیا
جو جھلملانے لگے تھے چراغ ابھر آئے
عزیزؔ و حسرتؔ و سیمابؔ و اصغرؔ و فانیؔ
جگر کی موت سے کتنوں کے داغ ابھر آئے

~~~

نشیمن نیز بھی ہوں تو بھی مرد دل کو کھلتے ہیں
جمادرشہ کتنی تیزی سے نئے پہلو بدلتے ہیں
لبوں پہ مسکراہٹ کھیلتی تھی ذکر سے جن کے
انہیں کے نام سے اب آنکھ میں آنسو مچلتے ہیں

~~~

عزیز و سائل کو رو رہے ہیں، ہے آرزو و خباب کا ماتم
یہ زندگی ہے ہماری یارو کہ عشرتِ زندگی کا ماتم
مجازؔ کو قبر میں لٹایا، جگرؔ کو کاندھا بھی دے نہ پائے
ہماری بس زندگی یہی ہے کسی کا نوحہ کسی کا ماتم

~~~

[1] اگر "غزلِ مسلسل" قابلِ قبول چیز ہے تو "نظمِ منتشر" بھی یقیناً قبولیت رکھتی ہے۔ (ادارہ)
~~~

وجاہت علی سندیلوی

عبرت انگیز

(طنزاجیہ)

جس طرح دکھانے والے دانت اور ہوتے ہیں اور کھانے والے اور، اسی طرح دیکھنے والی آنکھیں اور ہوتی ہیں اور عبرت پکڑنے والی آنکھیں اور۔ عبرت پکڑنے والی آنکھ کو دیدۂ بینا اور اس کے خوش نصیب مالک کو اہلِ بصیرت کہتے ہیں۔ دیدۂ بینا ایک خاص قسم کی چور بتی یا ٹارچ ہوتا ہے جو دماغ کے کسی نامعلوم حصے میں خفیہ طور سے لگا رہتا ہے۔

——— اور شاید اس کے لئے جگہ نکالنے کی وجہ سے دماغ کے دوسرے پرزے ڈھیلے کر دئے جاتے ہیں ——— اور اس سے نہ صرف اندھیرے میں دُور کی سوجھتی ہے بلکہ ظاہر چیزوں سے زیادہ غائب چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن خیر یہ تو اس کی ضمنی خصوصیات ہیں۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت عبرت پکڑنا ہوتا ہے۔ جس طرح مقناطیس میں لوہے کے ٹکڑے خود بخود کھنچ کر چپک جاتے ہیں اسی طرح دیدۂ بینا میں عبرتیں خود بخود اچھل کر گھس جاتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ بالکل اسی مناسبت سے دیدۂ بینا رکھنے والے انسان کو ہر طرف عبرتیں ہی عبرتیں نظر آتی ہیں۔ البتہ اگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے تو خود اپنی آنکھ کا شہتیر۔ اور سچ پوچھئے تو اس کے نظر آنے کی ضرورت بھی کیا؟ آنکھ اپنی شہتیر اپنا!

ہر اہلِ بصیرت ہر گھڑی زندگی سے طرح طرح کی عبرتیں پکڑتا اور دوسروں کو پکڑنے کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ گویا زندگی جدوجہد اور تجربے کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف عبرت پکڑنے کے لئے بنی ہے۔ خیر یہاں تک غنیمت تھا لیکن بدقسمتی سے یہ عبرتیں بھی اتنی مختلف، متضاد اور متناقض ہوتی ہیں کہ ایک عام انسان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کس کو پکڑے اور کس کو چھوڑے اور بالآخر وہ ان کو پکڑنے کی کوشش میں باؤلا ہو کر خود ایک

مرقع

مُرقّعِ عبرت بن کر رہ جاتا ہے۔

کبھی یہ عبرت دلائی جاتی ہے کہ سولی پر چڑھ کر بھی سچ بولو، لیکن کبھی دروغ مصلحت آمیز کے لئے چور دروازہ بھی کھول دیا جاتا ہے۔ کبھی جیتی جاگتی دُنیا کو دارِ فنا بتایا جاتا ہے تو کبھی قبرستان اور مرگھٹ کی مُردہ اور سنسان سرزمین کو دارِ بقا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبھی تقدیر کی بے وفائی کا رونا رویا جاتا ہے تو کبھی تدبیر کی بےچارگی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ کبھی ساری دُنیا کو اپنی فتوحات سے تہہ و بالا کر دینے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے تو کبھی خود اپنے گھر سے بھاگ نکلنے کے لئے راہِ فرار تلاش کی جاتی ہے۔ کبھی زاہدوں کی ریاکاری پہ انگلی اُٹھائی جاتی ہے تو کبھی رندوں کی سرمستیوں پہ لاحول کھینچی جاتی ہے۔ کبھی اپنوں کی شکایت کی جاتی ہے تو کبھی غیروں کی دُہائی دی جاتی ہے۔ کبھی جیسی کرنی ویسی بھرنی کا سبق دیا جاتا ہے تو کبھی نیکی برباد اور گناہ لازم کا تازیانہ لگایا جاتا ہے۔ کبھی اپنی خودی کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا فتویٰ صادر کیا جاتا ہے تو کبھی عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا کا راگ الاپا جاتا ہے۔ کبھی پیوا ور پلاؤ کا نعرہ لگایا جاتا ہے تو کبھی رہ اور مرد کا فرمان نازل کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال دیدۂ بینا والے اہلِ بصیرت اس سے بالکل غیر متعلق ہو کر کہ کسی عبرت کی قسم اور نسل کیا ہے یا وہ کھیت کی ہے یا کھلیان کی، یا وہ کسی دوسرے کے لئے قابلِ استعمال ہے بھی یا نہیں۔ اپنی پکڑی ہوئی عبرت دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں تو کسی بھی صورت اور سائز کی ہو، بس عبرت چاہیئے ورنہ

کھیں لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اب ذکر چھڑ گیا ہے تو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ہی کو دیکھئے۔ وہ صرف

عبرت پکڑتے پکڑتے بڑی شہرت پکڑ گئے تھے۔ ان کی گلستاں اور بوستاں میں آپ کو ایک بھی ایسا درخت یا پودا نہ ملے گا کہ جس سے کسی بڑے چمگادڑ کی طرح کوئی عبرت اُلٹی اُلٹی نہ لٹک رہی ہو۔ اور پھر ایک بیچارے شیخ صاحب ہی پہ کیا موقوف، پُرانے زمانے کے ہر قابلِ ذکر شاعر اور ادیب کو عبرت پکڑنے کا اس قدر شوق تھا کہ پہلے وہ کوئی موٹی تازی عبرت پکڑتا اور پھر اس کے گرد کوئی شعر یا حکایت گھڑ کر اس کے لئے ایک بوتل سی تیار کر دیتا تاکہ پکڑی ہوئی عبرت کے متعلق اس کے جملہ حقوق محفوظ ہو جائیں۔ عبرتیں پکڑنا ہمارے بزرگوں کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جہاں کہیں انہیں کوئی لاوارث عبرت مل جاتی وہ اُسے فوراً مضبوطی سے پکڑ لیتے۔ اور پھر آیندہ نسلوں کو صراطِ مستقیم پر چلانے کی خاطر وہ ان پکڑی ہوئی عبرتوں کو اپنی حکایتوں، قصوں، کہاوتوں، مقولوں اور شعروں کی بوتلوں میں بند کر کے ان پر طرح طرح کے من مانے لیبل لگا دیتے تاکہ سند رہیں اور وقتِ ضرورت پر کام آئیں اور واقعی اگر ان عبرتوں کی ضرورت سے زیادہ اتنی بہتات نہ ہو جاتی کہ وہ خلط مبحث ہو کر ہماری شامتِ اعمال نہ بن گئی ہوتیں تو یقیناً وہ ہم سب دیدۂ بینا سے محروم انسانوں کے لئے ایک بیش بہا سرمایۂ آخرت ثابت ہوتیں!

جس طرح کچھ لوگ عبرتیں پکڑنے کے لئے وقف رہتے ہیں اُسی طرح کچھ لوگ عبرتیں پیدا کرنا بھی اپنا مشغلۂ حیات سمجھتے ہیں۔ دیدۂ بینا والے حضرات کا عقیدہ ہوتا ہے کہ بے وقوف عبرت پیدا کرتا ہے اور عقلمند اس کو پکڑتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض سرپھرے افراد کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو زندگی بسر کرنا آتی ہے وہ زندگی سے تجربے کر کر کے عبرتیں پیدا کرتے ہیں اور جن لوگوں کو زندگی بسر کرنا نہیں آتی ہے وہ صرف عبرتیں پکڑتے پکڑتے خود ایک عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایک شخص چمن میں جاتا ہے تو پھولوں کو دیکھتا ہے۔ خوش ہوتا ہے، ان کو سونگھتا ہے، توڑتا ہے اور ان کے رنگ و بو سے جی بھر کر محظوظ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے دوسرا شخص صرف کمہلائے ہوئے پھولوں کو سمیٹ کر آہیں بھرتا ہے۔ کانٹوں کو دیکھ کر منہ بسورتا ہے اور خزاں کو یاد کر کے اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ؎

مقام عبرت ہے یہ دُنیا جو آیا، رویا، چلا گیا

تعیر

ایک صاحب بعض بزرگوں کے معیار سے کچھ نا عاقبت اندیش اور لاابالی واقع ہوئے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت ہنسی، مذاق اور تفریح میں صرف کیا کرتے۔ ایک روز ایک بزرگ نے اعتراض کرنے کا اپنا پیدائشی حق استعمال کرتے ہوئے پُوچھا۔ "میاں صاحبزادے! تم نے یہ کیا روش اختیار کر رکھی ہے۔ آخر تمہاری زندگی کا بھی کوئی مصرف ہے یا نہیں؟" قہقہہ لگا کر بولے۔ "پیر و مرشد! میری زندگی کا مصرف درسِ عبرت دینا یا آپ کے مشن کی تکمیل کرنا ہے۔ لوگ آپ سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور مجھ سے عبرت۔ میں ان کو دکھاتا رہتا ہوں کہ آپ کی نصیحتوں پر عمل نہ کرنے کا کیا بُرا انجام ہوتا ہے ؏ من نہ کردم شما حذر بکنید" حضرت غالبؔ بھی کم و بیش اسی اُفتادِ مزاج کے واقع ہوئے تھے۔ خود تو زندگی سے نئے نئے تجربے کرتے۔ اور پھر بڑی معصومیت سے اپنے دوستوں کو عبرت پکڑنے کی دعوت دیتے۔

؏ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

جب اپنی زندگی سے وہ خود لطف اندوز ہوئے تھے تو قاعدے سے اس کی عبرتیں بھی انہیں کو پکڑنا چاہیئے تھیں۔ لیکن اس ناخوشگوار فرض کو وہ ہمیشہ دوسروں کے سُپرد کر دیتے۔ وہی مثل کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو!

آج کل کی دُنیا میں جہاں ہر ایک بات میں ایک انقلابِ عظیم ہو گیا ہے، وہاں عبرت پکڑنے کے طریقوں میں بھی بڑی نمایاں تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ایک صاحب اپنے عزیزوں اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود رات کی تاریکی میں دریا کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے جایا کرتے، ایک روز پھسل کر دریا میں گر گئے۔ کافی دیر تک چیخے چلائے۔ تو لوگوں نے ان کی آواز سنی اور دوڑ کر موقع پر پہنچے۔ اتنے عرصے میں وہ صاحب، قریب قریب ڈوب ہی چکے تھے، لیکن بہ حال پانی سے باہر نکال لئے گئے اور حسنِ اتفاق سے بچ نکلے۔ چند روز بعد ان کے ایک خیراندیش نے پُوچھا: "اپنے اس حادثے سے کیا عبرت پکڑی تم نے؟" بولے۔ "بس کچھ نہ پُوچھئے۔ بہت بڑی عبرت پکڑی ہے میں نے۔ چیخنے چلانے میں بڑی زحمت ہوتی ہے اور لوگ اسے سنتے بھی ذرا دیر میں ہیں۔ اب میں دریا پر ایک بین لے کر جایا کروں گا۔ گرتے ہی اُسے بجانے لگوں گا۔ لوگ مدد کے لئے فوراً پہنچ جائیں گے۔"

کل ہی جب پنڈت سنگم پرشاد نے نیچے لکھی ہوئی حکایت درجے میں

ہشتائی تو لڑکوں نے وہ عبرت نہیں پکڑی جو پنڈت جی پکڑانا چاہتے بلکہ طرح طرح کی دوسری عجیب و غریب عبرتیں پکڑانا شروع کردیں۔

ایک گاؤں سے ایک باپ اور اس کا بیٹا اپنا ایک خچر بازار میں بیچنے کے لیے پیدل روانہ ہوئے۔ دھوپ تیز تھی اور فاصلہ زیادہ، لہٰذا باپ اور بیٹا دونوں چلتے چلتے نڈھال ہوگئے۔ راستے میں ایک شخص گھوڑے پر سوار ملا۔ اُس نے باپ بیٹے کی حالت دیکھ کر کہا۔ "عجیب احمق ہو تم دونوں — آخر تم میں سے ایک آدمی تو اس خچر پر بیٹھ ہی سکتا ہے!" باپ اور بیٹے کو بھی اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ آخر ہم لوگوں نے خود یہ بات کیوں نہیں سوچی تھی۔ چنانچہ ان دونوں میں تھوڑی دیر "پہلے آپ" — "نہیں پہلے تم" ہوا اور پھر باپ کے اصرار پر بیٹا لپک کر خچر پر سوار ہوگیا۔ اس صورت سے یہ لوگ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک پیدل چلتا ہوا تھکا ہارا بوڑھا ملا۔ اس نے آنکھیں لال پیلی کرکے بیٹے سے کہا۔ "میاں صاحبزادے ہو نہ تم کل جگ کی پیداوار؟ تمہارا بوڑھا باپ پیدل چلتے چلتے مرا جارہا ہے اور تم مزے سے خچر پر بیٹھے ٹخ ٹخ کررہے ہو۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔" بیٹا سخت شرمندہ ہوا اور فوراً خچر سے اُتر کر باپ کو اس پر سوار کردیا۔ اس طرح سے یہ لوگ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے پائے تھے کہ ایک نوجوان راہ گیر ملا۔ اُس نے باپ کو بڑے تمسخر سے مخاطب کرکے کہا۔ "بڑے میاں! تم شاید دولہا بنے شادی کرنے جارہے ہو؟ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ ساری شفقتِ پدری اسی میں رہ گئی ہے کہ تم خود آرام اُٹھاؤ اور اولاد کو گھس گھس کر جوانی ہی میں بوڑھا کرڈالو۔" باپ سخت محجوب ہوا اور فوراً نیچے اُترنا چاہا لیکن بیٹے نے اُترنے نہیں دیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ دونوں ہی خچر پر بیٹھ جائیں۔ اب اس طور سے "ایک پنتھ دو کاج" بن کر یہ قافلہ چلا تو بہت جلد خچر کے کئی ہمدرد جمع ہوگئے۔ ایک نے کہا۔ "چوری کا جانور معلوم ہوتا ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "کتنی موٹی موٹی لاشیں لدی ہیں بے چارے خچر پر؟" تیسرے نے کہا۔ "جانور کی جان لینی ہے تو ایک دم سے اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے؟ سنگ دلی اور بے رحمی کی بھی حد کردی حد!"

باپ اور بیٹا دونوں خجالت سے پانی پانی ہوگئے اور فوراً خچر پر سے پھاند پڑے اور کچھ دیر تنہائی میں مشورہ کرنے کے بعد خچر کو ساتھ لے جانے کی جو آخری ترکیب ہوسکتی تھی۔ اس پر عمل پیرا ہوئے۔ یعنی خچر کو اپنے اُوپر لاد کر آگے بڑھے۔ اب اس طرح تماشا بن کر یہ دونوں چلے تو خچر کی لاتیں تو گھاتے میں کھائیں اور ان کے گرد تماشائیوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوکر ان کا طرح طرح سے مذاق اُڑانے لگا۔ اتفاق سے کچھ ہی دور چل کر انہیں ایک دریا کا پل ملا۔ تماشائیوں کی فقرے بازیوں اور خچر کی لاتوں کی وجہ سے باپ بیٹا دونوں ہی بے چارے حد سے زیادہ عاجز آچکے تھے لہٰذا جب کسی ایک تماشائی نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ خچر کی یہ دُرگت بنانے سے تو بہتر ہے کہ اُسے دریا میں ڈال دو تو اُنہوں نے نہ دیکھا آؤ نہ تاؤ خچر کو اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ وہ بے چارہ تو پانی میں ڈوب گیا اور یہ دونوں خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

جس طرح کوئی باورچی بڑی محنت سے کوئی مزے دار کھانا پکا کر بڑے اشتیاق سے اُس کو چکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح پنڈت سنکٹا پرشاد نے یہ حکایت سُنا کر لڑکوں سے پوچھا۔ "اچھا بچو بتاؤ۔ تم نے اس حکایت سے کیا سبق سیکھا؟ مطلب یہ کہ کیا عبرت پکڑی؟" لڑکے خاموش رہے غالباً وہ عبرت پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ کسی مچھلی کی طرح حکایت کی جھیل میں بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔ بالآخر پنڈت جی نے ایک طرف سے فرداً فرداً ہر لڑکے کا نام لے کر اپنا سوال پوچھنا شروع کیا اور وہ کوئی نہ کوئی عبرت پکڑنے پر مجبور ہوگیا۔ ع

فکر ہر کس بقدرِ ہمّت اوست

پہلا:۔ "خچر کو دریا میں ڈالنے سے پہلے اُسے تیرنا سکھا دینا چاہیئے تھا۔"

دوسرا:۔ خچر کو دریا میں جھونک دینے کے بجائے اپنے گھر کی طرف بھگا دینا چاہیئے تھا۔ یقیناً پرانا جانور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے تھان پر واپس پہنچ جاتا۔

تیسرا:۔ بلا سوچے سمجھے خچر پر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

چوتھا:۔ خچر کے ساتھ سفر نہیں کرنا چاہیئے۔

پانچواں:۔ خچر کو اپنی طرح انسان سمجھنا چاہیئے۔

چھٹا:۔ (تیزی سے گویا اس نے کوئی سربستہ راز دریافت کرلیا ہے) "خچر ایک بڑا خطرناک جانور ہے۔"

پنڈت جی:۔ میں تم لوگوں سے خچر کی وکالت کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ نہ خچر کی عادات اور خصائل پر اپنی معلومات میں کوئی اضافہ کرنا

چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ پُوچھ رہا ہوں کہ اس حکایت سے تم نے کیا عبرت پکڑی ؟ "

ساتواں (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد) باپ اور بیٹے کو ایک ساتھ سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ جب ایک ہی خچر ہو تو ایک ہی آدمی کو سفر کرنا چاہیئے۔

آٹھواں: خچر پر بیٹھ کر اس راستے سے نہیں گزرنا چاہیئے جس پر بدتمیز تماشائیوں کے ملنے کا امکان ہو۔

نواں: "خچر کو ریل سے پہنچ دینا چاہیئے تھا۔" درجے کے سب لڑکے ہنسنے لگتے ہیں۔

پنڈت جی: (آگ بگولا ہوکر) یہ کیا خچر خچر کی رٹ لگا رکھی ہے تم خچروں نے۔ میں پوچھتا ہوں تم نے اس حکایت سے کیا سیکھا ؟ یہ تمہیں کس بات کی ہدایت کرتی ہے ؟

دسواں: بڑھاپے میں شادی نہیں کرنا چاہیئے۔

پنڈت جی (آپے سے باہر ہوکر) یہ بڑھاپے میں شادی کا کیا ذکر اس حکایت میں؟

دسواں: نوجوان راہ گیر نے یہی تو کہا تھا کہ بڑے میاں شاید تم شادی کرنے جارہے ہو!

پنڈت جی: (چیخ کر) چپ بے وقوف!

گیارہواں: پنڈت جی جب باپ اور بیٹے دونوں ایک ساتھ خچر پر بیٹھے تھے تو دونوں کے مُنہ ایک ہی سمت میں تھے یا مخالف سمتوں میں ؟

پنڈت جی: کیا مطلب اس سے تمہارا ؟ (غصے کے بجائے ان کے لہجے میں تعجب آگیا)

گیارہواں: ان کے مُنہ مخالف سمتوں میں ہوتے تو تماشائیوں کو زیادہ لطف آتا۔

سب لڑکے ہنسنے لگے اور ان کو ہنستا دیکھ کر پنڈت جی کو مجبوراً اپنے غصے پر قابو حاصل کرنا پڑا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئے ـــ "بچو! پُرانے زمانے کی ہر حکایت میں کوئی نہ کوئی عبرت چھپی ہوتی ہے اور اگر ہم یہ عبرت پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم حکایت کو سمجھے ہی نہیں۔"

بارہواں: تو پُرانے زمانے کے لوگ حکایتیں لکھنے کے بجائے عبرتیں ہی کیوں نہیں رکھ دیا کرتے تھے ؟

ایک آواز: ۔ تو پھر پنڈت جی کو نوکری کیسے ملتی ؟

لڑکے ہنسنے لگتے ہیں اور پنڈت جی بپھر جاتے ہیں ـ "یہ کون ؟ خاموش! بدتمیز کہیں کے۔

تھوڑی دیر درجے میں خاموشی رہی۔ غالباً لڑکے اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کی اور پنڈت جی اپنے غصّے کو پی جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اور جب دونوں کو اپنی اپنی کوششوں میں کچھ کامیابی حاصل ہوگئی تو پنڈت جی نے لڑکوں کے ذہنوں پر ایک بالکل نئے پہلو سے حملہ کیا۔ "کیا تم دُنیا میں ہر ایک کو خوش رکھ سکتے ہو ؟ "

کئی لڑکے: (بڑی سعادت مندی سے ایک ساتھ) "جی ہاں! کیوں نہیں۔"

پنڈت جی اب لڑکوں کی طرف دیکھنے کے بجائے چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی دعا مانگ رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اچھا بتاؤ اپنی عقل سے کام کرنا بہتر ہے یا دوسرے کی عقل سے ؟ "

تیرہواں: دوسرے کی عقل سے! "

پنڈت جی: یہ کیوں ؟

تیرہواں: دوسرے کی عقل سے کام کرنے میں یہ فائدہ رہتا ہے کہ خود ہماری عقل استعمال نہیں ہوتی ہے اور اگر کام بگڑ گیا تو ہم دوسرے کی عقل کو لعنت ملامت کر سکتے ہیں اور اگر اتفاق سے کام بن گیا تو ہم فوراً اعلان کر سکتے ہیں کہ ہم نے دوسرے کی عقل کا صحیح استعمال کرکے اپنی انتہائی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔

پنڈت جی: ۔ (کچھ لاجواب ہوکر) تم لوگ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانتے ہو، لیکن عبرت پکڑنا تم کو بالکل نہیں آتا۔ دیکھو جو حکایت میں نے تمہیں آج سُنائی ہے اس میں باپ اور بیٹے دونوں نے اپنی عقل سے کوئی کام نہیں کیا تھا بلکہ صرف دوسروں کے مشوروں پر عمل کیا تھا۔ اس کا انجام اچھا ہوا یا بُرا ؟ "

چودھواں: اچھا

پنڈت جی: وہ کیسے ؟

پندرہواں: وہ خچر کے بوجھ سے ہلکے ہوگئے۔

سولہواں: وہ مہذب ہوگئے، کیونکہ خچر پالنا ایک انتہائی غیر مہذب فعل ہے۔

سترھواں : وہ بہت جلد گھر پہنچ گئے۔ غالباً گھر پر ان کا انتظار بھی کیا جا رہا ہو!

پنڈت جی : تم لا لفظ عبرت کے معنی بھی نہیں سمجھتے! اچھا ایک بہت آسان حکایت سنو۔ ایک باپ مرنے لگا تو اُس نے اپنے ساتوں لڑکوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں ایک ایک دھاگا توڑنے کو دیا...“

کئی آوازیں : جی ہاں! یہ حکایت ہم پڑھ چکے ہیں۔

پنڈت جی : اچھا بتاؤ تو پھر کیا ہوا؟

اٹھارواں : ہر لڑکے نے اپنے اپنے دھاگے کو توڑ دیا۔ لیکن جب ساتوں دھاگے جٹ دئے گئے تو ایک مضبوط دوڑی تیار ہو گئی اور اُسے کوئی بھی نہیں توڑ پایا۔

پنڈت جی : (خوش ہو کر) ہاں! ہاں! تو بتاؤ اس حکایت سے تم نے کیا عبرت پکڑی؟

انیسواں : مرتے وقت وصیت نہیں کرنا چاہیئے۔

پنڈت جی : پُر خوش! تو کیا پیدا ہوتے وقت وصیت کرنا چاہیئے؟

بیسواں : ایک ڈاکٹر صاحب پرسوں ہی میرے والد سے کہہ رہے تھے کہ سات لڑکے نہیں پیدا کرنے چاہئیں

اکیسواں : دوڑی کو قینچی سے کاٹ دینا چاہیئے۔

بائیسواں : ایسی چیزوں کو کاٹنے کے لئے اپنے پاس ایک بہت تیز چاقو رکھنا چاہیئے۔

گھنٹہ بج گیا اور عبرت پکڑتے ہوئے پنڈت جی درجے سے باہر چلے گئے۔

تعمیر

میں مزاحیہ مضامین ترجیحی طور شایع کئے جائیں گے!

کشمیر شاہراہ ترقی پر

(صفحہ ۹۱ سے آگے)

اور ہم ایک سوشلسٹ سٹیٹ کی طرف نہایت ثابت قدمی سے بڑھ رہے ہیں جس کی قدریں آزاد ہندوستان میں نشوونما پا رہی ہیں۔ لہٰذا ریاست نے اپنی ضروریات کے مطابق خود کفیل ہونے کے لئے نہایت قابل قدر ترقی کی ہے اور دیگر شعبہ جات میں ترقی پذیر اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ یہ بات پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو جانی چاہیئے کہ ترقیاتی دور کے شروعات میں مشکلات آنی لازمی امر ہیں۔ تاہم سماجی بہبود کا جو بیڑا ہم نے اُٹھایا ہے اس کے لئے ہمیں ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ چاہے ہمارے راستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں۔

رحیم سوپوری

(صفحہ ۳۶ سے آگے)

ہا ولیسو پیے کرتسے زار تہ یار
کوت ژول میون لو کچھار
نادان اوسس در لو کچھار
ٹیکان وو تم تبر دار
ژٹھتھ ترووتس دیوہ دار
پوری آنتنے لو کچھار
یاون میون اوس خوش بہار
گوشن بہتھ سبزہ زار

رحیم سوپوری کی تربت سوپور کے شمالی گوشے میں دِلستا کے کنارے بزبانِ حال فریاد کر رہی ہے ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

دو غزلیں

نذیر بنارسی

جا رہی تھی جن میں وہ ارمان بھرے گیت گئے
رہ گئے عمر کے دِن جینے کے دِن بیت گئے

زندگی بخش وہ سانسوں کے ترنم نہ رہے
وجد فرماتے تھے ہم جس پہ وہ سنگیت گئے

اس قدر ٹوٹ کے برسی کہ گھٹا سوکھ گئی
یہ نہ سمجھو برسات کے دِن بیت گئے

ان کو بھی کم نہیں غم میرے شکستہ دِل کا
میرا اِک ساز گیا ان کے کئی گیت گئے

اہلِ دل ہار گئے جان کی بازی لیکن
ہارنے پر بھی جہاں والوں کے دِل جیت گئے

کر گئے جینے کا سامان محبّت والے
دے کے دُنیا کو نئی رسم نئی رِیت گئے

فاتحِ ملک مرے ایسا کہ پھر مر ہی گئے
وہی زندہ ہیں زمانے میں جو دِل جیت گئے

نہ مجھے کعبے کا رکھا نہ صنم خانے کا
چھوڑ کر ہائے دوراہے پہ مرے میت گئے

اِک محبت سے بھری رات، کہ حسرت میں نذیرؔ
کتنے دن آئے گئے، کتنے برس بیت گئے

عمر انصاری

کمانیں ٹوٹ گئیں کتنے باکمالوں کی
صفیں دُرست ہوئیں جب بھی مرنے والوں کی

دماغ عرش پہ ہوگا جنابِ زاہد کا
یہی زمین ہے جنّت مِرے خیالوں کی

نہ ٹوٹ جائے ترا نشہ اے نسیمِ سحر
سنبھل کے چل کہ یہ بستی ہے خستہ حالوں کی

بہ شکلِ موج جو طوفان بن کے اُٹھی ہیں
یہ کروٹیں تو نہیں ڈوب جانے والوں کی

مظاہرے ہوئے کتنے ہی زورِ بازو کے
نہ کھُل سکی کبھی مٹھی مِرے سوالوں کی

بس اِک نگاہ میں جنت بھی ہے جہنم بھی
یہی ادا تو قیامت ہے خوش جمالوں کی

ہماری تشنگیٔ دید ہی پر کیا موقوف!
کہیں بجھی ہے کبھی پیاس مرنے والوں کی

نہ تھم سکیں گے کہ آنسو ہیں بے قرار دِلوں کے
نہ رُک سکیں گی کہ نبضیں ہیں پائمالوں کی

یہ منہ اندھیرے عمرؔ آج کون یاد آیا
زمین ہو گئی اُونچی مرے خیالوں کی

ہری کرشن کول

کُتّے کی دُم

پروفیسر سومناتھ کول تین بجے کے قریب کالج سے لوٹا اور کپڑے بدلنے کے بعد ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی بیوی پربھا اس کے لئے چائے کا ایک کپ اور آملیٹ لے کر آئی۔ آج اُس نے معمول کے خلاف یہ شکایت نہیں کی کہ چائے میں دُودھ ضرورت سے زیادہ ڈالا گیا ہے۔ اس نے پربھا سے کپ لے لیا اور چپ چاپ چائے کی چُسکیاں لینے لگا۔

"آج آپ دِل ملول سے کیوں ہیں؟ کہیں پرنسپل سے پھر جھڑپ تو نہیں ہوئی ہے؟" آخر بیوی سے پُوچھے بنا نہ رہا گیا۔

نہیں تو؟

تو پھر بات کیا ہے؟ بیوی نے اصرار کیا۔

"کچھ نہیں، صرف یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ دُنیا کیسی ہے۔ یہاں کیوں کمل کیچڑ بھرے تالاب میں پیدا ہوتا ہے؟ یہاں کیوں زندگی کے تار جلد ہی زنگ کا شکار ہو جاتے ہیں اور سنگیت سِسک سِسک کر۔۔۔"

"اور چائے لاؤں؟" بیوی کو شوہر کے اس فلسفے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔

سومناتھ کو اس طرح ٹوکا جانا کچھ زیادہ بُرا نہ لگا اور وہ اپنی بات کہتا گیا۔

"ذرا سوچو تو پار والوں کا چمن کتنا خوبصورت ہے! کتنا چالاک ہے! اور اگر اس کہاوت پر یقین کیا جائے کہ ہونہار بِروا کے ہوت چِکنے پات! تو بلاشُبہ اُس میں ایک بڑا آدمی بننے کی سبھی صلاحیتیں ہیں! لیکن نہیں۔ وہ ایک غریب آدمی کا بیٹا ہے اس لئے اپنی خوبصورتی اور تیز عقل کے باوجود در در کی ٹھوکریں کھائے گا۔ دانے دانے کا محتاج رہے گا۔"

"مگر یہ ہمدردی آج اچانک ہی کیسے اُمڈ پڑی؟" پربھا نے کچھ مُسکرا کر پُوچھا۔ پر سومناتھ اپنی ہی بات کہتا گیا۔

"آج صبح میں نے اُسے سکول کے بچوں کے ساتھ مارچ پاس کے لئے پولو گراؤنڈ جاتے دیکھا۔ آگے آگے بینڈ بج رہا تھا اور پیچھے پیچھے باقی لڑکوں کے ساتھ وہ بھی قدم مِلا کے چل رہا تھا۔ باقی بچوں کی طرح وہ بھی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جب کبھی اس کی نظر اپنے ننگے پیروں پر پڑتی تو اس کا چہرا اُتر جاتا۔ روناسا آتا اور تب وہ باقی ساتھیوں کے ساتھ قدم نہیں مِلا پاتا۔ اس پر اُسے ماسٹر سے ڈانٹ مِلتی تھی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگتے تھے۔

اچھا تو پھر؟ پربھا ویسے ہی مُسکرا رہی تھی۔

پھر کیا؟ سومناتھ نے کچھ گرم ہو کر کہا۔ "مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ میں آج سمجھ گیا کہ غریبی کس چڑیا کا نام ہے؟ کس طرح ایک ہونہار بچہ ماں باپ کی غریبی کی وجہ سے لوگوں کے مذاق کی چیز بن سکتا ہے؟

مگر اس میں امیر اور غریب کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا؟ یکا یک پربھا کی مُسکراہٹ کہیں چلی گئی اور وہ تنک کر بول اُٹھی ——

"کیا چمن کے ماں باپ اُس کے لئے دو ڈھائی روپے کا ایک فلیٹ بھی نہیں لا سکتے تھے؟"

"اگر لا سکتے تو پھر رونا کِس بات کا تھا۔ تم نہیں جانتی۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں ——" پربھا نے شوہر کی بات کو بیچ میں ہی کاٹا۔ کل اُس کی ماں نے میرے سامنے ڈیڑھ سیر مچھلیاں خریدیں۔ دو روپے سیر کا بھاؤ دیکھ کر مجھ جیسی عورت کے بھی ہوش اُڑ گئے۔ پر اُس نے ٹھن

کرکے تین روپے نکالے اور مزے لوٹے۔"

"تو کیا برا کیا؟" سوم ناتھ بول اٹھا۔ "انہیں توٹی غذا نہیں ملتی ہے۔ ان کے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں۔ وہ بچوں کے لئے دودھ تک نہیں خرید سکتے۔ اب اگر ان ساری کمیوں کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مہینے میں ایک دفعہ تین روپے خرچ کرکے مچھلیاں خریدیں تو کیا برا کیا؟"

"آپ سے بحث کون کرے!" پربھا نے شوہر کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں یہی کہوں گی کہ انہوں نے شرم بیچ کھائی ہے۔ انہیں صرف پیٹ بھرنے سے کام ہے۔ نہیں تو میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو گھر پر پانی میں ستو گھول کر پیتے ہیں اور باہر اس ٹھاٹھ سے نکلتے ہیں کہ کسی رئیس کا گمان ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا۔" سوم ناتھ نے بیوی سے اتنا ہی کہا اور دل میں سوچنے لگا کہ جب تک ہمارے ملک میں گھر پر پانی میں ستو گھول کر پینے والے اور باہر ٹھاٹھ سے نکلنے والے لوگ موجود رہیں گے، ہم ترقی کے راستے پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

دوسرے دن سویرے ہی سوم ناتھ نے اپنے نوکر محمود کو بھیج کر چمن کو بلوا لیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔ "کہو کل کا مارچ پاس کیسا رہا؟"

"بڑا شاندار رہا۔" چمن کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "ہمارا اسکول اوّل نمبر پر آیا۔ باقی اسکول ... ..."

لیکن سوم ناتھ تو کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ چمن کے معصوم چہرے کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ بھولے بھالے مکھڑے پر دو پیاری پیاری آنکھیں جن میں مستقبل کے حسین سپنے ناچ رہے تھے۔ کچھ لمحے بعد اس کا دھیان ٹوٹا اور وہ بول اٹھا۔ "اچھا یہ بتاؤ، تم ننگے پاؤں کیوں چل رہے تھے؟"

تب اچانک چمن کا چہرا اتر گیا۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی اور وہ دھیرے سے بول اٹھا: "میرے پاس کوئی جوتا نہیں ہے۔ بابو جی سے روز لانے کو کہتا ہوں مگر وہ ... "

سوم ناتھ نے اسے پوری بات کہنے کا موقعہ ہی نہیں دیا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے۔ "یہ لو بیس روپے۔ بابو جی سے کہنا کہ وہ آج ہی تمہارے لئے ایک اچھا سا بوٹ خرید دے۔ شام کو میں تمہیں اپنے ساتھ سیر کے لئے لے جاؤں گا۔"

چمن کو یہ سب عجیب سا لگا۔ کل بابو جی کے آگے وہ ایک معمولی فلیٹ کے لئے کس طرح گڑگڑایا تھا اور آج اسے بیس روپے مل رہے ہیں! اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھے اور جھپٹ کر سوم ناتھ سے نوٹ لے لے۔ لیکن نہ جانے اس کے منہ سے کیوں صرف یہ الفاظ نکلے۔ — "نہیں بابو جی مجھے ماریں گے۔"

"ماریں گے کیوں؟" سوم ناتھ نے اسے نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ "کہنا بھائی صاحب نے دئے ہیں۔ میں کوئی پرایا تھوڑے ہی ہوں۔"

چمن کو یہ بات وزن دار لگی اور دھیرے دھیرے اس کی جھجک ختم ہو گئی۔ تب اس نے سوم ناتھ سے بیس روپے لئے اور انہیں جیب میں رکھ کر چلا گیا۔

"تو آپ نے اسے بوٹ خریدنے کے لئے بیس روپے دئے؟" چمن کے جاتے ہی پربھا نے سوم ناتھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میری مرضی!"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر اچھا ہوتا اگر آپ ان روپیوں کو دریا میں پھینک دیتے۔"

"وہ کیسے؟"

"میں جانتی ہوں کہ ان لوگوں کے لئے جوتے پہننا یا ننگے پاؤں پھرنا ایک جیسی بات ہے۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بےچارہ ننگے پاؤں پھرنے کی بات کو بالکل محسوس نہیں کرتا ہے؟" سوم ناتھ نے بیوی کی بے وقوفی پر ہنستے ہوئے کہا۔ "کاش تم نے مارچ پاس کے وقت اس کی حالت دیکھی ہوتی! تمہیں نہیں معلوم وہ ننھا سا بچہ کتنا سنسٹو (SENSITIVE) ہے۔ جب میں نے اسے بیس روپے دئے تو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کس قدر شرمندہ ہو گیا۔"

"جو بھی ہو، میں کہے دیتی ہوں کہ دو چار دن بعد ہی یہ پھر ننگے پاؤں پھرتا نظر آئے گا۔ تب آپ میری یہ بات ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگایا جائے، کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔"

آخری فقرہ سُن کر سوم ناتھ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پھر بول اُٹھا۔ "اُس جرمن فلاسفر نے تو ٹھیک ہی کہا ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں کوئی کمی سماج کے سامنے... ..."

لیکن پربھا وہاں سے اُٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اس لئے سوم ناتھ نے اپنی بات کو یہیں روک کر اُس سے شیو کے لئے گرم پانی مانگا۔

شام کو کالج سے لوٹتے وقت سوم ناتھ نے چمن کے لئے ایک بنی بنائی بُش شرٹ، نکر اور جرابیں خریدیں۔ یہ دیکھ کر پربھا شاید کچھ کہہ بیٹھتی۔ مگر سوم ناتھ نے اُس کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر رتبیر سے کہا۔ "کیا خیال ہے تمہارا اگر ہم چمن کو گود لے لیں۔"

ایک لمحہ کے لئے پربھا کی سانس رُک سی گئی۔ اُس کی شادی ہوئے چھ سال گزر گئے تھے، لیکن ابھی تک اُس کی گود سُونی تھی۔ شوہر کی بات سُن کر اُس کی آنکھوں میں ممتا جاگ اُٹھی۔ اُسے لگا کہ اس کی چھاتیوں سے دُودھ کی دھار بہہ رہی ہے جس سے اُس کا سارا آنچل بھیگ گیا ہے۔

لیکن یہ سب صرف ایک لمحہ کے لئے ہوا۔ دوسرے لمحے اُس نے ناک سکوڑی اور ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "یُوں کیوں نہیں کہتے کہ میں دُنیا بھر کے غریب بچوں کو پالنے پوسنے کا بار سنبھال کر گھر کو یتیم خانے میں بدل دوں۔ اگر کسی کو گود ہی لینا ہے تو اپنی بہن جی کا بیٹو پڑا ہے۔ وہ تو خود کہتی تھیں کہ ... ..."

لیکن یہاں پربھا رُک گئی اور شرم اور ناراضگی کے ملے جُلے لہجے میں شوہر سے پُوچھ بیٹھی۔ "مگر آپ یہ کیسے سمجھتے ہیں کہ میں ہمیشہ ایسی ہی رہوں گی؟"

سوم ناتھ کو ہنسی آئی اور اس نے پربھا کے بائیں گال پر پیار بھرا ایک ہلکا سا تھپیڑ مارا۔ پربھا کے ہونٹ بھی کھِل گئے اور اس نے شوہر سے کہا۔ "جائیے کپڑے بدل کر آئیے۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"میں تو اس وقت چمن کو اپنے ساتھ نہرو پارک لے جا رہا ہوں۔" سوم ناتھ نے کہا۔ "چائے بھی وہیں ریستوران میں پئیں گے۔"

"جو جی میں آئے کیجئے۔ مگر میں پھر کہوں گی کہ ...

"کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔" سوم ناتھ نے مُسکرا کر بیوی کی بات کو پُورا کیا اور پھر محمدو سے کہا کہ وہ چمن کو بُلا لائے۔

محمدو چلا گیا اور سوم ناتھ پربھا کے پاس جا کر اُسے سمجھانے لگا۔ "کسی بچے کے مستقبل کا دارومدار اس بات پر نہیں کہ اُس کا جنم کس ماحول میں ہوا ہے۔ وہ کس ماحول میں پلتا ہے۔ یہ اہم بات ہے۔ ہمیں ابھی سے چمن کو اُس ماحول کے بُرے اثر سے بچانا چاہیئے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ اس طرح اس کی چھپی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقعہ ملے گا، اور وہ ایک اچھا آدمی بن جائے گا۔"

مگر پربھا ان باتوں سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف مُسکرا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد محمدو چمن کو لے کر آیا۔ اس نے بال بڑے سلیقے سے سنوارے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا ہے۔

"شاباش گُڈ بوائے!" سوم ناتھ چمن کو اس حالت میں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور اس نے اس کے آگے بُش شرٹ، نکر اور جرابیں کر دیں۔

چمن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تبھی سوم ناتھ نے کہا۔ "ارے تم نے نیا بُوٹ نہیں دِکھایا۔ جاؤ جلدی سے پہن کر آؤ۔ نہیں تو پھر دیر ہو جائے گی۔"

آنکھوں کی چمک اچانک غائب ہو گئی اور چمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "وہ روپے تو میں نے بابوجی کو راشن خریدنے کے لئے دئے۔ گھر میں چاول ختم ہو گئے تھے اور ... "

اور پربھا کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ "میں نہ کہتی تھی کہ انہیں صرف پیٹ بھرنے سے کام ہے۔ چاہے کتنا ہی زور لگاؤ، کُتے کی دُم سیدھی نہیں ہو سکتی۔"

لیکن اس دفعہ سوم ناتھ اپنی بیوی کی بات کا جواب نہیں دے پایا اور کپڑے بدلنے کے لئے چلا گیا۔

نجم مظفر نگری

کشمیر ہمارا ہے

فطرت نے جسے اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے
جس خطّہ کا ہر ذرّہ خوش رنگ و دِل آرا ہے
جو سارے زمانے کو سَو جان سے پیارا ہے
کشمیر اُسے کہہ کر دُنیا نے پُکارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

وہ وادیِ جاں پرور گُل پوش گُزرگا ہیں
ہر روز دِکھاتی ہیں اُلفت کی نئی را ہیں
محرومیِ قسمت پر بھرتے ہیں عدو آ ہیں
زیبائشِ عالم کا بے مثل نظارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

خاموش فضاؤں میں بجتی ہوئی شہنائی
غنچوں کے تبسّم میں اِک عالمِ زیبائی
تصویر زمیں پر کیا جنّت کی اُتر آئی
پھولوں کی تمنّا کا رنگین سہارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

پروا نہیں گھِر جائیں ظلمت کی گھٹاؤں سے
بدلے گا نہ رُخ اپنا مذموم ہواؤں سے
مرعوب نہ ہم ہوں گے دُنیا کی بلاؤں سے
روشن ابھی بھارت کی قسمت کا ستارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

اُس خطّۂ رعنا پر اُس جانِ تمنّا پر
اُس مرکزِ جلوہ پر اُس اوجِ ثریّا پر
ہو جائیں گے ہم قرباں اُس حسنِ سراپا پر
دُنیائے محبت میں جو انجمن آرا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

پریم صراف

کشمیر شاہراہِ ترقی پر

گزشتہ بارہ سال کے دوران میں ہم نے ملک کے اس حصہ میں گوناگوں اقتصادی تبدیلیوں اور ترقیات کا مشاہدہ کیا ہے۔ عوام کو مناسب اور باعزت روزگار مہیا کرکے اُن کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ منصوبہ بندی کا مقررہ طریق کار کے تحت اعادہ کیا گیا جس کا اہم ترین مقصد اقتصادی ترقیات کو بڑھاوا دینا اور صنعت کاری کی شرح رفتار کو تیز کرنا ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور بات تو یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے فوراً بعد ہی موجودہ حکومت نے زیر قیادت جناب بخشی غلام محمد اُن ماہرین کو، جو اقتصادی مہم اور دیگر ریاستی امور میں محو کار تھے، پوری پوری سہولیات اور مراعات بہم پہنچائیں۔

ریاست کی منصوبہ بندی بڑی بڑی مختلف نوعیت کی سکیموں اور دماغی تخلیقات پر ہی مبنی نہیں بلکہ سچے تُلے خوابوں کی تعبیر ہے۔ جس کی بُنیاد ٹھوس حقائق اور صحیح اعداد و شمار پر رکھی گئی ہے۔

کشمیر ایک زراعتی ملک ہے۔ اس کے ۸۰ فیصدی عوام کا انحصار کُلیتاً کھیتی باڑی پر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہزاروں من غلہ ہر سال بیرونی ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ تاہم صورت حال نہایت سُرعت کے ساتھ سُدھر رہی ہے۔ حکومت ملک کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی تکمیل میں زراعتی اقتصادیات کو خصوصی طور پر اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ ریاست کی ٹھوس اور متوازن زراعتی اقتصادیات ریاستی عوام کی خوشحالی اور مسرت کے مترادف ہے۔

اس ضمن میں مختلف طریق کار عمل میں لائے گئے جن سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ نئی زراعتی پالیسی کے عمل درآمد کے تحت خاتمہ ٹھیکداری نظام اور کسانوں کو حقوق ملکیت اس زمرہ میں اُٹھائے گئے بُنیادی اقدامات ہیں۔ حکومت نے لازمی مجوزہ غلہ کے بوسیدہ رواج کو ختم کیا۔ کاشت کاروں کو جدید قسم کے آلاتِ کشاورزی، اچھی قسم کے بیج، کیمیاوی کھاد اور پھلوں کی بڑھیا پیوند بہم پہنچائی گئی۔ ریاست کے مختلف حصوں میں جدید زراعتی فارم اور پود گھر قائم کئے گئے۔

خشک سالی اور سیلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والی بربادیاں ہمارے لئے لاینحل مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ جس کی روک تھام کی طرف حکومت فوری توجہ دے رہی ہے۔ آبی مدافعت کے سلسلہ میں باندھ تعمیر کروانے اور امدادی نہریں کھُدوا کر سیلاب کی تباہی سے بچاؤ کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کر رہی ہے۔ زرخیز زمینوں کو پانی کے بہاؤ سے بچانے کے لئے مؤثر ذرائع عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ قابل کاشت زمینوں کو کیمیاوی کھاد کے استعمال سے اور زیادہ زرخیز بنایا جا رہا ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ خوراک میں اضافہ کے اثر کو ہماری بڑھتی ہوئی آبادی زائل کر دیتی ہے اس خطرناک صورت حالات کی روک تھام کے لئے موجودہ وقت میں بارہ خاندانی منصوبہ بندی مرکز قائم کئے گئے ہیں جن سے عوام خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں ۳۴ء۳۲۲،۲ لاکھ روپے کی گراں قدر رقم زراعتی اور کمیونٹی ترقیات کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ اور ۴۰ء۱۹۰،۴ لاکھ روپیہ آبپاشی اور بجلی کے ذرائع میں اضافہ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

ریاست میں پہلے دونوں منصوبوں میں اُن شعبہ جات پر زور دیا گیا ہے جن میں دیگر شعبہ جات کے لئے بہترین ذرائع اور مفاد حاصل

ہونے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔ ان شعبہ جات میں فوری ترقی لازمی امر ہے۔ لہذا زراعتی کمیونٹی ترقیات، آب پاشی اور بجلی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس طریق کار کے عمل درآمد سے زراعتی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اور یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ حکومت کی تمام تر توجہ مقررہ صنعتی ترقی کی طرف مبذول ہے اور زمین سے روزگار حاصل کرنے کے زیادہ جھگڑوں سے چھٹکارا حاصل ہو گیا ہے۔ دیہاتی آبادی کے لئے دیگر روزگار کے اور ذرائع فراہم ہو سکیں گے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مجوزہ ڈھانچے کے تین مقاصد میں اہم ضروری مقصد صنعت کاری کو فروغ دینا قرار پایا گیا ہے۔ درمیانے درجے اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ تیسرے پلان کے لئے کل وقف شدہ ۱۶,۹۱۳ء۱۴ لاکھ روپیہ کے گراں قدر سرمایہ میں سے ۴,۳۷۱ء۴۰ لاکھ روپیہ صرف صنعتی ترقی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

حکومت موجودہ دور میں ہر طرح کی صنعتوں کا مکمل فروغ چاہتی ہے۔ خواہ وہ چھوٹے پیمانہ کی ہو یا بڑے پیمانہ کی۔ آیندہ پانچ سالوں میں ہماری اقتصادیات کا دھارا بدلنے کے لئے ۳,۰۶۱ء۶۵ لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم مخصوص کر دی گئی ہے اور ضروری اشیاء کے لئے خود کفیل ہونے اور ذرائع روزگار کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ ہمارے منصوبہ مرتب کرنے والوں نے بڑے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو دست کاریوں میں تال میل پیدا کر کے عوام کو روزگار مہیا کرنے اور مالی ذرائع کی فراہمی میں متوازن سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اول الذکر روزگار کے لئے کم مواقع بہم پہنچا سکے گا۔ مگر قابل استعمال اشیاء کی کھپت کے لئے ایک بہت بڑی مانگ پیدا کر دے گا؛ اور جس کو پورا کرنے میں یہ قاصر رہے گا۔ بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے اس قسم کی اشیاء کی بہم رسانی کو کثرت سے مہیا کرنا اور گھریلو دست کاریوں کو وسیع پیمانہ پر جاری کرنا ہوگا۔ اس طرح ترقیاتی کام ریاست بھر میں نہایت سرعت کے ساتھ سر انجام پا سکیں گے۔ تیسرے پلان کے دوران میں قریباً ایک لاکھ اشخاص کو روزگار مہیا کرنے کے لئے مؤثر ذرائع بروئے کار لائے جائیں گے۔

مسئلہ حفظانِ صحت کے لئے حکومت نہایت سختی سے عمل درآمد کے درپے ہے۔ چونکہ پلان کو خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند ہوں۔ اس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے موجودہ حکومت نے صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لئے بھی بہترین اور مؤثر ذرائع کو عمل میں لانے پر زور دیا ہے۔ ان ذرائع کو وسعت دینے کے لئے ابھی کافی گنجائش ہے۔ اسی بنا پر تیسرے پلان میں ریاست بھر کے عوام کو بہترین طبی امداد پہنچانے کے کام کو تیزی سے چلانے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ریاست کے دور دراز علاقہ جات میں جدید قسم کے اوزار اور مشینری سے لیس ڈسپنسریاں اور طبی امداد کے مراکز کام کر رہے ہیں۔ تقریباً اٹھارہ ہسپتال اور سینی ٹوریم، پچیس بنیادی ہیلتھ سنٹر، چودہ ہیلتھ یونٹ، بیاسی انگریزی ڈسپنسریاں عوام کو مفت اور مناسب طبی امداد بہم پہنچانے کا کام سر انجام دے رہی ہیں۔ ریاست کے تمام ہسپتال جدید قسم کی مشینری اور قابل تربیت یافتہ زنانہ و مردانہ سٹاف سے مزین ہیں۔ گذشتہ سالوں میں ڈاکٹروں کی بہت بڑی تعداد بیرونی ممالک میں اعلیٰ تربیت کے حصول کے لئے بھیجی گئی تھی جو اب ریاست بھر کے تمام ہسپتالوں میں جانفشانی سے کام کر رہی ہے۔ سرینگر میں بہترین اور اعلیٰ پیمانہ پر ایک میڈیکل کالج کھولا گیا ہے جس میں اعلیٰ تربیت یافتہ سٹاف طلباء کو ایم، بی، بی ایس کے لئے تیار کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ لہذا دو اور میڈیکل کالج آیندہ پانچ سالوں کے دوران کھولے جا رہے ہیں۔

تیسرا پنج سالہ منصوبہ تعلیمی اعتبار سے بھی کم نہیں۔ ریاست میں ملک کے نوجوانوں کو ابتدا سے ہی ضروری تعلیم دیئے جانے کا مناسب انتظام کر دیا گیا ہے تاکہ فرزندانِ وطن کو عوامی بہبودی اور ترقی لانے کے لئے کارآمد بنایا جا سکے۔ اس طرح کا پیدا کیا گیا جذبہ انہیں آیندہ زندگی میں چاہے سماج، ریاست، یونیورسٹی یا میدانِ صنعت ہی کیوں نہ ہو، مکمل اور بہترین خدمات پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔

بیدار مغز ہستیاں، جن کی زیر قیادت مختلف شعبہ جات میں جس قدر کام سر انجام پا رہے ہیں، اُن سے ہمیں یقینِ کامل ہو جاتا ہے کہ ہمارا پلان نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ (بقیہ بر صفحہ ۶۴)

ایم ۰ ایس گیلانی

فکروفن

(تبصرے)

" حالی کا سیاسی شعور "

ڈاکٹر معین احسن جذبی

باہتمام احباب پبلشرز لکھنؤ

سول ایجنٹ : انجمن ترقی اُردو (ہند)

قیمت :- چار روپے ۵۰ نئے پیسے

معین احسن جذبی اُردو کی شعری دُنیا میں جس بلند مرتبے پر فائز ہیں اُس سے اس زبان کا کون طالب علم بے خبر ہوگا۔ مگر اس کتاب میں پہلی بار اُن کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر کھُلے ہیں۔ حالی ہمارے یہاں نئی تنقید کے پیشرو، سلیس نثر کے علم بردار اور اعلےٰ معیار کے شاعر تو مانے جاتے ہیں مگر اُن کی مفکرانہ اہمیت اور اُن کے سیاسی شعور کی جولانیوں کو پرکھنے کے کم ہی مواقع آئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہماری نئی پود حالی کی اس حیثیت سے لگ بھگ نابلد ہو رہی ہے۔ اُن کے سیاسی افکار کو محض سرسید کے افکار کی بازگشت سمجھا جا رہا ہے اور اُنہیں اُس نظام کا ایک سیارہ سمجھنے پر بس کیا جا رہا ہے جس کے سورج سرسید ہیں۔ جذبی صاحب کی اس بصیرت افروز کتاب کو پڑھ کر جدید تنقید کے امام اور مدوجزرِ اسلام کے شاعر کی عظمت کا احساس صحیح معنوں میں دوچند ہو جاتا ہے اور اس امر کا سُراغ مِل جاتا ہے کہ اُن کے افکار نہ صرف سرسید کو الگ چھوڑتے ہوئے اپنا انفرادی وجود رکھتے تھے بلکہ کئی معاملوں میں وہ سرسید سے اختلاف رائے بھی رکھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی تعلیم کے فیوض کے بارے میں وہ سرسید کے ہم خیال اور موید تھے۔ مگر جہاں تک ہندوستان میں اُبھرتی ہوئی سیاسی بیداری اور ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کا تعلق تھا اُن کی ہمدردیاں واضح طور ہندوستانیوں کی طرف تھیں۔ کتاب میں نہایت ہی بصیرت افروز طریقے پر حالی کے ذہن کو اپنے پُورے پیچ و خم اور کیف و کم

تعمیر

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب نفیس کاغذ پر عمدگی کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ ضخامت ۲۰۳ صفحات ہے۔ آخر میں "کتابیات" اور صحت نامہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔

اُردو ادب کے ہر سنجیدہ طالب علم اور ہر اچھی لائبریری کے لئے یہ کتاب ایک لابدی شے ہے۔

... ...

" غزل اور درسِ غزل "

تالیف : اختر انصاری

ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اُردو (علی گڈھ)

قیمت : دو روپیہ

غزل مسلّمہ طور ہماری شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ غزل کی صالح تفہیم بھی اسی حساب سے مشکل ہے۔ غزل کو فقرے بازی سمجھنے والے بھلے ہی رٹے رٹائے شعر دُہراتے پھریں۔ مگر اس حسینۂ سخن کی سحر طرازیوں اور عشوہ سازیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے ایک تہذیب یافتہ شعور اور ایک متمدن ذہن کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ہماری درس گاہوں میں تو یہ ہرنی اپنی ساری چوکڑیاں بھُول گئی ہے اور سمجھنے والے تو خیر بے چارے ہی ٹھہرے۔ خود سمجھانے والے اس کے ساتھ جو ناروا سلوک روا رکھتے ہیں۔ اُس کو دیکھ کر "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد" کی دِل دوز چیخیں فضا میں گونجتی ہیں۔ اس حال میں اختر انصاری کی یہ خوبصورت کتاب ایک بڑی ضرورت کو پُورا کرتے ہوئے منظر عام پر آئی ہے اور طرّہ یہ کہ نہ صرف پڑھانے والے بلکہ پڑھنے والے اس کتاب کا مطالعہ کرکے "بقدرِ ذوق" گلستانِ غزل کے محرم راز بن سکتے ہیں۔ اختر

انصاری صاحب نے غزل کا پس منظر پیش کرکے بہت سے تدریسی مسائل کا جائزہ لے کر چند اصول اخذ کرلئے ہیں۔ اور پھر اساتذہ کی چند مشہور غزلوں کو لے کر ان نظریات کے عملی اطلاق کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی طالب علموں کے لئے اساتذہ کی غزلیات کا نمائندہ انتخاب بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ جس سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اُردو غزل پڑھانے والے ہر اُستاد کے لئے یہ کتاب بہر صورت لازمی ہے ہی، مگر اُردو غزل کے طالب علموں کے لئے بھی اس کا مطالعہ بہت اہم ہے۔

کتاب سوا سَو صفحات پر پھیلی ہے اور اس کا کاغذ کافی عمدہ ہے۔ طباعت بھی اچھی ہے۔ مگر کتابت کا معیار خاطر خواہ حد کو نہیں پہنچا جو انجمن ترقی اُردو کی روایات سے ہم آہنگ نہیں۔

... ...

نئی روشنی — (پانچ ایکٹ کا ڈرامچہ)

محمد فضل الرحمٰن

ناشر: انجمن ترقی اُردو ہند (علی گڑھ)

قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

ڈرامچے کے پہلے صفحہ پر یہ سطر درج ہے: "پلاٹ شریڈن کی کومیڈی "دی رائی ولس" سے لیا گیا۔" ڈرامے کو سلیقے کے ساتھ ہندوستانی ماحول کے مطابق بنایا گیا ہے۔ زبان بڑی شُستہ اور مکالمے بڑے برجستہ ہیں۔ فصاحت بیگم کا کردار تو اُردو کے ڈرامائی ادب میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے اور اسے خوجی کی عظمت نصیب نہ ہو، مگر اُس صف میں ایک چھوٹی سی جگہ پانے کا ضرور دعویدار ہے۔ کتابت اور طباعت اچھے ہیں۔

شبنم شبنم — کرشن موہن کا مجموعہ کلام

ملنے کا پتہ:۔ انڈین اکاڈمی ۲۹۔ نریندر پلیس۔ نئی دہلی

قیمت: پانچ روپے

اس حسین کتاب کو دیکھ کر اچانک ہی دل مچل اُٹھتا ہے اور اس کا بے پناہ حسنِ ظاہری دامنِ دل کو بے محابا کھینچ لیتا ہے۔ اُردو میں اس اہتمام اور حسن کاری کے ساتھ شاید دیوانِ غالب کے چند خاص ایڈیشنوں کے بغیر اور کوئی کتاب نہیں چھپی۔ اور جب پانچ روپے کی قیمت پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار ناشران کے لئے مبارک باد کے الفاظ لب پر آتے ہیں۔ کرشن موہن ایک خوش گو شاعر ہیں اور رباعی، غزل، آزاد نظم اور ایسی ہی دوسری اصنافِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس مجموعے میں بھی اُن کی موزوں طبعی کے جوہر کھُلے ہیں۔ اُن کے اشعار کی روانی اور بے ساختگی کو دیکھ کر ڈاکٹر عابد حسین کی اس رائے سے اختلاف کی کم ہی گنجائش رہتی ہے کہ شاعر کے زورِ کلام نے پابندیوں میں آزادی کی راہیں نکالی ہیں اور اس کی طبعِ سلیم نے آزادی میں پابندی کے آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔

... ...

ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ

(شبلی نمبر)

مدیر: ابنِ فرید ایم اے

ناشر: سرسید بک ڈپو علی گڑھ — ۲

قیمت: چھ روپے

مولانا شبلی نعمانی ہماری ثقافتی بساط کی ایک برگزیدہ شخصیت ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی اُن کی حیات و افکار کے بعض مسئلے اب تک مابہ النزاع بنے ہوئے ہیں۔ درحقیقت مولانا کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ بذاتِ خود ایک انجمن اور ایک دَور تھے۔ ایسی شخصیتوں کے بارے میں آراء کا اختلاف اُن کی عظمت کی ہی دلیل ہوتی ہے۔ زیرِ نظر نمبر میں اُن کی حیات اور اُن کے کارناموں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا شبلی کی ایک قلمی شبیہہ اور اُن کی تحریر کے عکس نے اس کی دلچسپیوں میں اضافہ کیا ہے۔ شبلیات سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ نمبر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اتنی اچھی تخلیقات کو مطلوبہ معیار کی کتابت، طباعت اور کاغذ میسر نہیں آسکے ہیں۔ کتابت کی بعض شدید غلطیاں تو سخت کھٹکتی ہیں۔

افسانہ نگار حضرات سے

طویل افسانوں کی بجائے مختصر مختصر افسانے بھیجیں؛ تو ان کی اشاعت آسان بن جاتی ہے!

وقار خلیل
مدیر "سب رس"

"تعمیر" کا خالدِ کشمیر نمبر

جنابِ من۔ میرے محترم علی جواد زیدی صاحب کی عنایت سے "تعمیر" کا شمارہ "خالدِ کشمیر" نمبر نظر نواز ہوا۔ بقولِ شاعر ؎

زِ فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

کے مصداق یہ خصوصی شمارہ سراپا بہار اور فردوسِ گوش رہا۔ صرف کلماتِ مبارک رسمی بات ہوگی۔ ذیل میں تفصیلی تاثرات ایک مضمون کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ جو تفصیلی ہوتے ہوئے بھی ادھورے ہیں کیونکہ ہر نگارش کے خد و خال کی صورت کے لئے ؎ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

قبلہ بخشی صاحب ہمارے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے "ایوانِ اُردو" کی رسمِ افتتاح کی تقریب کے لئے گذشتہ دِنوں حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اُن ہی دِنوں موصوف کو قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا تھا۔ اور ایک نظر جو تاثر ذہن میں اُبھرا تھا اب یہ دقیع شمارہ دیکھ کر اس مردِ مجاہد کی پوری حیات اور شخصیت آئینہ ہوگئی۔

سادہ و پُرکار سرورق گلستانِ کشمیر کے اس گُلِ سرسبد کی شگفتہ تصویر سے مزیّن ہے۔ انفرادی مسکراہٹ واضح کر رہی ہے کہ اجتماعی مسرّتوں کا ایک بحرِ ناپید کنار اس مردِ حق نگر کی صلاحیتوں اور کامرانیوں سے عبارت ہے اور وہ ہے آج کا ترقی یافتہ، خوش حال اور سربلند، ہمارا، آپ کا اور سارے بھارت کا شہرِ زرنگار ——کشمیر

"ترپن منزلیں —— ترپن قدم" چند اشارے ہیں جو اس شہرِ آرزو کی اجتماعی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی بصیرت و بصارت کی روشن دلیلوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اور جو کشمیر کی کلیدی سربلندی اور سرافرازی کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ ترپن منزلیں بخشی صاحب کی زندگی کے ترپن قدم سے تعمیر

مماثلت رکھتی ہیں۔ کیونکہ اُن کی ذاتِ والا صفات جس کا کہ اداریہ (زاوئیے) میں ذکر کیا گیا ہے، یہ محض ایک ذات کا نام نہیں ہے، وہ ایک دَور، ایک تحریک، ایک رُجحان اور ایک مستقبل کا عنوان ہیں۔"

اداریہ میں اس مردِ بزرگ کو اُن کی شخصیت کے عین مطابق خراجِ عقیدت ادا کیا ہے اور کہیں تکلف یا تصنع کی جھلکیاں نہیں مِلتیں۔ اہلِ کشمیر قرارِ واقعی اس شخصیت پر جس قدر ناز کریں، کم ہے۔

"غزالِ کشمیر" اُردو کے مُستند نظم گو شاعر فضا ابن فیضی کی شاہکار نظم کا عنوان ہے۔ جس میں اس بالغ نظر شاعر نے "خالدِ کشمیر کی سالگرہ" پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ اس نظم میں نہ صرف بخشی صاحب کی حیاتِ جاوید نمایاں ہوتی ہے بلکہ آج کے کشمیر کا صحت مند رُخ بھی جلوہ ساماں نظر آتا ہے۔

یہ چند بے مثال شعر (۵۰) شعروں کی نظم میں سے پیش ہیں ؎

یہ کون مست چناروں کے نرم سایے میں
جو صبح سے بھی حسیں ہے وہ شام لے کے اُٹھا
وہ کسما اُٹھی کشمیر کی جواں تہذیب
ترے سبُو کی مئے تُند ہے خمار شکن
گلاب و عطر کی ان خواب وش فضاؤں میں
تری نوا نے جلائے چراغِ بیداری
ترے فروغِ تدبّر سے صُبح بن کے رہی
وہ رات جو ترے دیدہ وروں پہ تھی بھاری
ہے ذرّہ ذرّہ گزرگاہِ آفتاب ترا
کہاں سے تُو نے مرا شعلۂ خیال لیا

ترا پیام ہے چہرہ کشائے حسنِ عمل
ترا پیام بہت عہد آفریں نکلا
وہ تیری طبع زمانہ شناس کی تیزی
کہ شاخِ گل کو بھی تلوار کر لیا تو نے
جواں ہے تیری محبت سے چہرۂ لداخ
ترے خلوص سے ہے گرم پہلوئے کشمیر
یہ چاندنی، یہ شگوفے، یہ موجِ نکہت و رنگ
خود اپنے دام میں ہے آج آہوئے کشمیر
خدا کرے نہ کبھی یہ بہار کمھلائے
یہ جشنِ زہرہ و ناہید تجھ کو راس آئے

ممبر پارلیمنٹ انصار ہروانی نے پیام کی صورت میں خالد کشمیر پر جو تاثرات لکھ چھوڑے ہیں وہ مختصر مگر مفید ہیں اور بخشی صاحب کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ یہ جو لکھا ہے کہ "جب ہندوستان کی سیکولر ڈیموکریسی کی غیر جانب داری کے ساتھ تاریخ لکھی جائے گی تو مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں تین درخشاں ستارے نظر پڑیں گے اور وہ ہوں گے جواہر لال نہرو، ابو الکلام آزاد اور بخشی غلام محمد" بالکل درست اور ایمان داری کی بات ہے۔ بخشی صاحب بلاشبہ ہندوستان کے گنتی کے بے لوث قائدین میں سے ایک ہیں۔

"ہفت رنگ" جواں سال شاعر نریش کمار شاد کی خوبصورت نظم کا عنوان ہے جس میں بخشی صاحب کی باغ و بہار اور قوسِ قزح شخصیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ دو شعر تو غضب کے ہیں ؎

اپنے اخلاصِ بے پناہ کا رنگ   ہر کسی کی نظر میں بھرتا ہو
حکمراں ہے وہی جو تیری طرح   حکمرانی دلوں پہ کرتا ہو

ممتاز جرنلسٹ اور قوم پرست بزرگ حافظ علی بہادر خان ایڈیٹر "دورِ جدید" دہلی نے بخشی صاحب کے تئیں "چند جھلکیاں، چند تاثرات" کے تحت اپنے ارتسامات نذر کئے ہیں اور چند رفاقت کے لمحات کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے ادبی ذوق کے باب کو اُجاگر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ وہ اپنی گوناگوں معروفیات کے باوجود بھی ادبی تقاریب میں شرکت کرتے ہیں اور فن کاروں کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ ایک پریس کانفرنس میں جب صحیفہ نگاروں نے جگر مراد آبادی کو کشمیر بلانے کا ذکر کیا تو بخشی صاحب نے کہا تھا کہ "جگر صاحب کی بات تو اور ہے، اُن کو تو ہم کشمیر بھی بخش دیں۔"

عرش صہبائی اُردو کے ممتاز شاعر اور "آج کل" دہلی کے مدیر ہیں۔ آپ نے فارسی میں منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا ہے اور بخشی صاحب کی سخن دانی و ہمہ دانی کو ارفع و اعلیٰ ٹھہرایا ہے۔

ممتاز قلم کار پرتھوی راج کپور نے "اپنے بخشی صاحب" عنوان کے تحت بخشی صاحب کے تعلق سے بہت ہی نمایندہ خیالات تحریر کئے ہیں۔

رسا جاودانی کی نظم "معمارِ وطن" مناسب ترین ہے۔

اُردو کے ممتاز محقق، صاحبِ طرز انشا پرداز اور لسانیات کے ماہر ڈاکٹر زور نے اپنے تاثرات کے اظہار میں بالکل صحیح تحریر کیا ہے کہ "ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد مسلمانوں کے رہنماؤں میں مولانا ابو الکلام آزاد کے بعد بخشی غلام محمد صاحب کی ذات ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ راہ و رسمِ منزل کی نزاکتوں کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مولانا آزاد مرحوم کے بعد اُردو والوں کے لئے بخشی صاحب ہی سب سے بڑے لیڈر اور رہنما ہیں۔ اسی لئے ان کی نظریں ہر ضرورت کے وقت اُن ہی کی طرف اُٹھتی ہیں۔"

"نذرِ نیاز" ناطق گلاوٹھی صاحب کی خوبصورت نظم ہے۔

"کردار کا غازی" بخشی صاحب کی سوانح کا عنوان ہے جسے "امرت بازار پتریکا" کے لیکھک شرید رانی نے قلم بند کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بخشی صاحب کی تہہ در تہہ زندگی نمایاں ہوتی ہے اور ان کی عظمت قاری کی نظر میں بڑھا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے عہدِ جلیلہ کے سربلند قومی خدمات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

انور صابری اور محمد آصف کی تہنیتی نظمیں بھی بہت خوب ہیں۔ آصف کا یہ شعر تو بہت ہی شان دار ہے ؎

تیری باتوں میں وہ جادو ہے کہ مبہوت ہیں سب
اور دیوانے ہیں بھولے ہوئے زنجیر کا نام

"عوام کے چہیتے رہنما" کے زیرِ عنوان ایس۔ پی۔ ساہنی نے بخشی صاحب کی عوامی مقبولیت، عوام کے اتھاہ پیار کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ آخر میں یہ جو لکھا ہے کہ "بخشی صاحب صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ پایہ کے جمہوری رہنما ہیں۔ لوگوں کا ایک ایسا رہنما جس کا دل لوگوں کے دل کی دھڑکنوں کے

ساتھ ہم آہنگ ہے۔

"ادب نواز" عنوان ہے اُردو کے مشہور نظم گو شاعر کمال احمد صدیقی کی تحریر دلچسپ اور اس خصوصی اشاعت کی سربلند اور شاہکار تخلیق کا، جس میں شاعر نے تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے بخشی صاحب کی شخصیت کے پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ یہ شعر تو تعریف سے پرے ہیں ؎

تیری محفل میں کیوں ہے سوسن چپ
اُس کی فطرت زباں درازی ہے
چشمِ نرگس جھکی ہے تیرے حضور
آج کیسی نگاہ بازی ہے
غمِ دُنیا ہے دل سے بے پروا
بے نیازی سی بے نیازی ہے!

شمیم کرہانی کی نظم "تیری محبت تیری جوانی" کا کینوس بھی بخشی صاحب کی پہلو دار شخصیت ہی ہے۔ نظم جوان، رواں اور حسین ہے۔ یہ شعر تو بے حد پسند آئے ؎

اہلِ سفر کے سُکھ کی خاطر، وادی وادی، پربت پربت
راہ نکالے، راہ بنائے، تیری محبت، تیری جوانی
اہلِ جہاں کی ریت نہ پوچھو، اپنا نشیمن، اپنا بسیرا
گاؤں سنوارے، شہر سجائے، تیری محبت تیری جوانی
بستی بستی سورج چمکیں، نگری نگری چاند ستارے
دھرتی کو آکاش بنائے، تیری محبت، تیری جوانی
پرچم کھولے، تیشہ تولے، ہاتھ کروڑوں ساتھ کو حاضر
جس میداں میں پاؤں بڑھائے، تیری محبت تیری جوانی
پستی سے ہستی کو اُبھارے، پربت سے وادی کو اُبھارے
قوسِ قزح کی سمت بُلائے، تیری محبت، تیری جوانی

تاپا زنکن اور امیش کول کے مضامین علی الترتیب "محبوب قائد" اور "خاکہ اور رنگ" بہت گہرے تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ عتیق مرزا اور اثر انصاری کی نظمیں مناسب اور واجبی ہیں۔ عبدالعزیز پرواز کی نظم بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔

الزبتھ پارٹرج کے تاثرات "مردِ خلیق" کے زیر عنوان خراج تحسین کا بھرپور ترجمان ہیں۔

نہال رضوی اور انور صابری کی نظمیں بھی تاثراتی منظوم اضافے ہیں اور بقدرِ حوصلہ و ہمت خراج عقیدت کا نمونہ۔

"معرکہ کرکوٹ" کے تحت جن واقعات کا اعادہ کیا گیا ہے اُنہیں پڑھ کر بخشی صاحب کی طوفانی اور پُر وقار شخصیت کے حضور سر جھک جاتا ہے۔

"چائے کی دو پیالیاں" ایک انشائیہ ہے سا گر چند مہاجن کے پُر خلوص تاثرات کا مجموعہ ہیں۔ جس میں بخشی صاحب کی سادہ مزاجی اور حُب الوطنی کو واضح کیا گیا ہے۔

آمنہ تمکین اور غلام قادر کی نظمیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں مگر بخشی صاحب کی ہمہ پہلو شخصیت کے آگے ٹھہر نہیں سکتیں۔

چراغ دین تابش اور عباس علی وحشت کی نظمیں بھی پسند آئیں۔ تابش کا یہ شعر خوب ہے ؎

خاکِ کشمیر آج ہے اکسیر۔ ذرّہ ذرّہ ہے گوہرِ نایاب

"اکابرینِ صحافت و سیاست" نے بخشی صاحب کو جیسا پایا ویسے اپنے خیالات تحریر کئے ہیں جن میں اقوام متحدہ کے معتمدِ عمومی ڈاگ ہیمرشولڈ اور ارل ایٹلی سابق وزیر اعظم برطانیہ نے تاثرات صدفی صد بخشی صاحب کی شخصیت اور ہند دوستی کی ترجمانی و تصدیق کرتے ہیں۔

ایک دلچسپ عنوان "ساز بھی شمشیر بھی" ہے۔ جس میں اس مردِ آہن کی ہمت و قوت، خلوص و محبت اور ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لئے غیض و غضب کے مختلف دو راہوں کو روشنی میں لایا گیا ہے۔

اس طرح دلچسپ اور رنگا رنگ تاثراتی مضامین اور نظموں کا یہ گلدستہ دلچسپ تصویروں سے مزین ہے۔ ہر تصویر بخشی صاحب کے حیات و حرکت کی برکتوں کا مظاہرہ معلوم دیتی ہے۔ اُردو کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی تاثرات شائع ہوئے ہیں۔

"تعمیر" کا یہ دستاویزی سوانحی نمبر اُردو ادب میں اپنی افادیت کے لحاظ سے یادگار رہے گا اور کشمیر و بخشی صاحب کے تعلق سے ہر فرد کو اس کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہوگا۔ بجا طور پر یہ شمارہ سوانحی ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے جسے جناب جی این زتشی صاحب ناظم اطلاعات حکومت جموں و کشمیر نے محمد یوسف ٹینگ کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

حدیثِ دیگراں

اعظم گڑھ۔ حبیب خوش نظر۔ تسلیم شوق!

آپ کی فکری نفاستوں کا مرقع، ترتیب و تہذیب کی اچھوتی صلاحیتوں کا پیکر، کشمیر کی شاداب فضاؤں میں پلے ہوئے ذوق و وجدان کا دِلربا نمونہ اپنے خط و خال میں، رنگین و رعنائی کے شباب آفرین فردوس کی نکہت سموئے ہوئے نظر نواز ہوا۔ ہاں! جولائی ۱۹۶۰ء کا "تعمیر" کچھ ایسے ہی فکر انگیز و دیدہ زیب اسلوب کا حامل ہے۔ کشمیر کی اُس مرمریں شخصیت پر حسین نظموں، دِلربا قطعات، حوصلہ افزا پیغامات، سیر حاصل مضامین کا یہ مجموعہ اس اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے کہ وزیرِ اعظم کشمیر کی جامہ زیب شخصیت کے تمام نقوش اپنی پوری تابناکی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ نگاہوں کے سامنے ایک ایسی تصویر اُبھرتی ہے جس میں بیک وقت کئی رنگ دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ ان نیت کی صحیح قدریں، حوصلوں کا بانکپن، مستقبل کو سنوارنے کا عزم، عوام کی بے لوث سادہ آرزوؤں کا خندہ پیشانی سے استقبال، زخمی معاشرے اور مجروح تمدن کے زخموں کو چومتے ہوئے مرہم، تخریب کے رُخساروں پر حسنِ تعمیر کا چمکتا ہوا غازہ، کہساروں کے سنگلاخ دامن میں لہلہاتے ہوئے بہشت، ذروں کے پامال گریباں سے جھانکتے ہوئے سُنہرے آفتاب، روتے ہوئے شہروں کی اُداس جبینوں پر مُسکراہٹوں کے بکھرے ہوئے صندل، گلیوں کی اویزاں مانگوں میں ہنستی ہوئی فارغ البال زندگی کے سیندور ــــــ میں نے زیرِ نظر شمارے کے اوراق اُلٹے اور اس عہد ساز ہستی کے تمام پیچ و خم یاد آگئے جن کا کشمیر کی مختصر سی مدتِ قیام میں میں نے دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا اور شدت سے متاثر ہوا تھا۔ آپ نے یہ نمبر نکال کر کشمیر کی تہذیب کی فرمائی ہے اور شعر و ادبیات کے گیسو کو نئے خموں سے آشنا کیا ہے۔ اس اچھوتی کوشش پر مبارک باد قبول فرمائیے! مزاجِ گرامی

(فضا ابنِ فیضی)

روزانہ "تیج" دہلی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

مکرمی یوسف صاحب تسلیم!

"تعمیر" کا خالد کشمیر نمبر یعنی جولائی ۱۹۶۰ء کا شمارہ ملا۔ یہ پاکیزہ رسالہ جب بھی ہم دست ہوتا ہے عجیب کیف و مسرت کا پیغام لاتا ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ اس صحیفے میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک بلند معیار رسالہ میں ہونی چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی کوششوں اور کاوشوں کی وجہ سے "تعمیر" نے صفِ اوّل کے ان رسالوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے جو اب اُنگلیوں پر گِنے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میرا خیال یہ ہے کہ "تعمیر" کے ہر شمارہ میں کشمیری ادب اور ادب سے متعلق ایک خصوصی مقالہ ضرور ہونا چاہیئے تاکہ دوسری زبانوں کے لوگ کشمیری زبان و ادب کے بارے میں پوری طرح واقفیت حاصل کر سکیں۔ اُمید کہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

مخلص: بسمت پرکاش شوق سب ایڈیٹر روزانہ "تیج" دہلی

محترم مدیر "تعمیر" سلام مسنون!

"تعمیر" کا تازہ شمارہ "خالد کشمیر نمبر" وصول ہوا۔ میں آپ کا مشکور ہوں کہ مجھے پرچہ برابر وصول ہو رہا ہے۔ تازہ شمارہ وزیرِ اعظم کشمیر جناب بخشی غلام محمد کی قومی خدمات پر مشتمل مضامین سے پُر ہے اور ساتھ ہی ہند کے ممتاز شعراء نے اپنے کلام سے خالد کشمیر کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کئے ہیں۔ گذشتہ "تعمیر" کے شمارے اُردو ادب سے پیار کرنے والے ہر پرچہ کے ادبی ریکارڈ میں ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "تعمیر" کو ہندوستان کے ممتاز شعراء اور مصنفین کا تعاون حاصل ہے اور یہی تعاون "تعمیر" کے معیار و

ترقی میں چار چاند لگا رہا ہے۔ تازہ شمارہ خالد کشمیر نمبر میں حیدرآباد کے کسی بھی ایک ممتاز شاعر کی کوئی نظم یا غزل نہیں ہے اور یہ بات کھٹک رہی ہے۔ کیا آپ نے حیدرآباد کے شعرا کو مطلع نہیں فرمایا تھا؟ حالانکہ حیدرآباد کے ادبی و سیاسی حلقوں میں بھی وزیر اعظم کشمیر اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کشمیر میں ہیں۔ عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب کا مضمون دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ کم از کم ڈاکٹر صاحب شامل ہیں۔ خداوند تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ "تعمیر" کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

ملک محمد علی خان اُدپل کلاں ۱۳ب حیدرآباد دکن (اے پی)

اعظم گڑھ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۰ء

پیکر مجد و الکرم۔ سلام و نیاز۔ "تعمیر" کا خاص نمبر دوستوں کے ذریعہ ملا کر اپنے حسنِ ظاہری و باطنی سے دل افروز و نظر نواز بنا۔ آنجناب کے ترتیب دادہ شاہکار کی جتنی بھی ستائش کی جائے، کم ہے۔ اس کو خالد کشمیر نمبر کہنا بالکل برمحل ہے۔ آپ کی ادب دوستی و ادب نوازی پرچے کی مجموعی حیثیت سے ظاہر و باہر ہے۔ پرچہ کیا ہے ایک کشمیری گلِ خنداں ہے جس کے ہر ہر ورق سے دامنِ یوسف کی خوشبو پھیلی پڑی ہے۔ آپ ہی فرمائیں میرے جیسا یعقوب مضطرب کب تک اپنے کو جدا رکھ سکتا تھا۔ جرأت کر بیٹھا اور آج غائبانہ طریق سے محوِ ملاقات ہے۔

آپ کا خیر اندیش: حکیم انجم اعظمی)

جناب ٹینگ صاحب!

"تعمیر" کے دو شمارے ملے۔ جون کا پرچہ بھی ملا۔ اس زمانے میں بیمار ہو گئی تھی۔ آپ کو خط بھی نہ لکھ سکی۔ اُمید ہے کہ آپ معاف کریں گے۔ سچ ہے اتنا اچھا پرچہ ایڈٹ کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ کیا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ اتنی دُور رہ کے کشمیر کے بارے میں تفصیلی حالات وہاں کی دُنیا میں کھینچ لاتے ہیں۔ کشمیر میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب، شاعری و آرٹ کے ارتقا کو آپ ایسے فن کارانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں کہ مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے۔ میرا پتہ بالکل صحیح ہے۔

(نجمہ نکہت)

قاضی پور خورد۔ گورکھپور (یو پی)

۵ راکتوبر ۱۹۶۰ء

محترم یوسف صاحب۔ تسلیم! "تعمیر" کا خاص نمبر نظر سے گذرا۔ کافی پسند آیا۔ کشمیر سے اتنے خوبصورت ماہنامے کا اتنا نفیس اور معیاری خاص نمبر نکلنا محبانِ اُردو کے لئے باعثِ فخر ہے۔ اُردو ہر جگہ، ہر طرف جواں ہے حسین ہے، پھول رہی ہے، پھل رہی ہے۔ میں آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، کہ آپ نے اتنا اچھا نمبر نکالا۔ یقین ہے کہ "تعمیر" سے آپ وہی کام لیں گے جس سے زبان، فن اور ادب کا ارتقا ہوتا ہے اور اس میں کشمیر کے بارے میں مزید معلوماتی مضامین اور مقالات برابر شائع کرتے رہیں گے

خلوص کیش: ایم کوٹھیاوی راہی

پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی

۹ ر اکتوبر ۱۹۶۰ء۔ مکرمی یوسف صاحب

السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ ماہنامہ مصوّر "تعمیر" کے تین نمبر یکے بعد دیگرے ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ نہ میں رسید سے اطلاع دے سکا اور نہ رائے پیش کر سکا کیونکہ اس زمانہ میں مجھے بار بار باہر جانا پڑا۔

"تعمیر" کا حالیہ نمبر جولائی ۱۹۶۰ء پیش نظر ہے۔ مضامین کی ترتیب اور تصاویر کا انتخاب ہی اس قابل ہے کہ آپ کو مبارک باد دی جائے۔ جہاں تک کتابت، طباعت اور کاغذ کا سوال ہے، ہر شے اپنی جگہ پر قابل داد ہے۔ کشمیر اور خالد کشمیر کے متعلق اس قدر مواد پہلی مرتبہ میری نظر سے گذرا اور میں نے محسوس کیا کہ کشمیر جنت نظیر واقعی ہندوستان کا ایک جزو ہے اور واقعی اس قابل ہے کہ اہلِ ہند خصوصاً اور اُردو داں طبقہ کے لوگ خصوصاً اس سے دلچسپی لیں۔ بعض مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور ان میں وہ روکھا پھیکا پن نہیں ہے جو عموماً اعداد و شمار کی کثرت سے دامنِ مضمون کو تنگ اور دلچسپی کو ختم کر دیتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر "تعمیر" کے ہر نمبر میں دولتِ خداداد حکومت کشمیر کے متعلق ایک مضمون شائع ہوتا رہے تو ہند اور کشمیر کے ذہنی الحاق میں مزید اُستواری و استقامت پیدا ہو جائے گی اور آپ کا یہ کارنامہ ایسا ہوگا جو عرصۂ دراز تک یادگار رہے گا۔ کوشش کیجیے کہ کشمیر اُردو زبان و ادب کی خدمت

میں کوئی اہم مقام حاصل کرے اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی کوشش کیجئے جو اُردو ادیبوں اور شاعروں کا تبادلہ کرے۔ والسلام

نیازمند: (ڈاکٹر) عبدالعلیم نامی

لکھنؤ، ۷/اکتوبر ۱۹۶۰ء

محترم یوسف صاحب۔ ہدیہ تسلیم

بہرائچ سے میرے ایک شاعر دوست کا خط آیا۔ جس میں انہوں نے خالد کشمیر نمبر میں شائع ہونے والی میری نظم کے متعلق اظہار پسندیدگی فرمایا تھا۔ اس کے بعد جناب مصطفےٰ حسن رضوی اور جناب نہال رضوی سے اطلاع ملی کہ شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ بھی آ گیا۔ ہر دو اطلاعات میرے لئے سبب تحیر بنی جا رہی تھیں۔ اس لئے کہ معاوضہ تو در کنار، مجھے تو اس شان دار نمبر کا دیدار تک نصیب نہ ہوا تھا۔ اور پھر حسنِ اتفاق سے محترم مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے "ادبستان" میں مجھ کو "تعمیر" کا وہ یادگار صحیفہ بھی نظر آ گیا جس کو نگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ چونکہ میرے پاس متذکرہ شمارے کی کوئی کاپی نہ تھی اس سے جب میں واپس ہوا تو موصوف نے از راہِ نوازش وہ کاپی مجھ کو مرحمت فرمادی اور اس طرح جولائی ۱۹۶۰ء کا یادگار نمبر مجھ تک پہنچ گیا۔

آج کے ترقی پسند دور میں جب کہ شخصیت پرستی کا بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا ہے اور اعزاز کی مدح سرائی ناپسندیدہ قرار پا چکی ہے، خالد کشمیر کی شخصیت زندگی، اولالعزمی اور کردار سے متعلق مشاہیرِ اہل قلم کا خراج عقیدت بخشی صاحب کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا بے مثال ثبوت ہے۔

آپ لائق صد ستائش ہیں کہ ملک کے گوشے گوشے کے اہل علم حضرات کی ان قیمتی آرا کو یکجا کر دیا جو فرداً فرداً محفوظ تھیں۔ اب "تعمیر" کا یہ شمارہ ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

پرچے کا حسنِ ترتیب و تدوین انتہائی حسین ہے۔ تصاویر کے ذیل میں دئے ہوئے برجستہ جملے تو خصوصیت سے قابل داد ہیں۔ بخشی صاحب کی تقاریر کے اقتباسات نے اس پرچے کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ ترین غزلیں، ترین قدم، کشمیر کے متعلق معلومات کا ایک ایسا ساگر ہے جس کو آپ نے کوزے میں بند کر دیا ہے۔

حصۂ نثر تقریباً سب ہی اچھا ہے۔ ہر لکھنے والے نے اپنے اپنے انداز اور حوصلے کے مطابق خامہ فرسائی کی ہے۔ حصۂ نظم میں مجھ کو جناب فضا ابن فیضی کی تخلیق "غزالِ کشمیر" بہت پسند آئی۔ لیکن آخری دُعائیہ مطلع کے مصرعِ ثانی پر رُک جانا پڑا۔ مصرعہ کی برجستگی اور روانی اپنی جگہ بہت پیاری ہے لیکن زہرہ اور ناہید ایک ہی ستارے کے دو مختلف نام ہیں۔ اس لئے عطف کے ساتھ "جشن زہرہ و ناہید" سمجھ میں نہیں آیا۔

مجموعی طور پر زیر نظر شمارہ کشمیر کی صورت حال کی ایک ایسی مستند تاریخی دستاویز ہے جس کو ہر شخص بہ حفاظت رکھنے کی کوشش کرے گا۔ میں آپ کو ایک بار پھر اس یادگار تاریخی نمبر کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور "تعمیر" کی توسیع اشاعت کے لئے دُعاگو ہوں۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ فقط والسلام خلوص کار: ساحر لکھنوی

۳۶۔ مالویہ نگر بھوپال

۵/اکتوبر ۱۹۶۰ء

محترم۔ آپ کا خوبصورت، دیدہ زیب اور دلنشین رسالہ ماہ بہ ماہ ملتا رہتا ہے۔ اس عنایت کے لئے ممنون ہوں۔

خادم: گیان چند

ماہنامہ "اودھ پنچ" لکھنؤ

۲۹/ستمبر ۱۹۶۰ء

محترمی یوسف صاحب آداب! بہت خوبصورت بخشی نمبر بھجوانے کا شکریہ۔ دراصل "تعمیر" کا یہ خاص نمبر خالد کشمیر بخشی غلام محمد کی خدمات و خوبیوں کا ایک بہت جامع جائزہ ہے۔ اس کی کامیابی اور آپ کے سلیقہ کی داد نہ دینا میرے بس کی بات نہیں۔ میری جانب مبارک باد قبول فرمایئے۔

کمال احمد صدیقی، نہال رضوی اور ساحر لکھنوی وغیرہ کی نظمیں بہت خوب ہیں خصوصاً کمال احمد صدیقی تو معاف کیجئے گا حاصلِ تعمیر و حاصل مطالعہ نکلے۔

آپ کا ایک قرض اور باقی ہے۔ "تعمیر" شمارہ جون میں اختر انصاری کا مقالہ اُردو ڈرامہ اور انارکلی نہ بے حد پُر مغز مقالہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر آپ اتنے اچھے مقالے اور دوسری تخلیقات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یقین جانیئے پھر "تعمیر" کا مستقبل بہت روشن ہے اور ادب و صحافت کی تاریخ آپ کو کبھی نظر انداز نہ کر سکے گی۔ یہ مقالہ آپ کا معیار بڑھانے کا بہت اچھا شگون ہے

[illegible]

مکرمی یوسف صاحب۔ تسلیم

"تعمیر" آپ خوب نکال رہے ہیں۔ تازہ پرچے کے ٹائیٹل پر تو آپ نے کشمیر کی وادیوں کا عطر نچوڑ دیا ہے۔ پران ناتھ بھی آپ کے ساتھ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ "تعمیر" کو غالباً خالد کشمیر کا بھی التفاتِ خصوصی حاصل ہے اور "تعمیر" کا ان کے مطالعہ میں رہنا بہرحال اُردو کے لئے نیک فال ہے۔ اپنی کامیابیوں پر میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

ایک لفافہ "سونے کی زنجیر" بھیج رہا ہوں۔ غالباً آپ پسند کریں گے۔ بالکل غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہے۔ آپ پورے اطمینان سے شائع فرما سکتے ہیں۔ رسید اور رائے کا انتظار رہے گا۔

نیازکیش: کوثر چاندپوری۔ بھوپال

مسلم لائبریری الہ آباد

۹ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

مکرمی یوسف صاحب۔ السلام علیکم۔ "تعمیر" ماہِ اگست موصول ہوا۔ پوری ڈاک میں سب سے پہلے آپ ہی کا لفافہ کھولا اور سرورق دیکھتے ہی رہ گیا۔ "تعمیر" جس تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ اس کے لئے آپ اور آپ کے شریک کار مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے اس بحرانی دَور میں اُردو کی حیثیت بالکل اُس چراغ کی مانند ہے جو ایک اندھیری رات میں آندھی اور طوفان کے بیچ جل رہا ہو۔ آپ اور آپ جیسے دوسرے ادارے جس طرح فانوس بن کر اس کی حفاظت کر رہے ہیں ان ادبی خدمات کو آیندہ آنے والے مورخین ضرور سراہیں گے۔

شاکر پرشارتی کی "پُر اسرار زمین" عالم صاحب کی وادیِ کشمیر، حامدی صاحب کا "فنی کاشغیری اور نزیش کی ارشاد کا سرقہ اور توارد" قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر حفیظ صاحب کا "تاج محل" جو انہوں نے ساحر صاحب کو ان کی غزل کا مُنہ توڑ جواب دیا ہے، مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ماہ جولائی کا خاص نمبر جو آپ نے خالد کشمیر کی سالگرہ پر نکالا ہے، اس کی کامیابی پر بھی مبارک باد قبول فرمائیے۔ نیازمند: خالد انعام

مسلم لائبریری الہ آباد (یو۔ پی)

اربابِ فن سے معذرت اور اہلِ قلم کو مشورت

یہ پسندیدہ بات نہیں کہ آدمی خود اپنے کو فریب دے۔ اپنے معلوم جہل کو مہمل دعووں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے۔ صرف یہ کہہ کر جان بچالے کہ حسین شعر کے لئے قیودِ فن ضروری نہیں اور اس طرح عمر بھر کے لئے فنی جہالت اور بے راہ روی کی بدعت کا جواز پیدا کرلے۔

اس وقت نہ کسی کے کلام کی تنقیص مقصود ہے نہ تنقید و تبصرہ، مجھے تو ایک بات اپنے ہی متعلق عرض کرنی ہے۔

غالبؔ کی غزل "کسی کو دے کے دِل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو" پر میری تخمیس زیرِ تعمیر تھی کہ ماہنامہ "تعمیر" جنّتِ ارضی کشمیر کا تصور عطا کرنے کو سرینگر سے نازل ہوا۔ میں نے تضمین مکمل کر لی تو فوراً ایڈیٹر صاحب "تعمیر" کی خدمت میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ چند روز بعد اپنے غیر مطبوعہ کلام کو جستہ جستہ دیکھ رہا تھا کہ یہ تضمین بھی نظر سے گزری اور ایک فنی غلطی اس کے ایک بند میں دیکھی۔ ناظرین کی سہولت کے لئے پانچوں مصرعے لکھے دیتا ہوں:

"نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ آنسو رُخ پہ بہتے ہیں
بنامِ آزمائش اہلِ دِل خاموش رہتے ہیں
جو کچھ کہتے بھی ہیں میری طرح اتنا ہی کہتے ہیں
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں!
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو"

تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں ایک ہی قافیہ "کہتے" موجود ہے۔ یہی غلطی۔ سو میں نے اسی وقت ایڈیٹر صاحب "تعمیر" کو لکھا کہ اگر ممکن ہو تو اس بند کی اصلاح یوں فرما دیں:

"نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ آنسو رُخ پہ بہتے ہیں
بنامِ آزمائش اہلِ دِل سَو رنج سہتے ہیں
مگر اکثر وفورِ غم سے دِل میں کہتے رہتے ہیں
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو"

خدا کے لئے بے نیازِ فن سے پُوچھیئے کہ اس فنی فروگذاشت کو قصداً کرنے میں حُسنِ نظم پر کیا آنچ آئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ فن کے قیود کے ساتھ شعر میں حُسن کو قائم رکھنا ہمارے بس کی بات ہی نہ ہو۔ تو پھر اس عجز کی پردہ پوشی کے لئے نظریہ کیوں تصنیف کریں۔ اعتراف کرلیں۔ آنگن کو ٹیڑھا کیوں بتائیں

پأرۍ زان

مظفر عازم

سنہ ۱۹۵۵ء منز یلہِ سانہِ موجودہ دورکۍ واریاہ شاعر پنُن مقام تلاش کرِتھ سو کہِ موکہ ہیتھ اُسۍ چھپیے یہِ اَکِس رسالس منز عازمنۍ گہ ڈرِنج غزل۔ ادبی اجارہ دارَو ترٛوٗد گونژھہ تٔلۍ اشناہ زہ کَس تانۍ بُلۍ بیگ چھُ ارہ سرہ کران۔ یلہِ اتھ ناگرادس نموار ہمیہ نہٕ کینژن بمن زٕگ درہ۔ مگر جلدی پیٚو سارنۍ مانُن زہ کأشرِہ شاعری ہندِس نبَس پیٹھ چھُ اکھ غیر معمولی تارُکھ پٔرزیومُت۔ عازمس گیہِ دٕہ پانژٕسے وٕری شاعری کران مگر از چھُ سہ سانِہ ادبُچ سو ستھ، یمۍ سٕند ناوٕ اتھ یاوُن بخشان تہٕ شہجار پیدہ کران چھُ۔ تمۍ چھِ دوہ ژٕ کینژہ غزل، کینژہ نظم، اکھ اوپیرا (سون کٔسر) تہٕ اکھ بیلے (ہَوَس تہٕ حاصل) لیوکھمُت۔ تہٕ تمۍ سٕند وَنُن چھُ زہِ تس رِچھنہ دوہ ژٕ پنٕنۍ یِم کارنامہ پُورہ پأٹھۍ ٹارِہ کھسان۔
حالانکہ کأشرِہ شاعری ہندین لولہ دالین ہُند وَنُن چھُ زِہ یِہ تمۍ ونیٚک تانۍ وٚونمُت چھُ، سُہ چھُ اَچھِن مَتعَلِق لایق تہٕ کأشرِہ شاعری ہُند کانہہ انتخاب ہیٚکہ نہ تمہِ بغیر پُورہ گژھِت۔

محمد مظفر سپدیوٚ ۱۹۳۴ء منز درمولی ضلعس منز ٹنگر گہ اپور پہن گوٗل پورہِ پیدہ۔ مڈل کلاسنۍ منز اُسۍ اُمس بٔیت لیکھنٕکۍ کیرنِ تہٕ ہائی کلاسن منز اُسۍ اُمۍ ادگرِٕ ہتھو گرٕ کینژہ نظم اُردو زبأنۍ منز لیکھمٕژ۔ سرینگرہ کرِ ایس' پی کالجہ منزہ کوٗر اُمۍ بی، ایس، سی پاس۔ کینژس کالس رٕود محکمہ تعلیمس منز تہٕ از کل چھُ ریشم خانس منز مُلازمت کران۔

عازم ہرگاہ از بردٕنہہ شیہ ستھ وٕری کأنسہ دٔچھمُت آسہِ، سُہ ہیٚکہِ نہ ازتس گوڈنچہ نظرِ پرزہ نأودیٔتی۔ تہٕ کیازہِ تمہِ دوہ اُمس تِمس دأرٕ تہٕ از چھُ سُہ کلین شیو۔ عازم مینٛبنۍ گہ ڈرِنج نظم یوس شایع سپز، تمہ اوس "موت" عنوان۔ تہٕ سو اُمس اُردو ہِسی منز۔ واریاہس کالس پننین تخلیقی صلاحیتن، روایت پرستی تہٕ خیال پسندی ہندین ڈٕبن منز بند کرِتھ اوس عازم بڈٕہ مطمئن مگر زمانکس صدرس یمہ تیز تہٕ تُند گرایہ لگان آسہ، تِمچ ژھٔٹ تِیچ یمن اتہِ گژھ کوٹھرین تانۍ تہٕ عازمنِہ طبیعتک گنڈ آیہ تمہِ مستانہ اندازہ مُژرنہٕ زہ کأشرِہ شعرچ پنبر زلِ سپز مُحال تہٕ شاداب۔
از کل چھُ سُہ روزگارکین کُھرین منز تِتھہ کنۍ ولنہٕ آمُت زہ شعارچ نازنین سپے تس بڈٕہ کرِ کیچھہ وسان منہ ماداں تہٕ نیُن دادِ حاصِل کرِتھ ہیٚکان!

مظفر عازم

اکھ رات

وۄہ شبن ہیوٚت زال وہراوٕن دٕدکو بلبُل کے
از میٚہ چھُم بدنس اندر گردش کران تیزاب زن
از سمندر ہاوسن ہُند گرایہ ماران سپے بہ سپے
از دَما دم ژھالہ ماران شوخ ہوسن ہندو ہرن
از بیتابس وولہ دیوانس حرام آرام گوٚ
از میتیومُت دِل چھُہ گنزراوٕن ہیوٚان پہ انین چھوکن
دم کرِتھ عالم زمین تہٕ آسمان ہگو دُچھنہ خواب
آوسِتھ زن وۄدل جاپکو چرِگشن موتک کفن
کیاہ زٕرِتھ ہیکہِ دِل رٕہِتھ رُوزِتھ چھہ گاٹہٕ کاینات
اللہ اللہ! جود کیاہ کوٚر راتھ ہندی بازی گرن
از چھُہ تنہا شب گزارٕن موت کھوتہ باسان گُدُر
دٕہ گھرس کرٕہ مژ چھینم از قبرِ ہنز حالت شبن
دٕہ یمن نوٚزک ستارن ٹارِ آسن لوٚسمتو
واے کانژھاہ جانوار اتھ اس ہیو گڈہ ہے پکھن
ہاے کانہہ اکھ شب بیدار آسہ ہے یا ہوٚ کران
پھیرہ دِوان کانہہ شودہ پانۍ آسہ ہے پننین کتھن
داہے کانہہ ہمسایہ سُند موصوم شرا گژھہ ہے ہُشار
باشہِ نے کرِہ ہے ژٕ ہا دِیہ ہے ہنا زورسے پہن
داہے تنہائی تہٕ خاموشی دِلس پُٹھ پارہ گو
اکھ صدا ادا، اکھ کتھا، اکھ حرکتا گژھہ ہے کنن
تسلیاہ کرِہ ہا دِلس لوٚت پارِ تراوان آو آو
میوٚن اکھ دیوانہ آلو بوزِ اُمر دِلبرن
پے دو میزان ہُند یتھوی لبہن میہ ہاوس آشہِ رٕسو
ہاوہ ہے شبہ کین سِیہ خانن پنہن دیوار دُسر

مظفر عازم

غزل

کتھ زُلفِ سیاہس دِتی بہوُرِی گنڈ آلو
کتھ نوُرہ بُتھِس صبحیُک ژھاراں چھُہ پرگاشک رَو
سۓ ساؔنی دِواں لولچ دُبراسے زُو لما لن
وۄنہِ شلاں چھِہ گلاب اکثر، اُسی یام نظر ترٲوَو
تِم چشمہِ وُچھتھ صبحن برجستہ یُنبرزل پھوؔلج
یِم چشمہ وُچھتھ شامن تارک چھِہ ژھٹاں پہِ توَ
کیاہ لوٚب نہ دِلن، کیاہ لوٚب، فُرصت چھِہ حسابچ کس
پرتیت، رچھو لوسں، وۄنہ تہٕ خونِ جگر زالو
دِلہ شالِ ستم کوٚنہ، ونیتراوِہ نظر کوتاہ
دُورَو تہٕ چھُہ دِل راواں، سمکھو تہٕ دِلس راوَو
وادس چھُہ ہُرِیرسپداں، شمہس تہٕ چھِہ ریٚہہ تیزاں
یتھ نوُرہ زمانس منز ژھاین چھِہ زیوٗاں پژتو
کمِ آیہِ دِلس راتس شب خون کرن ارماں
وۄنہ لوسہِ دُنوی عازم شیچھِہ باوسنگر مالو

پمپوش

تھیکلِت کھُرژ زُون، مہریُو آسمانچ
زمین اگر ہووُس نانپہ دُن ڈل
حیاتس شوق گو لگہِ میوٗٹھ کرنک
ییُن زوٗ پیش کش تھوُدم، پمپوش جل

سیٚٹھاہ گُذر چھُہ پیواں عاشقس دِلک سودا
جگر ژھینا چھُہ حیابن سناں سناں گاہے
اگرچہِ لول چھُہ پوشس حیاتہِ کِس شبنم
کلاں چھِہ زیوٗ پہِ مُدھر کتھ دناں دناں گاہے

زُزُرہ اژاں چھُہ دِلس رُوح چھُہ مُبتلا سپدان
اگر گلاب مُشک دِن تہٕ بُلبلن ساوَن
سرو دمیانہِ کلامک فدا چھُہ رتس یارس
یُنز اکھ اکھ ادا وناں چھیہٕ یار مُژراوَن

عبدالعزیز ہارون

انسان تہٕ جمالیات

جمالیات چھُ تمہِ کِس فلسفس ناو۔ ہرگاہ بہٕ اَمِچ ژھوٚٹ پاٹھۍ وضاحت کرہ، تیٚلہِ گوٚ یہِ کینژھاہ حسن تہٕ حُسنہٕ کِس علمس سیٖتۍ تعلق چھُ تھاوان، تتھ چھُ وَنان جمالیات۔ یہِ چھُ اکھ حقیقت زِ جمالیاتُک لفظ چھُ سانہِ کاشرِ زبانۍ خاطرہ اکھ نوٚو لفظ۔ یُس نِہ فلسفیو پارٕ دِ زان کران چھُ۔ نہ صرف سانہِ کاشرِ زبانۍ خاطرہ اوٚت بلکہ قریب قریب تمام ایشیاکِن زبانن ہنٛدِ خاطرہ تِ چھُ یہِ نوٚو۔ میانہِ وَنہٕ تُک مطلب گژھہ نہ زانُن زِ امہِ قسمُک لفظ کیاد آسہِ ہا نہ یمن زبانن منٛز موجود۔ نہ یہ چھِنہ ہرگز میوٚن مطلب ز جمالیاتس یُس معنی مطلب تہٕ تشریح آیہِ کرنہٕ تمہِ کوٚر پرٛیتھ مُلکہٕ کِس فلسفس منٛز اکہِ نوِہ بابُک اضافہ۔ گوکہِ جمالیاتُک فلسفہ چھُ سیٹھاہ پرٛوٗن، قدیم یونانی حکیم افلاطون سنٛدِ وقتہٕ تہٕ چھُ ذِکِر میلان۔ وونۍ گوٚ یہِ نہٕ فلسفانہٕ تہٕ عالمانہٕ صورت اتھ از چھےٚ یِمو دآسنس چھےٚ سیٹھاہ کم۔

حُسن زٕوٚد انسانہٕ سنٛدِ علمِ ادراکہٕ کھوتہٕ سیٹھاہ تھوٚد۔ کائناتہٕ تہٕ زانن چھِنہٕ اتھ متعلق کانٛہہ سٔنِکہِ رایہِ قائم کرِتھ۔ یہِ سوال چھُ از تہٕ دُنیاکِن بٔڈِن تہٕ بارَستہٕ عالمن نِشہٕ کُشنہٕ طلب۔ وُنیُک تام چھِنہٕ کائناتہٕ تہٕ یہِ دعوی کوٚرمُت زِ حُسنُک حقیقت کیاہ چھےٚ یا حسن تہٕ حُسنچ دلیل چھےٚ سیٹھاہ مشکل تہٕ حل طلب۔

انسان چھُ فطرتن حسن پرست حسن۔ تہٕ ... چھُ انسانس منٛز اکھ عظیم وراثت۔ یہِ سلسلہ چھُ آدمس سنٛدِ ... وُنیُک تام برابر جاری۔ انسانہٕ سنٛد حسن شناس آسُن چھُ انسانی ارتقاکُک تعمیر

اکھ عظیم کارنامہ۔ قدرتکہِ حسین رنگ و روپک تجزیہ اوٚک طرف ترآوِتھ یلہِ انسان صرف حُسنس تہٕ بدس منٛز فرق کرہ تیٚلہِ سپدہ تمس زندگی ہُنٛد پرٛیتھ کانٛہہ زٕ ... روشن۔ مگہ لگہِ پُزی کِنۍ پننہِ خاطرہ زیادہ تلاش حسن کرنہٕ۔

ہرگاہ اَسۍ انسانی تاریخس کُن نظر ترأوو، اَسۍ وُچھو زِ انسانس چھُ فطرتس سیٖتۍ دۄ پاسہ واسطہٕ پیومُت۔ اکھ یلہِ تمس قدرتچ کائنات وُچھتھ تحیر پیدہ سپُد۔ مگر گوڈنچس منز بوٚڈتھ دوم وحشت، یمہِ تمس منٛز خوف پیدہ کوٚر۔ حیرتک جذبہ سپُد بنائے حُسن تہٕ وحشتن اوٚن خوف و ہراس۔ یمو بدتہٕ ییچھ احساسہٕ ہنٛدِ خاطرہ جائے سٕشیر۔

انسانس پیوٚ پننہِ بقا خاطرہ پرٛیتھ وِزِ قدرتس تہٕ فطرتس سیٖتۍ جنگ لڑُن۔ قدرتہٕ کین سربستہ رازن ہنٛد پےٚ معلوم کرُن۔ زندگی آسان بناونہٕ خاطرہ پٔیس نوِہ نوِہ آزمایش کرنہٕ۔ نوۍ ہتھیار تہٕ سامانہٕ پٔیس گرٕنۍ۔ محنت تہٕ مشقت، کرتھ یہِ کینژھاہ انسان زیناں اوس یا یمو چیزو سیٖتۍ تمس فائدہ وَاتان اوس تِمن نوٚل مگہ ریچھنہٕ تہٕ شیرنہٕ سنبھالہِ۔ دِیان ... پھل چھُ میوٚٹھ آسان لہٰذا یُس پھل انسان حاصل اوس کران، تمیُک ماے اَمِس اَمِس شعورس منٛز محفوظ روزان۔ تہٕ رژھ کھوتہٕ رژھ زیادہ زیادہ ہیُران۔ کُنہِ چیزِچ ماے تہٕ سیٖرن سنبھالن چھےٚ تیلی ممکن یلہِ تتھ کانٛہہ افادی پہلو تہٕ آسہِ۔ حُسن تہٕ چھُ انسانس تموی چیزو حاصل سُبھان یم انسانہٕ سنٛدِ خاطرہ فایدہ مند آسن۔ انسانس چھُ قدرتن ذہنۍ شعور عطا کوٚرمُت، (بنیہ چھنس)

یادداشتُک مادہ تہٕ بخشمُت۔ یُدوَے اِنسانس یہٕ شعور تہٕ حافظہ
آسہِ ہا نہٕ تیلہِ اوس انسانہٕ سُند اشرف المخلوقات آسُن ناممکن۔
کالُک زدٕن تہٕ پکُھچ فکر، نیک وبد، جان تہٕ خراب ـــ یہ سوری ونا
کینہہ چھہ ہیٚکان اُسی تیلہِ وایہٕ اُوت ییلہِ سون یادداشت اسہِ
یاوری کران چھےٚ۔ ہرگاہ یہ یادداشت، یا حافظہ آسہِ نہٕ انسانس ... تہٕ
تخیل چھےٚ تیلہِ بے معنی بنان، تہٕ کیازِہ سون شعور تہٕ حافظہ چھےٚ
سانین تجربن تہٕ مُشاہدن ہُند اکھ عظیم گنجینہ۔ یتھ گنجینس منز
چھہ سائنس ہر تجربس تہٕ مُشاہدس، خارجی محرکاتن ہنز اکھ عتیق
تناسب گنڈ کرِتھ۔ یہ خزانہ چھُ اسہِ حُسن زانُنس منز دستگیری
کران۔ یوہوی چھہ حُسنس پہچانچھ لاوان تہٕ انسانس شہ حیثیتس
بخشان یمہ سیتی سہ حُسنس تہٕ بدس چھُ ہیکان فرق کرِتھ ـــ
یہی شعور دی چھُ انسانس اعمالِ صالح کرناوس پٮ۪ٹھ اُکساوان
تہٕ کیازِہ صالح عمل تہٕ چھُ حُسنچ اکھ تعریف۔ کانسہِ ظلم کرُن،
کانسہِ ہندِ خاطرہ یتھہ کانچھُن، کوتاہ بدصورت فعل چھُ یوان
گنزراونہٕ۔

جمالیاتکس وسیع معنیس منز چھہ تمہ اثرات تہٕ یوان یمہ سائنس
جسم و جانس بیرونی طور متاثر کران چھہ۔ مثلاً نار۔ نار چھُ سانہِ
خاطرہ اکھ ضروری چیز۔ ضروری اوت نہ بلکہ اہم تہٕ لازمی تہٕ۔ یہ تہٕ
چھُ انسانہٕ سنز زندگی قایم تھاونس منز اکھ اہم درجہ تھاوان۔ نارک
تمام صِفت اوک طرف ترآوِتھ اگر اُسی امیوک صرف لوہ کُٹھ ہیوٗ
صِفت نِمون، اسہِ سپدِہ احساس زِہ یہ کوتاہ حسین تہٕ فایدہ
مند چھُ سانہِ خاطرہ۔ مثلاً یہ چھُ وندس منز سائِن بدنس حرارت
بخشان۔ یہ حرارت تہٕ وُشنیر چھُ سانہِ خاطرہ سیٹھاہ حسین تہٕ
ٹوٹھ آسان۔ یوہوی ٹاچھر چھُ اسہِ نارس سیتی اکھ جمالیاتی
داڈھ تھاوِتھ۔ سانہِ خاطرہ چھہ یہ کتھ اکھ اضافی درجہ تھاوان
زِہ نار چھُ کتھ ساعتہ اسہِ زالِتھ تہٕ ہیکان تہٕ زکھ تہٕ ہیکان
واتہٕ نآوِتھ۔ نارچ یہ شکل چھہ یُزی کنہ سانہِ خاطرہ بدصورت ... گر
یہ صورت آسِتھ تہ چھنہ اُسی نارہ کیس افادی حُسنس انکار ہیکان
کرِتھ۔ رُود تہٕ تاپ تہٕ چھہ اسہِ جسمانی راحت بخشان۔ اُسی
تعلیم

رچھہ یمن ہندین اثراتن ہندی عادی آسان بنیمتی۔ سون جسم
یمہ ساعتن یمن ہُند طلبگار چھُ آسان، کیاہ اُسی چھِتہ تمہ
وِزِہ یمن سوری توجہ یہ حاصِل کرنس پٮ۪ٹھ خرچ کران ـــ
اکھ کتھ چھہ ضرور، زِہ انسانی جسم چھُ یمن آہنگ شیٚین ہنزِ خاص
موت... ... صاحب بنان۔ سہ گوی زِہ وندہ سی منز ژھانڈِہ
کانہہ شخص بونہٕ ژنین ہنز نارہ کانگر تہٕ ژنیتہ کالہِ ترزوہ بیہ
شوکھو یآٹھو بونہٕ شہجارس نیٚندرِ۔

قدرتن کیُژاہ حسین چھہ یہ کاینات بناومژ۔ کوتاہ ... ین
سچُن یتھ منز واہراومُت! آسمانس پٮ۪ٹھ نیہ نیہ کرہ ون تارٕ،
یم کوہ تہ بال۔ رنگہ رنگہ پوشِ۔ قسمہ قسمہ جانوار تہٕ یمن جناوارن
ہنزٕ بیٚون بیٚون شکل وصورت۔ اکھ اکِس کھوتہ حسین۔ انسان
چھُ رلاوان۔ یہ سوری کینہہ وُچھِت تہ اُمِس چھُ پیٚوان تسلیم
کرُن زِہ قدرت کیُژاہ حُسن ساز چھہ۔ قدرتک یہ حُسن، یُہُے
انسانس حُسن شناسی ہنز تحریک بخشس تہ حُسن تخلیق کرنک
احساس دوہ یدونس۔

یہ قدرتک حُسن وُچھِت گیہ دُنیاہکی مشہور سائنس دان
تہِ سہہ حیرانگہ۔ ڈاروِن یُس ارتقاہکہِ نظریُک مُبلغ تہ آدم چھُ یوان
مانہٕ، چھُ تسلیم کران زِہ "قدرتن یُس حُسن بنومُت چھُ، سہ
چھنہٕ سوری کُنہ مخصوص حیاتیاتی مقصدہ خاطرہ وجودس منز
آمُت۔" ڈاروِن چھُ اتھ دلیلہِ یہ مِثال پیش کران زِہ مور
یُس جاناوارن منز خوبصورت چھُ یوان گنزراونہٕ، یمِس قدرتن
سیٹھاہ سُند نقش و نگار چھہ بناوِہ متہٕ، امہِ نقش گری تہٕ
خوبصورتی ہندی کیاہ فایدہ چھُ مورس پننِس ذاتس واتان؟
ہرگاہ اُمِس یہ رنگ وروپ آسہِ ہا نہٕ، کیاہ یہ اوسہِ ممکن زِہ
یہ نسل کیاہ گژھِہ ہا ختم؟ نہ تہٕ گژھِہ ہا نہ کینہہ! ڈاروِن تہٕ امہِ
پایک باقی عالِم چھہ یہ کتھ تسلیم کران زِہ یہ مورہ سُند حُسن
یا باقی جانوارن ہُند رنگ وروپ چھنہ پانے یک مُشت پیدہ
گومُت بلکہ چھُ فطرتس کرورہ بدین وریِن ... نتیجہ۔
یہ اکھ مسلہ چھُ وُنہِ حل طلب زِہ حُسن ... آہنگ،

ترتیب تہٕ امیُک میزان کراَو وجوٗدس منٛز؟ تِم کیاہ اسباب اَسی یِمَو سیتی یہِ پیدہ گو ـــــ یِمن سوالن ہُند جواب چھُ دُنیہِ سابہٕ علمہٕ تہٕ اِدراکہٕ نِشہٕ سیٹھاہ دوٗر، لیکن شہٕ دِوہ چھُنہٕ دوٗر، یلہِ انسان یِمن سربستہ رازن ہُند آگُر تہٕ دریافت کرِ۔ یہِ اکھ کتھ چھےٚ حقیقت زِ دُنیاہچ پرٛتھ کانہہ چیز، چاہے چرندہ پرندہ آسِن یا گُل لوٚلہِ، یِم تمام چیز چھِ اکھ جمالیاتی صورت تھاوان۔ تھوٚدی پاٚٹھی ونِو یہِ زِ یتھ زِندگی ہنٛز قوٗت کام چھےٚ کران تتھ چھُ یہِ حُسن لازوال موجود۔ یِہوٗے حُسن چھُ زِندگی ہندِس بقاہس تہٕ تمِس پوچھرس جاے شیران تہٕ زندگی قایم تہٕ دایم تھاوان۔

قدرتُک حُسنِ لازوال اوٚک طرف ترٲوِتھ وُچھو اَسی انسانس کُن، یُس پانہٕ تہِ چھُ تخلیقِ حُسن کران۔ محنتہٕ مشقت کرِتھ چھُ عظیم تہٕ تخلیق کران، یِمَو سیتی زِندگی ہُند کرچھر تہٕ تمیوٗک توچھ چھِ سیٹھاہ مدس تام گژھان۔ یہِ کتھ چھےٚ مینہ گوڈےٚ بیان کرٛم زِ حُسن چھُ اکھ احساسِ صالح، یُس انسانس شہٕ عمس چھُ کرہ ناوان یِمہ سیتی تمس پانس کانہہ آسہِ وزان چھہ۔ یہِ آسایش چھِ مختلف قسمچ آسان۔ ذہنی، فکری تہٕ روحانی۔ سنگلاخ زمین، سنگستانس آب پھیرتھ گُل تہٕ گلزار ووہ پداوان چھُ انسان پننِس جسمانی راحت تہٕ آسایشہ مندِس زُمرس منٛز شامل۔

سنگتراشی، شعروشاعری تہٕ مصوری چھِ انسان پننِس ذہنس تہٕ روحس سیتی تعلق تھاوان۔ یہِ تخلیق چھِ انفرادی حیثیتس منٛز باعمل یوان۔ انفرادی حیثیتس منٛز یِمہ کراماتھ زِ انسان کران چھُ تہِ چھےٚ اِجتماعی حلقہٕ تہٕ اِدراکہٕ اثر کینہہ تہٕ آسان۔ فرق چھُ صرف انسانی دماغن ہندِس ساختچ۔ اکھ فن کار چھُ پننین تخلیقاتن منٛز پنُن کسبُک نوٗر ورتاوِتھ تہِ پنُن خوٗنِ جگر خرچاوِتھ عام لوکن بروٚنٛہہ کنہِ پنُن کانہہ فن پارہ تھاوان۔ اَسی چھِ تیٚلہِ امہِ فن پارچ قدر کران یلہِ سہٕ ساینن احساساتن تہٕ جذباتن سیتی ساینس احساسِ جمالس تہِ متاثر کرِ۔

سون احساسِ جمال یا سانٛہ جذبات چھِ تیٚلی حرکتس منٛز یوان۔ یلہِ فن کارن سانٛہ صالح ترجمانی آسہِ کرٕمٕژ۔ یہِ تہِ چھُنہٕ ضروری زِ فن کارہ سند فن یا تمیُنٛز تخلیقات کیاہ گژھن عام انسانس نکرہ ترٛاوُن۔ یا فن کار کیاہ گژھہ عام لوکن ہُنٛد خیال تھاوِتھ کانہہ چیز تخلیق کرُن۔ یہِ کوشش چھےٚ عموماً اوٚژھ تہٕ ناکام روزان۔ یتھس ادبس منٛز چھُنہٕ جمالیاتی حُسن تہٕ پیدہ ہیکان سپدِتھ۔

فن کار تہِ چھُ انسانی سماجس منٛز تعلقُوی اکھ فرد، یتھ بُیاکھ اکھ انسان آسان چھُ۔ مگر اَکِس عام انسانس تہٕ فن کارس چھُ اکھ بڈ بارہ فرق۔ سُہ گوو یہِ زِ فن کار چھُ عام انسانو کھوتہٕ زیادہ حساس تہٕ ذہین آسان۔ قُدرتن چھُ اَمِس حُسنچ بصیرت زیادہ عطا کرٕمٕژ۔ ہرگاہ نہٕ فن کارس حُسن شناسی ہُند مادہ زیادہ آسِہ، تیٚلہِ اوس ناممکن زِ کانہہ کیاہ ہیکہِ نہٕ کانہہ تخلیق کرِتھ۔ یِمہ سیتی بُیاکھ متاثر آسہِ گژھان۔ فن کار پننِس شخصیت شعور تہٕ وجدان چھُ ہیٚکان کینہہ تہٕ کرِتھ۔ سُہ چھُ سماجس رونٛہہ پکنچ تیز وُنی تہِ ہیٚکان دِتھ۔ جمود تہٕ انتشار تہٕ ہیٚکان پیدہ کرنچ کوشش کرِتھ۔ ہرگاہ زن فن کار صالح انسان اوس، تہٕ چھُنہٕ کانہہ تژھ تخلیق کران یِمہ سیتی زمانچ رِوہ بیٚیہ وقتہ کینہہ ضرورتن منٛز کنہِ قسمچ درنگی گژھہ۔ امہِ قسمہ کینہہ فی کارن ہُند فن چھُ اسہِ پژہ پاٚٹھی ذہنی تہٕ روحانی غذا میسر کران۔ امہِ منٛز چھُ سون ذوقِ جمال تہٕ شوق یوان تہٕ سانِس فکر و عملس منٛز تہِ چھِ اکھ نوٚو حرکت پیدہ گژھان۔

فنچ اکھ صنف چھِ شاعری۔ شاعر چھُ عام بول چالہِ ہندین لفظن خاص ترتیب دِوان۔ تیتھے پاٚٹھی یتھہ پاٚٹھی منٛز موختہ پھلین اکِس مالہِ منٛز ترتیب سان گنڈان چھُ۔ لفظن منٛز یہِ ترتیب چھِ شعر بنان۔ یہِ شعر بوٗزِتھ اَسی وُنی، روحانی تسکین تہٕ اضطراب انسانس منٛز پیدہ گژھان چھُ تتھ کُس ہیکہِ انکار کرِتھ۔ یہِ سوٗدٕ دِی چھُ تیٚلی ممکن یلہِ شاعرن انسانی جذباتن ہُند سیٹھاہ عمیق مطالعہ آسِہ۔ قارٕی تہِ چھُ

تیٚلی مُتاثر گژھان یِلہٕ تمِس رُوحانی سکونس سیٚتۍ سیٚتۍ احساسِ جمالس تہٕ آبیاری سپدِ۔

ووٚنۍ کرو بۍ انسانہٕ ہنٛزِ جسمانی محنژ تہٕ جمالیاتس متعلق کینٛہہ عرض۔ شعر وشاعری یا مُصوری وجودس منٛز ییٚنہٕ برونٛہہ اوس انسان پننِ فن کاری ہٕنٛد مظاہرٕ تمن ضرورتن منٛز کران یِمہٕ تمِس فوری آسہٕ۔ غار یا گوپھ بناونہٕ۔ گٔلین پٔیٹھ لسنہٕ خاطرٕ جایہٕ ہناہ بناونۍ۔ انسان یہٕ کینٛژھاہ بناوان اوس، تتھ اوس سیٚتۍ سیٚتۍ وقتچہٕ ضرورژ مُوجوب تبدیلی تہٕ کران۔ یہٕ تبدیلی کرنس منٛز اوس حُسن پیدٕ گژھن اکھ ضروری امر۔ یہٕ کتھ چھہٕ سائنس تجربس منٛز آمژ زِ ہرگاہ اَسۍ کالہٕ کِس کنُس پٔیٹھ نوٚو عمارت بناوَو سو چھہٕ زیادہ خوبصورت تہٕ حسین آسان۔ کانٛہہ چیز بناوُن تہٕ لُہراوُن، لُہراوِتھ نوٚو سرو بناونس منٛز نوٚو انداز تہٕ نوٚو حُسن پیدٕ کرُن چھُ صرف حضرتِ انسان سٕندین خاص صِفتن منٛز شامِل۔ یہٕ صفت چھُہ انسانس تہٕ باقی جان دار مخلوقن منٛز اکھ بُڈ بارہ فرق قایم کران۔ انسانی اوت چھُہ سہٕ جان دار مخلوق یُس پرٛیتھ کانٛہہ تخلیق چھُہ آیندہ نسلن ہنٛدِ خاطرٕ کرِتھ تھاوان۔ بظاہر چھُہ پرٛیتھ کانٛہہ تخلیق وقتی ضرورت یا تحریک وجودس منٛز اننٛک بنا بنان۔ باقی مخلوقاتن کُن ہرگاہ اَسۍ نظر کرَو، تِم تہٕ چھہٕ پننِ ضرورتہٕ خاطرٕ داریاہ کینٛہہ بناوان۔ یُس تِہنٛزٕ محنژ ہٕنٛد سیٹھاہ خوبصورت نمونہٕ آسان چھُہ۔ مثلاً "ٹُکر" ٹُکر چھہٕ سیٹھاہ محنت کرِتھ گھن بناوان۔ یُس بناوٹ کِہ لحاظہٕ سیٹھاہ خوبصورت آسان چھُہ۔ یہٕ چھُنہٕ ناہنٛہ تہٕ بنیوٚمُت زِہ اَکِس گنس منٛز کیاہ کران تِمہٕ ہند نسل درنسل سکونت۔ یتھے پاٹھۍ وُچھو اَسۍ بارہ ژرِہ یا کنٛجہٕ۔ یِم تہٕ چھہٕ پنُن اول سیٹھاہ محنت تہٕ مشقت کرِتھ بناوان۔ گر یہٕ مشقت چھہٕ صرف وقتی آسان۔ انسانی اوت چھُہ سہٕ، یُس پانہٕ بناوِتھ پانہٕ چھاوِہ تہٕ آیندہ چھُہ تراوان باقین ہنٛدِہ چھاونہٕ خاطرٕ۔ یہٕ ساری جسمانی محنت کیازِہ چھہٕ اسہٕ خوبصورت تہٕ حسین باسان۔ یہٕ حُسن کیاہ سنا چھُہ سائنس محنتس منٛز؟ اتھ سوالس چھُہ یہٕ جواب زِہ

انسان یہٕ کینٛژھاہ محنت تہٕ مشقت کران چھُہ، سہٕ چھُہ سراپا حُسن گرٕیس ہٕند زمین لاگُن۔ حیاتِ انسانی خاطرٕ غذا میسر کرُن۔ اَکِس وودُرہ ہٕند کیرٕ ووٚنُن تہٕ انسانس تن ولُن چھُنا تخلیقِ حُسن۔ یہٕ کینٛژھاہ چھہٕ تیٚلی مُمکِن یِلہٕ انسانس یمن چیزن ہنر یا امہٕ محنژ ہنر ماسے تہٕ محبت آسہٕ۔ ووٚنۍ گو یہٕ زِہ انسانی سماجن چھُ انسانس منٛز سہٕ تفریق پیدٕ کوٚرمُت یمہٕ سیٚتۍ انسانی مشقژ ہٕند حُسن چھُ عیب گوٚمُت۔ محنت چھہٕ صرف ضرورت بنیمژ۔ اَکِس کاشت کارہ سنٛز محنت یا مِلہٕ ہندِس مزدورہ سنٛز محنت چھنہٕ تمِس سہٕ رُوحانی سکون واتناوان یمیُک سہٕ دراصل طالب چھُ۔ سماجی پستی تہٕ بلندی چھُہ انسان مختلف توہماتن ہٕند شکار بنوومُت۔ یُہوی وجہ اوس زِہ از تام اوس حُسن یوان اکھ غیبی چیز مانہٕ۔ نہٕ اوسُس سانہٕ بُزرگن سیٚتۍ کانٛہہ تعلق یوان تھاونہٕ، یہٕ کتھ مُشراوِتھ زِہ یُس چیز انسانی دُنیاہس پیداوار چھُ سہٕ کیا زِہ بنیوٚد؟ غیبی یا تصوری؟ ہرگاہ اَسۍ یہٕ کتھ پوٗرہ پاٹھۍ یاد تھاوَو زِہ حُسن چھُنہٕ شُے یُس اَسۍ کُنہِ لوٚنگنس منٛز رٹو یا حُسن چھُنہٕ صرف تصوری، خیالی اوت، تیٚلہٕ سپدَو نہٕ اَسۍ تمن غلط تصورن ہٕند شکار یِم حُسنس متعلق بیان چھہٕ یوان کرنہٕ۔

یہٕ چھہٕ اکھ حقیقت زِہ حُسن چھُنہٕ کُنہِ تصورُک ناو بلکہ چھُ حسین تہٕ خوبصورت چیزن ہٕند مٲکارہ وجود آسان، یمو سیٚتۍ اَسۍ اکھ سہٕ معیار قایم چھُ کران یتھ حُسن چھُ ناو۔ سماجی تفریقن چھُ انسانہٕ ہٕند ذہن تتھ حدس تام واتنوومُت یتہٕ انسان اوس حیوان ووٚنۍ انسانیتس تہٕ تیاگ دِلون۔ مثلاً زنانہٕ تہٕ مردہ ہٕند رشتہ چھُ پاک احساسن پٔیٹھ قایم آمُت کرنہٕ۔ سہٕ گوٚ یہٕ زِہ یِم چھہٕ دوٚن شوٗرے اَکِس رِشتس منٛز اَژِتھ شریکِ حیات بنان۔ پرٛیتھ کُنہِ ژوٚکِس مُدرس چھہٕ دوٚن شوٗرے شانہٕ داران۔ ایکن سماجی تفریق چھہٕ یہٕ رِشتہ یمن معنی ین منٛز نوان۔ امہٕ سیٚتۍ چھُ تصورِ حُسن تہٕ تبدیل گوٚمُت۔ جاگیرداری احساسِ حُسن چھُ زنانہٕ متعلق بدلی۔ تِم چھہٕ زنانہٕ ہندِس رنگ و رٗوپس اکھ

قسمُک مول کران۔ تِمن نِشِش چھُ زنانہٕ صِرف یوٚہوی درجہ نِہ پیٚچھ مردو شند طبیعت خوش کرنہٕ خاطرٕ پیدہٕ گومُت۔ اَتھ برعکس یِلہِ اَسو گریستس کُن نظر ترٲوان چھِ، یِمن ہِندِہ اِزدواجی رِشتُک معیار تہٕ احساسِ حُسن تہٕ چھُ بیوٚن تہٕ بدل۔ تِم چھِنہ زنانہٕ ہِندِیٚن اَتھن تہٕ کھورن ہِندِس زاوِی جارِس تھتھ پانٕٹھو وُچھان یِتھ پانٕٹھو اَکھ جاگیردار وُچھان چھُ۔ تِمن نِشِش چھہ زنانہٕ شریکِ حیات آسنس سیتو سیتو شریکِ کار تہٕ آسان۔ یُمِس مردِس دوش بدوش کامہِ کار آسان چھُ کرُن۔ پیٚہ محنت تہٕ مشقت کیپارٕی ہیٚکِہِ تِم زاوِی جار سوچِتھ پیٚنٹھ

گریستس آمادٕ گرِتھ یِم بیکار جاگیردارس وِلس منز دٲدیان رِچھہ۔ اَمُوس پیٚنٹھ کرِہ بہ یہ عرض زِہ حُسن، نیٚر تہٕ حقیقت چھُ سورُوی کینہہ اِنسانہٕ ہِنزِہ زِندگی ہِنزِن آزمٲیشن ہُند ثمر۔ قُدرتن یِمہٕ مجبوٗری انسانس پیٚنٹھ عاید چھہ کرِہ مٕژہ، چاہے تِہ فطرت کہ طرفہٕ آسِس یا سماج کہِ طرفٕ یِن خلاف رُود انسان مردانہ وار لڑان تہٕ میدان ماران۔ یہ انسانن دِنیُک تام زِیوٗن تیٚیُک اَکھ میوہ چھُ فن کاری۔ فنی چھُ اِنسانس پیٚنہِ اظہارِ حُسنُک بوٚڈ بارٕ ذریعہ۔

حدیثِ دیگراں (بقیہ از صفحہ ۵۸)

جب کہ قصور ناچ میں ہو۔

بہرحال اگست ۱۹۶۰ء کے "تعمیر" میں میری یہ تضمین "نذرِ غالب" کے عنوان سے ۴۲ اور ۴۳ صفحوں پر شائع ہوئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میری استدعائے اصلاح یا تو مدیر صاحب تک پہنچی نہیں یا دیر سے پہنچی۔ یعنی اُس وقت جب رسالہ طباعت کے اتنے مدارج طے کر چکا تھا کہ اصلاح ناممکن تھی۔ خیر، ناظرین چاہیں تو اپنے اپنے یہاں اصلاح فرما سکتے ہیں۔

پھر ایک روز مجموعۂ غیر مطبوعہ میں تضمین نظر سے گذری تو ایک جگہ کچھ معنوی اُلجھاؤ سا معلوم ہوا۔ ذیل کے بند میں ملاحظہ کیجئے اور جس طرح وہ اُلجھاؤ دُور کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ مطبوعہ بند حسب ذیل ہیں:

جو تم سے کہہ رہا ہو یہ کہ میرے دِل میں آجاؤ
اُسی اِک خام کارِ عشق سے یہ بات فرماؤ
گریز اچھی نہیں پھر بھی محل کہنے کا جب پاؤ
یہ کہہ سکتے ہو ہم دِل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دِل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

میں نے اپنے یہاں یوں بنا لیا ہے:

"زباں پر جلوہ افروزیِ دِل کا ذکر کیوں لاؤ
کسی اِک خام کارِ عشق سے یہ بات فرماؤ
گریز اچھی نہیں لیکن محل کہنے کا جب پاؤ
یہ کہہ سکتے ہو ہم دِل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دِل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس بند کو بھی ناظرین درست فرمالیں تو اچھا ہے۔

محض تصحیح مقصود نہیں بلکہ یہ چند سطریں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ اہلِ نظر کی دِلچسپی کا باعث ہوں اور اشاعت کے لئے نگارشات بھیجنے سے پہلے اُس پر غائر نظر ڈال لینے کا مشورہ اہلِ قلم کو دیں۔

(مانی جائسی)

اَترُ (بقیہ از صفحہ ۷۰)

... تہٕ یِلہِ سو شوٚنُخ تمہٕ وِزِہ اُس پانٕسی سیتو وَنان "بے صبرِس اَنِتس کینتھہ۔"

صُبحس نِکہ نِکہ گاشہِ ڈراس بہٕ کنہ فوٚٹ شال ہیوٗ گمرہ۔ وُٹِس منز یِرِتھ وُچھِم موٚختہ اوٚرہ یوان ... ... بہٕ وُچھِتھی زن گو تمِس اَسن پیٚراہ ... تہٕ نیٚنٹھ ہاوان دِژن کُنی ژھال۔

مُحی دِین بیچارٕ چھُ دوٚدٕ میٲنیٚن گھنن ہِنزِہ بلایہِ لوٚگمُت۔ اَتھِہ بلایہِ تھُت!

(بشکریہ ریڈیو کشمیر سرینگر)

غلام احمد حکاک مُقبلی

گوڈنیُوک چھوٗت وال

گوم ستس نظرِ والاہ آمتُوی چھنژرس اندر
ژوگ شُشرُ میانِس دِلس زن یاونہٕ کِس تژرس اندر

کیاہ خبر ہیٚتھ آکھ والو وارِہ وارَے ونہِ سے
کیاہ معیبت یُت پیٚومُت چھُوی تِہ آکھ چھنژرس اندر

آکھ ہیٚتھ شیٖنِچ سفیدی تحفہ زن سردی اُنِتھ
اوس میٚہ یاوُن شولہٕ ماران سینہٕ کِس سنیرس اندر

نار دُہہ ؤن چھُم جوانی ہنٛد میٚہ وُنہِ بدنس سیٚٹھاہ
آکھ یُد تو تے نہٕ باسان ییہ سُہ وِہرُ شرس اندر

حالِ دِل والو میٚہ کُن اظہار کرمو وایہِ کر
آیہِ آسے تیر ہیٚو گوہم سُنِتھ جگرس اندر

چھم دِس منز ستھ سیٚٹھاہ سوران میٚہ چھم نے اکھ ذراہ
آو کو چونٹھاہ زُژ خبر ہیٚتھ چھُس دپان سنزرس اندر

چھکُ تِہ کیاہ مرنچ نشانی زندگانی کیٚوتھ جواب
ماٗزِہ نم چھم چھُس بوہ وُنہِ زن یاوہ نہٕ کِس مژرس اندر

ہیہِ تقرِہ مے آکھ ترادنہِ ہاے وَن چھے کیاہ نیت
چھوٗی کرُن کیاہ ژھایہِ رُوزِتھ متہٕ کِس گنیرس اندر

گٹہِ منز والو ہلالاہ زاکھ وٗالنِجہ گاشس پیوم
ہیٚژ میٚہ فرقاہ وہ ذکرِ نی ایزِس تہٕ یزرس اندر

نااُمیدی ہێتھ ژٕہ آہم موکرُم سے کم ہِمت !
خم وُچھِت پٮ۪ون کیاہ کمر میوٚن ملیٚپۍ ہجرٕس اندر

چھُس ہوان ہمت یقین چھُم زیٚٹھ چھِم سے زِندگی
پرٕیٚن ہارت مہ کر گیر میٚہ اثرٕس اندر

چھم فوٚلے میٚہ پوشہِ باغس سُنبلن آمت بہار
ڈوٹھ تراوِنہ آکھ کیازِ سے آکھ یوٚت قہرٕس اندر

عشقکِس نارس اندر بوٚ ولنہٕ یِوان صبح وشام
ژھو ماران چھُس بوٚ وُزنِہ یتھ یاونہٕ کِس مزرٕس اندر

مسولن ہُند ہول تَے بیٚنہِ گُل روغن ہُند چھم میٚہ لول
چھُم میٚہ یادُن شولہِ ماران چھُس نہ کینٛہہ بجرٕس اندر

گوس رٕہِتھ ہیٚکنہ شہتھ محرم پچھُسے یا عید چھم
ژھِسے وُچھِت یکدم لوٚگُس سنیرٕس تہ بیٚنہِ تھزرٕس اندر

کیاہ سہ دراکھ زان ڈوٹھ تراونہِ سونتہ کیٚن گلزارنی
طوطہِ ہیُو بولان بوٚ اوسُس زِیوٚ لِجم کجرٕس اندر

چھُس قوی ہِمت بوٚ مُقبِل میانی یم سرد وسمن
گُل تہٕ گلزار یاسمن سُنبل نہ آسے چھٕژرٕس اندر

محمد یوسف ٹینگ

اَثَر

دفتر دراِمتِس اوس واراہ کال سپُدمُت۔ ہوٹلس منز چاے چیتھ تہٕ کیاہ کھیتھ اُس اسہِ کُل دُنیاہچ غیبت کرُمژ۔ مگر وۄنۍ اُسی نیرٕ تہٕ کینژ۔ محی الدین اوس وۄنۍ پرٛاپھ کرِتھ تھوکمُت۔ کینژس کالس رُودُس بہٕ تہٕ بکواس ونان۔ مگر محی الدینس اُس کُل دراِمژ۔ سُہ وۄتھ یاشاہ کرِتھ تہٕ کاڈاہ کڈِتھ لوٗگ ونن:

"وۄتھو نیبرٕ ہا نیرو۔ ییٛہو ییٛہو ہا گیہِ آرہ کیٛتو۔"

میٛہ تہٕ لوٗگ نہٕ کینہہ چارہ وۄتھس۔ مگر منتھ تھوٗم محی دینسی۔ "آہنو یکو۔ تٔرٛۍ ہا گوڈٕ مِزازہ کیٛوٚتھ تانۍ ہیو۔ دیوٕہ پھیرٕ سیتو ٹھیک گژھکھ۔"

محی دینن کوٗر زیوٹھ برٛور زن تہٕ اُس نہٕ تس میانہِ ہمدردی ہنز پرٛوٚدمی رُوز ہژا!

تہٕ وۄنۍ اُسی اُسی سڑکن پیٹھ بلہِ تہٕ بے مقصد چکر کران۔

انہٕ گٹہٕ لج گژھنہٕ۔ ماگچہ تیزٕر ہیٛژھ اُڈجن خبر ہیٛنو۔ محی دین تہٕ زن اوس ماحولکو پاٹھو ہیٛنڈ رپوٚمُت تہٕ کوکرپوٚمُت۔ سُہ اوس وُڈٕ وُڈٕ گھرٕ نِکھ ژھننہٕ یژھان۔ کَوٕ عارٕ بھرٕ ژٕو نظرٕو میٛہ کُن وُچھان۔ یتھٕ کنۍ کٹھٕ کھش کرن وأنِس پژِھس نظر تراوان چھُہ۔

وۄنۍ دَپو زِہ میٛہ اوس نہٕ تمُسند یہٕ حال پتاہ۔ بہٕ اوسُس وارہ پاٹھو زانان زِہ سُہ چھُہ میانِس پیرس تانۍ فاش پرَان تہٕ ہرگاہ تس چلہٕ سُہ دیہ ہے میٛہ سوٚتھہِ پیٹھہ دکہِ دِتھ بوٚن ونیتھہِ منز دأرِتھ۔ مگر راتھ کاپچ کتھ یلہِ میٛہ یاد آس پیوٚان، میٛہ زن اوس وأنجہ وۄمکمر ہیوٗ لگان تہٕ بہٕ اوسُس محی دِنس زیادہ چیرہ تعمیر

کھپ کران۔ سُہ اوس پراگندہ زِہ از کیاہ گیہِ میٛہ ہنگ منگ تمُسنز کھپ ہشی۔ برٛونٹھ زٕنہٕ ڈبل پونسہ خرچان چھُس۔ از اوس میٛہ سُہ چاے چومُت تہٕ کیاہ کھیومُت۔ برٛونٹھ زٕنہٕ آنکارکرنہ دراۍ کانہہ کتھ چھُس کران۔ از اوسُس بیٛیہ تہٕ بیٛنہِ کمتھن ٹلانی کران تہٕ دِرٛس دِوان۔ برٛونٹھ زٕنہٕ تس سیتو گنٹس سوزان اوسُس تہٕ کانہہ نتہٕ کانہہ ہیتھ کرُتھ اوسُس تس موچھو منزہ ژلان۔ از زن اُسکھ میٛہ تمُسنز ماے پھیرٕ پھیرٕ ژھننژ۔ بہٕ اوسُس نہٕ سُہ کنہٕ صوٗرتس منز چھیڑان۔ زن تہٕ اُس راُم تہٕ راتس منزٕ میانۍ ساأرۍ اُگڈرن بدلیمژ تہٕ از اوسُس بہٕ بالکل تبدیل گومُت۔ مگر پزر گوٚ یہ زِہ راتھ کیٛوٚتھ اوس نہٕ کانہہ ملکھ وۄتھمُت یُس میٛہ وۄدمہ سیتو سرٛان کرِتھ مِزازہ بدلی کرُمژ اُس، بلکہ کتھ چھیٚ یہ زِہ بہٕ اوسُس نہٕ کُنہِ حالتس منز کُن زوٚن یژھان روزُن تہٕ سہٕ اوس ژھو پہٕ کرُن یژھان۔ تہٕ کیاہ زِہ یتھہِ پاٹھو اُس راتھ کاپچ دلیل بیٛنہِ یک دم اُچھن برونٛہہ کنہٕ وۄتلان۔ تہٕ زن آسہم ریٛیہ تیلان۔ یہ ژٕنیتس پیٛتھ اوس میٛہ بُتھس نِدامتک وۄشلُن کھان تہٕ شرمندگی سیتو زن اُسم عرقہٕ ڈول پھرِتھ ژھنان۔ امہِ عذابہٕ نشہٕ بچنہٕ خأطرٕ اوسُس بہٕ محی دِنس عذاب کران۔ یُتھ زن تس سیتو کتھ باتھ کرِتھ بہٕ اصل کتھ گانگہِ کرِتھ ہیٛکہ ہا۔

موٚکتس تہٕ میٛہ گیہِ وۄنۍ نتیہ وُری نیتھر کرِمتس۔ تہٕ خُدا لاسہ تاوِنۍ تمِن۔ اسہِ چھی وۄنۍ زِہ گُل برونٛہہ کنہٕ گندان آسان۔ تہٕ یم سانہٕ سارے ماٹھو جگر بنیمتو۔ راتھکیس اَثر میٛہ سپدُ تہِ کنہٕ ماکرِیوم نہٕ باور۔ مگر ایمانچ کتھ چھُہ یہ زِہ آدکیٚن وۄہن

ٻار مون تقتنس پاڻس برجسته پيلي اُس، ٻار تپسندو روخسار ڏجهٽ
وه زلين ڏونطين تي رنگ ڏلان اوس تي ٻار تپسنزن اُچن هنز
اکه گرانے شراب خمڪ نشه کهالان اُس، تن وه هن ٿي اوشس
بہ ابيره گبيرو ساني تس ملے هيران. تي دڇين کهوفري ڏڏ ڊ ٿو
ٻار نه کانهه ٿو ٿو بوزن پيهنے، اوه اوشس تس کن اُيچو
ته اڃهہ تلان. وه ز گو سه کش رُون ڪري زن پس نه پنهنڊ لو کيچ
تہ لاوه مهرينهہ لوب کن پنهنڊ لوک اعتراف کرنا وه. نير
پرانين چهه کن کريو تنه منزه کياه نيره! وڻن چڇم يه زه دوريمار
هيچ ده ز ميڻ دارياه کينهه مغرور وٽ. ته ازکل هرگاه اُسو باڙ
زه تنها ته روزو، تته ڇي ميڻ مون ختنه گراوه ته وه ش بوزڻ
پيوان. کجا تم ماڙي مندي دوه زه هرگاه هيره پنهنڊ داڙي وڏوکه
هيڻ بوزنه پيه هے، اُسو اُسو لو منزس گوره گوره کرڻ هيوان.
تہ کجا اُزک منوس دوه زه پيڻوي اُسو اکه اُکس نشه لوب کن
بيٺو ته تمڙ هيڻ ته ٻن کانهه اند روٽ ڇهانڊنهہ غاطره کانسه شرو
سند هيتهہ هيوان. ميڻ گو کتاب پرنس ٿو ٿو. ته ٻه کسان
آيه چاره نه ته لسته کيڙ هيوتُن ڏهه نيرُن. اوره چلے يه بے وايہ
پانٺو زيوه هنز کرتل ته جنگهه تيمنبره پيرٽن تيزونهہ. يه نار چڇ
تيلي زهنيته گزهان. ٻار زن ده يو طرفو منزه اکهاه گانبته ميداُ
منزے ٽلان چڇ. اوتره راڃ ديل ڇه زه کته تاڻي لو کيچ
کته پنهنڊ گيه تمُس ته ميڻ تکرار. تمه هنگونڊ اوره وه هوه کاره ته
ميڻ هيڙه تس پتين شتمين خبر. تمه وزه پنهنڊ اُس ايه کته
ته اُومڙ... ... مگر راته جو نتنس —— خدا زانهہ يه کياه
سيپہ. يه کيته کيڙ سپد!

کته ڇه نه خاص کينهه تہ. پنهنڊ احمقاڻي پنهنڊ ڇس بہ اسان
تہ تہ ودان تہ. کالچ کبته کهنيته اُسو اُسو بهته کتهاه کتهاه
کران. سيڊيو اوس وڏان. ته والده اُس اُکس کنجس منز خبر کته
کُمرس وارسے کمرُ انان. ٿاٺو ميٿ اوس جيره سوٺاه سوٺاه
دوان تہ چکره هندس زير ومبس سيتو که گو وان. ميانڻ لوکٹ
پنهنڊ مريم اُس يوکن بهته موزه وونان. ته شري اُسو کهنيته

چهنيته گو بيهو. مگر ليفه تل اُزهته آسو يڏ بغريته پهرو گيزش کران.
سون همايه محمدشاه اوس چکر بوزنہ شاهي آمُت. مگر وه ڏ
اوس چکر بوزنه بدلو پنهنڊ مسخري هند کمال تقيکه ناوان ـ بہ
اوشس تمُندہ مسخري کمو تہ زياده تمُسنزه بيقلاڙي پنهنڊ اُندري
اسان. ميڻ ما چهم پتاه زه هي دم آسن يم ماڙے ميڻ پانسي تُسنو
ٿلمان. ته محمدشاهنو زمين تبع خرچ منز گزهه اکر تيهه جنگ هريڻ
پميوک وه تل هاو بہ پانز آسہ. ميڻ ڏچهو کيڙ اُس کي ڏور موخته
کانگره هيته بهته. تپسنده بتچهوک نب اوس وڏنہ چارته تہ منزه
منزه اُس سه ميڻ کن دو دلہ نظرن هندي تير چلاوان. تمُ اُس
بکه ٻشر بنيان اکهس منز پرتُز تہ اته سيتو اُس ٻگهاره سرو کران.
مجلس اُس مزس منز... ... تہ ميانڻ نيت بالکل سلامت.
يکدم گيه اَنہ گٺ... زن ته ٿهنو گرڊ هندي ٻنن گاشچ
نازل اُچهو ٹهڙارس منز ٹيننگه لاً دته. ريڊيو هس زن تہ چيوُ ر کهر
هوٹ... ... بجلي اوس کياه تانڻ گڏمت... ... امہ هنگه مگه
حادثه کيڙ گيه محمدشاهس اُکس بزنس ٿهوپه تہ ٹانگو صاٻنزجيره
هند گرُ گرُ تہ گو سوٽ هيو. مگر گو ڈنکہ فرنيڊ نشه نيريته هيڙن
جيره هنز تُمک نار بنيه وزنڻ تہ محمدشاه تہ گو سوزس ييته ٹرن
هندي بنگول بهاٹ وان. ... امي وزه زن آيہ ميڻ لٹه هش...
دِلس منز وُزهم رائے ته ڏچهن کون هيوتُم سارُن... محمدشاهس
آنکار کران کراُني ودتُس بہ موخس نشه... تہ زن تہ ٹهوٹ
اسن کهنگالو هند بم. بجلي اُس آمڙ. موخته اُس ڏتهو پيمز تہ ميانڻ
وِٹھ اُسو تمُسندنن وٹن سيتو ناٹلي نال گيمتو. ته ميڻ زن
اوشک نيٺو نيٺو آب پهريته ڙهونمُت.
تہ پهمنه واره خبر زه پنهنڊس کنٹهس منز کته کيڙ ودتُس...
مگر اور داتهي ڙهنيم اُڏنگه دندس تل تہ بے خبري منز لاگ تهته
تيوته ڏوپ زه سزکيه ڙچم نيريته... ... بجلي هيتر زن اُس
ميانہ بے وقوفي پنهنڊ ٹھاه ٹھاه کران. يکدم دبود ميڻ سوزچ تہ
بلاے گرم وفاه. ليف کلس پنهنڊو هنيته اوشسر بہ اُندري گلان.
... ڙہ تموهته تراپه... سو اُس لو تہ لو تہ کهکهاره ماران. (بقيه بر صفحه ۲۶)

پروفیسر عبدالاحد جان

رباعیاتِ عمر خیام

کشیری منظوم ترجمہ:-

از دی که گذشت هیچ ازو یاد مکن
فردا که نیامده است فریاد مکن
بر نامده و گذشته بنیاد مکن
حالی خوش باش و عمر بر باد مکن

تراوُن راتُک دوہ مہ کر تمیُک یاد
پگہکہ دوہ ہر کُوی بے سوُد چھُ فریاد
کیاہ ہُرِ تھ تہ لیُس گوٗ تہٕ، یینہٕ لیُس نہٕ آو
حالا خوش ژٕہ روز، کرمہ عمر برباد

دریاب که از رُوح جُدا خواهی رفت
در پردهٔ اسرار، فنا خواهی رفت
مے نوش، نہ دانی از کجا آمدی
خوش باش، نہ دانی بکجا خواهی رفت

وقتاہ غنیمت زان، رُوح چھُ ژلہ وُن
رازہ کین پردن منز، فناہ چھُ سیدُن
مے چیٗتہٕ، کیاہ چھے زان، کتہٕ آکھ ژٕ ری
خوش روز، ژانان چُھکھنہ کوت چھُ داتُن

در هر دشتی که لاله زاری بوده است
از سرخیِ خونِ شهریاری بوده است
هر شاخ بنفشه کز زمین میروید
خالی است که بر رخ نگاری بوده است

ہر کُنہ میدانُک، یوہے لالہ زار
باوان چھُ شاہ سندہ خونُک مونجار
بنفشُک پوشاہ، یُس زمینہٕ منزہ دراو
اوسمُت بُتھہ کُنی چھُ خالاہ شوبہٕ دار

افسوس که نامهٔ جوانی طی شد
وان تازه بهارِ زندگی دی شد
آن مرغِ طرب که نامِ او بود شباب
فریاد ندانم، که آمد و کے شد

افسوس گذریوو سہ یاوُنُک چکہ چاو
بیتِھ سہ تازہ زندگی ہُند بہار تہٕ موکلیاو
بولہ وُن سہ جانور، یُس ناو اوس شباب
ہائے ہائے! زونُم نہٕ، کتہٕ آو تہٕ کوت دراو

گویند بهشت و حورِ عین خواهد بود
آنجا مے و شیر و انگبین خواهد بود
گر ما مے و معشوق گزیدیم چه باک
چون عاقبت کار چنین خواهد بود

رچھ وتان آسہٕ تتہٕ جنت تہٕ حُورِ عین
میہ مانچھ تہٕ دودہ کی آسن سگونی
کیاہ چھُ ڈر، رَٹ اگر اسہٕ ویٚے و معشوق
یلہٕ یوہے کار کُنی انجام چھُ مین یقین

از بودنی اے دوست چه داری تیمار
وز فکرتِ بیهوده دل و جان افگار
خرم بزی و جهان بشادی گزران
تدبیر با تو نہ کرده اند، اول کار

سپدہ یُن چھُ سپدان، کیاژٕ چھکھ غم ہیوان
ناحق فکرہ منز، چھکھ دِل تہٕ جان گالان
خوش خاطرن، زندگی پنُنی ژٕ در جہان
وٕنہ پتہٕ ژٕ صلاح کیاہ کرکھ، کیازٕ چھکھ تالان

نئے بھارت کے معمار

تعلیم تعمیر ترقی



شری ابیل وانن کو ۱۹۵۹ء میں جو قومی اعزاز دیا وہ بے سبب نہیں تھا۔
شری ابیل وانن ریاست مدراس میں واقع ضلع جنوبی آرکاٹ کے قصبہ ورکل پٹی میں بورڈ ... کے
ہیڈ ماسٹر ہیں اور پچھلے تیس برس سے تعلیم کو فروغ دے کر ملک کی تعمیر و ترقی
میں لگے ہیں۔ اُن کی لگن سچی ہے۔ کامیابی نے اُن کے قدم چومے۔ انہیں
کوششوں کے نتیجے میں ضلع کے کتنے ہی اسکول اب توسیع پا چکے ہیں پہلے جہاں اُن میں
پڑھاتا تھا، اب وہاں متعدد اُستاد تعلیم دیتے ہیں۔ یہی نہیں، اس نیک کام میں گاؤں
واسیوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔
شری ابیل وانن بڑے ان تھک کارکن ہیں۔ اُنھوں نے اپنے اسکول میں بچوں کے
کھانے کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔ ان کی اعلیٰ اور گراں قدر خدمات کو جس درجہ سراہا جائے کم ہے۔
شری ابیل وانن جیسے سرگرم کارکن ملک کی افزوں ترقی کے لئے میدان ہموار کر
نئے بھارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

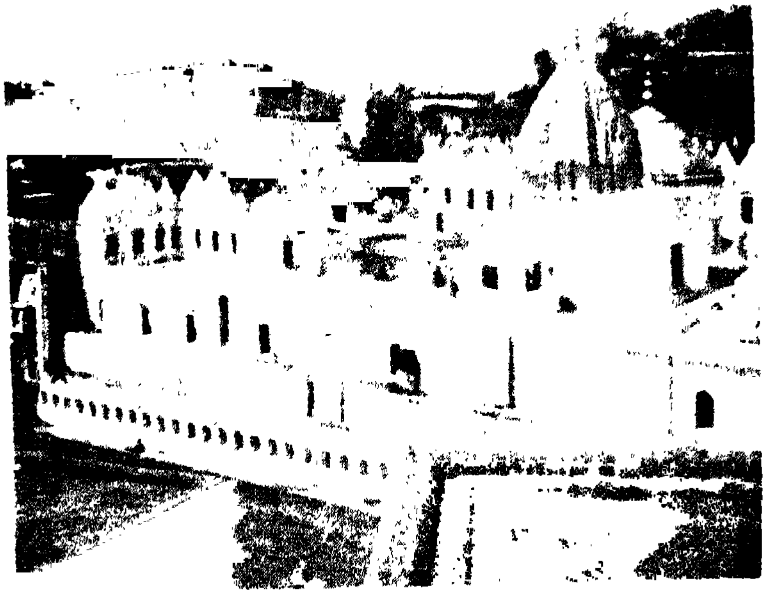
پلان سے مضبوطی

پلان سے خوشحالی

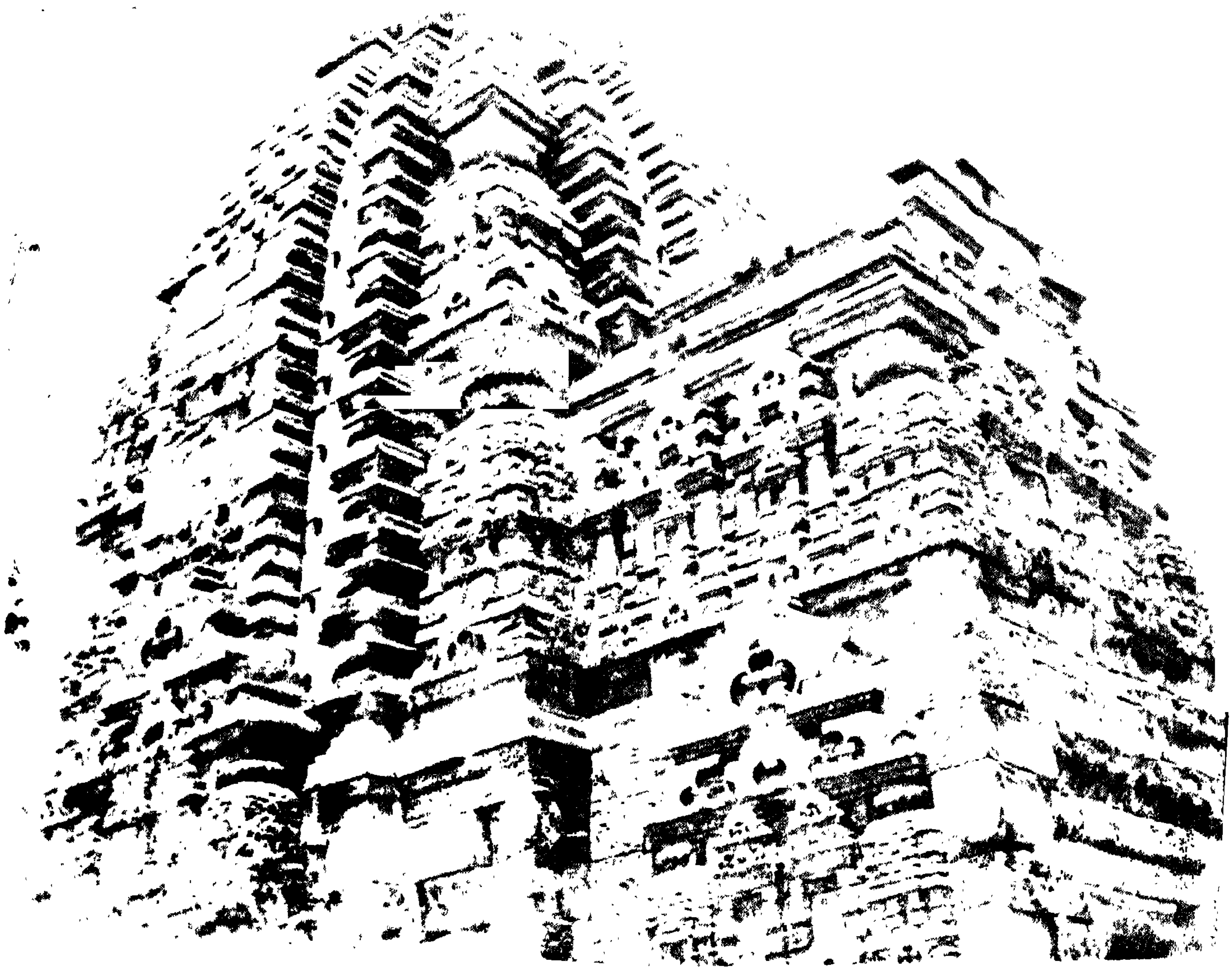
پلان کو کامیاب بنائیے، محنت سے بچت سے

چمبہ و بھرمور کے مندر

رگھو ناتھ مندر



کرمچی کا مندر






ماهنامه
تعمیر
سرینگر



دیدهٔ و دل فرش راه..

ماہنامہ سرینگر

جولائی ۱۹۶۱ء

جلد ۶ —————— شمارہ ۳۰

جنرل ایڈیٹر
جے۔ این۔ زتشی
ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے — سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط و کتابت کا پتہ:-
محمد یوسف ٹینگ ایڈیٹر ماہنامہ تعمیر سرینگر

[illegible] پریس میں چھپوا کر [illegible] سرینگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

۵۴ قدم منزلیں

۱ سیاسی اور جذباتی الحاق کی تکمیل

(۱) ۶ فروری ۱۹۵۴ء کو ریاستی آئین ساز اسمبلی نے ۱۹۴۷ء میں ہند سے کئے گئے الحاق کی توثیق کی۔

۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کو صدر جمہوریہ ہند نے اپنے حکم کے ذریعے ریاستی دستوریہ کو شرفِ منظوری عطا فرمایا اور ریاست کے تاباں ماتھے سے غیر یقینیت کے منحوس سایے چھٹ گئے۔

(ب) ۱۹۵۷ء میں ریاست مالیات کے سلسلے میں حکومت ہند کے انتظام میں شامل ہوگئی۔ اس طرح سے مالیات کے سلسلے میں ہماری ریاست ملک کی باقی ریاستوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہوگئی۔ ان میں پانچ سالہ منصوبوں اور دوسرے معاملات سے متعلق مرکز سے رقوم کا حصول بھی شامل ہے۔

(ج) ریاست کی اعلیٰ سروسوں کا مرکزی انتظامیہ اور پولیس سروسوں سے ادغام۔ اس سلسلے میں ریاست کے افسران کا پہلا گروپ مرکزی وزارت داخلہ کے تحت تربیت حاصل کرکے خدمات انجام دے رہا ہے۔

(د) ریاست کی شمالی زونل کونسل میں شمولیت۔ اس طرح سے ریاست اور اس زون کی باقی ریاستوں کے درمیان تعاون کا رابطہ بڑھ گیا ہے۔ اور ترقیاتی اور انتظامیہ کاموں میں ایک دوسرے کی سہاتیا کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔

(ہ) ریاستی اکاؤنٹ اور آڈٹ محکمے کا مرکزی آڈیٹر جنرل کی طرف انتقال

(و) مرکزی عدلیہ کے دائرہ اختیار کی ریاست پر توسیع

(ز) مرکزی انتخابی کمیشن کے اختیارات کا ریاست پر نفاذ

(م) کشمیر میں داخلے کے لئے پرمٹ سسٹم کی تنسیخ

۲ جمہوری آئین کی تکمیل اور نفاذ

مسودہ کمیٹی نے نئے آئین کا مسودہ ۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء کو ریاستی آئین ساز یہ میں پیش کیا۔ مہینوں کی گرما گرم بحث کے بعد ۱۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو منظور کر لیا گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو شادیانوں اور جشن کے درمیان اسے ریاست میں نافذ کیا گیا۔ آئین کے بدایاتی اصولوں کے مطابق ریاست کے تمام باشندوں پر بلا تمیز مذہب وملت، رنگ ونسل اور طبقات کے ایک بہتر اور خوش حال زندگی کے لئے مساوی مواقع بہم کرنے کی ذمہ

تعمیر

دی گئی۔ ایک سوشلسٹ طرزِ زندگی کا سماج تعمیر کرنے کا عزم کیا گیا اور معاشی فلاح اور سماجی عدل و انصاف کی گارنٹی دی گئی۔ آئین کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو ابدی اور حتمی لحاظ سے ہندوستان کا لازم و ملزوم حصہ قرار دیا گیا۔ آئین میں اس بات کی صریح وضاحت کی گئی کہ آئین کی اس دفعہ میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی۔

۳ بے گھر لوگوں کی آباد کاری

ریاستی حکومت نے مرکزی سرکار کی امداد و اعانت کے ساتھ ان تیس ہزار مہاجرین کی باعزت بحالی کے کام کو بخیر و خوبی تکمیل تک پہنچایا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے مظالم اور تشدد کے تحت ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ پاکستانی حکمرانوں کی بہیمیت کی وجہ سے خالی ہاتھوں صرف جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آج یہ لوگ پورے طور پر آباد کئے گئے ہیں اور ریاست کی معاشی تعمیرِ نو میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دس کروڑ روپے کا صرفہ کیا گیا۔

۴ بدنام مجوزہ سسٹم کی بیخ کنی

۱۹۵۳ء میں بخشی صاحب نے قلمدانِ وزارت سنبھالتے ہی بدنام مجوزہ سسٹم کی تنسیخ کا مژدہ ریاستی عوام کو سنایا۔ مجوزے کا یہ ظالمانہ انتظام غلامی کے بدترین دور کی سیاہ یادگار تھا۔ جس کی بنیاد جبر و قہر پر قائم تھی۔ مجوزے کی تنسیخ سے کشمیری کسان کی پیٹھ اس بارِ گراں سے آزاد ہو گئی جس سے اس کی کمر میں خم آ گیا تھا۔ یہ قدم اتنا انقلابی اور جرأت مندانہ تھا کہ بعض پختہ کار بھی سمجھتے تھے کہ حکومت کا ڈھانچہ مجوزہ کے بغیر دھڑام سے گر پڑے گا۔ مگر واقعات نے بخشی صاحب کی دور اندیشی اور انقلابی فراست پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ جب کہ مجوزے کی تنسیخ نے زرعی نظام میں ایک نئی تازگی کو جنم دے دیا۔

۵ دورِ غلامی کے قرضے کی تنسیخ

مطلق العنانیت کے دور میں اس وقت کی حکومت نے کشمیری کسانوں کو پابہ زنجیر بنانے کے لئے ایک ظالمانہ قرضے کا دام پھیلایا۔ جیسے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق کواپریٹو قرضے کا نام دیا گیا۔ اس پر سود در سود کے پھندے چڑھائے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس کسان نے ایک سو روپیہ قرض حاصل کیا وہ برسوں تک اس سو کے بدلے کئی سو روپے داخل کر کے بھی سود در سود کے اس جال سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اس پر طرہ یہ کہ جب کبھی اس کے پاس "بقایا در بقایا" داخل کرنے کے لئے کوئی روپیہ نہ ہوتا تھا تو اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے اور بے چارہ کسان حیران کہ وہ فریاد لے کر جائے تو کہاں جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۵۳ء میں جناب بخشی غلام محمد نے وزیرِ اعظم بنتے ہی اس بے حد گھناؤنے قرضے کی معافی کا اعلان کیا تو کسانوں کے چہرے فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے۔

۶ بہتر تجارت کے لئے سہولیات

مطلق العنانیت کی ایک اور مکروہ یادگار سسٹم کے نظام کا اجرا تھا اور اس کے ساتھ مختلف خواہ مخواہ قسم کے کنٹرولوں کی بھرمار بھی۔ ان پابندیوں کے بوجھ تلے ریاست کی ابھرتی ہوئی مگر کمزور تجارت کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسی لئے بخشی صاحب کے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالنے پر ان پابندیوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور تجارت کو پھلنے پھولنے کے بہتر امکانات مہیا کئے گئے۔

۷ جواہر ٹنل کی تکمیل

ریاست کی قومی شاہراہ یعنی جموں سرینگر روڈ پہ درۂ بانہال پر زبردست برف باری کی وجہ سے سرما کے مہینوں میں وادیٔ کشمیر باقی ملک سے کٹ جاتی تھی۔ بارہوں مہینے ٹریفک چالو رکھنے کے لئے پہاڑ میں پونے دو میل لمبی سرنگ لگائی گئی۔ جس کے پہلے ٹیوب کا افتتاح دسمبر ۱۹۵۶ء میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کیا۔ یہ ٹنل جو تین کروڑ روپے سے زیادہ کی لاگت سے تیار ہوا ہے، انجینئرنگ کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس سے نہ صرف سال بھر ٹریفک چالو رکھنے کی سبیل نکل آئی ہے بلکہ پہاڑی سفر کے ۱۸ نہایت ہی تکلیف دہ میل گھٹ گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان ۱۸ میلوں کی بچت کی وجہ سے ہر سال صرف پٹرول کی صورت میں ایک کروڑ پانچ لاکھ روپے بچ جایا کریں گے۔ اس اندازے میں موٹر گاڑیوں کی خستگی کا عوض شمار نہیں ہوا ہے۔

۸ مفت تعلیم، حیرت انگیز تعلیمی ترقی

۱۹۵۳ء میں وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوتے ہی بخشی صاحب نے تعلیم کو مفت اور لازمی بنانے کا اعلان کیا۔ آج صورت یہ ہے کہ ریاست میں پرائمری سے لے کر پوسٹ گریجویٹ جماعتوں تک تعلیم مفت ہے۔ اس معاملے میں کشمیر باقی ملک سے نمایاں طور آگے ہے۔ اس طرح سے ریاست کے ہر ایک باشندے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مساوی موقعوں کا دروازہ کھل گیا ہے۔ جہاں ۱۹۵۰-۵۱ء میں تعلیمی بجٹ ۴۹ء۲۳ لاکھ روپے پر مشتمل تھا وہاں ۱۹۶۰-۶۱ء میں یہ رقم ۰۹ء۲۲۷ لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) ریاست میں پچھلے کئی سالوں میں تعلیمی اداروں کی تعداد میں سو فیصدی سے زائد اضافہ ہوا ہے۔

(۲) ریاست میں سال کے ہر دن ایک نیا تعلیمی ادارہ وجود میں آتا ہے۔

(۳) دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام تک ریاست میں ۲۹۱۰ پرائمری سکول، ۲۴۵ سکنڈری سکول اور ۱۲ کالج قائم ہو گئے تھے۔ جہاں ۱۹۵۱ء میں طلبا کی تعداد ۱۳۲۰۰۰ اور ۱۹۵۵ء میں ۲۰۶۰۰۰ تھی وہاں یہ تعداد پچھلے سال ۲۸۳۰۰۰ تک پہنچ چکی تھی۔

ریاست میں آل انڈیا سکنڈری ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات پر کثیر مقصد نوعیت کی سکنڈری درجوں کی تعلیم کو نافذ کیا گیا جہاں پیشہ ورانہ اور فنی کاروانہ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

ریاست میں اساتذہ کی تربیت کے لئے چار پوسٹ میٹرک تربیتی سکول کھولے گئے اور سات ریفریشر کورس منعقد کئے گئے تاکہ اساتذہ تازہ ترین تعلیمی رجحانات و میلانات سے باخبر ہو سکیں۔

سکولوں اور کالجوں کے پس ماندہ جاتیوں اور غریب طلبا میں ۵۰ء۵ لاکھ روپے کے وظائف تقسیم کئے گئے۔

سکولوں میں بہتر تعلیمی تجربوں کے فروغ کے لئے دو بصری سماعتی یونٹ قائم کئے گئے۔

چھ لاکھ روپے سے زائد یوتھ ویلفیئر سکیموں پر خرچ کئے گئے۔

کسی حادثہ کا شکار ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہو جانے کی صورت میں سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ یا ان کے لواحقین کو مالی امداد دینے کے لئے بہبودی فنڈ کا قیام۔

لائبریریوں کو فروغ دینے کے لئے مختلف اقدامات

تعلیمی کوڈ کا اہتمام اور ضلع سطح پر تعلیمی نظام میں نئی شاخوں کا وجود۔ تعلیم نسواں کا فروغ۔

۹ فنی تعلیم

سکنڈری ہائی سکولوں میں پیشہ ورانہ تعلیم کا تعارف

سرینگر اور جموں میں دو صنعتی تربیتی اداروں کا قیام، جہاں موٹر میکانزم، چھینٹ سازی، سُناری، نجاری اور ٹوکریاں بُننے کے کام کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ریاست میں دو پالی ٹیکنیک وجود میں لائے گئے ہیں جہاں سول، الیکٹرک اور میکنیکل انجینئرنگ میں تین سال کے کورس پڑھائے جاتے ہیں۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت ہر ضلع کے صدر مقام پر ایک پالی ٹیکنیک قائم کیا جائے گا۔

سرینگر میں میڈیکل کالج کا اجرا

سرینگر میں انجینئرنگ کالج کا قیام

سرینگر میں سکول آف ڈیزائن کا وجود

ایک آیورویدک اور ایک یونانی کالج کی شروعات

سرینگر اور جموں میں دو زراعتی کالج کام کر رہے ہیں

تیسرے منصوبے میں جموں میں میڈیکل کالج کا قیام

۱۰ جموں و کشمیر یونیورسٹی

ریاست کی یونیورسٹی جو آج سے کئی سال پہلے تک محض ایک امتحانی ادارہ تھا، اب ایک اقامتی اور تدریسی ادارے میں تبدیل کی گئی ہے اور اس کی عمارات نسیم باغ سے متصل ایک پُر فضا ماحول میں تعمیر کئے گئے ہیں جو کشمیر کی اعلیٰ تعلیمی روایات سے ہم آہنگ ہے۔ اس یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر ہندوستان کے عظیم تاریخ دان اور ماہر تعلیم سردار کے ایم پانیکر ہیں۔ اور یہاں اس وقت چھ شعبوں یعنی انگریزی، ریاضی، اُردو، ہندی، طبقات الارض اور اقتصادیات میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے شعبہ جات کے لئے ہندوستان بھر سے بہترین اُستادوں کو بُلایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی مزید توسیع و ترقی کے لئے حکومت کئی سکیموں پر عمل کر رہی ہے اور اسے ایک عظیم تعلیمی ادارہ بنانے کا عزم خالدِ کشمیر کئی مرتبہ دُہرا چکے ہیں۔

۱۱ کھیلوں اور جسمانی تعلیم کا فروغ

ایک صحت مند ذہن کے لئے سب سے بڑی ضرورت ایک صحت مند جسم کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے جسمانی تعلیم اور کھیلوں کی طرف پوری توجہ دی جا رہی ہے۔

سرینگر میں بارہ لاکھ روپے سے زائد لاگت سے سٹیڈیم تعمیر کیا گیا ہے

جموں میں کھیلوں کے سٹیڈیم کی تعمیر زیر تکمیل ہے

ریاست کے ہر ضلع کے صدر مقام پر سٹیڈیم تعمیر کرنے کی تجویز پر جلد ہی عمل شروع ہوگا

نیشنل کیڈٹ کور کی تنظیم۔ ایک ہزار سے زیادہ کیڈٹوں نے تربیت مکمل کر لی ہے اور اس وقت ۸۶ آفیسر اور ۳۷۹۳ کیڈٹ زیر تربیت ہیں۔

.۱۵،۷۷ روپے کی لاگت سے مختلف کالجوں میں نیشنل کیڈٹ کور کے ۱۵ رائفل یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ اس تنظیم کا ایک ہوائی سکواڈرن اسال

رواں میں قائم کیا جا رہا ہے۔

کھیلوں کو سائنٹفک ڈھنگ سے بڑھاوا دینے کے لئے ریاست میں سپورٹس کونسل اور صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر میں دو پراونشل اولمپک ایسوسی ایشن قائم کئے گئے۔ رواں مالی سال میں سپورٹس کلب کے لئے ۱۴۰۰۰ روپے کی منظوری بین الریاستی ٹورنامنٹ اور میچوں میں شمولیت۔

پہلگام، گلمرگ اور دوسرے مقامات پر یوتھ ہوسٹلوں کا قیام جہاں ہر سال نوجوانوں کے کیمپ منعقد کئے جاتے ہیں۔

۱۲ صحت عامہ کی سہولیات

۱۹۴۷ء میں صحت عامہ کے سلسلے میں ریاست میں فی کس خرچ ۴۷ نئے پیسے تھا۔ آج یہ خرچ ۲.۰۸ روپے تک پہنچ گیا ہے۔

ریاست میں ٹائیفس اور ملیریا کی بیخ کنی

چیچک، تپ دق، کالرا اور دوسری بیماریوں کے خلاف مہمیں

سرینگر کے صدر ہسپتال میں دو سو بستروں اور جموں کے ہسپتال میں ڈیڑھ سو بستروں کی ایزادگی۔ دونوں ہسپتالوں میں ایکس رے اور سرجری کے جدید ترین سامان لگوائے گئے۔ دونوں ہسپتالوں کے آپریشن تھیٹروں، زنانہ امراض، آنکھ، ناک اور گلے کے شعبوں کو جدید آلات سے لیس کیا گیا۔

شفاخانوں کو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھنے کے انتظامات

ہسپتالوں کے تربیت یافتہ عملے میں سو فیصدی اضافہ۔ کٹھوعہ، ادھم پور، راجوری، اننت ناگ، بارہ مولہ اور لداخ میں ہسپتالوں کے لئے نئی عمارتوں کی تعمیر۔ ضلع ہسپتالوں میں ۳۰ بستروں، ایکس رے یونٹ، کلینیکل لیبارٹری اور باؤلے کتوں کے کاٹے کے علاج کا انتظام۔ ۲۳ ہیلتھ سنٹروں اور ۱۶ ہیلتھ یونٹوں کا قیام۔ اس کے علاوہ ۱۳۵ انگریزی دواخانے، ۱۲۵ یونانی اور ۹۰ آیورویدک دواخانے بھی کام کر رہے ہیں۔

ضلع میں متعدی بیماریوں کو روکنے کے لئے ایک ہیلتھ آفیسر، دو سینیٹری انسپکٹروں، دو ویکسی نیٹروں اور چار فیلڈ ورکروں کی تعیناتی۔

خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز کا قیام

جموں اور سرینگر میں دماغی امراض کے ہسپتالوں کا قیام

۷۰ لاکھ روپے کی لاگت سے سرینگر میں نرسنگ ہوم کا قیام۔ جس میں ۲۵ بیمار بیک وقت داخلہ پا سکتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنے والا ہر بیمار اپنے علاج کے لئے من پسند فزیشن یا سرجن منتخب کر سکتا ہے۔

تیسرے پانچ سالہ پلان کے تحت ہر ۷۰۰۰ کی آبادی کے لئے ایک ڈسپنسری کا قیام

۱۳ مزدوروں کی بھلائی

خالد کشمیر کی قیادت میں قانون ساز یہ نے لیبر ایکٹ منظور کیا جس میں مزدوروں کی بہبودی کے لئے حکومت نے واضح ضمانتیں اور سہولیات بہم کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ مزدوروں کی فلاح کے لئے سات ویلفیر مرکزوں کا قیام؛ جہاں مزدوروں کو مندرجہ ذیل سہولتیں حاصل ہیں:۔

(۱) طبّی امداد: اس سلسلے میں ڈاکٹری مشورہ اور وٹامنوں کی مفت تقسیم شامل ہے۔

(۲) مزدوروں کے لئے کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی بہم رسانی

(۳) مختلف کھیلوں کے لئے اہتمام

(۴) سیر و تفریح کے انتظامات

(۵) مزدوروں کی بہتری کے لئے تقریباً دس لاکھ روپے دوسرے منصوبے میں خرچ کئے گئے۔

(۶) مزدوروں کے لئے ہاؤسنگ سکیم پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے

۱۴ پسماندہ طبقوں اور دلت جاتیوں کا سُدھار

ریاست میں پس ماندہ طبقوں کے سُدھار کے لئے وسیع پیمانے پر اقدامات کئے گئے

(۱) دوسرے پانچ سالہ پلان کے تحت اس غرض کے لئے ۹۵ ر ۳۸ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔

(۲) ۱۷۸۶۰ طالب علموں کو وظیفے دئے گئے۔

(۳) جموں، رنبیر سنگھ پورہ، بھدرواہ، کٹھوعہ اور کنگن (کشمیر) میں پس ماندہ طبقوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس تعمیر کئے گئے۔

(۴) ۸۲۹ خاندانوں میں فی خاندان ۵۰ روپے، ۱۵۰ خاندانوں میں فی خاندان ۲۰۰ روپے اور ۱۰۵ خاندانوں میں فی خاندان ایک سو روپے کی امداد تقسیم کی گئی اور ۲۶۱۵ خاندانوں کو بیل، آلاتِ کشاورزی اور کیمیاوی کھاد خریدنے کے لئے امداد دی گئی۔

(۵) رنبیر سنگھ پورہ، دھنسل، چان اور بین اور ترال (کشمیر) میں گھریلو دست کاریوں کے چار مرکز قائم کئے گئے۔ جہاں ترکھان، چمڑے اور بُنائی کا کام کیا جاتا ہے۔

(۶) ۴۳۸ مکانات تعمیر کئے گئے۔ جس میں جموں میں صفائی کرنے والوں کی کالونی بھی شامل ہے۔

(۷) ۳۷۲ خاندانوں کو مکانوں کی مرمت کے لئے نقد امداد دی گئی۔

۱۵ ذرائع آمد و رفت کی ترقی

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت سڑکوں کی ترقی فی ہزار میل پہلے منصوبے کی بہ نسبت ۳ ۶ ر ۰ میل کے حساب سے بڑھی ہے۔ چنانچہ اس وقت تک

۲۴۶۶ ر ۵۰ میل لمبی سڑکیں اور ۲۰ عظیم پل تعمیر کئے گئے ہیں۔

۱۰۶ ر ۲۸ لاکھ روپے کی لاگت سے لیہہ کرگل روڈ کی تکمیل

کشتواڑ اور دوسرے دور اُفتادہ علاقوں تک سڑکوں کی تعمیر

تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت جموں اور سرینگر کے درمیان ڈھائی کروڑ روپے کی لاگت سے مُغل روڈ کی تعمیر کا کام شروع۔

۱۶ آبپاشی کی بہتر سہولیات

۱۳۲۲۰۱ - ایکڑ زمین کو بہتر آبپاشی کی سہولیات کی وجہ سے زیر کاشت لایا گیا۔

جموں میں ۱۳۰ ر ۰۸ لاکھ روپے کی لاگت سے پرتاپ نہر کی تکمیل کا کام جاری۔

تیسرے منصوبے میں ۴۴ ر ۲۴۴ لاکھ روپے صرف آبپاشی کی چھوٹی سکیموں کے لئے مخصوص رکھے گئے ہیں۔

۱۷ زرعی میدان میں کامیابیاں

پہلے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے وقت میں اناج کی پیداوار میں ۱۰ لاکھ من سے زیادہ کا اضافہ۔

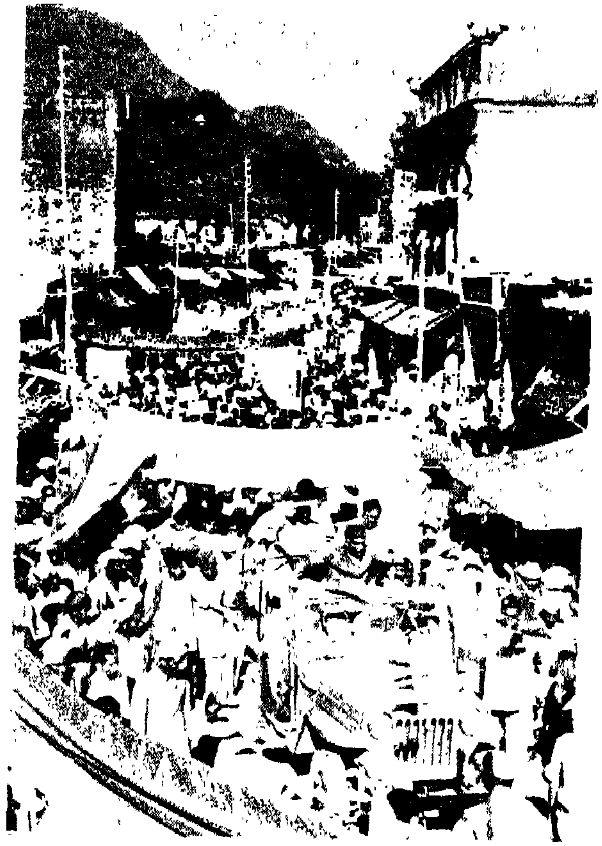
نئے کشمیر کا معمار



دوشی کا ایک بما سفنک میل -



بخشی صاحب نے بٹن دبایا اور ریاسی برقی رو کی روشنی سے منور ہو گیا -



محبوسین زندان‌ها در تبلیغات استقلال



صرف سال ۱۹۶۰-۶۱ میں ۰۰۰، ۱۶۰ من نیا کھاد تقسیم کی گئی۔
لاھور ہمن بہتر بیجوں کی تقسیم
بہتر آلاتِ کشاورزی کا تعارف
بیل اور ہل خریدنے کے لئے قرضوں کی فراہمی
شالی کاشت کرنے کے بہتر طریقوں کا تعارف

۱۸ میوہ کی صنعت کو فروغ

میوہ انڈسٹری ریاست کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ پہلے اور دوسرے پانچ سالہ منصوبوں کے تحت ریاست میں میوے کی زیادہ اور پیداوار کی طرف توجہ دی گئی۔

دوسرے منصوبے کے خاتمے تک ۴۸ نئی نرسریاں قائم کی گئیں۔
دوسرے منصوبے کے خاتمے تک آٹھ لاکھ پودے تقسیم کئے گئے۔
تقریباً دس لاکھ پونڈ سبزی کے بہتر بیج درآمد کئے گئے۔
سرینگر میں لال منڈی کے مقام پر بیج کے ملاحظے کی ایک لیبارٹری قائم کی گئی۔
درخت اُگانے کے سلسلے میں مختلف سطحوں پر تربیت کا انتظام کیا گیا۔
ریاست میں میووں کے تحفظ کے لئے فروٹ کیننگ کے انتظامات کئے گئے۔
درختوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ریاست کے طول وعرض میں دوائیاں چھڑکنے کی سہولیات بہم کی گئیں۔

۱۹ پُرانی صنعتوں کو بڑھاوا

ریاست میں قائم شدہ صنعتوں جیسے ابریشم، وولن ملز اور دوسرے کارخانوں کو صالح بنیادوں پر کھڑا کیا گیا۔ ان میں نئی مشینری فِٹ کی گئی اور انہیں تربیت یافتہ عملہ بہم کیا گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ان کی پیداواری صلاحیت اور قوتِ کار کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ وولن ملز کے ساتھ ۱۲۰۰ تکلیوں کا ایک یونٹ ملحق کیا گیا ہے
ریشم کے بہتر بیجوں کا تعارف کیا گیا ہے اور غنچوں کی پیداوار بڑھ گئی ہے۔ مثلاً ریشم کا تجربہ کامیاب رہنے سے آمدنی کا نیا ذریعہ کھول دیا گیا ہے

۲۰ نئی صنعتوں کا قیام

صنعتوں کے قیام کے بارے میں ریاست نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ دوسرے پانچ سالہ پلان کے تحت صنعتی ترقی کے مختلف شعبوں پر ۱۹۱٫۱۰ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔
جوئنری مِل، اینٹیں اور ٹائیلیں بنانے کا کارخانہ، چمڑے کا کارخانہ، سیمنٹ بنانے کا کارخانہ، جام فیکٹری اور دوسرے کئی کارخانے کھولے گئے۔
۵۵٫۷ لاکھ روپے کی لاگت سے نئے ادویاتی فارم وجود میں لائے گئے۔
دوائیاں تیار کرنے کے لئے ۴۵٫۱۱ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔

۵۰ لاکھ روپے کے سرمایہ سے ریاست میں مالیاتی کارپوریشن کا وجود عمل میں لایا گیا۔ جو صنعتوں کے فروغ [illegible] قرضہ جاتی رہے گا۔
سرینگر، جموں اور اننت ناگ میں ۲۲، ۷۵ لاکھ روپے کی لاگت سے بڑے صنعت نگر قائم کئے گئے۔ ان میں ۱۲۰ یونٹوں کے لئے جگہ اور کام کرنے کی وسعت ہوگی۔
ریاست کے اہم مقامات پر انیس صنعتی بستیوں کا قیام
تیسرے منصوبے کے تحت صنعتی ترقی کے عظیم نشانوں کا تقرر۔

۲۱ قومی توسیعی سروس کا پھیلاؤ

سنہ ۱۹۵۶ء میں کل ہندوستان پیمانے کے مطابق ریاست کو بھی کیمونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں شامل کیا گیا۔ اس وقت ریاست میں ۴۳ بلاک قائم ہیں۔ ان بلاکوں کے تحت زرعی ترقی، کیمیائی کھاد کی تقسیم اور بہتر بیجوں کا تعارف کیا جاتا ہے اور گاؤں کی اندرونی سڑکیں بہتر بنائی گئی ہیں۔ پنچایتیں اب اس سکیم کا بنیادی یونٹ ہیں۔ یہ پنچایتیں منتخب کی جاتی ہیں اور انہیں گاؤں کے بنیادی ترقیاتی یونٹ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ انہیں پنچایت ایکٹ کے مطابق ترقیاتی سرگرمیوں سے متعلق خاص اختیارات حاصل ہیں۔ ہر پنچایت کے لئے ایک پنچایت گھر تعمیر کیا گیا ہے جو ایک ثقافتی یونٹ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں ایک سماجی مرکز کے علاوہ کتابیں اور کھیلوں کا سامان بھی مہیا کیا گیا ہے۔ حکومت کی کوشش یہ ہے کہ اقتدار کو غیر مرتکز کرنے کے لئے پنچایتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات منتقل کئے جائیں۔

۲۲ برقی قوت میں زبردست اضافہ

پہلے اور دوسرے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران میں ریاست میں برقی رو کی پیداوار میں ۴۰۰ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔
پہلے پانچ سالہ منصوبے میں ریاست میں ۱۲۹۲۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں ۴۴، ۳۸۴ لاکھ روپے کی لاگت سے یہ پیداوار ۲۰ ہزار کلوواٹ کے گردونواح میں بجلی پہنچ گئی۔ سرینگر شہر میں بجلی کی بہتر سپلائی کے علاوہ اس کے گردونواح کے دیہات اور گلمرگ۔ ۵ قصبوں کو بجلی کی روشنی سے منور کیا گیا۔
تیسرے منصوبے کے دوران بجلی کی پیداوار ایک لاکھ کلوواٹ سے زیادہ ہوگی۔

۲۳ قدرتی وسائل کا فروغ معدنیات کی کھوج

ریاست معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل سے مالامال ہے اور اگر اس زیرِ زمین دولت کو بےنقاب کیا جائے تو ریاستی باشندوں کی تقدیر سنوارنے کے لئے امکانات اجاگر ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں پانچ کروڑ روپے کے منظور شدہ سرمایہ سے ایک معدنی کارپوریشن قائم کی گئی ہے۔ یہ کارپوریشن کالاکوٹ اور جنگل گلی میں کوئلے کی کانوں، پنچہامہ میں لگنائیٹ کی کانوں اور پونیار میں جپسم کی کانوں کی کھدائی کا کام ہاتھ میں لے رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور دوسری معدنی اشیا کی کھوج کے لئے سروے اور کھدائی کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں یہ کارپوریشن ۴ کروڑ روپے کی لاگت سے مختلف منصوبوں کو جامۂ تکمیل پہنائے گی۔ مثلاً بھاپ سے پیدا ہونے والی بجلی کا منصوبہ، جو جموں میں کوئلے کی کانوں کے فاضل کوئلے سے تیار کی جائے گی۔ اس پروجیکٹ کے مکمل ہونے پر اس سے سالانہ ۳۰،۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ اسی طرح بارہ مولہ کے نزدیک کیمیائی کھاد کے ایک کارخانے کا قیام جو سالانہ ۵۰ ہزار سے ۶۰ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ پیدا کرے گا۔ یہ بارہ مولہ کی اس سیمنٹ فیکٹری کا ایک ضمنی نتیجہ

تیر

ہوگا۔ جہاں سالانہ ۳۰ ہزار سے چالیس ہزار ٹن تک سیمنٹ پیدا کیا جائے گا۔ کوئٹے کو سڑک تک پہنچانے کے لئے تین رستوں کے سلسلے پل تعمیر کئے جائیں گے۔

۲۴ امداد باہمی کا پھیلاؤ

موجودہ زمانے میں پس ماندہ ملکوں کی معیشت کو ترقی دینے کا سب سے اہم اور سب سے کارآمد طریقہ امداد باہمی کا ہے۔ ریاستی حکومت اس پہلو پر پوری طرح توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ وادی کشمیر کے ۳۲۵۲ گاؤں میں سے ۲۹۰۶ گاؤں اور صوبہ جموں کے ۳۰۱۶ گاؤں میں سے ۱۵۴۵ گاؤں کواپریٹو تحریک کے دائرہ کار میں لائے گئے۔ اعداد و شمار کے مطابق وادی میں ۵۰ فیصد سے زیادہ خاندان اور جموں میں ۱۵ فیصد سے زیادہ خاندان اس تحریک سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کواپریٹو اداروں کی رکنیت ۱۹۵۳ء میں ۱۱۹۲۳ تھی۔ سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء میں یہ تعداد ۲۱۳۳۱۰ تک پہنچ گئی ہے۔

۲۵ جنگلات کی دولت کا استفادہ اور نئے جنگلات کی نشوونما

ریاست میں جنگلات خوبصورتی کا راز ہی نہیں ہیں بلکہ ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہیں۔ موجودہ حکومت نے پانچ سالہ منصوبوں کے سلسلے میں سرمایہ بہم کرنے کی غرض سے اُن دُور اُفتادہ جنگلوں تک ذرائع آمد و رفت کو فروغ دیا جہاں صدیوں تک راہ نہ ملنے کی وجہ سے لکڑی سڑ رہی تھی۔ ان جنگلات سے عمارتی لکڑی حاصل کرنے سے کروڑوں روپے کی آمدنی ہوئی۔ اس کے علاوہ ساتھ ساتھ ہی ورکنگ پلانوں کے تحت نئے جنگلات بھی اُگائے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں وزارت جنگلات کی طرف سے اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ جس حساب سے اس وقت جنگلات سے لکڑی برآمد کی جاتی ہے اُس کے مطابق تاابد جنگلات کی دولت ختم نہیں ہو سکتی۔

۲۶ سیاحت کی نمایاں ترقی

حکومت نے سیاحوں کی سہولت کے لئے جو کارنامے انجام دئے ہیں اُس کے نتیجے میں ریاست میں سال بہ سال سیاحوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا نتیجہ مندرجہ ذیل نقشے سے ہوگا:-

۱۹۵۶-۵۷ء	۶۴,۳۵۳	۱۹۵۷-۵۸ء	۴۳,۰۱۸
۱۹۵۸-۵۹ء	۶۰،۵۵۰	۱۹۵۹-۶۰ء	۷۰,۴۰۱
۱۹۶۰-۶۱ء	۷۱,۵۳۰		

اس سال اس تعداد میں اور بھی زیادہ اضافہ ہونے کی توقع ہے۔

نئی سڑکوں اور نئے صحت افزا مقامات کے علاوہ حکومت نے جگہ جگہ پر ۶۴ نئے ریسٹ ہاؤس تعمیر کئے ہیں۔ سرینگر اور جموں میں جدید ترین قسم کے سیاحوں کے استقبالیہ مراکز ۳۰ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہاں سیاحوں کو ہر قسم کی رہنمائی اور مشورہ مہیا کیا جاتا ہے اور ۲۴ گھنٹے کے لئے وہ یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ سیاحوں کے لئے ٹریفک کے آرام دہ اور بہتر انتظامات کئے گئے ہیں اور صحت افزا مقامات پر اُن کی سہولیات کے لئے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں۔

گھریلو صنعتوں کا احیا

ریاست گھریلو صنعتوں کے معاملے میں ابتدا سے ہی مشہور رہی ہے اور یہاں کے کاریگر اپنی دِل لُبھانے والی صناعی کی وجہ سے دُنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ شخصی نظام کے زیر اثر ان صناعوں کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی تھی اور اُن کا فن زوال پذیر ہو گیا تھا۔ موجودہ حکومت نے ان دست کاریوں کو فروغ دینے کے لئے اوّل سے ہی مختلف اقدامات کئے۔ چنانچہ گورنمنٹ ایمپوریم کے ذریعے صناعوں کا مال خریدا گیا۔ اور صناعوں کے روزگار کے وسائل پیدا کئے گئے۔ ایمپوریم کے تحت ملک اور بیرونِ ملک میں کشمیری صناعوں کا تیار کیا ہوا مال پہنچایا گیا اور اس طرح اس صنعت کو از سرِ نو فروغ حاصل ہوا۔ صناعوں اور گھریلو دست کاروں کو اس غرض کے لئے صنعتی قرضے مہیا کئے گئے تاکہ وہ اپنی دست کاریوں کو سرمایے کی قلت کی وجہ سے رُو بہ زوال نہ ہونے دیں۔ قرضے بہم کرنے کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

ٹرانسپورٹ کی تنظیم

ریلوے لائن کی عدم موجودگی میں ریاست کی معیشت میں جو اہم حصہ ٹرانسپورٹ کو ادا کرنا ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی غرض کے لئے اس تنظیم کے پھیلاؤ کی طرف خاص توجہ دی گئی اور آج نہ صرف یہ ہماری معیشت کی شہ رگ کے طور پر کام کر رہا ہے بلکہ ہماری آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے۔ پچھلے مالی سال کے دوران اس محکمے نے ۸ء۱ کروڑ روپے کی کمائی کی۔ اوسطاً اس تنظیم کے ذریعے سالانہ ۴ء لاکھ من بوجھ اور ۵ لاکھ سواریوں کے لئے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جاتا ہے۔

کم تنخواہ مُلازمین کے گریڈ میں اضافہ

۱۹۵۳ء میں وزارتِ عظمیٰ سنبھالنے کے بعد بخشی صاحب نے کم تنخواہ والے ملازمین کے اُن گریڈوں پر نظرِ ثانی کا حکم دیا جو پچھلے زمانے کی یادگار تھے اور جو نئی مزدوریوں کے لحاظ سے فرسودہ ہو گئے تھے۔ اس غرض سے ایک تنخواہ کمیشن کی تقرری ہوئی اور کروڑوں روپے کے اخراجات سے استادوں، کلرکوں، چپراسیوں اور دوسرے کم تنخواہ مُلازمین کی از سرِ نو گریڈ بندی کی گئی۔

مہنگائی الاؤنس کی منظوری

ریاست کی اقتصادیات کے پھیلاؤ، سیلابات اور دیگر آفاتِ سماوی اور آبادی میں زبردست اضافے کے سبب سے ریاست میں کچھ چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ ان حالات کے پیش نظر کم تنخواہ والے ملازمین کی اقتصادیات متاثر ہوئیں۔ چنانچہ حکومت نے اس صورتِ حال کو زیرِ نظر رکھ کر پہلے ایک بار مہنگائی الاؤنس کا اعلان کیا اور بعد میں تنخواہ کمیشن کی سفارشات پر اس الاؤنس میں تقریباً سو فیصدی کا اضافہ کیا گیا۔ یہ الاؤنس دیتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کم تنخواہ پانے والے مُلازمین سب سے زیادہ مستفید ہوں۔

ادب و ثقافت کی ترویج

خالد کشمیر بجا طور پر کشمیری تمدن و ثقافت کے احیائے نَو کے علم بردار کہلاتے ہیں۔ اُن کے دَورِ حکومت میں ریاستی تمدن نے نئی انگڑائی لی اور اس کو فروغ دینے کے لئے بے شمار اقدامات کئے گئے ہیں۔

(۱) ریاستی آئین کے تحت ادب اور فنون کی کلچرل اکاڈمی قائم ہوئی۔ جس نے ریاستی ادب کو فروغ دینے کے لئے بعض قابل قدر خدمات انجام دیں۔
(۲) ریاست میں دو جشن منائے گئے۔ ان جشنوں میں گمنام فن کار سطح پر آ گئے اور قدر دانی کی وجہ سے چمکتے گئے۔
(۳) ریاست کے مختلف خطوں کی لوک روایات اور لوک رقص ایک دوسرے کے قریب آ کر ربط اور ہم آہنگی کے شیرازے میں منسلک ہو گئے۔
(۴) محکمہ اطلاعات کے تحت دو صوبائی ثقافتی یونٹ اور ضلع اطلاعاتی مراکز بھی فنون اور ادب کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔

۳۲ سیلاب روکنے کا عظیم منصوبہ

ریاست کشمیر کی خوش حالی کا ایک اہم دشمن سیلابات رہے ہیں۔ ریاست کی جغرافیائی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ سیلابات کا مسئلہ ہمیشہ نہایت خطرناک رہا ہے۔ حکومت نے مرکزی سرکار کی اعانت و مشورے سے اس اژدہے کا خونخوار منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس غرض کے لئے ایک عظیم منصوبہ تشکیل دیا گیا ہے۔ جس پر آٹھ کروڑ روپے کا خرچ آنے کا اندازہ ہے۔ اس منصوبے کے تحت دریاؤں کے کناروں پر نئے بند اور اونچے تعمیر کئے جائیں گے۔ جہلم کی کھدائی کی جائے گی اور کھادن یار کے نزدیک جہاں یہ وادی کو چھوڑتا ہے، اس کے پاٹ کو لمبا بنایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں زور و شور سے کام جاری ہے۔

۳۳ ہاؤسنگ سکیم

چھوٹے درجے کے ملازمین کی سہولت کے لئے ایک ہاؤسنگ سکیم پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اس غرض کے لئے جموں اور سرینگر میں برائے نام قیمتوں پر خطہ ہائے اراضی قرعہ اندازی کے ذریعے تقسیم کئے گئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اب ضلعوں کے صدر مقامات تک پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملازمین کو قرضے کی سہولیات بھی بہم رکھی گئی ہیں جو بعد میں آسان قسطوں میں واجب الادا ہونگی۔ اس سکیم کے تحت اب تک سرینگر اور جموں میں ... امکانات تعمیر کئے گئے ہیں اور مزید تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

۳۴ فنی تربیت کیلئے سہولیات

ریاست کی پس ماندہ معیشت کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ٹیکنیکل مہارت رکھنے والا عملہ دست یاب کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ریاست میں مندرجہ ذیل ادارے قائم ہیں:۔
میڈیکل کالج سرینگر، انجینئرنگ کالج سرینگر، زرعی کالج سوپور اور سرینگر یونانی اور آیورویدک کالج جموں، پالی ٹیکنیک جموں، انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی چیوٹ جموں اور سرینگر
..۴۴ سے زائد طلبا بیرون ریاست میں مختلف ٹیکنیکل تربیتیں حاصل کر رہے ہیں اور حکومت اُن کے اخراجات پر سالانہ تیس لاکھ روپے صرف کر رہی ہے۔

۳۵ زمین کا کٹاؤ روکنے کے منصوبے

زمین کا کٹاؤ نہ صرف زرعی زمین کے نقصان کی صورت میں نمودار ہوتا ہے بلکہ یہ سیلابات کی تیز رفتاری کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ کثیر المقاصد منصوبوں کی حفاظت کے لئے بھی زمین کا کٹاؤ روکنے کی ضرورت بڑی اہم ہے۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں اس غرض کے لئے ۴۴ء۳۸ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی گئی۔ اس سلسلے میں ننگی پہاڑیوں اور بنجر زمین پر درخت نصب کئے گئے۔ اس سلسلے میں اب تک مختلف جگہوں پر لگ بھگ ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ

درخت نصب کئے گئے ہیں۔

۳۶ افزائشِ حیوانات

کسی ریاست کی اقتصادی خوش حالی میں صحت مند اور اعلےٰ نسل کے حیوانات کا کافی عمل دخل ہوتا ہے۔ ریاست میں مویشیوں کی افزائش اور اعلیٰ نسل کے مویشیوں پیدا کرنے کے سلسلے میں وسیع پیمانے پر اقدامات کئے گئے ہیں۔ کلیدی گاؤں سکیم کے تحت سلسلہ میں بہتر نسل پیدا کرنے کے لئے درآمد کئے گئے بیل، بھیڑ اور مرغ رکھے گئے ہیں۔ مویشیوں کی بیماری پر قابو پانے کے لئے وسیع پیمانے پر مہمیں چلائی گئی ہیں اور بہتر گھاس پیدا کرنے کے بیج بوئے گئے ہیں۔

۳۷ پینے کے پانی کی بہم رسانی

اس غرض کے لئے پہلے اور دوسرے پانچ سالہ منصوبوں میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا۔ سرینگر اور جموں میں بہم رسانیِ آب کے لئے مزید سکیمیں مکمل کی گئیں۔ بیج بہاڑہ، بارہ مولہ، سوپور، قاضی گنڈ، چرار شریف، ڈورو، پانپور، اننت ناگ، بکھر پورہ، پریس وانی، وہاب کھار اور ریاسی کو پانی مہیا کیا گیا۔ بھدرواہ اور شوپیان میں بہم رسانیِ آب کی سکیمیں مکمل ہوا چاہتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے گاؤں کو نلکے کا پانی بہم کیا گیا۔ اس طرح سے حفظانِ صحت کے معیار بلند تر ہو گئے ہیں۔

۳۸ شہیدانِ حرّیت کے ورثا کو امدادی رقوم اور وظائف

ریاستی دستوریہ نے وجود میں آتے ہی فیصلہ کیا کہ تحریک آزادی میں اپنی جان قربان کر دینے والے جانبازوں کی قدر افزائی کے سلسلے میں مناسب اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ گو شہیدوں کی جان کسی قوم کی سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے اور اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے قیمتی سے قیمتی چیز بھی بے قیمت ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر علامتی قدر افزائی کے طور پر فیصلہ کیا گیا کہ شہیدوں کے ورثا میں امدادی رقوم اور وظائف تقسیم کئے جائیں۔ چنانچہ لاکھوں روپے خرچ کر کے شہیدوں کے وارثوں کو یہ امداد بہم پہنچائی گئی اور ضروری حالات اُن کے لواحقین اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وظائف مقرر کئے گئے۔ شہیدوں کی یاد میں ایک یادگاری صحیفہ بھی عنقریب شائع کیا جا رہا ہے۔

۳۹ سماجی بہبود کے سلسلے میں کامیابیاں

سماجی بہبود کے سلسلے میں حکومت نے جو کوششیں کیں اُن کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان میں اس غرض کے لئے ۴ء۲۱ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ سٹیٹ سوشل ویلفیر بورڈ کے تحت سماجی بہبود کے مراکز کھولے گئے۔ سرینگر اور جموں میں بھیک منگوا اور بے سہارا عورتوں کی بحالی کے لئے دو مراکز کا قیام۔

۴۰ شہرِ سرینگر کی تعمیرِ جدید

سرینگر کا تاریخی شہر مہاراجہ اشوک کی یادگار ہے اور اپنی ہمہ رنگ اہمیت کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس شہر کی بیشتر عمارات آج سے کچھ سال پہلے تک فرسودہ نظر آتی تھیں۔ اور چاروں طرف ویرانے اور خار دار میدان نظر آتے تھے۔ بخشی صاحب نے اس سلسلے میں تیر

نمایاں طور دلچسپی دکھائی۔ چنانچہ آج سرینگر کے شہر میں تعمیرِ جدید کا ایک بے پناہ سلسلہ جاری ہے۔ کچھ ہی برسوں میں جدید ڈھنگ کی عمارات نے شہر کی ہیئت کو بدل ڈالا ہے۔ شہر کے تنگ و تاریک گلی کوچوں کو کشادہ بنانے کے کام کا بیڑا بھی بخشی صاحب نے اٹھایا۔ اُنہوں نے خود گلی گلی گھوم کر اہم سڑکوں کی کشادگی کا کام انجام دیا۔ گو یہ کام ابھی تکمیل پذیر نہیں ہوا مگر سرینگر کے لئے جو ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے اس کی تکمیل پر یہ شہر ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا خوبصورت ترین شہر ہوگا۔

۴۱ سرینگر اور جموں میں نئے سیکرٹریٹ بلاکس کی تعمیر

ریاست کے وسیع ہوتے ہوئے انتظامیہ کی وجہ سے پُرانے سیکرٹریٹ غیر مکتفی ثابت ہونے لگے تھے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جموں اور سرینگر دونوں جگہوں پر نئے اور جدید ترین ڈھنگ کے سیکرٹریٹ بلاک تعمیر کئے گئے۔ جموں کے سیکرٹریٹ کا افتتاح بخشی صاحب نے اسی سال میں کیا۔ سرینگر میں سیکرٹریٹ کے جو نئے بلاکس تعمیر کئے گئے ہیں اُن کے علاوہ اب ایک عظیم سیکرٹریٹ کا سنگِ بنیاد اُنہوں نے پچھلے ہی دنوں سابق عثمان پارک میں رکھا۔ ساٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا یہ سیکرٹریٹ کئی منزلہ ہوگا اور اس میں گرمی، سردی پہنچانے کے جدید ترین انتظامات ہوں گے۔ اس کے بالائی طبقوں تک جانے کے لئے لفٹ لگائے جائیں گے۔

۴۲ لداخ کی ترقی

لداخ ہماری ریاست کا اہم حصہ ہے اور اپنے جغرافیائی محل وقوع کے پیشِ نظر اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ ناموزوں جغرافیائی حالات اور ناخوش گوار آب و ہوا اس کی پس ماندگی کے لئے کافی حد تک ذمہ دار ہیں۔ مگر اس پس ماندگی میں شخصی حکومت کے عدم توجہ اور باقی دُنیا کے ساتھ ذرائع آمد و رفت کے فقدان کو بھی خاص دخل تھا۔ موجودہ حکومت نے لداخ کے سدھار کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ ۱۵۰ میل لمبی لیہہ کرگل سڑک تعمیر کی گئی اور لداخ کے اندر بھی کافی چھوٹی بڑی سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ضلع میں گذشتہ پانچ سال کے دوران ضلع ہسپتال کے لئے ایک سکول کے لئے ۱۴ اور دواخانوں کے لئے دو عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ یہاں زیادہ درخت اُگانے کی مہم شروع کی گئی ہے اور ۱۸۸ نرسریاں قائم کی گئی ہیں۔ اب تک چھ لاکھ درخت نصب کئے گئے ہیں۔ یہاں مویشیوں کی پرداخت کا کام بھی جاری ہے اور ذرائع آمد و رفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں معدنیات سے استفادہ کے مواقع بھی روشن ہو گئے ہیں۔

۴۳ اُون کی پیداوار میں اضافہ

ہماری ریاست ابتدا سے ہی اُونی اشیا کی تیاری کے سلسلے میں نام پیدا کر چکی ہے۔ مگر درمیان کے شخصی نظام کے دوران میں یہ صنعت بھی رُو بہ زوال تھی حکومت نے کئی مقامات پر بھیڑ پالنے کے فارم بنائے ہیں اور وہاں سے اُون حاصل کی جاتی ہے۔ اچھی نسل کی بھیڑیں، جو کئی گنا زیادہ اُون دیتی ہیں، باہر سے درآمد کر کے ریاست کے طول و عرض میں پھیلا دی گئی ہیں۔ اور اُون کے معاملے میں اپنی ضروریات پُورا کرنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔

۴۴ ریاست کے مختلف قصبوں کی ترقی

ریاست جموں وکشمیر کے جو قصبے کسی وقت تاریخی اہمیت رکھتے تھے، ریاستی معیشت میں زوال کے ساتھ اُن پر بھی زوال آگیا۔ موجودہ حکومت نے اس طرف خاص توجہ کی۔ جموں کا شہر آج جتنا بارونق اور آباد ہے اُتنا کبھی نہیں تھا۔ اودھم پور اور پونچھ کو بارونق بنانے کے لئے بھی کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔

کشمیر میں اننت ناگ اور شوپیان کے قصبے تو گ بھگ از سر نو ہی تعمیر ہو رہے ہیں۔ ان دونوں جگہوں پر خطرناک آتش زدگی کی وجہ سے ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ حکومت نے بڑی تن دہی سے کام کر کے اُن کو بسایا اور قصبوں کو بھی نئی ترویج دے دی۔ اننت ناگ میں حال ہی میں جو آتش زدگی وقوع پذیر ہوئی اُس کے بعد اس قصبے کی خوبصورت بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔

۴۵ تھیٹر کی ترقی

ریاست میں تھیٹر کی ترقی کے لئے حکومت نے کلچرل اکاڈمی اور محکمۂ اطلاعات کے تحت کئی اقدامات کئے۔ اس سلسلے کا تازہ ترین قدم ٹیگور میموریل ہال کی تعمیر ہے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا یہ ہال شمالی ہندوستان کے سب سے اچھے تھیٹر ہالوں میں سے ایک ہے۔ سٹیج کی جدید ترین ساز و سامان سے مزیّن ہونے کے علاوہ یہاں بیک وقت ۷۰۰ تماشائی آرام اور سکون کے ساتھ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

۴۶ خواتین شاہراہِ ترقی پر

کسی سماج کی ترقی اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اُس کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ شاہراہِ ترقی پر گامزن نہ ہوں۔ کشمیر میں ترقی کی مہم کا یہ خاصہ رہا ہے کہ عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتیں دکھا رہی ہیں۔ تعلیمِ نسواں کو فروغ ملنے سے عورتیں بہتر تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ ہزاروں طالبات تعلیم پا کر قومی ترقی میں اپنا رول ادا کر رہی ہیں۔ اور اُستادوں، ڈاکٹروں، نرسوں اور فن کاروں کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ حال ہی میں ریاست میں پنچایتی انتخابات کے سلسلے میں تحصیل بڈگام میں ایک خاتون سرپنچ منتخب کی گئی۔

۴۷ کنڈی علاقوں کو پانی کی بہم رسانی

کنڈی علاقوں کو پانی بہم پہنچانے کے لئے ۳۱ ٹیوب ویل اور چار پمپنگ سٹیشن قائم کئے گئے ہیں۔ قومی توسیعی سروس کے تحت کنڈی واٹر سپلائی سکیم کے ذریعے موسم گرما میں فی روز اوسطاً ۸۰۰۰۰ گیلن پانی کنڈی علاقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۴۸ ضلع ڈوڈہ کی ترقی

ضلع ڈوڈہ ریاست کا سب سے زیادہ پہاڑی علاقہ ہے اور غیر معتبر موسمی حالات کی وجہ سے اس کی پس ماندگی میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ حکومت نے اس ضلع کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے خاص اقدامات کئے ہیں۔ چنانچہ بخشی صاحب بہ نفسِ نفیس وقت وقت پر اس کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں دشوار گذار پہاڑیوں پر سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں اور کشتواڑ جیسے دور اُفتادہ علاقے کو باقی دُنیا سے ملا دیا گیا ہے۔ یہاں ایک کالج اور بہت سے تعلیمی اداروں کے علاوہ ہسپتال اور سماجی بہبود کے دوسرے ادارے قائم ہیں۔ حال ہی میں بخشی صاحب نے اعلان کیا کہ تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران اس ضلع کی ترقی پر خاص توجہ دی جائے گی۔

۴۹ کٹھوعہ کنال کی تعمیر

۱۴ میل لمبی کٹھوعہ نہر کی تکمیل اُس علاقے کی زندگی کا پیغام بن کر آئی ہے۔ اس نہر کی وجہ سے ربیع اور خریف فصلوں کے موقعہ پر ۲۸۰۰۰ ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی اور اس طرح سے مزید ایک لاکھ من دھان، ۶۰۰۰ من نیشکر ۲۵۰۰۰ من گیہوں اور ۱۸۰۰۰ من دوسری فصلیں پیدا ہو سکیں گی۔ تعمیر

اور بہت سے گاؤں کو پینے کا پانی بھی ملے گا۔

۵۰ ریاست کی مجموعی اور ٹیکس آمدنی میں اضافہ

گو کہ اس وقت ریاست کا ایک حصہ پاکستانی حملہ آوروں کے قبضے میں ہے اور انتظامیہ کے اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ مگر پھر بھی ترقیاتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ریاست کی ٹیکس اور مجموعی آمدنی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اجمالی نقشے سے ہو سکے گا:۔

۱۹۴۷-۴۸ء	دو کروڑ ۴۷ لاکھ ۴۵ ہزار روپے
۱۹۵۳-۵۴ء	۵ کروڑ ۲۳ لاکھ ۸۹ ہزار روپے
۱۹۶۰-۶۱ء	۱۴ ، ۹۶ ، ۱۹ ، ،

۵۱ پرائیویٹ سیکٹر کو بڑھاوا

ریاستی حکومت ریاست کی متوازن ترقی کے لئے جہاں پبلک سیکٹر میں صنعتوں کو فروغ دے رہی ہے اور کئی قابل ذکر کارنامے انجام دئے گئے ہیں۔ وہاں پرائیویٹ سیکٹر میں صنعت کاروں کو سرمایہ لگانے اور ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنے کی پوری سہولیات دی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے قابل ذکر واقعہ کلکتہ کے ساہو جین گروپ کے صنعت کاروں کے ساتھ ریاستی حکومت کے حالیہ معاہدے ہیں۔ یہ فرم ریاست میں کئی کروڑ روپے کی لاگت سے جنگلات سے متعلق اور پلائی ووڈ کی کئی صنعتیں قائم کر رہی ہے۔

۵۲ قدیم مغل روڈ کی تجدید

بانہال روڈ پر ٹریفک کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ جموں اور سرینگر کے درمیان ایک متبادل شاہراہ تعمیر کی جائے۔ اس غرض کے لئے تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں ڈھائی کروڑ روپے قدیم مغل روڈ کی تجدید کے لئے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ ۲۴۴ میل یہ سڑک سنگین پہاڑوں پر سے گذرے گی۔ اس لئے پسیوں کے خطرے سے محفوظ رہے گی۔ اسے مکمل کرنے کے لئے حال ہی میں ایک علیحدہ انجینئرنگ ڈویژن کھولا گیا ہے اور جولائی ۱۹۶۳ء تک یہ ٹریفک کے لئے کھل جائے گی۔

۵۳ ایندھن کے مسئلے کا حل

ایندھن کا مسئلہ پچھلے کئی سال سے شدید صورت اختیار کر رہا ہے۔ حکومت نے اس مسئلے کے حل کے لئے ابتدا سے ہی اقدامات اٹھائے ہیں۔ وادی میں جہلم کے کناروں اور نشیبی علاقوں میں بید کے کروڑوں درخت نصب کئے گئے ہیں اور ان درختوں کے گھنے جنگل تیار ہو رہے ہیں۔ بہت جلد یہ جنگل ایندھن کی ضروریات کا پورا حل پیش کریں گے۔

۵۴ زرعی اور کوآپریٹو قرضوں کی تقسیم

جاگیرداری اور مہاجن داری نظام کے ختم ہونے کے بعد گاؤں کی اقتصادیات میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ کاشتکار کو بیج بوائی کے وقت قرضے کی ضرورت ہوتی ہے

اور قرضوں میں وہ اسے واپس کرنے کے قابل ہوتا تھا۔ مہاجن اور جاگیردار کسانوں کی اس مجبوری کا بے حد ناجائز فائدہ اُٹھاتے تھے۔ مگر موجودہ حکومت نے اس سلسلے میں کسان کی تمام مشکلات آسان کر دی ہیں اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ مجوزہ سسٹم کے بدلے شہر کو راشن دینے کے لئے دھان جمع کرنے کا ایک خوش گوار طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ چنانچہ کوآپریٹو اداروں کے ذریعے لمبی اور طویل مدت کے قرضے تقسیم کئے جاتے ہیں اور کسان قرضوں میں فی خروار سولہ (۱۶) روپے کے حساب سے دھان واپس کر دیتا ہے۔ پچھلے چند سالوں کے اعداد و شمار یہ ہیں :-

۱۹۵۷-۵۸ء	۷،۰۰،۰۰۰ روپے قرضہ جو پیشگی دیا گیا
۱۹۵۸-۵۹ء	۱۲،۹۰،۰۰۰ " " "
۱۹۵۹-۶۰ء	۶،۴۵،۰۰۰ " "

عوام کا محبوب

" وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کے عوام سے تعلقات ہند بھر میں لاثانی ہیں اور عام لوگ اُن کے ساتھ اس حد تک قریب ہیں کہ بعض اوقات یہ بے تکلفی اور یہ قربت پریشان کُن، حتیٰ کہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم لوگوں سے اس طرح گھُل مِل کر باتیں کرتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر نہ مراسم کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ کوئی دُوری محسوس ہوتی ہے ...

... لوگ چاہیں تو اُن کی پیٹھ پر تھپکیاں بھی دیتے ہیں یا بسا اوقات عورتیں اپنی درخواست پیش کرنے کے لئے اُن کے کپڑوں کو بھی کھینچ لیتی ہیں۔

... ... وہ لوگوں کے ساتھ ایک وزیر اعظم کی طرح بات نہیں کرتے بلکہ اُن کا طریقہ کچھ ایسا ہے جیسے کہ محفلِ ساز و سرود کے منتظم کا۔ جو ایک اشارہ کرے تو فوراً ساز بجنے لگتا ہے اور دوسری جانب اشارہ کرے تو تاروں پر مضراب لگنا شروع ہوتا ہے ... ... "

("تایا ز نکن" مانچسٹر گارڈین ")

زاوئیے

قومیں افراد سے عبارت ہوتی ہیں۔ مگر قوم کی حیاتِ اجتماعی کے سامنے افراد کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن جب کوئی فرد قوم کی اُمنگوں، آرزوؤں، اُمیدوں اور مقاصد کی علامت بن جائے تو وہ قوم کی حیاتِ اجتماعی کا نفسِ ناطقہ بن جاتا ہے۔ بخشی غلام محمد تاریخ کے ایسے ہی برگزیدہ افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شئے جو اُن کی اہمیت اور عظمت میں اور بھی اضافہ کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ صرف ایک قوم کے قائد ہی نہیں ہیں بلکہ انسانیت اور جمہوریت کے چند برتر میلانات، رجحانات اور آدرشوں کے بھی بیک وقت مظہر اور علم بردار ہیں۔ اُن کی جامع ذات کشمیر کی پُرسطوت تحریک آزادی کے جلال و جمال، حال کے کشمیر کے عزم ترقی اور مستقبل کے کشمیر کی تابانیوں کا سنگم ہے۔ اُن کا پُرشکوہ پیکر ایک باطل اور زوال آمیز فلسفۂ زندگی پر ایک ترقی پسند اور حیات افروز نظامِ زندگی کی فتح کا مینارۂ نور ہے۔ اسی لئے اُن کی ذات انفرادی حدود پھاند کر اجتماعیت کی بے کرانیوں کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ اس ذاتِ بابرکات کے اندر کشمیر کی حریت و حمیت کا دِل دھڑکتا ہے کشمیر کی تعمیر کے خواب حقیقت کا رُوپ اختیار کرنے کے لئے مچلتے ہیں۔ سیکولرازم کا صالح فلسفہ اپنی بقا کے لئے قوتِ حیات حاصل کرتا ہے اور عظیم مستقبل کی حسین آرزوئیں نیا عزم اور نیا ولولہ حاصل کرتی ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری نے کہا بخشی صاحب مشکلات کے مقابلے میں چٹان کی طرح کھڑے رہے ہیں۔ خالدِ کشمیر نے اپنے وطن کو مصیبتوں سے بچانے کے لئے اپنی پُرجوش شخصیت کی ساری صلاحیتیں داؤ پر لگا دی ہیں۔ اور واقعات گواہ ہیں کہ اس دیوقامت ہستی کی بے پناہ صلاحیتوں نے تاریخ کے دھارے کو دُرست سمت کی طرف موڑنے میں بے مثل رہنمایانہ رول ادا کیا ہے۔

کشمیر کے اُفق پر پچھلے چودہ برس میں غیر یقینیت اور انتشار کی بہت سی گھنگھور گھٹائیں چھائیں۔ اس سرزمین پر نظریاتی خلفشار کی دُھند نمودار ہوئی اور تفرقہ پردازی کی کئی یورشیں ہوئیں۔ مگر ہر آزمائش کے وقت خالدِ کشمیر کی مُستعد، باہوش اور پُرعزم قیادت کے جوہر کچھ اسی کیفیت سے نکھرے جس کا اشارہ اقبالؔ کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

دُھوپ کی شدّت سے چمکی اس طرح صحرا کی ریت
یورشِ آلام میں جیسے مجاہد کا ضمیر

واقعات کی غیر جانب دار گواہی نے ثابت کر دیا کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کشمیر کی رہنمائی کے لئے بخشی صاحب کا انتخاب خود تاریخی قوتوں اور عوامل نے کیا ہے اور صرف اُن کی ذات گرامی ہی قیادت کے اس بارِ گراں سے بہ طریقۂ احسن عہدہ برا ہو سکتی تھی۔ ہم آج ہندوستان بھر میں رہنے والے بے شمار محبّ وطنوں کی نداؤں کے ساتھ مبارک بادی کی اپنی ندا شامل کرتے ہیں۔ اُن کی سلامتی کے ساتھ ہمارے مُلک کے عظیم آدرشوں اور ہماری ریاست کی خوش حالی کا دامن گہرے طور پر وابستہ ہے۔

اس شمارے میں بخشی صاحب سے متعلق جو مضامین شامل کئے گئے ہیں اُن میں بخشی صاحب کے عوامی کردار کے کچھ رُخ پیش کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور تصاویر میں بھی اسی پہلو پر خاص طور زور دیا گیا ہے۔

مدیر

نذرِ خالدِ کشمیر

کم نہ تھا بے کسی وادیٔ غربت کا محن
تو بھی جاتی ہے مجھے چھوڑ کے اے یادِ وطن

بزمِ رنداں میں ترانے کی جگہ ہے شیون
آہ ساقی ہی نہیں کون منائے ساون

کس کو معلوم کہ پردے میں ستمگار ہے کون
شور ہے چرخِ کہن چرخِ کہن چرخِ کہن

سب دعا گو اسی تیرِ نگہِ ناز کے ہیں
سر و پیشانی و قلب و جگر و سینۂ من

کتنے القاب ہیں اک حسنِ مجسم کے لئے
مہ رُخ و شمع رُخ و لالہ رُخ و سیم بدن

کہہ رہی ہے بتِ کافر جسے اک خلقِ خدا
سامنے آئے تو زاہد بھی جھکا دے گردن

ہر طرف حسن نے اک آگ لگا رکھی ہے
سوزِ پروانہ ہو یا نالۂ مرغانِ چمن

ان کو بھی سوزشِ پنہاں کی خبر ہے کہ نہیں
ہائے رے دِل کی جلن دِل کی جلن دِل کی جلن

بیٹھ جانا کسی چشمے کے کنارے سرِ شام
بسترِ خار پہ وہ نیند، وہ دن بھر کی تھکن

شام سے تا بہ سحر اپنے حبیبی کی پکار
آبلوں کی وہ ٹپک ہائے وہ کانٹوں کی چبھن

کاش اُس جانِ تبسم سے کوئی کہہ دیتا
کب سے روتا ہے اک آوارۂ صحرائے محن

کم قیامت سے نہیں گردشِ ایام کا رنگ
کس کی رفتار سے بدلا ہے زمانے کا چلن

فتنہ کہتے ہیں کسے چرخ کو معلوم نہ تھا
یہ تو ہے ان کی نگاہوں کا سکھایا ہوا فن

اے خوشا چشمِ ادا کار کا اندازِ حیا
بات کرتے ہیں وہ جس وقت جھکا کر گردن

بڑی مشکل سے وفادار ملا کرتے ہیں
تھا کبھی ان کی گذرگاہ میں ایک سوختہ تن

پوچھتے ہو کسے کہتے ہیں شفیقؔ خوش گو
ہے وہ اس دور میں شاہنشہِ اقلیمِ سخن

اللہ اللہ مری شامِ غریباں کی پھبن
جس پہ قربان ہوئی جاتی ہے خود صبحِ وطن

روشنی پھیل گئی کس کے رخِ تاباں کی
اب تو جیسے مرا ویرانہ ہے دشتِ ایمن

گیسوئے حور کی خوشبو ہے مری بالیں پر
شام ہی سے دلِ آوارہ ہے بےرہومن

آستیں اپنی سلامت نہ گریباں باقی
پھر بھی شوریدہ مزاجی پہ جوانی کی پھبن

گنگناؤں جو ان آنکھوں کے تصور میں کبھی
جمع ہو جائیں مرے گرد بیاباں کے ہرن

روکش سدرۂ و طوبیٰ ہے ببولوں کی قطار   دل بربادِ کی وحشت پہ بلا کا جوبن
اُف خوشی آوازِ محبوب میں ڈوبا ہوا راگ   عشق میں بھی بخدا حسن کا بے ساختہ پن
آج یہ کس کی توجہ ہے مری وحشت پر   جس نے تپتے ہوئے صحرا کو بنایا ہے دُلہن
دُور تک پنجۂ مریم کا سماں صلِّ علیٰ   فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا
پھول تو پھول ہیں کانٹوں میں وہ شادابی ہے   دیکھ کر جن کو ہرے ہو گئے سب زخمِ کہن
یا خدا یوں ہی سلامت رہے آباد رہے   دشتِ سلمیٰ مرے معصوم محبت کا وطن
آج دِل میں نہ وہ کاوش نہ جگر میں وہ خلش   دوڑتی پھرتی ہے خورشیدِ مسرت کی کرن
کارفرما ہوئی کس کی نگہ لطف و کرم   خود بخود دُور ہوئی جاتی ہے سینے کی جلن
چار جانب سے چلی آتی ہے وہ بوئے لطیف   جیسے ایک ایک گلی تبت و تاتار و ختن
شکوۂ گردشِ ایام اِک افسانہ ہے آج   جیسے اندازِ جفا بھول گیا چرخِ کہن
آج بھی میں ہوں وہی شامِ غریباں ہے وہی   سوچتا ہوں کہ وہ کیا ہو گئی دِل کی اُلجھن
اِک طرف پیکرِ مستی ہے وہ رومانِ شباب   اِک طرف ساقیِ مخمور نظر توبہ شکن
دمِ عیسیٰ ہے نسیمِ سحری کا جھونکا   باغباں داند و من دانم و داند دلِ من
اوج پر ہے مری تقدیر کا روشن تارا   آج لائی ہے کہاں مجھ کو مرے دِل کی لگن
رُخ و دندان و لب و زُلف پہ جس کے ہے نثار   رنگِ گُل دُرِّ عدن لعلِ یمن مشکِ ختن
مہِ نو جس کے گریباں کی قسم کھاتا ہے   جس کے دامن کا ہر اِک تار ہے سورج کی کرن
ہے شبِ ماہ کا پیغام نمو پیشانی   یا ہلالِ شبِ اوّل ہے جبینِ روشن
آبِ کوثر کا تقدس ہے لبِ لعلیں میں   موجیں تسنیم کی ہونٹوں پہ رواں وقتِ سخن
جس کے گلزار کو فردوسِ بریں کہتے ہیں   جس کی ایک ایک گذرگاہ ہے رضواں کا وطن
جس کے فیضانِ قدم سے ہے بہارِ غیرت   کتنے ویرانوں میں پیدا ہوئے آثارِ چمن
جس کی رفتار سے ہو جاتے ہیں فتنے پامال   جس کے قدموں پہ فراعین کی خم ہے گردن
بخشش و جود و عطا میں ہوئی شہرت جس کی   نام ہے اہلِ قلم کے لئے موضوعِ سخن
جس کو خالق نے بنایا ہے محمدؐ کا غلام   جس کے حامی ہیں بہر حال حسینؓ اور حسنؓ
یاد کرتے ہیں جسے حضرت بخشی کہہ کر   جس کی بخشش کی حکایات ہیں مشہورِ زمن
دردمندی کا یہ عالم ہے کہ اکثر جس نے   بھر دئے لعل و گہر سے غربا کے دامن
آج گلزار ہی گلزار ہیں اُجڑے ہوئے گھر   کل بیاباں ہی بیاباں تھا غریبوں کا وطن
دامنِ کوہ بنا دامنِ جنت جس سے   جس کے فیضان سے ہر سو ہے رواں جوئے لبن
جھک کے کہتی ہے ہر اِک شاخ بہ پیشِ بخشی   کہ ترا پرچمِ اقبال رہے سایہ فگن

خالد کشمیر

چند واقعات کے آئینے میں!

آدمی بڑا ہو یا چھوٹا، اس کی زندگی اہم اور غیر اہم واقعات سے بھری ہوتی ہے۔ ان واقعات میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس کی خوبیوں اور کمزوریوں کو آشکار کرتے ہیں، اس کے کردار کے عام طور سے دوسرے لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں اور جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آدمی درحقیقت کس پایہ اور درجے کا ہے۔

جناب بخشی غلام محمد کی پبلک زندگی کا سرسری جائزہ لینے سے بے شمار ایسے واقعات اُبھرتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدرت نے اُنہیں وہ تمام اوصاف بخشے ہیں جن کی بدولت وہ ریاست کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کے رُوحِ رواں بنے اور جب ۱۹۴۷ء میں اسی سیاسی تنظیم کو حکومت کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنا پڑیں تو آپ بغیر کسی کوشش کے خود بخود اس کے اہم ترین رُکن بنے۔ تحریک حریت کے دوران شخصی حکومت کے خلاف عوام کی مزاحمت منظم کرنا آپ ہی کے ذمہ تھا اور جب ۱۹۴۷ء میں آپ کے کندھوں پر حکومت چلانے کی ذمہ داری کا بوجھ پڑا تو اس شعبے میں بھی آپ نے وقت وقت پر ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جن کا اعتراف آپ کے بدترین سیاسی مخالفین بھی کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست پر پاکستان کی جانب سے حملہ ہوا۔ اُس وقت کی حکومت اس حملے سے پیدا ہوئی صورت حال کا سامنا نہ کر سکی۔ فوج منتشر ہو چکی تھی اور پولیس کے عملے کا حوصلہ بے حد پست تھا۔ ایسے حالات میں ایک مرحلہ پر یُوں نظر آیا کہ حملہ آوروں کو ریاست کے بلند و پست پر چھا جانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن دیکھتے دیکھتے سارا نقشہ بدل گیا، مایوسی اور شکست خوردگی کی جگہ ہمت اور حوصلہ نے لی۔ اور لیہہ سے لے کر کٹھوعہ تک ہر جگہ "حملہ آور خبردار"
تیمیر

کا نعرہ گونجنے لگا۔ یہ معجزہ بخشی صاحب ہی کی قائدانہ صلاحیتوں کے نتیجہ میں رُونما ہوا۔ رات دن کام کر کے اُنہوں نے عوام کو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے اُبھارا، رضاکاروں کے دستے منظم کئے جو سرکاری عمارتوں، بنکوں اور اہم ناکوں پر باقاعدہ فوجی ڈسپلن کے تحت پہرہ دینے کے فرائض انجام دینے لگے۔ اُن پُرآشوب ایّام کا ایک منظر میری طرح یہاں کے ہزاروں لوگوں کے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوگا جب، لال چوک میں پلیڈیم سینما کی عمارت کے سامنے لوگوں کا ایک بھاری مجمع موجود تھا۔ بخشی صاحب کا رنوسوں کی ایک پیٹی پہنے عمارت کی کھڑکی میں کھڑے تھے۔ اُن کے ریوالور کے چمڑے کا کیس چوک میں کھڑے لوگوں کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چوک میں اتنا شور تھا کہ کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ معاً بخشی صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھایا۔ یک لخت ہر طرف خاموشی چھا گئی اور اسی خاموشی میں بخشی صاحب کی پُروقار آواز گونج اُٹھی اور اُنہوں نے کہنا شروع کیا کہ حملہ آوروں کی پیش قدمی روک لی گئی ہے۔ چند الفاظ کہنے کے بعد اُنہوں نے ایک قبائلی حملہ آور کو کھڑکی میں کھڑا کیا جو سہما ہوا سا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ہجوم نے "لعنت لعنت" کی آوازیں بلند کیں۔ اُنہیں اس بات کا اطمینان ہوا کہ حملہ آوروں کی پیش قدمی روک لی گئی ہے۔

پاکستانی حملہ کے دوران جموں میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے تھے جن کے پیشِ نظر وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بخشی صاحب وہاں بھی پہنچے اور چند دِنوں کے اندر اندر ہی صورت حال کو سُدھارا، آج بھی دیوا وٹالہ اور پاکستانی سرحد کے قریب واقع جموں کے بیسیوں دیہات میں رہنے والے بہادر ڈوگرے اُن دِنوں کو یاد کرتے ہیں کہ بخشی صاحب نے کبھی بھی خطرے کے سامنے حوصلہ نہ ہارا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ سرحدوں پر جاتے

تھے اور حملہ آوروں کے خلاف عوام کی مزاحمت منظم کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک نائب وزیر اعظم کی حیثیت میں اور ۱۹۵۳ء سے لے کر آج تک وزیر اعظم کی حیثیت میں بخشی صاحب نے جس طرح سے ایڈمنسٹریشن کے مسائل حل کئے۔ جس طرح نازک مراحل پر عوام کی ڈھارس بندھائی اور جس طرح سے اپنے گوناگوں فرائض انجام دئے، وہ ایک طویل کہانی ہے جسے ایک مختصر سے مضمون میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کہانی میں سے چند ایک اہم واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

سندھ ویلی ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کی تکمیل میں تاخیر واقع ہوئی اور عوام انجینئروں اور متعلقہ سٹاف کے خلاف بیزار تھے۔ مہورا پاور ہاؤس پر اس قدر دباؤ پڑا تھا کہ ایک سو اینڈن پاور کا لیمپ ایک چھوٹے سے کمرے کو بھی روشن نہیں کر سکتا تھا۔ بخشی صاحب نے جب وزارت عظمیٰ کا چارج سنبھالا تو انجینئروں کی ایک میٹنگ بلائی اور ان کے ساتھ پروجیکٹ کے تمام پہلوؤں کے متعلق بات چیت کی۔ آپ نے اُن تمام مشکلوں کو دور کیا جو اس کی تکمیل میں مانع تھیں اور انجینئروں کو ہدایت دی کہ وہ اس کو ایک خاص میعاد کے اندر مکمل کریں۔ ان کی اس ہدایت کے مطابق کام مقررہ وقت کے اندر مکمل ہوا۔ اور بجلی کے متعلق عوام کی دقتیں دور ہو گئیں۔

جہلم ویلی روڈ بند ہونے کی وجہ سے اس بات کی ضرورت بڑی طرح سے محسوس کی جا رہی تھی کہ جموں اور سرینگر کے درمیان سال بھر ٹریفک جاری رہے ــــ ۱۹۵۴ء میں بخشی صاحب نے اپنی ایک تاریخی تقریر میں کہا تھا "ہم پہاڑوں کا سینہ چیر کر راستے بنائیں گے"۔ بہت کم لوگوں کو خیال تھا کہ بخشی صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقیقت بن کے رہے گا۔ لیکن صرف تین سال بعد جواہر ٹنل کا ایک ٹیوب مکمل ہوا اور بانہال روڈ کو سال بھر کھلا رکھنے کے سلسلے میں ایک اہم مرحلہ طے ہوا۔ عوام کی مدد کرنے اور ان کی کسی مشکل کو آسان کرنے کا سوال ہو تو بخشی صاحب ذاتی آرام و آسائش کو بالائے طاق رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی سلامتی تک کی بھی پروا نہیں کرتے، پچھلے سال جموں سرینگر سڑک نگر کوٹ کے قریب بہہ گئی۔ ٹریفک رُک گیا اور عوام کو سخت تکلیف ہوئی۔ بخشی صاحب سڑک ٹھیک کرنے کے متعلق پبلک ورکس کے کام کی رفتار سے مطمئن نہیں تھے اور انجینئروں اور دوسرے لوگوں کے مشورے کی پروا نہ کرتے ہوئے خود موقع پر پہنچے اور اپنی نگرانی میں نہ صرف کام مکمل کر ایا بلکہ جب سڑک ٹھیک ہو گئی تو اس کی درستی کی آزمائش کے لئے خود پہلی گاڑی میں سڑک کے اس حصے کو عبور کیا۔

۱۹۵۷ء میں تین بار سیلاب آئے جس سے فصلوں کو نقصان پہنچا۔ بچی کھچی فصلیں قبل از وقت برف باری سے برباد ہوئیں۔ ادھر سرکاری گوداموں میں اناج کا بہت تھوڑی مقدار موجود تھی۔ حکومت نے فوراً باہر سے غلہ منگوایا۔ اور غلہ یہاں دھڑا دھڑ پہنچنے لگا۔ اسی دوران خبر آئی کہ اناج سے بھری ہوئی چند گاڑیاں بانہال پر برف کی وجہ سے پھنس گئی ہیں اور ڈرائیوروں اور کلینروں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ بخشی صاحب فوراً موقع پر گئے۔ شدت کی سردی میں کھانے کا سامان لے کر پیدل اُس جگہ گئے جہاں گاڑیاں رُک گئی تھیں۔ آپ کی آمد سے نہ صرف ڈرائیوروں اور کلینروں کی جان میں جان آئی بلکہ مزدوروں کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔ سڑک سے برف ہٹائی گئی اور شام تک گاڑیاں سرینگر پہنچ گئیں۔

خطرے کو دیکھ کر نہ گھبرانے اور ایسے موقع پر عوام کا ساتھ دینے کے متعلق بخشی صاحب کی عادت کا اُن کے کنبہ پر کس قدر اثر ہے، اس کی ایک مثال ۱۹۵۱ء میں فراہم ہوئی جب ساری وادی میں زبردست سیلاب آیا تھا اور سرینگر شہر کے ڈوبنے کا خطرہ محسوس ہوا۔ بڑے بڑے لوگوں نے وقت ضائع کئے بغیر ایسی جگہوں میں پناہ لی جہاں تک پانی پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ جن اصحاب سے عوام کو سیلاب سے بچانے کی توقع تھی وہ خود اپنے بال بچوں اور پالتو جانوروں کو لے کر چشمہ شاہی ایسے مقامات کی طرف بھاگے۔ بخشی صاحب کسی سرکاری کام سے دہلی گئے تھے۔ اُن کی بیگم صاحبہ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنی قیام گاہ کو چھوڑ کر کسی اونچے مقام پر چلی جائیں۔ لیکن انہوں نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ اور صاف طور پر کہہ دیا کہ "بخشی صاحب اگر یہاں ہوتے تو وہ کبھی عوام کو اپنے حال پر چھوڑ کر نہ جاتے۔ اس لئے میں کیونکر کوئی ایسا قدم اُٹھا سکتی ہوں جو اُن کی مرضی اور منشا کے منافی ہے۔"

بخشی صاحب فطرتاً ایک باعمل انسان ہیں۔ ۱۹۵۳ء تک لمبی چوڑی تقریریں کرنے کے عادی نہ تھے لیکن ۱۹۵۳ء میں وزیر اعظم بننے کے بعد انہیں پہلی مرتبہ حزب مخالف سے نبٹنا پڑا۔ اس رول کو نبھانے میں آپ نے قابلیت

تعمیر

بردباری اور سنجیدگی کا ثبوت دیا۔ کئی مرتبہ حزبِ مخالف نے اپنی تقریروں سے بظاہر حکومت کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بخشی صاحب نے اپنے مؤثر اور مدلل جوابات سے ہر بار اُنہیں چپ کرا دیا۔ اس حیثیت میں آپ کو بڑی طویل تقریریں کرنا پڑیں اور مختلف محکموں کے افسرانِ اعلیٰ اور اُن کے پرائیویٹ آفس کے اہل کاروں کو معلوم ہے کہ اپنی تقریروں کے لئے تیاری کرنے اور اعداد و شمار جمع کرنے میں بخشی صاحب کے لئے کئی کئی راتوں جاگتے رہنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسمبلی کے ریکارڈ میں اُن کی ایسی معرکۃ الآرا تقریروں کی رپورٹیں محفوظ ہیں۔

اپنے سیاسی مخالفین کو زیادہ سے زیادہ رعائتیں دینا اور اُن سے فراخ دلانہ برتاؤ کرنے کے متعلق بخشی صاحب کی عادت اُن کے بہترین مداحوں کے لئے ایک معمے سے کم نہیں۔ ایک مرتبہ آپ سرینگر کے سنٹرل جیل کا معائنہ کر رہے تھے تو ایک سیاسی نظر بند نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور اُن سے صاف صاف کہدیا۔ "مجھ سے اب اپنے عزیزوں کی جدائی برداشت نہیں ہوتی، آپ کے ساتھ ہی میں جیل سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ بخشی صاحب نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں آنسو چھلک آئے تھے۔ آپ نے موقع پر ہی حکم صادر کیا اور سیاسی نظر بند آزاد ہوا۔ سیاسی مخالفین کے اہل و عیال کا خیال رکھنے، اُن کے عزیزوں کو تعلیمی وظائف دینے اور اُن کو اعلیٰ تربیت دلوانے کے متعلق بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

بے حد معروف ہونے کے باوجود بخشی صاحب کو معمولی معمولی باتوں کا کس قدر خیال رہتا ہے، اس کے متعلق کچھ بتانا موزوں رہے گا۔ چند دن پہلے کی بات ہے کہ وہ پہلگام میں تھے۔ طلبا کی طرف سے منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے وہ آ رہے تھے کہ بر لب سڑک اُنہوں نے ایک کارکن کو منتظر پایا۔ اس کارکن سے وہ کسی وجہ سے ناراض تھے۔ تقریب میں شرکت کرنے کے بعد جب وہ واپس اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے تو اس کارکن کو بدستور وہاں پایا۔ کارکن نے بھی یہی راستہ لیا اور جب کچھ دیر بعد بیرونی دروازے پر پہنچا تو نوکروں نے اُسے خلافِ توقع اندر آنے سے نہیں روکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بخشی صاحب نے قیام گاہ پہنچتے ہی ہدایت دے رکھی تھی کہ فلاں کارکن کو اندر آنے سے نہ روکا جائے۔

بخشی صاحب جب دورے پر ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ کے سٹاف اور اخبار نویسوں کی آرام و آسائش کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ خود بعد میں کھاتے ہیں، سب سے پہلے ان کو کھلاتے ہیں۔ دعوتوں کے موقع پر اُنہیں اس بات کا خاص خیال رہتا ہے کہ مہمانوں کے ڈرائیوروں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ آپ کے عہد میں ریاست میں تعمیر و ترقی کے بیسیوں کام انجام دئے گئے اور اس وقت بھی انجام دئے جا رہے ہیں۔ بڑی عمارتوں کی رسم افتتاح کے موقع پر آپ اُن کاریگروں اور مزدوروں کو فراموش نہیں کرتے جنہوں نے کسی پروجیکٹ پر کام کیا ہوتا ہے۔

وزیر اعظم کی حیثیت میں اُنہیں بے شمار کاغذات پر دستخط کرنے پڑتے ہیں، لیکن یہ کام بھی آپ میکانکی انداز سے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ ایک صبح آپ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا اور اُن سے کہا کہ کل شام میں نے ایک چٹھی پر دستخط کئے ہیں جس کی زبان مجھے کچھ اصلاح طلب معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اُسے واپس لایا جائے۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے اس پر متعلقہ محکمہ کو ٹیلی فون پر مطلع کیا کہ چٹھی واپس کی جائے۔ چنانچہ چٹھی واپس لائی گئی اور اس میں واقعی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں۔

بخشی صاحب کو عوام سے اور عوام کو بخشی صاحب سے پیار ہے۔ روزانہ سینکڑوں لوگ آپ سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ جمعہ کو تو کئی گھنٹے آپ عوام سے درخواستیں لینے پر صرف کرتے ہیں۔ اور آپ پر لوگوں کے اعتماد اور بھروسہ کا یہ عالم ہے کہ وہ آپ کے پاس اپنے گھریلو تنازعے نپٹانے کے لئے بھی آتے ہیں۔ کئی پارٹیوں پر بخشی صاحب نے کھانے پینے کا سارا سامان اُن لوگوں میں تقسیم کیا جو وہاں تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ عیدین کے موقع پر بچے اور جوان جس بے تکلفی سے آپ سے عید کا مانگتے ہیں تو وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کی ان ہی سخاوتوں کے پیش نظر مشرق وسطےٰ کے ایک مُلک کے سرکردہ مدبر نے یہاں کے ایک بزرگ سے کہا۔ "یاد رکھو بخشی صاحب ایک طویل عرصہ تک برسرِ اقتدار رہیں گے، خدا کی امداد اُن کے ساتھ ہے۔" اور جس لگن اور یکسوئی سے عوام کی خدمت کر رہے ہیں، جس اَن تھک طریقے سے وہ کام کرتے ہیں اور جس طرح سے وہ خود ریاست کے کونے کونے میں پہنچ کر خود عوام کے مسئلے حل کرتے ہیں اُس کے پیش نظر ایک دوست بار بار کہتا ہے کہ بخشی صاحب نے اُن اصحاب کے لئے کام دشوار بنا دیا ہے جو اُن کے بعد وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہیں گے۔

تعمیر



بخشی صاحب! ایک
بات اور......



ماتا! میں سیوا کے لئے
حاضر ہوں"



یعنی آگے چلیں گے دم لیکر۔



سب کا اپنا۔ سب کا دوست

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عدم جاذبیت کے کس قدر کور ذوق واقع ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیشہ عظیم انسانوں کے جیتے جی اُن کی عظمتوں اور اُن کے محاسن کا اعتراف کرنے میں بخیل ثابت ہوئی ہے، البتہ اُن کے کھو جانے پر روتی پیٹتی نظر آتی رہی ہے۔ لیکن یہ صحت اعتراف کی پاکیزگی نہیں ہوتی بلکہ محض لاچاری، جس کے آنسو ترازوئے عدل کو متوازن نہیں کر سکتے۔ وہ عدل ہی کیا جو حیاتِ ضرر رسیدہ کی اشک شوئی سے تو راہِ فرار اختیار کرے مگر جنازے کے تعاقب میں سمندِ بے لگام کی صورت لنگڑی دوڑ دوڑتا پھرے۔

ایسے حالات میں کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جن کی عظمت کے آگے اُن کے جیتے جی زمانے کی یہ قبیح عادت ہتھیار ڈال کر اُن کے محاسن کی داد دے۔ میں اگر کہوں کہ بخشی صاحب ایسے ہی بزرگوں میں سے ایک ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ اسی خوش نصیبی کے متعلق میرا اعتقاد ہے کہ یہ خدا کی دین ہے جسے وقت کا کوئی بھی جابر ہاتھ بخشی صاحب سے چھین نہیں سکتا۔ بخشی صاحب کے متعلق یہ اور اس قسم کے دیگر حقائق اس قدر نمایاں ہیں کہ میری تائید کی ضرورت نہیں۔ البتہ آج چونکہ "تعمیر" اپنا یہ شمارہ بخشی صاحب کے ساتھ منسوب کر رہا ہے، میں بھی اس موقع پر بخشی صاحب کی ذاتِ گرامی کی خدمت میں اپنی معمولی سی استعداد کے مطابق نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت پا سکوں۔ محبوبِ نظر اور مرغوبِ خاطر یادوں میں سے دو ایک کا تذکرہ کروں گا جو میرے لوحِ دل پر کندہ ہیں:-

حال ہی کا واقعہ ہے کہ شری نہرو لداخ کے سرحدی علاقوں کا دورہ کرنے کی غرض سے کشمیر تشریف لائے تھے۔ دورے سے فراغت پا کر بخشی صاحب کی سرکاری قیام گاہ پہ پروگرام کے مطابق انہیں نیشنل کانفرنس کارکنوں سے خطاب کرنا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں کارکن اور اکابرینِ تنظیم جمع تھے اور میں جلسہ گاہ کے شمال کی طرف پریس گیلری میں بیٹھا تھا۔ بخشی صاحب انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے اور کارکن فرطِ عقیدت سے پنڈت جی زندہ باد اور [illegible] زندہ باد کے نعروں سے ہمالہ کا مضبوط دل ہلا رہے تھے۔ اتنے میں پنڈت جی کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور نعروں کی شدت میں ناگوار حد تک اضافہ ہوا۔ آخر بخشی صاحب نے اس غرض سے کہ پنڈت جی کے ایک لمحے کا بھی بے جا مصرف نہ ہو، خاموش رہنے کا حکم دیا۔ چھوٹے بڑے سبھی کارکن خاموش ہو گئے۔ لیکن کمترین قوم کا ایک جوان جو کہ فطرت کی ستم ظریفی سے گونگا بھی ہے اور بہرا بھی، اور بخشی صاحب کی عام مجلسوں میں خودکار مشین کی طرح سرگرم نظر آتا ہے، پھر بھی اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر چلاتا رہا۔ حاضرینِ مجلس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئی۔ قریب تھا کہ کسی کارکن کی جسمانی قوت، نزاکتِ وقت کے شدتِ احساس کے زیرِ اثر یہ گونگی مگر پُرخلوص شرارت روک سکے کہ بخشی صاحب بھانپ گئے اور یکلخت دوڑ کر گونگے کے پاس یہ کہتے ہوئے تشریف لائے کہ خبردار جو کسی نے میرے گونگے دوست کی شان میں گستاخی کی۔ اس کی بولی میں ہی جانتا ہوں اور یہ میری ہی بولی سمجھتا ہے۔" گونگے کو ایک طرف لیا۔ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چھاتی سے لگایا اور پھر دونوں دوستوں کے درمیان اشارات کی زبانی گفت و شنید ہوئی۔ ہم سب نے دیکھا کہ بخشی صاحب کا گونگا دوست اُن کا ہاتھ چوم کر پیر چھوتا ہوا کامل اطمینان کے ساتھ خاموش بیٹھ گیا اور بخشی صاحب مسکراتے ہوئے ڈائس کی طرف چل پڑے۔ کس قدر دلفریب تھا افہام و تفہیم کا وہ منظر! مجھے اب تک یاد ہے۔

گذشتہ عید الفطر کا دوسرا دن تھا اور بخشی صاحب سرینگر کی سرکاری قیام گاہ پر لوگوں سے مِل رہے تھے۔ عید مبارک کہنے والوں میں عام لوگ بھی تھے اور سِول اور ملٹری حکام بھی۔ اتنے میں محکمہ ٹرانسپورٹ کا ایک چپراسی آیا اور کچھ تو اپنے احساسِ کمتری کے باعث اور کچھ تو موقع کی نزاکت کی وجہ سے مجلس سے تھوڑی دُور رُک گیا۔ بخشی صاحب کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا اور چپراسی سے مُسکراتے ہوئے بولے۔ "دوست! ہم سے آج کیا خطا سرزد ہوئی ہے جو رُوٹھ کر دُور دُور ہی رہے۔" چپراسی ہنستا ہوا آگے آیا۔ سلام کرتے ہوئے مصافحہ کیا۔ بخشی صاحب اپنے چپراسی دوست کی مزاج پُرسی کر ہی رہے تھے کہ عین اُسی وقت کوئی برگیڈیر بھی آ پہنچا اور فوجی سلام پیش کرنے کے بعد بخشی صاحب سے ہاتھ ملانے لگا۔ ہم اس وقت سوچتے رہے کہ دیکھیں کہ وہ لمحات کی اس کڑی آزمائش سے بخشی صاحب کیسے گذرتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت ایک چپراسی کا دل بھی انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور برگیڈیر کی توقعات بھی اسی قسم کی کشمکش سے گذر رہی تھیں ایک جج صاحب نے، جو پاس ہی بیٹھے تھے، چپراسی سے ایک طرف ہونے کو کہا۔ لیکن بخشی صاحب نے اشارے سے منع کرتے ہوئے چپراسی کے بائیں کندھے پر بایاں ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی چھاتی سے لگائے رکھا اور داہنا ہاتھ برگیڈیر سے مِلا کر عدل و مساوات کی لاج بھی رکھ لی اور اپنی قوتِ فیصلہ کا بھی ایک سبق آموز مظاہرہ کیا۔

بخشی صاحب کی عام مُلاقات لیلئے جمعہ کا دن تھا۔ وہ لوگ جنہیں اس قسم کی عام مُلاقات کی کسی تقریب میں شرکت کا موقع مِلا ہے، اس بات سے واقف ہیں کہ اس روز بخشی صاحب نوع نوع کے مُلاقاتیوں سے وہ کچھ کہتے سُنتے نظر آتے ہیں جو بے حد دلچسپ بھی ہوتا ہے، اور سبق آموز بھی۔ فریادیں ہوتی ہیں، داد رسیاں ہوتی ہیں، سنجیدہ لطیفے ہوتے ہیں، اقرار زیادہ ہوتے ہیں اور بعض ناگزیر حالتوں میں کچھ انکار بھی ہوتے ہیں، لیکن انکار ایسے، جن میں اقرار سے کہیں زیادہ مٹھاس ہوتی ہے۔ ٹوٹے دِل جوڑے جاتے ہیں اور پھوٹی تقدیریں سنورتی ہیں۔ اصلاحِ نفس کے لئے نصیحتیں ہوتی ہیں، دُعائیں ہوتی ہیں۔ رو رو کر آنے والے ہنس ہنس کر جاتے نظر آتے ہیں اور آہیں بھرتے ہوئے آنے والے گردنیں اکڑا کر واپس آتے ہیں۔ غرض یہی چیزیں ہیں جن سے جمعہ کی بہار ترتیب پایا کرتی ہے اور اسی بہار میں

تیمر

بخشی صاحب کی دِل نواز شخصیت بہاراں نظر آتی ہے۔ الغرض جمعہ کی وہ بہار جس کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، اپنی رعنائیوں سے دِل کشی کے سامان مہیا کئے جا رہی تھی۔ لوگ "میں پہلے" - "میری باری ہے۔" "مجھے صرف سلام کرنا ہے۔" "مجھے صرف بخشی صاحب کو دیکھنا ہے۔" "مجھے بخشی صاحب نے فلاں روز جب کہ میں نے اُن کی گاڑی روکی تھی، آج آنے کو کہا ہے" چلا چلا کر نجی دفتر کے حکام سے گتھم گتھا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص انتہائی کرخت لہجے میں چلاتا سُنائی دیا کہ "بخشی صاحب! یہ لوگ مجھے چھوڑتے نہیں، مجھے آپ سے نہایت ضروری کام ہے، مجھے آنے دیجئے ورنہ میں یہاں خودکشی کر دوں گا۔" بخشی صاحب جو کمرے میں موجود مُلاقاتیوں کے ساتھ مصروفِ کلام تھے، یک لخت بول اُٹھے — "شاید زینہ دار محلہ کا بُڈھا ہانجی ہے۔ چیرسی ہے، آنے دو اسی کو پہلے۔" پرائیویٹ آفس کا ایک کارندہ جھٹ گیا اور فریادی کو پیش کیا۔ جانکاروں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ وہی بُڈھا ہانجی سامنے تھا جس کے بارے میں بخشی صاحب پیشین گوئی فرما چکے تھے۔

بُڈھا ہانجی: بخشی صاحب! اس ماہ دو ایک بار نکسیر پھُوٹنے کے عارضے سے ہفتہ بھر کام نہیں کر سکا ہوں، اس لئے ماہانہ راشن کے لئے پیسے جمع نہ کر سکا۔ جمعہ کا منتظر رہا۔ آج ۹ بجے صبح راشن ٹکٹ گھاٹ منشی کے پاس چھوڑ آیا ہوں، اس وقت ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہے۔ گھاٹ پر میرا نام پُکارا جاتا ہوگا۔ جلدی کیجئے اور پیسے دیجئے۔ شالی کی کٹائی بھی مشین پر جا کر کرانی ہے۔ جلدی کیجئے بخشی صاحب، ورنہ شام کو فاقہ کرنا ہوگا۔

بخشی صاحب: (مُسکراتے ہوئے) آج میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔

ہانجی: بُڈھی (ہانجی کی بیوی) کیا کھائے گی؟

بخشی صاحب: اُس کے لئے کھانا ساتھ لے جاؤ۔

ہانجی: لیکن بُڈھی کہے گی کہ تم نے بخشی صاحب کے ساتھ نہ جانے کس قسم کی ضیافت کھائی ہوگی اور میرے حصے میں اُس سے کم آیا ہوگا۔ تو پھر بخشی صاحب! رات بھر جھگڑا رہے گا اور شہادت میں آپ کو خود آنا پڑے گا۔

بخشی صاحب ہنستے ہوئے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے لیکن روپیہ ندارد۔

آخر بخشی صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے میرا نام لیا۔ اس لئے کہ میں اُن کے قریب بیٹھا تھا لیکن ساتھ ہی (میری ناداری کا صحیح اندازہ کر کے) فرمایا نہیں۔ اس کے بعد پرنسپل کول سے کہا۔ "پانچ روپے دیجئے۔" بخشی صاحب مانگنے والے ہوں تو کون ہے جو اپنی حسین آرزوؤں کا شباب بھی چھپا سکے۔ چشم زدن میں پانچ روپے کا نوٹ میز پر تھا۔ اس کے بعد بخشی صاحب کی نگاہ منزل شناس گھوم کر پھرتی ہوئی قیوم صاحب (ممبر اسمبلی) کے چہرے پر جم گئی۔ جس نے کوٹ کے بٹن کھولے نہیں بلکہ کالر پکڑ کر اتنا شدید جھٹکا دیا کہ بٹن بخشی صاحب کے قدموں پر اور پانچ روپے میز پر نظر آئے۔ ابھی انتہائی بے تابی کے ساتھ دس روپے کی دُنیا لُوٹ گیا۔ کیفیت یُوں تھی کہ پانچ پانچ کے دو نوٹ ہاتھ میں، خوشی کے چند آنسو پلکوں پر اور بخشی صاحب کے لئے دُعائیں زبان پر۔

یہ ہے یادوں کا وُہ سوغات، جو اب تک میرے دِل کے تہہ خانے میں موجود ہے۔ بخشی صاحب کی زندگی اس قسم کی لاکھوں ادائیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ہر ادا میں خلوص کی ایک ایک دُنیا بسی ہوئی ہے اور ایسی دُنیا جہاں نمود و نمائش کا خفیف سا دھبہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہی ہے وہ حُسنِ عمل جس نے کبھی بھی کوئی ناجائز اثر قبول نہ کیا اور جس کی بنا پر میرا یہ اعتقاد روز بروز زیادہ راسخ ہو جاتا ہے کہ وزیر اعظم کشمیر کے ایوانِ وزارت سے بخشی صاحب کا قصرِ عظمت ہی بلند تر ہے جس کے دریچے گروہِ مصیبت زدوں اور بے کسوں کے لئے ہر وقت کھُلے رہتے ہیں۔

جری رہنما

"بحیثیت وزیر اعظم وہ ایک قدیم مُغل روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بخشی صاحب نے کچھ دن مخصوص رکھے ہیں جب کہ کوئی بھی شخص بلا اپنی شکایت کے کر اُن سے مِل سکتا ہے ... وہ سخت بھی ہیں اور مہربان بھی۔ سیکولر ازم (غیر مذہبی جمہوریت) پر اُن کا یقین اٹل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے لئے کشمیر کا ہند سے الحاق ایک دائمی اور قائمی رشتہ ہے۔ ... اور اس سلسلہ میں سکیورٹی کونسل ہو یا پاکستان، شیخ عبداللہ ہو یا کوئی اور فہم باز، وہ کسی بھی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ... بخشی صاحب فرقہ پرستوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور سازشیوں پر رحم نہیں کھاتے ... اُنہوں نے ۱۹۵۰ء کے سیلاب میں اپنی بہادری اور جوانمردی کا زبردست ثبوت دیا جب کہ اُنہیں گھٹنوں تک پانی میں سے گذرتے ہوئے کندھوں پر چاول کی بوریاں لئے میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔"

(کے ایل شریدرانی)

مجاہد کشمیر

ہے اس کا جشنِ سالگرہ کتنا جاں فروز
دِل کا فقیر ترکِ مجسم کہیں جسے

بخشی لقب غلام محمد ہے جس کا نام
فردِ عظیم مردِ مقدم کہیں جسے

وہ رائت بلند نشاں جس کے زیبِ دست
آزادیِ خیال کا پرچم کہیں جسے

سینے میں جس کے لاکھ رموز و نکات دفن
راز کار کا محرم کہیں جسے

جس کشتیِ عظیم سے طوفاں بھی آب آب
اِک اُس کا ناخدائے مکرم کہیں جسے

پیچیدگی سے ناخنِ تدبیر آشنا
عقدہ کشائے گیسوئے برہم کہیں جسے

جس کی نظر تمام نشیب و فراز پر
معنی شناس ہر طرب و غم کہیں جسے

آمادۂ معارف سلسل وہ جاں سپار
دِلدادۂ کشاکشِ پیہم کہیں جسے

ایسا ضمیر صاف کسی کو کہاں نصیب
پہلو میں دِل وہ آئینۂ جم کہیں جسے

قُدرت اس سے جس کے سر پہ دو عالم کی نعمتیں
اس کے قریب فخرِ دو عالم کہیں جسے

جس کی نظر میں کفر سے نفرت بھی کفر ہے
اسلام کا حبیبِ مسلّم کہیں جسے

کشمیر کا نجات دِہندہ گراں لقب
اس سرزمیں کی رُوحِ رواں ہم کہیں جسے

اس کی نظر سے ہر دِل زخمی ہے مطمئن
اس کی نظر کا لطف وہ مرہم کہیں جسے

ہم اس کے جشنِ سالگرہ میں شریک ہیں
نہرو بھی ملک و قوم کا ہمدم کہیں جسے

دِل اس کا گرم گرم بھی اور اس کا نرم بھی
شعلہ کبھی کہیں کبھی شبنم کہیں جسے

وہ ولولے وہ جوش وہ ہمّت وہ حوصلے
اور اس پہ عزم عزم وہ محکم کہیں جسے

وہ اشک شوئے دیدۂ گریاں اُسے نصیب
دامن وہ دامنِ بن مریم کہیں جسے

جس پر نثار دیدۂ حوّا کی عصمتیں
سینہ وہ اس کا سینۂ آدم کہیں جسے

اُس کے لئے زباں پہ دُعائیں ہزار ہیں
کشمیر کا مجاہدِ اعظم کہیں جسے

حنیف ربانی عزیز

مسیحائے کشمیر

بخشی صاحب کا چہرہ ۔ شانہ اور ناک کشادہ، جسم موٹا، صحت اچھی اور قد میانہ ہے۔ وہ مونچھیں بھی رکھتے ہیں۔ کانوں کے اوپر کے بال قدرے سفید ہیں۔ یہ ہے بخشی صاحب کا سراپا، وہ آج سے ۵۴ سال پہلے ۱۹۰۷ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک غریب کشمیری خاندان سے ہے۔ اسی غریب خاندان میں بخشی صاحب کی پرورش ہوئی بچپنے سے جوانی تک وہ آفات و مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔ چونکہ فطرتاً ذہین اور محنتی تھے اس لئے اسکول میں ان کا تعلیمی کردار قابل تعریف رہا۔ اسکول سے باہر کرہ پیمائی، تیراکی سماجی بہبود اور کھیل سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ غریبی کے باعث انہیں اپنی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ لاعلاجی و افلاس کے مسکن لداخ کے ایک اسکول میں ایک معمولی عہدہ پر ان کا تقرر ہو گیا۔ بخشی صاحب کو کشمیری زبان پر عبور حاصل ہے۔ وہ انگریزی اور اردو میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ ادب و ثقافت سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ لداخ کے دورانِ ملازمت میں انہیں بہت ہی قریب سے عوام کی اقتصادی، اخلاقی، سماجی، تعلیمی و تہذیبی حالت کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ حالات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اُن کا سیاسی شعور بیدار ہوتا گیا۔ اُن دنوں ملک کی سیاسیات پر مہاتما گاندھی چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف انڈین نیشنل کانگرس کا دور دورہ تھا۔ وہ اسکول کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر سیاسی کارکن بن گئے اور ریاست میں سب سے پہلے "سمندر پار کی چیزوں کا بائیکاٹ کرو" کی ہمہ گیر و کامیاب تحریک چلائی۔ اس وقت ریاست میں سیاسی بیداری کا نام و نشان نہ تھا۔ حکومت بخشی صاحب کی سرگرمیوں سے خوف زدہ ہوئی۔ وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اسکول کی ملازمت چھوڑنے کے بعد بخشی صاحب کچھ دنوں کھادی بھنڈار کی شاخ سرینگر میں ملازم ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں تحریک آزادی کے ساتھ انہوں نے مکمل وابستگی اختیار کر لی۔ وہ شخصی راج کے خلاف برابر احتجاج کرتے رہے۔ طلبا، مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی تنظیم اور ان کی یونین بناتے رہے۔ بخشی صاحب کشمیر مسلم کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے لیکن وہ مہاتما گاندھی کی قیادت اور انڈین نیشنل کانگرس کی سرگرمیوں سے متاثر و متفق تھے۔ ان کا نظریہ غیر مذہبی تھا اور پوری ریاست کے عوام کا مفاد پیشِ نظر تھا، اس لئے انہوں نے مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ دیا۔ جس کی وجہ سے نیشنل کانفرنس تمام کشمیریوں کی واحد نمائندہ اور مقبول و محبوب جماعت بن گئی۔ اس میدان میں بخشی صاحب اپنی استعداد اور صلاحیت، ایثار و قربانی اور قابل قدر سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک معمولی استاد اور کھادی بھنڈار کے ملازم کے درجے سے بلند ہو کر ریاستی عوام کے معزز رہنما بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنی پُر خلوص خدمات سے جو رہنمائی و قیادت حاصل کی وہ ہر کسی کا حصہ نہیں ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بخشی صاحب تحریک جنگ آزادی میں چار بار جیل گئے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں وہ سولہ مہینوں تک ریاستی جیل میں محبوس رہے اور انہیں ہر طرح کی اذیت و صعوبت پہنچائی گئی۔ جب آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک چلائی تو بخشی صاحب ریاستی پولیس سے بچتے بچاتے ہندوستان چلے آئے اور تحریک کے حق میں ہندوستان کی رائے عامہ کو منظم کرتے رہے۔ وہ بہت دنوں تک دہلی میں پہاڑ گنج میں مقیم تھے۔ یہاں سے انہوں نے مختلف

شہروں کا دورہ کیا۔ اخباری نمائندوں، صحافیوں، ملکی رہنماؤں اور جمعیۃ العلمائے ہند کے اکابرین سے رابطہ پیدا کیا۔ انہیں دنوں وہ گاندھی جی سے ملنے سیوا گرام گئے۔ بخشی صاحب کی یہ تمام سعی و محنت کامیاب ہوئی۔ کاک وزارت کا خاتمہ ہوگیا۔ وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک کو ریاست چھوڑنا پڑی۔ انہیں دنوں مہاتما گاندھی کشمیر گئے۔ اُن کی واپسی پر بخشی صاحب کا وارنٹ گرفتاری منسوخ ہوگیا۔ پھر بخشی صاحب ایک ایسے فاتح و حکمران کی طرح ریاست میں داخل ہوئے جس نے آیا، دیکھا اور فتح کر لیا۔ "کشمیری عوام نے بخشی صاحب کا شاندار خیر مقدم کیا۔ ساری ریاست کے عوام نے بخشی غلام محمد گاندھی کی جے تک کے نعرے بلند کئے۔ جو عظمت سارے ملک میں گاندھی جی کو حاصل تھی وہی عظمت کشمیر میں بخشی غلام محمد نے پائی۔ بدقسمتی سے اسی درمیان میں ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ ریاست کی سرحدوں پر پاکستانی قبائلیوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں جس سے ریاست کی سلامتی خطرہ میں پڑ گئی۔ اس اہم و نازک مرحلہ پر بخشی صاحب کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ بڑھ گئیں۔ انہیں ریاست کی سلامتی و آزادی کی قیادت و حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ بخشی صاحب نے ریاست کے اندر فرقہ پرستوں، رجعت پسندوں، سامراجی عناصر، سرمایہ دار اور شیطانی طاقتوں کی سرکوبی و انسداد کے لئے زبردست جد و جہد کی۔ پاکستانی حملوں کے دوران ہندوستانی افواج کے ساتھ ہر مقام پر موجود رہے۔ جس کی وجہ سے بھارتی فوج کے افسروں سے ان کے گہرے اور خوشگوار تعلقات ہیں۔ جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستانی قبائلیوں نے دھاوا بولا تو بخشی صاحب وہ واحد نڈر اولوالعزم اور بے باک مجاہد تھے جنہوں نے اپنی بے مثال دماغی و تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سلامتی فوج کے نام سے ایک مضبوط دفاعی جماعت قائم کی۔ جس نے ریاست کے امن و امان اور سرحدوں کی حفاظت کی۔ دشمن شہر سے باہر ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ حالات انتہائی نازک اور پیچیدہ تھے اس دورِ پُرخطر میں بخشی صاحب اکثر ایسے مقامات پر دیکھے گئے جہاں ان کی زندگی کو خطرات لاحق تھے۔ مگر بخشی صاحب ہر خطرے کی پرواہ کئے بغیر اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ بھارت کے ایک فوجی افسر نے بجا طور پر یہ رائے دی تھی کہ دراصل بخشی صاحب ایک فوجی کمانڈر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ شہری لباس پہنتے ہیں۔ یہ سبھی کو معلوم ہے کہ بخشی صاحب سیکولر نظریات کے حامل ہیں۔ وہ پاکستان کے دو قومی نظریے کے ہمیشہ مخالف رہے اور جرأت و صداقت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قطعی ہے۔ یہ پالیسی اس وقت متعین ہو چکی تھی جب پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ ۱۹۳۸ء سے نیشنل کانفرنس ایک غیر فرقہ وارانہ اور کشمیریوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ وابستہ رہی۔ خان عبدالغفار خان، خدائی خدمت گار، نیشنلسٹ شخصیتوں اور جماعتوں سے اس کا گہرا تعلق رہا اور بخشی صاحب اس ارتباط و تعلق کی برابر حفاظت و قیادت کرتے رہے۔

ہندوستان کی آزادی چند لمحوں میں غارت ہو سکتی تھی اگر اس ملک کی ساڑھے چھ سو ریاستیں نظم و ضبط اور وفاداری کے ساتھ ہندوستان میں شامل نہ ہو سکتیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو ہماری سیاسی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے جس نے ریاستوں کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کو حل کیا اور جس کے سایۂ تدبر میں بحسن و خوبی نظم و ضبط اور وفاداری کے ساتھ دیش کی ساڑھے چھ سو ریاستیں ہندوستان میں شامل ہو گئیں۔ بالکل اسی طرح ریاست کشمیر کا ہندوستان سے الحاق اور اس جنتِ ہندوستان کی آزادی اور سلامتی کا تصور بخشی غلام محمد کے بغیر ناممکن و دشوار ہے۔

بخشی صاحب کی سیاسی زندگی اور ریاست سے ان کی وابستگی اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ وہ اجتماعی و عوامی معاملات میں ہمیشہ پُرخلوص اور عہدہ و منصب کی دوڑ دھوپ سے گریزپا رہے۔ وہ ملکی و قومی ذمہ داریوں کو بڑی وفاداری سے انجام دیتے ہیں۔ وہ دوسرے سیاست دانوں کی طرح مخصوص سیاسی عقائد کے قائل نہیں۔ وہ کسی "ازم" (ism) پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ ان کا نصب العین صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہے عوام کا ہے، جو کچھ کرو عوام کے لئے کرو۔ بخشی صاحب اپنے اس طریقۂ کار میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست کی پہلی عوامی وزارت قائم ہوئی تو وہ نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر مامور ہوئے۔

۹ اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے بعد ریاست کے وزیر اعظم ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی ۱۹۵۳ء میں بخشی صاحب کل ہند اسٹیج پر کلیانی (بنگال) میں نمودار ہوئے جہاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس موقع پر ہر طرف سے بخشی صاحب کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور مدراس (صوبۂ مدراس) میں بھی بخشی صاحب نے جنوبی ہند کے عوام کے سامنے مسئلۂ کشمیر کی جس قابلیت کے ساتھ وضاحت کی اُس سے جنوبی ہند کے لوگوں میں بخشی صاحب کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور آج سارا ملک بخشی صاحب کا سیاسی دُور اندیشی، عوامی مقبولیت اور عظیم خدمات کا معترف ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی سے ریاست میں جو سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی بخشی صاحب ہی کا تدبّر تھا جس نے حالات پر قابو حاصل کر کے ریاست کو تمام خطرات سے صاف صاف بچا لیا۔ اسی شخصیت کے بارے میں آنجہانی مسٹر سی۔ اے۔ ٹنڈل بسکو نے ۱۹۴۸ء میں جنوبی افریقہ میں کہا تھا کہ میرا شاگرد بخشی غلام محمد، جو آج نائب وزیر اعظم ہے، جلد ہی کشمیر کا وزیر اعظم ہوگا۔ اس پیشین گوئی کے مطابق بخشی صاحب نہ صرف کشمیر کے وزیر اعظم ہیں بلکہ ہندوستانی عوام اور بین الاقوامی دُنیا میں ایک امتیازی شان حاصل کر چکے ہیں۔ برطانوی لیبر لیڈر مسٹر بیون، مسٹر ایٹلی اور روسی رہنماؤں نے بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے بخشی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

میں دسمبر ۱۹۵۸ء میں ہندوستان کے ممتاز و مشہور اور صاحبِ طرز شاعر حضرت شفیق جونپوری کے ہمراہ ریڈیو کشمیر کے مشاعرہ میں شریک ہوا تھا۔ دوسرے دن جموں کی صنعتی نمائش میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ بزمِ مشاعرہ اپنے شباب پر تھی کہ ایک طویل قامت اور وجیہہ و شکیل انسان ڈرامائی انداز سے عوام کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک سب کی نگاہ اس پُراسرار شخصیت پر مرکوز ہو گئی اور لوگوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ آپ ڈائس پر تشریف رکھیں۔ مگر اس عجیب و عظیم شخصیت نے جواب دیا کہ میں عوامی آدمی ہوں۔ مجھے عوام ہی کے درمیان بیٹھنے دیجئے۔ ارباب محفل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ مسکراتے ہوئے ڈائس پر تشریف لائے۔
تھیم

اور ہمارے قریب بیٹھ گئے۔ یہ تھے ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد۔ وہ انہماک، توجہ اور دلچسپی کے ساتھ شعرا کا کلام سُنتے رہے اور اس انداز سے داد و تحسین دیتے رہے جس سے اُن کے ادبی ذوق کی چاشنی، شاعری سے والہانہ شیفتگی، نکتہ سنجی و سخن شناسی کی بلندئ معیار کا اظہار ہوتا تھا۔ میں مشاعرہ سے زیادہ بخشی صاحب کی شخصیت اور کردار و گفتار کا جائزہ لے رہا تھا۔ بخشی صاحب نے شعرائے کرام کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ہم سب بخشی صاحب کی جائے قیام پر پہنچ گئے۔ میں بخشی صاحب کی رہائش گاہ کو دیر تک بغور دیکھتا رہا۔ وزیر اعظم کی قیام گاہ نہ تو مغرب کا نگار خانہ تھی نہ ریاست و امارت اور جاہ و جلالِ حکومت کا قصرِ زریں تھا۔ بخشی صاحب کی آرام گاہ ایک ایسی جگہ ہے جس کے چاروں طرف سادگی و نفاست کا ظہور ہوتا ہے۔ جس میں آرائش و زیبائش کے لئے کوئی غیر ملکی سامان استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ فرنیچر سے لے کر عام استعمال تک کی چیزیں کشمیری یا ہندوستانی ہیں۔ ہر قسم کے کپڑوں میں صرف کھادی کا استعمال کیا گیا ہے۔ بخشی صاحب کے مخصوص کمرے اور عام مُلاقاتیوں کے کمروں میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی تصویریں آویزاں ہیں۔ میز، کرسی اور کھدر کے پردے مزین ہیں۔ ایک معمولی سرکاری افسر کے بنگلے پر آپ جو رنگا رنگی دیکھیں گے، وزیر اعظم کی کوٹھی پر اس کا عشر عشیر بھی آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

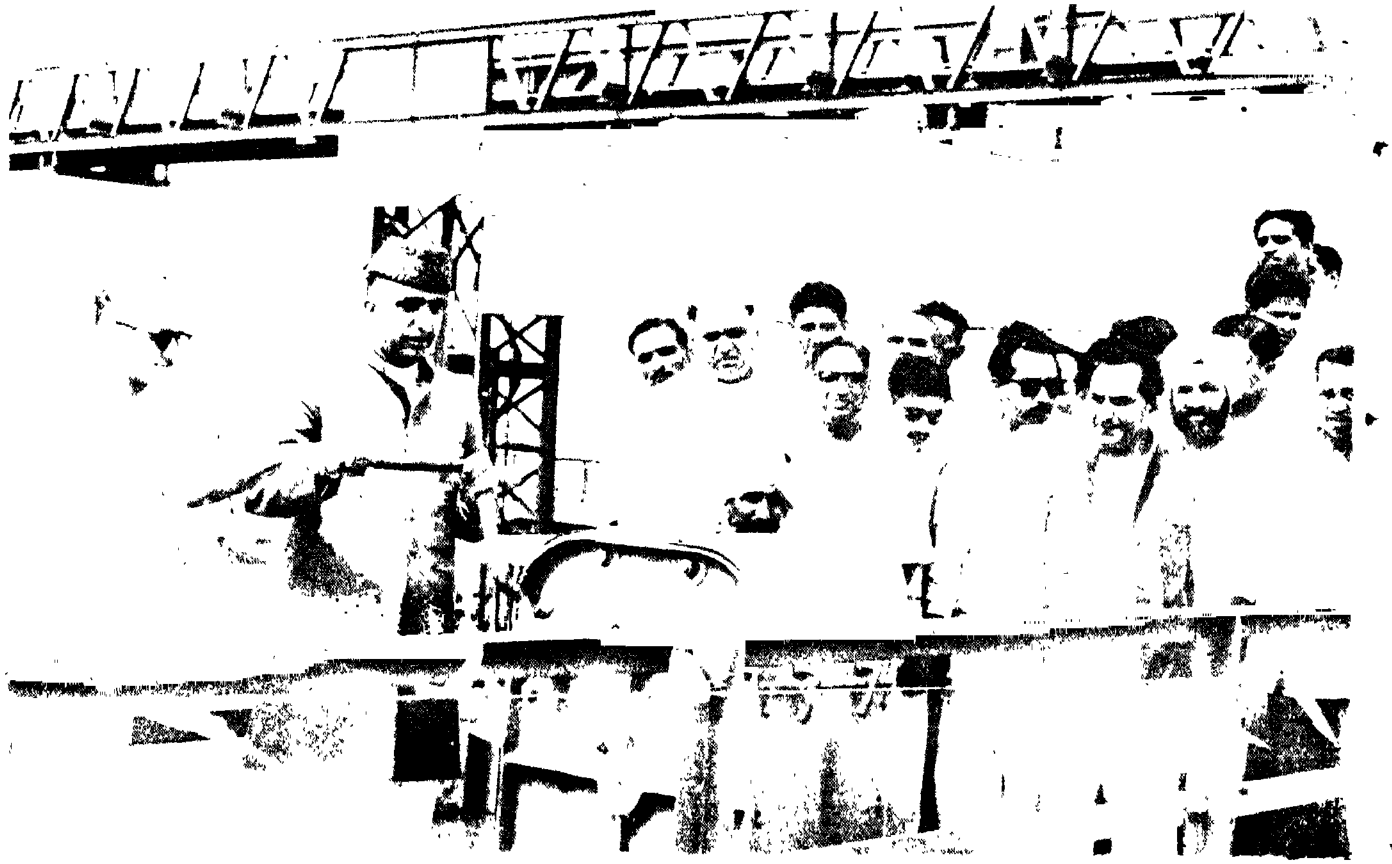
ہم سب مُلاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بخشی صاحب نے بذاتِ خود شعرائے کرام کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے حضرت شفیق جونپوری سے یوں متوجہ ہوئے — "کہئے شفیق صاحب، مزاج کیسے ہیں، اب آپ کی صحت کا کیا حال ہے؟" پھر کچھ دیر تک شفیق صاحب سے اس طرح گفتگو فرماتے رہے جیسے بہت پُرانی دوستی ہو یا کوئی قریبی عزیز و رفیق ہو جب کہ بخشی صاحب سے شفیق صاحب کی یہ پہلی مُلاقات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جس طرح بخشی صاحب کے رہن سہن، خورد و نوش، لباس و معاشرت اور ذوقِ طبع میں سادگی اور انفرادیت ہے اسی طرح وہ ہر شخص سے ملنے جلنے میں بھی انفرادی شان رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر ملنے والے کو اپنے ہی خاندان کا

فرد مزید سمجھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا خاندان بہت ہی بڑا ہے جو چالیس لاکھ کشمیریوں پر مشتمل ہے۔ وہ ہر کشمیری کی نشو و نما، تربیت و ارتقا اور اس کے روشن آئندہ مستقبل کی حفاظت و نگرانی کو اپنی خاندانی ذمہ داری سمجھتے ہیں جب کہ یہ وسیع خاندان بھی لاکھوں افراد سے اپنے تعلقات کا لحاظ اور فرائض کا احساس رکھتے ہیں۔

کشمیر کے مختصر دورانِ قیام میں مجھے بخشی صاحب کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کوئی موقعہ ہو بخشی صاحب کے چہرے سے ایک جلال آنکھوں سے ایک جاذبہ اور گفتگو سے پھول برستا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی نصف صدی دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر جھریاں نہیں۔ یقینِ محکم، عملِ پیہم اور فاتحِ عالم محبت کا نور برستا ہے۔ وہ بے مثال تنظیمی صلاحیت اور مہارت کے لئے مشہور ہیں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کو تیز رفتاری سے انجام دینے کے عادی ہیں۔ جس طرح نپولین کی ڈکشنری میں "ناممکن" کا لفظ نہیں، اسی طرح بخشی غلام محمد کی ڈکشنری میں تساہل نام کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ ہر وقت لوگوں سے ملتے ہیں۔ ہر وقت ان کا کام کرتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر بنفسِ نفیس موجود رہتے ہیں۔ حالات کو دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور اسی جگہ مناسب ہدایات اور احکام جاری کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کی طرح "سُرخ فیتہ" کی کارگذاری پسند نہیں کرتے۔ ان کا دل ایک ایسے رفیق اور دردمند انسان کا دل ہے جو شیشے کی طرح صاف اور تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ وہ کسی سے حسد، عداوت، بغض یا انتقام کا جذبہ نہیں رکھتے۔ وہ دوستوں سے خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اور دشمنوں سے اخلاق و مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ ان کا شیوہ ہے کہ "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" بخشی صاحب کو دیکھ کر مرحوم رفیع احمد قدوائی کی یاد آجاتی ہے۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی اونچی جگہ یا اعزاز کو پاتا ہے تو اپنے مخالفوں کو انتقام و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے دل میں عوام کی محبت، دوستوں کا خیال، وطن کی یاد اور قوم کی خدمت کا تصور باقی نہیں رہتا۔ وہ کچھ اس طرح بدل جاتا ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ اپنا تصور کرنا باعثِ اہانت سمجھتا

تعمیر

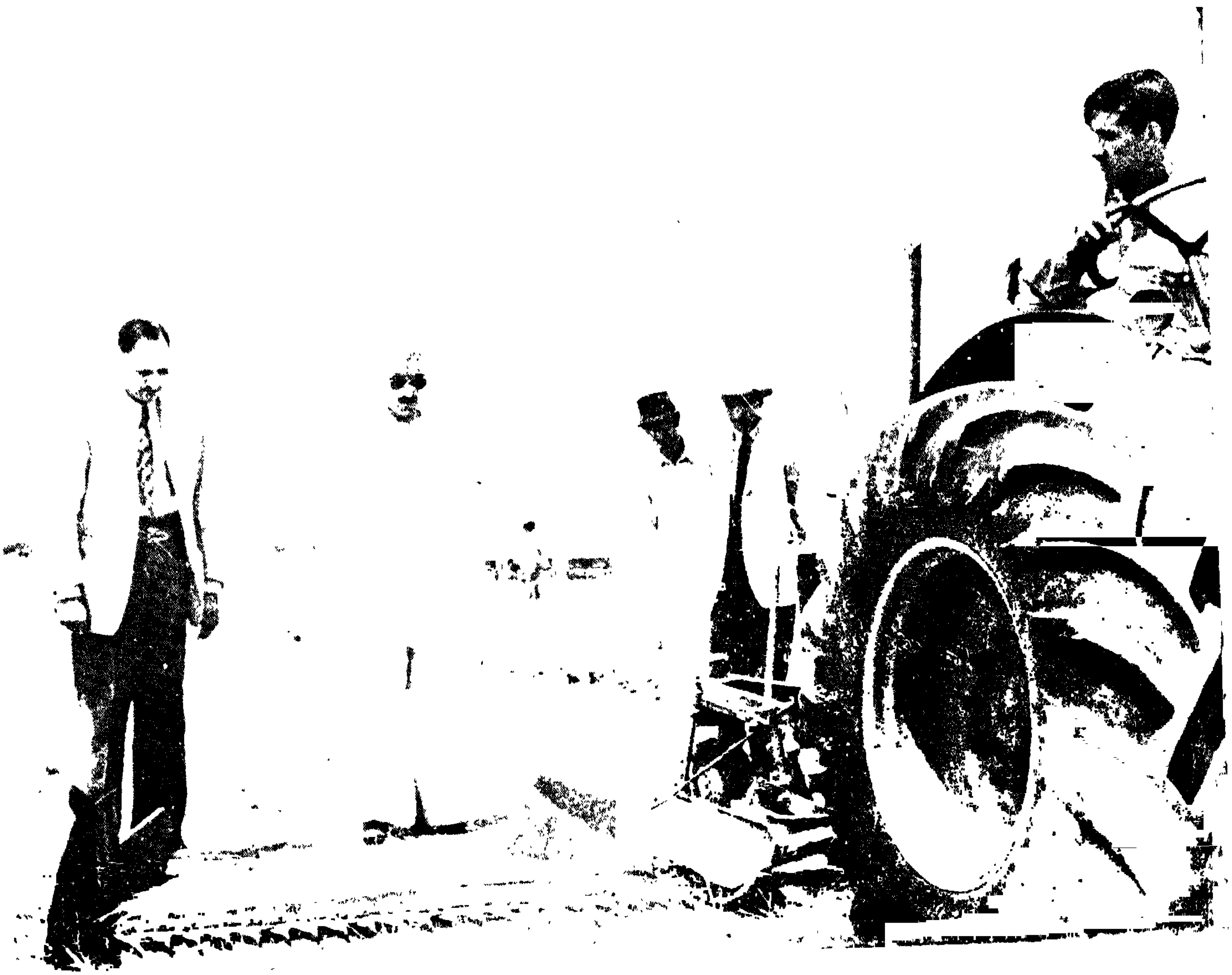
ہے۔ یہ تلخ حقیقت کسی کو ناگوار نہ گذرے کہ ہمارے اکثر وزرا اور اربابِ اقتدار کا یہی حال ہے۔ لیکن بخشی صاحب جنہیں عام طور سے خالقِ کشمیر کہا جاتا ہے، خود کو خادمِ کشمیر ہی سمجھتے ہیں اور رفیع مرحوم کی طرح تیز رفتاری، احساسِ ذمہ داری اور جذبۂ خدمت کی سرشاری کے ساتھ اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ بخشی صاحب حقیقت پسندانہ زندگی پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اقتدار و حکومت سے وابستہ رسوم و روایات کو تکلیف دہ جانتے ہیں۔ تیرہ سال پہلے وہ کشمیر کی کابینہ میں شامل ہوئے اس عرصے میں جس حسن و خوبی اور فہم و تدبر کے ساتھ نظامِ حکومت کو چلاتے رہے اس پر اکثر سیاست دانوں کو رشک آگیا ہے، از روئے دیانت آزادی سے پہلے کے کشمیر کا تصور کیجئے اور آج کا کشمیر دیکھئے تو آپ کو اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ بخشی صاحب کی عجیب و عظیم شخصیت کی رہنمائی میں کشمیر جادۂ ارتقا پر گام زن ہے۔ کوہ بانہال میں نئی سُرنگ کی تعمیر، سرینگر کو سیلاب سے بچانے کی تدبیر، اقتصادی، صنعتی و حرفتی، تعلیمی اور تہذیبی ترقی، مزدوروں اور کسانوں کی فلاح و بہبود، رشوت ستانی بدعنوانی کے اخراج، نظم و نسق کی تنظیمِ نو اور ریاست کی مجموعی خوش حالی و شادابی کے لئے بخشی صاحب نے اپنے کارناموں اور منصوبوں کو عمل میں لاکر کشمیر کے مستقبل کو تابناک و درخشاں بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بخشی صاحب کی سیاسی زندگی نے جن عظیم الشان کارناموں کو انجام دیا ہے ان کے پیچھے ایک ایسا عظیم و جمیل جذبہ کارفرما ہے جس میں ماں کی ممتا، باپ کا پیار، بھائی کی محبت، دوستوں کی رفاقت، جمہور کی عزت اور خوشنودیِ محبوب کا احساسِ لطیف موجزن ہے۔ وہ تکلف و تصنع شان و شوکت اور منصب و منزلت کی فرسودہ و جمہور شکن روایات سے بلند ہو کر ایک ایسے انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنے سینے میں تمام انسانوں کے لئے عزت و محبت کا عملی جذبہ رکھتا ہے۔ آپ جانتے ہیں بخشی صاحب ہفتے میں دو بار کھلا دربار منعقد کرتے ہیں۔ یہ دربار امرا، تعلق داروں، والیانِ ریاست یا عہدِ رفتہ کے بادشاہوں کا دربار نہیں ہوتا ہے یہ جمہور کا دربار ہوتا ہے جہاں ریاست کا ہر شہری اپنے فرماں روائے جمہور کا



دھنورکہ کنال سے بنجر زمینیں شاداب ہو اٹھیں۔



ہم مادر وطن کی سلامتی کے لئے سیلاب
کے موذی کو ہمیشہ کے لئے دیش سے نکال
دیں گے۔



"زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے سائنسی ایجادات کو اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔"

دامن بچا سکتا ہے۔ اپنی باتیں کہہ سکتا ہے، اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر کے واپس ہو سکتا ہے۔ انہیں اوصاف کی بنا پر بخشی صاحب نہ صرف ایک دیاست کے ہیرو ہیں بلکہ پورے ہندوستان میں مقبول و محبوب ہیں۔ وہ اپنے عقیدت مندوں اور شیدائیوں کے درمیان کوئی پردہ، امتیاز نہیں رکھتے ہیں۔ اکثر مشتاق دید ہجوم اور لاکھوں عوام کے درمیان وہ حفاظتی انتظامات اور پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک والہانہ کشش کے ساتھ اپنے عوام میں گھل مل جانے پر مصر ہوتے ہیں اور عوام کا ہجوم اس طرح ان پر ٹوٹ پڑتا ہے جس طرح چھتے پر شہد کی مکھیاں۔ وہ ہجوم میں کسی کی پیٹھ پر تھپکیاں دیتے ہیں، کسی کے شانہ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ کسی کو سینے سے لگا لیتے ہیں، کسی سے مذاق کرتے ہیں، کسی کو ہنساتے ہیں اور کسی کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے بخشی صاحب کا ہنستا ہوا چہرہ اور روتی ہوئی آنکھیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ بخشی صاحب کس قدر دردمند اور حساس قائد و رہنما ہیں۔ اکثر عورتوں نے ان کے دامن کو اس طرح کھینچ لیا ہے جیسے ان کے ہاتھوں میں دامنِ عمر رض آ گیا ہو۔ ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی نے کانگریسی وزارتوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خلیفۂ اسلام حضرت عمر رض کے طریقۂ کار کو اپنائیں۔ اگر ہندوستان میں ایسی کوئی ریاست ہے جو مہاتما گاندھی کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہے تو وہ ریاست کشمیر ہے جس کی قیادت بخشی غلام محمد کے دستِ تدبیر میں ہے۔ بخشی صاحب انتظامی معاملات میں عجیب اوصاف رکھتے ہیں۔ ان کا حال کچھ ایسا ہے جیسا کہ کسی محفلِ ساز و سرود کے منتظم کا، جو اگر ایک طرف اشارہ کرے تو فوراً ساز بجنے لگتا ہے اور دوسری جانب اشارہ کرے تو تاروں پر مضراب لگنا شروع ہوتا ہے۔ شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ بخشی صاحب موسیقی، کشمیری لوک گیتوں، صوفیانہ کلام اور شعر و سخن کا انتہائی نفیس ذوق رکھتے ہیں جس کی چھاپ ان کی سیاسی زندگی پر بھی پڑی ہے۔ تقریر و خطابت میں بھی ان کی شان نرالی ہے۔ وہ مکالمے کے انداز میں لوگوں کو خطاب کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں دلچسپی بڑھے، ان میں حوصلہ پیدا ہو۔ ایک عام شہری اور وزیر اعظم کے مابین کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ بخشی صاحب صاف ستھری، آسان اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ صرف مطلب کی بات کہتے ہیں۔ جس میں عوامی پسند کا میٹھا میٹھا مزاح ہوتا ہے۔ وہ خشک سے خشک مسائل کو اتنی رنگینی و دل آویزی دیتے ہیں کہ سننے والا اس کو ایک پُر اسرار کہانی کی طرح ذوق و شوق سے سنتا ہے۔

میں اپنے مشاہدات و مطالعات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بخشی صاحب سیاسی دُور اندیشی، تعمیری صلاحیت، فکری توازن، عملِ پیہم، بلند ہمتی، عزمِ محکم، قابلیت و مہارت، اعتماد و تجربہ، مردم شناسی، خلوص و سادگی، ہمدردی و رفاقت، بے باکی و صاف گوئی، مہر و وفا، دیانت و فراست، صبر و تحمل، احتیاط و اعتدال، قوت و کشش اور دردمندی کا مجسمہ ہیں۔ ایسی ہمہ اوصاف شخصیت بہت کم دیکھی گئی ہے۔ ریاستی زندگی میں انقلابات و حوادث کے ہزاروں جھونکے آتے رہے ہیں۔ لیکن انہیں اوصاف کی یہ برکت ہے کہ انتہائی نازک حالات میں بھی بخشی صاحب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں۔ نہ ان کی جبینِ فردست پر کبھی پریشانیوں کی شکن دیکھی گئی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں جیسے

ان بجلیوں کی چشمک باہم بھی دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

بخشی صاحب نے جس طرح ہندوستانیوں کے دلوں کو جیتا ہے اور جس شان سے وہ کشمیریوں کے دلوں پر حکمراں ہیں وہ ایک اعجازِ مسیحائی رکھتی ہے اور بلاشبہ بخشی صاحب خالدِ کشمیر بھی ہیں اور مسیحائے کشمیر بھی!

ی صاحب — مولانا آزادؒ کی نظر میں

جن شخصیتوں کے حالات کی تبدیلیاں اُبھارتی ہیں اُن کا ہر گوشۂ حیات کردار و عمل کی بلندیاں چھپائے ہوئے زمانے کی باگ ڈور سنبھالے چلتا رہتا ہے اور عروج و ارتقا کی ہر منزل اُنہیں سلام کرکے گذرتی رہتی ہے۔

کشمیر کی دلفریب فضاؤں کا فضا بخشنا اور لطیف تاثر جہاں شعر و ادب اور حسن و جمال کے عناصر غزل ترتیب دیتا اور رونق کائنات میں حیات افروزیوں میں اضافہ کرتا رہتا ہے وہاں جدوجہد اور فکر و تدبر کے انسانی پیکر بھی ڈھالتا رہتا ہے۔

اس وادیٔ جنت نظیر نے گردشِ ایام کی ہزاروں کروٹیں دیکھی ہیں اور قدرتی بصائر کے لاکھوں خزانے وسعتِ دہر میں بکھیر دیئے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو نئی سیاست رُونما ہوئی وہ اپنے ساتھ تعمیر و تخریب کے اَن گنت گہوارے بھی لائی۔ پرانی آبادیاں اُجڑیں اور اُنہیں کے آب و گِل سے نئی آبادیاں بنیں۔

کشمیر بھی ان شراروں کی زد پر آیا۔ لیکن جناب بخشی غلام محمد کے دردمند اور حساس دل نے اپنی بھیگی ہوئی پلکوں پر سمٹے ہوئے محبت کے پانی سے اُنہیں چند دِنوں میں ٹھنڈا کر دیا۔

اُن کے یہ آہنی عزائم اور مضبوط و مستحکم ارادے جو نقوشِ جاوداں بساطِ عمل پر قائم کر چکے ہیں اُن کو مِٹانے کی صلاحیت اب کسی انقلاب میں نہیں!

وہ نگارخانۂ دانش و حکمت کا ایک ایسا آئینۂ شجاعت ہیں جو اپنے جوہرِ ذاتی کی بدولت آفاقی اور غیر فانی عظمت کا مقام حاصل کر چکا ہے۔

رفیع ا۔ قدوائی کے خلوص، جواہر لا   ابوالکلام کی ٹھنڈی فراست کی خمیر سے اگر کوئی ہیولیٰ تیار کیا جائے گا تو اُس کا نام بخشی غلام محمد کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس عظیم المرتبت محب وطن کو افسر شاہی سے زیادہ رضاکاری راس آئی۔ وہ شہرت طلبی سے آزاد رہ کر "خدمتِ جمہور" کی راہوں پر پوری خالِقیت کا مجسمہ بن کر گامزن ہے۔

اُس کی پُر شکوہ پیشانی میں وقارِ تدبر ہے۔ اُس کے تبسم ریز ہونٹوں میں آدمیت سے محبت کا لازوال خزانہ ہے۔ اُس کے مُنہ سے نِکلا ہوا ہر لفظ زندگی کی پیچ تلی حقیقتوں کا ترجمان ہوتا ہے۔

غریب ماں باپ کے آغوش میں پلی ہوئی فطرت زمانہ کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں سے عشق کا عنوان بن چکی ہے۔ اُس کی محنت کے پسینے کا ہر قطرہ غربت کی اندھیری راتوں سے کھیلنے والے لوگوں کے لئے ستارۂ اُمید ہوتا ہے۔

غصہ کے عالم میں بھی اُس کے عارضِ عدل و انصاف کا حسن جاذبِ قلوب رہتا ہے۔

عوام کے سینوں میں دَبی ہوئی خواہشیں اظہارِ مُدعا کے بغیر وہ یُوں محسوس کر لیتا ہے جیسے یہ خود اُس کے اپنے دِل کی خواہشیں ہیں۔

کشمیر اور ہندوستان کے الحاقی رشتوں کو اُستوار کرنے کا خواب اور اُس کا تعبیری ماحول بخشی کے لیا نہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے وہ اپنی توجہات کے ساز پر کشمیر اور ہندوستان کے متحدانہ میٹھے میٹھے گیت گنگناتا رہا۔

تمیر

کچھ ناسمجھ ساتھی اُس کی صدائے دِل کی ہم آہنگی نہ کر سکے۔ اُس نے اُنہیں صرف اس لئے چھوڑنا گوارا کیا کہ محبتِ وطن کی دیانت دارانہ ضرورت کا تقاضا اُسے اس فیصلہ پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ دیانت اور صداقت کے مقابلہ میں دوستیوں کے احترام کا قائل نہیں۔ اُس کا یقین ہے کہ اگر وطن اور ابنائے وطن کی عظمت کے راستے میں اپنوں کی کوتاہ فہمی کے مہلک نتائجِ فکر حائل ہوں تو حُسنِ تدبیر کا سہارا لے کر اُنہیں راستے سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔

آج دُنیا کا ہر مُنصف مُفکر اُس کی نیت، اُس کے عمل اور اُس کی زندگی کے اعلیٰ کیریکٹر کا معترف ہے۔

کشمیر کے اندرونی نظام کا معیاری اندازِ ترقی صاف صاف شہادت دے رہا ہے کہ عروجِ ہندوستان کا دَورِ مستقبل جناب بخشی غلام محمد کے کارناموں کو فراموش نہ کر سکے گا۔

بخشی کے ذہن میں صرف کشمیر نہیں پورا ہندوستان ہے۔ پوری دُنیا کا امن ہے اور پوری انسانیت کی خوش حالی ہے۔ متحدہ قومیت کا تخیل ہے اور غیر فرقہ دارانہ جمہوری احساس ہے۔ خدا اُس کی عمر میں

ترقی دے۔ وہ جب تک زندہ ہے، اپنے صاف وشفاف آئینہ عمل پر کبھی داغ نہ آنے دے گا۔ میں نے ایک مرتبہ امام الہند حضرت مولانا آزاد علیہ الرحمہ سے بخشی غلام محمد کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا:۔

"وقت کے نازک تقاضوں کا شعور اُن کو ہے۔ جس راہ پر وہ چل رہے ہیں وہ نہایت سیدھی اور صاف ہے۔ حوادث کا کوئی موڑ اور فطرت کی کوئی دیوار اُنہیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکی۔ مجھے اُن کے کردار و عمل پر اعتماد ہے۔

میرے بھائی! یہ دُنیا انفرادی منفعت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مفادِ عام کے جذباتِ طلب ہی اِس دُنیا کی سچی اور مفید رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اگلے دَور میں فرقہ دارانہ اُلجھنوں کا حل بخشی صاحب جیسے خوش کردار انسانوں کی زندگی ہی میں تلاش کیا جا سکے گا۔"

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پیشین گوئی آج بھی میرے کانوں میں موجود ہے اور میں اُس مستقبل کے انتظار میں ہوں
کے کردار کا امتزاج نئی قدروں کے تحفظ اور ان
اور کشمیر میں زندگی کی لہریں دوڑا کر دُنیا کو امن کی منز

تعمیر میں شائع ہونے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
(۲) "تعمیر" میں چھپنے والی نگارشات میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں وکشمیر کا متفق ہونا لازمی نہیں۔
(۳) "تعمیر" میں شائع شدہ تخلیقات "تعمیر" کا حوالہ دے کر کسی خاص اجازت کے بغیر نقل کی جا سکتی ہیں۔

(مدیر)

رنگ استاد

نئے کشمیر کی سیر

کشمیر کے غدّاروں نے اکثر دشمن کو یوں للکارا ہے
ہر خیر و شر کے جھگڑے میں ہم سمجھتے ہیں تو ہارا ہے
کشمیر پہ ہم مٹ جائیں گے ولولہ ہے یہ دل آرا ہے
ہم اپنی جان لٹا دیں گے یہ ہم کو جان سے پیارا ہے
سو جان سے ہر کشمیری کو کشمیر پہ شیدا دیکھا ہے
کیا تجھ کو بتائیں اے ہمدم کشمیر میں کیا کیا دیکھا ہے

وہ فصلِ بہار ہے ہر جانب رنگیں و حسیں گلزاروں میں
مستی سے ابریں اٹھتی ہیں ڈل کے پُر لطف نظاروں میں
اک موسم جواں خوابیدہ ہے جہلم کے بہتے دھاروں میں
گاتے ہیں طیورِ خوش الحان اور نغمے کہساروں میں
کشمیر میں آکر ہر اک نے جنت کا نظارہ دیکھا ہے
کیا تجھ کو بتائیں اے ہمدم کشمیر میں کیا کیا دیکھا ہے

تعلیم مزدوری مفت ہوئی خوش حالی کا پیغام ملا
ہر کشمیری کو محنت کا اب سکھ ہی انعام ملا
دستورِ خیالِ آزادی پہ ہر اک کو اذنِ عام ملا
دورِ بیکاری ختم ہوا اور ہر نوجوان کو کام ملا
ہر سمت سیاست میں ہم نے تعمیر کا نقشہ دیکھا ہے
کیا تجھ کو بتائیں اے ہمدم کشمیر میں کیا کیا دیکھا ہے

کشمیر کی دھرتی پہ ہمدم غیروں کی فوجیں کیوں آئیں ؟
لداخ ہمارا اپنا ہے کیوں اس میں غیروں کو لائیں
ہر بات ہے بالکل بے معنی اس بات سے ہم کیوں گھبرائیں
نہرو نے سچ فرمایا ہے کیوں زخم نیا دل پہ کھائیں
غیروں کی حکومت کا ہم نے پہلے بھی نتیجہ دیکھا ہے
کیا تجھ کو بتائیں اے ہمدم کشمیر میں کیا کیا دیکھا ہے

چوہدری عبدالحمید وکیل

حقیقت اور افسانے کا سنگم — خالد کرش

افراد اور اقوام میں ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہونے کی فطری خواہش موجود ہوتی ہے۔ اگر حقیقت میں کوئی ہیرو میسر نہیں آ سکتا تو عوام رفتہ رفتہ افسانے سے ایک ہیرو تراش لیتے ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ ہیرو اصلیت سے قریب بھی ہوتے ہیں مگر بارہا ایسا ہوا ہے کہ قوموں کے افسانہ اور ہیرو خیال نے ایک شخص کا روپ اختیار کیا ہو اور اسی صورت میں اس قوم کے تمام جذبات مرکوز ہو گئے ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم کے ہر دور میں خاص قسم کی عظیم شخصیتیں نمودار نظر آتی ہیں جو اپنے عہد کی کسی سماجی، اقتصادی یا سیاسی ضرورت کی پیداوار تھیں۔

ہمارے وزیر اعظم کی شخصیت بھی حقیقت اور مبالغہ کی ایک بڑی دلچسپ [illegible] ہے۔ وہ حقیقت میں ایک عظیم انسان ہیں۔ اسی لئے عظیم انسانوں کی طرح ان کے گرد افسانے اور روایات کا ایک پورا قصر تعمیر ہو چکا ہے اور سیاست کے [illegible] دلدادہ [illegible] وزیر اعظم کو مرکز [illegible] سے [illegible] جنم لیا ہے۔

یک [illegible] ایک شخص [illegible] سے طالب ہو کے کہتا ہے۔ [illegible] بات ہے کہ کل کی [illegible] جو کچھ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible]

اعظم خود تو [illegible] وزنی بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے اعتقاد میں کوئی کمی نہیں آتی۔ [illegible] صاحب کی کار کے [illegible] کا ہم مرتبہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان جانے پر حقیقت کو قربان کر دیتا ہے اور اسی طرح سے یہ داستان [illegible] ہوتی ہیں۔ اب ہمارے [illegible] معلوم ہو گا کہ وزیر اعظم [illegible] اہم معمولات سے [illegible] [illegible] زندگی [illegible] مطالعہ کرتے ہیں اور [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] بنانے میں اپنی قیمتی صرف کرتے ہیں اور مبالغہ کی [illegible] حقیقت کی اس طرح [illegible] ہونے کی وجہ سے یہ داستانیں کسی کو متعجب نہیں کرتیں!

اس بات سے کون واقف نہیں کہ وزیر اعظم [illegible] اور [illegible] کے دشمن ہیں۔ اس کا مظاہرہ [illegible] ہوا جب [illegible] کو [illegible] بنانے کی کوشش [illegible] اپنے [illegible] پر سنبھال لیا۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کرتے تھے۔ یہ کام [illegible] کے [illegible] [illegible] سکتے تھے۔ وزیر اعظم نے [illegible] کیا کہ اس سلسلے میں کسی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ وزیر اعظم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور کسی خاص حالت میں [illegible] جذبات اور [illegible] [illegible] ہے۔ وہ شہر

کے کسی تعلیم یافتہ مجمع سے مخاطب ہوں یا گاؤں کے کسی ناخواندہ ہجوم سے، عوامی دِل کی دھڑکنوں پر اُن کی نظریں مضراب کا کام کرتی رہتی ہیں۔ اُن کی حقیقت بین اور حقیقت شناس آنکھیں موقعے کو بھانپ جاتی ہیں اور اُن کی زبان سے وہی الفاظ نکلتے ہیں جو سیدھے عوامی دِلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔

اپنی زندگی میں ایک افسانوی حیثیت اختیار کرنا عظمت اور بزرگی کا علامتی اظہار ہوتا ہے۔ بخشی صاحب حقیقت کی دُنیا میں عوامی دِلوں کو اتنا تسخیر کر چکے ہیں کہ عوام نے اُن کی ذات و صفات کے اِردگرد ایک دلچسپ ہیولا تعمیر کیا ہے۔ اُن کی سخاوت، فیاضی اور جودت کی کہانیاں اب دادی امائیں اپنے بچوں کو سُناتی ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور اس عظیم شخصیت کے عظیم کارنامے عوامی ادب کا رُوپ پاکر کتنے ہی دِلوں میں حُبِ وطن، سخاوت، خدمتِ خلق اور عزم و ارادے کی نئی نئی مشعلیں روشن کرتے رہیں گے۔ زین العابدین بڈشاہ کے بعد آج تک کوئی صاحب اقتدار عوامی مقبولیت اور محبُوبیت کے اس رُتبے پر فائز نہ ہو سکا۔

صاحبِ ذوق

"وزارت عظمیٰ سنبھالنے کے بعد بخشی صاحب اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار تعمیری کاموں میں کرتے آئے ہیں۔ وہ صرف ایک بہادر سیاست دان ہی نہیں ہیں بلکہ ایک بے خوف اور مُدبر اندیشن منتظم بھی۔ بعض اشخاص اُن سے ڈرتے ہیں، لیکن عام لوگ اُن سے محبت کرتے ہیں۔ اکثر باعمل انسانوں کی طرح وہ موسیقی اور شاعری کے دِل دادہ ہیں۔"

(ڈی، این کپور، "ہندوستان ٹائمز")

پاسبانِ کشمیر

زہے غلام محمد کہ جانِ کشمیر است
زہے وجود کہ رُوح و رواں کشمیر است
چنیں نہ ہیچ کسے ترجمانِ کشمیر است
زبانِ بخشی دانا زبانِ کشمیر است
ببیں جلال کہ شایانِ شانِ کشمیر است
عجیب حوصلۂ امتحانِ کشمیر است
نظر بجانب انجام ہر عمل دارد
تمام آگہ سُود و زیانِ کشمیر است
کہ داغدار رُخِ ناقہ عیں نہ شود
خوشا گلے کہ گُل گلستانِ کشمیر است
نہ حرف حرف ہزاراں رموز در یا بم
جہان حُسنِ معانی جہانِ کشمیر است
زہے غلام محمد کہ صد جگر دارد
دریں زمان ظلّ پاسبانِ کشمیر است
خوش است یومِ ولادت بر ایں دلیلِ عظیم
کہ سایہ دار سرکار دانِ کشمیر است
سلیم شاہد رعناست اکبر است گواہ
نشانِ شوکتِ ماضی نشانِ کشمیر است
چرا بہ فرقِ منور نمی رسد تا زل
سحاب لطف کرم آسمانِ کشمیر است

خالد کشمیر — شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب

آج سے پانچ سال قبل جو سرینگر آیا ہوا اُس کی حیرت کے لئے اب یہ گل بہ دامان شہر بہت سی چیزیں اپنے دوش پر لئے ہوئے ہے۔ پہلے صدیوں پر اس شہر کی حالت ایسی طور تبدیل نہیں ہوئی تھی جس طور آج کے دنوں میں۔ منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں۔ اب لیجئے یہ حضوری باغ ہے۔ آج سے چند ہی سال پیشتر یہ وسیع و عریض میدان اپنی تنہائیوں کی وجہ سے اگر کچھ ردِ عمل پیدا کرتا تھا تو وہ ہول اور وحشت جذبے سے کچھ کچھ مشابہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وسعتیں بس ویرانیوں کا تصور دینے کے لئے ہی موجود ہیں۔ مگر آج اس ویرانے کی قسمت بدل گئی ہے۔

اب یہ نئے کشمیر کی تندرست جسمانیت اور صحت مند روحانیت کے دو روشن ستاروں کو اپنی پیشانی پر لئے ہوئے ہے۔ جوش نے یہ شعر فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے کہا تھا مگر اس کے معنوں کو اور وسعت بخش کر اگر اسے جسمانیت اور روحانیت (ان دو میں کچھ فرق ہے یا نہیں، وہ مسئلہ نزاع ہو سکتا ہے مگر مشرق کے شاعروں اور مفکروں نے عموماً ان دو کی وحدت کو عموماً تسلیم نہیں کیا ہے) کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو اس میدان کی زبانِ حال کا کچھ کچھ اظہار ہو سکتا ہے۔

کو ثر و گنگا کو اِک مرکز پہ لانے کے لئے
اِک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لئے

تو اس سرینگر کا بخشی سٹیڈیم اور ٹیگور میموریل ہال اسی نئے سنگم کے دو دھارے ہیں۔ کشمیر کے لوگ اپنی جسمانی اور روحانی کامرانیوں کے لئے پچھلے زمانے میں ایک زمانے سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں مگر غلامی کے دور نے ان دونوں چیزوں پر اپنے دبیز چھاپ ڈال

بقیہ

دیئے۔ کشمیری کا جسم مفلوج اور ماؤف کر کے رکھ دیا گیا۔ اس کے گالوں کی گلابی اور آنکھوں کی شادابی تو جسموں کے کھنڈر میں بھی چمکتی رہی۔ مگر اس کی مضبوط بانہیں آہستہ آہستہ اپنا زور کھو بیٹھیں۔ اس کے جسم سے پھرتی اور شکتی کے جوہر غائب ہونے لگے۔ یہی حال اس کی تدریسی قوا کا بھی ہوا۔ تحقیق و تفتیش اور ذوق و شوق کی جو قندیلیں زمانے بھر کو اپنی چمک سے خیرہ کر چکی تھیں، آہستہ آہستہ اجنبی ہاتھوں کے گراں بارِ ستم سہہ سہہ کر بجھ رہی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں بھی اپنے خاکستر میں غنی، وستول میر، مقبول کرالہ واری اور پرمانند جیسی چنگاریاں چمکتی رہیں۔ مگر پھر بھی یہ حقیقت قائم رہتی ہے کہ یہ دور اپنی کیفیت میں کشمیر کی ثقافتی زندگی کے خزاں کا دور تھا۔

اور پھر خالد کشمیر مطلعِ وطن پر نمودار ہوئے۔

خالد کشمیر تحریکِ آزادی کے سب سے پرجوش مجاہد اور جری جرنیل رہے ہیں۔ انہوں نے سنگ و آہن کی فصیلوں کو اپنے جذبۂ حریت کی آنچ سے پگھلا دیا۔ مگر عملی فتوحات کا یہ کمان دار روحانی اور ثقافتی زمیوں کا بھی اسی طور رسیا ہے۔ رزم میں دشمن کی صفوں پر شمشیر و سناں بن کر ٹوٹنے والا بزم میں چنگ و رباب کے نغموں کی چھاؤں میں ملک و قوم کی نیا کو پار لگانے کے سنہری خواب بنتا ہے۔ شاید ایسی ہی شخصیت کا پیکر علامہ اقبال کے سامنے تھا۔ جب انہوں نے یہ شعر کہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

پیوستہ

آزادی کے بعد [illegible] کا آغاز ہوا تو قوم کی ازسرنو
تعمیر کی طرف بھی توجہ دی گئی اور [illegible] ذوق قوم کی تشکیل
کی طرف۔ ایک طرف کشمیر [illegible] دنیا کی [illegible] کا جواب دینے کے لئے
سائنس اور انجینئرنگ کے [illegible] لگا اور دوسری طرف
مرجھائے ہوئے [illegible] پر بہار آگئی۔ ایک طرف پہاڑ کا جگر چیر کر
بانہال [illegible] اور دوسری طرف جشن کشمیر منایا جا رہا تھا۔
ایک طرف [illegible] اور لیہہ کرگل روڈ پر سنگ و آہن کا [illegible]
[illegible] اور دوسری طرف رقص و موسیقی کی تانیں تعمیر و ترقی
کے نئے عزم [illegible] — اور خالد کشمیر ہر جگہ قافلہ سالاری کا
فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مجھ کو اس سلسلے میں وہ ایک
منظر یاد ہے:

وہ [illegible] پیر پنچال کا سلسلہ کہ اپنے غضب کا مظاہرہ کر رہا ہے
بارش [illegible] اور بجلی و رعد کی گرج چمک ہر انسان کا دل دہلا
دیتی ہے۔ بانہال روڈ پر پتھروں کے تودوں کی بارش ہو رہی ہے —
بانہال روڈ [illegible] سے [illegible] سرینگر میں ایک طرف تو سیاح رکے پڑے
ہیں اور دوسری طرف [illegible] پار ضروریات زندگی سے بھری ہوئی
گاڑیاں۔ خالد کشمیر جب سرینگر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں خود موقع پر
پہنچ جانا چاہیے۔ انجینئر لاکھ کہیں کہ ان کے جانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔
مگر ان کے [illegible]۔ وہاں وہ بانہال پہنچ گئے —
— بارش کا غضب اور تیز ہو گیا۔ بخشی صاحب آگے بڑھتے گئے —
اور ان کے ساتھ چار افسروں اور انجینئروں کی فوج بھی — آگے
پہاڑ کا تودہ آگیا۔ جیپ آگے نہیں جا سکتی۔ بخشی صاحب پیدل چلے۔
بھیگ گئے — "ٹھہریے تو —" پیچھے آواز آئی — "پہاڑ
خطرناک ہے بخشی صاحب رک جائیے۔" وہ نہیں رکے — اور چند
ساعتوں کے بعد بادل چھٹ گئے۔ دھوپ مسکرا اٹھی — سڑک کی
صفائی کا کام ہونے لگا۔

اور یہاں [illegible] ہے:
بخشی صاحب [illegible] بیٹھے ہوئے تھے کچھ مسائل پر
بات چیت کر رہے [illegible] لوگوں کی باتوں اور اطوار سے معلوم ہوتا ہے

کرسی ہی [illegible] اہم ہے — لیکن [illegible]
[illegible] بخشی صاحب کے — [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
حیران کر [illegible] نغموں کی [illegible] — غزل کی
[illegible] بخشی صاحب [illegible]
[illegible] بخشی صاحب [illegible]
پکار کر کہا:

"تم نے یہ مصرعہ غلط پڑھا ہے۔ اس کا صحیح تلفظ یہ ہے۔"
اور بخشی صاحب [illegible]

اور غزل نغموں کی لہروں پر پھر سرود بجاتی گئی۔
تو یہ بات بخشی اسٹیڈیم اور ٹیگور ہال کی ہو رہی تھی۔
بخشی اسٹیڈیم کشمیر کی [illegible] کی تندرستی، پھرتی اور [illegible]
کا مظہر ہے اور ٹیگور میموریل ہال نئے کشمیر کے [illegible]
[illegible] — اور ان دونوں [illegible] خالد کشمیر
کا [illegible] کے نئے نئے گل بوٹے کھل رہے ہیں۔
اسٹیڈیم [illegible] اور کھیلوں کا [illegible] سب لوگ [illegible]
مگر کچھ ایسی باتیں [illegible]
جیسے ہر شے [illegible] پا رہی ہیں!
[illegible] — خالد کشمیر
اور اسٹیڈیم میں [illegible] — [illegible] کی
[illegible]
دیکھنے لگے [illegible] — خالد کشمیر [illegible] سے قدم قدم کا
مقابلہ کر رہے ہیں۔ [illegible]
کشمیر کے [illegible]
والوں [illegible]
گیا۔ [illegible]
خالد کشمیر یہاں سے [illegible]
[illegible]

غلام نبی باو

سب سے جُدا سب کا رفیق

تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر قوم کبھی نہ کبھی ایسے دَور سے گذری جس کو ابتلا و آزمائش ہی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خود ایسے ادوار نے لامحالہ ایسی شخصیتیں پیدا کیں جنہوں نے اپنی قوموں کی زمامِ امامت ہاتھ میں لے کر ایسے منازل و مقامات تک رہنمائی کی جن کے لئے قوموں کے حالات خود متقاضی تھے۔ ایسی قومیں زیادہ خوش نصیب تھیں جن کے رہنما و ہادی کسی حالت میں بھی اتنا بھی نہ بدلے کہ ان کا عوامی صفوں سے دُور جا پڑنے کا اندیشہ پیدا بھی ہوا ہو۔ خالد کشمیر کا مقام اس قسم کے رہنماؤں کی صفِ اوّلین میں ہے۔ گو ان کی جامع شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے لیکن ان کے کردار کو عوام سے جُدا کر کے نہیں جانچا سکتا ؎

شمع کی طرح سب سے جُدا سب کا رفیق

بخشی صاحب رات و دن عوامی ماحول میں عوام کی خاطر کام کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو کسی قصبے کے کسانوں کی جمعیت کے درمیان بولتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ کبھی کسی مزدور انجمن کو ہدایت دیتے ہوئے، کبھی کوچوں اور بازاروں میں سے لوگوں کے جم غفیر کے ساتھ معائنہ کرتے ہوئے، کبھی اپنی کوٹھی پر ضرورت مندوں کی امداد رسی کرتے ہوئے اور کبھی کسی عوامی جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ سعی و عمل کے میدان میں کبھی تھکتے نہیں اور اگر تھکان محسوس کرتے بھی ہوں گے تو گویا وہ مسکراہٹ کر کہتے ہوں گے ؎

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

بخشی صاحب کی شخصیت کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ وہ عوام میں گویا جذب ہو کر رہتے ہیں۔ وہ عوام میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ ان سے کہیں ظاہری آن و بان اور [illegible] ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ مل کر ان کی سی زبان بولتے ہیں۔ سادہ سا لباس پہنتے ہیں۔ عوامی تنظیم کا ذوق پیدا کرتے ہیں اور انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک وزیر اعظم بھی ہیں۔ یہی وہ راز ہے کہ بخشی صاحب جہاں بھی اور جس وقت بھی ذرا سا توقف کریں گے ہزاروں لوگ دیکھتے دیکھتے جمع ہو جائیں گے اور اُس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر مرد و زن ان کو دیکھ کر بے انتہا مسرت محسوس کرتا ہے۔ یہ اُن کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ وہ اُن کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ چلتے ہیں تو لوگوں کا ہجوم ان کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔ ٹھہرتے ہیں تو پروانوں کی طرح ان کے اِرد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت یہی محسوس ہوتا ہے ؎

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

"مانچسٹر گارڈین" کی نمائندہ تایا زنکن نے اس صورت حال کا عینی مشاہدہ قلم بند کیا ہے۔ لکھتی ہیں:—

"عوام کے ساتھ وزیر اعظم کشمیر کے تعلقات سارے ہند میں بے مثال ہیں اور عام لوگ ان کے ساتھ اس حد تک قریب ہیں کہ بعض اوقات بے تکلفی اور یہ قربت پریشان کن حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ عوام کے ساتھ اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر نہ تو مراسم کا ہی لحاظ دکھایا جاتا ہے اور نہ دُوری محسوس کی جاتی ہے۔ اس وقت نہ تو پولیس کے آدمی ہوتے ہیں اور نہ کوئی گارڈ ہوتا ہے۔ کوئی بھی آدمی ان کے سٹیج کے بالکل قریب آ سکتا ہے اور اس پر چڑھ سکتا ہے۔ لوگ ان کے ساتھ اس طرح چپکے رہتے ہیں جیسے

چھتے پر شہد کی مکھیاں! "

بخشی صاحب کی شخصیت میں لا محدود طاقتیں مضمر ہیں جن کو وہ حسبِ موقع و حسبِ ضرورت عوامی مفادات کی خاطر بروئے کار لاتے ہیں ان کے عزائم میں جہاں آہن و فولاد کی سی سختی ہے اور جس سختی کے سامنے مجال نہیں کہ کوئی دم مارے وہاں ان کے رویّے میں گلاب کے پھول کی پتی سی نرمی اور شبنم کی سی ٹھنڈک بھی پائی جاتی ہے۔ وہ ہزاروں لوگوں سے جو مختلف طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں ملتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی اکتاتے نہیں۔ ہر کسی موقع و محل کے مطابق تشفی دہ جواب دیتے ہیں۔ کوئی ان کے سامنے اپنی بے روزگاری کا مسئلہ لاکر رکھ دیتا ہے اور کوئی اپنے گھر کی اُلجھنوں کو۔ کوئی ان سے اپنی ملازمت کی مشکلات کے بارے میں چارہ جوئی چاہتے ہیں اور کوئی اپنی ناداری کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ کوئی ان کا دھیان کسی پُل کی تعمیر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں اور کوئی کسی کوچے کی مرمت کرانے کی درخواست کرتا ہے۔ کوئی ان سے کوئی سماجی اُلجھن دُور کرانے کے لئے متقاضی ہے اور کوئی انہیں کوئی مذہبی ادارہ قائم کرنے کی خاطر استدعا کر رہے ہیں۔ شاکی آتے ہیں اور تسکین پاتے ہیں۔ وفود ملتے رہتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حکومت ہو یا تنظیمی معاملہ، اقتصادیات سے متعلق مسئلہ ہو یا سماجیات سے، کلچر کی بات ہو یا دینیات، شاید ہی کوئی اہم مسئلہ ہو جس میں اس مردِ کامل کی ہدایات کی ضرورت کو محسوس نہ کیا جاتا ہو۔ ان کی مجاہدانہ شخصیت ساری قوم کے جذبۂ سعی و جہد کو حرارت بخشتی ہے۔ اقبال عمر بھر ایک مردِ مجاہد کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے اور اگر وہ آج زندہ ہوتے تو خود اپنی دیوان سے اس شعر کا اخراج فرماتے ؎

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

بخشی صاحب جہاں ضرورت کے وقت نہایت سنجیدہ اور بُردبار آدمی ہیں وہاں بذلہ سنجی اور مذاقِ لطیف بھی ان کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ زاہد خشک معلوم دیتے ہیں اور کہیں رندِ بے نیاز۔ جہاں وہ سیکولرازم کے علمبردار ہیں وہاں مذاہب کی عقیدت اُن کے دل سے دُور نہیں۔ جہاں وہ کسی قسم کے بھی جذباتی رشتوں کی مصلحتوں سے بے نیاز ہیں وہاں وہ کسی عام آدمی کے لئے بھی رفیق اور دلی ہمدرد ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فاضلانہ لیکچر دیتے ہیں وہاں کسی عوامی سطح کی محفل کو بھی گُل و گلزار بنا دیتے ہیں۔ بخشی صاحب نے اپنی ساری زندگی میں ثابت کر دیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے کردار کی تعمیر میں خود اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کی پیدائش کے وقت ہی اُن سے کہا تھا ؎

تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

ہو سکتا ہے کہ اس مردِ آہن کے دل میں ادب و کلچر کا ذوق دخل ہی نہ پاتا۔ لیکن جاننے والے واقف ہیں کہ کشمیر میں تہذیب و کلچر کی موجودہ ترقی بخشی صاحب ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اُنہوں نے اس میدان کی قوتوں کی جس طرح پُشت پناہی کی ہے وہ شاید ہی کوئی کر سکتا۔ ان کی ذاتی دلچسپی اور سرگرمی سے یہاں کے ثقافتی اور کلچرل اداروں میں جان آگئی ہے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بوَد گلدستہ گردد

بخشی صاحب لوگوں کو ہنستے اور مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی رنگین طبع سے اس جنتِ ارضی کی لطافتوں میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ کلچرل جشنوں، میلوں اور نمائشوں سے وہ درون اور بیرونِ ریاست کے لوگوں کا دل بہلانے کا سامان میسّر کرتے ہیں۔ وہ خود شعر و سخن اور راگ و موسیقی کے دلدادہ ہیں اور عوام میں بھی یہ ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور وہ جہاں بھی شامل ہوتے ہیں ساری آنکھیں ان پر مرکوز ہو جاتی ہیں ؎

دریا متلاطم ہیں تیرے موجِ گہر سے
شرمندہ ہے فطرت تیرے اعجازِ ہنر سے

بخشی صاحب کی بے حد مصروف زندگی ان کے حکومتی کاموں میں رُکاوٹ نہیں بنتی۔ یہاں بھی ان کی رہنمائی ہر مسئلے کا حل مانی گئی ہے۔ وہ قابل ترین ایڈمنسٹریٹر ثابت ہوئے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کر رکھا ہے کہ بعض رہنما جو سیاسی میدان میں مسلّم صلاحیت رکھتے ہیں وہ حکومتی اداروں کی نگہداشت، تنظیم اور ترتیب میں ناکام ثابت ہوئے (بقیہ بر صفحہ ۵۱)

عزیز جونپوری

اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

جسے ہم ظلمتِ عالم میں اک تنویر کہتے ہیں!
شعور و دانش و ادراک کی تصویر کہتے ہیں
خراباتِ جہاں میں پیکرِ تعمیر کہتے ہیں
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

جسے آزادیٔ قوم و وطن کا پاسباں کہیے
دلِ جمہور و رُوحِ مملکت کا رازداں کہیے
جہادِ زندگانی میں امیرِ کارواں کہیے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

کسی کی لغزشِ پا پر جو اکثر ہو گیا برہم
وفاداری کا جس کے ہاتھ میں ہے آجتک پرچم
ادائے ناروا کو دیکھ کر کرتا رہا ماتم
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

اسے کیا غم اگر ہے بجلیوں سے چشمکِ باہم
وہ جس سے آج تک گھبرا رہی ہے گردشِ عالم
جلائے برقِ تپاں تجھ پر بھی لہرا سکتا ہے پرچم
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہ جس نے کہدیا تھا صاف جبر ننگ و اکراہ سے
مگر اُلجھے نہ اب کوئی ہمارے عزمِ محکم سے
مرے ہندوستاں کو پیار ہے بس امنِ عالم سے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہی ایمان ہے جس کا دلوں کے ربطِ باہم پر
وہی جو گامزن ہے جادۂ فاروقِ اعظمؓ پر
صفا و صدق و امن و صلح و عدل و عزمِ محکم پر
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہ جس کی ذات سے کشمیر صد رشکِ گلستاں ہے
وہ جس کا ہر نفس نامِ خدا صبحِ بہاراں ہے
گلوں کا مونس و غمخوار کلیوں کا نگہباں ہے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہ جس نے جنگِ آزادی میں دی بے مثل قربانی
بالآخر جسکے قدموں پر گرا ہے تاجِ سلطانی
وہ جس سے سامراجیت کو تھی کتنی پریشانی
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

زہے عہدِ گلستاں ہر طرف جشنِ بہاراں ہے
وہ مالی جس کا کردارِ چمن سازی نمایاں ہے
نوا سنجِ چمن قمری کہیں بلبل غزل خواں ہے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہ بخشی جسکی بخشش پر زمانہ ناز کرتا ہے
وہی جس پر مذاقِ عارفانہ ناز کرتا ہے
خلوص و دردمندی کا فسانہ ناز کرتا ہے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

زبانِ شوق پر جس کی حدیثِ دلبراں بھی ہے
اسی کا پاسباں ہے جو غزل کا رازداں بھی ہے

وہ موسیقی کا دلدادہ ہے فن کا قدرداں بھی ہے
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

ہوا کشمیر صدر رشکِ جناں جس کی قیادت میں
ملا ہے جادۂ حق قوم کو جس کی ہدایت میں

ہرا ہندوستاں سرشار ہے جس کی محبت میں
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

وہ شانِ تمکنت ہے جب شکن لاتی ہے پیشانی
ہو جیسے صفحۂ قرآں پہ آیاتِ قرآنی

خوشا تقدیر جو ہے واقفِ احکامِ ربانی
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

مجھے بھی فخر ہے اس کی ملاقاتِ محبت پر
خلوصِ بے نہایت پر نگاہِ مہر و شفقت پر

مرے ہندوستاں کو ناز ہے جس کی قیادت پر
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کو

وہ جس نے بھر دیا دامن گُلِ مقصود سے سب کا
در دولت سے کوئی آج تک واپس

عزیزؔ اس پیکرِ الطاف کی بخشش کا کیا کہنا
اسے اہلِ زمانہ خالدِ کشمیر کہتے ہیں

کشمیر کا نجات دہندہ

"بخشی صاحب ہندوستان کی اُن تمام انقلابی روایات کے وارث ہیں جنھوں نے آج ہندوستان کو اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں امن کی تحاریک میں شان دار جگہ دی ہے۔ بخشی صاحب نہ صرف کشمیر کی آزادی کی تحریک کے جنم داتا رہے ہیں بلکہ اس کی تعمیرِ نو میں بھی اُن کا ہی حصہ ہے جو کمال اتاترک کا ترکی کی تعمیر میں تھا۔"

(جناب انصار ہروانی ایم۔ پی)

ہمارا اپنا خالدِ کشمیر

بخشی غلام محمد وزیر اعظم حکومت جموں و کشمیر اور صدر آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس ہیں۔ نیشنل کانفرنس عوامی جماعت ہے اور ۱۹۴۷ء سے برسر اقتدار حکمران پارٹی ہے۔ ۱۹۵۳ء سے بخشی صاحب وزیر اعظم چلے آتے ہیں اور اس سے قبل نائب وزیر اعظم تھے۔

اُن کی سالگرہ ۲۰ر جولائی ۱۹۶۱ء کو منائی جا رہی ہے وہ آج چوّن ۵۴ سال کی عمر کو پہنچے۔ عمرش دراز۔ بخشی صاحب سرینگر میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ محنت کش کا یہ گھرانہ اپنی محنت کی حلال روزی سے بسر اوقات کرتا تھا۔ خانقاہِ سوختہ، جو محلہ ان کی جائے ولادت ہے عید گاہ کے وسیع میدان کے نزدیک اور برلبِ دریائے جہلم واقع ہے۔ اگر اس میدان کی وسعت نے اس نوجوان کو جو بچپن میں اکثر کھیلا کرتے تھے، نظر کی وسعت عطا کی تو دریائے جہلم کی پُر وقار اور پُرسکون لہروں نے اُن کے دل و دماغ میں ساتھ ساتھ توازنِ دماغ بھی عطا کیا۔ نیک ماں کی آبیاری نے اس نونہال کو "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق بنا دیا۔

پیدائش کے وقت کس کو علم تھا کہ یہ ہونہار بچہ پٹھانوں، مغلوں، سکھوں اور ڈوگروں کے جابرانہ دورِ حکومت کے بعد عوامی حکومت میں وزارتِ کشمیر کے ساتھ پُروقار حیثیت میں عوام کے ساتھ جمہوری طور طریقہ پر منسلک رہے گا۔ یہ ہو کر رہا اور سچ ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لڑکپن سے ہی بخشی صاحب کے مزاج میں قدرت نے ہمت، محنت، جانثاری، ایثار، رحم دلی اور خدمتِ خلق کا جذبہ عطا کیا تھا۔ مجال ہے کہ آپ کسی کی باتیں خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہوں سُنیں اور ماتھے پر شکن پڑے۔ اگر بہ تقاضائے انسانیت کسی وقت غصہ بھی آئے تو وہ دیرپا نہیں رہتا بلکہ اُس پر زیادہ نوازش ہوتی ہے جو اچانک یا کسی دھوکے سے سادگی میں ایسا کر بیٹھے۔ جس سے آپ آزردہ ہوں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مشن سکول میں حاصل کی ہے۔ اس سکول کی تربیت اور فضا نے ان کے فطری جواہر کو چمکا دیا۔ اور وہ چمک ان کے باعمل ارادوں سے دُور دُور تک پھیل گئی۔ سکول نے ان کو قول و فعل میں پکا SPORTS MAN بنا دیا۔ تیراک بنے۔ کشتی رانی اور کوہ پیمائی سیکھی۔ ڈسپلن کو اپنایا۔ ڈوبتوں کو بچاؤ۔ بیماروں، اپاہجوں اور ناداروں کی مدد کرو۔ علم پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ جسمانی صحت کا خیال رکھ کر مفید شہری بنو۔ ملک اور قوم کی ترقی و بہبودی کے لئے اگر سر کی بازی لگانی ہو تو گریز نہ کرو۔ خدمتِ خلق کو روز کا مشغلہ بناؤ — یہ تھیں وہ باتیں جن کا سبق سکول میں ان کو ملتا تھا۔ باعمل طالبِ علم بلکہ سکول کا وہ طالب علم تھا جو all things to all men موٹو کے ترازو پر پورا اُترتا۔ سچ پوچھئے بخشی غلام محمد سکول کا وہ لڑکا تھا جو غربت اور عشرت دونوں میں پورا اُترا اور وہ "گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی گر بہ ذلت برسی پست نہ گردی مردی" کا نمونہ بنا۔

ان کی ہمت کے سامنے لڑکپن کی کس مپرسی نے ہتھیار ڈالے۔ تنگ دستی نے ان کی محنت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور وسعتِ روزی نے ان کے اولوالعزمی اور پُر اُمید محنت کے پیر چومے۔ الغرض اپنی بے پناہ قابلیت اور ہمت سے انہوں نے زندگی کے میدانِ جنگ و جدل میں کامیابی حاصل کی۔

اُنہوں نے کام سے کبھی دِل نہ چُرایا۔ کٹھن سے کٹھن کام سے نہ گھبرائے۔

محنت مزدوری کی۔ خدمت کی۔ تجارت کو سنبھالا۔ مگر بیکار کبھی نہیں بیٹھے۔ یہ ان کی زندگی کا بہترین نمونہ ہے۔ جہاں رہے کام میں مشغول رہتے۔ بے ہمت بننا اور کسی چیز سے پشیمان ہونا ان کے نزدیک قابلِ شرم حرکت ہے اور انسانی ارتقاء سے کوسوں دُور۔ وہ کبھی خود بھی نہ روئے نہ دوسروں کا رونا اُن کو پسند ہے۔ لڑکپن سے ہی سچائی کے لئے لڑنا اور پھر جرأت سے لڑنا ان کا روزانہ مشغلہ تھا۔ اگر کسی غریب یا مظلوم کو پٹتے دیکھتے تو وہ بے تاب ہو جاتے اور جان کی بازی لگاتے اور اُس مظلوم کی امداد میں سب کچھ کر بیٹھتے۔

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے اوّلین جانبازوں میں آپ کا شمار ہے۔ آپ نے نہایت تکلیف دِہ صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ جیل گئے ہیں۔ صوبہ جموں کی جیلوں میں شدّت کی گرمی میں رہے مگر کبھی بھی ملول دکھائی نہ دئے۔ بلکہ تکالیف کی ایذادہی سے ہمت بڑھتی تھی۔ دورانِ تحریک پوشیدہ کام کرتے تھے۔ مظالم میں بُرقعہ پوش ہو کر تحریک کو چلاتے تھے۔ یہ اوّلین دَور ہے اور یہ وہی دَور ہے جس میں شہدائے کشمیر نے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل سرینگر کے باہر استبداد کی گولیوں کو لبیک کہہ کر فردوسِ ارضی کی پھلواڑی کو ارغوانی رنگ کے خون سے رنگین کر دیا اور اُس کی یاد تا دَورِ قیامت زندہ جاوید رکھی۔ اُس دَور میں گھر گھر پھر کر تحریک کو چلانا اور اُس کو زندہ رکھنا جب کہ دوسرے لیڈرانِ قوم قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ کارے دارد والا معاملہ تھا اور اُس کو سر کرنا ان کا ہی کام تھا۔ خانیار کی نار، زُو تحریک گھوڑ دوڑ پل کی استیہ آگرہ تحریک، چھتوں پر تمام رات نعرے لگانے کی تحریک، پوسٹر لگانے اور آزادی کے نعرے لگانے کی آوازیں، جیلوں کو ہزاروں افراد سے بھرنے کا کام، اخباروں کے ذریعہ بیرونی ممالک کو تحریک کے اغراض و مقاصد اور مظالم سے باخبر رکھنے کی اہلیت اور پھر مظالم سے مرعوب ہو کر ٹس سے مس نہ ہونے کا سپرٹ پیدا کرنے کا باعمل کام ان کا ہی کام تھا کوئی دوسرا اس میں پورا نہ اُترا۔ بھوکے رہے مگر قومی فرض کو انجام دیتے رہے۔ مجاہد منزل ہماری جائے پناہ تھی اور اُس میں ان کی ہمت افزائی شفقت اور دل بھی ہمیشہ معاون و مددگار رہا۔

مختصر سختی کے دَور گزر گئے۔ قربانیوں کے نتائج ظاہر ہوئے۔ ہم نے شخصی راج سے چھٹکارا پایا۔ پارٹی میں ہمیشہ اُن کا ایک اصول رہا او

آج بھی ہر کام میں یہ اُس کے پابند ہیں۔ جب جماعت نے متفقہ طور پر ملکی اور عوامی مفاد کے پیشِ نظر فیصلے لیا تو اس پر پابند رہنا ان کے اصول کے مطابق ایمان کے مترادف ہے۔ خواہ وہ فیصلہ کسی بھی نوعیت کا ہو چنانچہ الحاق کے مسئلہ پر ان کا اٹل فیصلہ اسی بہترین اصول کا نتیجہ ہے اور عوام کی رائے کے عین مطابق ہے۔

آپ سنجیدہ سیاست دان ہیں۔ ان کا دِل و دماغ فہمیدہ اور باعمل ہے۔ باتیں کم کرتے ہیں اور عمل زیادہ۔ وہ زبردست مردم شناس ہیں اور اپنے شہر کے بچے بچے سے واقف ہیں اور ان کے حالات سے بھی باخبر ہیں۔ ہر گھر کا ان کو پتہ ہے اور ہر صاحبِ خانہ کا علم ہے۔ ان کی اس گہری واقفیت کا مجھے ذاتی علم ہے اور میں کبھی کبھی حیران رہتا ہوں کہ بخشی صاحب وزیر اعظم کشمیر کو اپنے ہم وطنوں کی اس قدر واقفیت کیسے ہے اور ان کا دھیان اور ذہن کہاں کہاں لگا ہے!

پوشش آپ کی سادہ ہے۔ رہن سہن بالکل سادہ اور عام انسانوں کی مانند۔ کھانا آپ کا سادہ، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، سر کے اوپر قراقولی ٹوپی۔ ان کا جھوم جھوم کر چلنا نہایت پسندیدہ ہے۔ کشمیریوں کے ساتھ جب اپنی مادری زبان میں بولتے ہیں تو اس طرح بولتے ہیں اور وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے کہ دو بھائی یا باپ بیٹا گھر میں بیٹھے آپس کی باتیں کرتے ہیں۔ وزیر اعظم ہیں مگر ماتھے پر فریادی کی فریاد سننے پر شکن نہیں۔ مجھے اپنے کئی ایسے واقعات یاد ہیں کہ میں اپنی عرضداشتوں میں آداب سے تجاوز کر گیا مگر بخشی صاحب کے ہنستے ہنستے جوابوں نے مجھے ہمیشہ شرمندہ کر رکھا۔ کسی کی تنگ دستی، بے کاری یا مصیبت ان کے لئے برداشت سے باہر ہے۔ جہاں تک ہو سکے، ہر ایک کی دادرسی فرماتے ہیں اور خندہ پیشانی سے۔ کئی ایسے معاملات ہیں جو قابلِ رحم تھے اور بخشی صاحب کی رحم دلانہ طبیعت نے مظلوموں کی دادرسی میں قوانین کی سختی کو بھی بھلا دیا اور ایسے معاملات میں اُلجھے ہوئے افراد پر، جن کا عیال بھوکوں مرتا تھا، خسروانہ نوازش کی۔ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔

عوام کے ساتھ گُھل مِل جاتے ہیں۔ بچوں سے کھیلتے ہیں۔ جیسا کہ باپ اپنے بچوں سے۔ سچ پوچھئے کشمیر کے بزرگ ان کو اپنی اولاد، ہم عمر

اپنا بھائی، جوان اپنا مربی اور بچے اپنا باپ سمجھتے ہیں۔ عورتوں کی داد رسی میں جس جلدی سے آپ کام لیتے ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ ہر جمعہ کو آپ کی کوٹھی پر عوام کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شہر و دیہات کے لوگ قسم قسم کی فریادیں لے کر آتے ہیں۔ اس مجلس میں رُکاوٹ کسی کو نہیں۔ ہر ایک کی سُنتے ہیں اور سُن کر دلجوئی فرما کر مناسب کارروائی کرتے ہیں۔ موجودہ تعمیری ترقی، تعلیم، صنعت، رسل و رسائل، اقتصادی بہبودی کا جس سے جموں و کشمیر بھرا پڑا ہے اور جس کی داستان طویل ہے، ان کی ذات اور ذاتی توجہ سے وابستہ ہے۔ میں ان کو ہر انگریزی یا اُردو مضمون میں بنا بریں بڈشاہِ ثانی کے لقب سے پُکارتا ہوں۔

بچوں سے اس قدر پیار ہے کہ ہر جلسہ میں خود ان میں مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ایک جلسہ میں گذشتہ سال شیرین باغ میں منتظمین مہمانوں کی تواضع کے لئے بعدِ جلسہ چائے اور اس کے ساتھ کھانے پینے کی دوسری چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ جلسہ ختم ہوا۔ صاحب صدر بخشی غلام محمد سے استدعا ہوئی کہ قدم رنجہ فرما کر چائے نوش فرمائیں۔ اُن کی نظر بچوں کی ایک بڑی جماعت پر پڑی۔ اور ان کو دیکھ کر نہایت سختی سے حکم دیا کہ کوئی بڑا چائے پینے کو شامیانہ میں نہ جائے اور صرف بچے جائیں۔ خود اس کو نزدیک میں دیکھتے رہے اور اس طرح بچوں کے کھانے سے [illegible] ہوئے۔

بھکاریوں یا فریاد۔ یوں کو ان کی موجودگی میں کسی کی مجال نہیں کہ ڈانٹ سکے۔ ایک دن پولیس بھکاریوں کے پکڑنے میں مشغول تھی اور اُن کو کیمپ میں لیا جاتا تھا۔ مجاہد منزل کا ایک پُرانا واقف کار اور کارکن جو اب مفلوج ہے اور بخشی صاحب کا دُعاگو حاضرِ مجلس رہتا ہے، اس نرغہ میں آیا۔ گاڑی میں ایک صاحب نے، جو حفاظت کی ڈیوٹی پر تھے، اس کو دھکیل دیا۔ بھکاری نے Man on duty کا نام لے کر پُکارا — "بخشی صاحب۔" بخشی صاحب کے کانوں تک آواز گئی۔ اُنہوں نے فوراً جواباً فرمایا — "تم کو اس کے صدقے کروں گا۔ جلدی اس کو چھوڑ دو۔" کھانا اس کے لئے لایا اور بعد میں واپس لوٹے۔

غریبوں پر ہر چیز کی مہربان ہیں۔ پرسش، دوروں کے دوران عوام کے ہر طبقے، مرد و زن سے بات چیت، سوچ بچار ان کا ادنیٰ کام ہے۔ باہمت ایسے ہیں کہ پہاڑوں میں پیدل یا شدید برف باری میں بانہال کو پار کر کے جموں جاتے ہیں۔ گذشتہ سال کی ان کی ہمہ قسم کی بے مثل ہمت قابلِ داد ہے۔

سیلاب اور آگ میں خود کودتے ہیں اور ڈوبتوں اور جلتوں کو بچاتے ہیں۔ ان کی زندگی کی ایسی ہزاروں مثالیں ہیں۔ دوست دشمن کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ بلکہ دشمن پر ان کی نوازش زیادہ ہے۔ واقعات اس کے گواہ ہیں۔ سیاسی مخالفوں پر شدید مخالفت کے باوجود مہربان رہے ہیں۔

ان کی ذات کے ساتھ ہر دوست دُشمن کو محبت ہے اور اُن کے ذاتی اوصاف کی قدر ہے۔ عوام کو ان کی ذات سے والہانہ محبت ہے۔ ان کے تعمیر و ترقی کے کام اور عوام کی خدمت ان کی ذات کو ہمیشہ تاریخ عالم زندہ رکھیں گے۔ حقیقت میں حکومت جموں و کشمیر کے وہ واحد طور پر اور احسن طور پر چلانے کے بذاتہٖ ذمہ وار ہیں۔ وہ اعلیٰ ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ سیاست دان ہیں، انجینئر ہیں، پروفیسر ہیں، ڈاکٹر ہیں، کواپریٹر ہیں۔ کسان ہیں، مزدور ہیں، معمار ہیں اور عوام کے صحیح ترجمان اور رہنما ہیں۔ حسب ذیل چند ابیات سالگرہ کی مُبارک تقریب پر میری جانب سے ان کے پیشِ خدمت ہیں: ؎

عوام کا خادم بخشی بھائی — مُلک میں جس نے ترقی لائی
تعمیر و ترقی دیکھو باہر — ان کے عہد میں ہم نے پائی
بچوں سے محبت لوگوں سے اُلفت — کرتے ہیں مانند باپ اور مائی
معمارِ مُلک ہیں قائدِ قوم ہیں — جب سے ملک میں ترقی آئی
چھوٹوں سے ملنا ان کا کام ہے — بڑوں کی قدر کی نوبت آئی
بخشی بھائی، بخشی بابا — مُبارک سالِ نو، عمر درازی
عنایت تم کو کرم اور رحم ہو — عمرِ جاوید اور نورِ الٰہی
علی ہے دُعا گو تیرا ادنےٰ — رحمت ہو تم پر خدا کی [illegible]

نذرِ خالدِ کشمیر

بتقریبِ جشنِ ولادت

عظمتِ ہندوستاں کے پاسبانِ ہوش مند
آسماں گیر جہاں ہے تیرا عزمِ سربلند

تیرا عنوانِ سفر ہے جادۂ حسنِ عمل
زندگی تیری غنیؔ کی شاہکارِ دل غزل

جنتِ کشمیر کے رنگیں نظر معمار تو
آفتابِ علم و دانش تیری پیشانی کی ضو

دانشِ امروز تیرے حلقہ برداروں میں ہے
ذکر تیرا محفلِ انجم کے سیاروں میں ہے

قلب نورالدین ولیؒ کا آئینہ تیری حیات
فکرِ انور شاہؒ تیری آرزو کی کائنات

روحِ گاندھی ہر قدم تیرے ارادوں کی مشیر
دیدۂ آزادؒ سے تیری نگاہیں مستنیر

پاسبانِ عزت و توقیرِ انسانی ہے تو
پیکرِ عزمِ جواں، تصویرِ قربانی ہے تو

ہر دلِ پُر دردِ آدم کا شریکِ غم ہے تو
زخمِ دل کا غربت و افلاس کے مرہم ہے تو

پڑھ کے ہر چہرہ کو سینے کی خبر لیتا ہے تو
سازشِ دشمن سے بھی دادِ نظر لیتا ہے تو

عرش پر پہنچے نہ شالامار کا کیونکر دماغ
تازہ پانی میں کئے نامی کے پھر روشن چراغ

یہ عوام الناس پر تیرا بڑا انعام ہے
چشمۂ شاہی غریبوں کے لئے اب عام ہے

ہر برس رنگینیٔ جشنِ بہاراں کی قسم
وادیٔ کشمیر بن جاتی ہے گلزارِ ارم

جذبۂ اخلاص خیر و ربط باہم کر دیا
ہند اور کشمیر کے رشتوں کو محکم کر دیا

جاوداں یہ رنگ ہے خوش بختیٔ احوال کا
ہے جواہر لال تیرا تو جواہر لال کا

امن کے خوابوں کی یہ کتنی حسین تعبیر ہے
قسمتِ ہندوستاں، کشمیر کی تقدیر ہے

کوئی اس تعبیر کے خاکے مٹا سکتا نہیں
چشمِ بدبیں کوئی اس جانب اٹھا سکتا نہیں

روز افزوں سلسلہ ہو عمرِ خوش اقبال کا
ہر چھپن پر اضافہ ہو چھپن سال کا

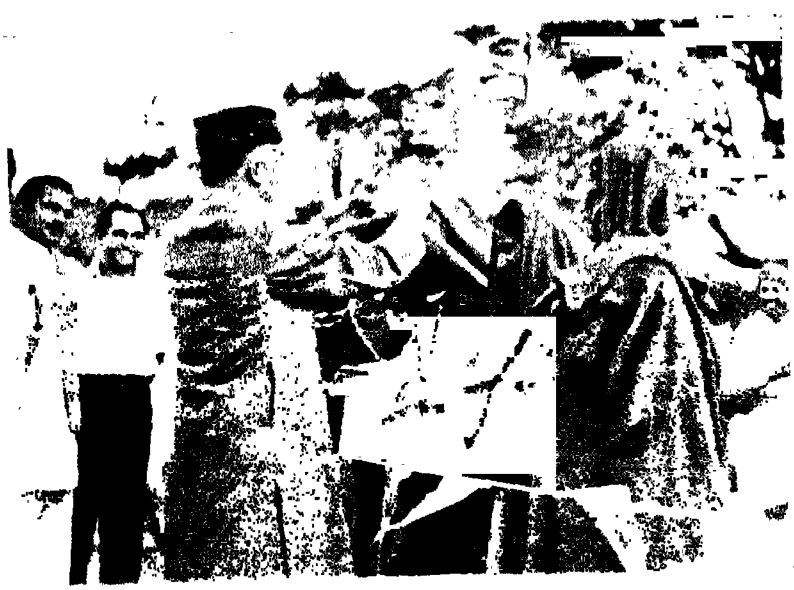
جاوداں ہو تیرے گلزارِ تمنا کی بہار
زندگی کا ہر نفس ہو نغمہ ریز و عطر بار

کاش سرحد پار بھی جائے یہ سازِ دل کی لے
ہر زباں پر خالدِ کشمیر زندہ باد ہے

۲۰۲
۱۷۵۹ + ۲۰۲ = ۱۹۶۱ء



''ننھے بچو! تم بھارت کی آشا ہو''

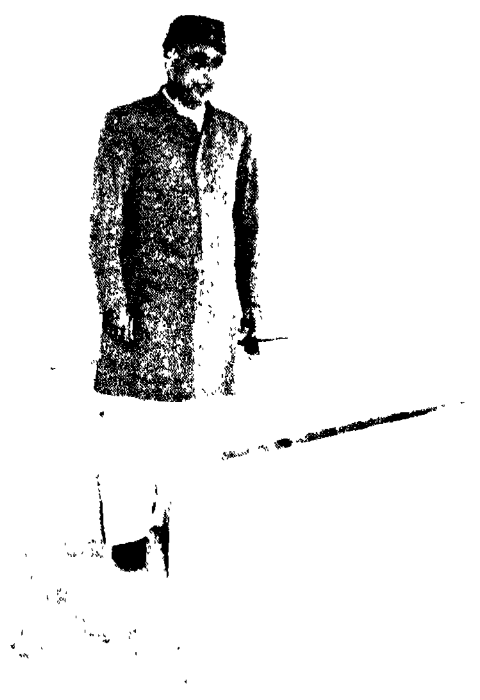


''پیاری بہنو! تم وطن کی شوبھا ہو''

ہم پھولوں کے حسن کی خاطر انگاروں سے کھیلے ہیں-



پاکستان کے دورے میں [illegible] صاحب اس زندان خانے کو دیکھنے
بھی گئے- جہاں انہوں نے ۳۴ء میں سولہ مہینے کی قید کاٹی-



داستانیں

قصہ کہنا یا سننا انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب ہماری تہذیب نے ابھی [illegible] کرنا سیکھا تھا تو قصہ گوئی کا فن شروع ہو چکا تھا۔ ابھی انسان لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ وہ غاروں پر تصویریں بھی نہ بنا سکتا تھا۔ لیکن دماغ سے قصے گھڑ گھڑ کر سنا سکتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ قصہ گوئی کا آغاز اُس وقت ہوا جس وقت انسان نے کھڑے ہو کر چلنا سیکھا۔ قصہ کہنے یا سننے کی عادت کرۂ ارض کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے۔ ان میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو مہذب کہلاتی ہیں اور وہ بھی قصہ گوئی سے دلچسپی لیتے ہیں جن سے تہذیب نے آنکھیں دوچار نہیں کی ہیں۔ گویا قصہ کہنا سننا کسی مخصوص تہذیب کی روایت نہیں تھی اور نہ یہ مہذب قوموں کی امتیازی خصوصیت تھی بلکہ قصہ گوئی انسانی نفسیات میں داخل ہے۔ ان داستانوں کے ذریعہ انسان نے نہ صرف اپنی فطرت کا اظہار کیا ہے بلکہ اس نے ان کے ذریعہ مستقبل کے سنہرے سپنے بھی دیکھے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے زمین کے چھپے ہوئے دفینے دریافت کئے اور ان ہی کے وسیلے سے اس نے فضا کی بلندیوں میں پرواز بھی کی ہے۔ دیوی دیوتا، جن و پری، پرندے اور جانور، پیڑ اور پودے ان قصوں کے کردار بن جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کے پردے ان کے ذریعہ کھلتے جاتے ہیں۔

خود ذہن کی نفسیات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انسان اپنی محرومیوں کو [illegible] میں حاصل کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان فطرت کے سامنے [illegible] بے دست و پا محسوس کرتا تھا۔ وہ غاروں کی تاریکی میں [illegible] کے سامنے سر [illegible] ہوتا اور جان بھی تسلیم کرتا۔ وہ میدانوں اور جنگلوں میں درندوں کا شکار ہوتا اور اگر ان سے بچ جاتا تو موسموں کی شدت کے سامنے مجبور ہو جاتا۔ جس طرح وہ جسمانی طور پر ان طاقتوں پر فتح پانے کی فکر میں دن رات لگا رہتا وہاں وہ اپنے خوابوں کے محل بھی بناتا اور انھی خوابوں میں ان ارضی و سماوی طاقتوں پر فتح بھی حاصل کر لیتا۔ جہاں [illegible] کی زندگی میں اسے وقتی طور اگر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو وہاں وہ اپنے خوابوں میں ان حسرتوں کی تکمیل دیکھتا اور اپنے آپ کو فاتح محسوس کرتا اور یہ خواب داستانوں میں ڈھل جاتے۔ جن طاقتوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو بے بس پاتا وہاں وہ داستانوں میں انھیں پسپا کرتا۔ اور بقول [illegible] حسین جن حسینوں کی آرزو میں مرتا ان کی تحصیل کا خواب انھیں کہانیوں میں دیکھتا۔ زندگی کے سفر کے نشیب و فراز میں جو کٹھنائیاں پیش آتی تھیں ان کو اپنے حالات کے مطابق کرتے اور ان پر قابو پانے کی تعلیم بھی انھیں کہانیوں کے ذریعہ دیتا۔

یہ داستان گوئی کا نفسیاتی جواز تھا۔ لیکن اگر ہم تاریخی طور پر اس کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ داستان گوئی کو ایک ایسے دور میں فروغ حاصل ہوا جب کہ لوگوں کے پاس نسبتاً زیادہ فراغت تھی۔ صنعتی زندگی سے پہلے کے زمانے میں جب آبادی کا بڑا حصہ کھیتوں پر کام کرتا تھا، ایک گھر والے کی ساری ضروریات کھیتی باڑی سے پوری ہوتی تھیں اور گھر کے تمام افراد کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ اس وقت بونے اور [illegible] کے درمیان [illegible] ان کا ہی بونے اور وقت گزارنے کا [illegible] وہاں [illegible] کے مقابلے میں زیادہ فراغت حاصل تھی اور وہ [illegible] کے لمحات

ہیں وہ اس سے جی بہلایا کرتے تھے۔ مرزا غالب نے داستان گوئی کے اس عنصر کو سمجھتے ہوئے کہا تھا کہ "داستان گوئی منجملہ فنونِ سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کا اچھا فن ہے۔" یہاں غالب نے داستان کی ادبی حیثیت کو کم کرنے کے لئے یہ بات نہیں کہی ہے، جیسا کہ ممتاز حسین کا خیال ہے بلکہ غالب نے اس کے ایک اہم وصف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسے منجملہ فنونِ سخن میں شامل کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ غالب کے سامنے داستان کی فنی حیثیت مسلّم ہے۔

داستانیں اس وقت وجود میں آئیں جب انسانی شعور زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا۔ انسان جذبات کے جھکولوں سے سکون حاصل کرتا تھا۔ اس لئے وہ جنوں، پریوں اور دوسری مافوق الفطرت چیزوں سے اپنا دل بہلایا کرتا تھا۔

یہ تھا داستانوں کا تاریخی جواز۔

اب آئیے داستانوں کے مواد پر غور کریں۔ داستانوں کی ایک اہم خصوصیت مافوق الفطرت عنصر کی موجودگی ہے۔ یہ عنصر اتنا اہم ہے کہ اگر اسے داستانوں سے نکال دیا جائے تو پوری عمارت اڑا اڑا دھم کر کے نیچے آ پڑے۔ یہاں دیو پریاں بھی بستے ہیں اور جادو کے محل بھی۔ یہاں جانور بولتے ہیں اور پرندے انسانوں کی زندگی کے رازوں سے واقف ہوتے ہیں۔ قالین ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ میلوں کا فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہوتا ہے۔ دیو زاد کی زندگی پودوں میں محفوظ ہوتی ہے یا کسی توتے میں کہ اس کی گردن مروڑ دی اور دیو زاد کا خاتمہ ہو گیا۔ سرمہ ایسا کہ لگانے کے بعد زمین کے چھپے ہوئے خزانے نظر آ جائیں اور اگر جادو کی ٹوپی پہن لے تو اسے کوئی دیکھ نہ پائے۔ وہ ہر ایک کو دیکھے۔ زمین کی تقسیم ملکوں کے اعتبار سے نہیں ہوتی بلکہ ہمیں یہاں انسانوں اور جنوں کے علاقے نظر آتے ہیں اور زمین سے غلہ نہیں پیدا ہوتا، ان میں سحر ہوتا ہے۔

انسان پریوں پر عاشق ہوتا ہے تو کوہِ قاف کے بادشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس میں اسے بڑے بڑے خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ اور ان کی فتح کا راز مافوق الفطرت پر انسان کے قابو پالینے میں ہے۔ مافوق الفطرت کے عنصر کے پیش کرنے میں قوتِ متخیلہ کو بہت دخل ہے۔ کیونکہ فکر و عقل کے عنصر کی کمی قوتِ متخیلہ کے ذریعہ پوری کی جاتی ہے۔ یہاں رائی کا پربت بن جانا بڑی معمولی سی بات ہے اور کبھی کبھی یہ پربت بغیر رائی کے بھی بن جاتے ہیں۔ داستانوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی مربوط پلاٹ نہیں ہوتا۔ یہ ایک مذبیہ کی طرح شروع ہوتی ہے۔ یہاں انسانوں، دیوؤں، جنوں اور پریوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ اس کا سارا لطف زورِ بیان میں ہوتا ہے۔ الفاظ کا ایک سمندر ہوتا ہے جو یہاں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ کسی واقعہ یا کسی بات یا کسی فرد کے حدود مقرر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ داستانوں میں تناسب نظر نہیں آتا۔ گویا لکھنے والے کے سامنے کوئی خاکہ نہ تھا۔ وہ صرف اپنی قوتِ متخیلہ کے بل بوتے پر ساری داستان سرائی کرتا تھا۔ خوابوں کے کوئی حدود نہیں ہوتے۔ چنانچہ داستانیں کسی قسم کی حدبندی گوارا نہیں کرتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں پلاٹ کی کوئی باقاعدہ ترتیب نہیں ہوتی۔ گویا داستانوں میں ایک وحشت ہے جسے مفید نہیں کہا جا سکتا۔

داستانوں کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کردار نگاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں ہیرو ہوتے ہیں اور ہیرو سے جھگڑنے والے دیو زاد یا جنات۔ داستانوں کے ہیرو عموماً ایک ہی قسم کے عزائم اور ایک ہی طرح کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ داستانیں جس دور کی پیداوار ہیں، اس وقت انسان نے اپنے آپ کو شخصی طور پر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں انسان کی حیثیت کرۂ ارض پر اکائی کی سی تھی۔ اس لئے مختلف افراد کی شخصیت کی مختلف تہوں، اس کی نفسیاتی اور سماجی زندگی پر کوئی غور نہیں کیا گیا۔ اسی لئے داستانوں میں کردار نگاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

داستانوں کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لکھنے والے کی ذات، شخصیت اور اس کا زندگی سے متعلق نقطۂ نظر بالکل نظر نہیں آتا۔ ہر داستان ایک انداز سے لکھی جاتی ہے۔ کسی داستان پر کسی کا نام دے دیا جائے تو فرق نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ مصنف کی شخصیت یا اس کے نقطۂ نظر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہاں واقعات سے براہ راست دلچسپی لی جاتی ہے اور سارا زور واقعات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ جس طرح ہم کالی داس کے ڈرامے شکنتلا کو پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شیکسپیئر کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے یا شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کو کالی داس یا برنارڈ شا کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔ ہر تصنیف پر مصنف کی شخصیت کا

عکس پڑتا ہے۔ داستانیں اپنے مصنف کی عکاسی نہیں کرتیں۔ آپ کو داستانوں میں ان کے مصنف کی شخصیت نہ نظر آئے گی۔

داستانوں کی ماہیت کا تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم مجموعی طور پر اس صنفِ ادب کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ داستان ایک اہم صنفِ سخن ہے۔ بعض لوگ اس سے وہ مطالبات کرتے ہیں جن کی ناول میں ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی مختصر افسانے کی خصوصیات کو ناول میں تلاش کرے تو یہ فعل عبث ہوگا۔ داستانوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ اس کے اپنے آداب ہوتے ہیں جو ما فوق الفطرت سے آراستہ ہوتا ہے۔ لیکن اس عہد کی معاشرت داستان کے ذریعہ چغلی کھاتی ہے۔ آپ داستانوں کے آئینہ خانے میں ماضی کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو انسانیت کے بچپن کی کلکاریاں نظر آئیں گی۔ انسان اپنے بچپن کے کھیل تماشوں اور حماقتوں کے دور سے گزر جاتا ہے۔ لیکن وہ ان معصوم شرارتوں اور نادانیوں کو یاد کر کے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کی یاد اس کے لئے اکثر و بیشتر لطیف ہوتی ہے۔ یہی حال داستانوں کا ہے۔ یہ انسانیت کے بچپن کی کلکاریاں ہیں۔ ممتاز حسین نے صحیح کہا ہے کہ :۔

"داستانوں سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس کچھ زیادہ بڑھی ہے۔ کیونکہ اب ہم داستانوں کی جذباتی اور داخلی گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ آج ان کا تجزیہ ہم خارجی انداز سے کرنے پر زیادہ قادر ہیں۔" داستانوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انجام ارتقا کے اصول کی طرح ہمیشہ رجائی ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی شکست نہیں ہوتی۔ یہاں انسان ہارتا نہیں۔ ورنہ اس کے خواب چکنا چور ہو جائیں۔ یہاں اگر انسان مارا بھی جاتا ہے تو ایک نئی جد و جہد کر کے اس کا سر دوبارہ جوڑ لیا جاتا ہے۔ وہ بوٹیاں تلاش کی جاتی ہیں جو اسے نئی زندگی عطا کرے۔ کبھی کبھی انسانوں ہی کی غلطیوں سے یہ سر غلط جوڑ جاتے ہیں۔ لیکن داستان لکھنے والا دیوتاؤں یا جنوں سے انسانوں کا مذاق نہیں اڑوانا چاہتا۔ اس سر کو پھر سے کاٹ کر جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر یہ انسان اپنے دشمن پر فتح پاتا ہے۔ کوئی داستان المیہ پر ختم نہیں ہوتی۔ داستان زندگی کے ارتقا کا بہت بڑا استعارہ ہے۔ یہاں زندگی کا راز امید پر ہے نہ کہ مایوسی پر۔

ہمارے آج کے تقاضوں کو داستان پورا نہیں کر سکتی۔ اسی لئے اس نے اپنے پیش رووں کے لئے جگہ خالی کی ہے۔ لیکن داستانوں کی داستان دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

سب سے جدا، سب کا رفیق

بقیہ از صفحہ نمبر ۲۴

لیکن بخشی صاحب اس میدان میں بھی شہسوار ثابت ہوئے۔ ان کی نظر حکومت کے ہر شعبے پر رہتی ہے اور وہ ہر اہم مسئلے کو خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں۔

بخشی صاحب کے مدِنظر خالی بڑے بڑے صنعتی اداروں کے قیام کے مسئلے ہی نہیں رہتے بلکہ وہ ترقی کے ایسے کاموں میں زبردست دلچسپی لیتے ہیں جن کا عوامی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ دورہ کر کے گلی کوچوں کی مرمت، روشنی کے انتظامات اور صحت عامہ کے طریقوں کی جانچ پڑتال کرتے رہتے ہیں۔

خواہ وہ اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل ہو یا وزیر اعظم روس، خواہ وہ برطانیہ کا سابق وزیر اعظم ایٹلی ہو یا جوئن، دنیا کا کوئی اخباری نمائندہ ہو یا کسی ملک کے وفد کا لیڈر، کوئی سیاح ہو غیر سیاسی یا سیاسی لیڈر، سب بخشی غلام محمد کی شخصیت کی عظمت، ان کی بے پناہ قوت، ان کی عوام کی خدمت کا نقش اپنے دلوں پہ لے گئے ہیں۔

سعید سہروردی

کیسر کی وادی

آنے والو، شوق سے آؤ بھارت کی پھلواری میں
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں کیسر کی اس وادی میں
سفیتل جھرنے، بے کل لہریں لائیں نئی،
چنچل پُروا کے یہ جھونکے گائیں سنگیت
نین کٹوروں میں جھیلوں کے ڈولے من
سندرتا کی ناگن جھومے آ کے اس
آنے والو، شوق سے آؤ بھارت
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں، کیسر کی اس وادی میں
اجول برف بندھی چوٹی پر کرنیں اڑ
موتی بن کے اوس برسائے، سپنے من کو بھائیں
بیاکل من اس پریم نگر میں آس ملن کی پائیں!
جیسے رادھا شیام کو پائے گوکل کی گلیاری میں!
آنے والو، شوق سے آؤ، بھارت کی پھلواری میں
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں، کیسر کی اس وادی میں
مسجد کے میناروں پر سے آئیں صدائیں اذانوں کی
سانجھ سویرے مندر مندر گونج رسیلی تانوں کی
رین اندھیاری چونک اٹھے ہیں سن للکار جوانوں کی
سیمائوں پر سب چوکس ہیں، سب ہیں پہرے داری میں
آنے والو، شوق سے آؤ بھارت کی پھلواری میں
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں، کیسر کی اس وادی میں

آنے والو! شوق سے آؤ، لیکن جنت چاہنے کو
کشمیر کی اس وادی میں تم سے گیت جگانے کو
گر تم آئے اس [illegible] شانت سورج میلنے کر
سنسار کی [illegible] کی بہاری میں
نفرت کا طوفان بپا ہے، گوکل کی گلکاری میں
آنے والو! شوق سے آؤ بھارت کی پھلواری میں
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں کشمیر کی اس کیاری میں!

خوشحالی کا نقیب

کشمیر کی ترقی اور خوشحالی کا حقیقی ذمہ دار جناب بخشی غلام محمد کی مخلص قیادت ہے۔ انہیں اپنے عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے اور وہ تن من سے عوام کی بہبود کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کشمیر میں چند دن رہ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ ان کی قیادت میں عوام کے [illegible] جو [illegible] کر اپنی زندگی میں عمل [illegible] کی حیثیت دے رہے ہیں۔

ان چند سادہ باتوں میں جن پر میں چلتا اور [illegible] دیش کی [illegible] اور [illegible] گزرنے کے بعد بھی [illegible] کی۔ [illegible] ان کی جوانی [illegible] سادگی اور سادہ پن، "[illegible] سے بڑھ کر علم اور ہنرمند کی عزت کرنا اور سب سے بڑھ کر اپنے دیش کی مٹی سے [illegible] بخشی صاحب کی باتوں میں [illegible] قول اور فعل میں [illegible] میں دیش کی مٹی کی بھینی بھینی مہک [illegible] مٹی کا پیار ملتا ہے۔ اسی لئے میں [illegible] پیار کرتا ہوں ..."

——— پرتھوی راج کپور

جی۔ مسیٹی
ترجمہ (ہربنس سنگھ دوست)

علامہ اقبالؒ سے چند ملاقاتیں

علامہ اقبال کے نام سے متعارف ہو چکا تھا۔ اقبال مرحوم کی "بانگِ درا"، "ہندوستان ہمارا" اور "ہمدردی" وغیرہ نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اُن دِنوں وُہ بہت تیزی سے لکھ رہے تھے (۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء) اُن کی ہر نئی تخلیق اُردو پڑھنے والوں کو آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ اُس کے بعد علامہ اقبال کی تخلیقات "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی"، "پیامِ مشرق"، "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" میں پڑھیں اور اس طرح اقبال کا اثر میرے دِل اور ذہن پر پوری طرح جم گیا۔

۱۹۳۵ء کے دِن تھے۔ میں اُن دنوں لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ کونسل کے انتخابات کا چرچا چاروں طرف ہو رہا تھا۔ میں نے میاں ذوالفقار (مرحوم) کی ڈاکٹر اقبال پر لکھی ہوئی انگریزی کتاب اُن دنوں تازہ تازہ پڑھی تھی (کتاب کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا) اُن ہی دِنوں ڈاکٹر اقبال کا تحریر کردہ مقالہ "اسلام اور قادیانیت" بڑا مقبول ہو رہا تھا۔ اِس سے متعلق لیڈروں میں بڑے لمبے دھڑے ہو رہے تھے اور عام لوگوں میں بھی یہ بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ اُس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک تنقیدی مضمون اس مقالے کے بارے میں "ماڈرن ریویو" میں پڑھا اور ڈاکٹر اقبال کا جواب (اسلام اور احمدیت) بھی میری نظر سے گزرا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اقبال نے لکھا تھا کہ اس مقالے کے بعض حصے پنڈت جی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ جس کی وجہ اُن کی نظر میں یہ تھی کہ اسلام کے بارے میں اُن کا مطالعہ وسیع نہیں۔ اور وہ اسلامی ماحول سے بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ لاہور میں اُن دِنوں چھوٹی بڑی نشستیں اور جلسے اکثر ہوا کرتے تھے۔ اقبال کے مخالف جن میں کئی ہندو تھے اور کئی مسلمان، جلسوں اور میٹنگوں میں اقبال کے یہ مندرجہ ذیل اشعار بہت زور و شور سے پڑھا کرتے تھے:

(۱) مسجد تو بنا دی شب بھر میں، ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پُرانا پاپی ہے، برسوں میں غازی بن نہ سکا

(۲) اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

علامہ کو میں نے ان جلسوں میں حصہ لیتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ شاید اس کی وجہ اُن کی بگڑتی ہوئی صحت تھی۔ اُن دنوں اُن کا گلا بالکل خراب ہو گیا تھا۔ اور چند الفاظ بھی وہ بمشکل ہی کہہ پاتے۔ اُن کے مخالف اکثر کہا کرتے: "آخر اقبال یہ سب ہی کیا، حُقّہ لے کر دِن بھر گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ دو کش لگائے، دُھواں چھوڑا اور شعر کہہ دیا۔" وغیرہ وغیرہ

علامہ اُن دنوں میکلوڈ روڈ پر ایک پُرانی سی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ اُن کی میو روڈ والی کوٹھی جاوید منزل بن رہی تھی۔ جب کبھی میں میکلوڈ روڈ سے گزرتا، اُن سے ملنے کی دبی ہوئی خواہش دِل میں چٹکیاں لینے لگتی۔ کوٹھی اور سڑک کے بیچ ایک لمبی سی گلی تھی۔ گلی کے بائیں طرف ایک کھلی زمین تھی جہاں مکئی کے پودے میں نے اکثر کھڑے یا جھولتے ہوئے دیکھے تھے۔ سڑک پر سے کوٹھی کی گیلری کے ستون بالکل صاف نظر آتے تھے۔ علامہ کے

مجھے ایک مدت سے خواہش بہت پہلے سے تھی، اُن کے پاس جانے کی ہمت مجھ میں
نہ تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ اُن تک پہنچنے میں کسی طرح کی کوئی دقت
نہ ہوگی لیکن مجھ پر علامہ کا اتنا رعب چھایا ہوا تھا کہ دل میں خواہش ہوتے
ہوئے بھی جانے کی ہمت نہ کر پاتا۔ شاید نومبر کا مہینہ تھا جب مشہور افسانہ
نگار پریم چند تلمیذی مرحوم (جو اس وقت ادب میں قدم رکھ رہے تھے)
لاہور آئے اور میرے ساتھ میکلوڈ روڈ پر ٹھہرے۔ اُن کے آنے کے تقریباً
ایک ہفتہ بعد ہم دونوں جناب بشیر احمد (مدیر ہمایوں) اور بیرسٹر شوکت
شمیم کو ساتھ لے کر علامہ سے ملنے کے لئے چلے۔ سڑک والے پھاٹک کو
پار کرتے ہی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جناب بشیر احمد نے اپنی آمد کی خبر
بھجوائی تو اندر سے نوکر آیا۔ "چلے آئیے!"

گیلری سے ہوتے ہوئے ہم دائیں طرف کے ایک کمرے میں داخل ہوئے
اُن دنوں موسم خاصا سرد تھا۔ علامہ بادامی رنگ کا ہرے کنارے والا دُھسہ
اوڑھے، حقے کی نے منہ میں لئے، بستر پر گٹھڑی سے بنے تکیے پر ٹیک لگائے
نیم دراز تھے۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں کچھ لوگ پہلے سے ہی
موجود تھے۔ علامہ اُن میں سے ایک شخص کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے بات
چیت کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بڑا گہرا طنز کرتے اور کبھی کبھی ہنسنے لگتے۔
(بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیرسٹر جلال الدین تھے) وہی "اسلام اور احمدیت"
والا قصہ چل رہا تھا۔ ہم اندر داخل ہونے کے بعد کچھ دیر تک خاموش ہی
رہے۔ اُس کے بعد کسی نے بات کی تو پھر کسی نے بھی رائے دی۔ علامہ نے
بات آگے بڑھائی اور اس طرح بہت دیر تک بات چیت چلتی رہی۔ اور دوں
کو اس طرح آزادی سے گفتگو کرتے دیکھ کر میری ہمت بھی بڑھی۔ میں نے
بھی دو ایک باتیں چھیڑیں۔ علامہ ہر ایک کی بات بڑے اطمینان سے سنتے۔
زیادہ تر چپ رہتے لیکن جب مناسب سمجھتے تو کچھ کہہ بھی دیتے۔ جب بھی کوئی
سیدھا سوال کر بیٹھتا تو اُس کا جواب بڑی سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر
دیتے اور بڑی احتیاط سے اپنی تخلیقات کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور
کرنے کی کوشش کرتے۔ اُن کی بے تکلفی، خلوص اور انکساری دیکھ کر میری
حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ [illegible] ہر ایک کے لئے ہمدردی
تھی

سے بھرا ہوا ہے۔ باتوں کا ایک جواب جھٹک دیتا۔ بات چلتے چلتے "بانگِ درا"
تک پہنچ گئی۔ بشیر صاحب نے کہا — "افسوس ہے قوم نے آپ کی قدر نہ
کی۔ اگر کوئی اور ملک ہوتا تو "بانگِ درا" یا دوسری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں
بِک جاتیں۔"

علامہ نے بشیر احمد صاحب کی اس بات کو شاید پسند نہیں کیا۔ بولے "قوم
غریب ہے اور جب کوئی غریب آدمی آ کر میری شاعری سے متعلق مجھ سے کچھ
کہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں، قوم میری قدر کر رہی ہے۔"

میں نے بڑی ہمت سے کام لے کر اُن سے پوچھا کہ آپ کی شاعری کا نصب
العین کیا ہے۔ جواب ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں دیا:-

"There is a Crust at the heart of Central Asia. I want to break through it."

بشیر احمد صاحب نے بات چیت کا رُخ موجودہ طرز پروپیگنڈا اور اُس کے
نقصانات کی طرف پھیر دیا اور اُس کی مذمت بھی کی۔ علامہ نے کہا — "خدا
کی طرف دیکھو۔ وہ سب سے بڑا اشتہار باز اور پروپیگنڈا کرنے والا ہے۔
یہ ساری کی ساری کائنات اُس کی اشتہار بازی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے —
ہزاروں لاکھوں قسم کے لوگ اشتہار ہیں۔ تم پروپیگنڈا کو اتنا برا کیوں کہتے ہو"

پردیسی نے ٹیگور کے بارے میں پوچھا تو بولے — "ٹیگور بہت عظیم مفکر
ہے۔ اتنا عظیم کہ آج ہندوستان میں کوئی اُس کی ٹکر کا نہیں ہے۔" پھر
گنگناتے ہوئے بولے — "اُس کے افکار کی گہرائی اور عظمت کبھی کم نہیں ہوگی
اُس کی شاعری امن و سکون کی پیامبر ہے۔ وہ ایک [illegible] ہے اور عمل
کی ترغیب دیتا ہے... اور میری شاعری میں اوّل تا آخر [illegible]
ہے لیکن میں عملی انسان نہیں ہوں۔"

میرے یہ پوچھنے پر کہ آپ کی سب سے پہلی تخلیق کون سی ہے۔ علامہ نے
حقّے کا ایک طویل کش کھینچ کر ایک لمبی سی "ہوں" کی اور کچھ دیر غور کے بعد
"ٹھیک نہیں کہہ سکتا، پر اسٹیج پر میں نے سب سے پہلے نظم
"نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

جب [illegible] تعارف کرایا۔ یہ بتا کر کہ [illegible] کشمیری ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور [illegible] یہ شعر پڑھا

[illegible]

[illegible]

کہنے لگے کہ میں کئی بار کشمیر جا چکا ہوں۔ لیکن طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ آہ! کیا جگہ ہے۔ اس کے بعد وہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر یکایک بولے۔ [illegible] ۔ میں پیچھے [illegible] آپ [illegible] ؟

[illegible] ۔ میں نے کہا۔

[illegible] پھر ایک لمبی [illegible] ۔ [illegible] ڈاکٹر صاحب کے [illegible] کہ ڈاکٹر صاحب کی [illegible] مطلب ہے کہ [illegible] ڈوب گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد [illegible] بولے۔

[illegible] آپ وہاں کی قومی تحریک کے بارے میں [illegible] بتائیے۔

[illegible] کرنے لگا کہ کسی [illegible] کے آنے کی اطلاع [illegible] نے [illegible] سے کہا۔ آئیے آئیے۔ [illegible] نے [illegible] آداب کیا اور کانپتے ہوئے لہجے [illegible] کے لیے [illegible] آیا ہے۔ [illegible] ایک کتاب [illegible] کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ [illegible]

[illegible] نے کتاب کھولی۔ وہ [illegible] ۔ [illegible] نے کہا کہ کتاب کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible]

کہا۔ [illegible]

[illegible] جیسے [illegible]

[illegible]

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

لیکن [illegible]

[illegible]

[illegible]



پنچایت الیکشن میں منتخب شدہ
پنچوں سے ایک مذاکرہ۔



"قومی معیشت کی ترقی کے لئے مال مویشی
کی پرداخت بڑی ضروری ہے"



شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے دیہاتیوں نے بخشی صاحب
کی گاڑی روک لی اور ان کے ارشادات سننے کے لئے اصرار کر
لیا۔ بخشی صاحب ملک کی تعمیر و ترقی کے محبوب
موضوع میں گم ہو گئے





ذکر ہے۔ اُن کے لہجے میں ایک خاص اثر تھا جو سُننے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ لفظوں میں اُسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اِس کے بعد میں کئی بار علاّمہ سے مِلا۔ لیکن جب کبھی بھی گیا، آٹھ دس آدمیوں کو وہاں پہلے ہی بیٹھے دیکھا۔ علاّمہ کسی شخص کو بھی کوئی خاص گرم جوشی سے خوش آمدید نہ کہتے۔ اور نہ ہی کسی شخص کے کسی وقت بھی آنے سے اُنہیں کسی طرح کی تکلیف ہوتی۔ جس کا دِل چاہتا جب بھی ہو چلا آتا۔ اور دو چار گھڑی باتیں کرکے اُٹھ جاتا۔ صرف ایک بار دیکھا: علاّمہ کسی کو خوُد اُٹھ کر پھاٹک تک چھوڑنے گئے۔ وہ تھیں محترمہ سروجنی نائیڈو صاحبہ۔ علاّمہ اُن کی شعری تخلیقات کی بہت قدر کرتے تھے اور اُن کے خیال میں اُن کی تخلیقات انگریزی ادب میں ایک خاص مقام پانے کی حق دار تھیں۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے، اُن کا دروازہ ہر شخص کے لئے ہمیشہ کھُلا رہا۔ اُن سے مِلنے کے لئے کسی بھی طرح کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ کوئی آتا، گھنٹوں بیٹھا رہتا، باتیں کرتا، مذاق کرتا، اُنہیں کبھی بھی ناگوار نہ گزُرتا۔ صبح سے شام تک مِلنے والوں کا ایک ہجوم اُن کے مکان پر لگا رہتا۔ دو چار مِلنے والے اُٹھ کر چلے جاتے تو دو چار اور آجاتے۔۔۔۔

اکثر میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا کہ علاّمہ کھانا وغیرہ کب کھاتے ہیں۔ پڑھنے لِکھنے کے لئے کس طرح وقت نِکالتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ دِن بھر گھر پہ رہنے کے عادی ہوگئے تھے اور چلنے پھرنے سے کترانے لگے تھے۔ پروفیسر حمید احمد نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اُن سے تنہا مِلنا ہو تو صبح کا وقت بہترین ہے، جب وہ راوی کے کنارے سیر کرنے نِکلتے ہیں۔ میں بھی ایک دِن صبح ہی صبح ماڑھی دروازے سے ہوکر راوی کی طرف چل پڑا۔ دیکھا کہ بیرسٹر جلال الدین اکیلے چلے آرہے ہیں۔ پُوچھنے پر پتہ چلا کہ کچھ دِن تو علاّمہ سیر کے لئے آتے رہے۔ پھر ایک دِن تنگ آکر بولے ـــــ "یہ روز روز کا جھنجھٹ ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھار چلنا ہُوا تو ایک بات بھی ہے۔ ہر روز کون نِکلے۔"

لوگ اُن سے مِلنے آتے تو علاّمہ کو ایک مسرّت سی ہوتی۔ علاّمہ کو ہندوستان اور بیرونی ممالک سے خطوں کی ایک اچھی خاصی تعداد روزانہ وصول ہوتی۔ اُن کے جواب وہ خود لِکھتے۔ جو بھی بات پُوچھی گئی ہوتی اُس کا جواب دیتے۔ اِس میں اُنہیں اپنا کافی وقت دینا پڑتا تھا۔

ایک بار گیا تو ایک اخبار نویس تشریف فرما تھے۔ اُن سے سیاسی بات چیت چل رہی تھی۔ وہ گئے تو ایک ڈاکٹر آگئے۔ جن سے ایلوپیتھی پر باتیں ہونے لگیں۔ اُس کے بعد کوئی فوجی افسر آگئے۔ علاّمہ نے موضوع میدانِ جنگ کی ہیئت ناکیوں کی طرف موڑ دیا۔ تب ہی ایک پہلوان آگئے اور پہلوانی کے داؤ پیچوں پہ بات چھِڑ گئی۔ جس موضوع پر بھی وہ بولتے معلوم پڑتا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد بول رہے ہیں۔

میں نے سُنا تھا علامہ نے مشرقی اور مغربی ادب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے مذہب سے خصوصاً اُنہیں بڑی عقیدت ہے۔ اُس وقت بھی اُن کے سرہانے میز پر چھ سات کتابیں پڑی تھیں۔ تین چار تکیے کے ساتھ اور اتنی ہی تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ اُردو، انگریزی اور فارسی کا انہوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کسی اچھی کتاب کا ذکر ہوتا تو اپنے دوستوں سے مانگنے میں وہ رتّی بھر بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ انگریزی، فارسی اور عربی میں علاّمہ روانی سے نہ بول سکتے تھے۔ ذرا رُک رُک کر بات کرتے تھے۔ لیکن لِکھتے وقت اُن کی تحریر میں بلا کی قوّت ہوتی۔

وہ اکثر پنجابی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی ایسا شخص آجاتا جو پنجابی بہ آسانی نہ سمجھ سکتا تو وہ حسبِ ضرورت اُردو، انگریزی اور فارسی میں بھی بولتے۔ کسی بات کا جواب دے کر اکثر وہ چُپ ہوجاتے اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے رہتے۔ اور کچھ دیر کے بعد ایک طویل "ہوں" ہی اُن کی خاموشی کو توڑتی۔ اُس وقت اِس طرح محسوس ہوتا کہ علاّمہ زیرِ بحث موضوع کی گہرائیوں میں گُم ہوگئے تھے اور اب دوبارہ اُبھرے ہوں۔

اِسی بیچ میں نواب بھوپال نے اُنہیں علاج کے لئے بُلایا۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو اُن کے گلے کی حالت پہلے سے قدرے دُرست تھی۔ لیکن پھر بھی وہ دھیمے لہجے میں ہی بات چیت کرتے تھے۔

ایک بار پہنچا تو ڈاکٹر سعید اللہ بیٹھے تھے۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کا ذکر چل رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو یُونانی اور آیورویدک معالجوں پر بڑا اعتماد تھا۔

ایک بار اُنہیں دائیں گردے میں پتھری ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں نے ولایت جاکر آپریشن کرانے کا مشورہ دیا۔ لیکن دِلّی جاکر حکیم نابینہ صاحب کا علاج کروایا گیا تو آپریشن کی ضرورت ہی نہ پڑی اور پتھری اچھی ہوگئی۔

ایک اور واقعہ علاّمہ نے سُنایا :۔ ایک بار میں دہلی میں حکیم اجمل خاں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کو دو بجے کے قریب میری داڑھ میں سخت درد ہونے لگا اور بہت عذاب ہوا۔ میں نے حکیم صاحب کے نوکر کو جگایا اور اُسے حکیم صاحب کو جگانے کے لئے کہا۔ پہلے تو نوکر مانا نہیں۔ کیونکہ حکیم صاحب زنانے میں سو رہے تھے۔ لیکن جب درد بہت شدید ہوگیا اور میں نے اصرار کیا تو آخر کار بُلوایا گیا۔ حکیم صاحب نے آکر نوکر کو کچھ لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ لے آیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ جس داڑھ میں درد ہے اُسے اس پر رکھ کر اُوپر والی داڑھ سے دَبا دو۔ میں نے ویسا ہی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں درد کافور ہوگیا۔ میں نے حکیم صاحب سے پُوچھا کہ کیا چیز تھی۔ تو بولے ـــــ " نادر شاہ سے جواہرات کا ایک تھال لے کر ہمارے بزرگوں نے یہ چیز تو اُسے دے دی تھی۔ لیکن اس کی اصلیت نہیں بتائی تھی۔ بھلا میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں' یہ ادرک اور اُس پر پسا ہوا نمک تھا۔ "

حکیم صاحب کانگرس کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ اکثر اُن کی جھڑپیں علاّمہ کے ساتھ بھی ہوا کرتیں۔ کیونکہ یہ کانگرس کے مخالف تھے۔ لیکن دوستی میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ ۱۹۳۶ء میں اُن کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ایک بار جب میں پروفیسر حمید احمد کے ساتھ وہاں پہنچا تو علاّمہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ کالی عینک لگا رکھی تھی۔ اُنہوں نے تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے ہی ہمیں کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر سعید اللہ پہلے سے ہی وہاں تشریف فرما تھے۔ جب میں کُرسی پر بیٹھ گیا تو علاّمہ نے پُوچھا "کون صاحب ہیں؟" یہ سُن کر میرے دِل پر ایک دھکّا سا لگا۔ ڈاکٹر سعید اللہ نے نام بتائے۔ تھوڑی دیر میں مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر (مدیر "انقلاب" لاہور) بھی آگئے۔ اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اُس دِن پتہ چلا کہ علاّمہ کی بائیں آنکھ میں موتیا بند اُتر آیا تھا جس سے کچھ بھی دِکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اُس حادثے سے میری قوتِ فکر اور تیز

حافظہ دونوں بہت تیز ہو گئے ہیں۔ اب محض غور و فکر سے مجھے وہ نقاط سُوجھتے ہیں جو پہلے گہرے مطالعے پر بھی نہ سُوجھتے تھے۔ بہر حال لکھنا پڑھنا بالکل ختم ہے کیونکہ میری دائیں آنکھ شروع سے ہی بے کار تھی۔ لیکن اس سے پہلے کبھی مجھے اس کا احساس نہ ہوا تھا۔ "

علاّمہ کی دائیں آنکھ دو برس کی عمر میں ہی جونکوں سے خون نکلوانے کی وجہ سے بے کار ہوگئی تھی۔

" فی الحال مجھے کالی عینک لگانے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ آنکھ پر زیادہ زور نہ پڑے۔ دریافت کرنے پر مجھے پتہ چلا ہے کہ شیشے کی کالی رنگت اس میں جست اور سُرمے کی آمیزش کی وجہ سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے سُرمے میں بھی یہی اجزا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کالی عینک کا پہننا ویسا ہی اثر رکھتا ہے جیسا آنکھوں میں سُرمے کا استعمال ـــــ " علاّمہ نے کہا۔

وہاں بیٹھے ایک صاحب نے کہا ـــــ " دونوں کا اثر ایک جیسا کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ شیشہ تو آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اس لئے روشنی کی کرنیں اس میں سے چھن کر آتی ہیں۔ لیکن سُرمہ صرف پپوٹوں میں رہتا ہے۔"

علاّمہ نے کہا کہ نہیں، بار بار آنکھیں جھپکنے سے سُرمے کی ایک باریک جھلّی آنکھ پر تن جاتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو کالی عینک۔

تبھی ڈاکٹر سعید اللہ نے غالب اور بیدل کا ذِکر چھیڑ دیا۔ اُن کے فارسی کلام کے بارے میں گفت و شنید ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ صرف اتنا سمجھ آیا کہ غالب کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے پہلے بیدل کو سمجھنا ضروری ہے۔ موسیقی کی بات چلی تو اُنہوں نے کہا ـــ " اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے۔ مسلمان جہاں کہیں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اپنی انفرادی اسلامی راہ نہیں دکھائی دیتی۔ "

علاّمہ نے اپنے مصر کے دَورے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ـــ " مصر میں

مجھے پرانے بادشاہوں کے قدیم مقابر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اُن مقابر کے ساتھ مدفن بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جس میں قوت اور حیثیت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ بہت ساری مسجدوں کی بناوٹ سے بھی بڑا حسن جھلکتا ہے۔ بہت عرصہ ہوا، میں نے مسجد کوہ السلام کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر جو اثر اُس وقت میری طبیعت پر ہوا، وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی تاریکی پھیل رہی تھی اور مغرب کا وقت قریب تھا کہ مجھے اپنا یہ خیال ایک جسارت سے کم نہ معلوم ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار میرے دل پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دِل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں الحمرا کے ایوانوں میں بھی جا بجا گھوما اور ... کی ہر دیوار پر "ھو الغنیوں" لکھا ہوا نظر آیا۔ میں نے دِل ہی دِل میں کہا — "یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے، کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔"

۱۹۳۵ء کے آخر سے لے کر ۱۹۳۷ء کے آخر تک میں لاہور سے دُور رہا۔ اپنا جیون ہی ایک جنجال بن گیا تھا۔ اُسے سُلجھانے میں مصروف رہا۔ جہاں کچھ سیکھنے گیا، سیکھ نہ سکا۔ جہاں کچھ اچھے آثار نظر آئے وہاں صحت نے ساتھ نہ دیا۔ پریشان اور مضمحل دماغ لئے۔ جب میں فلم کی نوکری چھوڑ کر سرینگر واپس گیا تو راستے پر لاہور میں بھی کچھ دِن ٹھہر گیا۔ علامہ کا کلام پڑھے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ اور اُن کی یاد بھی ذہن پر ذرا دُھندلی پڑ چلی تھی۔ ایک شام کو سینما دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ سُورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ مغرب کی طرف بادلوں کی کچھ ٹولیاں قوسِ قزح کا سا منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ایمپرس روڈ سے ہو کر اُس چھوٹی سی سڑک پر چل رہا تھا جو ریلوے کے دفتروں کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف جاتی ہے۔ چوراہے سے "جاوید منزل" کی پلیٹ بالکل واضح نظر آ رہی تھی۔ تمام پُرانی یادیں اُبھر آئیں اور میں جیسے غیر ارادی طور پر ہی جاوید منزل پہنچ گیا۔ اپنی آمد کی اطلاع بھجوانے کے بعد میں اندر گیا۔ علامہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ لحاف تہہ کر کے پیروں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کُرتا اور تہمد پہنے ہوئے تھے اور حقّے کی نَے مُنہ میں تھی۔ سارا کمرہ پنجابی تمباکو سے مہک رہا تھا۔ علامہ نے نَے کو مُنہ سے نِکال کر کہا — "بیٹھو۔" خوش قسمتی سے آج وہ اکیلے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک محترمہ سروجنی نائڈو کے بارے میں بات چیت چلتی رہی — دو سال کے اس طویل عرصے کے کچھ اقتباسات بھی میں نے علامہ کو سُنائے۔ میسور کا ذکر آیا تو ننّدی ہلز پر واقعہ ٹیپو سلطان کے قلعے کا (جو اب شکستہ حالت میں ہے) ذکر بھی چھڑ گیا جس کی فلک بوس دیوار سے سلطان فرنگیوں کے جاسوسوں کو نیچے گرایا کرتے تھے۔

کہنے لگے — "سُلطان واقعی مادرِ وطن کا اپنی طرز کا ایک ہی سپوت تھا۔ میں بنگلور اور میسور کے جس مقام پر بھی گیا، لوگوں کی زبان پر بس ایک ہی نام تھا اور وہ تھا ٹیپو سُلطان کا۔ ہر اُس مقام پر، جہاں دو چار لوگوں کی محفل بھی ہوتی، کسی نہ کسی طرح شہید ٹیپو سُلطان کا ذکر ضرور چھڑ جاتا۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہر شخص کے ذہن میں محفوظ تھی۔ اگر کوئی سلطان کی فرنگیوں کے خلاف جنگ کے واقعات سُناتا تو ہر کوئی تعظیم سے سر جھکا کر سُنتا۔"

اُن دِنوں "مرقعِ چغتائی" نیا نیا مارکیٹ میں آیا تھا۔ ہر طرف اُس کا ذِکر تھا۔ اُن کے یہاں بھی ذکر چھڑ گیا۔ بات چیت کے دوران میں میں نے پُوچھا۔ "آرٹ اور ادب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

بولے — "میرے خیال میں مسلسل جدوجہد انسان کی سب سے بڑی Achievement ہے۔ کوئی چیز بھی جو انسان کو اس طرف مائل کرتی ہے، اچھی ہے اور کوئی بھی چیز جو ایسا نہ کرے بُری ہے۔ مذہب، آرٹ اور اخلاق سب کو اسی کسوٹی پر کسنا چاہیئے۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہُنر
گُہر ہے اُن کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

پھر بولے کہ کسی بھی قوم کی رُوحانی صحت کا انحصار اُس کے شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی قوتِ تخیل پر ہوتا ہے۔ زوال کی طرف جلتے ہوئے

آج

اگر فن کار کے فن میں اگر یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی موسیقی یا اپنے اشعار یا اپنی تصویر یا اپنے بُت سے لوگوں کو متاثر کر کے اُن کے دماغوں کو بیمار کر دے تو وہ فنی تخلیق اُس قوم کے لئے چنگیز خان کی فوجوں سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ علامہ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں رُوح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ان ہی کے الفاظ ہیں ——— "انسانی قوت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے مظاہر سے خلاف، مخالفت، اختیار کی جائے نہ کہ اُس کے عمل کے سامنے اپنے تئیں رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ موجود ہے اُس کی مخالفت اس لئے کہ جو موجود نہیں اُس کی تخلیق ہو۔ ایسا کرنا صحت و زندگی سے اُلفت ہے۔ اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ موت و زوال کی طرف لے جانے والا ہے۔"

بات دُور نکلتی جا رہی ہے۔ پھر حقہ گڑ گڑا کر علامہ نے کہا ——— فن کو مفید اور کارآمد بنانے کے لئے فن کار کا انتہائی خلوص نہایت ضروری ہے۔

علامہ ہی نے فرمایا ہے ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دِل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

علامہ اس نظریے کے قائل نہیں تھے کہ فن کو صرف فن کے لئے ہی اپنایا جائے۔ اُن دنوں اُردو ادب میں فن برائے فن و فن برائے زندگی۔ ادب برائے ادب و ادب برائے زندگی پر بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ وہ ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو زندگی کے اعلیٰ نصب العین اور اُونچے اصولوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔

؎ مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دِل نواز نہیں

میں نے اُن سے پُوچھا کہ فن کے زوال کی خاص وجوہات اُن کے خیال میں کیا ہیں؟ اُنہوں نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ فن کا زوال دراصل قوم کے زوال کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا ہوتا ہے اور اُس قوم کو دوسری قوموں سے بلند رکھنا ہوتا ہے اُس وقت تک فن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ لیکن قوم کے زوال کے ساتھ ساتھ فن کا زوال بھی شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ کسی قوم کے زوال کا پہلا نشان اُس قوم کے فنونِ لطیفہ کو زوال کی طرف لے جانے والی تخلیقات ہی ہوتی ہیں۔

میں نے پُوچھا: ایسی حالت میں کیا ادب ہی سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے؟

بولے۔ "ضروری نہیں، لیکن اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم زوال کی طرف جانے لگتی ہے تو ادیب کا دِل بھی دوسرے فن کاروں کی طرح بس میں نہیں رہتا۔ وہ مادّی زندگی، تلخ حقیقتوں، دلیلوں اور زندگی کے قدرتی نشو و نما سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ چھلکے سے، رُوپ رنگ سے، باہری دکھاوے اور سطحی حُسن سے اُس کی دِلچسپی بڑھ جاتی ہے اور یہیں سے فن کا زوال شروع ہوتا ہے۔

میں نے پُوچھا: کیا فن بھی بے جان اور بے اثر ہو سکتا ہے؟

بولے کہ ہو کیوں نہیں سکتا؟ زوال کی طرف جاتی ہوئی قوموں کا فن نہیں رہ جاتا۔ رئیسوں کی باندی بن کر اُن کے دِل لبھانے کا ایک ذریعہ بن کے رہ جاتا ہے۔ وہاں فن کا رَس نچوڑ کر نہیں چکھا جاتا بلکہ پھل کی شکل اور رنگ بتا دئے جاتے ہیں اور وہ قوم اُس پھل کے رنگ و رُوپ کو دیکھ کر ہی مسرور ہوتی رہتی ہے۔

میں نے پُوچھا: فن کی عظمت کس بات پر منحصر ہے؟ ظاہری حُسن پر یا فن کار کے تخیّل اور Genious پر؟

اُنہوں نے فرمایا: ظاہری حُسن بھی فن کار کے تخیّل ہی کا ایک پہلو ہے۔

میں نے آج کل کے طریقۂ تعلیم کی بات نکالی تو کہنے لگے۔ "ایسی تعلیم کوئی کارآمد اور مفید شئے نہیں جو انسان کو اخلاق کی قدروں سے بیگانہ بنا دے۔ لیکن اخلاقی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم باہمی میل جول اور آپسی لین دین بڑھائیں۔ ایک، دوسرے سے زیادہ سے زیادہ ملیں اور بھائی چارے سے کام لیں۔

میں نے دیکھا۔ علامہ کے بہت درد ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر کبھی سیدھے اور کبھی اُلٹے ہو کر لیٹ جاتے تھے۔ لیکن اُن کے چہرے پر شگفتگی اور متانت اُسی طرح تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کی اجازت مانگی، سو مل گئی۔ میرے باہر نکلتے نکلتے علامہ نے کہا۔ "وہاں پہنچ کر وہاں کی قومی تحریک کے بارے میں ضرور کچھ لکھنا۔"

"کوشش کروں گا۔" میں نے کہا تھا۔

بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک کشمیری نوجوان اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور حصولِ آزادی اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے بے شک مر مٹے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ..."

بولے۔ "اس کے بعد تم کیا کہو گے۔ میں جانتا ہوں۔ یہ باتیں کسی قوم کو بیدار ہونے سے نہیں روک سکتیں۔ کسی قوم کی آزادی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکا سکتیں۔ غربت، جہالت اور دوسری کمیوں کی آڑ لینا خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر لینا ہے۔ لیکن یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔" جب انہوں نے آخری الفاظ کہے تو میں باہر جا چکا تھا۔

آج سوچتا ہوں انہوں نے کتنی بڑی پیشین گوئی کی تھی۔ کشمیر کے نوجوان آج جاگ چکے ہیں اور اپنے آپ کو دوسروں کے برابر کھڑا کرنے کے لئے کوشاں ہیں، مگر اقبال ہمارے درمیان نہیں ہیں!

نہال رضوی

قطعات

(بسلسلہ جشنِ پیدائش خالدِ کشمیر)

بہارِ سالگرہ نغمہ بار آئی ہے
نگارِ باغ کے گیسو سنوار آئی ہے
مئے نشاط پلا دے بنام خالدِ ہند
بہار آئی ہے ساقی بہار آئی ہے

پینے پلانے جام مئے خوشگوار کا
یہ حوصلہ ہے آج ہر اک بادہ خوار کا
ساقی بنامِ جشنِ مسرت پلائے جا
موسم بہار کا ہے زمانہ بہار کا

مئے عشرت پلائے دیتی ہے
خود سے بے خود بنائے دیتی ہے
ہے امیرِ چمن کی سالگرہ
ہر کلی مسکرائے دیتی ہے

حفیظ بنارسی

ترانۂ ازل

ٹیگور کی شہرۂ آفاق نظم "گیتان جلی" کے تیسرے stanza کا منظوم اُردو ترجمہ

جانے کس طرح چھیڑتا ہے تو اپنے نغموں کا ساز مالک
سکون و حیرت کے ساتھ سنتا ہے جس کو تیرا ایاز مالک
ترے ترانوں کی روشنی سے جبینِ عالم دمک رہی ہے
ترے ترانوں کی مست بلبل فضائے کل میں چہک رہی ہے
ترے ترانوں کا پاک دریا عجیب قوت دکھا رہا ہے
ہر ایک پتھر کو راستے سے ہٹا کے بڑھتا ہی جا رہا ہے
ہے میرے دل کی بھی یہ تمنا کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو
مگر وہ مجبور کیا کرے جس کا سازِ ہستی ہی بے صدا ہو
میں بولنا چاہتا ہوں مالک مگر مرے بول بے سرے ہیں
میں ان کو نغموں میں کیسے ڈھالوں جو بول چیخیں لئے ہوئے ہیں
میں کھو گیا ہوں ترے ترانوں کی موجِ سرمست و بیکراں میں
بنا لیا ہے اسیر مجھ کو ترے ترانوں نے اس جہاں میں

آر، ایل مہتہ

جت مل منی

(باواجتو)

عرصہ پانچ سو سال کا ہو گذرا ہے جب جموں میں راجہ بھیم دیو کی حکومت تھی۔ بدقسمتی سے یہ راجہ اپنی زندگی کے عالمِ شباب میں وفات پاگیا اور پیچھے اُس کا پانچ سالہ بچہ اجب دیو اکیلا رہ گیا۔ اُس کے بعد بیر سنگھ، جو کہ راجہ مرحوم کا دُور سے رشتہ دار تھا، جموں کا حکمران بن بیٹھا۔

ان ہی دِنوں کا واقعہ ہے کہ صوبہ جموں کے ضلع ریاسی موضع گھار میں ایک غریب برہمن کے ہاں ایک لڑکا تولد ہوا۔ اُس کا نام جت مل رکھا گیا۔ اس بچے نے اپنے گاؤں میں ہی تربیت پائی۔ اُس گاؤں کے قدرتی مناظر، زرخیز اور لہلہاتے ہوئے کھیت، گھاس کے چھوٹے چھوٹے میدان، پھول دار کیاریاں دل کو فرحت بخشتے تھے۔ بزرگ لوگ بہت سمجھ دار اور قابلِ تقلید تھے۔ ان تمام چیزوں کا جت مل پر بہت اثر پڑا۔ اِردگرد کے لوگ اس کی شرافت اور سادگی سے بہت متاثر ہوئے اور اُس کی شہرت دُور دراز تک پہنچ گئی۔ اُسے لوگ جت مل منی کے نام سے پکارنے لگے۔ جلد ہی جت مل ایک خوبصورت اور عمل چال وچلن کا نوجوان بن گیا اور لوگوں میں بہت مقبول ہو گیا۔ اُس کی شادی ایک خوبصورت برہمن لڑکی مایا کے ساتھ ہوئی۔ یہ دونوں اپنے والدین کی بہت خدمت کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے آخری دم تک اپنے بزرگوں کی سیوا کی اور جب جت مل کے والدین وفات پائے تو وہ اس دُنیا میں اپنے آپ کو مظلوم خیال کرنے لگا۔ ہمیشہ تنہائی پسند اور مایوس رہنے لگا۔ اور دُنیاوی کاروبار سے متنفر ہو گیا۔ وہ دُرگا ماتا کی پُوجا کیا کرتا اور ایک دن ماتا نے اُسے خواب میں پُوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ جت مل نے جواب دیا کہ وہ تونگی اور حوصلہ چاہتا ہے جس سے کہ وہ بھگوتی کی رات دِن پرستش کرتا رہے۔ دُرگا ماتا نے جواب دیا کہ اس کے ہاں لڑکی تولد ہوگی اور جت مل اور اُس کی لڑکی دُنیا میں نام پائیں گے۔ اور آیندہ کی نسلیں ان کو یاد رکھیں گی۔ جب جت مل کے ہاں ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ لیکن جلد ہی اُس کی بیوی انتقال کر گئی۔ وقت گذرتا گیا۔ ایک دِن ایسا ہوا کہ اُس کی لڑکی جس کا نام کاورسی تھا اور جو اب بڑی ہو چکی تھی، سخت بیمار ہو گئی۔ اُس کی بیماری بہت تشویشناک بن گئی۔ مقامی حکیم اور وید اُسے صحت یاب نہ کر سکے۔ اس لئے وہ اپنی لڑکی کو وہاں سے لے گیا اور کاہنا چک میں، جہاں آج مل بھری کا مقام ہے، کے موضع جنج دلی میں اپنے دوست رُلو کے ہاں چلا گیا اور ساتھ ہی اپنا پالتو کُتا لے گیا۔ اُس نے اپنے دوست رُلو کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ زراعت کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے۔ اُس نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اُس کے لئے کاشت کے لئے کوئی اچھا سا زمین کا ٹکڑا تلاش کرے جس پر وہ مالکِ زمین کو اپنی زرعی پیداوار کا نصف حصہ دے دیا کرے گا۔ رُلو جت مل کو بیر سنگھ کے پاس لے گیا۔ بیر سنگھ ان دِنوں آمبا گڑھ گاؤں، واقع رام گڑھ میں زمین کا مالک تھا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ وہ اپنی پیداوار کا صرف ایک چوتھائی حصہ بیر سنگھ کو دے دیا کرے جت مل نے جب یہ دیکھا کہ زمین بالکل غیر آباد، پتھریلی اور سانپوں سے بھری ہوئی ہے تو اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ بیر سنگھ نے صرف ایک چوتھائی لگان کیوں مان لیا تھا۔ اُس نے ہمت نہ ہاری اور بڑی محنت سے کاشت کرتا رہا اور ہمیشہ دُرگا بھگوتی کو یاد کیا کرتا۔ اب وہ لوگوں میں اپنے آپ کو منی کے نام سے نہ پکارنے دیتا۔ اس لئے لوگوں نے اُسے باوا جتو کہنا شروع کر دیا۔

ایک وقت آیا جب اسے اپنی محنت کا پھل حاصل ہونے لگا۔ پہلے ہی موسم میں فصل کثرت سے ہوئی۔ جتو کا نام ہر فردِ بشر کی زبان پر تھا اور سب حیران ہونے لگے کہ اتنی عمدہ اور زیادہ فصل اس زمین سے آج تک کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ لوگ اُسے بہت عزت سے دیکھنے لگے۔ جب بیر سنگھ نے یہ سب کچھ سُنا اور دیکھا کہ اس کی زمین میں جتو نے اپنی محنت و مشقت سے فصل کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنے فیصلہ شدہ ٹھیکہ کی شرائط کے خلاف بیر سنگھ نے جتو سے نصف فصل لینے کا مطالبہ کیا۔ باوا نے کہا کہ وہ غلّہ کے ایک چوتھائی حصہ سے ایک دانہ بھی زیادہ نہ دے گا۔ اس پر بیر سنگھ بگڑنا شروع ہو گیا اور بہت رُعب سے باتیں کرنے لگا۔ بیر سنگھ چونکہ ایک جاگیردار تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ وہاں سے آدھا غلہ زبردستی گھر لے آئیں۔ خود وہ اپنے گھر واپس چلا گیا۔

گاوری نے اپنے باپ کو کہا کہ وہ راجہ کو نصف غلہ دے دے تاکہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ لیکن وہ اصول کا آدمی تھا۔ اُس نے اپنی لڑکی کی بات نہ مانی اور کہا کہ "میں روپیہ جمع کر کے امیر نہیں بننا چاہتا ہوں۔ لیکن میں یہ بے انصافی اپنے اُوپر اور اپنے ساتھی کاشت کاروں پر ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے اپنے حقوق کو ہر قیمت پر بچانا ہے۔"

سپاہی اُس وقت غلہ لوٹنے میں مشغول تھے۔ باوا جتو نے اُنہیں زور سے کہا کہ وہ اپنی شرارت کو بند کر دیں۔ لیکن اُنہوں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ اس پر جتو لپک کر غلہ کے ڈھیر پر جا بیٹھا اور اُس کی اس طرح سے حفاظت کرنے لگا کہ گویا کوئی سانپ اپنے خزانے کی نگرانی کر رہا ہے۔ لیکن سپاہی اپنا کام کرتے گئے۔ اس نے اپنے دِل میں بھگوتی کو یاد کیا۔ اس کے دِل میں ایک آواز آئی کہ اُسے اپنی جان کو بیر سنگھ کی بربریت کی خاطر قربان کر دینا چاہیئے اور اُس کی لڑکی گاوری اس کا بدلہ لے گی۔ اس پر وہ فصل کے ڈھیر پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا کہ "اگر مجھے میرے حق سے محروم کرو گے تو میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔" راجہ کے آدمی سمجھنے لگے کہ جتو دھمکی دے رہا ہے۔ اس لئے وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور پھر زبردستی غلہ اُٹھانے لگے۔ اس پر جتو نے اپنے سینے میں خنجر گھونپ دیا اور سسکتا سسکتا زمین پر لیٹ گیا۔

سپاہی ہراساں ہو گئے۔ ان پر خوف طاری ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلے۔ وہ راجہ کے پاس پہنچے اور اُسے تمام ماجرا کہہ سُنایا۔ بیر سنگھ خود وہاں آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ غلہ کا ڈھیر خون سے لت پت ہے۔ یہ جتو کا خون تھا۔ جتو اُس دن امر ہو گیا اور اُس نے انسانی تاریخ میں غیر فانی درجہ حاصل کر لیا۔ باوا جتو کی لاش کو شرارتی بیر سنگھ نے دریا کے کنارے پر پھینکوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد آسمان ابر آلود ہو گیا اور بجلی کی کڑک سُنائی دی۔ جتو کی غیر قدرتی موت کے بعد اس کڑک نے ہر فردِ بشر کے دِل میں ایک ڈر سا طاری کر دیا۔ تمام لوگ پریشان اور خوف زدہ ہو گئے۔ گاوری نے اپنے باپ کی لاش کو ہندو رسُوم سے جلا دیا اور باپ کی چِتا میں خود چھلانگ لگا کر ستی ہو گئی۔ اس طرح سے ایک اور قیمتی جان اس جہاں سے رُخصت ہو گئی۔

بیر سنگھ اور اس کے خاندان کا ہر فرد ایک مہلک بیماری کا یکے بعد دیگرے شکار ہو گیا اور لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ دُرگا بھگوتی کا خراب تھا۔ بعد میں راجہ اجب دیو نے ایک مندر جھڑی میں باوا جتو کی یاد میں تعمیر کروایا۔ یہ مندر اب بھی شہید جتو کی یاد میں اپنی قدیمی شان سے کھڑا ہے۔

ہر سال نومبر کے مہینے میں جھڑی میں ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہ میلہ تین دن تک رہتا ہے۔ جموں پرانت کے ہزاروں اشخاص اس میلے کو دیکھنے کے لئے دُور دراز کے پہاڑی علاقوں سے وہاں آتے ہیں اور رات بھی وہاں کاٹتے ہیں اور اس طرح سے اپنے قدیمی محبوب کو شردھانجلی ادا کرتے ہیں۔

باوا جتو ڈوگرہ علاقے کا سب سے پہلا زرعی انقلاب کا لیڈر تصوّر کیا جاتا ہے جس نے کہ مالکانِ زمین کی چیرہ دستیوں کے خلاف لڑ کر اپنی جان دے دی۔ ریاست جموں و کشمیر کا دَورِ حاضر کے زرعی انقلاب کی بُنیاد اس برہمن نے ۵۳۰ برس پہلے رکھی تھی۔ آج اس کے عملی کارنامے ہماری قومی زندگی میں روزِ روشن کی طرح چمک رہے ہیں۔

جھڑی کا گاؤں جموں سے کوئی سترہ میل کی دُوری پر جموں اکھنور سڑک سے اندر کی طرف جنوب مغرب میں واقع ہے اور ڈوگرہ لوگوں کا ایک مقدّس مقام مانا جاتا ہے۔

حت مل جی

(مضمون اسی شمارے میں



باوا کے میلے پر لوک گایک اپنی دھن چھیڑتے ہیں -

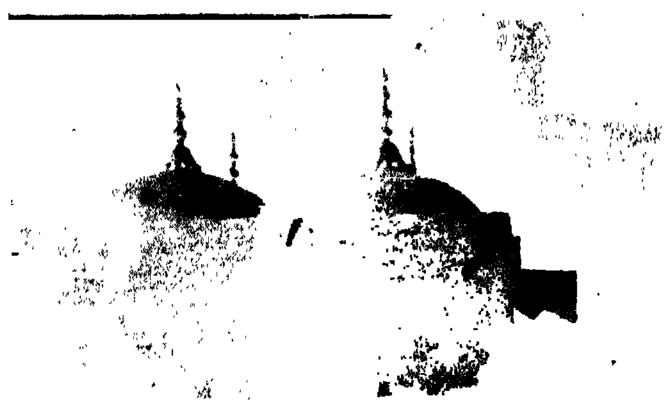


بخشی صاحب جب باوا جتو کے میلے پر گئے تو اُنھوں نے پانی کی آسانیوں کے بارے میں موقع پر احکامات صادر کئے -

جت مل جی باواجتو
(مضمون اسی شمارے میں)



دالسی مھلی د چارہ لے-



ہفت رنگ

بے خودی کی نقاب اُٹھانے دے   زندگی سے نظر ملانے دے
میں بہت پی چکا ہوں اے ساقی   اب ذرا ہوش میں بھی آنے دے

۲

یہ غلط ہے کہ راہِ ہستی میں   مے کدے کا کوئی مقام نہیں
مے کدہ خاص مرحلہ ہے مگر   مے کدہ منزلِ مقام نہیں

۳

کیا شرابی ہے وہ شرابی بھی   خاک وہ لطفِ جام لیتا ہے
چند لمحوں کی بے خودی کے لئے   جو خودی اپنی بیچ دیتا ہے

۴

غم فزا بھی ہے باعثِ غم بھی   صرف درمانِ غم نہیں ہے شراب
راس آئے تو آبِ حیواں ہے   زہر ہے ورنہ کم نہیں ہے شراب

۵

جسے اربابِ عیش پیتے ہیں   وہ مے زر خرید ہوتی ہے
ہم سے افسردہ دل جو پیتے ہیں   آنسوؤں سے کشید ہوتی ہے

۶

جام و مینا کا آسرا لے کر   کشتگانِ حیات جیتے ہیں
مے کشی خوش دلوں کا کام نہیں   مبتلائے عذاب پیتے ہیں

۷

حسن کا عنوان ہے نشاطِ الم   وہ فسانہ ہے میری مے نوشی
اپنے غم کی ہنسی اُڑانے کا   اک بہانہ ہے میری مے نوشی

ہنس راج رہبر

کمسن ہاتھ

شادی کا گھر تھا۔ خوش لباس اور خوش دل بچے خوش گلو اور خوش نوا پرندوں کی طرح چہکتے پھدکتے جہاں تہاں گھوم رہے تھے۔ بچے ہر گھر کی رونق ہوتے ہیں اور یہاں تو ماموں، چچا، چچی، پھوپھی اور ماسی جانے کس کس کے بچوں کے روپ میں کتنے گھروں کی رونقیں آ جمع ہوئی تھیں۔ دھرتی ان کے ننھے ننھے قدموں کے نیچے جگ مگ جگ مگ کر رہی معلوم ہوتی تھی۔ اور فضا قہقہوں سے معمور تھی۔ ایسی چہچہاہٹ دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ انہیں اگر کسی ادیب یا شاعر نے [illegible] کہا ہے تو بجا کہا ہے۔

ان قہقہوں اور [illegible] کے درمیان عورتیں اور مرد اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ بارات کو دو بجے وداع ہونا تھا۔ چنانچہ اجتماعی کوشش اور محنت سے اس ڈرامے کو اس وقت تک خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ عروج تک پہنچایا تھا۔ ڈرامے کے مختلف پہلو تھے۔ اس میں غم اور خوشی کا عجیب امتزاج ہوا تھا۔ ماں باپ کے دل یہ سوچ کر بیٹھے جا رہے تھے کہ ان کی پیاری بچی ۔۔۔ دل کا ایک ٹکڑا ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گا۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی باعثِ تسکین تھا کہ وہ اپنے ایک بنیادی فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔

یہ معصوم دھام اور گہما گہمی اس فرض شناسی کا نتیجہ تھی اور بچے اس معصوم ہنگامے کو دوبالا کر رہے تھے۔ شاید اس لئے وہ جہاں چاہے گھوم پھر سکتے تھے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تک کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہیں تھی۔ لیکن دلہن کی [illegible] کی طرف سے ایک نوجوان آکر کچھ جاری [illegible] جس کا [illegible] انہیں [illegible] گھر کے آنگن سے نکال باہر کر دیا گیا۔ [illegible]

دروازوں پر دو مضبوط آدمی تعینات ہو گئے جو انہیں اندر گھسنے سے منع کر رہے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ آنگن میں جہیز کا سامان سجایا گیا تھا۔ طِلا لگی ہوئی خوبصورت ساڑھیاں، جمپر، شلواریں، قمیضیں اور دوپٹے، تصویریں اور گڑیاں وغیرہ طرح طرح کے تحفے تحائف سے گھر ایک اچھی خاصی نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ بچوں کو تو ہر نئی چیز کی جستجو رہتی ہے۔ وہ اسے نہایت ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ اس کے حسن، نفاست اور خوش نمائی کی نہ صرف داد دیتے ہیں بلکہ اسے اپنی روح تک میں بھر لینے کا جتن کرتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ستارے ان کی دسترس سے باہر ہیں ورنہ وہ انہیں بھی چن چن کر کنچوں اور سنگریزوں کی طرح جیبوں میں بھر لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ کل جب گلی میں ہری، نیلی، پیلی اور سرخ رنگ کی جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ وہ کس قدر خوش تھے، اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے چاروں طرف گھوم رہے تھے اور انہیں اچک لینے کے لئے بےتاب ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جہیز کا یہ سامان دیکھ کر وہ خوشی کے مارے جھوم جھوم جاتے، ہر ہر طرح ہنرمندی اور کاریگری کی داد دیتے لیکن جانے کیا سوچ کر بدانش مندوں نے ان پر نمائش کے دروازے ہی بند کر دیئے!

"جاؤ جاؤ۔۔۔ ادھر کہاں آ رہے ہو اور رسمیں تیار ہو رہی ہیں۔" دروازوں پر تعینات دربان انہیں ہٹا دیتے۔

واقعی ساتھ والے کمرے میں کچھ رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ سوندھی سوندھی اشتہا انگیز [illegible] ہوا میں بسی ہوئی تھی جسے بچے چپکے چپکے اس طرف کے

رہتا۔ گھر کے تمام پنڈت مرلی دھر بہت مضبوط جسم اور اونچے ڈیل ڈول کے شخص تھے۔ ان کی عمر ساٹھ باسٹھ کے قریب ہو گی۔ آج تک جانے کتنی بارات کو کھلا چکے تھے۔ بارات کس قسم کی ہے، کیا پسند کرتے ہیں، سبزی، چینی، نمک، مرچ اور مصالحہ کس مقدار میں ملایا جائے — ان سب باتوں کا انہیں اس قدر تجربہ حاصل تھا کہ آج تک شکایت کا ایک بھی موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہی نہیں، کام کرنے کرانے میں بھی ہوشیار اور مشتاق تھے۔ دنیا بھر کے لطیفے، چٹکلے، حکایتیں اور محاورے انہیں زبانی یاد تھے جیسے چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا ہوں اور وقتاً فوقتاً حسبِ موقع وہ ایسا استعمال کرتے تھے کہ سننے والے لوٹن کبوتر بن بھی جاتے تھے۔ اسی لئے ان کے ساتھ کام کرنے والے ہمیشہ خوش رہتے تھے، کبھی اوبتے اور اکتاتے نہیں تھے۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے قصے سناتے سناتے جھٹ لیڈروں اور حکمرانوں کی کہانیاں شروع کر دیتے۔ ابھی مغلوں اور پٹھانوں کی بات چل رہی تھی کہ دوسرے ہی لمحہ کوروؤں اور پانڈوؤں کی داستان لے بیٹھتے۔ پھر بیان میں وہ شگفتگی اور تازگی جیسے ہر بات کا قول سنی اور ہر واقعہ آنکھوں دیکھا ہو۔ جیسے ہر زمانے کا تجربہ ان کے خون میں رواں دواں ہو اور ہر دور کی سمجھ ان کے شعور کا حصہ بن چکی ہو۔ پھر طاقت اتنی کہ دو دو من کی کڑاہی اکیلے ہی مگدر کی طرح اوپر اٹھاتے اور نہایت اطمینان سے جہاں چاہتے، رکھ دیتے۔ دل کی دھڑکن اور سانس متوازن رہتی۔ ذرا بھی تو فرق نہ آتا۔

اس وقت کام کا سب سے زیادہ بار انہیں پر تھا۔ کیونکہ باراتیوں کو ہر حالت میں بارہ بجے تک کھانے سے نپٹا دینا ضروری تھا۔ بابر نے جس طرح مراحی اور پیالہ توڑ کر اپنی ہارتی ہوئی فوج کو کٹ مرنے پر آمادہ کیا تھا، پنڈت مرلی دھر نے اپنے سب کارکنوں اور معاونوں کو مخاطب کر کے کہا — "دوستو، ساتھیو! میں نے آج تک کھانا کبھی ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہونے دیا۔ اب میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ سمجھ لو کہ ہمیں کھانا ٹھیک بارہ بجے تیار کر دینا ہے۔"

سب لوگ مستعدی اور تن دہی سے کام میں مصروف تھے۔ لیکن کام اتنا زیادہ تھا کہ گھبراہٹ اور پریشانی کے مارے رہ رہ کر ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

"پنڈت جی، آلو تو ابھی ایک بھی نہیں چھلا، پرانٹ کی پرانٹ یوں ہی پڑی ہے۔" مہر چند نے گوبھی تراشتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

"چنتا چھوڑو۔ چنتا تن کا روگ ہے۔ ہاتھ میں جو کام ہے پہلے اسے ختم کرو۔ اس کے بعد دوسرا شروع کر دو۔ یوں آہستہ آہستہ سب نپٹ جائے گا۔ چنتا کرنے سے تو ہاتھ کا کام بھی بھاری پڑ جاتا ہے۔"

کڑھائی میں پیٹھی بھرتے ہوئے انہوں نے اطمینان سے کہا اور پھر مہر چند کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے یہ پھر دہرایا:

"کارج دھیرے ہوت ہیں، کاہے ہوت ادھیر۔"

اسی وقت بچوں کی ٹولی نے ہلا بولا۔ وہ چیختے چلاتے اندر آئے اور ہر چیز کا جائزہ لینے لگے۔

"بھاگو بھاگو، نکلو یہاں سے۔" تیلو رام حلوائی کڑاہی میں چھلنی چلاتے ہوئے بولا۔

"نا نا، اس طرح مت جھڑکو۔ بچے بھگوان کا روپ ہیں۔" پنڈت مرلی دھر نے ملائمت سے کہا۔

"ہیں تو بھگوان کا روپ لیکن بندر۔" مہر چند نے بات آگے بڑھائی اور قدرے چڑ کر بولا — "اگر جامونت کی یہ سینا یوں ہی آ دھمکتی رہے گی تو ہم کام کیسے کریں گے؟"

"معلوم ہے کہ جامونت کی اس سینا نے لنکا فتح کی تھی۔"

مرلی دھر مسکراتے، بچوں کو دیکھ کر وہ یوں بھی مسکرایا کرتے تھے لیکن اس مسکراہٹ کا سبب یہ تھا کہ لنکا کی فتح سے ان کے ذہن میں ایک نئے خیال کا جنم ہوا تھا۔

وہ ہاتھ کا کام چھوڑ کر اٹھے اور جامونت کی اس سینا کو بھگانے کے بجائے پچکارتے ہوئے بولے:

"بچو! ادھر آؤ۔"

سب بچے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ شاید وہ سمجھے کہ کچھ کھانا دیں گے

کھانے کو [illegible] گے۔

"بتاؤ۔" پنڈت جی نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انگلی ہلاتے ہوئے آنکھیں چمکا کر پوچھا۔ "تم میں سب سے زیادہ ہوشیار کون ہے؟"

"میں ہوں!"

"میں ہوں!"

ہر بچے نے آگے بڑھ بڑھ کر اور سینے پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہنا شروع کیا۔ "شاباش! ادھر آؤ۔ میں ابھی امتحان لیتا ہوں۔"

اور وہ انہیں ساتھ لے کر آلوؤں کی پرات کے گرد جا بیٹھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ اچھا اچھا۔ راکیش بھیا ذرا ادھر ہٹو اور اسے بھی بیٹھنے دو۔"

سب بیٹھ گئے تو پنڈت جی نے ایک آلو اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے نا آلو کیسے چھیلے جاتے ہیں؟"

"ہاں ہاں معلوم ہے۔"

ایک وقت بہت سی آوازیں بلند ہوئیں اور ننھے ننھے ہاتھ پرات کی طرف بڑھے۔

دوسرے ہی لمحے سب بچے آلو چھیلنے میں مصروف تھے اور خوش تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ایک لڑکی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر پنڈت جی نے پوچھا۔

"پدم!"

"پدم بہت اچھا نام ہے۔ کس نے رکھا تھا؟"

"پتا جی نے"

"ماتا جی نے نہیں؟"

"ماتا جی نے بھی۔"

وہ قدرے جھینپ گئی لیکن باقی لڑکے ہنسنے لگے

"وہ لڑکی تمہاری بہن ہے؟"

"ہاں، میری چھوٹی بہن!"

"نام کیا ہے؟"

"چمپا!"

"اوہو۔ تبھی ہاتھ تیز تیز چل رہے ہیں۔" پنڈت جی کچھ اس انداز سے سر ہلا رہے تھے جیسے بندریا کا کھیل دکھا رہے ہوں۔

"پڑھتی ہو؟"

"ہاں، چوتھی میں!"

"اور تمہارا بیٹا؟"

"چھٹی میں!"

"دیکھا، تم سے دو سال آگے ہوا۔"

"وہ ہم سے بڑا بھی تو ہے۔"

"ہاں بڑا تو ہے۔" پنڈت جی نے سر ہلا کر تسلیم کیا اور آگے کہا۔ "یہ بتاؤ آلو تم زیادہ چھیلو گی یا وہ؟"

"وہ۔" چمپا شرمائی

"رس گلّے تم زیادہ کھاؤ گی یا وہ؟"

اس سے پیشتر کہ لڑکی کچھ جواب دے سب لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ یہ باتیں اور قہقہے سبھی کے لئے تفریح کا سامان مہیا کر رہے تھے اور رسوئی گھر کا کام اطمینان سے ہو رہا تھا۔

پرات میں اب آلو پانچ سات ہی رہ گئے تھے۔ انہیں ہر بچہ سب سے پہلے جھپٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ اپنے چھیلے ہوئے آلوؤں کی گنتی دوسروں سے زیادہ بتا سکے۔

پنڈت مرلی دھر اٹھے اور آنکھوں میں شوخی بھر کر مسکراتے ہوئے بولے "لو مہر چند، تم آلوؤں کی بہت چنتا کر رہے تھے۔ اب کہو لنکا فتح ہوئی یا نہیں؟"

سب بچے قہقہہ مار کر ہنسے۔ کام ختم ہو چکا تھا اور وہ اتنے خوش تھے کہ رس گلّے یا کچوری کا انہیں خیال ہی بھول گیا تھا۔

باواکرشن گوپال مغموم

ٹیگور

(رُباعیات)

(۱)

کندہ ہے نگینِ دل پہ نامِ ٹیگور -- اللہ رے! تاثیرِ کلامِ ٹیگور
تا زیست رہے مستِ شرابِ صد رنگ -- مِل جائے جسے بادۂ جامِ ٹیگور

(۲)

یہ فکر ہے یا بادِ بہاری، اے دوست -- جو سطر ہے، پھولوں کی ہے کیاری آے دوست
کلیوں کی لطافت کا مزہ دیتی ہے -- ٹیگور کی یہ نثر نگاری، اے دوست!

(۳)

منجملۂ صاحب نظراں تھا ٹیگور -- تصویرِ جمالِ کہکشاں تھا ٹیگور
وُسعت بھی تھی جس میں، جس میں گہرائی بھی -- افکار کا وہ بحرِ رواں تھا ٹیگور

(۴)

وہ چاند ستاروں کا فدائی ٹیگور -- قدرت کے نظاروں کا فدائی ٹیگور
ہوگا کسی شاداب چمن میں اب بھی -- گُل پوشش بہاروں کا فدائی ٹیگور

(۵)

اِک فلسفیٔ عہدِ رواں تھا ٹیگور -- اِک ساکنِ عشرت گہہِ جاں تھا ٹیگور
یزداں کی فضیلت تو نُمایاں ہی تھی -- انسان کا بھی مرتبہ داں تھا ٹیگور

(۶)

مُطرب نہیں، مُطرب کی نوا باقی ہے -- وہ دانشِ اندوہ رُبا باقی ہے
کہتا ہے وطن کا ذرّہ ذرّہ مغموم -- ٹیگور نہیں، اُس کی صدا باقی ہے

اجنبی سمندر اور لڑکی

رات کافی بھیگ چکی تھی!

بوڑھے پادری البرٹ نے اجنبی کو چاند کی زرد روشنی میں اپنے مکان کے سامنے باغ میں ٹہلتے دیکھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک پُرسکون جھیل میں پتھر ڈال دیا ہو۔ اُس نے فوراً کمرے کی کھڑکی بند کی۔ وہ جانتا تھا اجنبی اپنے آپ سے کچھ بڑبڑا رہا ہوگا۔ مگر کیا؟ البرٹ نے یہ جاننے کی کئی بار کوشش کی تھی مگر جان نہ سکا تھا ——— !

کرسچین کالونی سمندر کے مشرقی کنارے پر واقع تھی اور وہ کالونی کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے نوکر کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کی عمر ۴۰ سال کے قریب تھی۔ اُس کی موٹی گہری آنکھیں اس قدر سرخ تھیں کہ ہمیشہ یہ گمان ہوتا کہ اس کے جسم کا سارا خون آنکھوں میں سمٹ کر آ گیا ہو! وہ کیا کرتا تھا، کہاں سے آیا تھا، کالونی میں کوئی بھی نہ جانتا تھا — یہاں میں کسی نے اُس سے اپنے مکان سے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب سے وہ کرسچین کالونی میں رہنے کے لئے آیا تھا۔ پادری البرٹ اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ یہ راز جاننے کے لئے پادری نے اُس کے نوکر کے ساتھ بات چیت کرنے کی بھی کوشش کی۔ مگر اُسے زندگی کا ایک بہت بڑا صدمہ ہوا۔ اجنبی کا نوکر بہرا بھی تھا اور گونگا بھی ——— ! چند ہی دنوں کے اندر اندر کالونی کے سارے لوگ اجنبی سے ڈرنے لگے۔ ایک خاموش خوف سا، جیسا چھپا خوف تھا جو سارے کالونی پر چھا گیا تھا۔ اجنبی ان سب چیزوں سے بے خبر، بالکونی کے اوپر سے بے حس اپنے چھوٹے سے مکان میں ہمیشہ کچھ سوچتا رہتا۔

بوڑھے پادری البرٹ نے سونے سے پہلے اپنے من ہی من میں فیصلہ کر لیا چاہے کچھ بھی ہو، کل سویرے میں اس اجنبی سے ملوں گا۔ اُس سے باتیں کروں گا، اُس کا حال جاننے کی کوشش کروں گا۔ یہ سوچ کر وہ میٹھی گہری نیند سو گیا۔

صبح سویرے پادری البرٹ جلدی سے تیار ہو کر اجنبی کے ہاں چلا گیا۔ اندر جانے سے پہلے اُس نے چند لمحے سوچا کہ شاید اجنبی بُرا محسوس کرے۔ شاید وہ تنہائی پسند ہو۔ مگر اُسے اپنا رات کا فیصلہ یاد آیا اور اُس نے اندر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ وقت اُس نے جان بوجھ کر منتخب کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اجنبی کا گونگا اور بہرا نوکر اس وقت گھر میں نہیں ہوگا۔

چند لمحوں کے بعد ایک موٹی سی کھردری آواز آئی:

"کون ہے؟"

"میں ہوں آپ کا ہمسایہ پادری البرٹ ——— ذرا دروازہ کھول دیجئے۔"

شاید اجنبی نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اسی لئے دروازہ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی۔

دروازہ کھلا، دونوں کی آنکھیں مل گئیں۔ پادری کی آنکھوں میں پیار تھا — اجنبی کی آنکھوں میں نفرت تھی ——— پادری البرٹ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اُسے محسوس ہوا کہ اجنبی اُس سے دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔

"میرا آنا آپ کو گراں تو نہیں گذرا ہے" پادری نے کہا

"اوہ — " اجنبی نے فوراً جواب دیا "بالکل نہیں، تشریف لائیے نا۔"

پادری اندر آیا۔ کمرے میں ایک تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ دونوں شاید ایک دوسرے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ آخر پادری ہی بولا تھا —

"کل اتوار ہے! آپ چرچ چلیں گے نا؟"

"میں کرسچین نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو کرسچین بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ ..."

بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کی کسی سے جان پہچان ہے نہ کچھ اور ـــــ اس چھوٹی سی کالونی میں ہم سب پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ اتوار کو کالونی کے تقریباً سب ہی لوگ چرچ آتے ہیں۔ اگر آپ بھی آسکیں تو ... !"

وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا رہا، پھر بولا۔ "میں ضرور آنے کی کوشش کروں گا ـــــ ویسے یہ مندر، یہ مسجد، یہ گرجے مجھ جیسے آدمی کے لئے نہیں ـــــ !" پھر وہ اچانک بات بدل کر بولا۔

"معاف کیجئے، میں آپ کو چائے کی پیالی بھی پیش نہیں کرسکتا۔ میرا نوکر شاید باہر گیا ہوا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ـــــ کل ضرور آنا۔" یہ کہہ کر پادری چلا گیا۔

دوسرے دن دیر تک پادری اجنبی کا چرچ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ کل کی مختصر سی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسی ملاقات تھی کہ اس نے اجنبی کا نام تک بھی نہ پوچھا تھا ـــــ !

ایک ایک کر کے سارے لوگ چلے بھی گئے مگر پادری البرٹ کو اجنبی کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہ بھی واپس چلا گیا۔ اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا کہ اجنبی ایسے آدمی کو منہ لگانا ہی اچھا نہیں۔

چند ہفتے سکون سے گزر گئے۔

پھر ایک دن اچانک ساری کالونی میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ پولیس اجنبی کو تلاش کر رہی ہے۔ پادری البرٹ گھبرا سا گیا۔ کہیں اس آدمی نے خون تو نہیں کیا ہے، کہیں کوئی چوری تو نہیں کی ہے۔ اسی لئے شاید یہ یہاں چھپا رہتا ہے۔ یہ ضرور قانون سے بھاگا ہوا کوئی مجرم ہوگا۔ مگر پادری کے سارے شکوک ختم ہو گئے جب پولیس انسپکٹر شنکر ناتھ سے اس کی ملاقات ہوئی۔

"جی ہاں!" پولیس انسپکٹر بولا۔ "میں اسی آدمی کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ خاموشی کی زندگی بسر کر رہا ہے ـــــ یہ قاتل ـــــ"

"قاتل!" پادری البرٹ آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ اٹھا۔ "یہ قاتل ہے اور آپ نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ قتل کی سزا موت ہے، آپ کو معلوم ہے نا؟"

"جی ہاں!" شنکر ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "یہ آدمی چودہ [۱۴] سال کی جیل کاٹ کر یہاں آیا ہے جناب۔ یہ قتل کی سزا بھگت کر اب گم نامی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر اس نے قتل کیوں کیا؟"

"قتل کیوں کیا؟ اس کا جواب صرف وہی دے سکتا ہے۔ البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صرف پچیس سال کا جوان تھا جب اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔"

"بیوی کو قتل کیا تھا!"

"جی ہاں! کہتے ہیں کہ اس کی بیوی بہت ہی خوبصورت تھی۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ایک رات اس نے اپنی بیوی کا خون کر دیا۔ وجہ بتانے سے اس نے انکار کیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود ہی پولیس کو اطلاع دی۔ چودہ سال کی سزا کاٹ کر اب رہا ہو کر آیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب یہ ایک اچھے شہری کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔ آج اس کی فائل میں یہ سب کچھ نوٹ کر لوں گا۔"

شنکر ناتھ تو اجنبی کی کہانی سنا کر چلا گیا۔ مگر اس رات بوڑھا پادری البرٹ سو نہ سکا۔ رات بھر وہ اجنبی کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر اس نے بیوی کو کیوں مارا اور اب لوگوں سے دور کیوں بھاگتا ہے؟

اتوار کو پادری کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اجنبی کو چرچ سے ملنے ہی جائے مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے دل کا ساتھ نہ دے سکا ـــــ چرچ پہنچ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اجنبی کو چرچ کے بالکل سامنے ایک کونے میں سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ لوگ اجنبی کے بارے میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میری کہہ رہی تھی ـــــ "قاتل ہے، خوبصورت بیوی کو قتل کیا تھا نا۔"

"پتہ نہیں آج کیسے یہاں چلا آیا۔" ڈی سوزا نے آہستہ سے کہا ـــــ "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تمہیں ڈرنا ہی چاہیئے۔ آخر تم بھی کافی خوبصورت ہو۔" شیلا نے چوٹ کی۔

پادری اجنبی کے قریب آیا۔

"تمہارا یہاں آنا ٹھیک ہے دوست۔" پادری کے لہجے میں پیار تھا۔ اجنبی نے پادری کو گھور کر دیکھا۔ پادری نے پھر نرمی سے کہا ـــــ "یہ خدا کا گھر ہے۔ یہاں سب برابر ہیں۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے خدا کے سامنے رکھو۔ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا۔

پادری [illegible] چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اجنبی کب کا جا چکا تھا۔

وہ رات پادری البرٹ کے لئے قیامت کی رات تھی۔ اُس رات اُس [illegible] کی طرح اجنبی کے بڑبڑانے کی آواز سُنی مگر آج یہ آواز واضح تھی، [illegible] تھی۔ وہ اجنبی کی ایک ایک بات سُن سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا :

"میں نے تمہیں مارا۔ ہاں، ہاں یقین جانو وہ میرا پاگل پن ہی تو تھا ورنہ تم جیسی بیوی کہاں ملتی ہے۔ ایک ذرا سی غلط فہمی، ایک ذرا سی غلطی اور اتنی بڑی سزا ——— میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ میں گناہ گار تھا ——— جیل کی سزا میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی۔ مگر اب تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو۔ بتاؤ نا ——— بتاؤ ——— خدا کے لئے جاؤ، مجھے سکون سے مرنے دو ——— جاؤ ——— جاؤ ——— !!"

وہ زور سے چیخا۔ پادری البرٹ نے جلدی سے کھڑکی کھولی۔ اجنبی اپنے باغ میں کھڑا تھا۔ وہ چند منٹ بعد لڑکھڑایا اور دوسرے لمحے زمین پر گر پڑا۔ پادری البرٹ گھبرا گیا۔ جلدی سے باغ میں چلا آیا۔ اجنبی کو اُٹھا کر اس کے بستر پر لٹا دیا۔ اُس رات صبح تک اجنبی ہوش میں نہیں آیا۔ وہ بے ہوشی میں بھی بڑبڑا رہا تھا ——— جاؤ ——— جاؤ ——— !!

دوسرے دن جب وہ ہوش میں آیا تو سب سے پہلے اُس نے پادری کو دیکھا۔

"میں کہاں ہوں!"

"گھبرائیے مت، آپ اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"آرام کی ——— ؟ مجھے کیا ہوا ہے، میں تو اچھا ہوں۔"

"واقعی آپ بالکل اچھے ہیں، گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

چند منٹ پھر وہی پُر اسرار تاریک خاموشی چھائی رہی۔

پادری نے کہا ——— "آپ ہم سب لوگوں کو غیر سمجھتے ہیں۔ ماضی نے اگر آپ کو کچھ دکھ دئے ہیں تو اُنہیں بھول جانے کی کوشش کیجئے۔"

"لیکن بھول کیسے سکتا ہوں!"

"آپ ہمیشہ تنہا، اکیلے اور اُداس رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملیئے، اُن کے دکھ سکھ میں شریک ہو جائیے۔ شاید آپ اپنا ماضی بھولنے میں کامیاب ہو جائیں!"

وہ خاموشی سے پادری کو دیکھنے لگا۔ پھر اچانک بولا:

"آپ میرے [illegible] بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"ظاہر ہے بہت کم جانتا ہوں۔ لیکن جتنا بھی جانتا ہوں اُس سے پتہ چلتا ہے آپ کو تنہائی کی نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ جوانی میں ہر ایک سے غلطی سرزد ہوتی ہے۔ کسی سے چھوٹی، کسی سے بڑی ——— آپ بھول جائیے!!"

"جتنا بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ اتنی ہی قریب آتی ہے۔ پادری، میں نے ان گندے ہاتھوں سے اُس کا قتل کیا تھا ——— میں پاگل ہو گیا تھا، بالکل پاگل ——— وہ معصوم تھی بے قصور تھی! پندرہ برس ہو گئے ہیں، لیکن میں ہمیشہ اچانک رات کو جاگ جاتا ہوں ——— مجھے لگتا ہے وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔ روتا ہوں۔ ——— کل تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی چیخ رہی ہو ——— آؤ، ایک بار پھر مجھے قتل کر لو ——— آؤ ———"

وہ دیر تک روتا رہا۔ پادری دیر تک سمجھاتا رہا۔

اُس دن کالونی کے سارے لوگ حیران ہو گئے جب اُنہوں نے اجنبی کو پادری البرٹ کے ساتھ گھومتے دیکھا۔ اُس دن وہ پادری کے ساتھ چرچ گیا۔ ساتھ والے سمندر کے کنارے وہ لوگوں کے نہانے کا تماشہ بھی دیکھتا رہا۔ پادری البرٹ نے اجنبی کو لوگوں سے ملایا۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر اجنبی لوگوں سے اتنا گھل مل گیا کہ لگتا تھا جیسے وہ مدتوں سے اسی کالونی میں رہتا آیا ہو اور وہ بھی اُن میں سے ہی ایک ہو۔

وقت خاموشی کے ساتھ گذرتا رہا۔

اتوار کی ایک خوبصورت سی شام کو بہت سے لوگ سمندر کے کنارے بیٹھے بچوں کے نہانے کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا پادری البرٹ کہہ رہا تھا:

"کاش اس سمندر میں خطرناک شارک (مچھلیاں) نہ ہوتیں تو آج ہم بھی نہا لیتے!"

سبھی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا ——— پادری [illegible] تو نہا [illegible] شارک تو کنارے سے دُور ہیں۔ کوئی آگے نکل جائے تو [illegible]



طالبات میں مٹھائی
تقسیم کرتے ہوئے

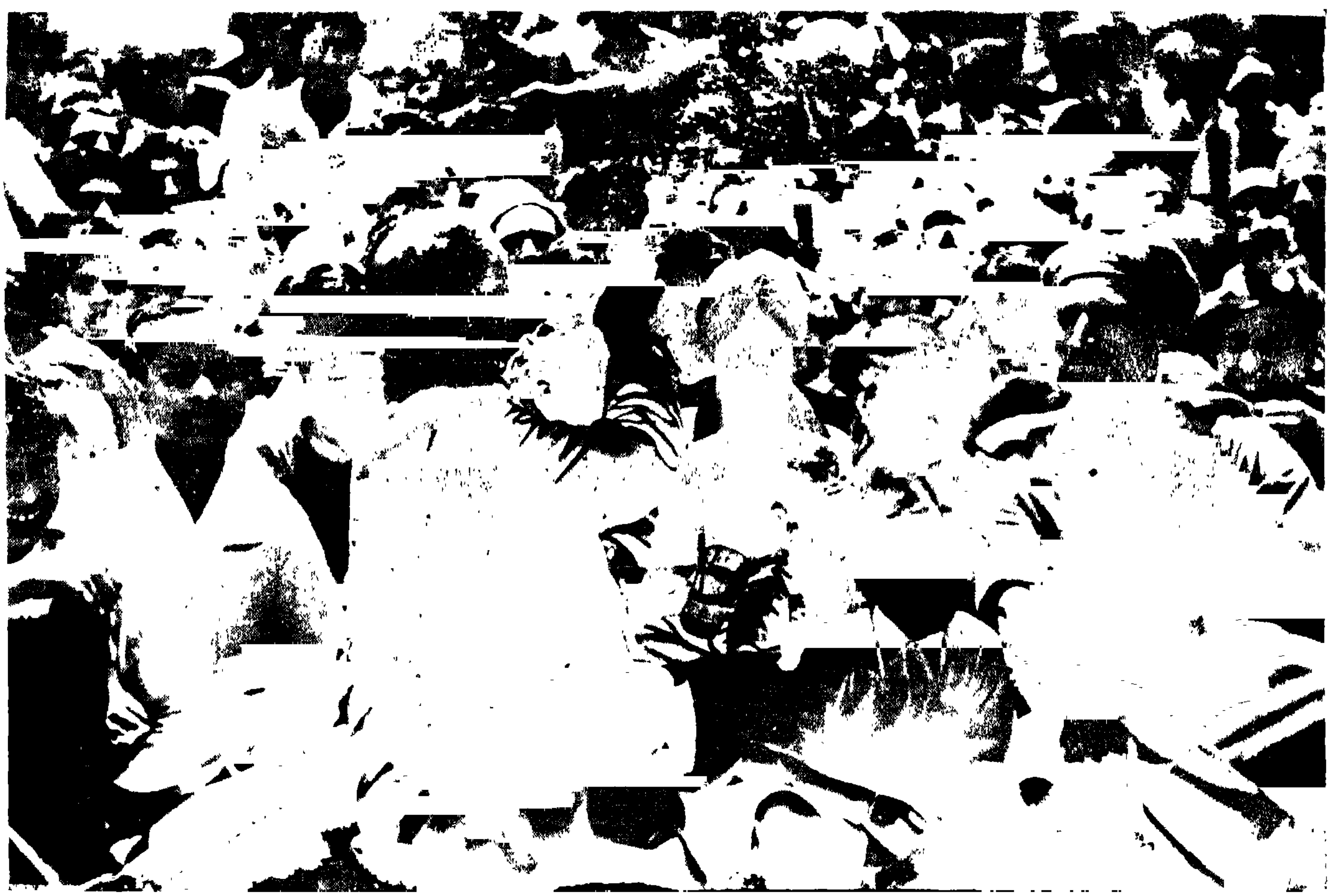
بخشی صاحب کو دیکھ
کر بچے خوشی سے ساز
بجانے لگے



زندگی زندہ دلی کا نام ہے



سجا دہلائی



''بخشی صاحب! ایک چھینٹا اِس طرف بھی''

"ہاں — " ڈاکٹر سوزالی نے کہا — " دراصل ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کسی زمانے میں ہم بھی اسی سمندر میں نہاتے تھے، پھر جب شارک ہم لوگوں کی طرف چلی آتیں، ہم بھاگ جاتے —— وہ وقت ہی انوکھا تھا — "

" یہ سب بچپن کی یادیں ہیں۔ " اجنبی نے بحث میں شامل ہو کر کہا —

" بچپن کی یادیں حسین ہوا کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے بڑھاپا اُن یادوں کے سہارے ہی گذر جاتا ہے۔ "

" صحیح ہے۔ " پادری البرٹ نے کہا — " مگر ...! "

اچانک وہاں شور بپا ہوا۔ لوگ چیخنے لگے۔

" مونا — مونا — مونا —— "

" مونا — " اجنبی نے چیخ کر کہا۔ " کون مونا، کیسی مونا — "

پادری البرٹ پاگلوں کی طرف بھاگ رہا تھا " کیا ہے۔ کیا ہے۔ "

" وہ دیکھئے، مونا سمندر کے بیچ شارکوں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے — وہ دیکھئے وہ چیخ رہی ہے — "

" ارے کوئی ناؤ تو لے آؤ — "

" میری بچی — مونا —— مونا — " شاید مونا کی ماں تھی۔

" میں مونا کو بچاؤں گا، میں مونا کو بچاؤں گا — " اجنبی نے کہا

" یہ موت کے مُنہ میں کود رہا ہے، پاگل ہے، مت جانے دو اُسے — مونا نہیں بچ سکتی۔ یہ بھی مارا جائے گا۔ " کوئی کہہ رہا تھا۔

مگر اجنبی سمندر کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چھوٹی سی لڑکی کو سینے سے لگایا اور کنارے کی طرف مُڑا۔

اچانک کوئی چیخا — " وہاں پانی سُرخ ہو رہا ہے۔ خون ہے خون۔ "

اجنبی مونا کو لے کر آہستہ آہستہ کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ کنارے کے قریب پہنچ کر مونا کی ماں نے اپنی بچی کو سینے سے لگایا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اجنبی کو پانی سے باہر کھینچ لیا گیا۔ مگر اُس کی ٹانگیں ہی غائب تھیں۔ اُس کے جسم سے خون کا ایک آبشار گر رہا تھا۔ لوگ بے حس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک پادری البرٹ پاگلوں کی طرح چیخا —— " ایسا کیوں کیا اجنبی — بتاؤ، تم نے یہ کیوں کیا ایسا — ! "

اجنبی درد سے کراہ اُٹھا اور ہلکے سے بولا —

" پادری اُس کا نام بھی تو مونا ہی تھا۔

پادری کو محسوس ہوا، جیسے سمندر کی لہریں اچانک ساکت ہو گئی ہوں!

ریٹھہ تہ تمن

(بقیہ از صفحہ ۸۲)

بکلہ ہیر تہنز۔ سو چراُسو چھُ پُزی پاٹھو چور۔ چراُسِس پیٹھ غصہ ہاوان کھوت دوستہ رحمانُن تُرکہ ہیور۔

دوستہ رحمان گو ویزنزِس کھنڈس بے ٹنگہ۔

آنگنہ منزہ اُس تہنز نوش وتان۔ گوڈہ چھلک کرِ سیتو بوییم پکو، صابن تہ چیم نہ۔ کنہِ نرہ پیٹھ تہ نیرہ کوتاہ۔ باقین ہُند گو ژُژو ژُژو تہ پھیرو پھیرو کھیوٗن۔

دوٗیمہ دوہ ہیوٗک نہ دوستہ رحمان محمد سوداگرنِس وانس پیٹھ نیرِتھ۔ دُی دوہس بیوٗٹھ پوٗت آنگنس منز دحان وگوِس دامچھو، اشند بنٹومرکو چھ منز تُرتھ۔

بخشی صاحب

اے بخشی لقب قوم پہ بخشش ہے ترا کام۔ بخشا ہے خدا نے تمہیں یہ رُتبۂ عالی!
بخشی بخشی وردِ زباں کیوں نہ ہو دِل کو۔ بخشش سے تیری آئی جو ہر گھر میں خوشحالی
ہے جُود عطا بخشش و ایثار تیرا کام۔ در سے ترے خالی نہ گیا کوئی سوالی
اقبال ہے یاکر تو خوش بختی ہے مددگار۔ یا رب رہیں یہ تا ابد اس در کے حوالی
غربا ہیں شب و روز ترے حق میں دُعا گو
مبنی ہے حقیقت پہ یہ دُعا اور نہ خیالی
(اے کے بیر)

ایم، ایس شاد

بخشی صاٰبس ڈیکہ کیاہ تابان — رؤف

بخشی صاٰبس ڈیکہ کیاہ تابان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

امنی رُوزنس پانہٕ حق سُبحان
زری پاڑٕ گلنس سون ژُوجان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

باغس پھلیاہ، بُلبل توشان
چھاوان خوشبو قسان باغِ بُستان
الٰہی پوشتن باغس باغوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

ڈراگہ دیُو بالہ ژوُلہ ہیتھ گو ژُوجان
گامین شہرن آو ارمان
لالہ ہیتھ مس پیالہ وتہٕ پنیہ کرشان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

راتہٕ موغلن دوٗ ژراو پاڑہ زان
باغہٕ منزٕ نیرہ نگ ڈراکھ فرمان

پوشہٕ نوٗلن ہُند جاری چھُ کاروان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

عدلک راج آو ظُلمس گوٗ فان
غاصبن کیتھہ پھیوُر ترٹہٕ طوفان
بجرگ تہٕ تعزک یلہٕ گوٗو ڈُکان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

ڈیکہ بوڈُ سونوی چھُ حاتمِ دوران
آسہ بوڈُ تھاوُنس شاہِ ہمدان
تقدیرِ مُلکُک کیاہ چھُ پزٕ زلاوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

بختے بڈیو سُندس چھُ تھینکہ ناوان
ٹوکہٕ بڈیو ازچس لول باگران
دنیس تہٕ چھے دراہٕ ژہ از وَنہٕ ناوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان
گٹہٕ منزٕ گاش زن گاہ تراوان

نعیم

جی۔ ایم انصاری نشاط

پانہٕ بوڑ چھُوی خالدِ کشیر سون

ساناٮ۪ یتھ کٔشیرِ چھُ پتہٕ پیٚٹھہٕ یمہٕ کتھہٕ ہُند فخر حاصل ز سمُت زہ اُمی چھِ سیٚٹھاہ یگانہٕ روزگار، قابلِ فخر تہٕ موہلو تہٕ آب دار موختہٕ وزہٕ وزہٕ پاٚدہ کٔرمتۍ یمو کٔشیرِ ہندس اُفقس پیٚٹھ آفتاب تہٕ ماہتاب بنتھ پنُن ناو زندہ تھاونس سیتۍ سیتۍ کٔشیرِ ہُند ناد تہٕ پریٚزلومُت چھُ۔ یمہٕ قابلِ فخر بیٚیہٕ آب دار موختہٕ منزہ چھُ کالیداس سلطان شہاب الدین، للتا دتیہ، بڈشاہ، یوسف شاہ چک، وغیرہ سیٚٹھاہ قابلِ ذکر موختہٕ۔

بڈشاہن کوٚر یتھکیٚن لُکن ہنزہ خوشحالی تہٕ فارغ البالی خاطرہ تہٕ کینژھاہ یمہٕ سیتۍ تسُند ناو بلا امتیازِ مذہب و ملت یتھک ہر کانہہ باشندہ وٚنیک تام نہایت ادبہ تہٕ احترامہ سیتۍ ہیوان چھُ۔ ینہٕ جایہٕ آسہ ہے بڈشاہس یہ گمان زہ تسُند پتہٕ کرہ نہٕ کانہہ اکھاہ تسنزی پاٚٹھۍ کٔشیرِ ہُند ناد روشن، مگر تسُندس دورس آسہ از فکرہ تران زہ دُہمہٕ صدی ہندِس ابتداہس منز دیت یمی جنتِ ارضین تتھس اکس موختہٕ ژھٔلس جنم یمۍ کٔشیرِ ہندِس نبس پیٚٹھ ثُریا بنتھ سیٚٹھاہ تھود مقام حاصل کوٚر، بیٚیہٕ یمۍ تسُند ناو تمام ایشیاہس منز روشن سپُد۔ سو ہستی گیہٕ بخشی غلام محمد ییٚس وُنکینس جموں و کشمیرکہ نوکرکار وانکہٕ سپہ سالار بنتھ یتھ منزلِ مقصودس کُن کھنا وال چھُ۔ اگر یتھکۍ تُکہٕ اٚمِس کٔشیرِ ہند بڈشاہِ ثانی تہٕ وَنو تہٕ تہِ ییٚنہٕ ین تسلی زہ تموٚ کیاہ دیت یمن خاطر غواہ تھزر۔ تمۍ کیاہ زہ کٔشیرِ ہنزہ آزادی، کٔشیرِ ہنزہ ترقی تہٕ کٔشیرِ تعلیم

ہندہ رٔژرہ خاطرہ کوٚر یمو تہٕ کینژھاہ یُمنک عشرِ عشیر بڈشاہن تہٕ آسہ ہے نہٕ کوٚرمُت۔ کٔشیرِ ہندِس کنہٕ اکس شعبس پیٚٹھ اگر سرسری نظر تراوو سہ چھُ پننہ احسانک مرہونِ منت بنتھ پننہ ثنا خوان۔ اقتصادی طور کٔشیرِ ترقی تہٕ خوشحالی ہنزہ وتہٕ پیٚٹھ لاگنہٕ بابت وَہردو۔ یمو پننس وقتس منز لفٹ ایری گیشن ہند سہ زال جایہٕ جایہٕ یمو سیتۍ تیتھ خار زار تہٕ بنجر بیٚیہٕ غیر آباد زمین گل تہٕ گلزار دو یداونہٕ رٔجۍ۔ دور اُفتادہ پہاڑی تہٕ ماٚدانی علاقن ہندیو بسن منزہ گامہٕ تہٕ قصبہ وغیرہ پانہٕ واٚنۍ یمہٕ ناونہٕ خاطرہ کرناوِن ہتہٕ بٔنزہ لوکچہ کیٚو بجہ، پختہ تہٕ خام سڑکہٕ تعمیر۔ شاید چھِ ساٚنۍ ریاست ہندوستانس منز سو واحد ریاست، یتہٕ ادلہٕ پیٚٹھہٕ ایم۔ اے پیٚٹھ تام تعلیم مُفت چھِ یوان دِنہٕ۔ امینک نتیجہ دراو یہ زہ ماضی یس منز آسہ یتکیٚتہ خوش قسمت تعلیم حاصل کٔرتھ ہیٚکان یمن گرن ہند آسُن بسُن تہٕ جان اوس آسان تہٕ چیندن ہنز وسعت تہٕ رٔژ آسان۔ اما پزنہٕ غریب شرین ہنزہ تعلیمِ ہندۍ مُقفّل دروازہ مُژراونہٕ بابت تُل یمو اکھ سو قدم یمہٕ سیتۍ وُنکینس پرنتھ اکھاہ کنہٕ قسمک تعلیم حاصل کٔرتھ چھِ ہیٚکان۔ گامہٕ گامہٕ آیہٕ سکول کھولنہٕ۔ پرائمری سکولن آو مڈل سکولن ہُند درجہ دِنہٕ۔ مڈل سکولن ہائی سکولن ہُند درجہ تہٕ ہائی سکولن ہائر سکنڈری درجہ دِنہٕ۔ امہ علاوہ آیہٕ کٔشیرِ ہندیٚن تمام قصبن منز ڈگری یا انٹرمیڈیٹ کالج کھولنہٕ۔ یتھہٕ پاٚٹھۍ بنیوو یتہٕ کیٚن تعلیم یافتہ سبے

روزگارن روزگار حاصل۔ ٹُکن روزگار مہیا کرنہٕ موٗجوٗب آیہٕ کشیرِ تہٕ جمّوٗس منز سیٹھاہ لوکٕٹ تہٕ بٔڈۍ کارخانہٕ بناونہٕ۔ سری نگرس منز روزن والین لوکٕٹین کیٛو بٔڈین مُلازمن یمن پننیو مکانہٕ آسیو نہٕ یا ناکتنی آسکھ تِمن ہندِ آرامہٕ ساں بسنہٕ بابت آیہٕ تِمن سرکاری پلاٹ، امہٕ علاوٕ مکانہٕ تعمیر کرنہٕ موکھہٕ نقد روپیہٕ تہٕ دِنہٕ ــــ چنانچہ کشیرِ منز جواہر نگر، بال گارڈن تہٕ جموٗس منز گاندھی نگر تہٕ کرن نگرٕ آیہٕ بےشمار مکانہٕ تعمیر کرنہٕ، یمن منز سرکاری مُلازم جان پٲٹھۍ رُوزِتھ چھہٕ ہیٚکان۔ یِتھے پٲٹھۍ آو سیہلابہٕ نشہٕ بچراونہٕ خٲطرٕ فلڈ ڈیپارٹمنٹ ناوٕک اکھ الگ محکمہ قایم کرنہٕ، یتھ منز ییٚکو سیٹھاہ تعلیم یافتہ بیٚیہٕ غیر تعلیم یافتہ لُکھ مُلازم لگو۔

کشیرِ ہنز خوبصورتی وُچھنہٕ بابت آسن پرٛیتھ وٕری فرہنگو تہٕ ہندوستانی سیاح یوٗت یوان۔ مگر یِہوی بوٗزِتھ تہٕ کیازِ تِہندِ یتہٕ روزنک خاص انتظام تہٕ اوس نہٕ کینہہ تہٕ۔ مگر بخشی صاحبن بناوِ یتہِ کینٛہہ تمام سحت افزا مقامن پیٹھ سیاحن ہندِ روزنہٕ خٲطرٕ عالی شان رہایشی مکانات۔ خاص شہرس منز تہٕ آیہٕ سیٹھاہ عمارژ تِہندِ روزنہٕ بابت تعمیر کرنہٕ۔ شہرچ خوبصورتی زیادٕ کھوتہٕ زیادٕ بڑراونہٕ موکھہٕ آیہٕ اَکھ پٲٹھۍ ڈیار خرچاونہٕ۔ یِہوی وجہ چھُ زِ وُنہٕ کیٛنس چھہٕ ساسہٕ واد سیاح کشیرِ یتھ یتیک لُطف تُلان۔

کٲشِر چھُ دوہے عِلمک تہٕ ادبک مرکز رُودمُت۔ مگر یِہ سہ علمی تہٕ ادبی ترقی امسندِس وقتس منز سپز سو چھےٚ پزۍ پٲٹھۍ قابلِ تعریف۔ جایہٕ جایہٕ آیہٕ کلچرل تہٕ لٹریری فورم بناونہٕ۔ مُشاعرن تہٕ مذاکرن ہُند کٔر آو کشیرِ ہنزِ پرٛیتھ کُنہِ جایہِ دِنہٕ۔ لُکن ہندِ تفریح خٲطرٕ آیہٕ جایہٕ جایہٕ پارک، باغ، ٹاؤن ہال وغیرٕ تعمیر کرنہٕ۔ یتہِ لُکھ ہیٚنہِ فُرصژ ہُند وقت جان پٲٹھۍ گُذراوان چھہٕ۔ منصوبہ بندی ہندِس پروگرامس تحت آیہٕ تِہنہٕ کامہِ انجام دِتہٕ یِمہٕ ڈوگرہ شاہی منز رُوزِتھ آسہٕ گیمژٕ۔ واریاہ محکمہ آیہٕ کھولنہٕ، یِمو سیتی گیچھ بےروزگاری دُور آیہٕ تعمیر

کرنہٕ۔ سوٗد خوارن تہٕ وڈ دارن ہندِ چھنگہٕ نشہٕ آزاد کرناونہٕ خٲطرٕ آیہٕ گریسِتین ہنزِ آسایشہٕ خٲطرٕ کواپریٹیو تحریک زُو دار بناونہٕ۔ یُمیک براہ راست اثر یہِ دراو زِ لچھہ واد روپیہ چھہٕ گریسِتین یوان پرٛیتھ وٕریہٕ قرضس پیٹھ دِنہٕ۔ ریاست ہنزِ صنعت و حرفتس ترقی دِنہٕ خٲطرٕ تہٕ آو اہم توجہ دِنہٕ۔ پنچایتی راج علہٕ منز اناونہٕ بابت آو دیہاتی لُکن پننین کوٹھین پیٹھ کھڑا سپدنہٕ خٲطرٕ اکھ نٔوۍ شعور پٲدٕ کرناونہٕ ــــ

بےروزگارن زیادٕ کھوتہٕ زیادٕ کٲم مہیا کرناونہٕ بابت آو بندوبستک محکمہ علہٕ منز آنہٕ ناونہٕ۔ یتھ منز ہتہٕ واد پٹواری اسسٹنٹ پٹواری، جریب کش، گرِداور، تحصیلدار تہٕ نائب تحصیلدار بھرتی آیہٕ کرنہٕ ـــ

یِمن تمام کتھن ہُند اصلی مطلب چھُ یِہوی زِ ریاستس منز گژھہٕ اقتصادی ترقی سپے لبنہٕ۔ تہٕ کیازِ کُنہٕ مُلکچ آزادی ہیٚکہٕ تیٚلی مضبوط تہٕ پایدار بنتھ یلہٕ کانہہ مُلک اقتصادی طور تہٕ آزاد آسہٕ۔ چنانچہ یِہوی خاص وجہ چھُ یتہٕ تہٕ کارفرما۔ یُس وجہ مدِنظر تھاوِتھ کشیرِ ہنز پرٲنی تعلیمی، اقتصادی تہٕ معاشرتی پس ماندگی دُور کرناونہٕ بابت ییٚچ پوشیدہ دولت چھہٕ انہٕ کُنہِ راونہٕ یوان۔ وُنہٕ کیٛنس چھہٕ سانہٕ کشیرِ ہُند تیار مال ازقسم ریشم، ڈوٗنۍ لکرِ پیٹھ کرمُت کٲم پیپر ماشی بیٚیہٕ امہِ قسمک دوٚیم مال نیبرِ مُلکن یوان سوزناونہٕ۔ توہہٕ چھہٕ ... تمام چیز انہٕ ناونہٕ یوان یِم سانہٕ کشیرِ منز چھنہٕ دوپرٛان یا بنان۔

بہرحال یِژھاہ تعمیری کٲم انجام دِنہٕ باوجود تہٕ چھہٕ وُنہٕ سانۍ کٲشِر کینٛژن کتھن منز وُنہٕ پس ماندٕ۔ مگر کشیرِ ہندِ لُکھہٕ کاروانک سپہ سالار چھُ یِمن تمام کتھن واقِف۔ تِمو چھُ عزم کوٚرمُت زِ ترٛیِس پانژٕ وُہرِ منصوبس منز گژھن یِمہٕ تمام کامہِ انجام یِنہٕ۔ یعنے کاغذ بناونک کارخانہٕ، سیمنٹ تیار کرنک کارخانہٕ، بجلی ہُند زال سارِسی کشیرِس منز وہراوُن، بیٚیہٕ باقی کارخانہٕ تہٕ فیکٹری تعمیر کرنہٕ، یِمو سیتی ییٚچھ قومی تہٕ مُلکی دولژ منز ہتہٕ گُنہٕ اِضافہ سپدِ، پوٗرٕ کرنہٕ۔

آدہ ہیکہِ ساٚنۍ کٲشیر پرٛینتھ رنگس منز خود کفیل بنتھ تہٕ یتیک مال دۆیمیٚن ملکن سوزنہٕ آوِتھ ـــــــــــ

یِتھٕکۍ کم تنخواہ دار ملازم آسی ہمیشہ درو جوٗرک شکار سپدان اما تِہنٛد معیارِ حیات بلند کرنہٕ خاطرہ آو ۱۹۵۴ء ہس تہٕ ۱۹۵۷ء ہس منز تِہنٛدین تنخواہن ہندی گریڈ بڈراونس سیتی سیتی تِمن مہنگایی الاونس تہٕ دِنہٕ۔ معمولی چپراسی چھہٕ ازکم سے کم پنژاہ روپیہ ماہوار تنخواہ نِوان۔ یِمن تمام کامیٚن ہنٛد فخر چھہٕ بخشی صاحبس حاصِل تہٕ یِہنٛدسی کلس چھہٕ امیک سہرہ گنڈنہٕ یِوان۔

یِتھ کالہِ اگر کانہہ ناگہانی آفت ریاستہٕ ہندِس کُنہِ حصس پیٹھ حملہ آور آسہ سپدان، کانہہ اکھاہ بوٗنہٕ تور کنہِ توجہ دِوان۔ مگر از اگر کُنہِ جایہِ کُنہِ قسمچ آفت نموٗدار چھہٕ سپدان سو چھہٕ فی الفور دور کرنچ کوشش یِوان کرنہٕ۔ مثلاً پرٕٛس پھیلیاو کشیرِ منز ژۄ وا بُد کالرا۔ آنًا فانًا آیہِ ہندوستانہٕ پیٹھہ سپیشل جہازن منز کالرا انجکشن انہٕ ناونہٕ تہٕ موٗذی بیمارِہ پیٹھہ آو قابوٗ حاصل کرنہٕ۔ یِتھے پأٹھۍ اگر کُنہِ جایہِ سون کھہ موکھہ نار لگان چھہٕ، حکومت چھہ نارہ دَدیٚن ہر ممکن اِمداد کران تہٕ یِتھہٕ پأٹھۍ رچھنہٕ ژۄکھہ کُنہِ قسمک تکلیف محسوس کران تہٕ نہ چھہ ہمت ہارزان۔

یِم کتھہٕ آسنہٕ تیلہِ ممکن ییلہِ ساٚنۍ کٲشیر غلام آس ـــ مگر وونۍ چھہ پنٛنۍ حکومت یتہٕ کینہہ توٗکن اتھہٕ۔ لہٰذا چھہٕ یِہنٛد فرض یہ ہوی نیہ تِم کرن کشیرِ ہنزہ ترقی خاطرہ ہر رنگہٕ کوشش تہٕ جد و جہد۔

ـــــــــــــــــ

عبد الغفار مشکور

مُغل روڈک معمار۔ خالدِ کشیر

یہٕ چھا نہٕ خوابہٕ کوٗی تعبیر مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر
یہٕ چھایِن نعرہ ہٕنۍ تاثیر مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

تِمن پتہٕ انیٚن روا یا تن دوبارہ سگ دِتوٗی ذاتن
امیک بأنی امیرِ کبیرؒ مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

دۆیِم اکبر تہٕ بنیہٕ بادشاہ امی دتہٕ آسی یوان گاہ گاہ
یہٕ تِہنٛدسے عہدہ کوٗی تعمیر مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

ژوٚ گامے خانقاہ موجود، امیرنؒ ہنٛد نشانہ بوٗد
پڑاون سریہٕ چھے حأضر مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

دساوَر بوٗڈ دیان شوٗبیٚن چھہٕ اوسمت یراٚنی وقتن
بنیہٕ بیدار گوس تقدیر، مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

سپُد تعمیر بنیہٕ اَتھ توٚنٛد، بہٕ ہرجا چھہ توٚنٛ شوی گو
بدولت خالدِ کشیر، مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

دِوان مشکور چھوی آوِتھ نِشانہٕ پیہ اَمی نُنہِ مأوِتھ
تھوان یِم کتھ کرِتھ تحریر، مُغل روڈ بنیہٕ سپُد تعمیر

محمد ایوب بیتابؔ

سون رہبر

زِندگی اکھ ساز آسہ کمہٕ دِژ یہٕ سے
نوٚ جلا بخشٕر دن میزِن ژٕ جِکھ سے نغمے
خوابن سانین یہٕ کمہٕ تعبیر ژھور
از لبان ارمان سانی نوٚو چِھ پے

۲

باعنوان لوگمی یہٕ کمہٕ ییتہٕ گلشنس
بلبلس دِژ آش سگ دوت پرٕنیتہٕ گلس
جہلمی اوسہٕ راژ کمہٕ کوٚر عِلمہٕ زوٚل
واتہٕ نوو کاشرٕ یہٕ کمہٕ اوسہٕ منزٕلس

۳

کس یہٕ فرہادس ژٹان کوہن جِگر
کمہٕ کوٚلن ہیوتھ نوٚر کوٚر شامس سحر
تا وہ ہرہ ڈرن یہٕ کمہٕ شہلاو تن
کمہٕ بخش شوقس بجر سوچس تعزر

چھوی یہٕ سوی یس "خالدِ کشمیر" ناو
اسہ بیمارن زٕن "مسیح" لاگتھ سہ آو
زِندہ کرٕ تمہٕ زِندگی بخشن تعزر
آولنہٕ منز کھاٚر بوٚنہ تمہٕ سانی ناو

۵

اُمہٕ ارادن آشنی ہند غاز کوٚر
اُمہٕ بجاپی ہند نوٚوی آغاز کوٚر
نعرہ اُہندی دِتھ ژٕرہ وونی آباد گژھ
حال اُمہٕ اسہٕ برتری ہند راز کوٚر

۶

مرحبا اے خالدِ کشمیر بننے مرحبا
شان کیژراہ تعزٕ چھہٕ جانی کوٚت بوٚڈ چھوی مرتبا
رہنما چھک سون منزل ژی کوٚرتھ اسہٕ آشکار
کاروانس یوٚن آکو سانِس بانگہٕ درا

فاضل کاشمیری

پھولوَنا

وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
سخ بادوباراں ترٕ طوفان اوس زورن پیٚٹھ
تُند آب، گٕڑ زٕدٕل، ابرِ سیاہ اوس زورن پیٚٹھ
اوس زورن پیٚٹھ
اُتھی منز یہ اکھ سأزٕ ناوِ ہِن مۄدرس تران رُوز
لمگٕ ترکٕنگ پوشہ وَن اکھ بأتھاہ پیان رُوز
کوشِش کران رُوز
آدٕ سارِنی نارس ترٕ گوو گُلزار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
ژۄٹ، دود ترٕ اُلو رزماہ سیوِتھ کھیِ کھیِ پچھونا
دوٕزٕ عنقریبی ٹانگرٕ پیٚن کیاہ میچھہ کھیوِ نا
کیاہ میچھہ کھیوِ نا
مُنڈکم ترٕ مڑکم ترٕ چھُہ بٔیہ دانہِ گٔت کم
پتہ وَتھ چھ صبرٕ چ ناو بُڈٕ یار دِچھٕ توہِ کیاہ غم
نتہ گیلہِ سور عالم
ادٕ یہ سُہ پیٚٹھ ترٕوہ ہِن ترِ ئٕچ دال کھار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا

وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
یتھ زندگی منز سون مُنزل ژود سیٚٹھاہ تھوٗد
شہبازہ سُند پرواز کوٗر وُچھ قدرتن کیاہ سیوٗد
وُچھ قدرتن کیاہ سیوٗد
کرہ نأو اسہِ اکھ پینژرٕ کأزٕ تام ادل تھزرس پیٚٹھ
تھدِہ پایہِ ہیٚچھ ناو جان دِیُن دلنس ترٕ بزرس پیٚٹھ
جأنی ترٕ سیٚنزرس پیٚٹھ
ادٕ بے سبب پھریٚستن چھُ نوٗگٔت نار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا
بڈٕہ پایہِ لوٗچِل ونتہ کیاہ بھتہ دادِہ مرٗیا زانہہ
مُنجمک بوچھر، شامک دوہ پیس دوٕزٕ چاو بھرٗیا زانہہ
چاو بھرٗیا زانہہ
دوٕزٕ غربتک کھوٚنک تھادِہ تے ژلہِ لار ہیٚنے وَتھ
نوُزندگی ہیٚتھ آیہِ ڈُلہ محرُوم دِلن ستھ
ادٕ کأشرِیٚن آباد گوو گھر بار پھولوَنا
وُچھ تارہ وِزٕ اُمو صاحبن دِیُت تار پھولوَنا

اختر محی الدین

ریٚہہ تہٕ مَن

از اوس دوٚستہٕ رحمان سیٹھاہ خوش۔

محمدٕ سوداگرنہِ وانہِ پٮ۪نٛجہِ پٮ۪ٹھ بہِتھ اوس سُہ پچھہِ تھٕمبہِ رٲلِشہِ موٚچہ پھشاہ پھشاہ دِوان تہٕ نوِہ سرہ از پنٕنہِ دوٚستہٕ کارٕ ہُنز پرٲنٛز داستان ونان۔ "بہٕ حقن اوٚسُس تِمن دوہن جوان۔ دوٚزُل نارہ فرہو نگ میٛوٚ میٛٛ اوسا کانٛہہ فکرہ کھسان۔"

دوٚستہٕ رحمانس اوس پرٛازن پٮ۪ٹھ اَسُن تہٕ محمدٕ سوداگر اوس کن پٲدٕ پٲدٕ بوزان۔ تہٕ کیازِ امہِ وِزِہ اوس نہٕ دانٛس پٮ۪ٹھ خریدار کانٛہہ۔ "اَتی چھُس بہٕ جرنیل شیرخانس بیٛٹھکہِ ختم بندتالو دِوان" بہٕ کیاہ وَنےٚ جرنیل شیرخان کیاہ اوس۔ دوٚستہٕ رحمانن تَہُنٛز اَچھ زِہ تالوس کُن۔ "خدا صاحب کرٕنس مغفرت" یلہِ میانٛز کامہ وُچھن" اَتی دوٚپُنم دوٚستا لیو تُو کُرٛ پیو۔" دوٚستہٕ رحمانن ترٲو اسنہ ہنا۔ محمدٕ سوداگرن تہٕ ترٲو اسنہ ہنا تہٕ دوٚپنُن ــــ" اہنا تہٕ تِمےٚ زانن کامہ وُچھن۔"

دوٚستہٕ رحمان گو محمدٕ سوداگرنہِ اَنکارہٕ سیٛتؠ داراہ خوش۔ سُہ اوس از سُلہِ پٮ۪نٛٹھےٚ خوش۔ آدہ پٮ۪ٹھ یلہِ کہِ تام سرکٲرؠ دفترک چپراسی تہُند ناو تہٕ پتاہ مولوم کران تہُند گھرہ ووت تہٕ اتہِ دوٚستہٕ رحمانس نوشہِ ہتھی دوٚپنُن ــ "دوٚستا، ژٕہ کر تہٕ حقن مہربانی۔ پگاہ کھسہٕ سون دفتر تتہِ آسی کانٛہہ اکھ زِہ دوہ۔"

دوٚستہٕ رحمان گو تمی ساعتہٕ خوش۔ تمُو پیٚر سوٚہ بہ سان نوشہِ کُن نظر تہٕ وننہٕ نوشی بوونس۔ چانس خانہٕ دارس کتہِ تگہِ سرکٲرؠ کامہ ــ پانسے وپ از تام چھُنہ کانٛہہ چپراسی پتہٕ کُنٛ ناوس آمُت۔" چپراسیس کُن

پھیرتھ وَدتھ دوٚستہٕ رحمان ــ "اَدہ حقن بہٕ وانہِ مگر یہ ونتم تہُند دفتر کتیت برابر چھُ؟"

چپراسی اوٚسُس وَدَنمُت۔ "ژٕہ پرٛار حقن پگاہ کاہ بجے یتی برابر اَسی سوزوےٚ جیب، تتھی منز کھسک۔"

"بس بس بہٕ دوٚسُس۔" دوٚستہٕ رحمانن دِژ نہٕ امہِ اَکُن نوشہِ کُن نظر چپراسی دراو۔ دوٚستہٕ رحمان کوٚر نہٕ دوٚنی یہِ کتھِ ہُند خیال زِہ وَگوٚن پٮ۪ٹھ دانہِ کھیوٚوا ترٛنُو کِنہٕ کوکرو۔ تس رُود نہٕ پتہٕ یاد زِہ شوٗٹھس ما چھہ نیچوٕ تہٕ نوشہِ شرٛو رٕچھن زِہِ ہتھاوِتو۔ سُہ اوس نہٕ اَندرٕ اَندرٕ وٕژران کُنہِ۔ امی ساعتہٕ، نوشہِ ہندِس تتھس کُن وُچھنہٕ درٲیہِ گوٚو سُہ محمدٕ سوداگرس دانس پٮ۪ٹھ تہٕ تُچھن کتھ ــ "یہ ہاسا اوٚسُم خان بہودرن چپراسی سوزمُت۔"

محمدٕ سوداگر گوٚو حیران ہیُو تہٕ تمُو پرٛژھس۔ "کیاہ سنا دلیل؟"

"دلیل نسا کینٛہہ ــــ دلیل کیاہ گژھہ آسنہٕ۔" دوٚستہٕ رحمانن وَوٚن تمہِ طریقہٕ زنتہٕ دُنیہکی خان بہودرلس پرٛیتھ دوہہ پننہٕ چپراسی سوزنہٕ آسی۔ "تہنز کامہ ماتگہِ شہرہ منزہ کٲنسہِ۔ اَتھو نہٕ دوٚنُز شوٗٹھس ہیکتھ کینٛہہ مانِیوس نہٕ۔ مگر دوٚنی کوٚر اَمہِ چپراسی نارہ پارہ تہٕ دوٚپُن ــ "خان بہودر سوزی پگاہ پننہٕ جیپ ــــ اَدہ سا تہٕ دوٚنی ما رُود چارہ کانٛہہ ــ"

دوٚستہٕ رحمان اوس زنتہٕ عرشہِ پٮ۪ٹھ بہِتھ فرشہِ کِنؠ وُکن سیٛتؠ کتھ کرٕتھ سارسی خدایس منت کھاوان۔

محمدٕ سوداگر اوس پرٛژو پانٛژو حیران گومُت۔ یُتام نہٕ دوٚستہٕ رحمانس

کاہہ صفت آسہِ یوتام نہ اُہنز کاُم مانن تہٕ زانن آسہِ یوان توتام کیاہ زِہ
واتہٕ ہن اُمسی ژھانڈان ژھانڈان تہٕ اُمسی کیاہ زِہ سوزہ ہن جیب۔
از تام کُنہِ چھہِ چھان تہٕ دُسپل جیپن تہٕ کارن کھاُلیتو۔

ووستہ رحمانن سُٹھ پرٕاینہ واُنین ہنز کتھ۔ تمیُ بوز نوو محمد سوداگرن
تہٕ ساریٚ موجزہ یِم تمہٕ چھانہٕ کامہِ منز کرِمتہٕ آسو۔ اُمی ووٚن جرنیل شیر
خانن بنجہِ واستان تہٕ جرنیل شیر خانس سیتۍ پنٕنہ دستانج کرنٕ باُنہٕ
باُنہٕ ذِکر۔ الغرض اوسُس ونان۔ یک بار گوو جرنیل صاب نقوذ دِتھ۔
جگیرٕ اُتھ برو نہہ کنہِ۔ تموک بِہر نوونس تہٕ دوٚپنس میٚہ کُن ——
"ووستا لیو تموکُ ییہ۔"

محمدٕ سوداگرن وانہٕ پیٚٹھ دِتھ نیٚرِ ووستہ رحمانس گرہ اوسُس
اژُن، تمیُ وِژ گوٚڈٕ اُندیٚ کِنہ مکانن، دارین، دروازن تہٕ پشس نظراہ۔
دایہ آسس ہیچ کہِ ہشہ لبنہٕ۔ دروازہ ازگری
نقو گری۔ ووشا ترا اُوِتھ شوٚنجن زِہ سہ ووستہٕ کارٕی گیہ کوٚت۔ وُنہٕ
تہٕ نیرِ یِم لوٚرہ لونڈہ یپرٕاینہ بنگلن تہٕ مکانن کُن دُچھان آسن۔ اُندری
آسن مند چھان زِہ ازکوٚنہ چھینہٕ پرٚھ صفاٗیی تگان۔

"خیر۔" ووستہٕ رحمانن ووٚن اُندری۔ "ووٚذکوٚ دُچھن وااُلی تہٕ
رُوو۔ کھتام چھہٕ اکہ یہِ خان بہودر۔ یاد پیٚیہ ہیٚرِو ووستہ رحمانن خوش
گژھت پچھہٕ تمیُ رِیشس موہ چھہٕ منز دُٹھ دَرہ ہنا دَرہ ہنا دِنی تہٕ پنٕ
پان جیپن منز ہیتھ دُچھن۔ جیب واتہٕ تمِس دروازہ داسس نِشہ۔ اتی
وایہ ہارن تہٕ برٕتہٕ زِس کھنڈس درکہٕ ژٕھٹھ وسہِ ووستہ رحمان ہتھیار
اُتھس کیٚتھ بیٚتھ۔ ہتھیار؟ —— توٚر، لیٚتر، ژوردژ تہٕ بینہٕ یکناوِن
زاُوِج کاُم آسہِ ووستہ رحمانس اوس گمُان گژھان زِہ
یہ ماژہ ہاژہِ یہِ خان بہودر بچارہ کیاہ کرِ ہا؟ تہٕندہٕ پسندِ ج کاُم کس تگِ
ہا ——؟

یِہ سوٚنچان سوٚنچان ژاو ووستہ رحمان گرہ۔ نوشہ تہٕنزہ بوٚز
وسواٗنک صدا۔ گراز ووٚن دہ تمہِ وُژھس لاگِتھ پژھس۔ "کیٚنہ نہ ریٚٹھ
چھہٕ۔ تیٚرو کوٚتاہ۔" نیٚرِ ابہِ ژٕھ ژٕھی کھیوٚد۔ یہِ اُمس ووستہ رحمانن
نوشہ یہ نیٚتھ وقتہٕ ووستہ رحمانس وُرکرونان۔ سہ اُمس ہنگہ تہٕ منگہ شرین
تمہِ

مار دِوان۔ مسافرن بتھ پھِران تہٕ اُی ساعتہ اُمس پژھنس خانہ دایہ شند
ونان۔ دوہس چھہٕ آسان بچور ژوٚر اُتھس کیٚتھ بیٚتھ لوکہٕ ہندین پشن
تہٕ ووڈگن پیٚٹھ۔ خدا نے پنٕ سہل کرنیں، یتہٕ پژھ ژھینس نہٕ کانہہ ——
صرف بیٚہنس دوہس وتہٕ وتہٕ پھیرنہٕ۔ ووستہ رحمان ییتہٕ نچوو گرہ بنہٕ
اوس کوٚرمُت تنہٕ اُمس الیس نوشہ وِژہ وِژہ یِم تیرلایان۔

ووستہ رحمان ونیوو واریاہ چھہ لِٹہ نیچوٚن زِہ حتا یو ہتے کوٚتہٕ اُدرہٕ
دوٚر چھس، یوہتے وُنہ ژوٚن کاریگرن ہنز کاُم کتھُی ژوٚن کرِ، یہ
کیاہ زِہ بیہہ گرہ۔ گرہ نیچوی زاہ موٚنس نہٕ۔ دوٚدس ژٕیٚہ پیٚہ نہٕ دوہ ف
ہیکتھ۔ اتھن چھے نٹہ نٹہ اڑان۔ گوڈ یتہ کیٚنہ ساعتہ وتشناہ، چتو
واتو نہٕ کنہِ۔ ژھنس بلایہِ، کُنہِ کھیو، غم کیاہ زِہ ہیٚمو!

گر نوشہ اُمس ووستہ رحمانس پُندی کڑان۔ پیٚٹھ تمہِ طریقہ زِہ لس
اوس نہٕ واد کرنس دار روزان۔ اُمس نہٕ زانہہ تہٕ لسں تمہِ لگِتھ کینہہ
ونان۔ پرٕنیتھ ساعتہ درگہٕ۔ گراہ شریٚس کنٕ، گراہ مسافرس کنٕ، گراہ پوٚنس
کنٕ تہٕ گراہ کوہ کرس کنٕ، البتہ اوسُس نہ ووستہ رحمانس کینہہ تہٕ دنٕ تگان
سمان اوسُس آمس منز زِہ وُنس۔ یتے بچارٕی ژٕھ کتھ چھک میٚہ
میراث در تیرِ ژانان۔ یو نے نیچوٚن کھاندر کرِ ہا، ژِہ کتہٕ گچھک
یتھ گرس منز۔ سہ اُمس پرٕنیتھ ساعتہ پنٕنہ کنہ نوشہ فکرہ تاران زِہ یہ
اوسُس نہٕ بڈہ دوہ ہتے۔ یو اوسُس اکہ دفتہ جوان تہٕ۔ پون ضانہٕ داد
سچھہٕ میٚہ خوٚنہ سیتو ردچھت۔ ژوٚد ہاژھ جاگہٕ پر نوومت تہٕ پتہ پیٚنس
کارس وگت۔ تس تربیت دِژمژ تہٕ بنچھہ نوومت —— گرہ نوشہ تہٕنزہ
زنیہ یِم کتھ فیکری تران آسہِ یا فکرہ ترٕاتھ بھاٗئی آسہِ۔ سہ اُمس تمہِ آیہٕ
کتھ کران زنتہ حضرتِ آدم سیندہ وقتہ پیٚٹھ ووستہ رحمان بڈتے
اوس۔ تہ ہند نیچوٚ جوان تہٕ کاریگر اوس تہٕ دُنیاہ یِتھوی اوسُس یِتھ ازہ
وکینس چھہٕ۔ ووستہ رحمانس اُمس اُہندہ امہ ڈل کاد لاگنہٕ اُڈ جوٚ
ہنز وس تام دزان۔ گرد نہٕ ہس کیاہ۔ سہ اُسس نہ دُنس وارِی
تھاوان۔

گراز اوس ووستہ رحمان خوش۔ از اُمس نہٕ تہٕنز نوشہ دولہ
دولہ کتھ کران۔ تمہِ اوس پانہٕ چراُسو دِچھت۔ تمہِ اوس پانہٕ پوٚزمُت

نہ دوست رحمانس واتہٕ نگاہ جیب دروازس تل۔ تسلی اوس دِماغس کتھہٕ تام پوٚت وٲنس منز اندرٕ وان یِوان۔ دوست رحمانس کیاہ نہٕ لگ چلے جانہٕ۔

دوست رحمان کھوٚت واپس کُٹھس منز تہٕ نوشہ کوٚر نگاہ کرِتھ دراو وٲتھ۔ "یتھ دستارس تہٕ پیزرس ہۍ گنٛاے ییہ یا کڈتھ" دِتھو یہ نگاہ کامہ چیکھ کٔمیت۔

اتھ اوس نہٕ نوشہ تہٕنزِ کانہہ چارہ۔ سو وُچھس۔ "اَدہ تعاوتہ بنہٕ تا چلن۔ وُنہٕ ہے پیٚت دوہ باقی چھُ۔ کینہہ چھا ونہہ۔"

دوست رحمانن اوس از داریاپہ کاٗلڈھکہ کوٚرمُت تہٕ اتھ ٹھکس اوس وینہ تہٕ تنہٕ تعمیل آمُت کرنہٕ۔ سہ گوٚو خوش تہٕ پھوٗلِتھ دوہٕ ودتھ نوشہ کُن — "چاے چھا بی تیار؟"

یہ اوس وِگرک موقعہ۔ دوست رحمانن وُچھ نوشہ بروٗنٛہہ کنہ چاپہ سماوارس ٹھکرو نیران۔ مگر تو تہٕ ووٚنُن یتھ زن تہٕنزِ نوشہ شنلیج زینہ وِزِ لگہِ۔ "چاے چھا بی تیار؟" "اَدہ تیار چھے،" دوست رحمان بیوٚٹھ۔

داریاہ کالس وۄن دوست رحمانن از گوڈنچ لٹہٕ نوشہ — "یمہ نہ بی گیہٕ نہٕ کامہ یہٕ خان بہودُر ہیوٚ شخص میہ ژھانڈُن۔ یہ گیہٕ نہٕ کھنہٕ کتھہٕ۔ پانہٕ اوسُم جرنیل شیرخان تموک بھران تہٕ ونان "دوستا لیہ تموک چھیو۔" کتہٕ چھے از ہش موج زِندہ ودتھ ہی۔ چِزی پٲٹھو اوس از دوستہ رحمانس تس جنتی ہند پیران!

مگر دوست رحمانہٕ نوشہ اوس نہ کینہہ وَنِتھ ان۔ دماغس کس پوٚت ونس اوس تس بر زن نارٕ جیبہٕ ہندہٕ روبہ اُس سو یِم نارہ وگو تشوپہ اوان۔

شامس آو دوست رحمانن ژٔکہ دوست غفار تیری پہن گھرہ تموٗ وُچھو آشیتن نکس تل کیاہ تام چھلان — "گوڈہ یکھنا یوٗرِی۔" تموٗ وقتن آشنہٕ تہٕ تمہ ترٲوی جیبرہ ہسندی پو نکسی تل تہٕ گوڈہ آیہ کتھہٕ بوزنہٕ — "ہمس گو چھانُن رحمانہٕ ما آسی آمُت، یوٗسو دیتس۔" "تِنہ کیاہ کری وُنکس؟" آشنہٕ پرُژھس۔ مگر خانہ داران

نمبر

یوٗزنس نہ کینہہ۔ سہ اوس اندرکن کُن ودان تہٕ کیاہ تام کھر کھر بوزان۔ نہٕ کٹس کران ہتھیارس ہیتو؟" تموٗ پرُژھ آشنہٕ یموٗ بیاکھ نہٕ شرٗ تو ما چھہ سیت کران۔

"یہ چھُ بب ہتھیار پھیراوان۔" آشنہ ووٚنس۔ دوست رحمان اوس اندرہ کنہٕ کُٹھس منز شوقہ سیتھ پنٛچ تیاری کران۔ تموٗ آسہ بیر کاٗنی پینڈ شودرِتھ واجرٕ، رندہ واٗلہٕتو۔ لیٚتر، توٗر، پھیرواد تہٕ بیٚی تہٕ کیاہ تام۔ تموٗ آسہ رندان تیغہٕ کجہرٕ تہٕ تمن اوس یتہ پینڈ چھشن دِتھ موکلیومُت۔ دوہ ذ اوس سہ لیٚترِ پھیرہ واد دِوان تہٕ اندرہ اندرہ سوچان — "بہر چھا ہم پنٛچ ذور رژ تہٕ یا پنہٕ مزدوٗرت۔ اتھ تہٕ پنہٕ پیٚشا دِنوی۔ یتھ یہ لیٚترِ میٚہ اتھ منز ترٲو، تتہ وُچھ کیاہ چھس بنیومُت۔ اُتھو چھہ اصل مصالح!"

دوست رحمان اوس مشغول زہ اوٚرِ تہٕ اسہ نیچو نزن حیرانی ہندس عالمس منز۔ "تہٕ کتھہٕ سا کُن لگمُت؟" دوست رحمانہٕ نوشہ اُس خانہ دارس پُتو کنہٕ دوہدنی۔

"کینہہ نا۔" دوست رحمانن کوڈ کمبرس واش ہیوٚ تہٕ ووٚنُن — "یہ اوسُم اُمی خان بہادُرن بچارِی پنُن چپراسی ———"

دوست رحمانہٕ نیچوی تژوو تعدیہ اسن کھنگالہٕ۔ دوست رحمان گوو کیٚتھہ تام۔ دوست رحمانہٕ نوشہ ہندس از دوہ الاوس نزتہ ژوٗدہ راٹھ پنٛیہ تہٕ نار شہلیود۔

"ہا سہ کوٚت سا لوٚگ؟" دوست رحمانہٕ ژٔکن وۄن کرمیان تس اوس میہ دوٚہمت کٲر چھانُن رحمانہٕ — تہٕ کتھہٕ لگہ ہک تتہٕ —— خیر ——"

"یہ کیاہ گوو یہ کتھہٕ لگہِ ہا تتہٕ ————" دوست رحمانن پرُژھ نیچوین گریبانس ٹھپ دِتھ تہٕ کیاہ گوو یہ کتھہٕ لگہِ ہا تتہٕ ——

"تمن اوس موموٗلی لونڈہٕ اکھ مزدوٗرت۔ دوست رحمانس اوس نیچوٗ فکرہ تاران —— "تس تتہٕ مزدورہ لگہِ ہا —— چھنہٕ تمیک تہٕ مزدوٗرت میہ کوٚر دوٚنو تتہٕ پلنے۔"

"مگر تموٗ ہے وقتن جیب ——" دوست رحمانس کھوٚت کیتام۔ (بقیہ صفحہ ...)

غلام محمد مشتاق

غزل

نارہ برٚیہٕ ہِشں وُزٕھ لہرٕ کٔژ چانٕہ بُتھِہ پیٚٹھِہ آسمان
آیہٕ چھیہ شفقس تِمَے، سو چھےَ پیٚٹھ کوہن ڈُلہٕ گٔژ دِوان

سٕنح چھےُ مُشکل نظرِہ ہُند، اتھ سُمہٕ ترٕن تارس اپور
خامُشی منزٕ یوسہٕ چھےُ منز چانِس سِیہٕ مستس یِران

چھم پیٚوان لِچھ بدٕی کُنِس جانس، چھےُ ہأرِتھ لوٚت ہیٚوان
چانہِ اسہٕ نیٚج دُدٕہس، غمن چھنہٕ یتھ دِلس اژنے دِوان

چھنہٕ یہٕ کانہہ تعجب، مُیٚس کٕٹھ کُشِں لگُن، مُہلک زہُن
تھوَ ہناہ بوٚن کُنَ نظر، ووٚنی آسہٕ یالِن رٔیہہ دوٚتھان

گوٚژھنہٕ امہٕ سیٚتو بانبرٕن، ژٕسے بانبرٕ ووتھن عالماہ
عشقہٕ مژرٕس منزٕ یہٕ آسی ژھالے میأنی گتھ کران

زوٗنٕہِ لیٚس مشہ وُن یہٕ کرٕ نہٕ ہیٚنیاراہ چھےُ پیٚٹھ روشن بُتھِس
بالہٕ یارو، میانہِ جِگرک چھےُ می یہٕ اندرِیمُ سِر ونان

توٚتہٕ کیاہ یِدوٚسے لغاوتھ ییٚنہٕ بیٚترٕن غزلس اندر
پوشتن مشتاق خوٗن دِلہِ چھےُ غزلس چھڑن دِوان

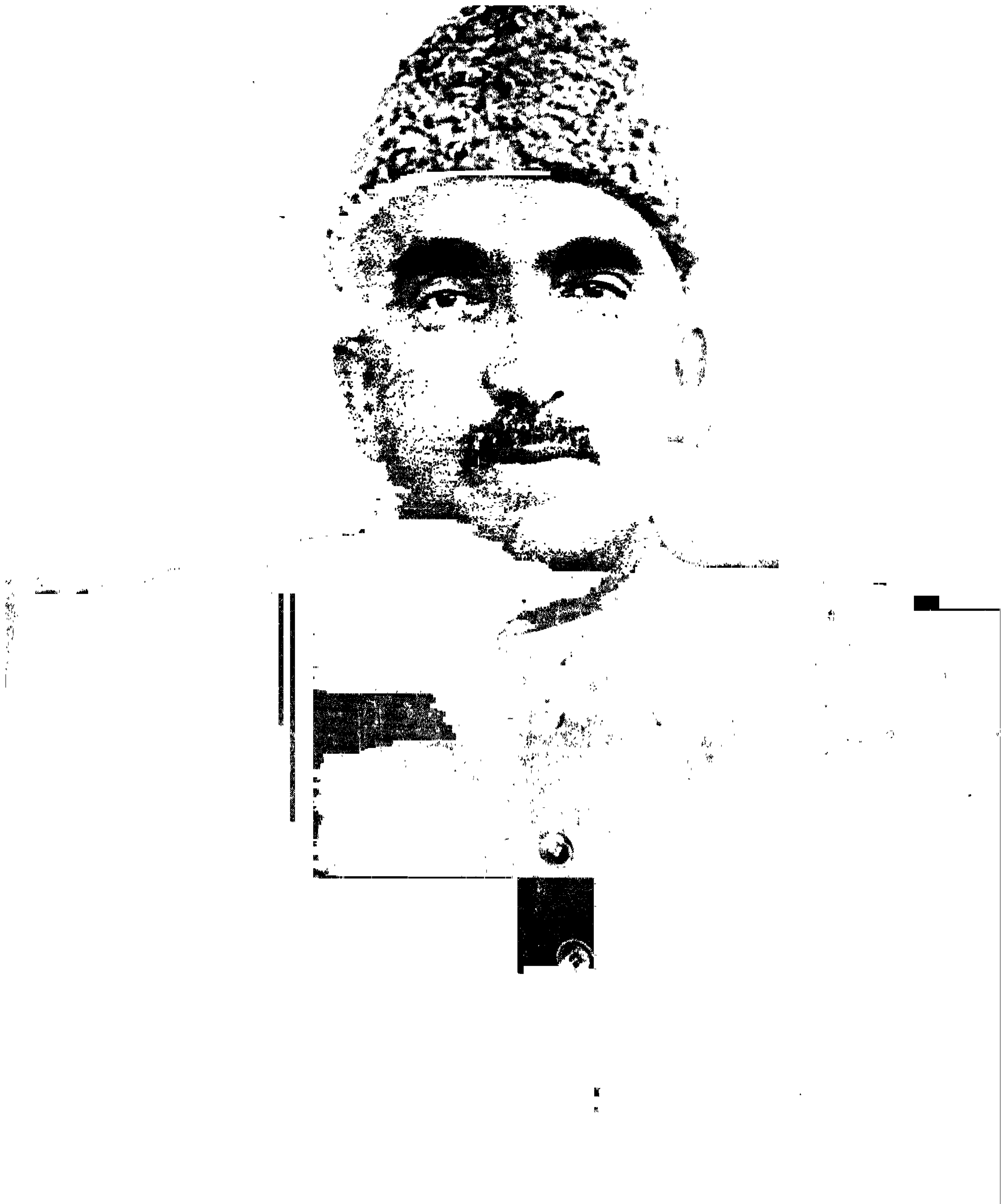
جرمنی ۱۹۶۲ء

خالدِ کشیر سون

عید مُبارک شوڈ ذاتن — ییتہ وزیراہ اسہ کن
تارکن منز ماہِ تابان — خالدِ کشیر سون
دِل شکستن سیمہ لادان — خالدِ کشیر سون
وکہ زدن چھوی نکمہ تھاوان — خالدِ کشیر سون
بوچھہ ہتین کھیاوان تہ چاوان — مُفلسن اتھہ روٹ کران
مناہِ گامتین سایہِ تراوان — خالدِ کشیر سون
لیس یوان دربارِ عالی — کرچھہ خالی سوی گژھان
بے کارن کار داوان — خالدِ کشیر سون
گمرہن سینز وتہ چھہ ہاوان — منگہ ونین پنیٹھ زرفشان
شونگتین چھوسی وزہ نادان — خالدِ کشیر سون
چھنہ ونکین بے کارا ہ — آن پیرہ ملکس اندر
ماسے سارین تاگراوان — خالدِ کشیر سون
دھرم سالن، مندرن تہ — مسجدن پنیٹھ یژہ بران
یژہ پژھرسان لول بران — خالدِ کشیر سون
سون وطن ازگاہ چھہ تراوان — مندہ سپان چھوی رضوان
باغِ ارمس داغ تھاوان — خالدِ کشیر سون
بے وسیلن دادی بوزان — سادہ نی پنیٹھ مہربان
خوانِ نعمت تاگراوان — خالدِ کشیر سون
روز و شب مشغول روزِتھ — پننہِ وطنک سنز کران
غربتک بیول گالہ نادان — خالدِ کشیر سون
شاعرن ہند چھوی شہنشاہ — ماہرن ہند ووستاد
طائرن چھوی بولناوان — خالدِ کشیر سون
کاوز چھس ڈآلِ سودان — مولہِ افسانہ خالی مال
تالی لاگیتھ یژہ تراوان — خالدِ کشیر سون



عوام کا محبوب عوام کے جھرمٹ میں ۔







جمہوریہ ہند کے نئے صدر ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن



نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین

ماہنامہ **تعمیر** سرینگر

اگست ستمبر ۱۹۶۲ء
(شمارۂ خصوصی)

جلد ۷ ——————— شمارہ ۴

جنرل ایڈیٹر
جے، این زتشی
ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

ایڈیٹر
ایس، ایم انصاری

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
ایس، ایم انصاری ایڈیٹر "تعمیر" سرینگر (کشمیر)

سرورق
مسرت
عمل: ——— موہن رینہ

ترتیب

چند باتیں

آزادیٔ ہند کی پندرہویں سالگرہ ملک کے اکناف و اطراف میں بڑے جوش و خروش سے منائی گئی۔ رہنمایانِ قوم اور عوام نے ایک بار پھر ملک کی آزادی اور سالمیت کو برقرار رکھنے کا عہد کیا۔ گو ان بیتے ہوئے پندرہ طویل برسوں کے دوران ہمیں بہت ساری مشکلات اور کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، لیکن ہمارے عزائم میں کوئی لغزش نہ آنے پائی۔ نتیجہ کے طور پر ہمارا ملک بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہمارا ملک بھی دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی بامِ عروج پر پہنچنے کے لئے ہمیں کئی اور مشکلات اور آزمائشوں سے گذرنا ہے جس کے لئے ہمیں ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ ویسے تو جہاں تک ہمارے عزائم کی گرم جوشی، جذبات کی ہم آہنگی اور ہماری کامرانیوں کی روایات کا تعلق ہے وہ ہمیں اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ ہمارا معاشرہ بہت جلد ایک سوشلسٹ طرز کے معاشرے میں تبدیل ہو جائے گا اور اس طرح وطن کے اُن پاک شہیدوں کا لہو رنگ لائے گا جنہوں نے آزادی کی خاطر اپنی عزیز جانیں بھینٹ چڑھا دیں۔

معمول کے مطابق اس سال بھی کشمیر میں جشن منایا گیا۔ یُوں تو یہ جشن کئی سال سے ہمارے لئے ایک ثقافتی روایت اور ہمارے کلچر کا ایک حسین جُز بن چکا ہے لیکن اس سال کا جشن ہمارے لئے کچھ زیادہ ہی مسرت کا باعث بنا۔ ابکے اس جشن کو بڑے موزوں اور مناسب وقت پر عنوانِ آغاز ملا۔ ملک کی آزادی کی پندرہویں سالگرہ کے ساتھ ہی جشن کی یک ماہی تقریبات بھی شروع ہوئیں اور وادی کے طول و عرض میں رنگا رنگ پروگراموں کا ایک سدابہار چمن کھل گیا۔ جس کے خوبصورت ماحول میں عوام اس طرح جذب رہے جیسے پھولوں میں خوشبو اور رنگ۔ کہیں رقص و سرود کی دل فریب محفلیں منعقد ہوئیں، کہیں موسیقی کے پروگرام سماعت نواز رہے۔ اُردو، کشمیری، پنجابی اور ڈوگری زبانوں میں مقامی اور ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔ غرضیکہ اس مہینے وادی کی طرب انگیز فضاؤں میں تہذیبی سرگرمیوں، ثقافتی عشوہ آرائیوں اور تمدنی نغمہ پردازیوں کی ایک دُھوم سی مچی ہوئی تھی۔ جس طرف بھی نگاہ اُٹھتی تھی، فردوس ہی فردوس نظاروں کے سامنے تھے۔ تمدنی احیاء کے اس عظیم کارنامے کے لئے عزت مآب بخشی غلام محمد کی ذاتِ گرامی یقیناً مبارک باد کی مستحق ہے۔ اب یہ بات ایک امرِ مسلّمہ بن چکی ہے کہ جس تمدنی تقریب میں بخشی صاحب موجود نہ ہوں وہاں ایک خلا سا محسوس کیا جاتا ہے۔

"تعمیر" کے پڑھنے والوں کو شاید یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب یہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے گا اور اس سلسلے میں جن دشواریوں کا ہمیں سامنا تھا اُن پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی "تعمیر" کا حجم کم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی باقاعدہ اشاعت ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ قارئین سے یہ بات بھی چھپی نہ رہے کہ کاغذ کی موجودہ نایابی اور گرانی کے پیش نظر آئندہ "تعمیر" بجائے وہائٹ پرنٹ پر چھپنے کے نیوز پرنٹ پر چھپا کرے گا۔ "تعمیر" کا یہ شمارہ چونکہ ایک خصوصی شمارہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس لئے اس میں کشمیری حصہ کے لئے آٹھ صفحے وقف کئے گئے ہیں۔ آئندہ سے کشمیری حصہ کچھ کم ہی صفحوں پر مشتمل ہوگا۔ اُمید ہے کہ کشمیری ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہماری مجبوریوں کے پیش نظر اس اقدام کے لئے ہمیں معذور سمجھیں گے!

نازش پرتاپ گڈھی

ہم پائندہ باد

اے زمینِ ہند! اے ہیر اور رانجھا کے دیار
تیرے ہی آغوش کے پالے ہیں اُلفت اور پیار

آج یہ مانا کہ ہے تیری فضا پر انتشار
آج یہ مانا کہ تو چند اُلجھنوں سے ہے دوچار

آج یہ مانا ترے بیٹوں میں ہے آپس میں پھوٹ
پڑ گیا ہے دل کے آئینوں پہ ہلکا سا غبار

آج بھی تو ہی مگر ہے امنِ عالم کا نقیب
تیرے ہی گلشن میں ہیں انسانیت کے برگ و بار

جلد ہو جائیں گے یک جا تیرے بیٹے، تیرے لال
غم نہ کر میرے وطن! اے خطۂ گردوں شکار

اے زمینِ ہند! اے چشمِ سراپا انتظار
سرفروشوں کی کمی اب بھی نہیں ہمت نہ ہار

اب بھی ہیں موجود معمارانِ تعمیرِ حیات
اب بھی تیری گود میں ہیں زندگی کے عشق کار

اب بھی سرگرمِ عمل ہیں تیرے محنت کش عوام
خونِ دل ارزاں کئے ہیں اب بھی تیرے جاں نثار

اب بھی ہے اُن انگلیوں کا حسن وہی دم خم وہی
کر چکی ہیں جو کبھی تاج و اجنتا کا سنگار

اب بھی ہے اپنے سینے میں وہ قوت اے وطن
تیرے ہر ذرّے کو کر جائے جو انجم در کنار

تازہ دم، تازہ قدم، تازہ نگاہ و تازہ کار
جادۂ ویراں پہ دیکھو آ گئے بڑھتے منزل سوار

تازگی کچھ اور بھی آئی ہرے شاخسار
آ گیا کچھ اور بھی کلیوں کے چہروں پر نکھار

تن گیا کچھ اور بھی ہر سرو کا قدِ دراز
بڑھ گئی کچھ اور بھی سنبل کی زلفِ تابدار

روشنی کچھ اور بھی نرگس کی آنکھوں کو ملی
ہو گئی کچھ اور عشرت خیز سیمائے بہار

دل میں تعمیرِ وطن کا عزمِ مستحکم لئے
قافلہ ایثار رواں ہے با مذاقِ کامگار

بیٹھ جائے گا فضائے فلک پر چھایا غبار
صورتِ گیسو سنور جائے گی اِک اِک رہگذار

پھوٹ نکلیں گے شگوفے، جاگ اُٹھیں گے برگ و بار
گونج اُٹھے گا چار جانب نغمۂ صوتِ ہزار

اپنے گلشن کو سنواریں گے کچھ اس انداز سے
خلد کے جلوے بھی جس کے سامنے ہوں شرمسار

جمع کر دیں گے مہ و خورشید، کہکشاں، رعنائیاں
مادرِ گیتی کے سینے پر قطار اندر قطار

اے زمینِ ہند آنے ہی کو ہیں وہ دن کہ جب
رشک سے تاکا کرے گی تجھ کو چشمِ روزگار

جلوہ گر ہے قوتِ تخلیقِ آدم، زندہ باد!
اے وطن تو شاد و خوش باش او ہم پائندہ باد

جناب بخشی غلام محمد
(وزیر اعظم جموں و کشمیر)

تیز تر گامزن...

کشمیر جو ملک کے دوسرے حصوں کے شانہ بشانہ پچھلے کئی برسوں سے منصوبہ بند ترقی کے ایک عظیم دور سے گذر رہا ہے، آج ہندوستان کے نقشے پر ایک نئی آن و شان سے اُبھر رہا ہے۔ جدھر بھی نگاہ اُٹھاؤ پرانے نظام کے رہے سہے نشان تیزی سے مٹتے نظر آرہے ہیں اور عوام پورے عزم اور لگن سے ترقی کی نئی وسعتوں کی جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ قومی زندگی کا کوئی بھی شعبہ لیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ دھیرے دھیرے ایک زبردست انقلاب آرہا ہے جو نئی زندگی کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں کا پیامبر ہے۔

وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے یوم آزادی کے موقعہ پر جاری کئے ہوئے اپنے اس مضمون میں ریاست میں بپا اس خاموش انقلاب کی چند حقیقتیں بیان کی ہیں۔ جن کا تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آج جموں و کشمیر کے باشندے آزاد ہیں اور وہ پوری قوت اور جوش سے اپنی قسمت سنوارنے کے عظیم کام میں مصروف ہیں۔ لہٰذا اب دُنیا کی کوئی بھی طاقت ان کی آزادی اور خوشحالی کو چھیننے کی جرأت نہیں کر سکتی ہے:

"آج ہمارا ملک آزادی کے پندرہویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ ہمارے کروڑوں ہم وطن ان بیتے برسوں میں قومی تعمیر نو اور زبردست جدوجہد کے بعد حاصل کی ہوئی آزادی کے استحکام و تحفظ کے عظیم کام میں برابر لگے رہے۔

آزادی کا ایک ایک برس گذرنے کے ساتھ ساتھ ہماری نئی قوم اقتصادی اور سماجی ترقی کے مختلف شعبوں میں اپنے قدم تیزی سے
تعمیر

آگے بڑھاتی رہی اور آج بھی منصوبہ بندی کے ذریعہ خود کفیل معیشت کی منزل پا لینے کے لئے ٹھوس اور جاندار کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ اب تک دو پانچ سالہ منصوبے پورے کئے جا چکے ہیں اور آج ہم تیسرے پلان کے دوسرے برس میں گذر رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہماری معیشت کے مختلف شعبوں میں ہمہ گیر ترقی کے آثار بخوبی نظر آتے ہیں۔ ملک کی زرعی پیداوار ۴۰ فیصد تک بڑھ گئی ہے اور قومی آمدن میں ۴۲ فیصدی سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت ہمارے دیہات میں جہاں ملک کی اصلی آبادی بود و باش رکھتی ہے، سرعت سے ایک خاموش انقلاب آ رہا ہے۔ اب تک اس تحریک کے دائرے میں ۴ لاکھ سے زیادہ گاؤں آ چکے ہیں۔ اور اس طرح اس پروگرام سے ہماری نصف سے زیادہ دیہاتی آبادی مستفید ہو رہی ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں ہم نے کئی ایسے کارنامے بھی انجام دئے ہیں جو قومی ترقی کی راہ میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن پر قوم کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ ان میں بجلی تیار کرنے کے مختلف منصوبے، بھیلائی، رورکیلا اور درگاپور کے فولاد تیار کرنے والے کارخانے، آواز کی رفتار سے تیز چلنے والے جٹ ہوائی جہازوں کی تیاری، بنگلور کا مشینی آلے بنانے والا کارخانہ، بھوپال کی بجلی کا سامان بنانے والی فیکٹری اور سماجی بہبود سے تعلق رکھنے والی دوسری کئی بڑی بڑی اسکیمیں شامل ہیں جن کے طفیل ہماری قوم کی معاشی زندگی کی کایا تیزی اور پورے زور سے پلٹ رہی ہے۔

ملک کے دوسرے حصوں کے دوش بدوش ریاست جموں و کشمیر بھی

معاشی اور سماجی شعبوں میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ریاست کی عوامی حکومت کی پالیسیوں کا بنیادی مقصد ابتدا سے یہ رہا ہے کہ یہاں کے عوام کی پھوٹی قسمت سنور پائے۔ کاشت کاروں کی زندگی کا معیار بڑھانے کے لئے کئی اقدام کئے گئے۔ انہیں جاگیردارانہ نظام کے خونین پنجے سے چھڑا دیا گیا۔ اس بارے میں جو پہلا قدم اُٹھایا گیا اُس کے تحت جاگیروں، معافیوں اور مقرریوں ایسے تمام استحصالی اداروں کا وجود ختم کر دیا گیا۔ بڑی زمینداریوں کے خاتمہ کے ایکٹ کے تحت یہ حد مقرر کر دی گئی کہ کوئی زمین دار اپنے پاس ۲۲½ ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رکھ سکتا ہے۔ کاشت کاروں میں ۲ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین تقسیم کی گئی۔ جس کے لئے اُن سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا گیا۔ ان زرعی اصلاحات کی بدولت تقریباً آٹھ لاکھ کاشت کاروں کو فائدہ پہنچا۔

کاشت کاروں کو مدد بہم پہنچانے کی غرض سے جو دوسرا قدم اُٹھایا گیا وہ صدیوں پُرانے قرضوں کی منسوخی سے تعلق رکھتا ہے۔ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو سُود خواروں کے چنگل سے چھٹکارا دِلانے کے لئے ۱۰ قرضہ مصالحتی بورڈ اور رہن کی ہوئی جائداد کی بحالی کے لئے ۴ عدالتیں قائم کی گئیں۔

فصل کاٹنے کے موقعہ پر کسانوں سے جبری طور پر غلہ وصول کرنے کے سلسلے کو جسے عرفِ عام میں مجوزہ کہا جاتا تھا، ختم کر دیا گیا۔ ان تدبیروں کے نتیجے میں محنت کش کاشت کاروں میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوا۔

باقی مُلک کی طرح ریاست میں اب تک دو پنج سالہ منصوبے مکمل کر لئے گئے ہیں اور اب تیسرے پلان پر کام شروع ہو چکا ہے۔ جہاں پہلے پلان پر ۱۵ر۱۲۷۴ لاکھ روپے خرچ کئے گئے وہاں دوسرے منصوبے پر ۰۷ر۳۳۹۲ لاکھ روپے کے مصارف برداشت کئے گئے اور اب تیسرے منصوبے پر ۷۵ کروڑ روپے خرچ آنے کا اندازہ ہے۔

ہمارے ترقیاتی منصوبوں کے بُنیادی آدرشوں کا مُدعا قومی آمدن میں بھرپور اضافہ کرنا، غذائی اجناس میں خود کفیل بننا، زرعی پیداوار بڑھانا، اپنے قدرتی وسائل کی بُنیاد پر برقی قوت اور صنعتوں کو ترقی دینا، روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم کرنا اور ریاست کی آمدن میں اضافے کے فوائد کو مساوی طور پر تقسیم کرنا ہے۔

جموں و کشمیر میں بجلی پیدا کرنے کے کافی مواقع موجود ہیں۔ چنانچہ سدا بہنے والی ندی نالوں کی موجودگی میں برقی قوت میں اضافے کے بہت ہی امکانات ہیں۔ اسی طرح کوئلے اور لگنائٹ کے وسیع ذخیروں کو نکالنے سے نہ صرف ریاست بلکہ دوسرے ہمسایہ پردیشوں کی ضرورتیں بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہاں تھرمل پاور ہاؤس بھی تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ پہلے دو منصوبوں کے تحت بجلی کی پیداوار میں ۵۰۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ موجودہ پلان کے دوران بجلی تیار کرنے کے وسیلے اور بھی بڑھ جائیں گے۔ توقع ہے کہ جہلم کے ہائیڈل بجلی منصوبہ کی بدولت ۱۲،۰۰۰ کلوواٹ برقی قوت پیدا ہوگی۔ اندازہ ہے کہ اس سکیم پر ۲۸۰ لاکھ روپے خرچ آئیں گے۔ کالاکوٹ کے کوئلہ کی کان کے نزدیک ایک تھرمل پاور ہاؤس بنانا بھی طے پایا ہے جو ۲۰،۰۰۰ کلوواٹ بجلی فراہم کرے گا۔ مہورہ پاور ہاؤس کی تعمیر کا کام جب پوری طرح مکمل ہو جائے گا تو یہ ۶۰،۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا کرے گا۔

صنعتی ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے لئے بھی سعی کی جا رہی ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ نجی سرمایہ کاروں کو ہر ممکن سہولتیں مہیا ہوں جن میں خام مواد اور مشینوں کی فراہمی، فنی مشورہ، بجلی اور مالی اعانت کی بہم رسانی شامل ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ریاست میں مختلف مقامات پر صنعتی بستیاں قائم کی گئی ہیں۔ ریاست میں صنعت کاروں کو ضروری سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے ایک صنعتی ترقیاتی بورڈ قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ صنعتوں کی آئندہ ترقی کے بارے میں حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک صنعتی مشاورتی بورڈ بھی بنایا گیا۔ ان دونوں اداروں میں ملک کے ممتاز صنعتی ماہرین کو شامل کر لیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں کئی نئے کارخانے کھل رہے ہیں۔ جموں میں سُوت کاتنے کی دو فیکٹریاں، چینی کے برتن بنانے والا ایک کارخانہ، پلائی وُڈ، سیمنٹ اور کاغذ تیار کرنے والی فیکٹریاں قائم کی جا رہی ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں آج سے کچھ عرصہ پیشتر ایک پلائی وُڈ فیکٹری نے پہلے ہی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

تیسرے پلان میں زراعت کو ترقی دینے کے لئے کافی رقمیں رکھی گئی ہیں۔ اب آبپاشی کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، کیمیائی کھاد کے استعمال اور کھیتی باڑی کے جدید طریقوں کو اپنانے کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ

زمینوں کو زیر کاشت لانے کے کافی امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے لئے ریاست کے چھ ترقیاتی بلاکوں میں پیکیج پروگرام پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔

ہماری ریاست کی جغرافیائی خصوصیات ہی کچھ اس قسم کی ہیں کہ یہاں کے دریا اور ندیاں سال بھر پانی سے بھرے رہنے کے باوجود یہاں آبپاشی کی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے اس بات پر غور کرنا لازم ہے کہ ہم کیسے اور کیونکر پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اب تک کئی تجربے کئے جا چکے ہیں۔ جموں میں پہلے ہی سال میں شالی کے دو فصل اگانے کا تجربہ کیا گیا ہے جو بہت حد تک کامیاب رہا۔

ریاست میں سیلابوں کی پیش بندی کے لئے ایک ماسٹر پلان پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ سماجی خدمتوں کا دائرہ بہت حد تک بڑھ گیا ہے۔ گذشتہ کئی برسوں میں ہمارے تعلیمی اداروں کی تعداد میں ۲۰۰ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم پر اب سالانہ تین کروڑ روپیہ خرچ کئے جا رہے ہیں۔ ٹیکنیکل تعلیم کے پھیلاؤ پر بھی خصوصی زور دیا جا رہا ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ تیسرے منصوبے میں ہر گاؤں میں ایک اسکول جاری کیا جائے۔

پچھلے برسوں میں یہاں کئی ایسے ادارے جاری کئے جا چکے ہیں جہاں فنی تعلیم کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان اداروں میں وادی کشمیر کا میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، سوپور اور کٹھوعہ کے دو زراعتی کالج، سرینگر اور جموں کے دو پالی ٹیکنیک، یونانی اور آیورویدک کالج اور ایک درجن سے زیادہ ایسے ہی دوسرے انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔

صحت عامہ کے میدان میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ شفاخانوں میں بستروں کی تعداد ۳۰۰ گنی سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تیسرے پلان میں عام باشندوں کو موزوں و مناسب طبی امداد مہیا کرنے کے لئے ہر پٹوار حلقہ میں ایک ہسپتال اور ہر گاؤں میں ایک ڈسپنسری جاری کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

نظم و نسق کے ڈھانچے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا جا رہا ہے۔ تاکہ منصوبہ بندی کے نتیجے میں کاموں کے بڑھتے ہوئے حجم کو اور تیزی اور قابلیت سے انجام دیا جا سکے۔ حکومت نے حال ہی میں انتظامی طریق کار کو سدھارنے کی غرض سے کئی اہم فیصلے کئے ہیں۔ حکومت رشوت ستانی کا انسداد کرنے کے لئے ٹھوس کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے کئی زوردار قانون بنائے گئے ہیں۔

جلد ہی ایک کمیشن مقرر کیا جا رہا ہے جو زرعی اصلاحات اور پہلے زمین کاشت کاروں کے مسئلوں کے نتیجے میں پیدا شدہ عدم مطابقت کا بغور جائزہ لے گا۔ ایک اور کمیشن بھی بنایا گیا ہے جو ریاست میں مفت تعلیم کے اثرات کے بارے میں ایک تفصیلی سروے کرے گا۔ اور اس بات کی بھی سفارش کرے گا کہ نظام تعلیم کو کیسے اور کیونکر بہتر بنایا جائے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان اقدامات کی بدولت ہماری زرعی پالیسی اور تعلیمی پروگراموں کی خامیاں منظر عام پر آ جائیں گی، اور ہم ان کو سدھارنے میں کامیاب ہو جائیں گے!

بہر حال آج کے مقدس اور تاریخی دن پر، جب ہم اپنے ماضی و حال کے کارناموں اور مستقبل کے عزائم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں جہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہم منزل بہ منزل آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں وہاں آیندہ کاموں کے حجم کو دیکھ کر ہم پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمیں نئی زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں حاصل کرنے کے لئے اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے جس کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم پہلے سے اور زیادہ ہمت اور مستعدی سے کام کریں۔

واقعی تعمیر عکسِ محفلِ تعمیر ہے
اے شفا کہنا پڑا اس کی عروج دیکھ کر

آفتابِ اتحاد و امن کی تنویر ہے
جانِ ہندوستان ہے آئینۂ کشمیر ہے

—— شفا گوالیاری

سعادت نظیر

تمنّا

یہی ہے تمنائے پیر و جواں   چمک جائے تقدیرِ ہندوستاں
نئی ہو زمیں اور نیا آسماں

نئی زندگی ہو، زمانہ نیا   ہو گلشن میں ہر آشیانہ نیا
نیا ساز ہو اور ترانہ نیا

نکھر جائے تعلیم کا بانکپن !   بہارِ نظر ہو خرد کی پھبن
سنور جائے تہذیب کی انجمن

کمالِ مصوّر کی برنائیاں   دکھائیں انوکھی وہ نقاشیاں
"اجنتا" کی تازہ ہوں فن کاریاں

تمدّن محبت کی تصویر ہو   نئی زندگانی کی تعمیر ہو
فنونِ لطیفہ کی تفسیر ہ

کرامات بجلی کی ہوں نت نئی   منوّر ہو ہر شعبۂ زندگی
بہر سُو ہو سائنس کی روشنی

سحر ہو کر چھٹ جائیں تاریکیاں   کہیں نام کو ہوں نہ بیکاریاں
ٹپکتی ہوں چہروں سے رعنائیاں

چمن کھیت نہروں سے سیراب ہوں   پھلیں پھولیں سرسبز و شاداب ہوں
کسانوں کے پورے حسین خواب ہوں

مشینوں کی بجتی ہوں شہنائیاں !   ہوں صنعت کی ہر سمت گل کاریاں
تجارت کی ہوں گرم بازاریاں

نہ مظلوم ہوں اور نہ مجبور ہوں   مگن کارخانوں میں مزدور ہوں
ترقی کی راہوں پہ جمہور ہوں

دِیہاتوں میں پیدا ہو جوشِ عمل   معاشی مسائل کا ہو جائے حل
نکل جائے ادنیٰ و اعلیٰ کا بَل

چمن تو چمن دشت گلزار ہوں   نشیب و فراز ایسے ہموار ہوں
جو بیکار ہوں وہ بھی سرکار ہوں

جو ہیں شہر و دیہات میں شاد ہوں   سماجی بکھیڑوں سے آزاد ہوں
جو برباد گھر ہوں وہ آباد ہوں

ہر انساں فراغت سے کھائے پئے   خوشی سے جئے اور جینے بھی دے
مرے تو مرے ارتقا کے لئے

کسی کو نہ کچھ بھی ہو احساسِ غم   بدل جائیں عشرت سے رنج و الم
مئے خرمی سے بھرے جام ہم

خواجہ غلام محمد صادق

تعلیمی پسماندگی کا قلع قمع

ریاست جموں و کشمیر جو ماضی میں اقتصادی اور دیگر شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی پچھڑی ہوئی تھی، اب تیزی سے تعلیمی پس ماندگی کے دور سے نکل کر علم و دانش کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ آج ریاست میں تعلیم مفت اور عام ہے۔ جا بجا نئے اسکول اور کالج کھل رہے ہیں اور تعلیمی ڈھانچے کو معاشی تعمیر نو کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم نسواں کو بھی فروغ دینے کی جانب خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ان اقدامات کا نتیجہ جہاں یہ ہوا ہے کہ ہمارے یہاں خواندگی کی شرح ۲۰ فیصدی تک بڑھ گئی ہے اور طالبات کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہاں اب ہمارے یہاں اچھے لکھنے والوں کے علاوہ انجینئر، ڈاکٹر، ہنرمند کاریگر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ جو ریاست کی معاشی و سماجی ضرورتیں پوری کرنے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ تیسرے پلان میں جہاں تعلیمی ترقی کی اس رفتار کو تیز تر کیا جائے گا وہاں تعلیمی نظام کی ہیئت و ساخت کو بدلنے کے لئے بھی ٹھوس اقدامات کرنے کے نشانے طے کئے گئے ہیں۔ توقع ہے کہ ان تدابیر کے نتیجے کے طور پر ریاست آہستہ آہستہ تعلیم کے میدان میں اُن بلندیوں سے ہم کنار ہو جائے گی۔ جن کا خواب ہمارے عوام نے "نیا کشمیر" کے منصوبے میں آج سے مدتوں پہلے دیکھا ہے۔

ماضی میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح جو نظام یہاں جو تعلیمی نظام رائج تھا اُس میں ہماری معاشی سماجی اخلاقی اور تہذیبی خودی کی تعمیر کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ اس کے بیشتر نمونے اور خاکے مستعار اور اجنبی تھے۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ تعلیم ہمارے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکی۔ ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ تعلیم کا دائرہ محض چند اونچے اور امیر گھرانوں تک ہی محدود رہا۔ اور ہماری بیشتر آبادی صدیوں تک جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ہم اچھے لکھنے والے، انجینئروں، ڈاکٹروں، سائنس دانوں اور مفکروں کی بجائے کلرک پیدا کرتے رہے۔ حالانکہ للتادتیہ، بڈشاہ، کلہن، چرخ، للہ عارفہ کے وارث ہماری قوم دل اور نظر کی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر گہری نگاہ اور گداز دل کی یہ تہذیب کسی گمنیر تعلیمی روایت کے سلسلے میں ہی پروان چڑھ سکتی تھی۔ لیکن بُرا ہو مطلق العنانیت کا، جس نے رائج تعلیم میں ان روایات کو پنپنے نہیں دیا۔

بہرکیف ۱۹۴۷ء میں جب ہم آزاد ہوئے تو سب سے پہلے ہمیں جو فکر دامن گیر ہوئی وہ نظام تعلیم کے اساس و غایت کو بدلنے کا تھا۔ کیونکہ یہ تعلیم ہی ہے جس کی اساس پر قومی تعمیر کا محل کھڑا ہو سکتا ہے اور اسے ہماری قومی شخصیت اور کردار کی تفصیلات و جزئیات کے نقوش تیار ہو سکتے ہیں۔ لیکن بعض ناگزیر مشکلات کی وجہ سے ہم ۱۹۵۳ء تک اس میدان میں نمایاں پیش قدمی نہ کر سکے۔ لیکن پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کے دور میں سے گذرنے کے بعد ہم اپنی روایات اور ضروریات کے پیش نظر ایک نئے تعلیمی لائحہ عمل کو ترتیب دینے میں سرگرم عمل ہوئے۔ چنانچہ ہم نے عالمی تعلیمی افکار کے تجربے اور اپنے مخصوص

سیاسی، معاشی اور تہذیبی احوال کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا کہ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ ایسی بُنیادوں پر اُستوار ہو۔ جس سے ہماری نسلِ آیندہ میں وہ سارے اوصاف جمع ہو جائیں جو ایک شعور، زندہ اور باجُرأت قوم کی لازمی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے، جو آیندہ ہماری قومی نیا کے ناخدا ہوں گے، جسمانی و ذہنی اعتبار سے توانا اور صحت مند ہوں۔ اور وہ اپنے یہاں ایک ایسا اشتراکی معاشرہ قائم کرنے میں بھرپور حصہ ادا کرسکیں۔ جس کی حدیں جغرافیہ نے نہیں بلکہ انسانیت نے قائم کی ہوں اور جو مادّیات اور رُوحانیات میں مُناسب پیوند اور خوش گوار توازن قائم کرکے خاص کی بجائے عام، قومیت کی جگہ بین الاقوامیت اور بُزدلی کی بجائے بہادُری کی طرف مائل ہوں۔ اور جو سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم سے شناسا ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے مالامال ہوں۔

اس نظریہ کے تحت ہم نے ریاست میں معاشی تعمیرِ نَو کی راہیں اُستوار کرنے کے فوراً بعد اس امر کی جانب خصوصی توجہ دی کہ شہروں اور قصبوں میں رہنے والی آبادی کے ساتھ ہی ساتھ دُور اُفتادہ علاقوں میں رہنے والے عوام کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی نیت سے مُلک کے اس حصے میں ابتدائی جماعت سے ایم اے تک تعلیم مُفت اور عام کر دی گئی۔ اس طرح سرزمین جموں کشمیر کا گوشہ گوشہ تعلیم کی روشنی سے جگمگ جگمگ چمک اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے یہاں ہر شخص پر تعلیم کے دروازے وا ہوئے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں ریاستی عوام کی اقتصادی و سماجی ترقی کے دوش بدوش ان کے تعلیمی و تمدّنی ارتقا کے لئے خصوصی کوششیں کرنے کا سوال ہر وقت اور ہر لمحہ ہمارے سامنے رہا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے آج سے بہت پہلے "نیا کشمیر" میں درج تعلیمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمہ گیر کوششیں شروع کر دیں اور تب سے ہم آج تک پُوری استقامت کے ساتھ حسبِ ذیل مقاصد کو پُورا کرنے کے لئے مصروفِ عمل رہے ہیں:

- سکول جانے کی عمر رکھنے والے بچوں اور بچیوں کو تعلیم دِلانا
- [illegible] علاقائی [illegible] ڈگری کالجوں میں بدل دینا اور ان تعلیمی اداروں کے لئے ازشاوسا [illegible] کے تربیت یافتہ عملہ کا بندوبست کرنا۔ نیز ان اداروں میں کثیر پہلو طریقِ تعلیم کو مروّج کرنا تاکہ ان دانش گاہوں سے پڑھ کر نکلنے والے طلبا ہماری معیشت کی ضروریات پوری کر سکیں۔
- فنّی تعلیم کی ترویج
- یونیورسٹی تعلیم کی ترقی، نوسرِ نے تعلیمی نصاب کا اجرا اور کالجوں میں مروّجہ تعلی[illegible] کی بجائے [illegible] سالہ ڈگری کورس جاری کرنا
- ارزاں و موزوں درسی [illegible] کی فراہمی
- خواتین خصوصاً دیہاتی [illegible] میں رہنے والی آبادی کو تعلیم دِلانے کے لئے خصوصی انتظا[illegible] کرنا
- پس ماندہ علاقوا[illegible] تعلیم کو فروغ دینے کے لئے طلبا کو معقول وظیفے دینا اور د[illegible] تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا
- طلبا کی صحت کی [illegible]اشت
- جسمانی کھیلوا[illegible]نی سرگرمیوں، سکاؤٹنگ اور دوسری سرگرمیوں کی ترقی
- پرائیویٹ [illegible] اداروں کو ضروری امداد دینا
- ڈراما[illegible] اور فنونِ لطیفہ میں طلبا کی دلچسپی بڑھا[illegible] کے [illegible] قدم اُٹھانا
- [illegible]بقہ کو موزوں معاشی اور دوسری سہولتیں مہیا کرنا [illegible] [illegible] اور گھریلو ماحول میں ہم آہنگی پیدا ہو کر نوجوانوں [illegible] ترقی ہو سکے۔

[illegible] سے تعلیمی پستی اور تہذیبی پس ماندگی کو دُور کرنے کی خاطر ہم گ[illegible] کئی برسوں سے ان مسائل سے مُستعدی اور تن دہی سے [illegible] پٹے آئے ہیں۔ [illegible]نانچہ پچھلے دس برسوں میں تعلیمی ترقی کی رفتار [illegible] کرنے کے لئے متعدد اسکیموں کو کامیابی سے تکمیل تک پہنچایا گیا۔ [illegible] کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں خواندہ لوگوں کی تعداد [illegible] [illegible] پہنچ گئی اور اس طرح شرحِ خواندگی ۷ فی صدی سے بڑھ کر [illegible] فی صدی تک پہنچ گئی۔ تعلیمی اداروں کی تعداد میں [illegible] [illegible] ۱۹۴۷ء

زیادہ اضافہ ہوا۔ تعلیمی بجٹ تین سَو گنا تک بڑھ گئی۔ قومی زندگی کے اس شعبے پر جہاں ۱۹۴۷ء میں صرف ۴۹ء۲۳ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے ہیں وہاں سال رواں میں تعلیم کے پھیلاؤ پر ۳ کروڑ روپے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی ڈھانچہ کو زمانہ کے جدید تقاضوں کے مطابق صنعتی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نیا تعلیمی نصاب تیار کیا جا رہا ہے۔ تعلیم کے اداروں کو توسیع دینے کا ایک مفصل پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔ چنانچہ تعلیم کے اُجالے کو ریاست کے تمام شہروں اور قصبوں اور دیہاتوں کے ہر گھر تک پہنچانے کے لئے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ تیسرے پلان کے خاتمہ پر ہر گاؤں میں ایک اسکول ہو۔ تاکہ آئین کے ہدایتی اصولوں کے مطابق آئندہ دس برسوں میں سکول جانے کی عمر رکھنے والے تمام بچوں کے لئے تعلیم پانے کے انتظامات مکمل ہو پائیں۔

پچھلے دس برسوں میں ہماری سرکار نے جو تعلیمی منصوبے مرتب کئے ان کا بنیادی مقصد یہی رہا ہے کہ ہم اپنے یہاں نونہالوں کی اُبھرتی ہوئی شخصیت کو آہستہ آہستہ اس طرح سے تعمیر کریں کہ ان کی ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک ساتھ ترقی کرنے اور نمو حاصل کرنے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے پہلے منصوبے میں ۰۲ء۶۶ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ دوسرے پلان میں ۸۹ء۱۱۰ روپے کے مصارف برداشت کئے گئے اور اب تیسرے منصوبے میں اس غرض کے لئے ۸ء۱۳۴ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

تعلیمی توسیع کے لئے اب تک جن منصوبوں پر عمل درآمد کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں ہمارے یہاں تعلیمی اداروں کی تعداد میں سَو گنا سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے منصوبے میں جہاں ریاست کے اطراف و اکناف میں ۵ کالج۔ ۳۰ پوسٹ میٹریکولیشن اسکول ۲۸ ہائر سکنڈری سکول ۸۴ مڈل اسکول ۷۶ سنٹرل اسکول ۹۵ پرائمری اسکول اور ۰۰۰ مکتب و پاٹھ شالائیں جاری کی گئیں وہاں دوسرے پلان میں کالجوں کی تعداد ۱۳، ہائر سکنڈری اسکولوں کی ۱۶۰، مڈل اسکولوں کی ۵۸۳ پرائمری اسکولوں کی ۲۵۰۵ اور مڈل پوسٹ میٹرک ٹریننگ اسکول کی ۳۰ تک پہنچ گئی۔ اس تعلیمی پھیلاؤ کا براہ راست اثر یہ ہوا کہ پچھلے دس برسوں میں طلبا کی تعداد میں ۲،۶۷،۵۸۶ کا اضافہ ہوا۔ اور طالبات کی تعداد ۴۴،۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ تیسرے پلان میں تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے جو لکشیہ تاکے گئے ہیں ان میں ہر گاؤں میں ایک اسکول کا جاری ہونا نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

کُل ہند سکنڈری ایجوکیشن کمیشن کی سفارشوں کی روشنی میں یہاں بھی تعلیمی ڈھانچے کی ہیئت و ساخت کو بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم کے نظام کو نئے سرے سے منظم کیا گیا ہے۔ پرائمری تعلیم کے لئے ایک نیا نصاب مرتب کیا جا رہا ہے۔ ایلیمنٹری بیسک اور سنٹرل اسکول کے ساتھ ساتھ سکنڈری ہائر اسکولوں کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کالجوں میں تین سالہ ڈگری کورس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں طلبا کو مروّجہ تعلیم کے علاوہ مختلف پیشوں مثلاً لوہاری، نجاری، بُنائی، موٹر میکنزم، بجلی کا سامان تیار کرنے، ٹائپ رائٹنگ، کامرس، زراعت اور گھریلو دست کاریوں میں تربیت دی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان اسکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے طالب علم صرف سرکاری نوکریوں کی تلاش میں سرگرداں نہ پھرتے رہیں بلکہ وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل ہو سکیں۔

تعلیمی ڈھانچے کو فنی بنیادوں پر استوار کرنے کی جانب بھی خاص دھیان دیا جا رہا ہے تاکہ ہمارے اچھے لکھنے والوں کے ساتھ ہی ساتھ ریاست میں اشتراکی نظام تعمیر کرنے کے لئے انجینئر، ڈاکٹر اور ہنرمند کاریگر بھی تیار کئے جا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ریاست میں اب تک ایک انجینئر کالج، ایک میڈیکل کالج، ایک طبیہ کالج، ایک آیورویدک کالج، دو زراعتی کالج، دو پالی ٹیکنیک، اور ایک درجن سے زیادہ دوسرے چھوٹے پیمانے کے فنی ادارے قائم کئے جا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آج تک تقریباً ۳۰۰ طلبا کو مختلف مضامین میں اعلیٰ تربیت پانے کے لئے باہر بھیجا گیا اور انہیں ۵ لاکھ روپے کی امداد اور قرضے مہیا کئے گئے۔ اُمید ہے کہ موجودہ سال میں ایسے طلبا کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔

ہماری ریاست تعلیم کے قومی نظام کے شعبے میں بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ تعلیم کو مفت اور عام کرنے سے جہاں جہالت کی تاریکیاں چھٹتی جا رہی ہیں وہاں نئے تعلیمی نظام کے کثیر المقاصد

وگرام کے تحت یہاں نئی تبدیلیاں ظہور میں آرہی ہیں۔ اس پروگرام کے تحت آئندہ جو اقدامات اُٹھانے مطلوب ہیں اُن میں ایکیوٹی بیسک سکول، پرائمری اسکولوں کو بیسک اسکولوں میں بدل دینے کے عمل کو وسیع پیمانے پر جاری رکھنا، ہائی اسکولوں کو اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں بدل دینے، پوسٹ میٹرک اسکولوں کو جاری کرنے کے سلسلے کو تیز کرنا، ریاست کے تمام حصوں میں گشتی سماعتی و بصری مراکز قائم کرنا، سیکنڈری ہائر سکولوں اور کالجوں میں مزید موزوں عملہ تعینات کرکے ان اسکولوں اور کالجوں کی کارکردگی بڑھانا، نگرانی کے انتظامات کو بہتر بنانا، ہر ضلع میں لائبریریاں قائم کرنا، طلبا میں سماجی بہبود اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینا اور اسکولوں اور کالجوں کے لئے عمارتیں بنانا اور ٹیکنیکل اداروں کو قائم کرنا شامل ہیں۔

ہماری ریاست نے تعلیم نسواں کے میدان میں بھی کئی قدم آگے بڑھائے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں میں زنانہ تعلیم کے اداروں میں کافی توسیع ہوئی۔ جہاں ۴۸-۱۹۴۹ء میں ریاست میں طالبات کے ۲۱۵ پرائمری ۳۰ مڈل اور ۸ ہائر سکنڈری اسکول تھے وہاں آج ہمارے یہاں ۵۱۶ پرائمری، ۱۷۰ مڈل، ۲۶ ہائی، ۲ کالج اور ۲ ٹیچرس ٹریننگ اسکول ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری لڑکیوں میں تعلیم پانے کا شوق روز روز بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد سے ہمارے یہاں خواتین کی شرح خواندگی میں ۵ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے پانچ سالہ منصوبے سے پہلے جہاں طالبات کی تعداد ۱۹,۵۰۰ تھی وہاں ۱۹۵۹ء کے خاتمہ پر یہ تعداد ۳۴,۰۰۰ تک پہنچ گئی۔

ریاستی سرکار اسکولوں اور کالجوں میں درس و تدریس کا معیار اُونچا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ طلبا میں تمدنی اور جسمانی کھیل کود کی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی جانب بھی بھرپور توجہ دے رہی ہے تاکہ طلبا کے لئے تربیت کا مقام کلاس روم ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب آہستہ آہستہ تعلیمی اداروں کی کارکردگی میں باہر کی سرگرمیوں کو ایک خاص مقام حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ آج نوجوانوں کے اجتماع، یوتھ کیمپ، چھٹیاں گذارنے کے کیمپ، انٹر اسکول اور بین الصوبائی ٹورنامنٹ، این سی سی۔ اے سی سی اور سکاؤٹنگ ہمارے تعلیمی نظام کے خاص جز کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست میں کھیلوں کو ٹھوس بنیادوں پر فروغ دینے کے لئے ایک سپورٹس کونسل قائم کی جا چکی ہے۔ سرینگر اور جموں میں کھیلوں کے اسٹیڈیم تعمیر کئے گئے ہیں۔ آنے والے برسوں میں تمام ضلعوں کے صدر مقاموں پر چھوٹے چھوٹے اسٹیڈیم تعمیر کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ریاست میں چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں زبردست اضافہ ہونے کی وجہ سے اُستادوں کی ایک بڑی تعداد کو بھرتی کیا جا چکا ہے۔ ان اساتذہ کی ضروری تربیت کے لئے جہاں ریاست میں مزید ٹیچرس ٹریننگ اسکول کھولے گئے وہاں ہائی اسکولوں اور کالجوں کے لئے موزوں عملہ تیار کرنے کے لئے اُستادوں کی ایک بڑی تعداد کو اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے باہر بھیج دیا گیا۔ علاوہ اس کے اُستادوں کو نئے تعلیمی رجحانات سے باخبر کرنے کے لئے گاہے گاہے ریفریشر کورسوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

ریاست کی تاریخ میں پہلی بار تعلیمی کوڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ ٹیچروں میں قابلیت کا معیار بڑھانے اور اسکولوں و کالجوں میں پڑھائی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے جموں و سرینگر میں سماعتی و بصری یونٹ قائم کئے گئے ہیں جو گشتی لائبریریوں، تعلیمی چارٹوں اور ریکارڈ کرنے کے سامان سے لیس ہیں۔ اساتذہ کی بہتری کے لئے ایک خاص بہبودی فنڈ جمع کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس میں اُستادوں کے علاوہ حکومت بھی چندہ دیتی ہے۔ فنڈ کی رقوم سے اُن اُستادوں، لیکچراروں یا اُن کے لواحقین کو امداد دی جاتی ہے جو کہ کسی حادثے کے نتیجے میں ناکارہ ہو جاتے ہیں۔

حکومت پسماندہ علاقوں اور طبقوں میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے مسلسل وظیفے دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ غریب مگر ذہین طلبا میں بھی وظائف تقسیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف دوسرے پلان کی مدت میں دس ہزار سے زیادہ طالب علموں کو وظیفے دئے گئے۔

حکومت نے ریاست کے اندر لائبریریوں کے قیام کو بھی تعلیمی نظام کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا ہے کہ ریاست میں لائبریریاں

قائم کرنے کی مہم تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں لائبریریاں قائم کرنے کے علاوہ شہروں اور قصبوں میں اہم مقامات اور تمام ضلعوں کے ہیڈ کوارٹروں پر بھی یہ ادارے قائم کئے جا چکے ہیں۔ خیال ہے کہ آئندہ تمام تحصیلوں کے صدر مقاموں میں بھی لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔

جموں وکشمیر میں عام وثانوی اور فنی تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی ایجوکیشن کو بھی بڑھاوا دینے کی جانب خاص توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ گزشتہ کئی برسوں میں اس سلسلے میں جو تدابیر اختیار کی گئیں ان میں یہاں کی یونیورسٹی کو ایک امتحانی ادارے سے اقامتی وتدریسی دانش گاہ میں بدل دینے کا قدم خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری اس سب سے بڑی دانش گاہ کے لئے اب تک لاکھوں روپے کی لاگت سے نسیم باغ کے پُرفضا ماحول میں کئی عمارتیں بنائی جا چکی ہیں۔ یہاں اس وقت چھ شعبوں یعنی انگریزی، ریاضی، اُردو، ہندی، طبقات الارض اور اقتصادیات میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یونی ورسٹی کی مزید توسیع وترقی کے لئے ہمارے سامنے کئی اور اسکیمیں بھی زیرِ غور ہیں۔ اُمید ہے کہ ان اسکیموں کے مکمل ہو جانے پر یہ ادارہ جلد ہی ملک کے اس قسم کے اداروں میں نمایاں درجہ حاصل کر پائے گا۔

ریاست کے اسکولوں میں زیرِ تربیت طلباء کے لئے معیاری درسی کتابیں تیار کرنے کا مسئلہ ابتدا سے ہی ہمارے پیشِ نظر رہا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے آج سے کچھ سال پہلے ریسرچ اور پبلی کیشن کے نام سے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا۔ یہ محکمہ پرائمری اور مڈل جماعتوں کے لئے درسی کتابیں تیار کرتا ہے جنہیں گورنمنٹ پریس میں چھاپا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ۶۰-۱۹۶۱ء کے دوران میں جو کام انجام پایا، اس کے حجم کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ سال زیرِ بحث کے دوران ۵،۰۰،۴۸،۵ سے زیادہ کتابیں شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ سرکاری پریس میں ان کتابوں کے رنگین سرورق اور ۱۴۱،۵۰۰،۹ نقشے اور تصاویر بھی چھاپی گئیں۔ اس طرح درسی کتابوں کی تیاری میں نسبتاً کم لاگت آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں کی قیمتوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔

پہلے دو منصوبوں کے دوران میں ریاست میں تعلیم کے مختلف شعبوں کو ترقی دینے کے بارے میں جو کام ہوا ہے وہ اگرچہ ہماری تاریخ میں اپنی انقلابی نوعیت کے اعتبار سے سدا یادگار رہے گا۔ تاہم تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چنانچہ تیسرے پلان میں اس عمل کو تیزی سے جاری رکھنے کے لئے ایک خطیر رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔ آئندہ پانچ برسوں میں جہاں آئین کے ہدایتی اصولوں کے تحت ریاست کے اُن سارے بچوں کو مُفت اور جبری تعلیم دلانے کے بھرپور انتظامات کئے جائیں گے جو ۱۴ سال تک کی عمر رکھتے ہوں وہاں تیسرے پلان کے دوران عام وفنی تعلیم کے علاوہ زنانہ، یونیورسٹی اور سماجی تعلیم کی توسیع اور ترقی پر بھی خاص زور دیا جائے گا۔ آئندہ برسوں میں ۳،۰۰۰ پرائمری ۱،۳۱۸ بیسک ایکیوٹی اسکول کھولنے کے علاوہ ۷۵ ہائی اسکولوں کو ہائر سکنڈری اسکولوں میں بدل دیا جائے گا۔ اور ۱۴- انٹرمیڈیٹ کالجوں میں تبدیل کیا جائے گا اور چار نئے کالج جاری کئے جائیں گے۔

تعلیم کی تیزی سے بدلتی ہوئی ہیئت وساخت اور تعلیمی سرگرمیوں کی اس بڑھتی ہوئی رفتار کے پیشِ نظر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ تیسرے پلان کے اختتام پر ہماری ریاست تعلیم کے میدان میں ایک نئے اور ترقی پسندانہ دور میں داخل ہو چکی ہوگی جو ہماری سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی ضرورتوں کا پوری طرح متحمل ہوگا۔

- تعمیر کو زیادہ دل کش بنانے کے لئے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازئے!

قیصر قلندر

دردِ مشترک

رات کی خامشی پھر اُوبنے ہی والی تھی
یک بیک بن میں کسی نَے نے فسوں توڑ دیا
اور چرواہے نے چھیڑا کوئی درد انگیز سا راگ
جانے کیوں ہوک کی، اُٹھنے لگی دِل سے مرے آگ،
اور پھرنے لگے آنکھوں میں خیالوں کے محل
پردۂ ذہن پہ کچھ رنگ کھلے، کھل کے بجھے
پھر مترکنے لگے یادوں کے ہزاروں پیکر
کچھ، دُھندلے، مُصفّا، طرب آمیز و حسیں
ایک سے ایک جُدا، ایک سے ایک الگ
انہیں میں ایک تبسم کا شگفتہ پیکر
انبساط آور، گُل افروز، وہ رعنائی کا خواب
مطلعِ دِل پہ نکھر آیا تھا یا ماہِ جمال
دَم زدن میں میرے ارمانوں کے جنگل میں کہیں
نُور کا دھارا بہا، درد کی ایک شمع جلی
دشتِ اُمید میں کھِل اُٹھے تبسم کے گلاب
پھر مہکنے لگا تنہائی کا خاموش سا خواب
راہ نے آبلہ پا کے لئے جیسے بوسے
غم کے کانٹوں کے مقابل کھلے گُھلنے نشاط
دِل کے ہاتھوں میں پھر آیا تھا ترنم کا ایاغ
فاصلہ یاد کا، رستے کا مِٹا رات کی رات
اور چرواہے کی مُرلی نے سُنا دی کوئی بات
دُور تاریکی میں بجنے لگا تاروں کا رباب
پھر کسی کنجِ گلستاں میں کھلے حسن کے پھول
عشق نے آرزومندی کی جلا دی قندیل
دُور سے دیکھتے ہی دیکھتے دوشیزہ ہنسی
پھیل کر مہک بنی، تاروں کی تنویر بنی
اور جو سمٹی ہے ترے نقشِ بدن کی صورت
رُوپ کا چاند ہوئی، پھولوں کا اِک باغ بنی!

گھاٹیاں، وادیاں، ویرانے، سمندر کتنے
ہجر کے راستے طے کرتا ہُوا میرا خیال
حرمِ حسنِ شگفتہ کو جو چھُو کر آیا
سرسوتی نے محبت کی اُٹھائی وینا
اور ناہید نے نغموں کی طنابیں کھولیں
راہ میں خوابوں کے کتنے ہی چمن زار کھِلے
دِل میرا درد کا ہے ایک جزیرہ کہ جہاں
پھُول کھِلتے ہیں تیرے جسم کی خوشبو کی طرح
نغمے ڈھلتے ہیں تیری آنکھوں کی رعنائی لئے
شعر کا حُسن لئے حُسنِ معانی کی شراب
اپنے ہاتھوں سے لُٹاتی ہے نسیم مخمور
اور غمِ دہر سے ہوتا ہے بدن جب میرا چور
پھر مجھے رات کی تنہائی میں ملتا ہے سکوں
اور پھر چُنتا ہوں ارمانوں کی رنگین کلیاں
میں نے سوچا تھا کہ پہناؤں تمہیں آج کی شب
اپنی رنگین تمناؤں کا شاداب سا ہار
کُتب خانے میں تمہاری ہے یہ تصویر خموش
حسن کا ایک نشاں، عشق کا ہے ایک جہاں
دُور چرواہے کی مُرلی نے تصور توڑا
نَے نوازی میں مگن، درد سے جیسے معمور
اس کا ہر راگ ہر اک طرح سے پُرسوز ہوا

شاہدہ سعید

ڈاکٹر ذاکر حسین

(مُدبّر، ماہر تعلیم، خطیب اور ادیب)

اسے ہمارے ملک کی خوش نصیبی کہنا چاہیئے کہ اس سال ہمارے ملک کی صدارت اور نائب صدارت ان دونوں کرسیوں کو ملک کے دو ممتاز ماہرین تعلیم نے رونق بخشی ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں، اس لئے بجا طور پر ہر ہندوستانی یہ محسوس کرتا ہے کہ ان دونوں عظیم ہستیوں کی فکر اور ان کے ذہن کی ضیا پاشی سے وطن کا مستقبل اور زیادہ نکھر کر دلوں کو نئے عزم، نئی لگن اور نئی امنگ سے سرشار کرے گی۔

جہاں تک ہمارے موجودہ صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کا تعلق ہے وہ پچھلے دس سالوں میں نائب صدر کی حیثیت سے اپنے منصب کی قدر و منزلت میں اضافہ کر چکے ہیں۔ اس کرسی پہ رونق افروز ہونے سے پہلے ہی وہ دورِ جدید کے ممتاز ترین ہندوستانی فلسفی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ فلسفہ کے میدان میں ان کے کارنامے اس حیثیت سے خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں ٹیگور اور مہاتما گاندھی کی روایت کے وارث ہیں۔ ان کی ساری زندگی مشرق اور مغرب کے ذہنی نقطۂ نظر کا فاصلہ کم کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے قریب اور ہم آہنگ کرنے میں گذری ہے۔ اسی طرح عالمی مسائل کے بارے میں جو ممتاز دانشور قومی تعصب اور تنگ نظری کو دور کرنے اور خالص انسانی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس جد و جہد میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ذہنی کاوشیں مثالی درجہ رکھتی ہیں۔

یہ بھی ایک نیک شگون ہے کہ ان کی درخشاں روایات کی وراثت جیسی نائب صدر کو نصیب ہوئی ہے وہ خود بھی ان کی طرح فلسفے تعلیم میں اپنی عظمت کا ... نقش چھوڑ ... بھی

ملک کے ہر حصے میں ماہرین تعلیم ... ہے ہیں۔

کچھ لوگ ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھی ڈاکٹر رادھا کرشنن کی طرح فلسفی سیاست دان کے لقب سے پکارتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان دونوں دانش وروں اور فلسفیوں کو قومی زندگی کے تقاضے سیاست کے میدان میں کھینچ لائے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے دامن کو سیاست کی آلائشوں سے آلودہ ہونے نہیں دیا بلکہ انہوں نے سیاست کی سطح کو بلند کرنے اور اسے فلسفہ کی رفعت اور عظمت کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خلوص، ان کی بصیرت اور بالغ نظری کے معترف ملک کے ہر حلقۂ فکر کے لوگ ہیں، اور سیاسی اختلافات اور مصلحتوں کے باوجود ہر طبقہ اور گروہ کا انہیں اعتماد حاصل ہے۔ آج عظیم ہستیوں کا ان جلیل القدر مراتب پہ رونق افروز ہونا ہندوستان میں جمہوریت کی بقا اور استحکام کے لئے ایک نیک فال ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ (یو۔ پی) میں ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے مسلم اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور الٰہ آباد یونیورسٹی کی بی۔ اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد وہ دو سال تک جامعہ ملیہ دہلی میں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد وہ مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی چلے گئے اور برلن یونیورسٹی سے انہوں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے برلن یونیورسٹی میں ہی اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پیش کیا اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔

اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کی مسلسل ذہنی نشوونما کا عرصہ تقریباً ۱۹ سال کا ہے۔ وہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء تک برابر تحصیلِ علم میں مصروف رہے اور طویل مدت تعلیم نے ان کے مزاج، فکر اور طبیعت پر دیرپا اثر ڈالا ہے۔ ان کے مزاج اور ان کی فکر میں جو سنجیدگی، بالغ النظری اور پختگی ہے وہ شاید اسی مسلسل ذہنی ارتقا کی دین ہے۔

شاید اس کے بعد بھی ان کی ذہنی تشنگی باقی رہی۔ اس لئے انہوں نے شعبۂ تعلیم کو اپنے میدانِ عمل کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ ورنہ ان اعلیٰ علمی ڈگریوں کو حاصل کرنے کے بعد زندگی کی بیشتر راہیں ان کے لئے چشم براہ تھیں۔ تن آسانی کی بے کیف، محدود اور بے مقصد زندگی میں ان کے لئے کشش نہ تھی اور ایک معلّم کی سادہ زندگی میں تن پروری کے امکانات نہ ہوتے ہوئے بھی قومی زندگی کی تعمیر و نشوونما کے مواقع ہوتے ہیں۔ شاید یہی وہ تحریک تھی جس سے متاثر ہو کر انہوں نے تعلیم و تربیت کے پیشہ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک وہ جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر رہے اور ۱۹۴۸ء میں ملک کی تقسیم کے بعد بدلے ہوئے حالات میں علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کی اور ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اس کرسی کو زینت بخشی۔

۱۹۵۷ء میں ان کے فکر و عمل کی ضیا باری صرف درس گاہوں تک محدود نہیں رہ گئی بلکہ بہار کے گورنر کی حیثیت سے ان کے انتظامی تدبّر کے جوہر کھلے اور اپنے دورِ اقتدار میں ان کی ذات، ریاست بہار کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک زبردست مؤثر تحریک رہی ہے۔ اپنی شخصیت بصیرت اور دُور اندیشی کی وجہ سے انہیں ہر گروہ اور حلقۂ خیال کے لوگوں کا اعتماد حاصل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت نے بہار کے عوام کے دلوں پر دیرپا نقش چھوڑا ہے۔

ذمّہ داری اور منصب داری کے کسی دَور میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا دائرہ عمل کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں رہا۔ ان کی صلاحیتوں، عملی تجربہ اور ان کی قوتِ فکر سے مختلف ادارے اور انجمنیں فیض یاب ہوئی ہیں۔ ۱۹۳۹ء

تم

میں وہ قومی بنیادی تعلیمی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی صدارت کو بھی انہوں نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۸ء تک رونق بخشی۔ اس کے علاوہ بہار، اُتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی تعلیمی اصلاحات کی کمیٹیوں میں بھی وہ شامل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی تعلیمی کمیشن، ہندوستانی اخباری کمیشن اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے رُکن اور ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور بعض عالمی انجمنوں میں بھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ عالمی یونیورسٹی سروس کے صدر رہے اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۷ء تک عالمی تعلیمی تہذیبی اور سائنسی انجمن کی مجلسِ انتظامیہ کے رُکن رہے ہیں۔

ان ساری مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے علم اور صلاحیتوں کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اتنی معروف زندگی گذارتے ہوئے بھی تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکالا ہے اور ان کی تصنیفات کا دائرہ معاشیات، تعلیم، سیاست اور زندگی کے دیگر مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف اور ترجمے دونوں ہی دُنیائے علم و ادب میں مستقل حیثیت کے مالک ہیں۔

سردار پٹیل مرحوم کی یاد میں تعلیم کی نئی تعمیر کے موضوع پر ان کے لیکچر ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس کے علاوہ مسٹر ماؤلنکر کی یاد میں ان کی تقریر اخلاق اور ریاست کے موضوع پر آج بھی اہلِ علم کو دعوتِ فکر و نظر دیتی ہے۔ اس لئے تعلیم کے موضوع پر ان کے خیالات کو پیش کئے بغیر ان کی شخصیت کا کوئی جائزہ صحیح اور مکمل نہیں ہو سکتا۔ "صحت مند قومی زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے پہلی اور بنیادی شرط تعلیم ہے۔" یہ ڈاکٹر صاحب کا بنیادی عقیدہ ہے انہوں نے اپنی زندگی کے ہر دَور میں اس عقیدے کو اصلیت کا ثبوت دینے کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔ آج سے پہلے انہوں نے کہا تھا کہ تعلیم کی مستحکم بنیاد ہندوستان کی آئندہ تعمیر کی بنیاد ہے اور تعلیم کی مستحکم بنیاد [illegible] تعلیم یا بنیادی تعلیم ہے۔ مہاتما گاندھی کے ذہن میں بنیادی تعلیم [illegible] اس کے ممتاز ترین معمار اور ترجمان ڈاکٹر صاحب ہیں۔ [illegible] موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اب بھی [illegible]

ملک کی قومی زندگی کی تعمیر کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ اپنے نظریۂ تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا تھا:-

"کوئی ملک خواہ کتنا ہی عظیم، خوش حال اور خوبصورت کیوں نہ ہو، اس کی عظمت، خوش حالی اور خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے شہری نسلاً بعد نسلاً صحت مند، محنتی، ہوشیار، ایمان دار، بھائی چارے اور فلاحِ عام کا آدرش رکھنے والے ہوں۔ یہ مقصد صرف اچھی تعلیم کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک "کامیاب اور بامقصد زندگی کی پہلی شرط خدمت ہے لیکن اس کی معقول تربیت گھر سے شروع ہونی چاہیئے ورنہ خدمت بھی فیاضی کی طرح محض وقت کی بربادی بن کر رہ جائے گی۔"

لائنس انٹرنیشنل کے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا:-

"اعلیٰ قدروں کی پرستش اچھی بات ہے لیکن اس کے لئے پوری لگن کی ضرورت ہے۔ موجودہ دَور کی روِش غلط ہے۔ کہیں کاروبار کی ہوس، کہیں اخلاق کی رٹ، کہیں ناجائز نفع کی بھوک، کہیں ایثار کا ڈھونگ، کہیں سنگ دلانہ بے رحمی، کہیں رحم کا مظاہرہ کہیں بے لگام لالچ، کہیں فیاضی کا اشتہار، کہیں اخلاقی قدروں سے بے نیاز فنّی مہارت، کہیں قدروں کا احساس جس میں فنّی مہارت شامل نہیں۔ اس دُورُخی روِش کے ذریعہ انسانی فلاح اور اخلاقی قدروں کا استحکام ناممکن ہے۔"

یہ سائنس اور ٹکنولوجی کا دَور ہے اور یہ قوتیں اخلاقی قدروں کی حریف اگر نہیں ہیں تب بھی اخلاقی قدروں سے بے نیاز یقیناً ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس بات کا تکلیف دہ احساس ہے کہ محدود اور کھوکھلی مادہ پرستی نے ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی میں گھن لگا دیا ہے۔ اور آدمی کو اندر سے کھوکھلا کرتی جا رہی ہے۔ موجودہ دَور میں فرد محض ایک بڑی مشین کا ایک بے بس اور بے اختیار پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے وہ بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں ایک انجینئر کے اندر کے انسان کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کی نعمتوں کو جانے اور ان کی قدر کر سکے۔ اگر وہ مشین بنا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے دماغ کو بھی ایک مشین بنا دے اور وہ اچھی شاعری، اچھے سنگیت، اچھی کتابوں اور صحت مند انسانی تعلقات سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اگر وہ مشین بنا سکتا ہے تو اسے اس بات سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے کہ ان مشینوں کا انسانی سماج پر کیا اثر پڑے گا۔

اس موضوع پر انہوں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنولوجی کے کانوکیشن ایڈریس میں مزید روشنی ڈالی ہے:

"میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جدید دَور کا عقلی، سائنسی اور تیز رفتار نظامِ عمل انسان کی معاشی زندگی کی ایک ایسی قوت ہے جو فائدہ پہنچانے سے زیادہ نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس قوت نے پچھلی صدیوں میں صرف نفع حاصل کرنے کو مقصدِ حیات بنا دیا ہے اور اس ہوس کی نہ کوئی انتہا ہے نہ کوئی حد۔ کیا یہی صورتِ حالات باقی رہے گی؟"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آدمی اپنی مرضی سے اپنے اختیار کی حدیں مقرر کرے اور تب ہی آئندہ زندگی کا وہ نقش وجود میں آ سکتا ہے جس میں انسان انسان کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور لوگ بھائی چارے اور سہیوگ سے اپنی ضرورتوں کی آسودگی کے لئے کام کریں۔

شعبۂ تعلیم سے غیر متعلق ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر ذاکر حسین نے اُستاد اور رہنما کی حیثیت سے اپنے منصب کو فراموش نہیں کیا ہے لیکن عام اُستادوں کی طرح وہ اُستاد کی حیثیت سے ندامت اور کمتری کے احساس کو دِل میں جگہ دینا گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اُستاد سماج کے اہم ترین منصب کا نمائندہ ہے۔ وہ اُن اعلیٰ ترین قدروں کا محافظ اور پاسبان ہے جنہیں قوم عزیز رکھتی ہے اور جن کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کشمیر کے ایک مزاحیہ شاعر

قاضی غلام محمد

جب سے میں کشمیر میں قیام پذیر ہوا، برابر یہ محسوس ہوتا رہا ہے کہ اس سرزمین کے رہنے بسنے والوں کو علم و فضل، شعر و سخن اور فنونِ لطیفہ سے ایک طرح کا فطری لگاؤ ہے۔ چونکہ یہ خطۂ جنت نظیر بڑی بڑی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں سے محصور رہا ہے اس لئے یہاں کے شاعر، ادیب اور فن کار بیرونی دُنیا سے بالکل علیحدہ رہے ہیں۔ اُن کے فطری جوہر یہاں کے لاتعداد پھولوں اور رنگ و نکہت کی بہاروں کی طرح یہیں اپنی چمک دمک دِکھا کر رہ جاتے ہیں۔ اور باہر کی دُنیا ان سے پُوری طرح لُطف اندوز نہیں ہو سکتی۔

یہاں کے کُتب خانے، یہاں کے شاعروں کے شہکار اور صاحب کمالوں کی تخلیقات ہر دَور کے دیدہ وروں اور صاحبانِ ذوق کی تشفی کرتی رہی ہیں۔ اہلِ کشمیر قدرت کی تمام نعمتوں سے دِل کھول کر استفادہ کرتے ہیں اور بہار و خزاں دونوں کی رنگارنگی میں یکساں لُطف لیتے ہیں۔ ان کو اس کی پروا نہیں ہے کہ دوسرے ان کی قدر کریں یا ان کی خوبیوں سے لُطف اندوز ہوں۔ وہ خوُد لُطف حاصل کرنا جانتے ہیں اور اپنے آپ مگن رہتے ہیں۔

یہاں کے ایسے ہی مست الست لوگوں میں جامعہ کشمیر کے شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر قاضی غلام محمد بھی پیش پیش نظر آئے۔ جب میں نے ان کا کلام سُنا اور پڑھا تو محسوس ہوا کہ ایک نمک مضمون کے اُستاد میں ایک اعلےٰ پایہ کا، باشعور اور دیدہ ور شاعر چھپا ہوا ہے۔ ایک ایسا شاعر جس کو نہ اپنے کلام کی خوبیوں پر ناز و [illegible] انتخاب ہے اور جو نہ اپنے ہم چشموں کی تحسین و آفرین کا محتاج و منتظر ہے۔ وہ شعر لکھتا ہے اور خود ہی اس سے محظوظ ہو کر مگن رہتا ہے۔ نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلے کی پروا۔

قاضی غلام محمد سے جب ذرا قریب ہونے کا موقع ملا تو یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اُردو کے جدید تقاضوں اور اُردو کی مزاحیہ نظم و نثر کی کائنات سے بخوبی واقف ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے فکاہیہ ادب اور ادیبوں سے ان کی خاصی جان پہچان ہے۔ وہ علی گڑھ میں بھی ایم اے کی تعلیم کے سلسلے میں قیام کر چکے ہیں اور ہندوستان میں اپنا ایک حلقۂ احباب رکھتے ہیں۔ مگر ان کی بے نفس گفتگو اور معصوم بلکہ مظلوم مسکراہٹوں کے باعث پہلی نظر میں ان سب باتوں کا اندازہ نہیں ہوتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن اننت ناگ اور سرینگر کے سِوا کچھ بھی نہیں جانتے۔

اننت ناگ کو اسلام آباد بھی کہتے ہیں اور یہ سرینگر سے تقریباً ۳۴ میل کے فاصلے پر ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ قاضی صاحب کو اس سے اتنی محبت ہے کہ روز ۶۸ میل کا سفر کرتے ہیں، مگر سرینگر میں قیام پسند نہیں۔ والدین کے اتنے اطاعت گذار ہیں اور ضعیف و بیمار والدہ کی ایسی خدمت کرتے ہیں کہ شاید ہی عہدِ حاضر کا کوئی شاعر اس معاملے میں ان کی ہمسری کر سکے۔ اس کے ساتھ دوستوں کی فرمائش دِل سے قبول کرتے ہیں اور ان کی پابجائی کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ جس غیر شاعرانہ ماحول میں شاعری کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں [illegible] میں نے ان سے دریافت کیا تو اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ [illegible]

اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا رُخ زیادہ تر ظرافت کی طرف واقف ہوتا ہے۔ وہ بظاہر نہایت سنجیدہ اور غم زدہ انسان نظر آتے ہیں مگر اپنے احول اور پیشے کی خشکی دُور کرنے کی خاطر تر و تازہ اشعار سے دِل بہلاتے ہیں۔

آج کل کی زندگی میں ہر نوجوان کو تلاشِ روزگار کے سلسلے میں کسی نہ کسی انٹرویو بورڈ کے آگے پیش ہونا ضروری ہے اور اس بورڈ میں جو مضحکہ خیز سوالات کئے جاتے ہیں اور اُمیدواروں کے عقل و شعور اور صبر و قرار کو جو اُن معشوقوں کے نت نئے اور مختلف انداز میں آزمایا اور پرکھا جاتا ہے، اس پر قاضی غلام محمد نے ایک بڑے ہی دلچسپ اور لطف انگیز انداز میں روشنی ڈالی ہے اور جو نظم لکھی ہے وہ اگرچہ تمام کی تمام زندہ دِلی اور شگفتگی سے معمور ہے مگر اس کے یہ چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔ یہ ان کے مطبوعہ مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" کے مطالعے کے دوران منتخب کئے گئے ہیں:

فلسفہ کیا ہے ہم کو سمجھاؤ	سائیکل ٹیوب کا محیط بتاؤ
کیا تھا شیکسپیئر کی ساس کا نام	کس محلے میں کرتی تھی وہ قیام
بھینس کب اپنی دُم ہلاتی ہے	روز یہ کتنی گھاس کھاتی ہے
پلنگ کو کیوں ہے اضطراب بتاؤ	کس کی ایجاد ہے کباب بتاؤ
یہ ایشیا کا مسئلہ کیا ہے	قطب مینار کتنا اُونچا ہے
کون یہ فیلسوف نیوٹن تھا	مڈل میں اس کا کیا ڈویژن تھا
ہم نے کیا آج جی میں ٹھانی ہے	فاسٹ بولر کی کیا نشانی ہے
پہیہ کس نے وہاں گرایا ہے	ہم نے مٹھی میں کیا چھپایا ہے

ایک نظم کسی ناخواندہ مہمان پر سپردِ قلم کی ہے اور چونکہ ہر شریف آدمی کو آئے دِن ایسے مہمانوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے گویا وہ قاضی صاحب کی آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بن گئی ہے۔ اس نظم کے یہ تین چار شعر ہی شاید بہت سے پڑھنے والوں کو اُن کے گزرے ہوئے واقعات اور بیتے ہوئے لمحات کی یاد دلا دیں گے۔ یوں تو پوری نظم ایسے ہی اشعار سے مالا مال ہے ؎

میں اپنی بیوی سے گرمِ کلام تھا یارو
شبِ بہار تھی آیا جو ناگہاں مہمان
میں جتنی دیر میں پہنچا رسوئی خانے سے
نگل چکا تھا پلیٹوں کو نوجوان مہمان
غبارہ بن کے نہ اُڑ جائے اب تو ڈر ہے مجھے
کہ کھا چکا ہے یہ دو سو چپاتیاں مہمان
لڑھک چکا ہوں میں سو بار سیڑھیوں سے مگر
یہ میرا چٹکلہ لگا کر گیا کہاں مہمان

بلّی اور چوہے اکثر گھروں کی رونق اور ویرانی بڑھانے میں صدیوں سے حصہ لیتے رہے ہیں اور دُنیا کی اکثر زبانوں میں ان پر مزاحیہ اور غم زدہ دونوں قسم کے شاعروں نے خیال آرائی کی ہے مگر قاضی صاحب نے ان کا جس طرح مشاہدہ کیا ہے اور ان کی جو شگفتہ تصویریں کھینچی ہیں وہ کسی زبان کے بھی شاعر کے اس قسم کے کلام کے مقابلہ میں ہیٹی نہیں رہیں گی۔ بلّی کی نسبت ایک نظم میں یوں لکھا ہے جس کا پہلا مصرعہ اختر شیرانی کی ایک مشہور نظم کا چربہ ہے ؎

ترا جسم اِک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے بلّی
یہ تیری چال محبوبوں میں بھی کم یاب ہے بلّی
ترے پنجوں کے گُن جب مجھ سے شاعر لوگ گاتے ہیں
گلابی ناخنوں تدبیر اُن کو یاد آتے ہیں
اُچھل کر تیرے مُنہ میں خود ہی جو جا چلا آیا
وہ قیدِ زندگی اور بندِ غم دونوں ہی سے چھوٹا
کبھی چوہوں کے ہوا نوں میں شامل ہو گئی تو کر
صفائی سے تو ہیرو بن کے بھاگی ولن بن کر
تری طینت کی پاکی نوحہ کا ایمان ہو جائے
تری سنجیدگی پر عشق قربان ہو جائے

اگر بلی نہ ہو چوہوں کا ایسا پرابلم ہوگا
گلستانِ جہاں کا ناک میں ہر وقت دم ہوگا

چوہوں کا ذکر چھیڑتے ہوئے شاعر نے اپنے "کرایہ کے مکان" کی عکاسی کرتے ہوئے ضمناً کیا ہے مگر وہ بجائے خود ایک مزاحیہ شہ پارہ بن گیا ہے ؎

یہاں چوہوں کے بل اتنے بڑے ہیں — کئی ثابت قدم ان میں گرے ہیں
مجھے بھی دور کی اک روز سوجھی — کسی بل کو میں کھودوں جی میں آئی
جو کھودا چشمِ حیراں نے یہ دیکھا — کہ اک لیڈر نما موٹا سا چوہا
دبائے منہ میں اک خاصہ بتاشا — مرے موزے پہن کر جا رہا تھا
وہیں اک چوہیا نکلی کہیں سے — ٹپکتا ناز تھا اس کی جبیں سے
بسا تھا عطر میں ہر ریشہ اس کا — پرے تھا عرش سے اندیشہ اس کا
بہت بن ٹھن کے نکلی تھی بچاری — میاں چوہے نے فوراً آنکھ ماری
نگاہِ غیر سے شرما گئی وہ — میاں چوہے سے پھر ٹکرا گئی وہ

غرض چوہے قیامت ڈھا رہے ہیں — در و دیوار پر منڈلا رہے ہیں
میں لایا تھا کہیں سے ایک بلی — پکڑ کر لے گئے چوہے اسے بھی

میر تقی میر نے اپنے مکان کی خرابی کا ذکر ایک اور ہی انداز میں کیا تھا قاضی غلام محمد کو بھی شاید ویسے ہی یا اس سے بھی برے مکان میں زندگی گذارنی پڑتی ہے مگر وہ اپنی فطرت کے رجائی انداز میں اس کی زحمتوں کو بھی ہنس کھیل کر گوارا کر لیتے ہیں۔

غرض اسی اسلوب میں قاضی صاحب نے متعدد طویل نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً اُٹھنگ ہال، موت، تعزیت، مفلسوں کا قومی ترانہ وغیرہ۔
بعض مشہور شاعروں نظیر اکبرآبادی، غالب، اقبال، اختر شیرانی اور جذبی وغیرہ کی مشہور و مقبول نظموں کے انداز میں بلکہ ان ہی کی زمین میں کہیں بطورِ پیروڈی اور کہیں بطورِ خود بڑی ہی دلچسپ نظمیں تخلیق کی ہیں جو اردو ادب میں قطعی اضافہ سمجھی جائیں گی۔

قاضی غلام محمد نے غزلیں بھی اسی رنگ میں لکھی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی بڑے اچھے اچھے شعر نکلے ہیں۔ مثال کے طور پر چند غزلوں کے منتخب شعر درج ذیل ہیں:-

مرے محبوب تیرے حسن کا یہ اک کرشمہ ہے
ہماری مفلسی اب جاوداں معلوم ہوتی ہے
جنابِ شیخ اس سے روز ہی بے نقط سنتے ہیں
یہ شیطانی کوئی اہلِ زباں معلوم ہوتی ہے

[illegible] سا ہوتا ہے مجھ کو ناصح پر — مفت میں ٹانگ کیوں اڑائی ہے
شیخ جی ان سے بچ کے رہئے گا — ہر ترقی پسند نائی ہے

کوئی جاتا نہیں بچوں کی قطاریں لیکر — ہسپتالوں میں وہ پھر جانا رہا میرے بعد
اپنی محرومیٔ قسمت پہ ہنسی آتی ہے — دودھ بازار میں خالص بھی بکا میرے بعد
میرے ماتم میں نہیں اپنی رقم کے غم میں — شہر کا بنیا سیہ پوش ہوا میرے بعد

نہ کیوں حورِ جناں کے ذکر سے محظوظ ہو واعظ
یہ اس کے توسنِ دل کے لئے مہمیز ہے ساقی
مرے اوقات گر یہ ٹائم ٹیبل پر مقرر ہیں
یہ بندہ عشق کے بارے میں بھی انگریز ہے ساقی
وہ میرے دو نئے پیسے بھی اپنے پرس میں رکھ لئے
کہ ان کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہے ساقی

ڈر یہ نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے
ڈر ہے کہ خاکسار کثیر العیال ہے
اب وہ شبِ فراق کی نیندیں کہاں نصیب
اے دل شبِ وصال میں سونا محال ہے
درباں سے ایک بیڑی یہ کہہ کر وصول کی
اس معرضِ مثال میں تو بے مثال ہے

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

سرِ شام

سلونی شام ہے اور جھیل کا کنارا ہے
بڑا سکوں ہے بڑا دِل نشیں نظارا ہے
کسی نے دُور سے شاید مجھے پُکارا ہے

یہ کس نے حدِ نظر تک کھِلا دیا ہے گلاب
گلوں کے ترشے ہوئے شبنمی کٹوروں سے
چھلک رہی ہے نشیلے تبسموں کی شراب
سُلگ رہی ہے فضاؤں کے نرم سینے میں
وہ سرد آگ کہ جس کو بہار کہتے ہیں
ہلورے کیلے جوانی کی گل فروش دُلہن
جھلا رہی ہے اُمنگوں کو پیار کا جھُولا
تصوّرات میں موسیقیاں مچلتی ہیں
شباب و شعر کی جنّت میں بج رہے ہیں رباب
جنوں فروش نظاروں کی تابناک نظر
تفکّرات کو رہ رہ کے گدگداتی ہے
گلوں کے آتشیں ہونٹوں سے آنچ آتی ہے
لرز رہے ہیں فضاؤں میں خوابگوں سائے
کسی نے چپکے سے فطرت کی خوابگاہوں میں
جگا دیا ہے ستاروں کا دِل نشیں جادُو
یہ کھوئے کھوئے نظارے یہ سوئی سوئی بہار
یہ نغمگی، یہ ترنّم، یہ بے خودی، یہ سرور
بہک رہی ہے تمنّا، بہک رہا ہے شعور
غمِ حیات کو نیند آرہی ہے رہ رہ کر
اُبھر رہی ہیں پہاڑی ندی کی لہروں سے
اُداس لَے میں کئی جھینگروں کی آوازیں
ہوا میں اُڑتے پرندوں کی نرم چہکاریں
فضا میں ریشمیں گیتوں کا لمس گھولتی ہیں
اِدھر اُدھر کھُلے جنگل کے سبز آنگن میں
اُچھل رہے ہیں نزاکت سے ہرنیوں کے ہجوم
نظر سے دُور سیہ پتھروں کی وادی میں
مچل مچل کے اُبھرتا ہے آبشار کا گیت
زمیں سے عرشِ بریں تک لہک رہا ہے شباب
نگارِ وقت کے رُخ سے سرک گیا ہے نقاب
چٹک رہی ہیں تصوّر میں مرمریں کلیاں
برس رہی ہے فضاؤں میں خوشبوؤں کی پھوار
کہ جیسے دُور کہیں جل ترنگ بجتا ہو
سکوتِ شام کی وادی میں گھُل رہا ہے نشہ
نشے میں ڈوب کر ایسا گماں ہوتا ہے
کہ حسنِ شام و سحر اِک گداز نغمہ ہے
جو کائنات کے بربط پہ گایا جاتا ہے

سلونی شام ہے اور جھیل کا کنارا ہے
کسی نے دُور سے شاید مجھے پُکارا ہے
یہ خواب ناک نظارے، یہ نرم رعنائی
بہار پھُول نزاکت، شباب، تنہائی
دِل و نظر میں کوئی لے رہا ہے انگڑائی
نہ جانے آج یہاں کون آنے والا ہے
اُلجھ رہے ہیں ارادے، بھٹک رہا ہے شعور
مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں قریب نہ دُور
کہ لوٹ آئی ہیں نظریں اُفق سے ٹکرا کر
میں چاہتا ہوں کہ ایسے میں ایک نظم کہوں
وہ ایک نظم کہ لرزیدہ ہے تخیّل میں
مگر زباں کے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی!

لچھمی چاچی

لال ٹول کی گٹھڑی اپنی جھکی ہوئی کمر پہ لادے لچھمی چاچی جب بھی ہمارے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتی، ہم سب بچے شور مچا مچا کر اس کا سواگت کرتے۔ ماں رسوئی گھر میں چوکا برتن کرتے ہوئے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیتی۔ وہ اپنے کالے رنگ کے گھستی سلیپروں کو، جن کے تلے اور ایڑیاں زمین کی دھول چاٹتے چاٹتے گھس گئے ہوتے، گھسر گھسر گھسیٹتی ہوئی آنگن میں آجاتی اور اپنے پوپلے منہ سے آواز نکالتی ہوئی کہتی: "رام رام بہو جی!"

"رام، رام"۔ ماں دھیمے لہجے میں سلام کا جواب دے کر پھر اپنے کام میں محو ہو جاتی۔ اور ہم سب بچے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیتے۔

"چاچی۔ چاچی! تیری گٹھڑی میں کیا ہے؟"

اور وہ ننگی زمین پر اپنا سُرخ رنگ کا لہنگا سمیٹتی ہوئی پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی۔ اور پھر گٹھڑی کی موٹی گانٹھ کھول کر سارا سامان زمین پر پھیلا دیتی۔ سینگ اور لکڑی کی چھوٹی بڑی کنگھیاں، ہتھیلی کی برابر چوکور شیشے، ننھے ننھے موتیوں کے ہار، کلائیوں کی لال اور کالے رنگ کی چوڑیاں، کپڑے کی گیندیں، جن پر رنگ برنگے دھاگوں سے چاروں طرف ٹانکے سے بنے ہوتے۔ ہم سب بچے للچائی للچائی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے۔ پھر کہتی:

"ہاں، چاچی ہار لائی ہے — اتنے سارے ہار"

"ہم تو کنگھی لیں گے چاچی سے۔" کوئی کہتی

اور میں چپ چاپ کھڑا چاچی کی طرف دیکھتا رہتا۔ حیرت زدہ سا! جیسے دنیا جہان کا سارا خزانہ چاچی کی گٹھڑی میں سما گیا ہو۔ اور وہ تب

اپنی گیلی گیلی آنکھیں اُٹھاتے ہوئے میری طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی۔

"یہ بھو بیٹا کس کا ہے؟"

اور میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے کہتا:

"چاچی کا—"

اور چاچی خوش ہو کر کپڑے کی ایک خوبصورت سی گیند میری جیب میں ٹھونس دیتی۔

"جا بیٹا کھیل! دیکھ چوٹ مت، یار لیو—"

اور پھر ہم سب بچے سڑک پر اچھل کود مچانے لگتے

خاموش خاموش اور الگ تھلگ سا گاؤں تھا۔ معصوم اور سیدھا سادہ سا جیون! چکیوں کی گھوں گھوں سے دن شروع ہوتا اور عورتوں کی مار پیٹ پر ختم ہو جاتا۔ سورج نکلتے ہی لوگ کپڑے میں بندھی روٹیوں کی پوٹلی کو، جن سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلتی رہتی، کندھے پر رکھی لاٹھی کے سرے پر لٹکائے کھیتوں میں چلے جاتے۔ عورتیں گھر کے کام دھندوں سے چھٹکارا پاکر پاس پڑوس میں جا بیٹھتیں۔ اور پورے گاؤں کے ماحول پر ایک سناٹا سا چھا جاتا۔ ایسے میں ہم بچوں کی موج آجاتی۔ وہ وہ دھما چوکڑیاں مچاتے کہ خدا کی پناہ! چاچی سے ملی گیند کو پیٹتے مارتے مارتے پلپلا سا کر دیتے۔ لڑتے بھڑتے، چوٹیں کھاتے اور شام پڑنے تک ہمیں اپنے پرائے کی سُدھ نہ رہتی۔ چاچی گھر گھر کی دہلیز جھانک کر سورج ڈوبے گھر واپس لوٹتی۔ اب اس کی گٹھڑی میں کنگھیوں، چوٹیوں، شیشوں اور گیندوں کے علاوہ چاول، گیہوں، گڑ وغیرہ

سستو اور چائے بیچ آنے پیسے بھی ہوتے۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتی تو اس سے تک کبھی نہ ٹلتی جب تک ماں چائے کا ایک گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے یہ نہ کہتی

"لے چاچی! کلیجہ ٹھنڈا کرلے۔"

اور وہ ایک ہی سانس میں پورے کا پورا گلاس غٹا غٹ چڑھا جاتی اور ماں کو دُعائیں دیتی ہوئی کہتی :

"سدا سہاگن رہو بہو، گود ہری رہے!"

چائے پیتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے اُوپری حصہ پر گلاس کے کناروں پر لگی ہوئی گاڑھی بالائی کے نشان پڑ جاتے تھے جنہیں وہ صاف نہ کرتی تھی۔ اور ہم میں سے کئی بچے اس کی یہ ہیئت دیکھ کر اُسے چڑاتے تھے : "مونچھوں والی چاچی——"

"مونچھوں والی چاچی——"

اور وہ کھسیا کر تیز تیز قدموں سے ہماری طرف لپکتی۔

"حرام جادو——" اور ہم سب ایک ایک کرکے بھاگ جاتے۔

گلی گلی گھومتے اور گھر گھر کی چوکھٹ جھانکتے جب شام کا دھندلکا پھیل جاتا۔ اور کسان کھیتوں سے لوٹ کر مویشیوں کو ان کی تھانوں سے باندھ دیتے۔ چوپالوں پر روشنیاں جاگ اُٹھتیں اور مویشیوں کے گھروں میں مچھروں کو بھگانے کے لئے کچے اُپلوں کا دُھواں پھیل جاتا۔ ان گھروں پر پھیلے ہوئے مٹیالے چھپروں پر شام کے سایے گہرے ہو جاتے اور ماحول میں لکڑیوں اور اُپلوں کے دھوئیں کی بُو، تیل میں بھنی ہوئی مرچوں کی دھانس اور حقہ کے تمباکو کی عجیب سی مہک بس جاتی۔ تو کبھی چاچی دھیرے دھیرے اپنے سلیپر گھسیٹتی واپس لوٹنے لگتی۔

اس وقت محلہ کا ہر بچہ اپنے باپ کے ڈر سے سہما ہوا چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا ہوتا۔ پھر بھی اس کے جوتوں کی آواز پر کسی نہ کسی طرف سے ایک آدھ آواز بلند ہو جاتی۔

"مونچھوں والی چاچی——"

اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتے۔ اس کے پیچھے لگ جاتے۔ چاچی زہر بجھا سر ہلا کر دیکھتی۔

"ادھر آ میرا—— کیا کہا تھا؟ اب کے کہیو، حرامی کہیں کے۔"

"میں تھوڑے ہی تھا چاچی—— وہ تو راجو تھا، شکتن چاچا کا۔"

بچے صفائی دیتا۔ اور پھر سب کے سب اُسے گھیر کر کھڑے ہو جاتے۔

"گڑ چاچی گڑ——"

پہلے پہلے تو وہ آنکھیں نکال کر سب کو دھمکاتی۔ اور آخر تنگ آکر اپنی جھولی میں سے تھوڑا سا گڑ نکال کر سب بچوں میں تقسیم کر دیتی۔

محلہ کی عورتوں میں زہرہ دادی ہی ایک ایسی عورت تھی جس سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ جب بھی آتی، ایک آدھ گھنٹہ ضرور اس کے پاس بیٹھ کر جاتی۔ باتیں کرتے ہوئے اسے اپنی گٹھری کا بالکل دھیان نہ رہتا۔ محلہ کے بچے اس موقع پر کبھی نہ چوکتے اور اس کی گٹھری میں سے ایک دو گیندیں چرا بھاگتے۔ کبھی اُسے پتہ چلتا، کبھی نہ چلتا۔ اگر اتفاق سے کبھی دیکھ لیتی تو بڑے دھیمے لہجے میں ٹوک کر دیتی :

"ارے تمہارا ستیاناس ہو رے—— بے بھاگے چوٹے کہیں کے"

اور پھر پہلے کی طرح باتوں میں مگن ہو جاتی۔ دونوں بوڑھی عورتیں ایک دوسری سے اپنا دُکھ درد بیان کرتیں۔ زہرہ دادی عام طور پر اپنے پوتے مشتو کا دُکھڑا روتی :

"تین برس کا تھا جب اس کا باپ اسے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ماں نے دوسرا خصم کر لیا۔ مرنے والے کی نشانی جان کر میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کس کس جتن سے پالا ہے بچی۔ بس کیا بتاؤں۔ پر وہ ایسا نکھٹو نکلا کر دو برس ہو گئے پردیس گئے۔ پھوٹی کوڑی نہیں بھیجی۔ آس دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ میرا بھی تو خیال نہیں آتا اس حرام کے جنے کو۔"

بس بس رہنے دے بہن! بیٹا بیٹی کسی کے ہوتے ہیں جو تیرے ہوں گے۔ ہزار میں ایک بھاگوان ایسی ہو گی۔" پھر چاچی ہمدردی کے لہجے میں جواب دیتی :

"جانا جو ایسا ہی گیا ہے بچی! شوہر سنیہ ہو گیا ہے دُنیا سے۔ اب بتا بڑھاپے میں پیٹ تو دو روٹیاں مانگے ہے۔"

اگست ستمبر ۱۹۹۲ء

اور چاچی ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی بپتا سنانی شروع کر دیتی۔

"چالیس سال ہو گئے اس موٹی گٹھڑی کو پیٹھ پر ڈھوتے ڈھوتے۔ اب تو آنکھوں سے سجھائی بھی کم دیوے ہے بہن۔ کون جانے ابھی جندگی کتنے دن کی ہے! بس بھگوان چلتے ہاتھ پاؤں اُٹھا لے۔"

چاچی کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں سچ مچ ہی آنسو بھر آتے۔ تھوڑی دیر وہ چپ سادھے رہتی۔ اور پھر گٹھڑی اُٹھا کر لاٹھی ٹیکتی اور رام نام جپتی کسی اور گھر کی راہ لیتی۔

کہتے ہیں اس کا گھر والا چالیس سال پہلے ندی میں نہاتا ہوا ڈوب کر مر گیا تھا۔ آل اولاد کچھ تھی نہیں۔ اس دن سے آج تک بیوگی کی پہاڑ جیسی زندگی کو چاچی نے اسی گٹھڑی کے سہارے گھوم گھوم کر کاٹا تھا۔ لیکن اب اس کے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے تھے۔ تھوڑی سی دُور چل کر ہانپ جاتی۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی دینے لگا تھا۔ ہاتھوں کی کھال سوکھ کر نیچے لٹک گئی تھی۔ گاؤں میں اب اُس کا پھیرا بھی کم ہی ہوتا تھا۔ جب بھی ہم سے کوئی اس کے گھر کی طرف جا نکلتا تو زہرہ دادی کی خیریت ضرور پوچھتی۔ کہتی:

"شمشو نے کچھ خرچہ ورچہ بھیجا——؟"

"... چاچی——" ہم میں سے کوئی جواب دیتا۔" اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر شمشو کو بُرا بھلا کہنے لگتی۔

زہرہ د... دماغ چل گیا ہے چاچی۔ جب بھی ڈاکیہ گاؤں میں آتا ہے، وہ ... ہے ہم بچوں کو۔ شمشو کا منی آرڈر آیا ہوگا۔ شمشو کا منی آرڈر آیا ہوگا۔ پر کہاں؟ اب تو اس کا خط پتر بھی کم ہی آتا ہے۔" کوئی دوسرا بول اُٹھتا۔

اور جب کافی دن گذر جاتے تو چاچی صبح ہی صبح لاٹھی ٹیکتی "ہوں ہوں" کرتی سڑک پر آتی دکھائی دیتی۔

ایک دن آئی تو میری ماں نے کہا۔ "کل شمشو کا منی آرڈر آیا ہے ...: زہرہ دادی بہت خوش ہے۔ جا، بدھائی تو دے آ اُسے۔"

چاچی نے سُنا تو باچھیں کھل گئیں۔ بولی:

"بھگوان بھلا کرے اُس کا۔ بُرا بیٹا اور کھوٹا پیسہ کبھی نہ کبھی کام آ ہی جاوے ہے——اچھا میں چلوں——"

اور وہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی زہرہ دادی کے گھر کی طرف چل دی۔

لوٹ کر آئی تو بہت اُداس تھی۔ میری ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بولی: "بڑا اجمانا آ گیا ہے بہو۔ کوئی کسی کے کام نہ آوے۔ بس اب تجھ سے کیا کہوں——" اور وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

ماں نے اصرار کیا تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی:

"چکر مت کرنا بہو۔ اپنا جان کر تجھے بتائے دوں ہوں۔ کبھی اپنے بھلے کے دِنوں میں دس روپیہ دے دئے تھے میں نے جہرو کو۔ کھیال تھا اب پیسے آئے ہیں تو لوٹا دے گی۔ پر کہاں بہو۔ اُس نے تو سانس تک نہیں لی۔"

"بھول بھال گئی ہوگی بے چاری——" میری ماں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا،

"ابھی نہیں——کرج کا کھایا بھی کوئی بھولے ہے——" چاچی نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "بڑی کھراب نکلی جہرہ تو——"

اور پھر بہت دیر تک چاچی دُنیا والوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی کا گلہ کرتی رہی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی رہتی کہ اب اس سے کام کاج کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھوں سے اتنا کم سُجھائی دینے لگا ہے کہ سوئی میں ڈورا تک نہیں پرو سکتی۔ گٹھڑی پیٹھ پر لاد کر چلنے کی بھی سکت اب اس میں نہیں رہی۔ روٹیوں تک کے لالے پڑ گئے ہیں۔

ماں نے تھال بھر کر چاول اس کی گود میں ڈال دیئے۔

"نا——نا بہو رہنے دے۔ اس کی کیا جرورت ہے۔" چاچی کے لاکھ انکار کرنے پر بھی ماں نہیں مانی۔ اور وہ ماں کو ساتھ گھر بھر کو دُعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ مہینے کی ٹھیک ان تاریخوں کو جب شمشو کے منی آرڈر آنے والا ہوتا، کسی نہ کسی طرح رینگتی گھسٹتی زہرہ دادی کے یہاں آتی۔ اور کچھ بیٹھ کر مایوس لوٹ جاتی۔ لوٹتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ماں کے پاس ضرور آتی۔ کہتی:

"جہرہ کے یہاں گئی تھی۔ پر کیا بتاؤں بہو——تکا جا بیں کر روں ناہوں کھو دسے اُسے سرم آوے نہیں۔ ایسا اندھیر بھی کہیں نا دیکھا تھا——"

زہرہ دادی کو بُرا بھلا کہنے میں ماں اس کا ساتھ دیتی۔ اور پھر اُسے سمجھاتے ہوئے کہتی:

"تقاضہ تو کرنا ہی پڑے گا لچھمی۔ سیدھی انگلیوں گھی کہاں نکلے ہے مانگے بنا کام نہیں چلے گا۔"

"نا۔ نا بہُو! جُبان سے کچھ نا کہوں گی۔" چاچی مُنہ پر ہاتھ رکھ کر کہتی:

"پھر تو کہے تو میں کہدوں۔" ماں پُوچھتی۔

"نہیں نہیں تو بھی مت کہیو۔ نہیں دیتی تو نا دے۔ بھگوان بھلا کرے اس کا۔" چاچی سختی کے ساتھ ماں کو روک دیتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔

شمشو پردیس سے لوٹا تو گاؤں بھر میں دُھوم مچ گئی۔ خُوب ٹھاٹھ میں تھا۔ کوٹ پتلون ڈاٹے ہوئے، کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی، ساتھ میں بہت سارے پھل اور مٹھائیاں۔ زہرہ دادی نے محلہ بھر میں مٹھائی تقسیم کی۔ گھر گھر پوتے کی تعریف کرتی پھری۔ مجھے بُلا کر کچھ کیلے اور مٹھائی دی۔ بولی:

"جا، لچھمی چاچی کو دے آ۔"

کافی دِن چڑھ گیا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ میں چاچی کے گھر پہنچا تو وہ ابھی تک اپنی پھٹی پُرانی گدڑی میں لپٹی پڑی تھی۔ اور اس کے ٹُوٹے پھوٹے گھر میں ایک عجیب سی خاموشی مُسلّط تھی۔ میں نے دُور ہی سے آواز دی—

"چاچی— چاچی— دیکھ تیرے لئے کیا لایا ہوں—؟"

چاچی نے رضائی سے مُنہ باہر نکالا۔ پُوچھا— "کیا ہے؟"

میں نے تھال اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا— "زہرہ دادی نے بھیجے ہیں تیرے لئے۔ شمشو بھیّا آئے ہیں کل—" اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ پُوچھے میں باہر نکل آیا۔

اگلے دِن لچھمی چاچی آئی تو میری ماں سے بولی:

"سُنا ہے شمشو آیا ہے—؟"

"ہاں!" میری ماں نے کہا— "اور ساتھ میں بہت سارا سامان بھی لایا ہے— جا تو بھی اپنے پیسے مانگ لے۔"

"ہاں بہُو! اب کے نا چھوڑوں— بے گیرت بن کر بول ہی دوں گی۔ سرافت میں کام نا چلے گا۔"

چاچی نہ جانے کن حالات کے تحت اب کی بار تقاضا کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"اور پھر اپنا قرضہ مانگنا ہے۔ بھیک تھوڑی مانگنی ہے۔" ماں نے بڑھاوا دیا۔ "کل آئی تھی میرے پاس، بڑی تعریفیں کرتی تھی شمشو کی۔ کہتی تھی— "بنئے کا تو سارا پیسہ چُکا دیا۔ دس بیس اور رہ گئے ہیں اِدھر اُدھر کے۔ وہ بھی نبٹا دوں گی۔ لگے ہاتھوں تو بھی مانگ لے۔"

"سب کا دے دیا، میرا کیوں نہیں دے گی۔ سایَد سا پھر کہدوں گی اب کے۔" چاچی نے تِنک کر کہا۔ اور مجھ سے بولی:

"چل بیٹا۔ جرا مجھے جُہرہ کے گھر تک پہنچا دے۔ کیڑا کانٹا اب سُجھائی نا دیوے ہے۔" اور میں چاچی کا ہاتھ پکڑ کر زہرہ دادی کے یہاں لے گیا۔ شام کا وقت تھا۔ دادی چُولھے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو لپک کر آئی۔ بولی:

"بہت دِنوں میں آئی لچھمی— اچھی تو ہے!"

"ہاں بہن! سُنا تھا شمشو بیٹا آیا ہے۔ اُسے دیکھنے چلی آئی۔ اب مجھ سے چلا پھرا نا جاوے ہے۔"

اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر باتوں میں لگ گئیں۔ دادی نے شمشو بھیّا کی لائی ہوئی ایک ایک چیز اُسے دِکھائی۔ دیر تک پوتے کی تعریفیں کرتی رہی۔ اور جب لچھمی چاچی جانے کے لئے اُٹھی تو دادی نے تھوڑے سے لڈّو چاچی کے پلّو میں ڈالتے ہوئے کہا:

"کبھی کبھی تو آ جایا کر لچھمی۔ تجھے دیکھے آنکھیں ترس جاتی ہیں۔"

"پر یہ لڈّو میں کیا کروں گی بہن!" لچھمی چاچی نے پلّو سمیٹتے ہوئے کہا— "میرے کون بیٹھا ہے کھانے والا—"

لیکن دادی نے زبردستی اس کے پلّو میں گرہ لگا دی۔

جب ہم لوٹنے لگے تو دادی ہمیں چھوڑنے کے لئے دروازے تک آئی اور چاچی کو رُخصت کرتے ہوئے بولی:

"بھگوان ہی تو نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا بدلہ تو بھگوان ہی دے گا۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی تیرے لئے۔ تو نے بُرے دِنوں میں میری مدد کی تھی۔ بھگوان تیری مدد کرے گا۔ میں ہاتھ جوڑ کر تیرے دام واپس کر رہی ہوں نے لے انہیں سنبھال —"

اور یہ کہہ کر دادی نے دس روپیہ کا ایک نوٹ لچھمی چاچی کی طرف بڑھا دیا۔

چاچی چلتے چلتے یک لخت رُک گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ گھبرا کر بولی:

"نا — نا بہن — میں نہیں لوں گی۔ میں نے کوئی کرجا تھوڑی دیا تھا تجھے۔ تو انہیں رکھ۔ بھگوان تجھے بہت دے —" اور وہ لپک کر آگے بڑھ گئی۔

دادی نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ اس کی جیب میں ڈالنا چاہا۔ لیکن وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی اور دھیرے دھیرے لاٹھی ٹیکتی ہوئی اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔

"اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج پھر لچھمی چاچی نے مجھ سے پوچھا ہو — بھو بیٹا کس کا ہے؟"

اور میرے جواب پر خوش ہو کر اس نے کپڑے کی ایک خوبصورت سی گیند میری جیب میں ٹھونس دی ہو!

کشمیر کے ایک مزاحیہ شاعر (صفحہ [illegible] سے آگے)

اگر آنا ہوا تو ایک فلمی گیت گائے گا
مری میت پر وہ حسب روایت نوحہ خواں کیوں ہو
دم گفتار جو بیوی سے اکثر بات کہتا ہے
سرِ منبر وہی واعظ بڑا معجز بیاں کیوں ہو

غرض قاضی غلام محمد کے کلام میں زندگی اور زندہ دِلی کے جن عناصر کی فراوانی ہے ان سے کسی قوم کے مزاج اور ماحول کے سمجھنے میں بڑی مدد مِل سکتی ہے۔ نیا کشمیر جن ولولوں اور اُمنگوں کی آماجگاہ ہے ان سے اس کلام کے مطالعے کے بعد نہ صرف آگاہی ہوتی ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جان دار اور پُر لطف شاعری کس قسم کے ماحول میں نمودار ہو سکتی ہے۔

قاضی صاحب نے سنجیدہ کلام بھی لکھا ہے اور وہ بھی ان کے مجموعے "حرفِ شیریں" میں بطورِ حصہ دوم شامل ہے اور وہ قدیم اور جدید اسالیب سخن کے ایک ایسے امتزاج سے معمور ہے جو ایک فطرتی اور بے لوث شاعر ہی کے موئے قلم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ نقاشی بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے تصور سے اپنے ماحول کے ایسے رنگا رنگ نقشے صفحۂ کاغذ پر بکھیر دیتے ہیں جو کشمیر کے دوسرے فن کاروں کی صنعت گری اور نقش و نگار سے زیادہ دیرپا اور دُور رس اثرات کے حامل ہیں:

"تعمیر" میں چھپنے والی نِگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
(۲) نگارشات کا خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف ہونا ضروری ہے
(۳) منصوبہ بند ترقی سے متعلق مضامین ترجیحی طور پر طلب کئے جاتے ہیں
(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے مضامین بھی شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں
(۵) نگارشات میں ظاہر کی گئی آرا سے حکومت جموں و کشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

شمیم کرہانی

یاد آتا ہے!

برستے ہیں جو فضا سے دہکتے انگارے — تو مجھ کو ابرِ بہارِ گام یاد آتا ہے
اُجاڑ صبح جو ہوتی ہے رہگزاروں میں — تو ڈل کا حُسنِ سرِ شام یاد آتا ہے
ہوا جو رُکتی ہے، ہوتا ہے حبس کا عالم — نسیمِ باغ کا پیغام یاد آتا ہے
جھلکنے لگتی ہے نظروں میں شام جہلم کی — دُولر کی صبح کا ہنگام یاد آتا ہے
ہوا کے دوش پہ گلمرگ کی فضاؤں میں — وہ ایک سلسلۂ جام یاد آتا ہے
مئی کی دھوپ سے جلتی ہیں جس گھڑی آنکھیں — نظر کو ابرِ سیہ فام یاد آتا ہے
حیات جلتی ہے تپتے ہوئے مکانوں میں — ہمالیہ کا خنک بام یاد آتا ہے
ہوائے گرم سے دہلی کا لالہ رُخ ہے [illegible] — سرینگر کا گُل اندام یاد آتا ہے
میں کیا کروں کہ مرے جذبۂ پرستش کو — نگار خانۂ اصنام یاد آتا ہے
جو محوِ کار ہے کشمیرِ نو کی دھرتی پر — وہ دِل کا حوصلۂ عام یاد آتا ہے
ملی ہے خالدِ کشمیر کی تڑپ جس کو — وہ کاروانِ سُبک گام یاد آتا ہے

نہ آؤں یاد میں بستانِ کاشمر کو شمیم
مجھے تو وہ سحر و شام یاد آتا ہے

نذرِ خالدِ کشمیر

کشمیر ہندوستان کا!

جوڑ اس کا ہم ہی سے ہے کوئی کچھ ہانکے
لگائے ہیں ریاضی ٹانکے
پانچ سو ستر اعداد سے
سو ستر ہی ہیں ہندوستان کے

ڈاکٹر شفا گوالیاری (بھوپال)

دیویندر اِسّر

ہندوستانی کلچر اور قومی یکجہتی

ہندوستانی تہذیب نہ صرف دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہے بلکہ اس میں ارتقا کا مسلسل عمل کارفرما ہے جس کے باعث آج بھی ہندوستانی کلچر زندہ ہے اور مسلسل پروان چڑھ رہا ہے۔ ہندوستانی کلچر کی نشو ونما کا سب سے بڑا باعث وہ قوت ہے جس سے مختلف نسلوں، مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کی رُوح اس کے اندر جذب ہوتی چلی گئی اور یہ سب ایک مشترک تصور میں بندھتے چلے گئے۔ اس مشترک کلچر کی تعمیر میں ادب، زبان، موسیقی، رقص، آرٹ اور فنِ تعمیر نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

ہندوستان میں مذہب، فرقے یا زبان کی بنا پر تفرقات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی بلکہ ان سے بالاتر ہوکر ایک مشترک کلچر کی تشکیل کا عمل جاری رہا۔ ہندوستان میں ہر مذہب کے پیرو کار بغیر کسی خوف کے اپنے اپنے عقائد کے مطابق ہندوستان کی سماجی زندگی میں اپنا رول ادا کرتے رہے ہیں۔ مذہب میں تبدیلی یا کسی مذہب کی اشاعت بزورِ شمشیر نہیں ہوئی بلکہ اس کا ذریعہ مختلف النوع مناظرے اور بحث ومباحثے قرار پائے۔ قرونِ وسطیٰ کی تواریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستان میں مذہبی مناظرے اکثر منعقد کئے جاتے تھے جن میں مختلف مذہبوں کے پیروکار باہم مباحث کے ذریعہ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مباحثوں کا اثر سب فرقوں کے لوگوں پر پڑنا اگزیر تھا۔ اس لئے سب مذہبوں میں ایک طرح کا اشتراک قائم ہوگیا تھا۔ ہرش وردھن کے دَور میں ایسے ہی ایک مناظرے کی رُوئیداد ملتی ہے۔ جس کی صدارت یوان چوانگ نے کی تھی۔ کئی ہزار بودھ بھکشو اس مناظرے میں شامل ہوئے تھے جن میں بودھ مت کے دونوں فرقے، ہین یان اور مہایان — شریک تھے۔ ان کے علاوہ قریب تین ہزار برہمن اور جینی بھی شامل تھے۔ روایت ہے کہ یوان چوانگ کی دلائل سے متاثر ہوکر ہرش وردھن نے مہایان اسکول کی فلاسفی کو قبول کرلیا۔ ہندوستان میں ایسے کئی بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے جو بحث ومباحثہ سے متاثر ہوکر اپنے خیالات میں تبدیلی کر لیتے تھے۔ جنوبی ہند کے فرمانرواؤں میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی رواداری، فراخ دلی اور صلح وآشتی کا جذبہ بدرجۂ اُتم موجود رہا ہے۔ ہندوستانی کلچر اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ دقیانوسی خیالات سے متاثر ہوکر دوسرے مذاہب کے لوگوں کو جبر و ستم کا شکار بنانا ہر مذہب کی رُوح کے خلاف ہے۔ اسی باعث دوسرے دیشوں سے لوگ مذہبی جبر اور تعصب کا شکار ہوکر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ روم سے سیرین عیسائی پہلی صدی عیسوی میں ٹراونکور میں آکر بس گئے تھے اور ہندوستان میں عیسائیت کا پرچار شروع ہوگیا۔ یہودی مہاجرین بھی ہجرت کرکے ہندوستان میں ہی آزادی کا سانس لینے لگے۔ زرتشت جنوبی ایران سے بھاگ کر ہندوستان کے مغربی ساحل کے قریب تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اُن کے پیروکار آج بھی پارسی فرقے

کی حیثیت سے ہندوستان میں باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں حملہ آور اور فاتح کی حیثیت سے وارد ہوئے پنڈت نہرو کے الفاظ میں ہندوستان نے اُنہیں فتح کر لیا اور وہ ہندوستان کے ہی باسی بن گئے۔

ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی تشکیل میں سب سے زیادہ اہم اور ہمہ گیر رول سنت کویوں اور صوفی شعرا نے ادا کیا۔ جو مذہب، زبان، رنگ، نسل، قوم اور فرقے سے بالاتر انسانی اخوت اور مساوات کے پیامبر تھے اور وحدت میں یقین رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مذہبی تعصبات اور تنگ نظری کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اُن کا پیغام سارے ہندوستان میں گونج اُٹھا۔ جس کے باعث ہندوستان گیر بھگتی تحریک کا پرچار شروع ہو گیا۔ اس تحریک نے انسانی تعظیم اور ایک خدا کی پرستش پر زور دیا۔ بھگتی تحریک نے ہندوستان کے ہر فرقے کو متاثر کیا۔ یہ تحریک محض اہلِ علم و دانش یا خواص تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا رشتہ براہِ راست عوام سے تھا اور اس کے پیامبر عوام سے متعلق تھے اور اُن کی زبان میں ہی وہ اپنا پیغام سُناتے تھے۔ کبیر، گورو نانک، داود، چیتنیہ مہاپربھو، نامدیو، تکارام جیسے شاعروں اور سنتوں نے اس تحریک کو قبولِ عام بخشا۔ اسی رُوحانی پس منظر میں خواجہ معین الدین چشتی رح، بابا فرید پاک پٹن والے اور دکن کے سید گیسو دراز کی رُوحانیت اور انسانی اخوت، صُلح و آشتی اور مذہبی رواداری کے خیالات کی اشاعت ہوئی۔ ان سب شعراؤں اور راہ نماؤں نے ہندوستانی کلچر کو از حد متاثر کیا اور مشترک کلچر کی جڑوں کو مضبوط کیا اور سارے ہندوستان کو ایک رُوحانی تصور میں باندھ دیا۔ اس تحریک میں سب فرقوں، سب علاقوں، سب زبانوں کے صوفی اور سنت شامل تھے۔ جنم سے برہمن چیتنیہ کو ہی اپنے ایک اچھوت شاگرد کے ساتھ گاؤں گاؤں گھوم کر بھجن گا گا کر انسانی اخوت کے پیغام سُناتا رہا۔ راما نند کے پیروکاروں میں موچی، نائی، جاٹ، کسان اور مسلمان جولاہا شامل تھے۔ اُن کے پیروکاروں میں سب سے زیادہ مشہور کبیر ہے جس کے بھگت ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ یہی مقبولیت گورو نانک دیو کو نصیب ہوئی۔ ان سنتوں کے خیال میں رام اور رحیم ایک ہی ہستی کے مختلف نام ہیں۔ اللہ اور ایشور ایک ہی ہیں، خدا نہ مندر میں ہے نہ مسجد میں، نہ بنارس میں نہ مکہ میں، بلکہ اپنے بھگتوں کے دل میں ہے۔ کبیر کے دوہے آج بھی اُتر پردیش اور پنجاب میں مقبول ہیں۔ گورو نانک دیو نے پنجاب کے لوگوں کو از حد متاثر کیا۔ گورو ارجن دیو کے "آدی گرنتھ" اور گورو گوبند سنگھ کے "گرنتھ صاحب" میں سنت اور صوفی پیامبروں کے دوہے، گیت اور کبت شامل ہیں اور اس میں مذہب اور فرقے کی کوئی تفریق نہیں، صرف ایک خیال ہے خدا کی وحدت کا اور انسان کی اخوت اور مساوات کا۔ احمد آباد کا صوفی شاعر داود دوئی صاف کرنے والا تھا جس نے اسی پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔ اکبر بھی سولھویں صدی کے ہندوستانی صوفیوں سے متاثر ہوا۔ اور اُس نے ایک نئے مذہب "دینِ الٰہی" کی بنا ڈالی اور ایک مشترک عبادت خانے کی تعمیر کی جس میں ہر مذہب اور فرقے کے پیروکار خدا کی بارگاہ میں برابر کے شریک ہو سکتے تھے۔

مذہبی رواداری اور مساوات کے اسی ماحول میں مذہبی اصلاح کی نئی نئی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ان آدرشوں پر یقین رکھتی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان میں سماجی بدعتوں اور مذہبی تفرقات کے خلاف پرچار کیا اور برہمو سماج کی بُنیاد ڈالی۔ وہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، اُردو اور بنگلہ کے ماہر تھے۔ اُنہوں نے خدا کی وحدت پر ایک مقالہ فارسی زبان میں تحریر کیا اور اُس کی تمہید عربی میں لکھی۔ ۱۸۳۰ء میں اُنہوں نے ایک ایسی عبادت گاہ کی بُنیاد رکھی جس میں سب انسان بلا لحاظ مذہب و ملت پرستش کر سکتے تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے اُسی شاندار روایت کو مستحکم کیا جس کی بُنیاد بھگتی تحریک اور اکبر کی آزاد خیالی نے رکھی۔ اسی روایت کو جدید ہندوستان میں گاندھی جی نے پروان چڑھایا اور ہندوستان کے کونے کونے میں

قومی یک جہتی، مذہبی رواداری اور مشترک کلچر کی لہر دوڑادی۔ اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد، اچھوت اُدھار، اور ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لئے جو کوششیں کیں وہ دراصل ہندوستان کے مشترک کلچر اور قومی یک جہتی کی لازوال مثال پیش کرتی ہیں۔ گاندھی جی کی شہادت نے اسی مشترک کلچر کی شاندار روایت پر مہر ثبت کردی اور یہ ثابت کردیا کہ ہندوستان ایک ہے، اپنے مختلف مذاہب اور زبانوں کے باوجود بھی اس کی رُوح ایک ہے۔ اس کا ماضی، حال اور مستقبل مشترک ہے۔

تواریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں زبان کی بنا پر تعصب نہیں تھا بلکہ سب زبانیں اپنی اپنی سرزمین میں اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی کررہی تھیں۔ سنسکرت سب زبانوں میں ایک مشترکہ رشتے کا ذریعہ بن گئی اور مختلف زبانوں کے اسکالر سنسکرت کا مطالعہ کرتے تھے۔ جس کے باعث ان زبانوں پر سنسکرت کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سنسکرت کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ ہندوستان کی قریباً سب زبانوں میں شروع ہو گیا تھا۔ تامل میں سکند پران اور مہابھارت (آٹھویں صدی) رامائن (گیارہویں صدی) تلیگو میں مہابھارت (گیارہویں صدی) کنڑ میں مہابھارت اور رامائن (دسویں اور بارہویں صدی) بنگالی میں رامائن اور مہابھارت (چودہویں صدی) بھاگوت (پندرہویں صدی) کے تراجم پیش کئے گئے۔ ہندی میں تلسی داس کی رام چرت مانس سولہویں صدی کی مقبول ترین تخلیق تھی جس کا مطالعہ ہندوستان کے کونے کونے میں ہونے لگا۔ آسامی زبان کا آغاز (تیرہویں صدی) میں پران اور مہابھارت کے تراجم سے ہی ہوا۔ اور چودہویں صدی میں رامائن کا آسامی ترجمہ کیا گیا۔ شودر شعرا سرول داس اور بل رام داس نے مہابھارت، رامائن اور بھاگوت کا منظوم ترجمہ کیا۔ سنسکرت کے ادبِ عالیہ کے تراجم کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں ملیالم، کنڑ، تیلیگو، بنگلہ، مراٹھی، ہندی وغیرہ کی ترقی بھی جاری رہی۔

بنگلہ میں چنڈی داس اور چیتنیہ مہاپربھو، میتھلی میں ودیاپتی، شمالی ہندوستان میں رامانند، کبیر، میرا، ولبھ آچاریہ اور گورونانک جنوبی ہند میں سادھو ویدانت، گیانیشور اور ولیشیکا وغیرہ مختلف علاقائی زبانوں میں ایک ہی کلچر کی نمایندگی کررہے تھے ـــــ اس مشترک کلچر نے ایک نئی زبان کی تشکیل کی ـــ اُردو جسے ہندو اور مسلمان شعرا اور دانش وروں نے ایک بے مثال زبان بنادیا۔ غالب، اقبال، سرشار، پریم چند، فراق اور سینکڑوں دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے اس زبان کو ہندوستانی تہذیب اور روایات کی نمایندہ زبان کا درجہ دیا اور مشترک کلچر کی روایت کو مستحکم کیا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ادب اور زبان کی ترقی میں جہاں کسی قسم کا لِسانی تعصب کارفرما نہیں تھا۔ وہاں مذہبی عقائد بھی اس کی راہ میں حائل نہیں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ادب اور زبان کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ اور اس میں اُنہوں نے کسی قسم کی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بنگال کے فرمانروا علاؤالدین حسین شاہ اور اُس کے فرزند نصیرالدین نصرت شاہ نے بنگالی زبان کی سرپرستی کی اور اس میں سنسکرت کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ کرایا۔ حسین شاہ کی ایما پر ملادھر دسُو نے بھاگوت پُران اور بھگوت گیتا کو بنگلہ میں پیش کیا۔ نصرت شاہ کی سرپرستی میں مہابھارت کا بنگلہ ترجمہ کیا گیا۔ رامائن کا ترجمہ بھی ایک مسلمان بادشاہ کی سرپرستی میں ہی ہوا۔ کئی مسلمان بادشاہوں نے ہندو اور مسلمان اسکالرز کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سنسکرت کے معیاری ادب کے ترجمے فارسی میں کریں جن سے مسلمان فیض حاصل کرسکیں۔ اُنہوں نے ہندوستان کی تواریخ اس نظر سے مرتب کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستانی کلچر کی وحدت کو اُجاگر کیا جاسکے۔ زین العابدین والیٔ کشمیر نے ہندو اور مسلم کلچر کی یگانگت کے لئے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اس یگانگت کی اشاعت میں وہ اکبر کے پیش روؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے ہندو پنڈتوں کی مدد سے اتھرو وید

اور رامائن کا ترجمہ کیا اور ہندوؤں نے بھی فارسی نثر و نظم میں رامائن کے تراجم پیش کئے۔ مہابھارت کا ترجمہ ملا عبدالقادر کے علاوہ ہندو اور مسلمان اہلِ دانش نے بھی کیا۔ ہندو اسکالرز نے ریاضی اور طبعی علوم کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں پیش کیا۔ امیر خسروؔ جو شاعر بھی تھا اور موسیقار بھی، مشترک کلچر کے نمایندہ پیش رووں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی کلچر کی وحدت میں سب سے زیادہ اہم کام اکبر نے ہی کیا ہے۔ اس نے ہندو اور مسلمان شعرا، موسیقاروں اور فن کاروں کی سرپرستی کی۔ انہیں اپنے نو رتنوں میں شامل کیا۔ اکبر کے دور میں سور داس نے اپنا کلام پیش کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں نے ہندی شاعروں کی سرپرستی کی اور ہندی میں کلام تخلیق کیا۔ کہا جاتا ہے کہ خود اکبر نے بھی ہندی میں شاعری کی ہے۔ ہندو اور مسلمان شعرا نے فارسی اور ہندی میں اپنا کلام پیش کیا۔ ملک محمد جائسی نے اودھی میں اپنی مشہور تصنیف پدماوت پیش کی۔ اس کسان نے ہندی شاعری کو عظمت عطا کی۔ ان شعرا کی شاعری میں ہندو روحانیت کا بڑا گہرا اثر ملتا ہے۔ فیضی نے لیلاوت کا فارسی ترجمہ پیش کیا۔ اس طرح ہندو اور مسلمان شعرا نے مشترک کلچر کی ترقی کے لئے ایسا کام کیا جو تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

دارا شکوہ کو ہندو فلسفے میں بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے اپنشد بھگوت گیتا، یوگ وششٹ کے تراجم فارسی زبان میں پیش کر کے ہندو اور اسلامی روحانیت کی بنیادی مماثلت پر روشنی ڈالی اور خود بھی روحانیت کی اس مشترک قدر پر ایک فلسفیانہ کتاب لکھی۔

مشترک کلچر کی تشکیل محض مذہب، ادب یا زبان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ جمالیات کے دوسرے شعبوں میں بھی یہی عمل جاری رہا۔ ہندوستانی فنِ تعمیر میں ہندی اور مسلم طرزوں کا امتزاج ملتا ہے۔ بودھ اور جینی طرز، ہندو اسٹائل اور ترک ایرانی عناصر سب نے مل کر مغل اسٹائل کو جنم دیا۔ جو خالصتاً کلاسیکی ہندوستانی اسٹائل بن گیا۔

اور جس کا نادر نمونہ تاج محل ہے۔ تاج محل کی تعمیر دراصل اس مشترک کلچر کی نشو و نما کا عروج ہے جو مختلف طرزوں کے امتزاج سے پیدا ہوا اور جو ہندوستانی ماحول اور سرزمین میں ہی ممکن ہے جس میں سب طرزوں کو جذب کرنے اور پھر اسے کلاسیکی طرز میں ڈھالنے کی قوت ہے۔ اسی مشترک کلچر کے نمونے ہندوستانی مصوری میں بھی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ ہندوستانی مصوری میں بھی ترکی، ایرانی اور ہندی اثرات کے امتزاج سے نئے اسٹائل رائج ہوئے۔ ہندو اور مسلمان بادشاہوں نے آرٹ کی سرپرستی کی۔ جے پور، کانگڑہ اور جموں طرزِ مصوری پر مغل اسٹائل کا نمایاں اثر پڑا ہے۔ آج بھی جدید ہندوستانی مصوری میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے فن کار موجود ہیں جن کی ایک خصوصیت مشترک ہے کہ وہ ہندوستانی کلچر کی روایت کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی نمایندگی سب سے زیادہ موسیقی کے شعبے میں نظر آتی ہے۔ بنگال، جنوبی ہند اور شمالی ہند میں سنگیت کے طرز ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ مذہب، زبان اور صوبے کی حدیں سنگیت کی لہروں میں بہہ جاتی ہیں اور ہم صرف ایک بات محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روح کی گہرائیوں میں کوئی ایسی آواز گونج رہی ہے جو ہمیں ایک ایسی مسرت سے روشناس کراتی ہے جو ہندوستان کے باسی ہونے کے ناطے ہم محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستانی کلچر کی روایت اس بات کی شاہد ہے کہ اس میں مختلف قسم کے نظریے، تصورات اور رجحانات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ان سب میں وحدت ہے اور وہ ایک ہی روح کے مختلف پیکر ہیں۔ ہمارا ورثہ مختلف مذہبوں یا زبانوں کی الگ الگ میراث نہیں بلکہ وہ ہمارا مشترکہ کلچرل ورثہ ہے جس کی ترقی میں ہندوستان کے ہر باشندے کو کوشاں رہنا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس کلچر کی ترقی کے لئے اقلیتوں کے کلچرل ورثے کو بھی عزیز سمجھ کر اس کو پھلنے پھولنے کے مواقع مہیا کرنے ہیں۔ جدید ہندوستان کی سماجی، معاشی اور کلچرل زندگی

 دراصل مشترکہ کلچر کی روایات کو مجموعی طور پر قبول کرتی ہے اور اس

جشنِ آزادی

پھر چمن میں بہار آئی ہے
سرخوشی کے پیام لائی ہے
ہر روش بن گئی ہے خلدِ نگاہ
ہر کلی محوِ خود نمائی ہے

ہو کے خوش قمریاں ہیں نغمہ طراز
ہو کے خوش بُلبلیں غزل خواں ہیں
ہر طرف چھائی ہے خوشی ہی خوشی
غنچے مسرور، پھول شاداں ہیں!

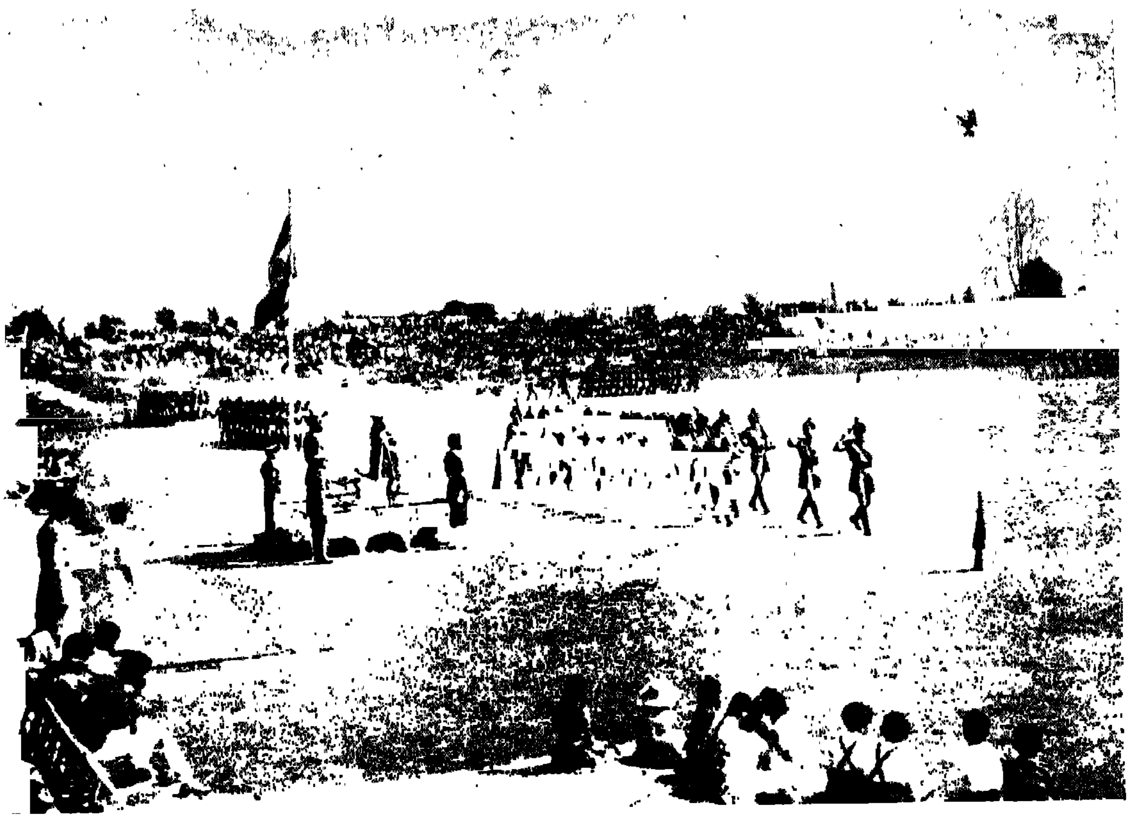
پھر سرِ میکدہ گھٹا چھائی
آج رندوں کی عید ہے ساقی
ہر طرف چھائی ہے خوشی ہی خوشی
آج یومِ سعید ہے ساقی

رند ہوں اور تیرے نام کی خیر
نہ رہے لب پہ اور نام کوئی
ساقیا! آج ایسا دَور چلے
نہ رہے آج تشنہ کام کوئی

نصیر

معصوم ارادے

آزاد آج ہم ہیں، آزاد ہے زمانہ
اے نونہالو! چھیڑو "جمہور کا" ترانہ
کلیاں چٹک رہی ہیں، پھولوں پہ تازگی ہے
ہر شاخِ گلستاں کی مستی میں جھومتی ہے
رُت آئی ہے سہانی، ہر شے پہ ہے جوانی
سرسبز لہلہاتی کشمیر کی یہ وادی
یا چاندنی میں کوئی پھولوں کی شاہزادی
پیروں میں اپنے پائل باندھے ہوئے کھڑی ہے
یہ تاج یہ اجنتا سانچی کا یہ دیہارا
دِلّی بھی ہے ہماری کشمیر بھی ہمارا
بھارت کی سمت کوئی دیکھے نہ آنکھ اُٹھا کر
آؤ نوید آؤ! جبّا دید تم بھی آؤ
چیکو کہاں چھپے ہو؟ جگدیش کو بُلاؤ
ہاتھوں میں لو ترنگا دو سب کو یہ سندیسہ
کوئی نہ اب کسی کا دھرتی پہ خون اُچھالے
سیوا کریں وطن کی ہم نوجواں جیالے



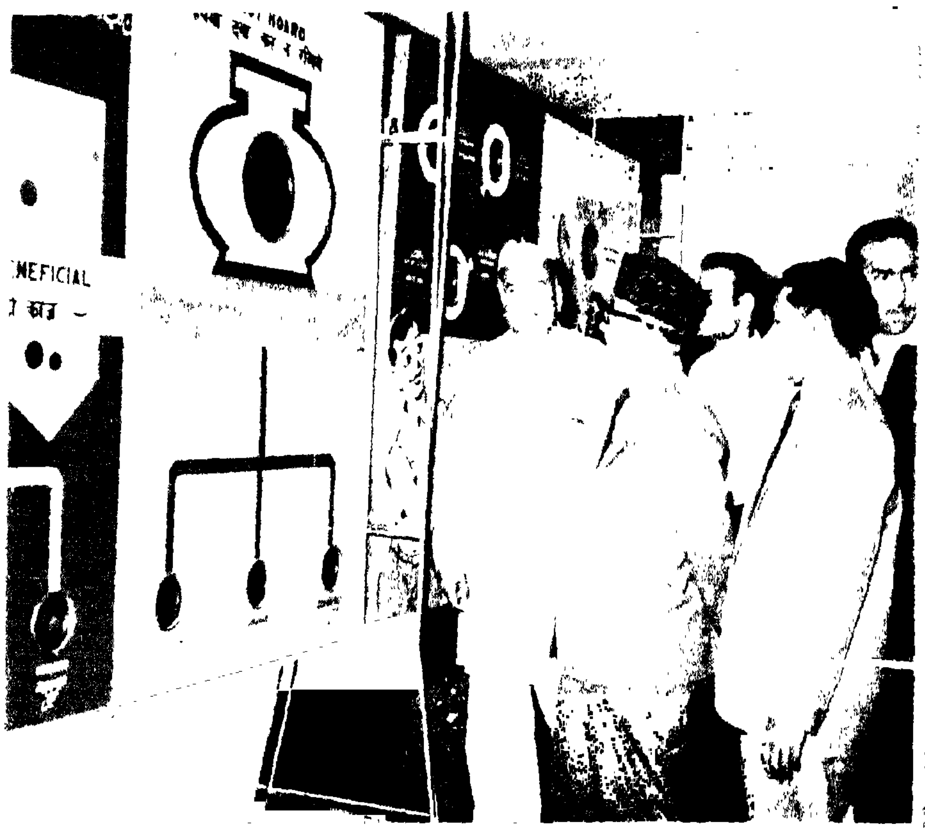
صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ
یوم آزادی کی مبارک تقریب
پر سلامی لے رہے ہیں —



وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد جشن کشمیر کی
افتتاحی تقریب میں ——



یوم سودور کی آمد پر ـ دہ خالد کشمیر عوام سے مخاطب ہیں—



جناب غلام محمد [illegible] جنہوں نے سرینگر میں ۱۹ ویں صنعتی نمائش کا افتتاح کیا نمائش کے اردو اسٹال کا مشاہدہ کر رہے ہیں—

ڈی جنڈ   جھاکباں
۴



اظہار مسرت
لتشمودی مغذ روں ا ایک طا نمه

"بہا بو"



ته قوالی



شرمتی یشو راج لکشمی یوم خواتین
پر انعامات تقسیم کر رہی ہیں



[illegible] کی سرگرمیوں میں طالبات
بھی اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں

محمد یاسین صداقت

کشمیر کے تمدنی جشن

ریاست جموں و کشمیر میں انواع و اقسام کے جشن منائے جاتے ہیں۔ دن بھر کی محنت اور مشقت کے بعد جب کسان اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی قسم کے تفریحی سامان کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جشن اور تمدنی میلے ان دیہاتیوں کو غم و آلام سے چھٹکارا دلاتے ہیں اور وہ زندگی کے لطیف احساسات سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک غریب کسان دُکھ درد بھول کر خوشی اور مسرت کے جذبات سے ہم کنار ہوتا ہے۔

جشن یا تمدنی میلے منانا کشمیریوں کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان میلوں میں بعض ایسے ہیں جو محض مذہبی نوعیت کے تہوار ہوتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق تمام فرقوں کے ساتھ ہوتا ہے اور لوگ بلاتخصیصِ فرقہ ان میلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ان سب میں زیادہ رنگین اور دلچسپ وہ میلے ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف کسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ دیہات کے یہ میلے مختلف موسموں میں منعقد ہوتے ہیں۔ بہار ہو یا گرمیاں، جاڑا ہو یا سردیاں، ہر موسم میں کوئی نہ کوئی تمدنی میلہ ہوا ہی کرتا ہے۔ دیہاتیوں کو ان میلوں میں شرکت کرنے سے تفننِ طبع اور تفریح و مشغلے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

موسم بہار کی آمد کا خوش آمدید بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تمام فرقوں کے لوگ بہاریہ رنگ رلیوں میں شمولیت کرتے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں صوبہ جموں میں وہاں کے کسان سردیوں کے خاتمہ کا جشن "لوہڑی" کے نام سے مناتے ہیں۔ اس دن رنگ برنگ کی پوشاکیں پہنی جاتی ہیں۔ بچے اور بوڑھے شادماں ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔ مور کی شبیہ بنا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جس میں اونٹوں کو بھی سجا کر شامل کیا جاتا ہے۔ بچے مور کی شبیہ کے اردگرد ناچتے اور گاتے ہیں۔ یہی وہ ایام ہوتے ہیں جب جموں کے دیہات میں تیلیا بیج کی فصل پک جاتی ہے۔ کسان اپنی محنت کا ثمرہ دیکھ کر خوشی میں جھوم اُٹھتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں بہار کی معجزہ نمائی کارفرما ہوتی ہے۔ شاخ و شجر پر قانونِ فطرت کے مطابق رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ آب و گل اور برگ و بار میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑتی ہے۔ کشمیر میں بہار کو "سونتھ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بھلا کشمیر کے باشندے "سونتھ" کے اِس رُوح پرور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتے ہیں؟ قدرت کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرنے سے اُن کا احساسِ لطیف جاگ اُٹھتا ہے اور بہار کی خوشیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔

موسم بہار کا اوّلین جشن بادام واری کا میلہ کہلاتا ہے، جو اب سینکڑوں برسوں سے ایک روایتی میلے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر اعظم کے زمانے میں تعمیر کئے گئے قلعہ ہاری پربت کے دامن میں واقع بادام کے شگوفے کا منظر واقعی قابلِ دید ہوتا ہے۔ شوق اور مسرت کے جذبات سے بھرپور کشمیری بادام کے ان باغات میں جا کر اور "سماوار" میں گرم گرم چائے تیار کر کے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

موسم بہار کے علاوہ کشمیر کے بقیہ تین موسموں یعنی "ہار"، "ہرُد" اور "وندہ" میں بھی مختلف میلے منعقد ہوتے ہیں۔ جس طرح ہندوستان کے دیگر حصوں میں بیساکھی، دسہرہ، ہولی، شیوراتری وغیرہ کے تہوار منائے جاتے ہیں اسی طرح کشمیر میں بھی منائے جاتے ہیں۔ لیکن کئی تہوار ایسے بھی ہیں جو محض کشمیریوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں اچھابل اور [illegible]

کا میلہ، گاندربل میں قمر صاحب کا میلہ اور عیش مقام کا پھرآد میلہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مقامات کشمیر کے ٹورسٹ نقشے میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے دیہاتی، گرمیوں کے آغاز میں جب کھیتوں میں ابتدائی کام سے قدرے فارغ ہو جاتے ہیں تو وہ بیج بہاڑہ اور اچھبل میں جمع ہو کر "جشنِ دہقانان" میں شمولیت کرتے ہیں۔ امسال اچھبل کا میلہ ۲۰ جون کو اختتام پذیر ہوا۔ اس سے قبل دو روز تک یہ میلہ بیج بہاڑہ اور اسلام آباد (اننت ناگ) میں ہزاروں دیہاتیوں نے حصہ لیا۔ اس جشن میں حسبِ معمول شہنائیاں بجائی جاتی ہیں، ڈھول بجتے ہیں۔ "بھانڈ" یعنے دیہاتی رقاص اپنے رقص و فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، شمشیر بازی ہوتی ہے اور گھوڑے پر ایک نقلی دولہا سوار کر کے اس کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ کسان اپنے کھیتوں کے کام کو چند روز کے لئے بھول کر ان رنگ رلیوں میں شامل ہو کر محظوظ ہوتے ہیں۔

عیش مقام میں بھی امسال اپریل کے مہینے میں حسبِ معمول ایک ہفتہ تک جشن جاری رہا۔ قریب قریب تین لاکھ دیہاتیوں نے اس جشن میں شمولیت کی۔ زین شاہ صاحب رحؒ کی زیارت پر سالانہ عرس کی تقریب پر مشعلوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ڈھول اور شہنائی بجنے کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن کی جاتی ہیں اور زیارتِ عالیہ کے دامن میں مشعل بردار دیہاتی اُس واقعہ کی یاد دلاتے ہیں جب حضرت زین شاہ صاحب رحؒ پہلی بار عیش مقام میں وارد ہوئے تھے اور اُن کی بدولت باطل کی قوتوں پر حق و صداقت کی جیت ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عیش مقام کی غار میں ایک آدم خور دیو رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ سانپوں سے بھرا پڑا تھا۔ زین شاہ صاحب رحؒ کی آمد پر یہ دیو اور سانپ نابود ہو گئے۔ اور عیش مقام میں انسانوں کی آباد کاری ممکن ہو سکی۔

یہ تمام جشن اور میلے سبھی فرقوں کے لوگوں کے ساتھ مشترک طور پر وابستہ ہیں۔ مثلاً نوروزِ عالم وغیرہ کئی تہوار ایسے بھی ہیں جو ہندو دیوتاؤں یا مسلمان اولیا کے یادگاری ایام کے طور پر منائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے قدیم شعرا اور مفکرین کی یاد میں بھی دن منائے جانے لگے ہیں۔ حبہ خاتون، رسول میر، مہجور وغیرہ شعرا کے ایام اب باقاعدگی کے ساتھ ہر سال منائے جاتے ہیں۔ ان شعرا کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اُن کے کلام کو پھر سے تازہ کیا جاتا ہے اور اس طرح کشمیر کے تمدنی ورثہ کو پھر سے سنوارنے اور نکھارنے کی سعی و کوشش کی جاتی ہے۔ ان تقریبات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کشمیریوں کو اپنی تمدنی عظمت کا احساس ہونے لگا ہے اور وہ تہذیب و تمدن کی نشاۃ ثانیہ کے لئے نئے شاعروں اور ادیبوں، مفکروں اور محققین کی خدمات کا استفادہ کرنے لگے ہیں۔

جموں و کشمیر کو آزاد ہوئے اب کوئی پندرہ برس کا عرصہ گزرا ہے۔ سیاسی لحاظ سے آزاد ہونے کے بعد حکومت نے اوّلین توجہ معاشی ترقی اور سماجی بہبود کی طرف دی۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے حکومت نے بجا طور پر تمدنی ترقی اور ذہنی نشوونما کی طرف دھیان دینا شروع کیا ہے، درسگاہوں میں کھیل کود، گانے بجانے، مصوری اور نقاشی، رقص و مروجہ ڈرامہ وغیرہ امور میں تربیت دی جانے لگی ہے۔ اس کے علاوہ جشنِ کشمیر کے نام سے ہر سال سرکاری اہتمام سے مختلف مقامات پر تمدنی میلے منعقد ہوتے ہیں۔ اگست ستمبر میں وادیٔ کشمیر کے اندر اور جنوری فروری میں صوبہ جموں میں یہ جشن منایا جاتا ہے۔ ان جشنوں میں رنگا رنگ اور دلچسپ پروگرام پیش ہوتے ہیں۔ جو عوام اور سیاحوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ امسال بھی کشمیر میں ۱۵ ار اگست سے جشن کی یک ماہی تقریبات شروع ہوئیں جو ۱۲ ار ستمبر تک جاری رہیں گی۔ اختتامی تقریب شبِ شالیمار ہوگی جو ایامِ جشن میں بہترین اور بے بدل شب تصور کی جاتی ہے۔

جیسا کہ وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد نے فرمایا ہے جشنِ کشمیر کا مدعا یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اُن کی تمدنی عظمت کا احساس دلایا جائے اور نئی پود کی قابلیت (TALENT) کو اُجاگر کیا جائے۔

"انسان صرف کھانے پینے سے ہی زندہ نہیں رہ سکتا۔ حقیقی زندگی تو ذہنی اور رُوحانی ترقی میں مضمر ہے۔ میرا خیال ہے کہ جشنِ کشمیر یہ کام بخوبی سر انجام دیتا ہے۔"

—— شری جگ جیون رام

تعمیر

فضا ابنِ فیضی

غزل

کیوں دیکھتے ہیں آپ مجھے بے بسی کے ساتھ — آنکھوں میں آگئے تھے کچھ آنسو ہنسی کے ساتھ
رُخ پر ترے پڑی تو وہ اِک پھول بن گئی — اُٹھی تھی جو نگاہ بڑی بے دلی کے ساتھ
کیا کیجئے شعورِ غمِ دِل کے باوجود — ہم نے فریب کھائے بڑی سادگی کے ساتھ
پہلو ہے ایک یہ بھی ترے التفات کا — اپنا لیا غموں کو بھی ہم نے خوشی کے ساتھ
اس باب میں ہے اہلِ جنوں کا یہ فیصلہ — دِل کے معاملات نہ رکھ آگہی کے ساتھ
کیوں راہ روک لی ہے حدِ ممکنات نے — میں دو قدم چلا تھا ابھی تو کسی کے ساتھ
دُنیا سمٹ کے کل مرے قدموں میں آگئی — اِک آہ کی تھی، جذبۂ خود رفتگی کے ساتھ
سیراب کیا ہو رُوح کہ خود غالباً شراب — ساغر میں ڈھل گئی ہے مری تشنگی کے ساتھ
رُخسارِ دِل نواز پہ گیسو بکھیر لو — ہاں! رات بھی تو چاہیئے اس چاندنی کے ساتھ
بے اختیار رو پڑی شبنم یہ دیکھ کر — گستاخ ہے نسیمِ سحر کیوں کلی کے ساتھ
آجائے گی مذاقِ طبیعت میں پختگی — لمحاتِ غم گزار دے آسودگی کے ساتھ
تہذیبِ زندگی کے لئے ہے یہ لازمی — وابستہ حادثات رہیں زندگی کے ساتھ

اُس چشمِ نازنین کا سب احسان ہے فضاؔ
مجھ پر جو تہمتیں ہیں مری شاعری کے ساتھ

کبیر احمد جائسی

موازنہ "باغ و بہار" و "فسانۂ عجائب"

میر امن اور رجب علی بیگ سرور دونوں ہی اُردو نثر نگاری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طرز میں درجۂ کمال رکھتے ہیں دونوں اپنی اپنی منفرد تہذیبوں کے نمائندے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش سے اُردو ادب کے دلدادوں کو متاثر کیا ہے۔ دونوں ہی کا اُردو ادب پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے فنِ داستان گوئی میں وسعت پیدا کی جس سے جدید افسانہ نگاری کا فن بات کہنے کے انداز سے آشنا ہوا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی دو پسندیدہ چیزوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دیکھتی ہے کہ اس میں کون سی چیز بہتر ہے اور بہتری کی وجہ کیا ہے؟ فنِ موازنہ کی آفرینش اسی انسانی جذبہ کی مت کش ہے۔ لیکن موازنہ کے لئے باہم دو اشیا میں مطابقت ہونی چاہیئے ورنہ موازن کا کام حد درجہ دشوار ہو کر رہ جائے گا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے اسلوب قصے کے مرکزی خیال اور کرداروں میں کوئی مطابقت نہیں ہے تو عقل حیران ہو کر رہ جاتی ہے کہ ان کا باہم موازنہ کیسے کیا جائے؟ ایسے موقع پر عقل کا یہ فیصلہ قابلِ قبول ہوتا ہے کہ پہلے ایسی دو متضاد تصانیف کے اوصاف بیان کر دئے جائیں اور بعد میں دونوں کے اوصاف کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ کون سا وصف دوسرے وصف سے زیادہ بلند اقدار کا حامل ہے اور ایسا کیوں ہے۔ اس لئے ہم بھی ان دونوں تصانیف کا الگ الگ مطالعہ کریں گے۔ بعد ازاں دونوں کے اوصاف پر مجموعی نظر ڈال کر موازنہ کی شرط پوری کر دیں گے

باغ و بہار

جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے باغ و بہار کا اصل فارسی قصہ مشہور شاعر امیر خسرو کا تصنیف کردہ ہے جو صدیوں سے قبولِ عام کی سند حاصل کرتا چلا آرہا ہے۔ اوّل اوّل اس کو تحسین نے "نوطرزِ مرصع" میں اُردو کا جامہ پہنایا۔ یہ نقشِ اوّل تھا ضرورت نقشِ ثانی کی متقاضی تھی جو اس میں پہلے آب و رنگ بھر سکے۔ چنانچہ قرعۂ فال میر امن کے نام پڑا اور انہوں نے اس قصہ کو کچھ ایسی وسعت دی کہ اس میں تخلیق کی شان پیدا ہو گئی۔ کسی نثری یا شعری شہ پارے کو قبولِ عام کی سند پانے کے لئے [illegible] پہلے جس منزل سے گزرنا ہوتا ہے وہ اسلوب کی منزل ہوتی ہے۔ نظم ہو یا نثر، بات کا انداز اور اپنی بات سے دلوں کو موہ لینے کا فن ہی کسی فن کار کی قدر و قیمت متعین کرا سکتا ہے۔ ایسے فن کار اپنی بات میں وہ زور، وہ اثر اور وہ جوش پیدا کرتے ہیں۔ جذبات کی ترتیب و تہذیب میں ایسی کاوش کرتے ہیں کہ ان کے قلم سے ناگفتنی بھی گفتنی کے روپ میں ڈھل کر نکلتی ہے۔ یہی ایک بڑے فن کار کا کمال ہے اور جب تک کوئی فن کار اس کمال سے نا آشنا ہوگا، بڑا فن کار نہیں بن سکتا۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے

style is the man جو حقائق پر مبنی ہے۔ مصنف کی شخصیت کا اثر اس کے اسلوب پر پڑتا ہے اور لاشعوری طور پر اس کا اسلوب اس کی شخصیت کی اچھائیوں اور خامیوں کا حامل بن جاتا ہے۔ مرنجاں مرنج طبیعت اسلوب میں البیلاپن پیدا کرتی ہے۔ پاک و صاف طبائع کا اسلوب نزہت و پاکیزگی کا حامل ہوتا ہے۔ مشتعل طبیعتوں کے حامل حضرات کا اسلوب پُر جوش اور جذبات میں ہیجان پیدا کر دینے والا ہوتا ہے۔ غرضیکہ مختلف طبائع کا اثر اسلوبِ بیان پر مختلف طریقوں سے پڑتا ہے۔ باغ و بہار کا اسلوب بھی اسی اصول کا پابند ہے۔ اس میں مصنف اور اس کی تہذیب کی سادگی، سلاست، نرم روی، رکھ رکھاؤ سب ہی کچھ آشکارا ہے۔

باغ و بہار کی طرزِ نگارش کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ یہ دعویٰ کر لینے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ہم سادگی کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب کس چیز کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں چند باتیں عرض کر دینی بے جا نہ ہوں گی۔ سادگی سے لوگ عام طور پر یہ معنی لیتے ہیں کہ جو بات کہی گئی ہو وہ بغیر کسی کاوش کے سمجھ میں آ جائے اور اس بات میں کوئی ایسا دقیق فلسفیانہ مسئلہ نہ بیان کیا گیا ہو۔ جہاں تک پہنچنے سے ذہنِ انسانی قاصر رہے۔ یعنی خیالات اور اندازِ بیان دونوں کے لحاظ سے بات عام فہم ہو۔ اگر اندازِ بیان سلیس اور شستہ ہے مگر بات میں پیچیدگی موجود ہے تو اس کو ہم سادگی کی مثال قرار نہیں دے سکتے لیکن ہمارے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سادگی کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ عام فہم استعمال کئے جائیں، تشبیہات اور تلمیحات میں زیادہ دقت پسندی نہ ہو۔ جملوں کے اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو بات کہی جائے اس کے اندازِ بیان میں ایک ایسی جدت ہو جس کی وجہ سے لوگ اس بات کو نئی اور انوکھی بات سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم باغ و بہار کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ:

"اس کا ہر فقرہ، ہر ٹکڑا سلیس و فصیح ہے اور اس سے عبارت میں ایسی روانی پیدا ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا قصے کی دلچسپی سے قطع نظر ہو کر اس کی روانی میں [illegible]"

مثلاً یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"صبح کو جوگی مانند آفتاب کے نکل آیا اور دریا میں نہایا دھویا اور پار جا کر پھر آیا اور بھبھوت بھسم تمام بدن میں لگایا وہ گورا بدن مانند انگارہ کے راکھ میں چھپایا اور ماتھے پر ملاگیر کا ٹیکہ دیا۔ لنگوٹ باندھ کر انگوچھا کاندھے پر ڈالا۔ بالوں کا جوڑا باندھا۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر چڑھواں جوتا اُڑا لیا..."

اس عبارت میں سادگی، روانی، فصاحت، کسی بھی وصف کا دامن ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹنے پایا ہے۔ اس کے علاوہ داستان اور افسانہ نگاری کا اسلوب اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ کہانی پن کے تمام زندہ اور متحرک اجزا اس کے سانچے میں رچ بس جائیں۔ میر امن نے داستان گوئی کے اس تقاضے کو بھی مدِنظر رکھا ہے اور غالباً اسی لئے وہ کہیں کہیں سامع پر عالمِ تحیر طاری کرنے کے لئے مافوق الفطرت اشیا کا بھی اس بے تکلف انداز میں تذکرہ کر جاتے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کی جیتی جاگتی چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ اس موقع پر اس زندگی کے کردار کا تذکرہ خاص طور [illegible] وہی ہے جس کو پہلے درویش کی سیر میں پیش کیا گیا ہے۔ سلطانِ دمشق کی بیٹی جس سوداگر پر عاشق تھی اس کے حسن و جمال کا تذکرہ جس بھرپور انداز سے اس سے اس کی اصل تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن جب ہم اس کو سلطانِ دمشق کی شکیل و جمیل بیٹی کو چھوڑ کر ایک کالی کلوٹی بدوضع بدہیئت کنیز سے عشق کرتے اور اس کی محبت میں آہیں بھرتے دیکھتے ہیں تو ہم کو دنیا کی نیرنگی پر بڑا تعجب ہوتا ہے اور ہمارا جی خواہ مخواہ کے لئے یہی چاہنے لگتا ہے کہ ہم عشق کی ماہیت و اصلیت پر بھی چند لمحوں کے لئے رک کر غور کرتے چلیں۔ اس بات سے ہمارے دلوں میں جو حیرت پیدا ہوتی ہے وہ [illegible] زیادہ روانی کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے اور ہم [illegible] قصے سے اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی بات خواجہ سگ پرست کے کردار کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جب ایک قاری یہ پڑھتا ہے کہ خواجہ سگ پرست اپنے دونوں بھائیوں کو پنجروں میں بند رکھتا ہے اور ان کو ایک [illegible] اور جب [illegible] میں مثل و جواہر ملتے ہوئے ہیں تو ہم کو خواجہ سگ پرست کے کردار سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اس نفرت کے پہلو بہ پہلو ہم کو حیرت بھی ہوتی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور یہی حیرت ہمارے دل کو خواجہ سگ پرست کے احوال اس کی زبان سے سننے پر مجبور کرتی ہے۔ غرضیکہ سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ اسلوبِ بیان کے اس تحیر نے بھی باغ و بہار کی قدر و قیمت میں گراں بہا اضافے کئے ہیں۔

اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ باغ و بہار کے اسلوب کی ایک خاص خصوصیت اس کی روانی بھی ہے۔ اب ہم اسی نکتے کی قدرے وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ الفاظ کی برجستگی اور ان کا برمحل استعمال اور لہجے کا آہنگ جملوں ہی کسی عبارت کو رواں بنانے کا ضامن ہوتا ہے۔ ان اوصاف کو پیش

نظر رکھتے ہوئے جب ہم باغ و بہار کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تب بھی ہم کو ایسی شیں ملتی بلکہ ہر ہر سطر میں ہم کو یہ خصوصیت نمایاں ملتی ہے۔ مثلاً یہ عبارت ملاحظہ ہو :-

"میں نے اس کاغذ کو جو دیکھا ایک تصویر نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بندہ مارے ڈر کے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا بہت خوب! میں رخصت ہوتا ہوں۔ اگر خدا کو میرا بھلا کرنا ہے تو بموجب حکم حضور کے مجھ سے عمل میں آئے گا۔ یہ کہہ کر بیارک کو ہمراہ لے کر جنگل کی راہ لی۔ گاؤں گاؤں بستی بستی شہر شہر ملک ملک پھرنے لگا اور ہر ایک سے اس کا نام و نشان تحقیق کرتا۔ کسی نے نہ کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں یا کسی سے مذکور سنا ہے۔ سات برس تک اسی عالم میں حیرانی و پریشانی کو سہتا ہوا ایک نگر میں وارد ہوا۔ دیکھا عمارت عالی اور آباد، لیکن وہاں کا ہر ایک متنفس اسم اعظم پڑھتا تھا اور خدا کی بندگی عبادت کرتا تھا ... "

صرف ایک ہی عبارت نمونتہً پیش کی جا رہی ہے۔ اس عبارت میں ایک لفظ بھی زائد یا بلا وجہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ کسی لفظ کو ہٹا کر اس کی جگہ پر دوسرا لفظ رکھ دیں تو ہم اس میں بھی ناکام رہیں گے۔ اچھی نثر کی ایک صفت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا کوئی لفظ بیکار نہیں ہوتا۔ نثر نگار کی صناعی کا یہی کمال ہے کہ وہ جو لفظ جہاں جس موقع پر استعمال کر جائے اس کو وہاں سے ہٹایا نہ جا سکے۔ غرضیکہ "باغ و بہار" کا اسلوب نگارش سب داستانوں سے زیادہ دل کش اور دل نشین ہے جس کو بقولِ وقار عظیم "ہر مکتبۂ خیال کے نقادوں نے سراہا ہے۔"

فسانۂ عجائب

یہ رجب علی بیگ سرور کا کارنامہ ہے جو لکھنؤی تہذیب اور لکھنؤ اسکول کی نمائندگی کرتا ہے۔ مغلیہ کے زوال کے بعد جب نوابینِ اودھ کو شاہانِ اودھ کا خطاب ملا تو انہوں نے اپنی معاشرت کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی جو بیرونی اثرات سے یکسر پاک رہی۔ لباس، طرزِ تکلم، آدابِ نشست و برخاست شعر و ادب غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اہلِ لکھنؤ نے دہلی والوں کے خلاف بغاوت کر کے اپنے لئے ایک نیا معاشرہ قائم کیا۔ اس کا اثر وہاں کے ادب پر بھی پڑا۔ چونکہ وہاں کی زندگی بڑی رنگا رنگ بو قلموں اور تصنع آمیز ہو گئی تھی اس لئے وہاں کا ادب تکلف و تصنع کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جب ہم اس نقطۂ نظر سے فسانۂ عجائب کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لکھنؤی تہذیب کی رنگا رنگی اور اس کے تصنع کی غمازی کرتا ہے۔ ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں کہ مصنف کی شخصیت کا اثر اسلوبِ بیان پر بھی پڑتا ہے۔ سرور لکھنؤ کے رہنے والے اور شاہانِ اودھ کی ٹھاٹھ باٹھ دیکھے ہوئے تھے اس لئے ان کا اسلوبِ بیان بھی تصنع اور تکلف کا حامل ہو گیا۔ لکھنؤی تہذیب کی تمام نزاکتیں ان کے اسلوبِ بیان میں موجود ہیں۔ تکلف، تصنع اختلاع جگت لفاظی سطر سطر میں نمایاں ہے۔

غالباً اسی وجہ سے سرور کے طرزِ بیان کو نقادوں نے غیر فطری طرز کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کو پڑھتے وقت ہم کو قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور ہم الفاظ کے طلسم کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک معنی کا تعلق ہے ان کو اتنے دبیز اور رنگین پردوں میں چھپا دیا گیا ہے کہ ان تک نگاہوں کا پہنچنا دشوار تر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بھی ایک طرز تھا جو قدیم زمانے کی یادگار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر پڑھا لکھا انسان عربی و فارسی سے مکمل طور پر آشنا ہوتا تھا اور اس دور میں رنگینی و ثقافت ہی کو حاصلِ علم سمجھا جاتا تھا۔ بقول وقار عظیم "اس کی قدر دانی کے لئے عارضی طور پر قدیم ذہنیت پیدا کیجئے۔ ہر جملے کے ٹکڑوں کو رُک رُک کر صحیح عطف و اضافت کے ساتھ پڑھیئے اُس وقت اس کا مزہ آئے گا۔"

فسانۂ عجائب کے اسلوب کا مزید مطالعہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل عبارتوں پر ایک غائر نظر ڈال لیجئے :

"سرزمینِ ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد جنت نژاد رشکِ محبوبانِ جہاں قابل بود و باش محبوبانِ زماں شمیم اس کی معطر کن دماغ و جاں مسکن اہلِ تقلب ... [illegible] زمین اس کی رشکِ چرخ بریں ... [illegible] بلندیٔ فلک ہفتمیں۔ گلی کوچہ ... [illegible]

"والیٔ ملک وہاں کا شاہ گردوں وقار، پُرتمکین با اقتدار، سکندر سے ہزار خادم دارا سے لاکھ فرمانبردار، کیقباد شوکت کاؤس حشم، مالک تخت و تاج والا مرتبت عالی مقام شہنشاہ فیروز بخت نام ... "

نمونہ کے لئے یہی دو عبارتیں کافی ہوں گی۔ پہلے اقتباس میں مینو سواد کے لفظ کی وجہ سے جنت نژاد کا لفظ التزاماً لایا گیا ہے۔ جہاں اور زماں کا قافیہ بھی اسی التزام کا نتیجہ ہے۔ غرضیکہ ایک ذرا سی بات کو اتنا زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے کہ اس کا اصل مقصد (معنی) رنگین الفاظ کے دبیز پردوں میں چھپ کر رہ جاتا ہے۔ سرور کے سارے جملے تکلف اور تصنع کی کڑیوں میں اس بُری طرح جکڑ جاتے ہیں کہ قصے کے اصل مفہوم تک ہماری رسائی مشکل ہو جاتی ہے اور ہم اس جال کو توڑنے سے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ان کی تشبیہات و استعارات میں لطف سہی، تلمیحات میں رنگینی و جاذبیت سہی لیکن یہ پُر تکلف انداز ہم کو اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس قصے کے کردار ہم کو اپنی دُنیا کے نہیں بلکہ کسی دوسری دُنیا کے کردار معلوم ہوتے ہیں جن سے ہم کو نہ کوئی محبت ہو پاتی ہے اور نہ ہی ان کے لئے ہم اپنے دل میں ہمدردی کے کچھ جذبات ہی محسوس کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پنڈت برج نرائن چکبست نے فسانۂ عجائب کی کردار نگاری پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ سرور ہم کو سارے لکھنؤ کی سیر ضرور کراتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جن جن اشیا کی سیر ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ سب غیر متحرک اور مردہ ہیں۔

سرور کے اسلوب بیان میں طمطراق، دھوم دھام اور رنگینی تو ہے مگر اس میں ایک خاص کمی کا احساس ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جذبات نگاری کے فن سے بالکل ناآشنا ہیں۔ جذبات نگاری [illegible] اسلوب کا حامل ہو تو ہنستے ہوئے انسان کو رُلا اور روتے کو ہنسا سکتا ہے۔ مگر فسانۂ عجائب کا پورا کا پورا قصہ [illegible] سے خالی ہے۔ اگر سرور کا تخلیق کردہ کوئی کردار روتا ہے تو اس کردار کے رونے سے سرور قصہ میں جو تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اس میں یکسر ناکام رہتے ہیں۔ غالباً اسی ناکامی کی وجہ یہ ہو کہ پورا کا پورا لکھنؤ اسکول غم کے صحیح مفہوم اور عرفانِ غم سے ہمیشہ سے ناآشنا رہا ہے۔ ظاہری طور پر تو بہت سی رونے پیٹنے کی باتیں لکھنؤ اسکول میں مل جائیں گی۔ مگر اصل غم کی تصویر ڈھونڈھ نکالنی دشوار ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کے نظم و نثر کے تمام نمایندے جذبات نگاری سے قاصر رہے ہیں۔

غرضیکہ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فسانۂ عجائب ایک طرز کی پیشوا ہے جس نے غیر فطری اسلوب کا حامل ہوتے ہوئے بھی اُردو نثر نگاری کی خدمت کی ہے۔

موازنہ

ان دونوں تصانیف کے اوصاف کا جب ہم یکجا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں کہ دیکھیں کون سی کتاب بلند انسانی اقدار کی حامل ہے اور کس میں بات اس انداز سے کہی گئی ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد کی مثال بن گئی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں تصانیف میں بعد المشرقین ہے۔ آج کی صحبت میں ہم کو ان دونوں ناولوں کے صرف اسلوب بیان ہی سے بحث کرنی ہے اس لئے ہم قصہ کے مرکزی خیال کردار نگاری، جذبات و منظر کشی سے قطع نظر کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ باغ و بہار کا اسلوب نگارش فطری ہے اور فسانۂ عجائب کا غیر فطری۔ باغ و بہار سادگی، سلاست اور فصاحت بیان کی نمایندگی کرتی ہے اور فسانۂ عجائب دقت پسندی اور ثقیل بیانی کی ترجمان ہے۔ باغ و بہار کا اسلوب بیان ایک آہستہ خرام دریا ہے جس کی روانی سے لطف اندوز بھی ہوا جا سکتا ہے اور اس کے پانی سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن فسانۂ عجائب اس کے برعکس پُرشور گدلا دریا ہے جس سے نہ تو محض نگاہ ہی کو حظ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا پانی انسان کے کسی کام آ سکتا ہے۔ باغ و بہار کے اسلوب بیان پر مافوق الفطرت ہستیوں کا عکس تقریباً نہیں کے برابر پڑنے پایا ہے جب کہ فسانۂ عجائب میں یہ عفریت ہر جگہ منہ کھولے بیٹھے ہم کو نگل جانے کے لئے تیار نظر آتی ہے۔ باغ و بہار کے چند جملے پڑھ کر [illegible] سے پورا پورا لطف لیا جا سکتا ہے اور مصنف کی بات کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر فسانۂ عجائب میں الفاظ کے طوطا مینا اُڑانے

گئے ہیں۔ دو دو تین تین صفحے کی عبارت پڑھ جائیے، اصل مفہوم و مقصد سے آشنا ہونا دشوار ہی نظر آئے گا۔ باغ و بہار کا اسلوب نگارش فطری اور اصل کے مطابق ہے جب کہ "فسانۂ عجائب" کا اسلوب غیر فطری اور اصل سے قطعاً ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ باغ و بہار کا اسلوب انسانی جذبات احساسات اور خیالات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے مگر فسانۂ عجائب کا اسلوب ایک پیٹ بھرے انسان کی چٹکلہ بازی سے زیادہ دقیع نہیں ہے۔ جس میں بے فکری ہے، کھلنڈرا پن ہے، ہنسنے ہنسانے کا جذبہ ہے لیکن کسی چیز کی حقیقت و ماہیت تک پہنچنے کا جذبہ اس کی تلاش و جستجو کی کاوش مفقود ہے۔ باغ و بہار کے اسلوب بیان نے جو جو مناظر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں وہ زندہ اور متحرک شکل میں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مگر فسانۂ عجائب کا ایک بھی کردار، ایک بھی منظر اس وصف کا حامل نہیں نظر آتا۔ یہاں ہر چیز پتھر کی مورتی ہے جو نہ تو اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے اور نہ ہی مسکرانے کی طاقت رکھتی ہے۔

انسانی فطرت یہی ہے کہ وہ اصل کو نقل پر اور سچ کو جھوٹ پر فوقیت دیتی ہے۔ اس وجہ سے باغ و بہار کو فسانۂ عجائب پر ہمیشہ فوقیت دی گئی اور دی جاتی رہے گی۔ کیونکہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب میں وہی فرق ہے جو سچ اور جھوٹ اور اصل اور نقل میں ہے۔ اسی وجہ سے باغ و بہار کے اسلوب بیان کو زندہ متحرک اسلوب بیان کہا گیا ہے اور فسانۂ عجائب کے اسلوبِ بیان کو جامد اور غیر متحرک۔ بقول وقار عظیم :-

"باغ و بہار کا قصہ فسانۂ عجائب، کی نسبت کہیں عظیم ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی حریف ٹھہرائی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ باغ و بہار ایک طرز کا پیشوا ہے اور فسانۂ عجائب دوسرے طرز کا۔ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ مذاقِ سلیم کا تقاضا ہے کہ فطرت کو تصنع پر ترجیح دی جائے، اُس کی روی کو شگفتگی سے کہیں بہتر سمجھا جائے، باغ و بہار کو فسانۂ عجائب سے زیادہ پسند کیا جائے ..."

پریم چند کے ناول اور نئی رومانیت

[illegible] کے گہرے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ پریم چند کے فن کو حقیقت [illegible] ہے کہ ان کی زندگی کی تصویر کشی میں بھی مثالیت اور [illegible] کام کر رہی ہے۔ حقیقت نگاری میں ان کا ذہن تخیلیت اور جذباتیت سے علیحدہ نہیں ہے۔ یہی پریم چند کے فن میں کسانوں کی [illegible] حالت، مہاجن یا متوسط طبقہ کی زندگی، بیرونی اقتدار کے خلاف قومی جدوجہد، سماجی استحصال اور ظلم کے خلاف آواز، جذبۂ قومی، ناقص سماج کی [illegible]، ہندو مسلم اتحاد، بے لاگ حقیقت، تنقیدِ حیات، زندگی پر تبصرہ، گاؤں کی زندگی کا بیک گراؤنڈ، انسان دوستی، جذبات کے تقاضے، اپنے وقت کی [illegible]، زندگی کے ان بے نقوش، واقعات کے [illegible] پر نظر کہ انسان [illegible] کی [illegible]، اور [illegible] تیاگ [illegible] درمیانہ طبقہ کی کشمکش ——— ان تمام باتوں میں ان کے رومانوی ذہن کو پاتا ہوں۔ اگر ان کا رومانیت کا شدت [illegible] تو یہ عمارت یقیناً گر جاتی۔ یہی رومانیت [illegible] میں [illegible] کے فلسفے کے قریب لے جاتی ہے۔ اسی [illegible] سے کہیں نظر کی ہے اور جذبات کی [illegible]۔ یہی رومانیت کرداروں کو مثالی بناتی ہے۔ اسی سے پریم چند نظر کی دنیا میں [illegible] [illegible] اسی کے [illegible]

میں انسان کو زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ یہ رومانی ذہن [illegible] پہنچتا ہے کے قریب جاتا ہے اور جب وہاں تشنگی نہیں بجھتی تو کسی [illegible] تائید کے بغیر انسانی قدروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ [illegible] تکنیک کی یکسانیت سے بیزار ہے اور قدیم زندگی کے [illegible] ایک نئی زندگی کی خواہش اسے [illegible] نئی زندگی کے لئے یہ ذہن بغاوت کرتا ہے اور [illegible] میں [illegible] ڈھونڈتا ہے۔

فنی اور تعمیری نقائص پریم چند کے ناولوں میں موجود ہیں۔ [illegible] اور غیر منطقی اور غیر نفسیاتی ارتقا سے پریم چند کے بعض ناول [illegible] بننے سے رہ گئے ہیں۔ واقعات میں کوئی منطقی گرفت نہیں ہے۔ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ پیدا نہیں ہوتا، غیر ضروری تفصیلات [illegible] سے تعمیرِ ماجرا کو صدمہ پہنچتا ہے، کردار نگاری میں بھی غیر فطری [illegible] ملتا ہے۔ عزیز احمد نے بجا طور پر غلط نہیں کہا ہے کہ "پریم چند اخلاقی، معاشی، ذہنی، نفسیاتی ہر قسم کی اصلاحات ہر فرد اور ہر [illegible] پر اس طرح زبردستی عائد کرتے ہیں کہ نفسیات اس کی [illegible] ——— میدانِ عمل میں بھی ان کا معیار بلند نہیں ہے [illegible] سانچے میں ہر کردار ڈھلتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے بعض اہم اور بنیادی مسائل سامنے آتے ہیں، [illegible]

[illegible] اور [illegible] دوں میں ہم اچھی دیکھنے کی کوشش ہوتی ہے، لیکن حقیقت فن پر غالب بھی ہے۔ پریم چند کے جذبات اور احساس کی تلخی سے وحدتِ اثر پیدا نہیں ہوئی ہے، مختلف حصوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ کردار نگاری میں جذبہ، احساس، نیت، رویّہ، نفسیاتی عمل اور ردِ عمل پر نظر نہیں ہے، حقیقت کا ہر جگہ گہرا احساس ہوتا ہے، لیکن تلخی، مبالغہ، طنز اور وحدتِ اثر کی کمی سے یہ ناول حقیقت (Realism) میں گم ہو گیا ہے، فنی قدروں کا گہرا احساس دُور دُور تک نہیں ملتا، کردار ٹائپ اور کھلونے بن گئے ہیں۔ جہاں مصنف لے جانا چاہتا ہے، یہ کردار سر جھکائے ہوئے چلتے ہیں۔ گاندھی ازم سے جو گریز ہے اور عدم تشدد اور ستیہ گرہ کی حقیقت سے جو واقفیت ہے اُس کی تعریف اُسی وقت ہوتی جب فنی اعتبار سے یہ ناول پریم چند کی کمزوری کا ایک اشارہ نہیں بنتا اور اُس ناول کا ارتقا میکانکی نہ ہوتا، پورے ناول میں منطقی تسلسل کی اہمیت نہیں ہے۔ ضمنی کرداروں سے واقعہ بوجھل بن گیا ہے، طوالت سے تصنع اور ناہمواری کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ جو زندگی ملتی ہے وہ سطحی اور ہنگامی ہے۔ گہرائی اور گیرائی اور گہری معنویت کا فقدان ہے۔ طویل مکالمے اور زیادہ پریشان کن ہیں۔ کرداروں کے غیر فطری عمل سے توازن قائم نہیں رہتا۔ سمجھوتہ بازی کے تصور نے "میدانِ عمل" کے موضوع کا سارا حسن نچوڑ لیا ہے۔ اس ناول کی رومانیت، ان کی مثالیت میں اچھی طرح نمایاں ہوئی ہے۔ آدرش کرداروں کی تخلیق میں یہ رومانیت دیکھی جا سکتی ہے۔ امرکانت، سکھدا، سکینہ، کالے خان، نینا، یہ سب آدرش کردار ہیں۔ "حقیقت" بھی مثالیت کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے۔ مضمحل زندگی میں حرکت دیکھنے کی تمنا نے کتنے شیشوں کا استعمال کیا ہے، کہیں کہیں ذہنی کشمکش اور ذہنی اُلجھنوں اور جذباتی عمل اور ردِ عمل میں پریم چند کی تخلیت، مثالیت اور رومانیت اچھی طرح نمایاں ہوئی ہے سکینہ کی محبت بھی ایک جذباتی عمل ہے، ایک آدرش محبت۔ منّی کے کردار میں پریم چند نے جذبات، احساسات، نیت، رویّہ، عمل اور ردِ عمل کو جس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بیوگی کی اُلجھنوں اور نفسیاتی گھٹن کو جس طرح اُجاگر کیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے ہم ان کی فن کاری کے قائل ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار بہت سی تلخیوں کو لے کر آتا ہے، ہم اس کی ایک ایک مسکراہٹ میں تلخیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ فضا نگاری اور فطرت کے مطالعہ میں رومانی اسلوب کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

پریم چند کے جو کردار ہمیشہ زندہ رہیں گے اُن میں ہوری، دھنیا، بلراج، سمن، گیان شنکر اور نرملا کے نام آسانی سے لئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی مرتبہ پریم چند کے ناولوں میں محنت کش طبقہ کے لوگ ہیرو بن کر آتے ہیں، نفسیاتی واقفیت کا دائرہ پہلی بار اتنا وسیع ہوتا ہے، کردار اور فضا کا احساس پیدا کر کے واقعات کے ساتھ نفسیات کو جذب کر دینا بڑی بات ہے۔ پریم چند کے کامیاب ناول "گئودان" اور "گوشۂ عافیت" کی یہی خصوصیتیں ہیں، محبت اور معاشی مسائل، رومان اور سماجی حقائق کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ حقیقت کی پیچیدگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ فوق البشری قوت سے تیکنیک میں بھی بڑی لچک پیدا ہوئی ہے، تیکنیک ایک مکمل شعوری تخلیق نظر آتی ہے۔ پریم چند کی "آئیڈیالوجی" کی تشکیل میں تیکنیک کو اہمیت حاصل اور تکنیک کی تشکیل میں ان کی "آئیڈیالوجی" کی اہمیت ہے، طبقاتی زندگی سماجی مظہر کو پیش کرتی ہے۔ کسانوں کے درد و دُکھ میں شامل ہوتے ہوئے انہوں نے مغلوبیت اور افسردگی کو دُور رکھا۔ اس میں ان سے غلطی بھی ہوئی ہے، جب وہ اپنے خیالات کی وکالت کرتے ہیں اور غیر ضروری تفصیلات کو ناولوں میں پیش کرتے ہیں تو تعمیرِ ماجرا اور کردار کی تخلیق میں زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ "میدانِ عمل" "بازارِ حسن"، "چوگانِ ہستی" اور "پردۂ مجاز" کو مثال کے لئے سامنے رکھا جا سکتا ہے، یہاں زندگی کو صرف خارجی طور سے سمجھنے کی کوشش ہے اور داخلی طور سے سمجھنے کا کوئی گہرا خیال نہیں ملتا۔ یہ درست ہے کہ انسانی عمل کے ذریعہ حیاتِ انسانی متحرک نظر آتی ہے، لیکن اس عمل میں داخلی عناصر کی کشمکش، ان کا تضاد اور ان کی پیچیدگی بھی کام کرتی ہے، سماجی زندگی کے عمل اور حرکت کے قوانین کا علم بہت ضروری ہے۔ لیکن اُن داخلی قدروں کو بھی سمجھنا چاہیے جن پر خارجی حقیقتوں کا عکس ہے اور صرف عکس نہیں۔ یہ داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کا

کا تصیبر بھی ہیں۔ ان کے افسانے ان کے ناولوں کے برعکس فن کے زیادہ خوبصورت نمونے ہیں۔ اس لئے کہ اپنے افسانوں میں پریم چند نے داخلی عناصر، ان کے تضاد اور ان کی پیچیدگیوں کو زیادہ فن کارانہ طور پر پیش کیا ہے۔

پریم چند کی "آئیڈیولوجی" نے زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کر کے اور سامراج کے خلاف آواز بلند کر کے تکنیک کو بڑی وسعت دی ہے، شمالی ہندوستان کے کسانوں کے نمایندے اسی وجہ سے سارے ہندوستان کے نمایندے بن جاتے ہیں۔ دوسرے کردار بھی اپنی تہذیبی زندگی کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ایک سلجھے ہوئے نظریہ اور ایک پختہ شعور کی کارفرمائی ہر جگہ ملتی ہے (میں آئیڈیولوجی اور نظریہ کے الفاظ کسی فلسفیانہ اصطلاح کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں) انقلاب اور حرکت اور ارتقا کے پیچیدہ عمل کو مکمل طور پر سمجھنا ان کے لئے ممکن نہ تھا، لیکن اسے بھی سمجھنا چاہیئے کہ ان کا ذہنی اُفتاد گاندھی جی سے مختلف تھا، وہ کسی جگہ رُک نہیں گئے۔ اصلاحی تحریک کا بھرم ان کے سامنے ٹوٹ چکا تھا، گوشۂ عافیت کے ہیرو کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں :-

"زندگی اپنے نئے نئے تجربات کا مکتب نظر آتی تھی!"

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ کچھ ناقد (ہندی کے ناقد زیادہ پیش پیش ہیں) پریم چند کی گاندھی ازم کو ان کی بڑی خوبی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی ایک بڑی کمزوری ہے، اصلاحی تحریک سے متاثر ہو کر اور گاندھی ازم کے سہارے انہوں نے جہاں اپنے ناولوں کی بُنیاد کو مضبوط کرنا چاہا ہے کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے، ان کی اصلاح پسندی اور گاندھی ازم سے بھرپور ناولوں اور افسانوں کی بُنیاد پر انہیں رجعت پسند یا ترقی پسند کہنا غلط ہے۔ میدانِ عمل اور پردۂ مجاز کو گئودان اور گوشۂ عافیت کی موجودگی میں زیادہ اہم سمجھنا مناسب نہیں۔ گوشۂ عافیت میں کسانوں کی زندگی کے بُنیادی مسائل ملتے ہیں۔ یہ ناول ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت ملک میں عدم تعاون کی تحریک چل رہی تھی۔ یو، پی کے کسان باغی ہو رہے تھے۔ یہاں حقیقت نری حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ مثالیت اور تصوریت کے ساتھ ملتی ہے۔ ذاتی قربانی اور دُنیا کو تیاگ دینے کی تعلیم

باتیں ملتی ہیں۔ بُنیادی مسائل کے لئے اس وقت کوئی سماجی اور معاشی حل کی صورت صاف نہیں تھی۔ اس لئے اس ناول میں بھی رُوحانی سدھار کی طرف ایک پرواز ہے، گاندھی ازم کا اثر آخر میں ہے، چونکہ اس ناول میں اس زمانے کا ہندوستان اپنی تحریک کی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ ملتا ہے اس لئے اس کی اہمیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ اس ناول کی تصوریت اور مثالیت سے ان کے ذہن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے زندگی کی تعمیر کا ایک خواب ملتا ہے، یہ خواب ایک بڑے رومانی ذہن کا خواب ہے۔

روایتوں کے پیشِ نظر عزیز احمد نے لکھا ہے :

"اگر اس عرصہ میں پریم چند نے اُردو ناول کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوتا۔ پریم چند کا ناول منزلِ ارتقا میں اپنے پہلے کے ہر ناول نگار کے ناول سے کم سے کم ایک صدی آگے ہے۔" (ترقی پسند ادب صفحہ ۲۴۶)

روایتوں اور تکنیک کی بدلتی ہوئی صورت کے پیشِ نظر اس قسم کی باتیں حیرت انگیز معلوم ہوتی رہیں، اگر خُدانخواستہ پریم چند نے ناول نہ لکھے ہوتے پھر بھی انجام سے اتنی پریشانی کی ضرورت نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ پریم چند ایک بڑے افسانہ نگار ہیں، بڑے ناول نگار نہیں ہیں۔ انہوں نے بعض اچھے اور بہت اچھے ناول لکھے ہیں اور ان سے روایتوں کے پیشِ نظر مواد اور اسلوب دونوں میں کافی فرق پیدا ہوا ہے، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، گئودان، غبن، چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، میدانِ عمل — یہ سب اچھے ناول ہیں۔ تکنیک کی تبدیلی میں ان ناولوں سے بڑی مدد ملی ہے، موضوعات بھی اہم ہیں لیکن یہ تو مبالغہ کی حد ہے کہ پریم چند کا ناول منزلِ ارتقا میں اپنے پہلے کے ہر ناول نگار کے ناول سے کم سے کم ایک صدی آگے ہے۔ روایتوں پر گہری نظر رکھی جائے اور ہر فن کار کے ذہن اور اس کے ماحول کے رشتے کو دیکھا جائے تو پریم چند کے ناول اسی سلسلے کی کڑیاں نظر آئیں گے۔ وہ اپنی روایتوں، ذہنی پس منظر اور ماحول سے علیحدہ نہیں ہیں۔ جس طرح نذیر احمد، شاد عظیم آبادی، سرشار، رسوا اور راشد الخیری نے تقاضوں کے پیشِ نظر ناول لکھے اسی

رباعیات

اُکھڑے ہوئے پاؤں ہیں جو لغزیدہ ہوں
حالات کی گردش میں ہوں رنجیدہ ہوں
اِک لمحہ جس پر نہ کبھی آئی بہار
وہ پھول گلستاں میں خزاں دیدہ ہوں

اِک کشمکشِ سود و زیاں سے گزرے
اندیشۂ صد وہم و گماں سے گزرے
فرزانے رہے دامِ سیاست میں اسیر
دیوانے حدِ کون و مکاں سے گزرے

لازم ہے مری زیست کا ساماں بن جاؤ
تم میرا مقدر، مرا ارماں بن جاؤ
میں اِک نئی تاریخ مرتب کر لوں
تم اِک نئے مضمون کا عنواں بن جاؤ

یہ وقت کا منشا ہے کہ سب مل کے رہیں
کیا بات ہے کیوں زخم ہرے چل کے رہیں
جمہور و مساوات کے اس گلشن میں
لازم ہے کہ پھولوں کی طرح کھل کے رہیں

تکمیلِ ہوس کا دستور نہیں تو کیا ہے
اخلاق سے یہ دور نہیں تو کیا ہے
یہ فرقہ پرستی، یہ تعصب، یہ جنوں
انساں کی یہ شکست نہیں تو کیا ہے

غزل

سرور و کیف کے سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں
ہم آج اُن کی گلی سے نکل کے آئے ہیں

دیارِ حسن سے کل رات اے نسیمِ ہستی
ہمارے واسطے عنوانِ غزل کے آئے ہیں

وہ اپنے ہونٹوں پہ ہیں ایک شہرِ نغمہ لئے
جو تیری یاد کے سائے میں پل کے آئے ہیں

ہم آج قتل گہِ زندگی میں دیوانو
حیات و موت کے عنواں بدل کے آئے ہیں

نظامِ رازِ محبت کی خیر ہو یارب
پھر آج اشک مژہ پر مچل کے آئے ہیں

مژہ پہ شبنم و گل کی فضا لئے ہوئے ہم
تری تلاش میں کانٹوں پہ چل کے آئے ہیں

خیال آج نہ جانے بھٹک رہا ہے کہاں
جلائے دل میں تصور کنول کے آئے ہیں

کمالؔ محفلِ جانانہ گراں سے ہو کے
چراغِ شام کی مانند جل کے آئے ہیں

مہاکوی کا سفرِ آخرت

"شیرازہ" کشمیری کے شمارہ اگست ۱۹۶۱ء میں "کشمیری کہاوتیں اور محاورے" کے عنوان سے شائع شدہ اپنے مقالہ میں شری سوم ناتھ سادھو نے ایک کہاوت درج کی ہے:

"کالی داسس چھ چھنز نیرہ ونیو مُت"

اس کہاوت کا تعلق اس روایت سے ہے جس کے مطابق کالی داس اپنی نظم میں اپنا نام نہ لکھنے کے باعث اَن جانے میں ہی ایک بڑھیا کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ شری سوم ناتھ نے یہ کہاوت Mrs. Higgins کی کتاب (Stories from the history of Ceylon P. 117) کے حوالے سے نقل کی ہے مگر فٹ نوٹ میں اپنی طرف سے اس روایت کی حقیقت سے انکار کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ "اس کہانی کا کوئی تعلق سنسکرت کے مہاکوی کالی داس سے نہیں ہے۔"

یہ سچ ہے کہ تحقیقی نوعیت کے تاریخی واقعات کی صداقت کا انحصار محض عوامی روایات اور کہاوتوں پر نہیں ہوتا مگر کالی داس کو سنسکرت کے مہاکوی کالی داس ہی کو [illegible] ہیں یہ روایت [illegible] [illegible] سنسکرت اور [illegible] تاریخ و ادبیات میں اس امر [illegible]

[illegible]

سنسکرت کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار اور شاعر مہاکوی کالی داس کے سفر آخرت کی اسی روایت کے تاریخی پس منظر پر تفصیلی بحث کریں گے۔

کالی داس کے وطن مالوف کے متعلق تو ودوانوں نے ان کی تصانیف میں دئے گئے بعض اشاروں کی بنا پر ہی کچھ اندازے لگائے ہیں مگر ان کی موت کے متعلق صرف ایک ہی روایت مشہور ہے اور قیاس آرائی کی چنداں گنجائش اس میں نہیں ہے۔ مہاکوی کالی داس کی موت کب اور کہاں ہوئی، اس بارے میں محققین، مورخین اور سنسکرت کے ودوانوں میں ابھی تک اختلاف رائے موجود ہے۔ لیکن اس باب میں بعض مستند تاریخی روایات اور آثار موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ سنسکرت ادب کا آفتاب تاباں لنکا میں غروب ہوا۔ کالی داس کی زندگی کا خاتمہ لنکا (سنگل دیپ) میں ہوا، اور وہ بھی ایک رقاصہ کے ہاتھوں!

اس ضمن میں سب سے معتبر اور قابل ذکر چیز [illegible] بودھی) نام کا وہ مقبرہ یا سمادھی ہے جو آج بھی لنکا میں [illegible] کے حضور سر عقیدت جھکائے کھڑا ہے۔ سنگلی کیلنڈر کے بک (اپریل) مہینہ کے تیسرے ہفتہ میں اس مقام پر آج بھی کالی داس کے سفر آخرت کی یاد میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور اس موقع پر [illegible] کا [illegible] منعقد ہوتا ہے۔ [illegible] مہاکوی کالی داس کی یہ آخری آرام گاہ سنگل دیپ [illegible] میں [illegible] واقع ہے۔ یہ مقام بہت [illegible] ہے۔ [illegible]

اشجار لگائے گئے ہیں اس لئے اس مقام کا نام بہت بودھی پڑ گیا۔ بہت بودھی سنسکرت سپت بودھی کا پراکرت رُوپ ہے۔ روایت ہے کہ کالی داس کے علاوہ یہاں پر ان کے ہم عصر سنگل دویپ کے راجہ کمار داس اور ان کی پانچ بیویوں کی سمادھیاں بھی ہیں۔ انہیں کی یاد کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے ان سمادھیوں کے اُوپر بودھی اشجار لگائے گئے ہیں۔

سنگل مؤرخین کے مطابق کالی داس کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کے آس پاس ٹھہرتا ہے۔ ان کے خیال میں راجہ کمار داس ۵۱۶ء میں لنکا کے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے عہد میں کالی داس وہاں آئے۔ سنگل کی تاریخی اسناد کی رُو سے کالی داس اور کمار داس کی موت ایک ساتھ ہی ۵۲۵ء میں ہوئی تھی۔

ہندوستان کے تاریخ دانوں اور ودوانوں کو کالی داس کی متذکرہ صدر تاریخ وفات کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہو سکتی ہے مگر سنگل کی ادبی دستاویزات میں اس امر کے ثبوت موجود ہیں۔ پانچویں صدی کے اواخر تک کالی داس اُجین کے راجہ وکرمادتیہ کے دربار میں موجود تھے اور چھٹی صدی کے اوائل میں لنکا آنے کے بعد ہی ان کی موت ہوئی۔ اس کے علاوہ وکرمادتیہ کے نو رتنوں میں ایک رتن مشہور منجم وراہ مہر کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی ثابت ہو چکا ہے اور کالی داس وراہ مہر کے ہم عصر تھے کمار داس بھی چھٹی صدی کے ہی مانے جاتے ہیں۔ سنگلی ادب کے ایک مشہور مہاکاویہ "پیرکیا سرت" (جو سنگھ بودھی پر اکرم باہو کے عہد کے کسی گمُ نام شاعر کی تصنیف ہے) کے ایک شلوک میں کہا گیا ہے:

"اٹھارہ وہار (خانقاہیں) اور اٹھارہ تالاب بنوا کر "جانکی ہرنم[1] مہاکاویہ" کے مصنف اُس کمار داس نامی راجہ نے اپنے دوست کالی داس کے لئے اپنی زندگی بھی قربان کر دی۔"

سنگلی زبان کی قدیم تصانیف کی فہرست کے ذیل میں "جانکی ہرنم مہاکاویہ" کا عہدِ تصنیف چھٹی صدی عیسوی مانا گیا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ جانکی ہرنم کا مصنف کالی داس کا ہم عصر راجہ کمار داس ہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کالی داس کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کے آس پاس کا زمانہ ہے۔

کالی داس کے سفرِ لنکا کے بارے میں لنکا کے تاریخی حوالہ جات اور بعض پالی اور سنگلی ادبیات میں دو مختلف روایات کا اظہار ہوا ہے۔ تاریخی کتب کے مطابق کالی داس راجہ کمار داس کی تصنیف "جانکی ہرنم" کے مطالعہ کے بعد شاعر کے زورِ کلام اور دلکش اسلوبِ نگارش سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً انہوں نے کمار داس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور شاہی توسط سے اس خواہش کا اظہار کمار داس سے بھی کیا گیا۔ جواباً کمار داس نے جب پُر زور الفاظ میں اُنہیں لنکا آنے کی دعوت دی تو وہ اپنے چند احباب کے ہمراہ لنکا پہنچے۔ لنکا میں کمار داس نے کالی داس کا پُرشکوہ استقبال کیا اور کمار داس کے اصرار پر ہی کالی داس مستقل طور پر لنکا میں سکونت اختیار کرنے پر رضامند ہو گئے۔ روایت کے مطابق "ماترمہاتیرتھ نگر" میں کمار داس کے محل کے قریب ہی ان کے لئے نیا مکان تعمیر کر دیا گیا اور وہ آخر تک وہیں رہے۔

اس کے برعکس سنگلی اور پالی ادبیات میں اگرچہ یہی روایت بیان ہوئی ہے مگر قدرے مفصل اور مختلف انداز میں!

اس روایت کے مطابق کمار داس کے دادا راجہ دھاتوسین کے دو بیٹے تھے — موگلیاین اور کاشیپ۔ موگلیاین بڑی رانی کے بطن سے تھا اور عمر میں بھی بڑا تھا۔ اور اسی وجہ سے راجہ دھاتوسین اسے ہی تخت کا وارث بنانا چاہتا تھا۔ مگر اپنے بڑے بھائی کی حق تلفی کر کے خود کاشیپ کو تخت نشینی کی ہوس تھی۔ حصولِ سلطنت کے لئے اس نے ایک دن اپنے والد دھاتوسین کو قتل کر دیا۔ اپنے بھائی کی اس وحشیانہ حرکت پر موگلیاین بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔ مگر اس وقت تک تمام طاقت کاشیپ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی۔ اور وہ بے بس تھا۔ نتیجہ کے طور پر الگ فوجی طاقت کے حصول کے لئے موگلیاین

---

[1] راجہ کمار داس کی تصنیف "جانکی ہرنم" سنسکرت ادب میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ مشہور ادیب راج شیکھر نے لکھا ہے کہ کالی داس کے "رگھوونش" کے سامنے جانکی ہرنم جیسا معیاری مہاکاویہ لکھنے کی صلاحیت کمار داس میں ہی تھی۔ کالیداس کے رگھوونش سے ٹکر لینے کی جسارت سنسکرت کے کسی اور شاعر نے نہیں کی
تعبیر

کو ہندوستان آنا پڑا۔ اور یہاں اُس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال بسر کئے۔

سِنگلی اِتہاس گرنتھوں کے مطابق اس عرصہ میں مودگلیاین کے بیٹے کمار داس کی تعلیم و تربیت ہندوستان میں ہوئی جس کی بدولت وہ سنسکرت کا ایک جید عالم اور عظیم شاعر بن سکا۔ اس کی بے مثل قابلیت اور فنِ شعر میں کامل دسترس کا ثبوت اس کی جانکی ہرتم مہاکاویہ سے ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مودگلیاین کے ہندوستان سے چلتے وقت اس کے بارہ ہندوستانی دوست لنکا آئے تھے۔ ان میں ایک کالی داس بھی تھے۔ مودگلیاین کی وفات کے بعد انہوں نے لنکا میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی اور کمار داس کے عہد حکومت میں انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

اس موڑ کے بعد دونوں روایات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ آگے کہانی اس طرح چلتی ہے کہ اپنے والد مودگلیاین کے عہد حکومت تک تو کمار داس کے چلن اچھے رہے مگر اس کی وفات کے بعد جب کمار داس ولی عہد سے راجہ بن گیا تو اس کے عادات و اطوار بگڑنے لگے۔ دن رات وہ شغلِ ناؤ نوش میں مصروف رہتا اور راتیں رقاصاؤں کے ہاں بسر ہوتیں۔ سلطنت کی ذمہ داریوں سے اس کی چشم پوشی اور بدا لحواری کی افواہیں اُڑتے اُڑتے کالی داس تک بھی پہنچیں اور ان کی تصدیق کے لئے کالی داس از خود رقاصاؤں کی محفلوں میں جا کر کمار داس کے متعلق استفسار کرنے لگے۔ اُدھر کمار داس کو جب یہ علم ہوا کہ کوئی شخص طوائفوں کے ہاں جا کر میرے متعلق پوچھ تاچھ کرتا ہے تو اسے یہ شبہ گذرا کہ بہت ممکن یہ شخص خود کالی داس ہی ہو۔ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی غرض سے ایک رات جب کمار داس طوائف کے گھر سے باہر نکلا تو جاتے وقت اس نے دروازہ پر ایک شلوک کا پہلا مصرعہ لکھ دیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی تحریر کر دیا کہ جو شخص اس مصرعہ پر گرہ لگائے گا اُسے حکومت کی طرف سے ایک ہزار طلائی اشرفیاں بطور انعام مرحمت ہوں گی۔

کمار داس شلوک کا ایک چرن (مصرعہ) لکھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کالی داس بھی طوائف کی اقامت گاہ پر تشریف لائے تو سب سے پہلے ان کی نظر دروازہ پر لکھے ہوئے اس شلوک پر گئی۔ لکھا تھا:

(کمل سے ہی کمل پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات سُنی تو ہے مگر دیکھی نہیں)

مصرعہ کو پڑھ کر کالی داس لمحہ بھر کے لئے مُسکرائے اور فوراً ہی دوسرا مصرعہ کہہ کر انہوں نے شلوک مکمل کر دیا۔

(اگر ایسا ہے تو اے حسینہ! تمہارے کمل جیسے چہرہ پر کمل کی سی یہ دو آنکھیں کہاں سے آئیں)

بالاخانہ کی کھڑکی میں کھڑی طوائف سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اس شلوک کو اگر میں اپنے نام سے کمار داس تک پہنچا دوں تو مجھے ایک ہزار طلائی اشرفیاں بھی انعام میں مل جائیں گی اور کمار داس میری شاعرانہ صلاحیتوں کے قائل بھی ہو جائیں گے۔ اس طرح مہاراجہ کی نظروں میں میری قدر و منزلت اور بھی بڑھ جائے گی — یہ خیال آتے ہی معاً اس کے اندر کا شیطان جاگ اُٹھا کہ اصل شاعر کے زندہ رہتے اس طرح جھوٹ کا سہارا لینا غیر ممکن ہے۔ چنانچہ جوں ہی کالی داس نے مکان کے اندر قدم رکھا۔ رقاصہ نے فوراً تلوار کے ایک ہی وار سے ان کا سر قلم کر دیا۔ صحن میں گڑھا کھود کر لاش کو دفن کر دیا اور خود انعام پانے کی غرض سے کمار داس کے دربار میں جا پہنچی۔

کمار داس نے طوائف کے منہ سے پورا شلوک سُنا تو عش عش کر اُٹھے مگر چند لمحوں کے بعد جب شعر کی اثر انگیزی کا کیف ذرا کم ہوا تو معاً انہیں خیال گذرا کہ سنسکرت کا اتنا بلند پایہ شلوک جس کا صحیح تلفظ بھی یہ سِنگلی طوائف ادا نہیں کر سکتی۔ یہ شلوک اس طوائف کی تخلیق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کمار داس حقیقت کو تاڑ گئے تھے۔ فوراً ہی انہوں نے کالی داس کو ڈھونڈ لانے کے احکام جاری کئے۔ جب دُور و نزدیک کہیں بھی کالی داس کا کچھ پتہ نہ چلا تو طوائف سے دوبارہ باز پُرس ہوئی اور تلاشی لینے پر اس کے مکان سے مہاکوی کالی داس کی لاش برآمد کر لی گئی۔ شاعر کے مُردہ جسم کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر کمار داس چیخ اُٹھے۔ مگر اب بازی بیت چکی تھی۔ کمار داس نے فوراً ہی چندن کی لکڑی کی ایک بڑی چتا بنوائی اور اس میں اپنے مرحوم دوست کی لاش رکھی...

(بقیہ صفحہ پر)

عید کے دن

" عید مُبارک "

بس سے اُترتے ہی مسز سراج نے سامنے بابا کی دُکان پر ٹنگا ہوا بورڈ دیکھا۔ پچھلے میل کے سفر میں وہ چپ چاپ گم سُم اپنی نشست پر بیٹھی رہی تھی اور ماضی کے "تانے بانے" میں کھوئی رہی تھی۔ آج تو اُس کی زندگی کی ساری رونقیں جیسے بجھ گئی تھیں۔ مسٹر سراج گذشتہ چار سال سے سینی ٹوریم میں تھے اور پچھلے تین مہینوں سے تو ڈاکٹروں نے صاف جواب ہی دے دیا تھا۔ کسی بھی دن مسٹر سراج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی اُمید تھی، چاہے برائے نام ہی ہو۔ ایک تسلی تھی کہ وہ بیوہ نہیں، سہاگن ہے ... لیکن اب تو سارا قصہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

جانے کیوں جب اسے یہ سوال تار ملا تھا۔ وہ اسی وقت سب کچھ سمجھ گئی تھی، لیکن اس پر کوئی عجیب کیفیت طاری نہ ہوئی۔ کوئی گھبراہٹ، کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ بڑے اطمینان سے اُس نے نوکرانی آیا کو تمام تیاریوں کی تفصیل بتائی۔ بچوں کا پُورا خیال رکھنے اور ان کی خواہشات پُوری کرنے کی تنبیہہ کی اور بنا یہ بتائے کہ وہ کہاں جا رہی ہے، کیوں جا رہی ہے۔ وہ ایک اٹیچی اور صرف ایک دو روپے ساتھ لے کر گھر سے چلی گئی۔ آیا، نوکر اور بچوں کو یہ پتہ تھا کہ وہ صرف تین دن کے لئے باہر جا رہی ہے۔ جو ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی، خصوصاً اُس وقت سے، جب سے وہ مقامی ویمنز کالج میں لیکچرر ہو گئی تھی اور کالج کی مختلف ٹیموں کو لے کر یہاں وہاں جایا کرتی تھی۔

سینی ٹوریم پہنچ کر اُس نے سارا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اُس کا خاوند چند لمحوں کا مہمان تھا۔ کوئی بات بھی نہ ہو پائی۔ کھانسی کی زیادتی اور سانس کے بار بار اُکھڑنے کی وجہ سے اُس کا خاوند کوئی بات کرنے کے قابل نہ تھا۔ آنکھوں کی آزردگی اور چہرے کی اُداسی سے اُس کے جذبات عیاں ہو رہے تھے۔ آخری وقت میں اُس نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کھانستے کھانستے ایک ہچکی کے ساتھ سانس کی وہ ڈوری توڑ دی جس میں وہ ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔

چونکہ وہ ایک امریکن ڈھنگ کا سینی ٹوریم تھا اور وہاں کے اصول کے مطابق اسے لاش نہیں مِل سکتی تھی اور فرض کیجئے کہ چند گھنٹوں کے لئے مِل بھی جاتی تو بھی وہ نہ لیتی۔ کیونکہ عام عورتوں سے وہ بالکل الگ تھی اور جذبات کو کبھی غیر ضروری طور پر اپنا کام نہ کرنے دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ لاش لے جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بڑا بیٹا اور بیٹی کلکتے میں زیرِ تعلیم تھے۔ دو چھوٹے بچے تھے تو ان کو سوائے رُلانے دُھلانے کے اور اس کا مصرف کیا ہو سکتا تھا!

کئی گھنٹے وہ اپنے خاوند سے لپٹی روتی رہی تھی۔ آج اسے اپنی زندگی کے وہ پچیس برس بُری طرح یاد آ رہے تھے جو اُس نے شادی کے بعد مسٹر سراج کے ساتھ گذارے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے مثالی ساتھی تھے اور دونوں کی پچیس سالہ مشترکہ زندگی نے چار بچوں کو جنم دیا تھا۔ دو کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور دو ابھی بہت چھوٹے تھے اور پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔

روئے دھونے کے بعد اس نے اپنی بچی کھچی ہمت میں کفن دفن کا

تعبیر

انتظام کیا اور اس طرح جیسے کوئی جواری ہاتھ جھاڑ کر جوئے خانے سے نکلتا ہے اس نے حسرت بھری نظر سے سینی ٹوریم کو دیکھا اور بس کے اڈّے پر آگئی۔

منہ اندھیرے اس نے پہلی بس پکڑی تھی اور ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ وہ اپنے شہر پہنچ گئی۔ وہ شہر جو کبھی اس کے لئے جنت سے کم نہ تھا۔ وہ [illegible] جہاں وہ اور مسٹر سراج ہاتھ میں ہاتھ ڈالے [illegible] سامنے تھی [illegible] [illegible] [illegible]

عید مبارک!

[illegible] [illegible] [illegible] جا رہا تھا۔

[illegible] بچوں کی دو [illegible] [illegible]

[illegible] اچھی ہو جاتی [illegible] رسمی طور پر پوچھا

"بس ماں [illegible] عید مبارک!"

اور جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسہ مارا۔ عید مبارک۔ کیسی عید مبارک!! .... اس نے بوکھلاہٹ میں "تھینک یو" کہا اور جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یہ اس سال کیسی عید آئی ہے۔ سارا عالم خوشیاں منا رہا ہے اور وہ .... اُف، یا خدا، یہ کس جرم کی سزا ہے۔ اگر یہ سب کرنا ہی تھا تو دو دن بعد کر لیتا۔ آج بچوں کو عید تو منا لینے دیتا۔ آج کے دن ماتم تو بہت تکلیف دہ ہوگا۔ ساری دُنیا خوشیاں منا رہی ہے۔ اور اس کے گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں گی۔ آس پاس والے رنگ رلیاں چھوڑ کر ان کی صفِ ماتم پر آ بیٹھیں گے۔ یا اللہ، یہ کیا کر دیا تُو نے!

سامنے اسٹوڈیو ڈی زوکو (STUDIO - DE - ZOKO) تھا کس طرح رنگ برنگے کاغذوں سے سجایا گیا تھا اسے۔ وہ پاس سے گزرنے لگی تو اچانک رک گئی۔ سامنے شوکیس میں اس کی اور مسٹر سراج کی تصویر آویزاں تھی پانچ چھ سال پہلے کی۔ کتنے مسرور تھے وہ دونوں۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ دونوں!

پتہ نہیں وہ کب تک کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ انہیں اپنی ساڑھی کے پلو سے پونچھ رہی تھی کہ اندر سے جاپانی فوٹو گرافر نکلا۔

"ہیلو مسز سراج کم اِن!"

اور اس طرح جیسے کوئی چوری کرتا پکڑا جائے۔ وہ جھینپ سی گئی۔

"عید مبارک" جاپانی فوٹو گرافر نے مسکرا کر کہا [illegible] "[illegible] نہیں؟"

"تھینک یو۔" اور اس طرح جیسے وہ پیچھا چھڑا رہی ہو تیز تیز سامنے کے موڑ پر مڑ گئی۔ وہ چاہتی تھی جلد سے جلد گھر پہنچ جائے۔ لیکن جوں جوں گھر [illegible] تصور سے ہی وہ کانپ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی وہ انہیں اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنی گود میں لئے اپنی قسمت کو روتی رہے۔ کوئی آج اس کے پاس نہ آئے اور .... لوگ اطمینان سے عید کی خوشیاں مناتے رہیں، اپنی دُھن میں مگن رہیں۔

اُس نے دیکھا، سامنے اُس کی آیا آ رہی تھی

"سلام بی بی جی!"

"سلام،" جیسے اس نے بہت دُور سے کہا

"کب آئیں آپ۔" آیا ذرا جلدی میں تھی۔ "ہم ابھی بچّہ لوگ کے لئے مٹھائی لے کے آتا ہے۔"

"ٹھہرو۔" مسز سراج نے بڑی ہمت سے کہا تاکہ اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔ لیکن ایک سیکنڈ میں کئی خیال ذہن میں آ گئے۔ زبان جیسے گنگ ہو گئی!

"اچھا جلدی آؤ۔" آہستہ سے کسی طرح اُس نے یہ تین الفاظ ادا کئے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

سامنے نیو لائٹ ٹاکیز تھا۔ چاروں طرف عید کی خوشی نمایاں ہو رہی تھی۔ سیریٹیل کے بورڈ آویزاں تھے اور رات کے شو ابھی سے رنگ برنگے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ شادی کے بعد جب وہ پہلے پہل اس شہر میں آئی تھی تو مسز سراج نے عید کے موقعے پر سیریٹیل کے بارے میں سن کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ ایک رات میں ایک ایک کر کے تینوں فلمیں —— خدا جانے لوگ کیسے دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے شوہر نے مذاقاً دو ٹکٹ بھی منگوا لئے اور وہ مذاق مذاق میں تینوں فلمیں بھی دیکھ گئے۔ فلموں سے زیادہ تو وہ آپس کی باتوں میں مگن تھے۔ باکس میں بیٹھے دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کے کالج کی باتیں، ایک دوسرے کی خواہشات کی باتیں اور نہ جانے کس کس طرح کی باتیں!

اور آج —— آج وہ تنہا لائٹ ہاؤس کے پاس سے گزر گئی۔ اُداس آنکھیں، پیلا بجھا ہوا چہرہ، پریشان بال۔ وہ ایک بیوہ تھی۔ اس کے چاروں بچے باپ کے سایے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے تھے۔ گھر کا آفتاب غروب ہو گیا تھا اور . . .

"عید مبارک۔" دو ضعیف العمر شخص ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ایک ٹیکسی پاس سے گزری تو ان میں سے ایک نے آواز دی —"او ایشر سیاں!"

"او آ آ"۔ ٹیکسی کے سکھ ڈرائیور نے ٹیکسی روک کر کہا —"دین محمد، بھئی عید مبارک!"

اور اُتر کے وہ بھی دونوں سے گلے ملنے لگا اور پھر شام کو دعوت میں ملنے کا وعدہ کر کے اپنی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

معلوم پڑتا تھا مسز سراج کا ذہن پھٹ جائے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ چیخ چیخ کر سارے لوگوں کو مطلع کر دے کہ اس کا گھر اُجڑ گیا ہے۔ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ خدا کے لئے اُس کے سامنے ہنسی خوشی کی باتیں نہ کرو۔ لیکن پھر یہ سوچتی کہ کسی کو کسی کا کیا غم۔ ہنسنے کے لئے ممکن ہے کوئی ساتھی مل جائے لیکن رونے کے لئے کوئی شریک نہیں ہوتا۔ دُکھی دلوں کو ہمیشہ اکیلے رونا پڑتا ہے!

وہ گھر پہنچی تو نوکر کمروں کو سجا چکا تھا۔ اور اب وہ اندر کے دالان کو صاف کر رہا تھا۔ بچے غسل خانے میں نہا رہے تھے اور کمرے میں ان کے نئے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ نیچے نئے جوتے، نئے موزے، سامنے میز پر کل کی ڈاک میں آئے ہوئے کچھ کارڈ پڑے تھے۔ "عید مبارک!"

اُف گھر میں کیا قیامت آگئی ہے۔ سب کتنے مصروف اور خوش و خرم ہیں۔ اور اب جب سب کو اس المیے کا علم ہوگا تو گھر میں ایک کہرام مچ جائے گا۔ ساری اُمیدیں —— ساری اُمنگیں خاک میں مل جائیں گی۔

اُس نے میز کی دراز سے دو تار فارم نکالے تاکہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو اس سانحے سے مطلع کر دے۔ بیگ سے اُس نے پین نکالا اور دونوں تاروں پر ان کے پتے لکھے۔ نیچے اپنا نام اور پتہ بھی لکھ دیا۔ مضمون کیا لکھے —— "تمہارے ابا چل بسے!" . . . اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُف ابھی دو گھنٹے بعد تار اُنہیں جا پہنچے گا۔ اس وقت کتنے خوش اور مسرور ہوں گے وہ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عید منا رہے ہوں گے۔ لیکن جب تار ملے گا تو . . . تو . . . ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن اس نے جلدی سے آنکھوں کو پونچھا اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے اُسے دیکھا تو نہیں۔

"ارے!" اسے اچانک یاد آیا۔ اُس کے بیٹے اور بیٹی کے تو سالانہ امتحان چل رہے ہیں۔ اطلاع ملی تو یقیناً وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔ دو قیمتی سال ضائع ہو جائیں گے۔ ان کی زندگی کے دو سنہری سال —— نہیں نہیں۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔ ان کے امتحانوں تک انہیں کوئی اطلاع نہ دے گی۔

"اُمّی —— اُمّی۔" دونوں بچے نہا دھو کر کپڑے پہننے کے لئے آ گئے۔ اس نے دونوں کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "اُمّی، ہمارے لئے کیا لائی ہو؟" "میرے لئے کیا لائی ہو امی۔" چھوٹے نے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور دوسرے نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

ان کو کیسے بتائے کہ ان کے لئے وہ منحوس خبر لائی ہے کہ ان کے سر سے ان کے باپ کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔ لیکن یہ پھولوں سے مسکراتے چہرے، یہ معصوم کنول، ان کی خوشیاں، ان کے یہ نئے کپڑے، نئے جوتے!

. . . نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ مسز سراج نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج ان کو کچھ نہ بتائے گی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب ان کی خوشی چھین کر وہ آج کے دن کو قیامت کا دن نہیں بنائے گی۔ اس کے بچے ایک دن دل سے محسوس کریں گے کہ ان کے سر پہ ماں اور باپ دونوں کا سایہ ہے

ہے۔ انہیں ساری چیزیں نصیب ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔

کپڑے پہن کر نوکر کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ تمہیں سب کچھ لے دے گا۔" اُس نے بچوں سے کہا اور بچے جھٹ پٹ کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ نوکر بھی آگیا۔ مسز سراج نے دس کا نوٹ اُس کے حوالے کر کے اسے ان کی حسب ضرورت چیزیں خرید دینے کے لئے کہا۔

دونوں بچوں کو جیسے جنت مِل گئی تھی۔ خوشی سے ناچ رہے تھے۔

"اچھا امی — ٹا — ٹا"

وہ دروازے پر کھڑی کچھ دیر دیکھتی رہی۔ پھر کچھ خیال آتے ہی اُس نے نوکر کو بُلایا —

"یہ دونوں تار ڈاک خانے میں دیتے جانا۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے تار پڑے کئے —

"عید مُبارک"... اور بڑی ہمت کر کے بولی — "ہر سال تار جاتے ہیں تو اب کیا نہیں جائیں گے۔"

"ہاں بی بی جی، ہم تو بھول ہی گیا۔" اور نوکر تار لے کر باہر نکل گیا۔

مسز سراج نے دونوں بچوں کو ٹک ٹک کر جاتے ہوئے دیکھا۔ اور دروازہ بند کر کے مسٹر سراج کی تصویر کو سینے سے لگا لیا اور بستر پر اوندھی گِر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔ سیلاب بند توڑ کر بہہ نکلا تھا اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی!

شاغل ادیب

رُباعیات

سینے میں وہ ہلکی سی چبھن باقی ہے
اک آس کی دُھندلی سی کرن باقی ہے
اے دوست ترے اپنے تغافل پر بھی
وہ سوزِ محبت، وہ لگن باقی ہے۔

اے کاش تجھے ڈھنگ سے جینا آتا
ہر زخم کو ہنستے ہوئے سینا آتا
مِل جاتا ہر اِک گھونٹ پہ امرت کا مزہ
اشکوں کا ہلاہل تجھے پینا آتا

ہر زخم ہے سینے کا اُبھرنے والا
ہر درد ہے اب حد سے گزرنے والا
ہر سمت دیئے غم کے جلائیں آؤ
انسان کا مقدر ہے سنورنے والا

ریاست میں جسمانی تعلیم کو فروغ

ریاستی حکومت تعلیم کے مکمل ڈھانچہ کو مضبوط اور جدید بُنیادوں پر کھڑا کرنے کے جس پروگرام پر عمل کر رہی ہے اُس میں جسمانی تعلیم اور کھیلوں سے متعلق اقدامات بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اس بات کے پیش نظر سرینگر اور جموں میں دو اسپورٹس سٹیڈیم تعمیر کئے گئے۔ اس کے علاوہ ریاست کے ہر ضلع میں ایسا ہی ایک ایک سٹیڈیم تعمیر کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

مختلف کالجوں میں نیشنل کیڈٹ کور کے ۱۵۔ رائفل یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ جن پر ۱۷۷،۵۰ روپے خرچ کئے گئے

کھیلوں کو جدید طرز کی بُنیادوں پر اُستوار کرنے کے لئے ریاست میں سپورٹس کونسل قائم کی گئی ہے۔

صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر میں دو پراونشل اولمپک ایسوسی ایشنز قائم کی گئیں۔

رواں مالی سال میں سپورٹس کلب کے لئے ۴ لاکھ ۱۰ ہزار روپے منظور کئے گئے ہیں تاکہ ریاست اور ملک کے درمیان ہونے والے ٹورنامنٹوں میں شمولیت کی جا سکے۔ پہلگام گلمرگ اور دیگر مقامات پر یوتھ ہوسٹلوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان مقامات پر نوجوانوں کے کیمپ لگتے ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور اسکیم کے تحت اب تک ایک ہزار سے زیادہ کیڈٹوں نے تربیت حاصل کر لی ہے۔

پورن سنگھ ہُنَر

پیامِ کشمیر

چار سُو ہے دِل رُبائی دِل کشی کشمیر میں
پھُول بن کر کھِل رہی ہے زندگی کشمیر میں

گوشہ گوشہ کیوں منوّر ہو نہ اس کے فیض سے
نُور افشاں ہے چراغِ آگہی کشمیر میں

متحد ہے سعی و کوشش میں ہر اِک فردِ بشر
نام کو بھی اب نہیں ہے بیکسی کشمیر میں

دُشمنوں سے بھی کبھی یہ دُشمنی کرتے نہیں
کِتنا اُونچا ہے مقامِ دوستی کشمیر میں

رُک گئی ہے گردشِ ایام بھی آکر یہاں
دُور ہے رنج و الم سے آدمی کشمیر میں

بارہا اے دوست دیکھی ہے بہارِ مہر و ماہ
اس سے بڑھ کر ہم نے دیکھی دِل کشی کشمیر میں

جلوۂ بے رنگ میں پیدا ہوئیں رنگینیاں
زندگی کو بھی مِلی ہے زِندگی کشمیر میں

دیکھنے والے فِدائے سادگی ہونے لگے
سادگی بھی حُسنِ رنگیں بن گئی کشمیر میں

شادماں ہر اِک دِل ناشادماں ہے اے ہُنَرؔ
ہر طرف رقصاں ہے اب آسُودگی کشمیر میں

عبدالاحد رفیق

کشمیریوں کی فوجی روایات

کشمیری علم و ادب، فن، اور ہنر و کسب کے علاوہ اپنی فوجی روایات کے لحاظ سے بھی مشہور رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کشمیریوں نے محاذِ جنگ پر ہر وقت جان توڑ کر لڑا ہے۔ جب کبھی کسی غیر ملکی حملہ آور نے کشمیر پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ عہدِ قدیم میں کشمیریوں نے طاقت اور فوجی قوت کے بل بوتے پر ہندوستان، افغانستان اور چین کے بعض علاقوں کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ ان میں جذبۂ حب الوطنی ابتدا سے ہی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

بعض یورپین سیاحوں نے کشمیریوں کے بزدل اور ڈرپوک ہونے کا ذکر کیا ہے جو حقائق اور واقعات کی روشنی میں غلط ثابت ہوا ہے۔ ان یورپین سیاحوں نے اوّل تو خود کشمیر میں قلیل عرصہ رہنے کی وجہ سے صحیح اور درست حالات کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ دوم ان کے عقائد میں ہیون سانگ کا بیان بھی شامل ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں مغالطہ ہوا ہے۔ ہیون سانگ نے جس سوسائٹی میں زیادہ اوقات بسر کیے ہیں، وہ برہمنوں کا سماج تھا۔ برہمن لوگ عالم تھے۔ انہیں علم و ادب کے ساتھ گہرا رشتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو علم و فن کے ماہر ہوں وہ بہادر اور شجاع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہیون سانگ خود ان کے علم و ادب کا مداح رہا ہے۔

یورپین سیاحوں نے انیسویں صدی میں کشمیر میں قدم رکھا۔ یہ دور تاریخ کشمیر میں تعطل اور جمود کے لحاظ سے بہت ہی زبوں حالی کا دور رہا ہے۔ کشمیری عوام بے دست و پا تھے۔ ملک میں امن و سلامتی کا فقدان تھا۔ جبر و استبداد نے کشمیریوں کے ضمیر تک کو بدل دیا تھا۔ فوجی ملازمت تو درکنار، انہیں زندہ رہنے کا حق بھی نہ تھا۔ ہر کشمیری کو آج بھی سکھا شاہی کا نام لرزہ بر اندام کرتا ہے۔

کشمیر کے نامور اور اولوالعزم بادشاہوں میں مکتا پیڈ اور للتا دتیہ کے نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ ان کے فوجی کارنامے بلند اور عظیم رہے ہیں۔ وہ جنگی امور کے بڑے ماہر اور شجاع تھے۔ جب محمد قاسم ایک عرب فاتح نے راجہ داہر سے للتا دتیہ کے بارے میں کھوج لگائی اور پوچھ گچھ کی تو راجہ مذکور نے محمد قاسم کو ذیل کا پیغام بھیجا:

قہر کنندۂ روئے زمین است و انتقام کشندہ جباراں زماں
و حسب و نسب را ہباں کہ در ملکِ کشمیر صاحب چتر و نوبت
علم و رایت کہ آیاں بر آستانہ دولت او نہادہ اند۔ و جملہ
ہندو سندھ در تحت از فرماں شد۔ بداد کہ راں و توران
امرا خود قلادہ کردہ صاحب صد زنجیر پیل است و در اکب
پیل سفید است کہ نہ اسپ او مقابل تواند و نہ مرد بادے
تواند افشرد۔ اجازت کردمے تا شمار اسیر کردے۔ کہ
تا العرام عالم ہیچ لشکرے را مجال نبودے کہ پیرامون
حدود او بگذشتے۔"

للتا دتیہ کا پوتا جیا پیڈیا (۷۶۴ سے ۷۹۵ء) ایک بہت بڑا فاتح ہو گزرا ہے۔ اس نے ایک بھاری لشکر کی ترتیب اور تنظیم انجام دی۔ اور کشمیر کی حدود کو الہ آباد تک بڑھایا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجے اس کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ عظیم الشان بادشاہوں کے

کیلئے ستن ہو جاتے تھے۔ دولت کی فراوانی اور جاہ و حشمت کے لحاظ
سے بھی وہ بہت ہی بلند تھا۔ چنانچہ ۹۹۹۹ گھوڑے خیرات کر دیئے
وہ ہمیشہ اپنے پایۂ تخت سے دُور مقبوضات کو بڑھاوا دینے میں
معروف رہتا تھا۔ وطن میں کبھی چین سے نہ بیٹھتا تھا۔

پنجاب اور ہندوستان کے کچھ علاقوں کو محمود غزنوی نے آن کی
آن میں فتح کر لیا تھا۔ اس کا لشکر تجربہ کار بہادر جوان مردوں پر
مشتمل تھا۔ بخارا، سمرقند، افغانستان میں اس کی فوج نے بہادری
کے چھکے چھڑا دئے تھے۔ اور وہ ہندوستان کے ہر حملے میں کامیاب
رہا۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے مشہور اور معروف راجے
جن میں اجمیر، دہلی، قنوج اور لاہور کے حکمران بھی شامل تھے،
اس کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ مگر جب یہی محمود غزنوی کشمیر پر چار بار حملہ
آور ہوتا ہے تو اس کے بہادر جرنیل میدانِ جنگ میں کام آتے ہیں
اور ہر بار بُری طرح شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ محمود
کا گیارہواں حملہ ۱۰۱۵ء میں کشمیر پر ہوا تھا۔ اس وقت یہاں ایک
ہندو خاتون حکمران تھی جس کا نام دِدا رانی تھا۔ محمود شکست کھا کر
پونچھ اور راولاکوٹ چلا جاتا ہے۔ اور یہاں کے راجہ کے ساتھ جو
قلعہ میں تھا، لڑنے لگتا ہے۔ مگر یہاں بھی محمود کو ناکامی کا منہ دیکھنا
پڑتا ہے۔ محمود غزنوی نے دوسری بار ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر یورش کی۔
مگر اس وقت بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۳۳۹ء میں کشمیر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ کشمیر کے مسلمان باہر کے
رہنے والے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ کشمیری
سلاطین میں شہاب الدین بادشاہ کا نام فوجی طاقت کے لحاظ سے
بہت ہی اہم ہے۔ وہ فتوحات کرتا گیا۔ چنانچہ اس کے دورِ حکومت
میں تبت، نیپال، چین کے بعض علاقے، افغانستان، سرہند وغیرہ
کشمیر کی سلطنت میں شامل تھے۔ سارا ایشیا اس کے دبدبے سے کانپ
اٹھتا تھا۔ وہ اس دن کو اپنی عمر کا اچھا دن شمار نہ کرتا جس دن
اس کو کسی نہ کسی جگہ کی فتح کی خوش خبری نہیں ملتی تھی۔ [illegible]
اور حسن و فن کا بھی بڑا مشتاق تھا۔ وہ کشمیر کا سکندرِ اعظم بھی کہلاتا
تھا۔ اسی دوران میں فیروز شاہ تغلق نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔
یہ بات عیاں ہے کہ سارے تغلق بادشاہوں میں فیروز شاہ تغلق
کی فوجی طاقت مستحکم تھی۔ مگر یہاں اُس کو شکست ہوئی۔ اگر حضرت
سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ صلح اور صفائی نہ کرواتے تو دہلی کا
تخت بھی کشمیریوں کے قبضے میں آجاتا۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنی
لڑکی کشمیر کے سلطان کے نکاح میں دے دی۔ سلطان قطب الدین
اور سلطان بت شکن دونوں نے بہادری کے جوہر دکھلائے۔ علامہ
اقبال فرماتے ہیں ؎

خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

تیمور جس نے تمام دُنیا میں اپنی عظمت اور بہادری کا سکہ بٹھا دیا
تھا، کشمیر پر حملہ کرنے میں تردد کرنے لگتا ہے اور کشمیر کے سلطان
کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ جموں کی سرحد پر امیر تیمور جموں
کے راجہ کے ساتھ لڑائی کرتا ہے تو شرف الدین یزدانی کے قول کے
مطابق جموں کی سرحد پر مضبوط، بہادر اور شجاع ہندو آباد تھے۔
انہوں نے امیر تیمور کا شدید طور مقابلہ کیا۔ اور امیر تیمور نے لڑائی
کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ امیر تیمور کی فوج کو یہاں بھاری
نقصان اُٹھانا پڑا۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہدِ حکومت میں جب اسکردو
اور تبت کے لاماوں نے سلطان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ تو
بڈشاہ خود ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ وہ نہ
صرف یہ کہ دونوں تبتیوں کو سر کر لیتا ہے بلکہ بعض علاقے جن میں
چترال، یاسین اور کوہِ ہندوکش کا علاقہ بھی شامل ہے، فتح
کر لیتا ہے۔ بڈشاہ نہ صرف یہ کہ ایک عظیم فاتح تھا بلکہ اُس نے ملکی
امور کا انصرام نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ رعایا
کی خوش حالی اور فارغ البالی کا ہر وقت اس کو دھیان رہا کرتا تھا۔
وہ علم و ادب کا بھی بڑا شائق تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علما، شاعر
اور حکیم تھے۔ اس کے بہادر فوجی جرنیل جن میں محمد ماگرے، ملک مسعود ٹھاکر
ملک رینہ، احمد رینہ اور اکرم رینہ نے مشرقِ بعید میں دُشمنوں کے

بچلے چڑائے تھے۔ معرکہ کاشغر کے بارے میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری رقم طراز ہے:

"آخر الامر بتائید الٰہی ہزیمت بہ کاشغریان لاحق شدہ۔ رُو بہ فرار آوردند۔ و سلطان بہ فتح فیروزی دار الامان کشمیر مراجعت نمود۔"

جب پنجاب کا علاقہ دہلی سے چھوٹ گیا اور یہاں کھوکھر بھائیوں کی حکومت تھی تو معمولی سی یورش سے پنجاب کا علاقہ بڈشاہ نے اپنے قبضے میں لایا۔

"جرت کھوکھر کھکھر بہ قوت سلطان اگرچہ توانست دہلی نمود اما تمام پنجاب را در تصرف آورد۔"

بڈشاہ نے ایک بھاری فوج جموں کے راجہ جسرت کو پنجاب اور دہلی فتح کرنے کے لئے بھیج دی۔ ان دنوں دہلی کے تخت پر بہلول لودھی حکمران تھا۔ اگرچہ راجہ دہلی کو اپنے قبضہ میں نہ لاسکا مگر پھر بھی اس نے پنجاب کو فتح کر لیا۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ بڈشاہ نہ صرف کشمیر کا سلطان تھا بلکہ وہ پنجاب، سرہند، پشاور، اسکردو، تبت، گلگت، کاشغر، ہزارہ، چترال کا بھی حکمران تھا۔ ان علاقوں کے باشندے بڑے بہادر اور جواں مرد تھے۔ مگر کشمیریوں کے مقابلے میں وہ ہمیشہ نکمے ثابت ہوئے۔

سلطان حسن بڈشاہ کے پوتے کے عہدِ حکومت میں تاتار خان، پنجاب کے گورنر نے جموں پر چڑھائی کی۔ ان دنوں جموں کا راجہ راجہ دیو تھا۔ اس نے سلطان سے کمک کی درخواست کی اور بادشاہ نے تازی بٹ کی کمان میں فوج بھیج دی۔ تازی بٹ نے راجوری اور جموں دونوں علاقوں میں تاتار خان کی دھجیاں اُڑا دیں۔ پھر تازی بٹ نے سیالکوٹ پر حملہ کیا اور اس علاقے کو فتح کر کے جموں کے ساتھ ملا دیا۔ تازی بٹ خانقاہ معلیٰ میں مدفون ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب کہ خانہ جنگی کی وجہ سے کشمیریوں کی فوجی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اور کشمیریوں کی عظمت کا سکہ اطراف و جوانب میں بیٹھا ہوا تھا۔

سلطان حسن ۱۴۸۷ء میں وفات پا گئے۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا محمد شاہ جو صرف سات سال کا تھا، تخت نشین ہوا۔ اُمرا اور وزرا نے تحفے اور تحائف پیش کئے۔ مگر سات سالہ بچہ صرف تلوار کی طرف ہاتھ لے جاتا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر ہمسایہ حکمرانوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بچہ صرف فوجی سپرٹ اپنے دل میں رکھتا ہے اور وہ روپیہ، سونا اور دیگر سامانِ عیش و عشرت کی طرف مائل نہیں ہوتا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں کشمیر میں طوائف الملوکی تھی۔ ملک میں بدنظمی اور گھر گھر راج جاری تھا۔ بادشاہ اُمرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۵۴۰ء میں مرزا حیدر نے کشمیر پر حملہ کیا اور دس سال تک حکومت کی۔ مگر خطبہ اور سکہ ہمایوں کے نام پر جاری تھا۔ شاہمیری خاندان کا آخری بادشاہ حبیب شاہ ۱۵۵۳ء میں اپنے ماموں غازی خان سے لڑائی کے بعد قتل ہوتا ہے۔ غازی خان غازی شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ہے اور ایک نئے خاندان چک خاندان کی حکومت شروع ہوئی ہے۔

غازی خان نے کشمیری خون میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کیا۔ اور وہ علاقے جو کشمیر کی حکومت سے الگ ہوئے تھے، پھر اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ اور اکثر علاقوں کو فتح بھی کر لیا۔ زین العابدین کی حکومت کے بعد کشمیر میں دوبارہ فوجی سرگرمیاں تیز ہونے لگیں۔ تاریخ حسن میں مذکور ہے:

"غازی خان در مدت سلطنت خود تمام کوہستان ہند را مسخر ساخت و یاگلی و بہتر تصرف در آورد و دختر کمال خان گکر بعقد آورد [illegible] تعین نمود۔ و ہر دو تبت و کشتواڑ دار و گلگت و پکلی را از احکام انجا قلع نمود۔"

غازی خان نے کشمیر میں ایک مضبوط اور قوی حکومت قائم کی اور بدنظمی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ایک قابل ناظم اور فوجی جرنیل تھا۔ مگر ربط و ضبط اور ڈسپلن میں وہ بہت سخت تھا۔ اس کی سزائیں بے رحم قسم کی ہوتی تھیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں ملک شمس الدین

ہمایوں کے پاس اس کے خلاف فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے چلا۔ ان دنوں ہمایوں مسجد کی چھت سے گر کر مر گیا تھا۔ تاہم ملک شمس ابوالمعالی کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اُمرا کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی۔ کیونکہ وہ غازی شاہ کے بُرے برتاؤ سے تنگ آچکے تھے۔ دشمن کی فوج پونچھ کی جانب کوچ کر گئی تھی اور اچانک بیرون کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ ایک دن گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ بادشاہ غازی شاہ نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ دشمن کی فوج جان توڑ کر لڑی۔ مگر کشمیری فوج کے مقابلے میں الٹے پاؤں نہ چلی۔ اور شکست کھائی۔ مغلوں کے سترہ سو (۱۷۰۰) آدمی قید کر لئے گئے اور باقی مر گئے۔ بادشاہ شان کے ساتھ سری نگر میں داخل ہوا۔۔۔ لوگوں نے استقبال کیا اور خوشی کے نعرے بلند کئے۔

کشمیری اُمرا نے پھر ایک بار [illegible] کی [illegible] محمد [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] کر لی گئی اور [illegible] بہادر [illegible] حیدر [illegible] [illegible] [illegible] دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ دشمن نے [illegible] [illegible] خان نے بہادری سے مقابلہ کیا اور [illegible] مغلوں کو [illegible] بادشاہ نے کشمیری [illegible] [illegible] کے لئے [illegible] [illegible] مغلوں کی [illegible] پڑے۔ مؤرخوں کے قول کے مطابق مغلوں کے بہت [illegible] افراد اپنے آپ کو بچا سکے۔ بڑے بڑے مغل سردار اس لڑائی میں کام آئے۔

یوسف شاہ غازی خان کا بھتیجا ۱۵۷۹ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ اگرچہ بہادر اور قابل حکمران تھا مگر عیش و عشرت کی زندگی کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے کمزور اور نکما بن گیا تھا۔ اس کے عہد میں اکبر بادشاہ کی نظریں کشمیر پر پڑی تھیں اور [illegible] بادشاہ نے کشمیر پر حملہ کیا۔ مگر ہر بار اس کی فوج کو ہار ہوئی۔ بدقسمتی سے چند کشمیری اُمرا کو یوسف شاہ چک سے اختلاف ہوا۔ اور انہوں نے اکبر بادشاہ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ مگر اکبر بادشاہ نے نہیں مانا۔ کشمیری امرا کی اس ناکامی کے بعد

تعمیر

.... اُنہوں نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے پیش کئے۔ ان قصیدوں کا بھی بادشاہ کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تاہم راجہ مان سنگھ نے اکبر کو مجبور کیا کہ کشمیر کو فتح کرنا آسان ہے۔ چنانچہ راجہ مان سنگھ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ حملہ کیا۔ مگر اُوڑی کے مقام پر کشمیریوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ راجہ مان سنگھ نے جب دیکھا کہ کشمیریوں کی فوجی پوزیشن مضبوط ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور [illegible] یوسف شاہ کے ساتھ صلح [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کشمیر کو فتح کر لیا ہے۔ پھر بھی کشمیریوں نے [illegible] وقت [illegible] [illegible] کا خوب مقابلہ کیا۔ مگر [illegible] [illegible] [illegible] ہونے کی وجہ سے وہ شکست کھا گئے۔

کشمیر تو اکبر نے فتح کر لیا۔ مگر پھر بھی اکبر کا دل کشمیریوں سے خائف تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ بڑے بہادر اور لڑاکو ہیں۔ چنانچہ وہ خود کشمیریوں کے بارے میں کہتا ہے: "کشمیری شفقت [illegible] [illegible] [illegible]!"

اکبر نے کشمیریوں کو فوجی ملازمت سے محروم رکھا۔ کیونکہ [illegible] تھا کہ ان کے ہاتھوں کسی وقت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغلوں کے وقت میں یہاں آرٹ اور ادب کو کافی عروج حاصل ہوا۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ صنعت و حرفت کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ [illegible] روزگار [illegible] ہوا۔ رعایا کی بہبودی اور خوشحالی کا [illegible] ہر [illegible] فکر تھا۔ پھر بھی چند کشمیری ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی قابلیت اور صلاحیت کا ہر مغل بادشاہ کو اعتراف رہا ہے۔ فارسی زبان و ادب کے یہاں جتنے بڑے بڑے شاعر ادیب اور انشا پرداز کشمیر میں پیدا ہوئے اس کی نظیر محال ہے۔ یہاں علم و ادب کی بڑی بڑی دانش گاہیں تھیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں تشنگانِ علوم و فنون اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ غرض اہلِ کشمیر ہر فن میں یگانۂ روزگار تھے!

(باقی باقی)

امین کامل

ژٕہ آیکھ ووٚنۍ مگر ....

ژٕہ آیکھ ووٚنۍ مگر ہٕتس لٔدِتھ پوش
کٔنڈ یو رٔژو داگو کوٗر ییلہِ میوٗن یاوُن
جُدایی ہُندی میہ ہر دِن رنگ تال ہٕٹ ولِ
وٕل کرِتھ ماگہٕ بٔرٕ تہٕ وصلک یہ شراوُن
ژٕہ یتھ پوٚشرِ بٔنِتھ گتھ کرنہٕ آیکھ
مےٚ زِنگوٚ ژھیٚوٚ یہ کیاہ چھُوی پرژناوُن
یمو شینو دٕلو ستیٚنس منہ کرِ میٹھو!
یہ گوو دٕ شیر پیٚنہٕ نوٚی داوٕہ راوُن
یہ امرت لھوس کُنہ ستیٚلہ اس ڈٕکیس لاسے
سمے ژٕشی یپھٕ سہٕ جوٚشک سۄو ہیاوُن
میہ دٕری منٚز گاسہ ٹٕلی تامت نہٕ میٚنس
اتو ژٕ کھاٚ لبتھ ژٕہ کیاہ بیٚکھ آیہٕ ناوُن
میہ کیاہ ووٚنۍ تلہِ کرٕ ہوتن کانہہ نِشا بس
میہ سیٚدٕ مت پان پنہٕ نوی ژٕ ورٕ تھاوُن
میہ ہوٚکھ میٚنہ نہٕ کیٚن کوٚچن اندِ خوٗلی
ژٕ یٕژ ژھٕنٕے دٕل ہوا مس جُزان تہٕ چاوُن
میہ زان گوو ہیرٕ کھسہِ ووٚن پود نیرِتھ
ژٕ یٕژ ژھٕنٕے زِندگی ہُند بام چھاوُن

(مارچ ۱۹۶۲ء)

موتی لال ساقی

غزل

اگر نہٕ یاوُن میہ ژھال کرِہا میہ زادِ مہٕ ماقرار یارسے
میہ لوسہٕ وٕلن دٕزٕ چھُ ووٚنۍ کوٚہس بیٚنِتھ ژٕنہٕ پُژھنے تہٕ بہار یارے
ژٕ یِہ آدِنگ ستر نہٕ ہوٚ تھوٚی وٕنے کیاہ میہ رُود تُھنگ سراب گُنزرن
ژٕ یِہ یام چاو دِتھ کمانِ ابرو میہ ہوٚیتھ اشکن ہیٚون شمار یارے
مہٕ کھار دٕزٕ از ژٕ کمس عمر ژھایہ خیشہِ دِل لوسہِ ماو چھانی
عمر بلہِ زِل بیچار بیرِ ما چھُ لالِہ وٕنہِ سوا رُغ دِلن یار ہٕتے
میہ گوو دٕ راتن زِنس نہٕ بسِ تل امارنی ہُند الاو زِو لم
میہ وینس راوُم ژٕ یِہ برآر و بیلہ بی ژٕ یِہ گوٚمی نہٕ نہٕ اعتبار یارے
یہ تھوٚی میہ ووٚنے حِینس دِنا بعد پینہٕ کتھاہ کر زِکھ پہٕ راود
ژٕ باگی دِ متھُم دِلاسہٕ واراہ اچھو ژٕ یِہ کوٚر تھُم نِکار یارے
میہ آو لُن چھُم ژٕ ژوان اچھن تل کٕنن ژٕ یِہ گے نا ونیدا کہ میانی
نیٚنہٕ بہ چھوگے میہ جانہِ باپت وچھانہٕ گوو وقتہ لالہ زار یارے
یِمس مِلہِ چیٚنہٕ کنس چھُ مُشکل یہ باگراوُن یٕکہ ژٕ ساقی
چھُ ترلِشہِ مِیٚٹھ ہیار ژٕ گۄڈ بِس تل مہٕ کر ژٕ پیالن خمار یارے

اختر محی الدین

آپن ہور جنگ

(۱)

یہ اوس بیاکھ محاذ یتہِ پیٹھہ توپ آیہِ۔ موخہتہ آپس گو وأچھن، گوڈہ انہِ گوٹ، پتہ آس نیول دوزُل بوزنہ۔ سو گیہِ یہے اپارہ ہشی۔ تس باسیوو خلافِ توقع مگر ہمت ہارن نہ۔

ہے کیاہ گوم۔ ہے کیاہ گوم۔ گو و کیاہ زمانس تہ بنیوو کیاہ دُنیاہس۔۔ " نیہِ گوڑ اعلانِ جنگ۔۔ " یہ چھا وُچھت تہ یہ چھا بوزمُت۔ ہے تِتی پیٹھہ تہ کُنہِ پیٹھہ نسا! "

" آپو کرِ حضور، پانس، وُمھ یہ " رسول لانژھن کوڑ موخہتہ آپس زارہ پارہ۔

" ہیو گژھو ہتینہ دفع۔ " موخہتہ آیہ اُمس نار ژ ہان۔ ’’ زنانہ گھرن منز کتہِ خراد وُنہِ یُوت اَنہِ گوٹ۔ یہ ہے گو ڈہ اُمس زہر دِمہ تہ آدہ کھینہ پانہ۔ "

رسول لانژھس ہیو تہ کھوسہ بُتھہِ پیٹھو پھیرہ پھیرہ اُوش وسن۔ موخہتہ آپن وُچھ تہ وُچھت زن پنُنس مُشت گومُت، ہتیار یاد۔ تہ دِژ بُتھہِ بُتھہِ تہ تراون وَدان باک۔

موخہتہ آپہِ ژ بہ ہش کوڑ طوطہ لالہ اُمس اپارہ گوڈہ شرارتہ سیتی کھمان، پتہ تراوُن اوش زہ موخہتہ آیہ ماگژھ امی سیتی رام۔ یلہِ نہ کینہہ اندیوس، تمہِ تل ٹیلی فون تہ کوڑن واریو۔ موٹر آنہ نوُن تہ ڈُبُو اُمس ماچہ رخصت ہینہ درائی۔

قصہ اوس پتہ کُنہ سپدمُت۔ موخہتہ آپہ اُمس سوہرہ پیٹھہ گھر زہ تہ وو نی اُمس خیمہِ گُنڈس منز۔ اتہ اوُس طوطہ لالن کیاہ تام ضرورت پیومُت۔ طوطہ لالہ اُمس ساتھ نشامس دارِدہ پیٹھہ آمژ تہ تورہ اوُس تعبیر

خانہ دارہ سُند چپراسی سیتی۔ موخہتہ آپن کوژ خیمہ کُٹہ پیٹھہ چپراسس: آلو۔۔ " ہیو۔۔ کیاہ چھوی ژ نیہ ناو۔۔ ہتا چپراسیا! "

" کیاہ حضور؟ " چپراسی اوس دوران آمُت۔

" تلا طوطہ آپس کر یوری آلو۔۔ " ووُن موخہتہ آپن۔ طوطہ لالہ اُس امہِ دِزہ دیوان خانہ منزہ دراموژ تہ وونی اُمس کُزس منز۔ تمہِ یلہِ ماچہ ہند یہ وَنُن بوز، تس کُرژ ژ کھ۔ دزان وزان ژ ا یہ خیمہِ گُنڈس منز تہ ادرک بوزنہ در آیہِ ہیوتُن یورہ وَنُن۔ " ژ یہ کہیے چھوی نہ یہ آیہ آپہ وَنُن مشائی؟ ... "

موخہتہ آیہ گیہِ حیران ہشی۔ اما آدہ کیاہ گوژھہ وَنُن۔ یمیس کیا زہ کَھرژ تہ وَنس پیٹھہ ژ کھ۔ یہ ماچھ مژ گامژ۔ "

موخہتہ آیہ ژ طوطہ لالس بُتھہِ بُتھہِ وُچھنہ زہ یہ کیاہ۔۔؟

طوطہ لالہ وُژھس۔۔ " سیود چھوی نا بنان وَنُن بیگم صاب۔۔ دُنیاہ ہے میہ تی چھہ وَنان۔۔ "

" تہ کیاہ گو و بیگم صاب۔۔ " موخہتہ آپس اُمس توپ آمژ۔۔ " تہ چھُم از توَدی ناواہ۔ تہ کیاہ گو و؟ " موخہتہ آپس زنہ نہ کُنہی اُوس فکرہ تران۔ تس اُسی گاڈی گیری بجہ کران۔ مگر طوطہ لالس کُرژ ماچہ ہنز جادسے ژ کھ۔ " آدہ کیاہ۔ تی گژھہ چون وَنُن۔ یہ کھرد نہ آپہ تہ قاہ یہ آپہ گژھہ نہ میہ وَنُن۔ "

یہ اوس موخہتہ آپس تہ موخہتہ آپہِ نِس سارسی اشراف دُرِس پیٹھہ ضرب۔ تمہِ ہیوک نہ یہ ژ ا الِتھ۔ سو گیہِ تھود تھود وُتھت۔ " یہ گیہِ گانہ گی۔ ژہ چھک نا مند چھان تہ۔ اُسی چھہ اشراف۔ اُسی لگو نہ بیگم

سُ بہ بیگم صاب وننس ۔ "
"تکیو نۆ تہٕ ہتہٕ لگو تو ۔ میٚہ کیتھ چھکہ ہنہ عقاوان ۔ طوطہ لالن
زنہ ہس اُچھو تہٕ دمراوِتھ :
"چانہِ تہٕ تمنہٕ کراو میٚانہِ پورٕ تہٕ تیلہِ وننہ سینہٕ دوی ۔ "
اَتھ میٚہ چھنہ خوش کرانہ ۔ موختہ آپن وون ۔ "میٚہ چھنہ
پڑنہ یہ لیکھ لاو تہٕ خوش کران ۔ "

موختہ آپس اُس اَندرۍ اَندرۍ چیراُسہ دِ ہنز تہٕ ژوکان ۔ اشراف
گرن ہنز نیپر تالہ نوکرازی پیٹھ آسان ۔ یم گونژہ کرٕ کرٕ
تہٕ د چھا اشرافن گھران اندر اتھٕ لایق ؟ موختہ آپس اُس
پنہ پاٹھو طوطہ لالہ صران ۔ ادسے وونن ۔ "دوہ پر موہنیو سیتۍ
سیتۍ پینا ونہ چھا رنگی تکان ۔ "

چیراُسہ مند چھور کینژھاہ تہٕ کینژھاہ گرس اَندرۍ اَندرۍ کیتہ
کیتہ ۔ سہ پول پیٹھ تہٕ دود ڈلیتھ پیٚن ۔

طوطہ لالن ادس تہٕ اَتھ تام چیراُسہ دنہ موہنیو زونمت ۔ تمہ
ادم تہٕ ستہ مو ہنیو تہٕ نزاتھہ نزان ۔ تہندۍ کنۍ ادس سہ چیراُسہ
تہٕ پتہ ۔ گمراز گوس ماچہ ہنز کتھو تلواس ہیو ۔ خانہ دار ہنزہ
افسرو تہٕ منشرو ہند سو زد غیرت وتھ اُچھن اندر ۔ اُچھو
گلیس دود زچھ نار ہش ۔ موہتہ نہ آسہ ہس ، خبر کیاہ بنزراونا دِہس
تہٕ وژھس ۔ "ژنہٕ چھے بڈھ دیوت ووژھمژ ۔ تہٕ چھک شیٹھ
ڈلیتھ پیٹھ ۔ بوزتھ ؟ "

"دیوت چھے ژیہ ووژھمژ ۔ بوزتھ ؟ " موختہ آپن دِتس جواب ۔
"کھریس چھے ووژھمژ ۔ " امہ پتہ دیژن دند چیرِتھ زورہ کزکہہ ۔
"بنہو کھنڈ چھیتھ گٲمژ ۔ "

طوطہ لالہ اُس محاذ تراوِتھ ژٕمژ ۔ دیوان خانہ پیٹھ ادسن
واریو ٹیلی فون کورمت تہٕ کار منگٲوِتھ اُس ماپس ماجہ رخصت
ہینہ وسأوِ ژھمژ ۔

اَتھ پیٹھ ادس رسول لالن وَدان ۔ اشراف کورہ ہند پورسے
واریو گژھن تہٕ گوڈہ تہٕ واریوین پتہ گژھ کرٕ کرٕ بادچھ لیو ۔ یہ
ادس تہٕ رسول لالن ازتام وچھمت یا بوزمت ۔ پیٹھ تہٕ کرتھ
تمہ

وارِوین ہنز کار آژنا دِنی ۔ باقر خانہ مچہ رہستوی تہٕ سارۍ کھوتہ
بوڈ رسول لالنس ودٲی طوطہ لالن ۔ واریو گژھن ادس رسول
لالنس بڈ قیامت باسان ۔ ادسے کھوت سہ موختہ آپس زارہ
پارہ کرنہ ۔ "آیو کرحن پانس ژھو یہ ! "

مگر موختہ آپہ کیتھ کرِہا ژھو یہ ۔ تس ادس رژھ پتہ رژھم شرارت
گنان ۔ طوطہ لالس سیتۍ سیتۍ ہینہ ہیوتن تس باقی لوکن ہند تہٕ شرارت
کھسن ۔ گوڈہ رہیہ سُند ۔ تہٕ سے ہیوتن پانس سیتۍ ووژن ۔ گوڈہ
گوو تمتھ دوہس ڈاکہ تہٕ دُد وَتہٕ یمہٕ دوہہ یہ اَتھ گھرس لج ۔ گوو
اَتھ گھرس لیلامہ ۔ " سہ اُس دوہہ دوان طوطہ لالہ ہنین وارِوین گمر
وَنن ادسس بند آتی یہ ۔ "میٚہ ہے تمی دوہہ تالہِ پیٹھ کنی ہیژا یہ زہ
اَتھ گھرس لگو تہٕ اُسی ۔ میٚون چھا کانہہ مانان ۔ یہ وُنیتھ ژھیٹن بیاکھ
باک ۔ تہٕ باک ژھیٹنہ پتہ ہیوتن بیٹھہ وَنن ۔۔۔ "یہ چھم ناسیدہ
بوژھ ۔ " یہ دوَنن رہیہ سُند ۔ "گوو تمہ دوہہ خام طمع ، لڑکن چھے
پڑھائی کرمژ ۔ کیاہ تام ایل ۔ ایل ۔ بی پاس چھہ ۔ یم پڑھتو چھہ گرمتو
آسان ۔۔۔ بوہے اُسس گوڈسے زانیتھ ۔ "

موختہ آپہ اُس دِگرہ پیٹھ شام تام گرا وَدان تہٕ گرا دوران ۔
رسول لالنہ ادسس برونٹھہ کنہ ہیتھ گرا ہزری اُچھو منزہ کھوسہ
بتھہ چہ گینیو منزہ آب تراوان تہٕ گرا آذی آذی کران ۔ یوتام شام
سپد تہٕ طوسی صاب وآتھ پیود ۔

موختہ آپن شرارت ادس کینژھاہ وقتن تہٕ کینژھاہ رسول
لالنہ سنز آذی آذی کرنن گوڈہ بپأو مُت ۔ ہمسایِن تہٕ اشناون ژھٹ
کڈ نومُت تہٕ پتہ وارہ وارہ ہموار کرِتھ سو مُت ۔ وودنی ادسس
منزۍ منزۍ ہواگینژ ہیو خیالاہ یوان تہٕ شرارت تہٕ کس سرن آسہ رنجہ
رنجہ لہرہ ہش وودکان ، امہ وِزہ اُس موختہ آپہ یا تہٕ وَدان نتہ دوماں
گمر پتھوی طوسی صابن گوزہ منزہ "ماشااللہ" گوز تہٕ دیوان خانس
کن سنیدن ہیوتن ، موختہ آپہ لپس شرارت تہٕ سرس لج بیاکھ کنی ۔۔۔
ننو نمت دود گوو بیدار تہٕ موختہ آپن وِژ کرِ کہ ۔۔۔ "اُمی کیاہ کرٕ
شیٹھ تہٕ رسوا تہٕ خجل ۔ اُمسی کیاہ چھنہ میٚوان زندہ روزن خوش
یوان ۔ گوڈہ گوو خداماپس میٚہ کیتھ موت تہٕ کامنہ ۔ کیاہ گوم !

اگست ستمبر ۱۹۶۲ء

کیاہ گوم — موختہ آین ترأو ژیث ڈدن لہر —

طوسی صاب اوس ژینتھ ژکھ آمت۔ سہ اوس ووٕنی پۄژیمت تہ شوحن کیومت۔ تسنہ اوس ووٕنی بیہنہٕ کتھہ ہند تہ آیہ ونہ موکلہ ہند ضرورت۔ مگر پتہ دریہ پیٹھہ ییتہ تہ طوطہ لالس پننی جرمنی تانکھہ کورمت اوس، اوتس قبلہ ہیومت۔ اکہ بی شامس آیہ موختہ آیہ بیہ ترٕنی کھینہٕ آسان تہ وکہ بی شامس آیس طوطہ لالہ ژین وأریوین ہنز تہ گلپ کاہے تہندس خانہ دارہ ہنز داگوی بوزنی آسان۔

طوطہ لالنہ وأریوٕ آسو نہ پتہ پتہ بٔڈکہ۔ تمن اوس نہ کنہ آندہ مرگذار تہ تو ادہ چھینہ جاگیر کیتھی۔ پیٹھہ اوسکھ طوطہ لالن خانہ دار ووریاہ ہمہ دنہ چھہ لودمت سہ — خبر کیاہ اوسن کورمت مگر بعد نہ اوس سہ کنہ تام آسہ۔ کیاہ نام دپن منشتر۔ تہندس گرس اندر اوس نہ خی جہ تورن تہ دشتہ دأری۔ تہنزہ نوشہ کورہ آسہ ٹاکین گژھان۔ (تہندر گھرہ آسو داہ (تداں تہ داہ نیراں) — نوکرأزی پتھہٕ آسکھ مردہ موہنزہ — کورہ آسکھ مدرسن گژھان برقو روستوی —

پأد اوس موختہ آین توٚجیمت۔ تہ کیا زہ اشراف زنانہ کمر بتھہ اتھ ہا کورہ ہند دأریو۔ ونہ آو نہ ڈوڈ گونہ ڈدڈ مگر بیقوی کیاہ تام اوسن بوزمت، کینژہ ہاہ ازسس بہان تہ کینژ ہاہ اوسس نہ بہان۔ مگر ازبیو ستس سورٕوی۔ از ووٕ ڈین سیٹھاہ زہ کور لیچ دیہ ینتر خبر کمن کمین ہندس گرتہ منز۔ تہ بیقوی طوسی صابن ماشا اللہ بوزن، زنتہ تمس لوٚرہ سندیہ لأبن یمہ اہنزہ دارہ لوٹ اوس کورمت۔ اوسے لأجن کرکھ — گوڈہ گو وخدا صابس میٚہ کینھہ موت تہ کامنہ آسہ پتہ ترأوان لہر — "کیاہ گوم — کیاہ گوم —"

طوسی صابس اوس آنگنہ منزے دارہ سوارٕوی کینہہ بورمت۔ تسن آس پہ بوزتھ دادہ منز تہ سیتھ طوطہ لالہ نہ کھو تہ جادہ اوس ہن موختہ آیہ نوی شرارت کھوتمت۔ مگر ہر کنس سوتب آیس نہ ہینگتھ۔ اوسے ترا وسیو ڈوی دیوان خانہ۔ پوزہے بوزد طوسی صابس تہ اوس طوطہ لالنین وأریوین ہند اندری ژور تس۔ تہ اوس باسان نہ منزہ بوڈ پتہ کھیکو نیل آسمان لشر، تہ اوس باسان تتیس

نہ طوطہ لالن خانہ دار چھنہ سانہٕ کینہ ہند، اسہ ہیتو تہ اسہ لایق۔ اعتوی اوس تس منزٕ منزٕ گمان گژھان نہ فائدہ واتنہٕ ونہ بدلہ چھہ طوطہ لالن خانہ دار شوتھس دھکہ دھکے دوان۔ ہتہ بیتی کڈان تس آسو تیتو کینہ تو وریوٕ پیٹھہ کاشکار تھچو چرو ہی گامتو۔ گوڈہ کھینہ بس نیمن پتہ پرکینژ ہاہ ژھلو کو بچاون تمتہ پیس گأز وودد۔ کیاہ تام تلکھ بینڈ زن گو تہ تہندین کاشکارن تیج کڈ کھینک پاٹھی چھگ۔ اڈہ ڈلہ دچھن تہ اڈو کھوورٕ۔ طوسی صابن آسہ سیٹھاہ ڈدہ ددو مگر اندیوس نہ کینہہ۔ پوتس ژدوہن گام زہ نیشہ یمن بشر ژدوٚدو ژدوٚدو اتھو ہتپ کرتھ ژود۔ گوڈہ آسہ ن شرین پیٹھ نیابت زہ تم سنبھالنہ نہ ہتھ لڈکہ بشیر صاب آس ڈاکٹری پرتھ تہ لوگ پننہ کامہ سیتی۔ طوسی صابن پیوس سیٹھاہ زہ ہتا زمینس زراعتس واتنہ۔ مگر تس زن بہ فرصتی نہ آسہ آیہ تورکن۔ آخر گنیہ طوسی صابن دوییمس لڈکس جلیل صابنس ناوس سیتی دتہ۔ مگر سہ اوس انجینری ہندی ژھوکن کھیومت۔ سہ اوس کالہ آکس جایہ دورس آسان تہ یگاہ بیٚیس جایہ۔ اتہ ہأرتھ آس طوسی صابن طوطہ لالنین اژکین وأریوین پیٹھ نظر تراومژ۔ بلہ تہندہ گرہ پیٹھہ منز یوم یور آو طوسی صابن کرس ستہ اتھ ہتپ تہ موختہ آیہ نہ ٹول ٹول کرتھ باوجود نیوکھ طوطہ لالس نیتھ کرتھ۔

موختہ آیس اوس از اندری اندری تیلہ تلیون گژھان۔ سوأس طوسی صابس ترژہ کانہ لوپا یژھان دنو پتھ زن سہ دیوان خانہ ترأوتھ دوی ترہ ہاختہ کھکس منز تہ اتہ موختہ آیس کینہہ بڈہ برہ وتھ ہا۔ از ونہ ہیس موختہ آیہ ننہ ننہ کتھہ ——— ——— مگر طوسی صاب بیوٚٹھ لوتی تہ اوسے دوند موختہ آین سیٹھاہ — سیٹھاہ۔ جادہ گرس رسول لانژھن سیخ یہ سہ ووتھ امہ کیٹہ منزہ تہ تونہ دیوان خان طوسی صابس نزگوں موہٹھ دینہ۔

۲

یہ اوس نوٚو محاذس پرسہ پیٹھ قایم اوس سپدمت۔ مگر گوڈنیکہ توپہ آس از چلیمژ۔ موختہ آیہ آس امید نہ تہ پیس محاذس پیٹھ جنگان۔ یدوسے تمہ تتھ محاذس پیٹھ ووٕنی جنگ

هورمُت اوسُن گمر شادی آسہِس یہِ زِہ تہٕ جنگس منز اوسُس طوسی صاحب سیٹھا سیٹھی نداں تہٕ نوو نوی بگولہٕ ہیتھ کران۔ یِم خاندانس تِرہ (۳۰) وری پتہ وان تِیلہِ موخت آپس گو ڈیکھ نیچو ندامت اوسن۔ موخت آیہ آس بتھ دِوہن لوکیٹ تہٕ موصم۔ طوسی صابُن نِلنِلہٕ اوسن عالمس۔ موخت آپس تِہند تسول لاٹرھس اوس تہٕ ہمسایِن اُشنادن منز چھنہٕ کیٹھی۔ نیچو سِندس زمینس بیٹھ آیہ ہُنڈری بازِ تہٕ دوہ موزج آیہ انباد نہٕ۔ گمر ساروی کھو تہٕ بُڈ فکر اُس موخت آپس یہِ زِہ ناو کیاہ کرِ دِس۔ تمہ دوٚن طوسی صابس کنس تل — "پیر صابس دُنزِہ قرآنہٕ منزہ ناو کڈُن۔ یُتھنہٕ گوب، آسِیس۔ دوٚندہ بہ زرُو — او بیٚیہ گرِثھ مر تہٕ تیٚتہ ناد کانسہ آسن!"

طوسی صاحب گو و تہٕ آو۔ ناو اُنِن عاریاہ تہٕ قسم کرِن زِہ پیر صابن کڈی یِم ساری قرآنہٕ منزہ۔ بیٚیہ وونُن زِہ یِمو منزہ چھنہٕ کانہہ تہٕ گوب۔ موخت آپن تولی اُندرِ اُندرِ ساری ناد اُغر کوٚرُن اکھ پسند تہٕ تھووُن نیچِس بشیر ناو — سیتی گیہ اُندری اُندری سیٹھاہ خوش۔

گمرواسے یہِ قرآن چھہ سارِنی ہُند تہٕ پیر چھہ سارنی ای منزہ ناد ژارِتھ دِوان۔ اکثر دوہ اُس موخت آیہ دیوان خانہ داریہ بیٹھ بہتھ دُور کوٚتھ تام کُن وُچھان تہٕ خبر کم سُنٛز کران۔ اُتھو منز کوٚڈ ہمہ کھوپہِ ہُندہ پوٚتھ دِیہ کِنز کھورٕشہِ پھیارہ کلہ تہٕ دِژن کُزیہ — "بشیرو — ہتا بشیرا۔"

موخت آیہ رٲو۔ اما یہ چھا میانِس بچہِ لاسن بلایہ لگان —؟ یِکس چھہ بشیرو بشیرو وَنان۔ موخت آپس کھوٚت بچِس شرار تکّ وو زچار۔ اچھو بِچس وتہٕ کُن درِس تہٕ اتھو منز گوس ییتم شہہ پیٹھ کُن تہٕ بروٚنٹھیم بروٚنٹھ کُن تیلہ ہتہٕ ڈھیوٚٹ پیٹھ کھورٕشہ پھیارہ ہُند زر — کرِتھن کال ہیو، پیٹھ نوٚٹنی تہٕ کھس پیٹھ کمرہ آکھ کرِتھ — کریکہ دِوان وُچھن — "کِیِہ طاون جدی!"

"ہتا بلایہ لگے معلا یورِ — " کھورٕشہِ پھیار آسس وَنان — "بشیر لالا — ووٚلہ لگے!"

موخت آپس کھوٚت تیوٚتھ خشم زِہ سو ویٚیہ دیوان خانہٕ دارِہ کنہِ دوٚر۔ اکھ تو ہند بشیر لالہ بیٚیہ کھورٕشہِ پھیارہ ہُند۔ یہ گیہ قیامت! زمینس کو نہٕ گرزھان چاکھ۔ اسمانس کو نہٕ پیوان چھلہ چھلہ! —— گمر کینہہ گو و نہٕ۔ نہ گیہ زمینس چاکھ تہٕ نہ پیو اسمان چھلہ چھلہ۔ اوسے وونہ موخت آپس اوٚش۔ سو آیہ نہٕ تورتام تھٔنٛٹھری تام نہٕ طوسی صاحب آو تہٕ تمی کھورٕشہِ پھیارس ناد دِتھ آنہٕ ناو۔

"اَمِس کیٚہ چھُت نِریہ زُرِس ناو کوٚرمُت کھورٕشی؟" طوسی صابن لاج موخت آپس تمی عدالت تہٕ کھورٕشہِ پھیار آس ژورہ پسندی بٲتھو نٲران۔

"ہسہ کیاہ تام حض چھُس امام صابن ناو تھوومُت، میہ چھ تگان پھِرُن — " کھورٕشہ پھیارہ ہیوٚتھ ماریہ آلوس آب چھکُن۔

"نے تو تہٕ، بہ تہٕ زان بوزِہ ہا۔" طوسی صابن ژکرو ڈیکہ آسنہ یہِ ہاونہٕ موصوب زِہ وُچھ قیامت کیاہ کرِمس۔

"بوحض چھُس وَنان کھرپا کھرپا — " کھورٕشہ پھیارہ ہیوٚتھ یب — "یہ چھم تو ہند ٹاٹھنیار، تو سے چھُس وَنان۔"

"کھورُدی چھہ تہٕ۔" موخت آپن ووٚن اُندرو۔ تمہ تیجہ نہٕ کھورٕشہِ پھیارہ کُن اچھو تہٕ۔ سو اُس نہٕ تہنزہ اچھو زِہ تہٕ شیٹھ ہیٚکان۔

"اچھا تیر۔" طوسی صابن ژٹ کتھ ظاہر یہ زاتھ زِہ کمین سیتو لگن نہٕ جادہ کتھ کرِ نہٕ۔ کھورٕشہ پھیارہ زِدن تھنیس تہٕ دراو۔

امہ سیتو بدلو نہٕ کھورٕشہ پھیارہ زُرِس ناو۔ سو اوس تمس تو تہٕ بشیرا تہٕ بشیر لالا وَنان۔ اکھتوہی آسہ تس محلکو شُرِ کیہو تہٕ تی وَنان۔

موخت آپس تیلہ دوٚیم نیچو ییہ اندر ووس، تس ہنٛز کو ضرٕ فکر زِہ ناو کیاہ کرِن۔ سو اُس یہِ یتھ دوہ صبحس قرآنس ... تہٕ امہ اندرِ ناو سونبراوِتھ یاد تھوان۔ تمہ عتاو یہ زِہ تمسٕ جمع کرِتھ تہٕ پلہٕ شہ زاس گو ڈہ کوٚرنس ناو سکندر۔

گمر بٲدی کاکنہ دوٚرس — "ہسے کہو کورتھ ناو۔ میانہ وارِید

تو

چھِ یِہ ہانز کٹھِن ناو۔"

موخت آیہِ بامبرِ۔ تمہِ یِدرود جلد تہٕ شوونس جلیلہ ناو۔

یہ اُس محلہٕچن کمینہ بابن تہٕ شدٕرینین موختہ آپنٕز بٲکھ ترپ۔ اتھ پتہٕ اُس موختہ آیہِ خوش تہٕ اندرے اندرے اُس سونچان زِ یمہِ کیہِ بچہِ ہیکن یُتھ شوٗد ناو ہیٚنہٕ ہیٚن کرنہٕ تہٕ آیِتھ۔ تس اوس باسان زِ یِدوسے محلہ واجینہ پنٕنین شُرین یہ ناو تھاون دُنیاہ کرنٕکیو سنگسار۔ شُرگوو تُہین اتھ نامہٕ پکس۔

جلیلہ زیٚنتھ اُس موختہ آیہِ ڈُریس کھنڈس خوش۔ تہٕ کیا زِ گانٕسہ شدٕرینہِ اوس نہٕ اتھ ڈُلیس گانٕسہ کٔرِس امہِ ناوہ آلو کورمت امانٕز بشیر بشیر اوس پزٕ یتھ کٔنہِ گرس منز اُکِس نتہٕ اُکِس شُرِس ناو۔

اکِہ دوہہ اُس موختہ آیہِ سالس گامژ۔ اُکِس خوجہ گرس اوس تیٚچوس خاندر۔ یہِ خوجہ گرٕ تہٕ اوس سیٹھاہ پرٛون تہٕ سیٹھاہ اشراف۔ امہِ گرٕچہِ زنانہ آسہِ نہٕ نُدونہٕ اکتابس تُھد ہاوان۔ امہِ گرٕ کیو ییلہ مہارازہ پیرٛو تہٕ کوٗڈ محلہٕچہِ شدٕرینہِ آسہ سٔڑکہِ پیٹھ۔ ڈُری کٔری کٔرِ ر دٔ ہاوان۔ خوجہ بابن پنٕنہ ہانہ باتہِ سٔڑکن پیٹھ وٕسن۔ تہٕ ڈُری گنٕڈ نہٕ وَنہٕ ڈُن۔ مہارازہ ییلہ دٔراو، سٔڑکہِ پیٹھ وُڈھ کٔریکھ۔ شدٕرینیو تُل وَنون گرٕنز تہٕ خوجہ بابو لاچہ دارہِ پنجرن سیتی اُچھ یہِ جیٚٹ بوش وُچھنہٕ خاطرٕ۔ اُتھ منز پیٚچھو ییٚمن بابہِ مہارازس ہیٚری کنہِ شیٖرینیٚو، شُرِ کُٹھ گٔیہِ بشیرنیو سونبراوان لتہٕ موبچہ تہٕ وَنون درہ منزٕ وُڈھ اکہِ شدٕرینہِ کٔرِکھ — "ہتا جلیلا۔ ہیو پیٚنو کھاہ وُسھ! گرٕس تل ہا گژھک —جلیلا— ہتا جلیلا۔ ہہ ژینہٕ گردن پیٚنو پیٚھرا!"

موختہ آپس زن یِم دوہ ہٕرٕ پنٕنس جلیلس پے۔ سہ وسہِ ہا اُتھو سٔڑکہِ پیٹھ۔ اُمِس شدٕرینہِ ریٚڑہ ہا تہٕ زیچن دِیہِ ہس تُدونہٕ۔ یِمہِ ہیٚکہِ ہا مٔ کرِتھ۔ اوسے وُژھس اُتھو دٔدساے۔ تمہِ تِچھ پنجرہ دارہِ پیٹھہٕ اُچھ تھود تہٕ گٔیہِ اکتھ کُنہِ بیہنہٕ تہٕ وَدنہٕ— تس باسیوو پنٕنٕ پان پرٕنتھ طرفہٕ دشمنو سیتی وُلتھ۔

خوجن موکلیوو نینہِ دول تہٕ آیہِ وٕتل۔ وَنیٚو دوہہ شامس تُل موختہ آپن گرٕ گژھنہٕ خاطرٕ ڈیرہ ڈٕگ۔ رسول لانژھ اوس کتہ

تام آوُر۔ مگر موختہ آیہِ ہیوٚت نیرہ وُنی نیراو۔ خوجو تہٕ خوجہ بایو کرنوس کیاہ زِ رودز تہٕ بیٚیہِ اَ... دوہن۔ مگر موختہ آپن موونہٕ کینٛہہ۔ تس وُژراو سونٛدون وازہ دراو نستہ کیٚز تہٕ شرارتہ بیٚیتو ہیٚو پیٚچھ۔

کینژن کالس وُڈناہ کٔرِتھ، دوش تراوِتھ تہٕ پانسی سیٚند پوٚکن ڈُہو ڈُہو ییلہِ موختہ آیہِ تیٚچو تٔس کُرُ خدا ماین بٲکھ یاٹری۔ تس ہیٚنژن زِ مرٕ دٔرہ کہِ پٔنہِ۔ تس ہیوٚتن زِ مرٕ ٹال مٔشن۔ سہ رُوز زِ مرٕ بیٚیہِ ژٔدِ ہ۔ اُمی چیزن دِژ تس ہمت۔ اُمی چیزن سونچناو زِ اُزکہِ لٹہِ کرہ یہ شُرِس سہ ناو، یُس نہٕ کانٕسہ زیوٗدہ پیٹھ کٔیسہ تہٕ اَدہ کرِیا پنٕنس کٔرِس تہٕ ناو۔ مگر اُزکہِ لٹہِ نہٕ یِہ موختہ آپس کوٚرہ تہٕ کوٗرہ کوٗر سارِوی اُشناوو ناو "طوطہ" دلبر۔ موختہ آپن تہٕ موون تہٕ۔

مگر نوکھ اُسیا موٗدمتہ؟ وُہرِ کُنٛڈی اوس محلہٕکین شدٕرینن ہنزن سارِنی کُورین طوطہ ناو۔ وُچھنہٕ تہٕ اُس کٔریکہ طوطے تہٕ طوطہ لالے تہٕ کھو ورد تہٕ۔ موختہ آپن کرِیو امہِ وِزہ تہٕ سیٹھاہ زِ یِمہِ کٔرِکہ گژھن نہٕ بند۔ مگر اَندیوس نہٕ کینٛہہ!

آخر رُود دُہن وُرین یہ جنگ چلان۔ موختہ آپن تہٕ طوسی مایَن کوٗر پرٕنتھ دوہ یہِ دُہری کوٗرہ یا نیچوس کانہہ زاوِیل تہٕ نوٚو ناو مگر یہنِدہ ناو کرنہٕ پتہٕ کینژو کالی اوس محلس اندر یہ ناو داریا ہن شُرین آسان۔ موختہ آیہِ اُس اکہ۔ محلہٕچہِ شدٕرینہِ آسہِ واریاہ۔ موختہ آیہِ اُس دوہ یہِ دُہری نوٚو ناو کران مگر محلہٕچن شدٕرینین اوس یہ پرٕنتھ دوہ ہہ شامس یا صُبحس نِو ناوُک ضرورت آسان۔ پتہٕ آو موختہ آپس مصیبت۔ سہ آیہِ خدٲنِس تہٕ شُرِ زیٚنہٕ گاٹس موقوف۔ اتھ اَندیرس نہٕ کینٛہہ۔ اُدتھ واتِتھ ہورُن!

ہُبارِ گو مجلس منز ناون زاوجار یِوان۔ یوس کوٗر یُنہٕ ہیٚش اُس تس اوس طوطہ ناو۔ یُس کوٗرِ نہٕ مٲلیس ماجہ شُغدرہ شام اوس تس اوس شہزادہ ناو تہٕ یُس گٔٹس ژھوٗش پیٹھہٕ غیٚدٕ پیٚوان اُمس تس کوٗزِکہ اشفاق ناو، یُنِکہِ وامن کوٗزِکہ اقبال ناو۔ موختہ آیہِ گٔیہِ سیٹھاہ پتھ تہٕ محلہٕچہِ زنانہٕ گٔیہِ سیٹھاہ بدٕ نٔژ نیرتھ۔

(باقی)

گنگادھر بھٹ دیہاتی

قطعات

۱۔ یہِ کمُ وَننےَ تہٕ کمُ دِیُتنےَ ژیٖنہٕ میُتھ برٕم
خیالاہ خام چھُوی اِنسان چھُہ مجبُور
اُمی دِیُت رنگ وبُو یَتھ کایناتس
بُنِتھ گوٚو سُرخ رُو آدم سہُ منصور

۲۔ بہٕ کیاہ کرہ لالہ رُین بہٕ جبینن بینہِ مَدن وارن
میٖنہ دِل چھُم چھنہٕ رٲوِمت روی وُچھِت مزدُوریارن ہُند
وُچھِت داں ڈل قرارس چھُنہ روزاں دِل یہِ چھنہٕ رٲوِمت
کھسان وُشلُن بُتھِس چھُم مَد لگان چھُم لالہ زارن ہُند

۳۔ ژٕہ یِتہٕ میٲنِس جہانس منز تماشا بہٕ تۄہی ہاوَسے
نۄی آداب زِنٛدگی ہیٚچھناوتھ بہٕ باوَسے اکھ نۄو ہی رازا
جگر کیاہ گوٚو تہٕ غارت کیاہ خیالن ہُند تھزر کیاہ گوٚو
گِندُن کیاہ گوٚو کلس پیٚٹھ زِنٛدگی کیاہ گیہٕ زُوَس بازا

۴۔ یہِ چھُوی وہم چھُم چھنہٕ ژھونٛڈ چھُس بہٕ لاچار
فریبک بنیومت ژٕہ چھُکھ اکھ شکارا
دِلس آش چھےَ یوٚد یرادک تہٕ چھُوی جوش
ژٕہ چھُکھ پایہٕ بوٚڈ عالمُک باوِقارا

۱۔ یہ تجھ سے کس نے کہا اور کس نے تجھے ایسا کہہ کر بہلایا؟
یہ تو تمہارا خیالِ خام ہے کہ انسان مجبور ہے۔
یہی تو ہے جس نے اس کائنات کو رنگ و بُو بخشا
یہی تو ہے جس نے منصور بن کر آدم کو سُرخ رُو کر دیا

۲۔ میں حسین مہ جبینوں اور معشوقاؤں کو لے کر کیا کروں؟
اپنے پیارے محنت کش مزدور کو دیکھ کر ہی میرا دل بے قابو ہو گیا ہے
دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھتا ہوں تو دِل ٹھکانے نہیں رہتا
چہرے پر مسرت کی سُرخی پھیلتی ہے اور لالہ زاروں کی سی مستی دِل میں جاگتی ہے

۳۔ تم میری دُنیا میں آؤ! میں تمہیں ایک نیا تماشہ دِکھا دونگا
تمہیں نئے آدابِ زندگی سِکھا دونگا اور ایک نیا راز تمہیں بتا دونگا
جگر کیا ہوتا ہے، تخیّل کی بلندی کیا ہوتی ہے؟
اور سر سے کھیلنا یا زندگی کو داؤ پر لگانا کیا ہوتا ہے؟

۴۔ یہ تمہارا وہم ہے کہ جیبیں خالی ہونے سے ہی میں مُفلس ہوں
تم تو کسی کے فریب کے شکار ہو گئے ہو
اگر دِل میں اُمید اور ارادوں میں جوش ہے
تو تمہارا مرتبہ بلند ہے اور تم باوقار انسان ہو۔

جواہر لال سرور

قطعات

میٔہ چھُوی ہادس مُشتھ از شام گومُت
اشکہٕ ذن چھم شرابکۍ دام گومُت
ژٕ دُرچھُ زین میٲنی ہُندریومُت یہ دِل اَز
ژٕ ینُس چینہٕ رٕدس پُہ چھُس بدنام گومُت

ڈلکہ اڈہٕ بیتُل یہ یمپوشا مزر چون
ژُکم ہنزٕ ژُو بزن جوشا مزر چون
ژٕ یُہ بعر ہیو کھاسو سُنبلن ناف مولمُت
ژٕ دو لہ ساتھ خیر یوشا مزر چون

وَے میٔہ گوژھ واپس ینِن تو کچاز اَز
وَے تو یومُت چھُم غمن ہُند بار اَز
وَے پنیم توس اُتھر دل بانز نیم
یتھ دِلس میانس تہٕ گوژھ غم خوار اَز

تلا از ہُرأود تو متہ دارہ بازس
تلا غرم یتا گژھ کانہہ میٔہ رازس
میٔہ زن ز غمن چھٕہ کُو تام لوٚن چھوکُت
یہے وگ نار تدن طرٕ دن چھٕہ سازس

ینگس ینتھ جلے شیرتھ ذسے گلابس
یہ کرو انہہ گوس قابل اتھ کیا سن
ژٕ بازو نتھ یہ ذہنن تارہ منقل
یوہ رودُس تشنہٕ اتھ رویس تہٕ پیالس

تعمیر

عائشہ مستور

غزل

میٔہ نُون بخشس زِندگانی ہا لالو
یہ چھُم سیٹھاہ مہربانی ہا لالو
ژٕ یُد آسہٕ ہی سُر پہہ ولیس میٲنی باقی
جُدائی ژٕ ذرہکھ نہٕ میٲنی ہا لالو
یہ ماژس پنُن اعتبار ژٕ سیٹھاہ
ژٕ اُوژھتھ نیم یلہ میٲنی ہا لالو
میٔہ ما چھُم خبر چھے ژٕ ینہٕ دردِ دِل جُدائی
یہ اُتھس کراں آن ماگی ہا لالو
گیس بال ہُوا ژٕ دزاہ ہیو پرٛا
یہ اپو کھُت میٔہ اوسیم ژُلانی ہا لالو
ژٕ بلغار زِ اُتھ تیز ھو کھُر تہٕ ماسیں
چھوکن بیگام چھُکٕ رنگانی ہا لالو
ژٕ ینیہ سیتھ آفتاب لاگم گوروٕ تُھونے
سِگنے ہز میٔہ چھُم ماسے یہانی ہا لالو
پرُت آب تُلس قرارس بُونے کیاہ
یہ ناروس اندر چھس دزانی ہا لالو
میٔہ چھُم آتش سینس اندرٕ دونگ روشن
ژٕ ہو اکھ ژٕ میٔہ چھُس دوانی ہا لالو
میٔہ مستورِ یکھنا ژٕ ینیہ باز پھیرتھ
یہ ہندسے پنُن مزجوانی ہا لالو

حدیثِ دیگراں

"تعمیر" جلد ۲ شمارہ ۲ نظر نواز ہوا۔ میں اس یادآوری کا دل سے ممنون ہوں۔ بلاشبہ "تعمیر" بھی سرزمین کشمیر جنت نظیر کے مثل ادبِ عالیہ کی رعنائیوں اور قلمی گلپاشیوں سے سراسر گُل بداماں اور اُردو نظم و نثر کی گل کاریوں کا دل نواز مرقع ہے اور صحافت میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ ہندوستان میں اُردو صحائف اب ایسے کہاں؟ "تعمیر" نو تخلیق ہونے کے باوجود جدید و قدیم کا خوش نُما سنگم ہے۔ دراصل یہ لائق ایڈیٹر کا فطری ذوق ہے۔ جس نے "تعمیر" کو یہ مقام بخشا ہے۔ میری دُعا ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ کامیابی کے ساتھ اُردو ادب اور زبان کی خدمت انجام دیتا رہے۔

دُعاگو: اخلاق حسین دہلوی

لال محل حضرت نظام الدین نئی دہلی

کلم پورکیری۔

مکرمی انصاری صاحب' آداب عرض!

ایک صاحب کے ذریعہ "تعمیر" کا جنوری فروری کا شمارہ پہلی بار دیکھا۔ انتہائی پسند آیا۔ واقعی کشمیر سے اُردو کا اتنا خوبصورت پرچہ نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ میں جلد ہی اس کی خریدار بن جاؤں گی۔

زیرِ نظر شمارہ میں ساغر مہدی اور کیف احمد صدیقی کی نظمیں بہت پسند آئیں۔ کیف صاحب کی اخلاقی نظم نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ آج کل اس قسم کی نظموں کی خاص ضرورت ہے آپ اُن سے اس طرح کی نظمیں اور لکھوائیں۔ شکریہ!

خلوص کار: شبانہ رضوی ایم' اے

محبی جناب انصاری صاحب

السلام علیک' مزاج عالی!

اپریل ۔ جون ۱۹۶۲ء کا "تعمیر" موصول ہوا۔ آپ کی عنایت کا شکریہ۔ "تعمیر" کا معیار مجھے بہت پسند آیا۔ آپ نے چند صفحات میں مُلک کے اچھے شاعروں اور ادیبوں کو جمع کر لیا ہے۔ یہ آپ کے اعلیٰ مذاق کی دلیل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کی ادارت میں اس پرچہ کا معیار ابھی اور بلند ہوگا اور یہ پرچہ علم و ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے گا۔ میں آپ کو آپ کی کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خلوص کیش:

ڈاکٹر سلام سندیلوی

سوپور کشمیر

۲۴ راگست ۱۹۶۲ء

محترم انصاری صاحب' آداب! "تعمیر" آپ کے ہاتھوں بھی خوب پھل پھول رہا ہے' البتہ اشاعت کی باقاعدگی ابھی ڈھرّے پر نہیں آسکی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس طرف بھی توجہ دیں گے اور "تعمیر" کی اس بے قاعدگی کو ختم کر کے دکھا دیں گے!

خلوص کار: گنگا دھر بھٹ دیہاتی

۲۔ کیننگ روڈ

الہ آباد ۲۱ رجون ۱۹۶۲ء

محترمی تسلیم و نیاز۔ اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ "تعمیر" کا شمارہ بابت جنوری فروری نظر سے گزرا۔ اس میں شک نہیں کہ "تعمیر" نے آپ کی ادارت میں قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ اُمید ہے کہ دفتری امور میں بھی کچھ زیادہ باقاعدگی برتی ہوگی۔

آپ کا مخلص: شاہدہ سعد

۹ستمبر ۱۹۶۲ء

مکرمی و محبی انصاری صاحب، تسلیم!

"تعمیر" کا تازہ شمارہ بابت جولائی ۱۹۶۲ء مجھے کل دوپہر کی ڈاک سے ملا۔ سرورق اور رسالے کی پشت کی تصویر کو حسب معمول دل کش اور جاذب توجہ پایا۔ اندرونی تصاویر بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ نریش کمار شاد، دیوندر اسر اور ڈاکٹر اے۔ این رینہ کے تحقیقی مضامین دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔ جناب وجاہت علی سندیلوی کا مضمون مزاح نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آر۔ ایل مہتہ نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی روشنی میں نئے کشمیر کے حسین خد و خال پیش کئے ہیں۔ جملہ تفاصیل اور اعداد و شمار نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ حصۂ نظم بھی بلند پایہ ہے۔ مقام شکر ہے کہ ملک کے ممتاز اہل قلم کا تعاون آپ کو حاصل ہے۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ حضرات شمیم و ٹینگ کی صالح ادبی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے بصدقِ دل کوشاں ہیں۔ کتابت کی اغلاط بہت کم ہیں۔ اگر بہتر کا غذ میسر آئے تو کیا کہنا ہو۔ حصۂ نثر میں مجھے ایک بلند پایہ افسانے کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔

مخلص۔ باوا کرشن گوپال مغموم

۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء

محترم بندہ، سلام رحمتہ

اپریل، مئی، جون کا "تعمیر" نظر افروز ہوا۔ یاد افزائی کا شکریہ۔ جہاں تک "تعمیر" کے معیار کا تعلق ہے وہ بلا شبہ بہت بلند ہے۔ تخلیقات بہترین ہوتی ہیں اور سلیقے سے ان کی ترتیب اور بھی حسن پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایک ماہنامہ کا دو، دو، تین تین ماہ میں شائع ہونا یقیناً غیر مناسب ہے۔ اس سے پرچے کے خریداروں کی تعداد گھٹ تو سکتی ہے بڑھ نہیں سکتی۔ پتہ نہیں آپ کے ساتھ ایسی کون سی مجبوریاں ہیں جو آپ "تعمیر" کی ماہ بہ ماہ اشاعت سے معذور ہیں۔ بہرحال تعمیر مجھے پسند ہے!

مخلص: حضور سہسوانی

برادرم انصاری صاحب، تسلیم!

اُمید ہے کہ مزاج بہ عافیت ہوگا۔ عرصے سے آپ خاموش تھے اور آپ کی خاموشی پر میری کچھ یہ کیفیت تھی کہ بس سہ

لرزتا ہے مرا دل، زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

بہرکیف آپ کی خاموشی ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مطلب یہ کہ "تعمیر" کا جولائی کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جو پورے طور سے کشمیر کے ارمان انگیز لالہ زاروں کی نمائندگی کر رہا ہے۔

راقم: وجاہت علی سندیلوی

محترمی انصاری صاحب!

میں پہلے بھی "تعمیر" کا عاشق تھا، لیکن جب سے یہ آپ کی ادارت میں شائع ہونے لگا، اس کے ظاہری اور باطنی حسن میں ایک نکھار سا آنے لگا ہے۔ یہ میرا حسنِ ظن نہیں بلکہ آپ کی محنت شاقہ کا بدیہی نتیجہ ہے۔ جولائی کے پرچے میں غالب پر فارسی شعرا کا اثر، سوانح حیات اور "ابہام تہ اشاریت" اچھی چیزیں ہیں۔ ٹائٹل میں بھی رنگ آنے لگا ہے۔ خدا کرے کہ آپ کے باعث "تعمیر" کے اردو اور کشمیری دونوں حصوں کا معیار دن بدن بڑھے!

اخلاص کیش: امین کامل سرینگر

محترم انصاری صاحب

تسلیم! "تعمیر" مل رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اس کی باقاعدہ اشاعت آپ کی کوششوں کی بدولت کوئی ایسی شے نہیں رہ گئی ہے جو دائرہ ممکنات سے باہر ہو۔ اس کے مضامین میں تنوع ہوتا ہے اور اس کا کشمیری حصہ تو بے حد جاندار ہوتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس حصے کی جاذبیت "تعمیر" کے حسن کا خاص جوہر بنی رہے گی!

آپ کا: محمد ایوب بیتاب شوپیان

ضروری

ضروری

ضروری

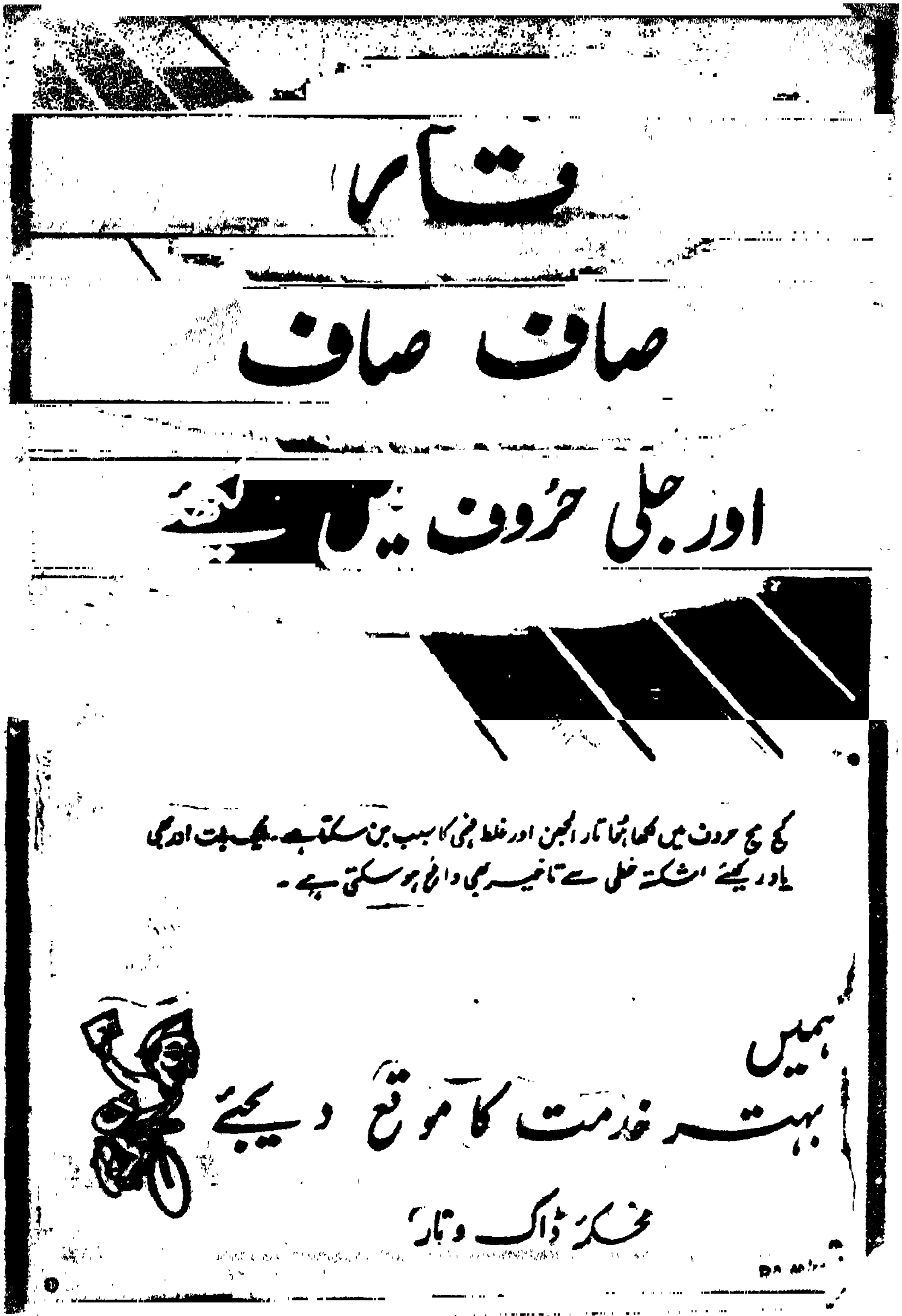
کوئی بیمار ہے ....
ضروری خبر بھیجنی ہے!
اسے "پرائرٹی" تار سے بھیجئے

بیماری، حادثہ یا موت پر پیغام پرائرٹی تار سروس سے بھیجا جا سکتا ہے۔
پرائرٹی تار کو ارجنٹ یا ایکسپریس تار پر ترجیح دی جاتی ہے لیکن اس کے لئے فیس ایکسپریس تار جتنی ہی لی جاتی ہے۔
اس طرح کا تار بھیجتے وقت لفظ "پرائرٹی" ضرور لکھنا چاہیئے

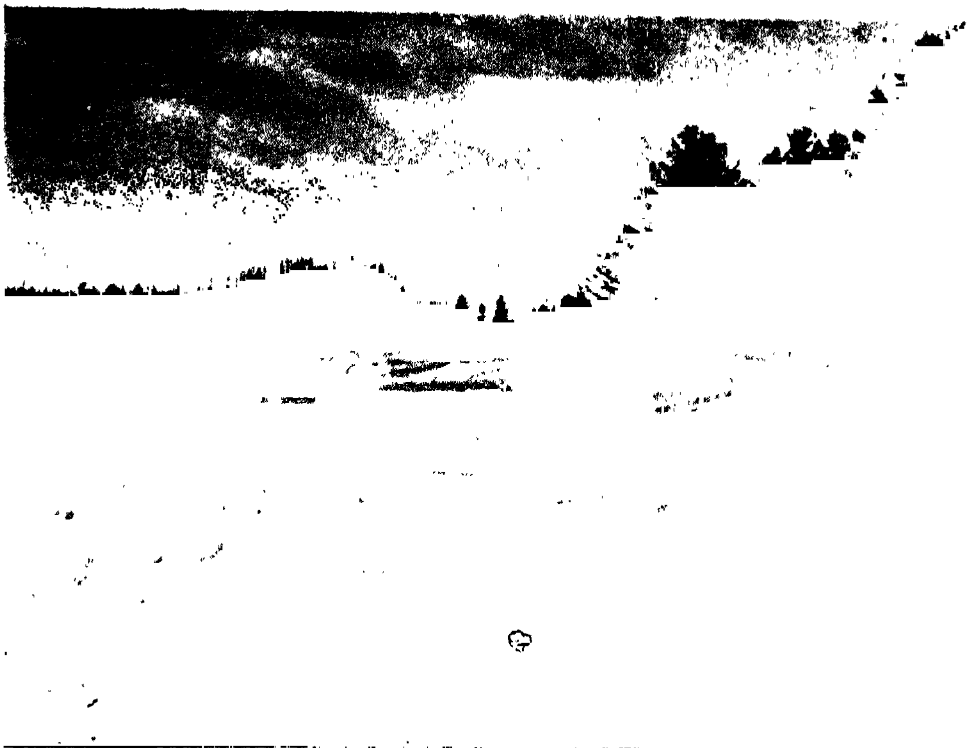
ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمہ ڈاک و تار

DA 60/623



پیرزادہ محمد سعید پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گورنمنٹ پریس سرینگر میں چھپا اور محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر نے شائع کیا



کشمیر — جنت نظیر کا
ایک دلکش نظارہ



ایک نئی سیر گاہ - یوس مرگ



کشمیر کے شہنائی نواز





ماہنامہ تعمیر

اکتوبر ۱۹۶۲ء

جلد ۷ ——————— شمارہ ۵

جنرل ایڈیٹر
ج، این زتشی
ناظم محکمہ اطلاعات حکومت جموں وکشمیر

ایڈیٹر
ایس، ایم انصاری

قیمت فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے ——————— سالانہ ۵ روپے

نگارشات کے لئے خط وکتابت کا پتہ :-

ایس، ایم انصاری ایڈیٹر "تعمیر" سرینگر، کشمیر

سرورق

عمل :- موہن رینہ

محمد سعید پرنٹر وپبلشر کے اہتمام سے گورنمنٹ پریس سرینگر میں چھپا اور محکمہ اطلاعات حکومت جموں وکشمیر نے شائع کیا۔

ترتیب

[illegible] عثمانی پوری

اے جنّتِ کشمیر

محسوس یہ ہوتا ہے کہ نغموں کی زمیں ہے
فردوس بریں سے بھی زیادہ ہی حسیں ہے
خم تیرے ہی قدموں پہ ستاروں کی جبیں ہے

جس سمت چلا نکہت گل راہنما تھی
کانٹوں کی نزاکت پہ بہار آپ فدا تھی
ہر منظر شاداب ہوا ہے مرا دل گیر۔ اے جنت کشمیر

جہلم کے کناروں نے پکارا تو چلا میں
شاداب چناروں نے پکارا تو چلا میں
جب ڈل کے نظاروں نے پکارا تو چلا میں

ہر حسن چمن زار سے سیراب ہوا ہوں
ہر وادیٔ گل پوش میں آوارہ پھرا ہوں
خوابوں سے حسیں تر ہے ترے خواب کی تعبیر۔ اے جنت کشمیر

وہ برف میں لپٹی ہوئی کہساروں کی جنت
گلمرگ فسوں تاب کے نظاروں کی جنت
اللہ حسینوں کے وہ رخساروں کی جنت

معصوم نظاروں میں یوں ہی کھو گیا میں بھی
جیسے ترا اک جزوِ حسیں ہو گیا میں بھی
صد رشک ترے قرب سے ہے عظمتِ تقدیر۔ اے جنت کشمیر

بکھرا لالہ بدن شوخ بھی رنگین قبا میں
بکھری ہوئی پھر موجِ تبسم بھی ہوا میں
تھوڑی سی جھجک ہے تو وہ بھی کیف سی شا میں
جیسے کسی ساحر کی کوئی سحر گری ہو
یا آتشِ نمرود جو گلزار ہوئی ہو
تعریف کہاں میں کیسے جرأت تحریر۔ اے جنت کشمیر

سوچا ہے تو خوابوں کا محل پایا ہے تجھ کو
دیکھا ہے تو رنگین غزل پایا ہے تجھ کو
آنکھوں میں پھرا کرتی ہے بس تیری ہی تصویر
اے جنت کشمیر

ہر نغمہ مرا، تیری بہاروں اثری سے !
لیتا ہے خراج اب بھی نسیم سحری سے
اسلوب نیا مل گیا شبنم کی تری سے

تخئیل کی دولت بھی مجھے تو نے عطا کی
انداز نے بخشے مرے فن کو جلا دی
ذرّوں سے ترے کاہکشاں کو ملی تنویر۔ اے جنت کشمیر

سنتا ہوں کہ تجھ پر بھی ہیں اغیار کی نظریں
مائل بہ کرم ہیں رسن و دار کی نظریں
کیا ظلم ہے کہ ہیں پھولوں پہ تلوار کی نظریں

قدرت نے تجھے اپنے ہی ہاتھوں سے سنوارا
شہکار بنا کر تجھے دھرتی پہ اتارا
پھر آنکھ میں دشمن کی چبھے کیوں کوئی شہتیر۔ اے جنت کشمیر

میں دور رہا اور مرے خیالات ترے ساتھ
ساغر مرے ہاتھوں میں خرابات ترے ساتھ
معلوم نہیں کب ہو ملاقات ترے ساتھ

اے موجِ صبا دوش پہ تو اپنے بٹھا لے
پھر مجھ کو ذرا وادیٔ کشمیر دکھا دے
[illegible] اس روز پھر لگتا ہے تیا غیر۔ اے جنت کشمیر

اکتوبر ۱۹۹۲ء

قومی یک جہتی فرضِ زندگی

ہر زمانے میں اہلِ تدبر نے قومی اتحاد کی اہمیت
ت تو ماننا ہی پڑے گی کہ قومیت کا وہ وسیع تصور
ہمارے ذہنوں میں موجود ہے۔ ان کے یہاں
ب یا گروہ تک محدود تھی۔ پھر بھی ایک ایسی
رآتی ہے جنہوں نے اس وسیع مفہوم کو اپنایا
جو آج عام موضوع بنا ہوا ہے۔ اس فہرست میں مذہبی مبلغ، ریفارمر اور ایسے حکمران نظر آتے ہیں جن کا نام احترام سے لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ ہندوستان میں اعلیٰ صفت شخصیات کی بھی کمی نہیں رہی۔ یہاں بڑی بڑی مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں، اصلاحی تنظیمیں وجود میں آئیں، لیکن سمجھدار طبقہ نے کبھی بھی جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر اچھے مقصد کی تبلیغ کرنے والا کبھی پسند نہ کرے گا کہ اس کی وجہ سے دوسروں کی دل آزاری ہو۔ جہاں ایسا قدم اٹھا جس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی وہیں مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس لئے بڑی دُور اندیشی اور تدبر سے کام لینے پر ہی کسی بلند مقصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

دورانِ جنگ آزادی اور آزادی کے بعد کچھ عرصہ تک اہلِ ہند کے سامنے بڑے اہم مسائل تھے۔ دراصل یہ وقت ان کے لئے آزمائش کا وقت۔ انہیں خدا نہیں آزما رہا تھا بلکہ ملک کی مٹی، جسے خاکِ وطن کا مقدس نام دیا جاتا ہے، ان کا امتحان لے رہی تھی۔ مادرِ ہند اپنی مشفقانہ نگاہوں سے فرزندانِ قوم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ان فرزندوں سے کچھ چاہتی تھی۔ اس کی چند خواہشیں اور تمنائیں تھیں جو ہر حیثیت سے اچھی تھیں۔ اس نے قومی اتحاد کا خواب دیکھا، یک جہتی کا تصور کیا۔ لیکن اس کا یہ خواب، یہ تصور عملی جامہ نہ پہن سکا۔ خاکِ وطن دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ جگہ جگہ فسادات ہوئے اور آزادی کی وہ تحریک جس کا مسلک عدم تشدد تھا، چند نادان اہلِ ہند کی غلطیوں یا لغزشوں سے خون کے دھبوں سے داغدار ہو گئی۔ گویا آزادی کی قیمت بے گناہوں اور معصوموں کا خون بہا کر چکائی گئی۔ امن و محبت کا پیغام دینے والوں پر ان حادثات کا کیا اثر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ دشوار ہے۔ ایسی ہنگامہ پرور مغموم فضا میں مہاتما گاندھی نے جس دلیری، جس قدر ہمت و استقلال سے کام لے کر اہلِ وطن کو امن و محبت کا پیغام دیا۔ اس نے ان کی عظمت کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا —
آزادی کے بعد فضا مکدر ہو گئی تھی۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے صرف مذہبی اختلاف کی بنا پر متنفر ہو گیا۔ گاندھی جی آخر وقت اپنے پاکیزہ مقصد کے لئے لڑتے رہے۔ کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے تمام عمر اس پیغامِ امن و مساوات کو عملی جامہ پہنانے میں گذار دی۔ انہوں نے اور ان کے حقیقی ساتھیوں نے اپنے ذہنوں کو تعصب سے دور رکھا۔ گاندھی جی کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی مل جل کر رہیں تاکہ مختلف تہذیبوں کا سنگم ہمارا ملک ترقی کر سکے اور سارے ملک کو امن اتحاد و اتفاق سے فائدہ تو پہنچے لیکن ساتھ ہی ساتھ دُنیا میں بھی اس کا وقار بلند ہو سکے۔ گاندھی جی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکے، یہ موضوع ایک تفصیلی بحث چاہتا ہے۔ اگر وہ کچھ عرصہ تک اور ہمارے بیچ رہے ہوتے تو شاید آج اس قسم کے کسی موضوع کا نام لینے کی نوبت بھی نہ آتی۔ ظاہر ہے انہیں اس قدر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی جتنی کہ وہ چاہتے تھے۔

اب تک وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا لیکن کام جاری ہے

ہیں۔ کوششیں جاری ہیں کہ اب ملک کا ذہن بیدار ہو چکا ہے اس لئے وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک تاریخ کے اس بدنما داغ کو اپنی تمام تر کوششوں سے پھیکا کر دے گا۔ وہ دن دور نہیں کہ اس طرف لوگ توجہ بھی نہ دیں اور اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو جائے۔ اتنی بڑی کامیابی حاصل کرنا ایک یا چند افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی جب تک سماج کا ہر فرد اپنے فرائض نہیں پہچانتا۔ ایسے فرائض جو اخلاق و انسانیت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں۔ ان قومی رہبروں کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے۔ جنہوں نے مصائب برداشت کئے۔ لیکن اپنی راہ سے نہ ہٹے۔ زمانہ کی پھٹکار سنی لیکن اپنے عزم پر قائم رہے۔ لوگ متنفر ہوئے لیکن ان لوگوں نے ان کی طرف پیار و محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جنگ آزادی کے ان مجاہدین کے کارناموں کا مطالعہ کریں جنہوں نے عزم و استقلال کی مقامی حیثیت قائم کر دی۔ اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی تو ہمارا مقصد پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہر ذی شعور کا فرض ہے کہ لوگوں کے ذہن میں انقلاب لانے کی کوشش کرے۔ آج کسی قسم کا معمولی واقعہ ہو جاتا ہے جس سے لوگ شدید طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں دوسرے طبقہ سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ فسادات ہوتے ہیں۔ اپنے ہی شہر کے لوگوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے اور جب معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کیا تھی تو سوائے ندامت کے ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ہر معاملہ کو سنجیدگی سے سمجھا جائے۔ جس طبقہ کی غلطی ہو یا جس طبقہ کے جذبات چند فرقہ وار افراد کی وجہ سے مجروح ہوئے ہیں۔ انہیں سمجھانے اور ان کی دل جوئی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملزم نادم ہو اور آئندہ ایسی غلطی نہ کی جائے۔ پریشان حال طبقہ کی دل جوئی اگر ہر ایک کرے گا تو اس کے دل میں اپنی حیثیت کا احساس پیدا ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ ملک میں یا عوام کی نگاہوں میں اس کی حیثیت بلند ہے۔ اس کا ایک مقام ہے۔ اس کے دکھ میں یہ افراد ایک ہی طرح شریک ہوئے ہیں۔ اس طرح عمل کے بعد ردِ عمل کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عمل کا ردِ عمل ہمیشہ خوفناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اوّل تو عمل (غلط اقدام) کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف اگر اتفاقاً ایسی غلطی ہو جائے جو ملک کے امن و امان کو منتشر کر سکتی ہے تو فوراً اس کے ہونے والے ردِ عمل (جو بیشتر ہوتا ہے) کو روکنے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ اس عظیم کام کو انجام دینے کے لئے خلوص و محبت کا ہونا ضروری ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی حادثہ سے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔ غیر ذمہ دار اشخاص کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایک کی غلطی یا حماقت کا ذمہ دار پوری اقلیت یا اکثریت کو قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ احساس ہر ایک میں پیدا ہو جائے کہ ہر شخص متعصب نہیں بلکہ ایک مخصوص طبقہ جس کا مقصد ہی فرقہ وارانہ اختلافات بڑھانا ہے وہی یہ کام انجام دیتا ہے تو کسی حد تک اختلافات کم ہو سکتے ہیں۔ ہر انسانیت نواز فرد کا فرض ہے کہ وہ ایسے عناصر کو سماج سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔ ان کے دلوں کو بدل دینے کی کوشش کی جانی چاہیئے اور حد درجہ خطرناک افراد کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے۔ حقیقتاً یہ کام قانون کے سہارے اچھی طرح انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایسی تدابیر کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے جن کی بنیاد خلوص و محبت ہمدردی و مساوات ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے "قومی یک جہتی کمیٹی" قائم کی گئی اور جگہ جگہ قومی اتحاد کے پرچار و تشہیر کی کوشش کرنا عوامی فرض قرار دیا گیا۔ یقیناً ہی زیادہ تر افراد قومی یک جہتی کے لئے اٹھائے گئے اس اقدام کی تعریف کر رہے ہیں۔ جب زیادہ تر افراد کے دلوں میں انقلابی تبدیلی لانے کی کوشش کامیاب ہو جائے گی تو نام نہاد طبقاتی خصوصاً مذہبی مفاد کا دم بھرنے والی جماعتیں خود ہی خاک میں مل جائیں گی۔

اگر اتحاد و اتفاق کی روشن مثال دیکھنا ہے تو ہمیں جنگ آزادی کے ان مجاہدین کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے جنہوں نے اپنی بے پناہ جد و جہد کی قومی یک جہتی کی خاطر طعن و طنز سے بھرپور جملے بھی سنے۔ مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے۔ ان دو (۲) رہنماؤں کی قیادت میں ان کے سینکڑوں مقلدین ایک مقدس مقصد کی تکمیل کے لئے سر بکف رہے۔ افسوس کہ ان کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ گاندھی جی نے تو ہمیشہ فرقہ وارانہ فسادات کی مخالفت کی۔ انہوں نے فسادات روکنے کے لئے برت رکھے۔ اپنی جان پر کھیل کر فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ امن و اتحاد کا پرچم لہراتے۔

ہوتے نہیں ہوئے۔ اس طرح ابوالکلام آزاد کا عزم راسخ ان کے عقائد و خیالات کا استقلال بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ انہوں نے قومی اتحاد کے نظریہ کی ہمیشہ حمایت کی۔ طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ انہوں نے پرواہ نہ کی۔ انہیں "شو بوائے" کہا گیا۔ لیکن انہوں نے ان الفاظ کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اپنی دُھن میں مگن، اچھے نتائج کی تمنا لئے مصروفِ کار رہے۔ مولانا طوفانِ مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی تحریر، تقریر اور عمل میں یکسانیت ہے۔ جو لفظ زبان سے نکلا، وہی تحریر کیا اور اس پر عمل کر کے ایک عملی انسان کا ثبوت دیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کو اصلی حالت سے واقف کرانے، انہیں ایک پلیٹ فارم پر لے آنے اور گاندھی جی کے ذریعہ اپنائے گئے طرزِ عمل کو حقیقی اور مفید ثابت کرنے کے لئے مولانا نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ جہاں بھی انہیں موقع ملتا ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے تھے، چاہے کانگرس کا جلسہ ہو یا خلافت کے جلسہ کی صدارت مولانا اپنے دِلی جذبات کے اظہار اور اس کی تبلیغ فرائض زندگی میں شمار کرتے تھے۔ آگرہ میں صوبائی مجلس خلافت کے خلبہ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔"

مولانا نے ۱۹۴۰ء میں کانگرس کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبہ میں کہا:۔

"میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندوستانی ہوں اور ناقابلِ تقسیم و متحدہ ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں ...

ہندوستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح وابستہ ہے جس طرح کہ ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔"

مولانا مشترک ہندوستانی تہذیب پر فخر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام

تعمیر

گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مِل جُل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پُرانا لباس تاریخ کی پُرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں۔"

مولانا نے ہندو اور مسلم دماغوں کو بیدار کیا۔ ایسے دماغوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی جو اپنے اجداد کی قدیم تہذیب واپس لانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مولانا ایک ہزار سال کی اس مشترک تہذیب کے نمایندہ علم بردار تھے۔ ان کی صدارت کے خطبات، رسائل کے مضامین اور دیگر تحریریں قومی یک جہتی کے تصور سے بھری ہوئی ہیں۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے عقائد کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔ ہر ایسے فرد کی حمایت کی جائے جو قومی یک جہتی کا صرف تقریری یا تحریری ہی نہیں بلکہ عملی نمایندہ ہے۔ ایسے تمام عناصر کی سخت مخالفت کی جانی چاہئے جو فرقہ واریت کو فروغ دیتے ہیں۔

اس عظیم مقصد کی تکمیل آسان نہیں۔ ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔ سماج کے ہر فرد میں اتحاد و اتفاق کے احساس کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ ہر ذی شعور کا فرض ہے کہ عوام میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قسم کے اجتماع میں قومی یک جہتی کا چرچا کیا جائے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ یا ہمارے منصوبوں کا کوئی حصہ اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک ہر ایک میں قومی یک جہتی کا احساس نہ ہو۔ بظاہر ہم کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لیں، اس وقت تک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب تک ہمارے خیالات و احساسات کی سطح بلند نہیں ہوتی جب تک ہم انسانیت کے بلند معیار نہیں تعمیر کر لیتے۔ یہ کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے دلوں میں ایکتا کا احساس پیدا ہوگا۔ سیاسی اجتماع ہو یا مذہبی، ادبی مجلس ہو یا سماجی غرض ہر قسم کے اجتماعات، ہر قسم کی تنظیم میں یک جہتی کی تبلیغ ضروری

اکثر

رکی حیثیت اختیار کرلے تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ کسی قسم ں تبدیلی لانے کی کوشش بتدریج کرنی چاہیئے۔ سوچ سمجھ کر قدم ٹھانا چاہیئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی بھی سیاسی تحریک کو مذہب اور زبان ں بنیادوں پر قومی نہ بنایا جائے۔ یہ ٹھیک ہی ہے کہ ہم جمہوری نظام ے قائل ہیں لیکن جمہوریت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کسی مقصد کے حصول ے لئے غیر جمہوری طریقہ اپنایا جائے۔ ایجی ٹیشن وغیرہ اگرچہ جمہوری صول کے تحت شمار کئے جاتے ہیں لیکن فرقہ پرست عناصر کو سر اٹھانے ا موقع ملتا ہے۔ اس لئے ایجی ٹیشن اگر معتدل روش اختیار کرتا ہے ر ٹھیک ہے ورنہ اس سے قومی اتحاد کو سخت خطرہ لاحق ہو جانے اندیشہ رہتا ہے۔ عوام میں ایک طرح کا ہیجان پھیل جاتا ہے۔ ہر ایک ر مذہبی فرائض کی طرح جمہوری فرائض پر بھی ایمان لانا چاہیئے۔ جس رح سے مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا —— اسی طرح جمہوریت ی ایسے عناصر کو ترقی نہیں دیتی جن سے تنفر و انتشار کی بو پھیلے۔ یسے طور پر جمہوریت کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری سماج کے ہر فرد پر مد ہوتی ہے۔ یہ فرض جو ایک مقدس فرض ہے، اس وقت تک پورا ہیں ہو سکتا جب تک ہر فرد قومی اتحاد کے جذبہ سے معمور نہ ہو۔

ایک جمہوری سوسائٹی میں ہر قسم کے ادارے بنانے اور انہیں فروغ ینے کی آزادی ہوتی ہے۔ مذہبی ادارے بھی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ ی کی تنظیم کم از کم ہمارے ملک میں تو بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن ہر قسم بلیغ کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو جو تاریک ہے، وہ یہ کہ مذہبی ساس پیدا کر کے لوگوں میں مذہبی احساس اس حد تک پیدا کر دیا جائے س سے وہ خود کو دوسرے اہلِ مذاہب سے الگ تصور کرنے لگیں۔ اس و کو ختم کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ ایسا خیال جب تک ختم نہ ہوگا ی قسم کی ترقی ممکن نہیں۔ دوسرا پہلو جو روشن اور مفید ہے وہ یہ لوگوں میں مذہبی تبلیغ تو کی جائے لیکن ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے ہر مذہب کا احترام کرنا فرائضِ مذہب میں داخل ہے۔ تہذیبی اور ی اداروں [illegible] ضرورت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں معاون و مددگار سماجی اداروں کا فرض ہے کہ وہ اپنی خدمات کو [illegible] محدود نہ کر دیں۔ اسے وسیع تر بنانا چاہیئے۔

وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اس مقدس کام میں مصروف رہنا بہت بڑا فرض ہے۔ ڈرامے، فلمیں اور دوسرے کلچرل پروگرام اس کام کو انجام دینے میں معین و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز بدل دینا چاہیئے۔ اس طرح چند افراد کو ہی فائدہ نہ پہنچے گا بلکہ پورا ملک مستفید ہوگا۔ جب لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے تو ملک کا وقار بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ترقیاتی منصوبوں کو تقویت ملے گی۔ فرقہ وارانہ اختلافات ملک کے کسی ایک شہر کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ان کا اثر ملک کے پورے حصے پر اور حکومت کے تمام عناصر پر پڑتا ہے۔ قومی ترقیاتی منصوبوں اور دوسرے ترقیاتی پروگراموں پر صرف کئے جانے والے وقت کا ایک بڑا حصہ اس قسم کے جھگڑوں اور ان کے ذریعہ پیدا کئے گئے مسائل کو سلجھانے میں صرف ہوتا ہے۔ اس طرح ایک غلطی بہت سی دشواریاں پیدا کر دیتی ہے۔

زبان و ادب کے معمار، شاعر، ناول نگار اور افسانہ نویس اس موضوع پر کافی کام کر سکتے ہیں۔ زبان و ادب کسی خاص فرقہ یا طبقہ کی میراث نہیں۔ ایک زبان پر قناعت کر لینا اور اسے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کمتر سمجھنا وسیع النظری کی علامت نہیں۔ ہر زبان کا اپنا ماحول، روایات اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ اچھا فن کار بڑا ہی وسیع النظر ہوتا ہے۔ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں ایسے اہلِ قلم نظر آتے ہیں۔ ہندی شاعروں کی فہرست سے اگر قطبن، عثمان، جائسی اور رحیم کو نکال دیجیئے تو اس کا حسن غارت ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر اردو شاعروں کے طبقہ میں رتن ناتھ سرشار، برج نارائن چکبست اور کرشن چندر کے علاوہ دورِ حاضر کے بے شمار غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کو شامل نہ کیا جائے تو اردو کا سرمایۂ شعر و ادب زیادہ با وقار نظر نہیں آئے گا۔ دراصل ان فن کاروں نے ہی اردو کی تزئین و آرائش ہی نہیں کی، بالکل اس مایوس طبقہ کو مسرت بھی بخشی جو اردو کو موت کی آغوش میں جاتا دیکھ رہا تھا —— روشن دماغ شاعر و ادیب، مذہب، فرقہ، ملک اور غیر ملک کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں آفاقیت اور ان کے احساس میں بے پناہ وسعت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اس ماحول میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ اس سے تمام زبانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جذباتی ہم آہنگی بڑھے گی۔

ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کو ایک ایسے مقصد کے تحت پیش کریں جو قومی اتحاد کا آئینہ دار ہو۔ ایسے موضوعات سے انحراف کرنا اس کا فرض ہے جو انتشار پھیلانے کا باعث ہوتے ہیں، جن سے کسی ایک طبقہ کی دل آزاری ہوتی ہے۔ صحافت کی راہ ایک دشوار راہ ہے۔ صحافی کی ذمہ داریاں بھی اہم ہیں۔ صحافتی مضامین ادبی حیثیت کم اور وقتی حیثیت زیادہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا تاثر اچھا بھی ہوتا ہے اور خراب بھی۔ ان کی وقتی حیثیت بعض لغزشوں سے ایک بڑی پریشانی کا باعث بھی ہو جاتی ہے۔ صحافی قومی اتحاد قائم کرنے کے پاکیزہ مقصد میں سب سے زیادہ کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کامیاب رہبرِ قوم تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی صحافتی حیثیت بھی درخشاں ہے۔ ہر زبان کا صحافی ان کی صحافت کے معیار سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ ان کی بے لوث صحافت زبان، ادب اور قوم کی ایک بڑی خدمت ہے۔

جس طرح فرائضِ مذہب سے انحراف کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے اور جس طرح اصولوں سے انحراف سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح ہر فرد کو قومی اتحاد کے جذبہ سے سرشار ہونا چاہیئے بلکہ اسے عینِ حیات تصور کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ پاکیزہ مقصد مشعلِ راہ نہ بنے گا، مذہب کی حیثیت زیادہ باوقار نہ ہوگی۔ خدا کی مخلوق کا دل دکھانے والے سے خدا کیونکر خوش ہوگا! یہ سمجھنا کہ کسی طبقہ کو مصیبت میں گرفتار کر کے، اس کے گھر کو تباہ کر کے اور عورت کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر کے کسی مذہب یا فرقہ کی بڑی خدمات انجام دے دی گئی ہیں، کم عقلی کی دلیل ہے۔ اس سے ملک کو فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس کے اتحاد کی عمارت کمزور ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ہلا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا احساس جب تک ہر فرد میں پیدا نہیں ہو جاتا اُس وقت تک ہم ملک کو صحیح معنوں میں آزاد تصور نہیں کر سکتے۔ ذہنی غلامی نقصان دہ ہے۔ صرف اپنے ذہن، اپنی عقل و ادراک اور فہم کو سب کچھ سمجھ لینا حد درجہ خطرناک ہے۔ یہ انفرادیت، جس کا ایک پہلو بھی ترقی پسندانہ نہیں، ضرر رساں ہے۔ دوسروں کی باتیں سمجھنے کی کوشش ضروری ہے اور اپنے احساسات دوسروں تک پہنچانے کے لئے مؤثر طریقہ اپنانا چاہیئے۔ جب تک ہر فرد کی زندگی میں قومی یک جہتی کا تصور "فرضِ زندگی" کی حیثیت اختیار نہیں کر لیتا اُس وقت تک اس مقدس مقصد میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ لوگوں کے رجحانات بدل دینے کی کوشش دشوار ضرور ہے لیکن کامیابی ناممکن نہیں!

"تعمیر" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کے لئے معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
(۲) نگارشات کا خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف ہونا ضروری ہے
(۳) منصوبہ بند ترقی سے متعلق مضامین ترجیحی طور پر طلب کئے جاتے ہیں
(۴) کشمیری زبان میں لکھے گئے مضامین بھی شکریہ کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں
(۵) نگارشات میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں و کشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

شباب ملت
ایم اے

سپاہی کی رخصتی

مجھے اے جان! تری سرمگیں آنکھوں سے شکوہ ہے
کہ ان میں آج کاجل کی لکیریں مٹتی جاتی ہیں!

ترا خونِ جگر یوں اشک بن بن کر برستا ہے
کہ ساون اور بھادوں کی گھٹائیں یاد آتی ہیں

ہراساں ہے تو بے شک میری فرقت کے تصور سے
شعورِ فرض کو سمجھا ہے تو نے بے رخی میری

مجھے تسلیم! میری زندگی پر کچھ ترا حق ہے
مگر قوم و وطن کی ہے امانت زندگی میری

مجھے معلوم ہے میں تیری اُمیدوں کا مرکز ہوں
حسیں عنوان ہوں میں تیری ہستی کے فسانے میں

یہ مانا تیرے دل کو غم ہے تکمیلِ محبت کا
محبت کے سوا کچھ اور بھی غم ہیں زمانے میں

وطن کا غم جو میرے سینۂ مضطر میں پلتا ہے
مری پیاری! غمِ اُلفت سے اونچا ہے مقام اُس کا

سپاہی ہوں وطن کی آبرو کا میں نگہباں ہوں
فقط دل کیا مرا ہر موئے تن بھی ہے غلام اُس کا

تری آہوں کا یہ طوفان، یہ سیلاب اشکوں کا
مجھے عشقِ وطن کی راہ سے بھٹکا نہیں سکتا

ترا احساسِ بے تابی، ترا اظہارِ مجبوری
مری گردن کو طوقِ بزدلی پہنا نہیں سکتا

مجھے برہم پتر کی پاکیزہ لہروں نے صدا دی ہے
مجھے آسام کی پیاری فضاؤں نے پکارا ہے

مجھے لداخ کی سنگین راہیں یاد کرتی ہیں
مجھے نیفا کی برفانی ہواؤں نے پکارا ہے

وہ ہمسایے ہمارے جو ہمالہ پار بستے ہیں
مرے پیارے وطن کی سرحدوں کو گھیر بیٹھے ہیں

وہ محسن کش حبیب اپنے جو دم بھرتے تھے اُلفت کا
وہ مارِ آستیں اب ہم سے آنکھیں پھیر بیٹھے ہیں

مجھے اپنے وطن کی آبرو کا پاس رکھنا ہے
وطن کی سرحدیں مجھ کو رگِ جاں سے بھی پیاری ہیں

شمالی سرحدیں شنکر کی پاکیزہ جٹائیں ہیں
مری رانی! تری زلفِ پریشاں سے بھی پیاری ہیں

مجھے بھی کم نہیں اے جانِ عشرت! دکھ جدائی کا
تری تصویر خلوت میں مجھے دیوانہ کر دیگی

مجھے بھی تیری سانسوں کی مہک جب یاد آئیگی
خرد سے ہوش سے یکسر مجھے بیگانہ کر دیگی

بھلا بیٹھی ہے کیوں تو پدمنی کو جودھا بائی کو
جو اپنے شوہروں کے تن پہ خود بکتر سجاتی تھیں

رفیقِ زندگی جب اُن کے رن بھومی کو جاتے تھے
ظفر مندی کا ٹیکا اُن کے ماتھے پر لگاتی تھیں

اُٹھا لے آرتی کا تھال اے جانِ وفا تو بھی
تلک میری جبیں پر تو سجا دے سُرخ صندل کا

مجھے پھولوں کی جے مالا تو ہنستے ہنستے پہنا دے
وفا پر حرف آئے گا جو آنسو آنکھ سے چھلکا

تبسم ریز ہونٹوں سے مجھے کہہ دے خدا حافظ
جدائی کا ذرا بھی غم نہ اے جانِ وفا! کرنا

مری یاد آئے تو پروردگارِ ہر دو عالم سے
ظفر مندی سے میرے لوٹ آنے کی دعا کرنا

رشید الدین

سچّا فن کار

سنسکرت زبان و ادب کے ڈرامہ "شکنتلا" کے خالق کالی داس کو سر ولیم جونس نے ہندوستان کا "شیکسپیر" کہا ہے۔ یہ بات چنداں مبالغہ آمیز یا عقیدت پر مبنی بھی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جونس نے پہلی بار "شکنتلا" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو یورپ کے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا اور لوگ دیوانہ وار اسے پڑھنے لگے۔ یورپ کی تمام زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ حتیٰ کہ اس [illegible] زبان میں بھی [illegible] مشہور فرانسیسی شاعر [illegible] نے اسے دنیا کی عظیم تصنیف قرار دیا اور مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے ان الفاظ میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا:

"کیا تمہیں بہار کا شباب دیکھنا ہے؟ کیا تمہیں [illegible] کا نظارہ کرنا ہے؟ کیا تمہیں وہ سب کچھ چاہیے جس میں [illegible] کے [illegible] ہے اور تسکین کے ساتھ لطف؟ کیا تم زمین و آسمان کی تمام رنگینیوں سے آشنا ہونا چاہتے ہو؟ تو لو میں "شکنتلا" کا نام لیتا ہوں اور تمہیں یہ سب مل گیا..."

میرے خیال میں کسی مشرقی شاعر یا ادیب کو آج تک مغرب میں اتنی عزت اور شہرت نہیں ملی جتنی کالی داس کو۔ بعد میں "شکنتلا" کا انگریزی میں پروفیسر مند و ولیمس نے منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ فورسٹر، برڈر اور ہرزل نے بھی "شکنتلا" کے انگریزی میں ترجمے کیے۔ جو یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ کالی داس کی بعض نظموں اور ڈراموں کے بھی بعد کو انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ انگریز، جرمن اور فرانسیسی لوگوں نے کالی داس کی تصانیف کے تراجم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ اب "شکنتلا" کو "ہیملٹ" (انگریزی مصنف: ولیم شیکسپیر) اور "فاوسٹ" (جرمن مصنف: گوئٹے) کے ساتھ دنیا کے تین بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

انگریزی کے علاوہ فارسی میں بھی "شکنتلا" کا ترجمہ ہو چکا ہے یہ ترجمہ پروفیسر سید ہادی حسن نے کیا ہے جسے ۱۹۶۰ء میں کونسل برائے ثقافتی تعلقات نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۶ء میں "شکنتلا" کا ایک منظوم فارسی ترجمہ مثنوی کی شکل میں بھی ہوا تھا جسے ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے دہلی میں اس وقت کیا تھا جب وہ ہندوستان میں ایران کے سفیر تھے۔ موصوف نے "شکنتلا" پر فارسی میں ایک سیر حاصل مقالہ بھی اس کے [illegible] لکھا تھا۔ حال ہی میں کالی داس کے ایک اور ڈرامے "وکرم اور وشیم" کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ ترجمہ اصل میں محمد عزیز مرزا کے اردو ترجمے کی مدد سے کیا گیا ہے۔ اسے بھی دہلی سے کونسل برائے ثقافتی تعلقات نے شائع کیا ہے۔ اس طرح مشرقِ وسطیٰ کے لوگ اور فارسی دان افراد بھی، کالی داس اور "شکنتلا" سے کماحقہ واقف ہیں۔

اردو ادب میں "شکنتلا" کا ترجمہ سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں ہوا جسے مرزا کاظم علی جوان نے فورٹ ولیم کالج کے لیے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی تحریک پر آسان اردو نثر میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ انہوں نے راست سنسکرت سے نہیں بلکہ برج بھاشا سے کیا تھا۔ برج بھاشا میں یہ ترجمہ سنسکرت سے ایک شاعر نواز کبیشر نے ۱۷۱۶ء میں کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ۱۹۳۹ء میں "شکنتلا" کا راست سنسکرت سے اردو ترجمہ کیا جسے انجمن ترقی اردو حیدر آباد (ہند) نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء

میں قدسیہ زیدی نے (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا) "شکنتلا" کا ترجمہ کیا تھا جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس کے بعد چوتھی بار "شکنتلا" کا اُردو ترجمہ ساغر نظامی نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے اور ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ بعض اُردو شاعروں نے "شکنتلا" کا مرکزی خیال لے کر مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ مگر ان میں وہ ماحول برقرار نہ رہ سکا۔ جو "شکنتلا" کا خاصہ ہے۔ کالی داس کی بعض نظموں کا بھی اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس طرح اُردو جاننے والے لوگ بھی اب کالی داس کی تصانیف سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ اُردو کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی کالی داس کا پورا ادب منتقل ہو چکا ہے۔ فلموں کے ذریعہ ہندوستان کے اَن پڑھ لوگ بھی "شکنتلا" سے پوری طرح واقف ہو گئے۔ "شکنتلا" پر ہندی میں دو فلمیں بن چکی ہیں۔ پہلی فلم ۱۹۴۵ء میں اور دوسری ۱۹۶۱ء میں بنی ہے۔ یہ دونوں فلمیں ہندوستانی فلمی صنعت کے مشہور فلم ساز و ہدایت کار شانتا رام نے بنائی ہیں۔

"شکنتلا" کا مرکزی خیال اس کا اپنا نہیں بلکہ "مہابھارت" سے ماخوذ ہے۔ مہابھارت میں ایک کہانی ہے کہ ایک راجا جس کا نام دشینت تھا، شکار کھیلتے کھیلتے ایک بار ایک آشرم میں پہنچ گیا۔ وہاں اسے ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی دکھائی دی۔ راجہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور اس نے اس سے گندھرو رسم (بغیر کسی رکھے سُنے ایک دوسرے کو ہار پہنا کر لڑکا لڑکی کا ایک دوسرے سے بیاہ رچا لینے کی رسم) کے مطابق شادی کر لی۔ کچھ دن بعد وہ اپنی راجدھانی واپس آگیا۔ جب شکنتلا اس کے پاس پہنچی کر اس نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور شادی سے صاف مکر گیا۔ تب غیب سے ایک آواز آئی اور راجا نے اسے اپنا لیا۔ یہ ایک بالکل سیدھی سادی کہانی ہے جسے کالی داس نے اپنے زورِ تخیل سے بڑی ڈرامائی بنا دیا ہے۔ مہابھارت کی کہانی میں چھل و چرانا کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ مہابھارت کی کہانی میں راجا کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مگر کالی داس نے اپنے ڈرامے میں راجا کے انکار کی وجہ تلاش کر لی ہے اور اس کہانی کو ایک مذہبی حلقے سے نکال کر ادب کے دائرے میں لے آیا ہے۔ کالی داس نے کہانی میں یہ ڈرامائی عنصر پیدا کر دیا کہ اس نے شکنتلا کو ایک سادھو کے ذریعہ یہ بددعا (شراپ) دلا دی کہ اس کا محبوب اسے بھول جائے گا اور جب تک اس کی دی ہوئی کوئی نشانی اُسے نہیں بتائی جائے گی وہ اسے نہیں اپنائے گا۔ شکنتلا راجہ کی دی ہوئی انگوٹھی پہنے اس کے دربار پہنچتی ہے مگر راستے میں ایک دریا میں جب وہ ہاتھ دھونے بیٹھتی ہے تو انگوٹھی انگلی سے گر جاتی ہے اور ایک مچھلی اسے نگل لیتی ہے۔ اس سے قطعی بے خبر شکنتلا دربار میں پہنچتی ہے جہاں راجا اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ تب وہ اسے انگوٹھی دکھا کر یاد دلانا چاہتی ہے۔ مگر انگلی کی طرف دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ انگوٹھی غائب ہے چار و ناچار وہ دربار سے نکل جاتی ہے۔ اس اثنا میں ایک مچھیرے کو ایک مچھلی کے پیٹ سے وہی انگوٹھی ملتی ہے جس پر راجا کا نام کندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مچھیرا انگوٹھی لے کر راجا کے دربار میں حاضر ہو کر انگوٹھی پیش کر دیتا ہے۔ راجہ تو انگوٹھی دیکھ کر سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ اور وہ شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور آخر اسے پا لیتا ہے۔

اس کہانی کو کالی داس نے سات ایکٹوں میں ترتیب دیا ہے۔ سب سے پہلے ڈرامہ عام سنسکرت ڈراموں کی طرح خدا کی حمد سے شروع ہوتا ہے۔ پھر ڈرامے کا ہدایت کار اور ایک شخص آکر چند تمہیدی مکالمے بولتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا۔ ان تمہیدی مکالموں میں ڈرامے کا موضوع، مرکزی خیال، مصنّف کا نام اور تعارف شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصل ڈراما شروع ہوتا ہے۔ کالی داس نے ڈرامے میں زبان بڑی معیاری، شستہ اور ادبی استعمال کی ہے۔ "شکنتلا" میں ہندو کلچر کی بڑی اچھی عکاسی موجود ہے جس پر مذہب کی گہری چھاپ ہے۔ شکنتلا ایک روایتی ہندوستانی عورت کا تمثیل (رمز) ہے۔ ڈرامہ بظاہر کامیڈی ہے مگر جگہ جگہ قاری کو ہندوستانی عورت کی بے چارگی اور وفاشعاری کا احساس ملتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا خیال ہے کہ اصل میں کالی داس کے ذہن میں ایک "ٹریجیڈی" ڈرامے کا تصور تھا مگر وہ اپنے زمانے سے بغاوت نہ کر سکا اور روایتی انداز میں کامیڈی ڈرامہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ واضح ہو کہ اس زمانے

برہمنوں نے ادب پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور ادب بھی سنسکرت میں تخلیق کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں کوئی ڈراما یا دیگر اصناف صرف کامیڈی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں راجا کی بادشاہی بھی نہیں دکھائی جا سکتی تھی۔ مذہب، سیاست اور مصلحت اس زمانے میں بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود "شکنتلا" کالی داس کی ایک عظیم تصنیف ہے جس میں ہمیں اس کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔

ابھی تک میں نے صرف کالی داس کے فن اور کارناموں سے بحث کی ہے۔ اس کی شخصیت، ماحول اور عہد کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ مگر شاید اس کے متعلق کچھ کہنے کے لئے میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔ ویسے ایک فن کار کے فن اور کارناموں کے بارے میں کچھ پڑھتے ہوئے ایک قاری کو اس کی شخصیت کے بارے میں بھی کچھ جاننے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ایک فن کار اپنی شخصیت کا اتنا رسیا نہیں ہوتا جتنا اپنے فن کا۔ ورنہ کیا کالی داس، جس نے اتنے سارے ڈرامے اور نظمیں لکھیں، اپنی بابت کچھ نہ لکھتا۔

کالی داس کی شخصیت، ماحول اور عہد کے بارے میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اسے قبلِ مسیح کا فن کار بتاتے ہیں تو بعض بعدِ مسیح کا، مگر اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے وطن کے بارے میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں مگر بہتوں کا خیال ہے کہ وہ اُجین کا رہنے والا تھا۔ اگر صرف عہد اور مقام تک ہی اختلافات کا سلسلہ رہتا تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر ان اختلافات کی زد میں آ کر تو اس کی شخصیت بھی ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے پہل وہ بڑا جاہل تھا مگر کالی ماتا کا سخت پجاری تھا۔ اور اس نے بعد میں اس میں علم و حکمت اور شاعری ودیعت کی اور اسی وجہ سے اس کا نام کالی داس (یعنی کالی دیوی کا بندہ) پڑ گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنی جوانی تک بالکل بے وقوف تھا۔ ایک بار وہ ایک درخت کی ایسی شاخ کو کاٹ رہا تھا جس پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔ یہ منظر چند برہمنوں نے جاتے ہوئے دیکھ لیا اور اسے ایک ایسی شہزادی کے سامنے ایک عظیم عالم کہہ کر پیش کیا جس کے علم و عقل سے وہ تنگ آ چکے تھے اور اس کے سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھے۔ شہزادی نے شرط لگا رکھی تھی کہ جو اسے بحث میں زیر کر دے گا وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی۔ اس نے کالی داس کو کوئی بہت بڑا عالم جان کر انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ایک ہے۔ کالی داس سمجھا کہ وہ کہہ رہی ہے کہ ایک تھپڑ ماروں گی۔ اس نے جواب میں دو انگلیاں اٹھائیں۔ شہزادی سمجھی کہ وہ کہہ رہا ہے کہ خدا دو ہیں۔ بعد میں برہمنوں نے بحث مباحثہ کر کے کالی داس کے خیال کی تائید کی۔ اور شہزادی کو قائل کرا دیا کہ خدا دو بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ شہزادی نے اس سے شادی کر لی۔ بعد میں اس نے اسے خوب پڑھا لکھا کر عالم و فاضل بنا دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ساری غیر معتبر ہیں اور نری اُن کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی ثبوت یا پس منظر نہیں ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ وہ معمولی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ اس زمانے میں سوائے برہمنوں کے کوئی سنسکرت سن اور بول بھی نہیں سکتا تھا۔ لکھنا پڑھنا تو اور کی بات ہے، البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ وہ کسی راجا بکرماجیت کے عہد میں گذرا ہے اور ذات کا برہمن تھا اور بہت ہی عالم، فاضل اور دانا تھا۔ کالی داس کی زندگی سے لے کر مدت تک روایتوں کا ایک ہالہ ہے۔ چنانچہ اس کی مدت کے بارے میں بھی یہ عجیب اور ناقابلِ یقین روایت چلی آ رہی ہے کہ وہ سیلان میں راجا کمار داس کے ہاں مہمان تھا کہ ایک درباری رقاصہ نے اس کو خنجر گھونپ دیا۔ کیوں اور کس لئے؟ اس کے جواب میں روایت خاموش ہے۔

کہتے ہیں کہ فن کار کا کوئی وطن، کوئی عہد، کوئی شخصیت اور کوئی ذات نہیں ہوتی۔ اس کا فن ہی سب کچھ ہوتا ہے جو جاوِداں ہوتا ہے اور زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کالی داس واقعی ایک سچا فن کار ہے، جس کے عہد، وطن، ذات اور شخصیت کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کا فن، اس کی نظموں اور ڈراموں کی شکل میں ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ پہلے بھی اسی طرح ساری دنیا پر محیط تھا اور آگے بھی رہے گا۔ اس طرح جب تک دنیا قائم ہے اس وقت تک کالی داس کا فن زندہ رہے گا۔ اس کے ڈرامے اسٹیج کئے جاتے رہیں گے اس کی نظمیں پڑھی جاتی رہیں گی اور کہا جاتا رہے گا کہ افسوس ہم کالی داس نہیں

مقبرہ

یہ میرا گھر
مرے بزرگوں کا ایک تحفہ
وراثتوں کا، روایتوں کا، عنایتوں کا
عظیم وارث
پرانی باتوں، پرانی یادوں، پرانی قدروں کا
اِک عطیہ
اگرچہ نقش و نگار اس کے
غمِ زمانہ کی آندھیوں سے
وہ رنگ و روغن وہ حسن و خوبی
سرورِ ہستی کو کھو چکے ہیں
مگر ہے پھر بھی عزیز مجھ کو
ہر ایک محراب ہے شکستہ
ہر ایک دیوار اب ہے خستہ
وہ فرش جس پر کسی زمانے میں
فرشِ مخمل بچھا ہوا تھا
مگر کوئی مجھ میں بیٹھ کر
یہ گا رہی تھی
(فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں)
نہ فرشِ مخمل نہ پائے نازک
چٹائیاں کچھ بچھی ہوئی ہیں
جہاں یہ فانوس جل رہا تھا
وہاں پہ اب اک دیا ہے روشن
جو شام ہی سے بجھا بجھا سا
چراغِ مفلس کی طرح یارو سسک رہا ہے
یہ میرا گھر، مرے بزرگوں کا ایک تحفہ

میں جانتا ہوں، میں سوچتا ہوں کہ اس کی بنیاد کیوں پڑی تھی
میں دیکھتا ہوں
کہ اب بھی باقی ہیں اس فضا میں
پرانی تہذیب کے پجاری
وہی روایاتِ شہریاری
وہی ہے جنگِ غرور جاری
میں سوچتا ہوں کہ ان روایات کے دھندلکوں سے کیسے نکلوں
مرے لہو کی تمام گردش
مری زباں کا ہر ایک جملہ
مری نظر کا ہر ایک منظر
مرے بدن کی ہر ایک لغزش
یہ چاہتی ہے کہ اس روایت کے مقبرے کو
کسی جہنم میں پھینک آؤں
مگر میں پھر سوچتا ہوں یارو
ہر ایک جینے کی بیسں تاریخ ہی سے کہتی ہے دل کی دھڑکن
کہ ہاتھ روکو
ضرورتوں کی ردا سمیٹو
نہیں تو چادر سے پاؤں باہر نکل پڑیں گے
یہ مشورے دل کے ہوں تو سوچو
نیا مکاں کس طرح بنے گا؟
نہیں نہیں میں نہیں گراؤں گا شہریاری کے اس کھنڈر کو
کہ سر چھپانے کے واسطے اب کہیں جگہ بھی نہ مل سکے گی
یہ میرا گھر
مرے بزرگوں کا ایک تحفہ
میں اس کا وارث، یہ میرا وارث!

اکتوبر ۱۹۶۲ء

پریم چند کے ناول اور نئی رومانیت

(۲)

روایتوں اور تکنیک کی بدلی ہوئی صورت کے پیشِ نظر اس قسم کی باتیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ پریم چند نے ناول نہ لکھے ہوتے پھر بھی انجام سے اتنی پریشانی کی ضرورت نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ پریم چند ایک بڑے افسانہ نگار ہیں، بڑے ناول نگار نہیں ہیں انہوں نے بعض اچھے اور بہت اچھے ناول لکھے ہیں اور ان سے روایتوں کے پیشِ نظر مواد اور اسلوب دونوں میں کافی فرق پیدا ہوا ہے۔ بازارِ حسن گوشۂ عافیت، گئودان، غبن، چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، میدانِ عمل یہ سب اچھے ناول ہیں، تکنیک کی تبدیلی میں ان ناولوں سے بڑی مدد ملی ہے۔ موضوعات بھی اہم ہیں، لیکن یہ تو مبالغہ کی حد ہے کہ پریم چند کا ناول منزلِ ارتقا میں اپنے پہلے کے ہر ناول نگار کے ناول سے کم سے کم ایک صدی آگے ہے۔ روایتوں پر گہری نظر رکھی جائے اور ہر فن کار کے ذہن اور اس کے ماحول کے رشتے کو دیکھا جائے تو پریم چند کے ناول اسی سلسلے کی کڑیاں نظر آئیں گے۔ وہ اپنی روایتوں، ذہنی پس منظر اور ماحول سے علیحدہ نہیں ہیں، جس طرح نذیر احمد، شاد عظیم آبادی، سرشار، رسوا اور راشد الخیری نے تقاضوں کے پیشِ نظر ناول لکھے اسی طرح پریم چند نے بھی لکھے ہیں۔ ان میں کوئی ایک صدی پیچھے ہے اور نہ کوئی ایک صدی آگے۔

مجھے پریم چند کے تمام ناولوں میں گئودان پسند ہے۔ گئودان کے بعد گوشۂ عافیت "کا انتخاب کروں گا۔" چوگانِ ہستی تک کے شروع

کا حصہ متاثر کرتا ہے۔ طوالت اور اصلاحی نقطۂ نظر کی کارفرمائی یہ دونوں باتیں بڑی طرح کھٹکتی ہیں: بازارِ حسن "اور چوگانِ ہستی" میں تعمیر ماجرا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، میلو ڈرامائی رنگ ہر جگہ ہے، اچانک پیدا ہو جانے والے میلانات اور واقعات ملتے ہیں جن کا کوئی اشارہ پہلے نہیں ہوتا۔ قصے میکانکی طور پر بڑھتے ہیں۔ یہ دونوں ناول پلاٹ کے اعتبار سے غیر دلچسپ اور کسی حد تک غیر فطری ہیں۔ میدانِ عمل تکنیک کے جھول کی وجہ سے ایک بوجھل ناول بن گیا ہے۔ واقعات میں عضوی (organic) تعلق نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کا میدان بہت وسیع ہے، ایک فلسفیانہ نظر ہے اور حقیقت نگاری کے لوازمات ہیں۔ میدانِ عمل اپنے کینوس کے لحاظ سے کافی اہم ہے۔ زندگی کے ایک وسیع دائرہ کو گرفت میں لینے کی کوشش ہے، لیکن واعظانہ انداز اور دوسری خامیوں کی وجہ سے فنی قدریں گم ہو گئی ہیں۔

پریم چند نے حقیقت نگاری کو نیا رنگ اور نیا روپ دیا ہے حقیقت کو مختلف سمتوں سے پہچاننے کی کوشش کی ہے، اگرچہ وہ بعض اوقات قدامت اور جدت کے درمیان پریشان نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں سطحی حقیقت نگاری کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، پھر بھی انسان کی قوتوں پر اعتماد، عوامی اور جمہوری طاقت کی عظمت کا اعتراف حیات کی قدروں کو آگے بڑھانے کا عزم، سماجی ماحول میں تبدیلی، زندگی کی تخیل پر بے جھجک تنقید اور دیہات کی زندگی کی وہ تصویریں جن میں

[illegible] رنگینیاں، [illegible] اور بھولے پن کے ساتھ [illegible] ملتی ہیں۔ پریم چند کی آئیڈیلزم سے فنی خوبیاں کبھی کبھی بہت مسخ ہو گئی ہیں۔ ان کی جانب داری اور جذباتیت سے بھی اسلوب کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پریم چند کے ناولوں سے اُردو الفاظ کے ذخیرہ میں کافی اضافہ ہوا ہے اور حالی کی روایت کی بے پناہ خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ عجمی اور ہندی روایات کی ہم آہنگی کی یہ بہترین تصویر ہے، خوبصورت مقولے اور دل نشین تشبیہیں ملتی ہیں۔ "گئودان" میں کہیں کہیں بلاشبہ حقیقی معنوں میں ساحرانہ اسلوب کی مثالیں ملتی ہیں۔ مکالموں میں نفسیاتی عمل اور ردِ عمل اور فطری رنگ نمایاں ہے۔ جنسی جذبات کی پیش کش میں اس اسلوب کی رعنائی اور پرکاری دیکھی جا سکتی ہے۔ لب و لہجہ صاف اور شفاف ہے۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان کی لطافت کا بھی گہرا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دلفریب اور شگفتہ جملے ہیں۔ مختلف طبقوں کے خیالات، مختلف افراد کی ذہنی اُلجھنیں، مختلف لوگوں کے خوابوں اور خواہشوں میں اسلوب کے بدلتے ہوئے رنگ کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ عوامی زبان کے جملوں اور عبارتوں کو تاثیر سے بھر دیتے ہیں۔ پریم چند اُردو کے ایک بڑے نثر نگار ہیں۔ ان کے رومانوی ذہن کی پہچان اسلوب میں اچھی طرح ہو جاتی ہے۔

علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"امراؤ جان ادا کے کردار کا شمار کبھی بھی عظیم کرداروں میں نہیں ہو سکتا، عظیم کرداروں کے لئے ضروری ہے کہ لوگ اس کے ساتھ جذباتی مطابقت پیدا کر سکیں، صرف ہمدردی پیدا ہونا کافی نہیں ہے۔ امراؤ جان ادا زیادہ سے زیادہ ہمدردی پیدا کر سکتی ہے۔ اور وہ بھی بڑی حد تک سطحی ہو گی۔ فسانۂ آزاد کی جان صرف ایک کردار "خوجی" ہے جو شاید انحطاط پذیر جاگیرداری قدروں کے ایک مضحکہ خیز مجسمے کی حیثیت سے بہت دن زندہ رہے گا۔ لیکن اسے ہوری کے کردار سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ دُنیا کے ادب کے [illegible] کردار [illegible] ہیں جن کی تخلیق میں "عوامی ذہن" کا تخیل صرف ہوا ہے یا [illegible] ہے، ہوری اس حیثیت سے مکمل کردار ہے۔"

(ترقی پسند ادب، [illegible])

یہ اقتباس میں نے اس لئے بھی پیش کیا ہے کہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اپنے بعض ناقد تکنیک کی ارتقائی کیفیت اور موضوعات کی تبدیلی پر غور نہیں کرتے۔ تکنیک کی جدلیاتی کیفیت کی بات ضرور کرتے ہیں لیکن اس کی روشنی میں تکنیک کی نزاکتوں کو (تاریخ کے تسلسل میں) نہیں دیکھتے۔ "عظیم کردار" کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یقیناً تشریح طلب ہے۔ امراؤ جان ادا اور خوجی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سراسر زیادتی ہے۔ سردار جعفری نے "عظیم" کا لفظ جن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ شاید ہوری بھی اس معنویت کو پیش نہ کرے۔ دُنیا کے ادب میں ہمیں یاگو اور وکٹر ہیوگو کا کبڑا بھی ملتا ہے۔ ان کی تخلیق میں "عوامی ذہن" کا تخیل صرف نہیں ہوا ہے۔ لیکن وہ عظیم کردار ہیں اور ہوری شخصیت کی تعمیر کے اعتبار سے ان کے سامنے بالشتہ نظر آتا ہے۔ "امراؤ جان ادا سے سطحی ہمدردی پیدا ہوتی ہے" یا "خوجی صرف ایک مضحکہ خیز مجسمے کی حیثیت سے بہت دن زندہ رہے گا۔" (یعنی یہ بھی لافانی نہیں ہے) اس قسم کی باتیں وہ لوگ کریں تو شاید کوئی شکایت نہ ہو جو ادب کو زندگی کے رشتوں سے بندھا ہوا نہیں دیکھتے۔ امراؤ جان ادا اور خوجی دونوں اسی طرح مکمل کردار ہیں جس طرح ہوری ہے۔ ان دونوں کرداروں کی حیثیت بھی علامتی ہے۔ کسی کردار کو صرف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق دیکھ کر اس کی تعریف کی جائے اور اپنی تمام روایتوں کو فراموش کر دیا جائے اور شعور کو تاریخی تسلسل میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے تو یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ ہوری مجھے عزیز ہے، لیکن میں اسے ان معنوں میں "عظیم" نہیں سمجھتا جن معنوں میں علی سردار جعفری سمجھتے ہیں۔ ہوری کو مکمل کہتے ہوئے میں دوسرے اہم اور مکمل کرداروں کو خواہ مخواہ نامکمل نہیں سمجھتا۔ کردار کی عظمت کا یہ معیار ترگنیف، چیخوف، دوستوئسکی، بالزاک، فلابیر، ایملی برونٹے، جین آسٹن، جیمس جوائس، ہنری جیمس اور عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور کرشن چندر کے کرداروں کو سمجھنے میں کہاں تک مدد دے گا۔ "ٹریجڈی کنگ" کی ہیروئن ہوری نہیں بن سکتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں "عوامی ذہن" کا تخیل "صرف نہیں ہوا ہے ---- تو کیا صرف اسی لئے اس میں ادبیت" نہیں ہے؟ کیا [illegible]

اور خوجی کے ساتھ عز میار، ولایتی، اکبری، عمران، مہابلی، تانی، حبشو اور پھر ایّا بریری، بیکی شارپ، ڈان کوئیکزوٹ، ہیملٹ، جیک جھڑ، برونش، یاگو، ایلیس سب مرجائیں گے؟ عوام کی بوباس کا بات بھی دلچسپ ہے۔ کس کردار میں عوام کی بوباس نہیں ہوتی۔ عوام کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہمارے سامنے ہر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ صرف نچلے طبقہ کے لوگ نہیں ہوتے۔ صرف نچلے طبقہ کے لوگ "عوام" نہیں ہیں۔ ہر اچھا، اہم اور بڑا اور مکمل کردار طبقاتی ہوتا ہے۔ اچھے اہم اور بڑے اور مکمل کردار اپنے طبقے اور اپنی زندگی کی نفسیات اور جذبات، احساسات، عوامل، ذہنیت، اور میلانات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ردِ عمل میں انسان کی بنیادی جبلتیں اور ان کے بنیادی ہیجانات پر نظر ضروری ہے۔ امراؤ جان ادا اور خوجی بھی خلا میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا بھی تعلق طبقاتی زندگی سے گہرا ہے۔ پریم چند کا ہوری تو پرل بک کے وانگ لنگ سے بھی قد میں چھوٹا ہے۔ وانگ لنگ میں عوام کی بوباس ہوری سے کہیں زیادہ ہے۔ پریم چند کا ہوری ایک علامت ہونے کے باوجود زمینداری ریفارم اور سماجی و تعلیمی اصلاح کے نظریہ سے کبھی کبھی ناول میں گم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ پرل بک کی نظر وانگ لنگ پر ہر وقت ہے۔ گئودان کی تکنیک کی کمزوری وہیں ہے جہاں زمینداری ریفارم، سماجی اور تعلیمی اصلاح کے بوجھ سے ہوری کا کردار دبنے لگتا ہے۔ وانگ لنگ کے کردار سے "گڈ ارتھ" (Good Earth) کے تمام عناصر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ہر واقعہ وانگ لنگ کا ہے اور ہر واقعہ میں اس کی شخصیت محسوس ہوتی ہے۔ کردار نگاری کا یہ عروج ہے۔ اسی کردار کے گرد تمام واقعات گھومتے ہیں۔ ہم بے شمار دھاروں کو دیکھتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش، قحط، جنوب کی جانب ہجرت، بھیک، تقدیر کا زور و ستم یہ تمام باتیں ایک کردار کے گرد گھومتی ہیں۔ تھوڑے لمحے کے لئے بھی ہم وانگ لنگ کو نہیں بھولتے۔ یہ وحدت غضب کی وحدت ہے۔ گئودان کے ہوری میں ایسی کشش نہیں ہے۔ وانگ لنگ کا عروج و زوال چینی زندگی کے ایک خاص دور کا عروج و زوال ہے اور وانگ لنگ کی انسان دوستی اور اس کی انسانیت بنیادی قدروں اور جبلتوں کی اہمیت کا گہرا احساس دلاتی ہے۔ گئودان کے فن میں مقصدیت کے بادل میں بعض نہایت اہم

تعبیر

حقیقتیں پوشیدہ ہو گئی ہیں۔

یہ دونوں ناول دو قوموں (چینی اور ہندوستانی) کے کچھ مسائل علیحدہ لے کر آتے ہیں۔ دونوں میں پلاٹ کی تعمیر پر پہلے غور کیا گیا ہے۔ اور پھر پلاٹ کے مطابق دو ایسے کرداروں پر غور کیا گیا ہے جو بہت ہی مستحکم ہیں۔ دونوں قصوں میں کوئی زیادہ کشش نہیں ہے۔ ہوری اور وانگ لنگ کے کردار خاص سماجی، اقتصادی اور مذہبی پس منظر میں ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی حیثیت علامتوں کی ہے۔ دونوں فن کاروں کے رجحانات مختلف ہیں۔ نقطۂ نظر مختلف ہے، میلانات مختلف ہیں، اس لئے فن کار کی چابک دستی کا مطالعہ اور زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے، تکنیک میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہوری سے زیادہ وانگ لنگ اہم اور بڑا ہے اور اس کی علامتی حیثیت بھی زیادہ اہم ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک پورا سماج جذب ہے، لیکن گئودان کی طرح ڈھیلا پن نہیں ہے۔

ہوری بلاشبہ گئودان کی روح ہے۔ ہوری کی وجہ سے بہت سی خامیاں دب گئی ہیں۔ ہوری کے علاوہ دھنیا، مسز کھنّا، تنخا صاحب، مہتا صاحب، مس مالتی، بھولا، گوبر اور دا تا دین، جھنگری، منگرو شاہ، رائے امر پال سنگھ، کنہیا اور پنڈت اونکار ناتھ بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں اور واقعات سے اپنا گہرا رشتہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب کردار پلاٹ میں جذب ہیں۔ ہندوستانی زندگی کے مختلف دھاروں کو نمایاں کرتے ہیں۔ پریم چند کی مثالیت اور تخلیت کی بھی پہچان ان کرداروں سے ہوتی ہے۔ گئودان پریم چند کا آخری مکمل ناول ہے۔ آدرش واد کی تصویریں جا بجا نمایاں ہیں اور پریم چند کا طبقاتی شعور اور ان کی طبقاتی رومانیت بھی صاف طور پر نمایاں ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پریم چند کا ذہن واضح نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقاتی رومانیت فن کی رومانیت کے قریب آ گئی تھی، یہاں واضح سیاسی شعور کی تلاش غلط ہے۔ معاشرہ کی اجتماعی قدروں اور مختلف کرداروں کے خیالات، الجھنوں، عمل اور ردِ عمل میں اس طبقاتی رومانیت کو اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گئودان سے گھریلو زندگی کا روایتی المیہ ایک معنی میں ختم ہوتا ہے اور سماجی زندگی کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ سماجی زندگی کے اس المیہ میں پریم چند کی رومانیت — اردو ادب کی نئی رومانیت ہر جگہ مختلف صورتوں میں ملتی ہے۔

صحت عامہ کی مزید سہولیات

ریاستی حکومت نے اس سال صحت عامہ کی سروسز کو مزید وُسعت دینے اور ہسپتالوں کے لئے نئی عمارتیں تعمیر کرنے کی غرض سے ۳۰ لاکھ روپے کے اخراجات کی منظوری دی ہے اور اس سلسلے میں جو بڑے بڑے کام انجام دئے جا رہے ہیں اُن کی مختصر تفصیل یہ ہے:-

- سرینگر کے صدر ہسپتال کی توسیع کے لئے ۳ لاکھ روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔ اس رقم میں سے ۲ لاکھ ۳ ہزار ۵ سو روپے ادویات اور سامان پر اور باقی رقم مریضوں کی خوراک پر خرچ کی جائے گی۔
- سرینگر کے صدر ہسپتال کے ساتھ ساتھ جموں کے صدر ہسپتال کو بھی وُسعت دی جائے گی اور اس پر ایک لاکھ پانچ سو روپے خرچ کئے جائیں گے۔
- ۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپے کی لاگت سے سرینگر کے صدر ہسپتال میں ایک آؤٹ ڈور بلاک اور جموں کے ہسپتال میں ایک نیا وارڈ تعمیر کیا جائے گا۔
- جموں میں ۵۰ بستروں والا دماغی امراض کا ایک ہسپتال قائم کیا جائے گا۔ جس کی تعمیر کے لئے ایک لاکھ روپیہ مخصوص رکھا گیا ہے۔
- ریاست کے دونوں صوبوں میں آئی سولیشن ہسپتالوں کے لئے ۲ لاکھ ۷۵ ہزار روپے کی لاگت سے نئی عمارتیں تعمیر کی جائیں گی
- ضلع ہسپتالوں کو مزید وُسعت دینے پر ایک لاکھ ۴۱ ہزار روپیہ خرچ کیا جائے گا۔
- ریاست کے مختلف ہیلتھ سنٹروں کے لئے نئی عمارتیں تعمیر کی جائیں گی جن پر ۴ لاکھ ۷۰ ہزار روپے خرچ آنے کا اندازہ ہے۔
- امراضِ سینہ کے ہسپتالوں کی توسیع پر تقریباً ۴ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

علاوہ ازیں

- دیہات میں لوگوں کو طبی امداد بہم پہنچانے کی غرض سے تین ایلوپیتھک اور آٹھ یونانی اور آیورویدک ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔
- منصوبہ بند ترقیاتی پروگرام پر عمل درآمد کرانے کے لئے ۵۵ ہزار روپے کے صرف سے ایک گشتی یونٹ کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔
- اسی طرح اور بھی بہت سارے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن کی بدولت عوام کو صحت عامہ کی ہر ممکن سہولیات بہم ہوں گی۔

محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

نور شاہ

کمرہ ۱۳

آرکسٹرا بج اُٹھا اور اُس کے سازوں کی لہروں کے ساتھ ساتھ سفید چکنے فرش پر جوان جوان جسم تھرکنے لگے ـــ سیٹھ جی کے دِل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اُس پر وہی پُرانی جنونی کیفیت سی طاری ہوئی اور وہ چیخ اُٹھا :

"آصف۔"

"جی!"

"کمرہ کھول دو۔ ہم اُوپر جا رہے ہیں۔"

"بہت اچھا سیٹھ ـــ "

آصف کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مُسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا جب آرکسٹرا کی دُھنوں پر جوان جسم تھرکنے لگتے ہیں تو سیٹھ جی کو اپنا مخصوص کمرہ یاد آ جاتا ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے اُوپر کی منزل کی طرف جانے لگا جہاں ہوٹل کا کمرہ نمبر ۱۳ حسبِ معمول اُس کا منتظر تھا۔ اُس نے ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ جی نشہ میں مست سہمی سہمی لڑکی کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ آصف نے لڑکی پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ گھبرا سی گئی مگر آصف نے اُس کی گھبراہٹ کی کوئی اہمیت نہ دی!

"آصف"

"جی سیٹھ!"

"وِسکی ـــ" سیٹھ جی کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے کی دیواروں میں جذب ہو کر رہ گئی۔

آصف بغیر کوئی جواب دئے نیچے چلا آیا۔

وِسکی کی بوتل اور دوسرے لوازمات لے کر جب وہ واپس آیا تو حسبِ عادت کمرے کے باہر اُس کے قدم خود بخود رُک گئے ـــ یہ اُس کا معمول تھا۔ کمرے میں جانے سے پہلے چند لمحے وہ ضرور رُک جاتا اور سیٹھ جی کی باتیں سُنتا ـ نہ جانے کیوں؟

سیٹھ جی لڑکی سے کہہ رہا تھا :

"یہ کمرہ تمہاری فلم انڈسٹری کی کتنی ہی لڑکیوں کے لئے جانا پہچانا ہے۔ ایک دِن جب تم بھی فلم انڈسٹری کی ایک بڑی ہیروئن بن جاؤگی تو اس کمرے کو بھُلا دوگی۔ مجھے بھُلا دوگی (قہقہہ) ـــ او ڈارلنگ میرے قریب آ ـــ ارے تم گھبرا کیوں رہی ہو!"

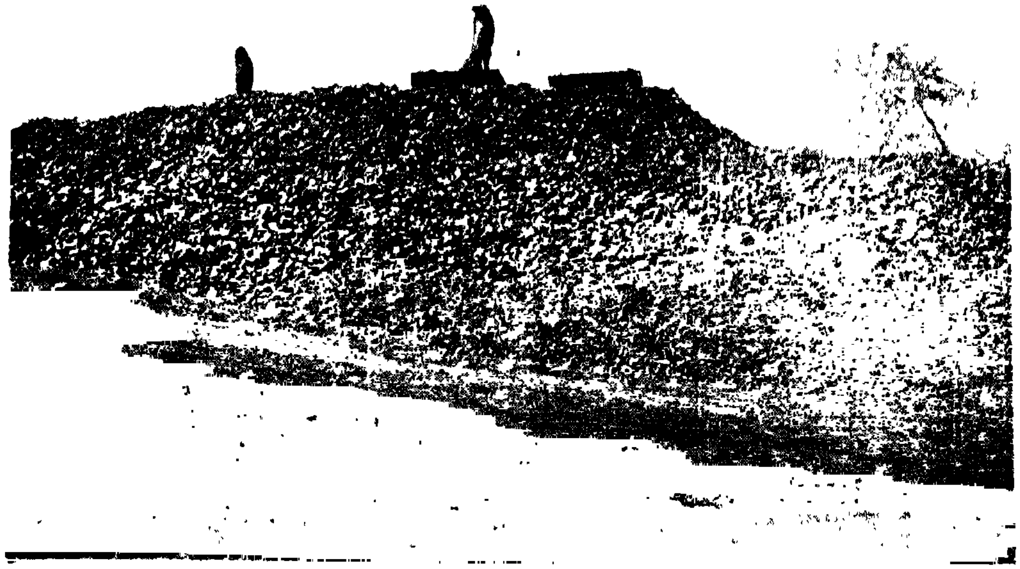
"لیکن سیٹھ جی ـــ" لڑکی نے جواب دیا ـ "مجھے ابھی کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اور کیا کیا کرنا ہوگا۔ بھگوان کے لئے مجھے اب کام دیجئے۔ میں ایک مہینے سے یہاں بھٹک رہی ہوں ـــ اُف اگر میرے پتاجی کو میری اس حالت کا پتہ چل جائے گا تو مجھے گولی سے اُڑا دیں گے ـــ میں گھر سے بھاگی ہی کیوں تھی۔"

سیٹھ جی نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا :

"تم گھر سے بھاگ گئی ـــ اس لئے کہ تم فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ تم بڑی بڑی رنگین محفلوں کی جان بننا چاہتی تھی، جواں دِلوں کو چکنا چور کرنا چاہتی تھی ـــ تم نے سوچا تم فلم میں آؤگی تو تمہارا نام ہوگا۔ تمہاری شہرت ہوگی ـــ بنگلہ، کار ـــ نوکر ـ ؟"

"لیکن سیٹھ جی ـــ" لڑکی نے یاس اور حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔

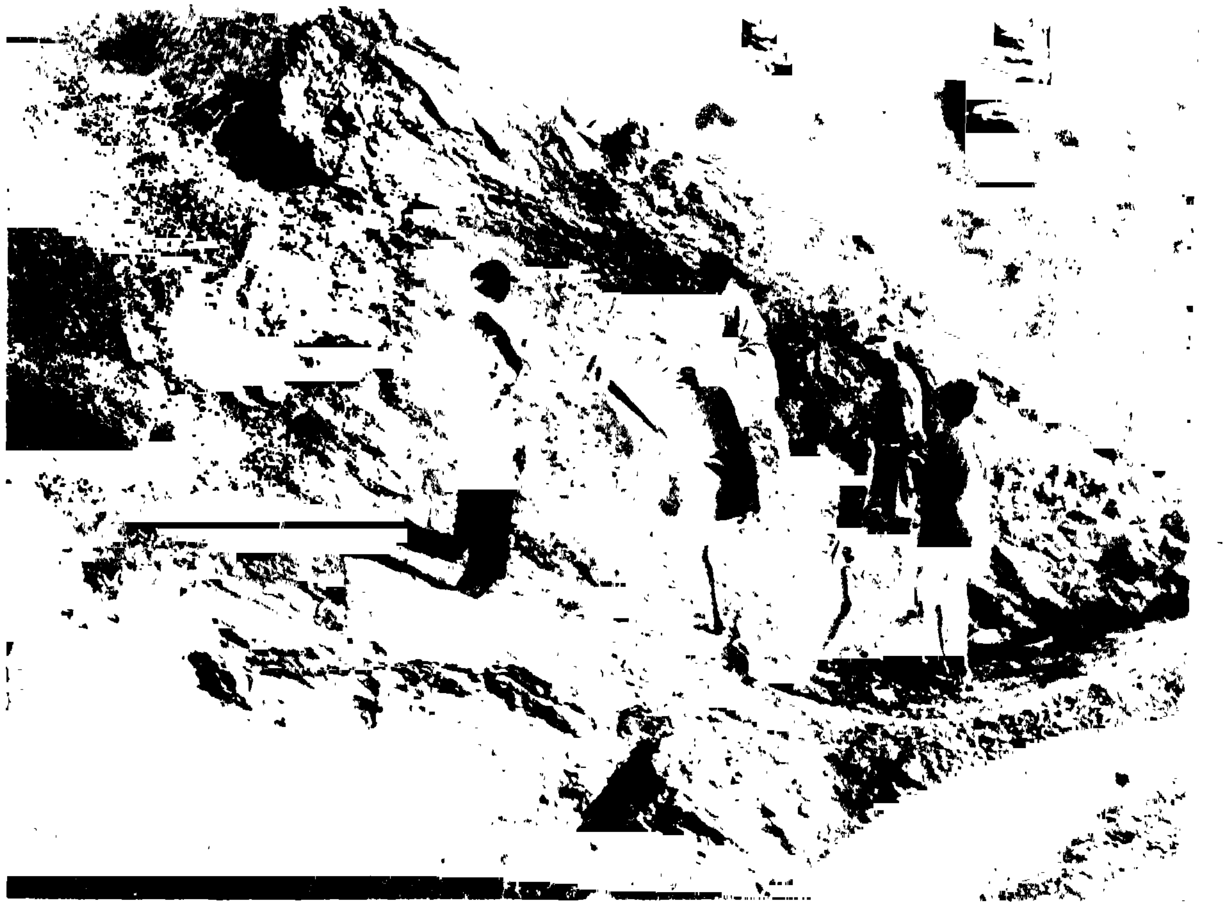
"تم گھبراؤ نہیں ساقی، میری بات تو سُنو۔ میں اپنی نئی فلم کی کاغذی تیاریوں میں لگا ہوا ہوں۔ بہت جلد شوٹنگ ہونے والی ہے

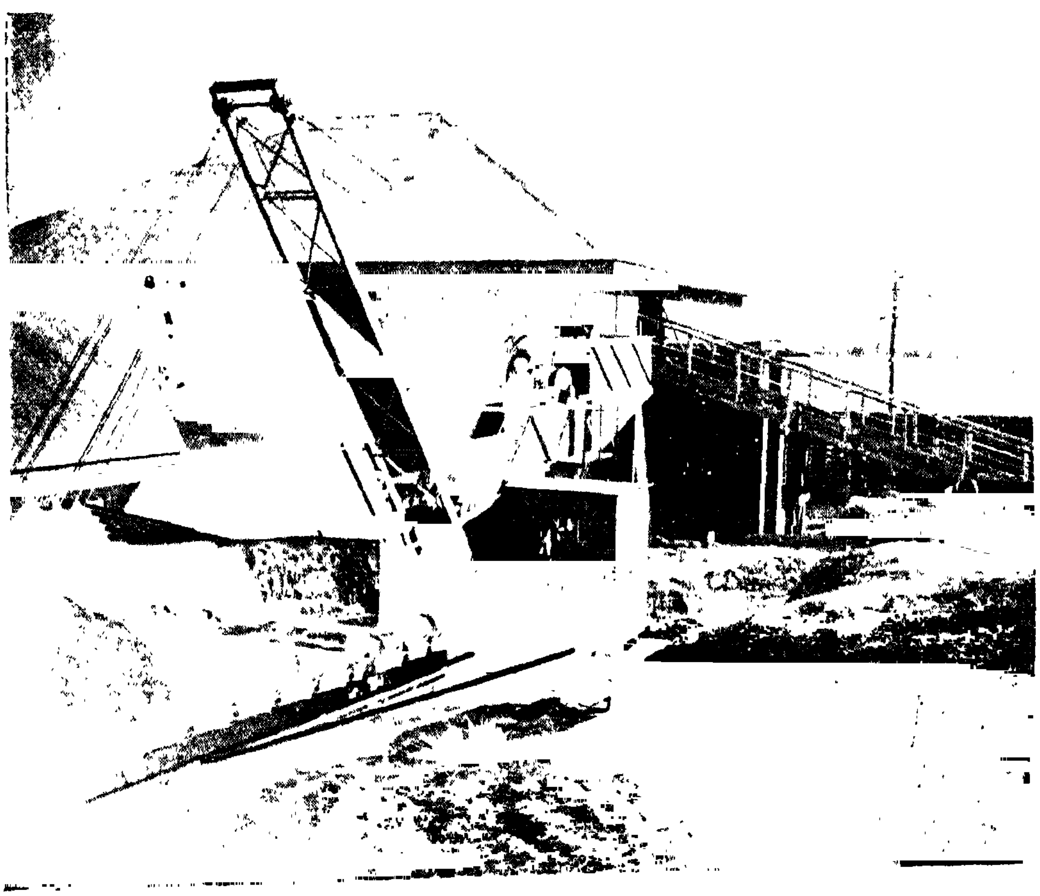


بالا کوٹ کے دو ٹلے کے میدان



نوں پر کام جاری ہے





تم خوبصورت ہو، جوان ہو اور میں تمہاری خوبصورتی اور جوانی کا احساس یہاں کے ہر پروڈیوسر کو دلاؤں گا — تم میری فلم کی ہیروئن بن کر آ رہی ہو۔ پھر تمہارے پاس وہ سب کچھ ہوگا جس کی تم متلاشی ہو — بنگلہ، کار، نوکر — ! اور اس کے بعد مجھے بھول جانا، بھول جانا مجھے اُن لڑکیوں کی طرح جنہوں نے میرے ایک ایک اشارے پر آکاش کی بلندیوں کو چھو لیا اور اب مجھے پہچاننے سے انکار کرتی ہیں۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سیٹھ جی کے اور قریب سرک آئی۔

"وہی پرانا فلسفہ۔ وہی پرانا کھیل —" آصف نے اپنے من ہی من میں سوچا اور کمرے میں داخل ہوا۔ شراب گلاسوں میں انڈیل دی اور باہر چلا آیا۔

شراب کا پہلا دور چلا، دوسرا دور چلا۔ اس کے بعد دور پر دور چلتے گئے۔ وِسکی بہتی رہی، یہاں تک کہ وہ ختم ہوگئی تو سیٹھ جی نے رانی کی آنکھوں سے پینا شروع کر دیا۔ شام کے سائے رات کی تاریکیوں میں بدل گئے۔ رانی سیٹھ جی کی باہوں میں لہراتی رہی اور جب صبح کی پاک روشنی نے رات کی تاریکیوں کو نگل لیا۔ تو آصف نے رانی اور سیٹھ جی کو کمرہ نمبر ۱۳ سے نکلتے دیکھا — ! گو کہ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ کسی نہ کسی لڑکی کو سیٹھ جی کے ہمراہ اس کمرے سے نکلتے دیکھتا تھا!

سیٹھ جی کی اپنی ایک لمبی کہانی ہے۔ وہ صرف آٹھ سال کا تھا کہ اس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ وہ ابھی نویں جماعت میں ہی پڑھ رہا تھا کہ اس کا چاچا بھی مر گیا۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن حالات اور قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ اُس کے ناپختہ شعور نے کچھ ناپختہ سے خواب دیکھے تھے۔ جو مسمار ہو کر رہ گئے۔ اُسے زندگی سے نفرت ہو گئی، لیکن مرنا آسان نہیں ہوتا اور جینے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ محنت کرنا پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے چاچا اس کے نام دو ہزار روپے کی رقم چھوڑ گیا تھا۔ یہ سب روپیہ لے کر وہ بمبئی کا رُخ کیا۔ یہاں اُس نے چائے کی ایک چھوٹی سی دُکان کھولی اور کافی پیسہ بنایا۔ اب وہ ٹھیکیداری بھی کرتا تھا۔ پیسہ پیسے کو کھینچتا رہا۔ تجوری بھرتی گئی —— ایک دن اس کے ذہن میں ایک بالکل نئی بات آ گئی۔ وہ اپنے ایک پروڈیوسر دوست سے ملا اور اُس کے ساتھ مل کر ایک فلم بنانا شروع کر دی۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران میں اُس نے ایک لڑکی کو بھی پسند کر لیا اور اُس سے شادی کر ڈالی۔ وہ اپنی بیوی سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگا — سنتوش تھی بھی محبت کرنے کے قابل — وہ بات کرتی تو محسوس ہوتا جیسے پگھلی ہوئی چاندنی بہہ رہی ہو۔ وہ چلتی تو لگتا جیسے کسی بڑی گہری نیلی جھیل میں کوئی بطخ تیر رہی ہو۔ اور پھر اُس کے ہونٹوں پر وہ موہنی موہنی سی مسکراہٹ — فلم تیار ہو کر ریلیز ہوئی اور بے حد کامیاب ہو گئی۔ اب وہ اکیلا ہی دوسری فلم بنانے کی تیاریوں میں لگ گیا کہ سنتوش نے ایک پھول سی بچی کو جنم دیا — راج؟

زندگی مزے سے گذر رہی تھی۔ پیسہ تھا، بنگلہ تھا، کار تھی، خوبصورت بیوی تھی، پھول سی بچی تھی —— اور کیا چاہیئے تھا۔ ناپختہ شعور نے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے ہو گئے تھے، لیکن اچانک ایک طوفان آ گیا۔ سنتوش نے فلموں میں کام کرنے کی ٹھان لی۔ نہ جانے کیوں؟ اُس کے پاس سب کچھ تھا لیکن تحت الشعور میں مشہور ہونے کی لیبل چسپاں ہو گئی تھی۔ یہ خواہش پہلے پہلے سنتوش کے دل میں دبی دبی سی رہی۔ اندر ہی اندر سُلگتی رہی اور ایک دن جب اُس نے اپنے خاوند سے اس کا اظہار کیا تو وہ چکرا گیا۔ اُس نے اس آگ پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا —— اور ایک دن سنتوش گھر کی چار دیواری سے نکل کر فلمی ماحول میں چلی گئی —— گھر کی چار دیواری میں جو پھولوں کی کیاری ہوتی ہے جس کی خوشبو سے دماغ معطر رہتے ہیں۔ وہ اُجڑ گئی تھی۔ سنتوش ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لہراتی رہی۔ ایک جام سے دوسرے جام میں ڈوبتی رہی۔ اُس نے اپنے دل پر جبر کر کے سنتوش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر سے بے گھر کر دیا۔ لیکن وہ سنتوش کو نہ بھلا سکا۔ اُسے بھولنے کے لئے اُس نے شراب کا

سنبھال لیا۔

اسی دوران اُس کی دو فلمیں چل نکلیں۔ اب پیسہ بھی تھا، شہرت بھی تھی۔ ملک کے بڑے بڑے ڈائریکٹر، ایکٹر اور ایکٹریسیں اُس کے ایک ایک اشارے کے منتظر تھے مگر اُس نے ہمیشہ اپنی راج کو فلمی ماحول، فلمی لوگوں سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ وہ راج کو سنتوش کے رُوپ میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وقت گذرتا رہا۔

راج جوانی کی منزلوں کو پھلانگتی رہی۔

لیکن وہ سنتوش کو بھُول نہ سکا۔ سنتوش سے انتقام لینے کی خاطر اُس نے ایک روز ایک عجیب سا فیصلہ کر لیا۔ وہ اُس وقت اپنی بیٹی راج کو بھی بھُول گیا جسے سنتوش نے جنم دیا تھا ——

شاید وُہ جنونی ہو گیا تھا؟

چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا ——

"میں ہر اُس لڑکی کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کروں گا جو فلموں میں کام کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔ میں اُنہیں بتاؤں گا فلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ کن کن سے ملنا پڑتا ہے!"

اور پھر اُس نے ایک بڑا ہوٹل خریدا۔ اُس ہوٹل میں ہر رات کتنے ہی ارمان کچلے جاتے۔ کتنی کلیوں کو پھُول بنا دیا جاتا۔ کتنی ہی بوتلوں کو توڑا جاتا —— خود سیٹھ اب شراب اور لڑکی کے بغیر نامکمل تھا۔ اور اس بات سے ہوٹل کے منیجر سے لے کر گیٹ کیپر تک ہر کوئی واقف تھا۔ اور پھر آصف تو اُس کا خاص نوکر تھا۔ ہوٹل کا کمرہ نمبر ۱۳ ہر روز نئی لڑکی اور نئی شراب کے لئے بے تابی سے منتظر رہتا۔ یہ کمرہ سیٹھ کی ہر حرکت سے واقف تھا۔ اور اس نے آصف کی طرح کبھی اپنی زبان نہ کھولی تھی —— اس کے سینے میں کتنے ہی تلخ تلخ، شیریں شیریں سے راز مدفن تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بار چاہا تھا کہ وہ اپنے دیواروں میں شگاف پیدا کر دے اور اس دیوانے کو اپنے تنگ و تاریک سینے میں چیر کر رکھ دے یا اس پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے۔

لیکن وُہ مجبور تھا اور اسی لئے خاموش تھا!

وہ بھی ایک عام سی شام تھی۔ سیٹھ جی اپنے بنگلے کے برآمدے میں بے صبری سے ٹہل رہے تھے۔ اُسے کسی کے ٹیلی فون کا انتظار تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو ——"

"سیٹھ میں آصف ہوں۔"

"کیا ہوا۔"

"سیٹھ جی ہری لال بولتا ہے آج کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔!"

"ایڈیٹ ——" سیٹھ جی کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور اُس نے پٹک کر ریسیور نیچے رکھ دیا۔ آج ہری لال نے ایک خوبصورت لڑکی لانے کا وعدہ کیا تھا جسے فلموں کا جنون بمبئی کھینچ لایا تھا۔ اور اس لڑکی پر فلمی دُنیا کے بہت سے لوگوں کی نظر تھی۔ وہ اب کسی نئے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک راج چلی آئی۔

"پتا جی۔"

اُس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

"ہاں بیٹا، کیا بات ہے؟"

"پتا جی آج ریوتی میں انگریزی فلم Night of the quarter moon لگی ہے۔ میں دیکھنے جا رہی ہوں۔"

"ضرور جاؤ بیٹا ——"

"آپ بھی آئیے نا؟"

"لیکن ...!" سیٹھ جی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"آپ میرے ساتھ کہیں نہیں جاتے۔ آج تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔ اگر آپ نے انکار کیا تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گی۔"

اُس نے بڑی معصومیت سے کہا

سیٹھ جی انکار نہ کر سکا۔

فلم دیکھنے کے بعد جب وہ سینما سے باہر نکل آئے تو راج نے اپنے ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے اصرار کیا۔

"تمہاری مرضی!"

راج آج پہلی بار اپنے ہوٹل میں آئی تھی۔ اُسے یہاں کا ماحول

عجیب سا لگا۔ آرکسٹرا بج رہا تھا۔ سپید چکنے فرش پر جوان جسم تھرک رہے تھے۔ موسیقی کے زیر و بم پر قہقہے اُبھر رہے تھے —
اچانک سیٹھ جی کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اُس پر وہی پرانی جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ چلّا اُٹھا:

"آصف۔"

"جی۔"

"کمرہ کھول دو۔"

آصف نے راج پر ایک نظر ڈالی اور چلا گیا۔

جنونی کیفیت

شراب

لڑکی

راج؟

"راج —" سیٹھ جی نے ڈوبے لہجے میں کہا۔

"جی —"

"تم بیٹھو میں آرہا ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

سیٹھ چلا گیا۔

راج سازوں کے زیر و بم میں کھو گئی۔

ساز بجتے رہے۔

جسم تھرکتے رہے۔

وقت گزرتا رہا — سیٹھ واپس نہیں آیا۔ یہاں تک کہ آرکسٹرا بجانے والے بھی تھک کر کافی پینے لگے۔

راج کو اپنے باپ کا خیال آیا اور خود بخود اُس کے قدم دوسری منزل کی طرف اُٹھ گئے۔ اُوپر کمرہ نمبر ۱۳ کے سامنے آصف کھڑا تھا۔

"شاید پتا جی —" وہ کمرے کے قریب آئی لیکن ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی آنکھوں کی بینائی کھو چکی ہو۔ اس کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اندر کمرے میں سیٹھ بدمست پڑا تھا۔ شراب کی کتنی ہی بوتلیں کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ عجیب سی حالت تھی سیٹھ کی آنکھیں لال لال سی ہو گئی تھیں۔ اُس کے بال بکھرے بکھرے سے تھے

"او چھوکری، کیا دیکھتا ہے۔" اچانک آصف کی آواز راج کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو ... ؟" اُس نے کہنا چاہا۔ لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔

"آصف اسے اندر آنے دو۔ یہ میری ... !" سیٹھ نے بدمست لہجے میں

آصف نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"پر سیٹھ — یہ چھوکری تو ابھی بہت چھوٹی ہے — بہت چھوٹی!"

راج کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

سیٹھ جی پر سکتہ سا چھا گیا۔ اُس کی زبان پر جیسے فالج گر گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ اُسی کمرے میں زندہ ہی دفنایا جا رہا ہو — !

معذرت۔ "تعمیر" کے پچھلے شمارے میں "مہاکوی کا سفرِ آخرت" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں غلطی سے ذیل کی چند آخری سطریں لکھنے سے رہ گئی تھیں۔ اس غلطی کے لئے ہم اپنے قارئین اور خاص کر مضمون نگار جناب شاکر [illegible] سے معافی کے خواستگار ہیں۔ — "آگ کے شعلے جب پوری شدت سے اُٹھنے لگے تو فوراً [illegible] میں خود کمار داس بھی چتا میں کود پڑے۔ روایت ہے کہ کمار داس کی پانچوں رانیاں بھی [illegible] کی تاب نہ لا کر اسی چتا میں جل مریں۔ یہی روایت ہے جو نیل ولا گنگ ندی کے کنارے بسنے [illegible] سے وابستہ ہے۔ آج بھی بیکھ (اپریل) کے تیسرے ہفتہ میں وہاں لوگ برت رکھتے ہیں اور گھی کے چراغ جلا کر اپنے [illegible] اور مہاکوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔"

شفیق جونپوری

دو غزلیں

ذرا تہذیب کی حد میں رہے وحشت کی جولانی
بہت نازک طبیعت ہے کسی کی پاک دامانی!

مری فریاد پر جب مسکراتے ہو میں ڈرتا ہوں
کہ تم کو بھی نہ لے ڈوبے مرے اشکوں کی طغیانی

کبھی فریاد تو سنتے گرفتارِ محبت کی
یہ کہہ کر مسکرا دیتے ہو زندانی تو زندانی

میں سچ کہتا ہوں تم اپنا گلستاں بھول جاؤ گے
ابھی دیکھی کہاں تم نے مرے صحرا کی ویرانی

تجلی ریز بستی ہے جہاں اے آسماں میں ہوں
ترے خورشید کا منہ پھیر دے ذروں کی تابانی

ہم اپنے ہوش میں کب تھے جو رسوائی کا ڈر ہوتا
یہ ان کا فرض تھا کرنے نہ دیتے چاک دامانی

بلائے جاں ہے اُلفت عشق ہے غارتگرِ ہستی
یہ سب کچھ جانتا ہے پھر بھی ہو جاتی ہے نادانی

توجہ ہو گئی شاید جمالِ روئے جاناں کی
یہ کیسی شامِ فرقت ہے کہ سارا گھر ہے نورانی

تجلی دل کے داغوں کی، سفر شامِ غریباں کا
چلی تاروں کے جھرمٹ میں مری برباد سامانی

تمہاری جستجو میں یوں گزارے دن بہاروں کے
جوانی آگے آگے پیچھے پیچھے خانہ ویرانی

نہ جانے طاق پر آئینہ کس کو یاد کرتا ہے
کئی دن سے بہت رونق ہے میرے گھر کی ویرانی

مری شوریدہ حالی کی حقیقت کوئی کیا جانے
کسی کی پاک دامانی ہے وجہِ چاک دامانی

زمانے کی خوشی قربان اُس کی چشمِ گریاں پر
ترے دامن نے جس کے آنسوؤں کی قدر پہچانی

کسی کے آستانے پر وہ میری نیند راتوں کو
ہوائے زلف میں ہوتی رہی آشفتہ سامانی

نہیں ہوں میں تو اُن کی جامہ زیبی پر اُداسی ہے
محبت لے رہی ہے انتقامِ چاک دامانی

مری شائستگی نے تو ہمیشہ پردہ پوشی کی
یہ کس نے اُن سے کہہ دی داستانِ سوزِ پنہانی

بگولے جب شفیق اُٹھتے ہیں میرے بعد صحرا میں
تو مجھ کو پوچھتی ہے دیر تک بے ساز و سامانی

حامدی کاشمیری

تو نہ آئی، ترے آنچل کی ہوا آئی ہے
دل کے شعلوں کو بھڑکنے کی ادا آئی ہے

تو نے جب دل پہ کوئی تازہ ستم ڈھایا ہے
جانِ من، تیرے لئے لب پہ دعا آئی ہے

میرے احساس کے لمحوں میں مہکتے ہیں گلاب
کیا ترے شہر سے خوشبوئے وفا آئی ہے

لڑکھڑائے شبِ تاریک میں جب میرے قدم
دُور سے صبح کے جلوؤں کی صدا آئی ہے

تیری شاداب نگاہوں میں یہ غم کے سائے
جھیل پر جھک کے بہاروں کی گھٹا آئی ہے

حوصلے اور بھی گستاخ نگاہوں کے بڑھے
جب تری شوخ نگاہوں میں حیا آئی ہے

ہر کلی شعلہ ہے، ہر پھول دہکتا ساغر
آگ برساتی ہوئی بادِ صبا آئی ہے

خلوتِ شوق ہے اور ہے وہ برافگندہ نقاب
حامدی آج مرے دل کو قضا آئی ہے

اندرجیت لال
ایم اے

جارج پیس شور

(اُردو کا مشہور فرنگی شاعر)

یہ شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اُردو شاعری کی نشو و نُما میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ فرنگی احباب نے بھی حصہ لیا ہے۔ اور ہر دَور میں کوئی نہ کوئی فرنگی غزلوں، رباعیوں اور مثنویوں سے اُردو شاعری میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ ویسے اُردو زبان کا ذکر ستارہویں صدی کے یُورپین سیاحوں کے سفرناموں میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے سفرناموں سے یُوں معلوم ہوتا ہے کہ یُورپین لوگوں کو اُردو زبان سے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی صرف و نحو پر سب سے پہلے جان شوا کٹلر نے، جو کہ پروشیا کا باشندہ تھا، لاطینی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ جسے ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۷۷۲ء میں ہیڈلے نے اُردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب شائع کی۔ اسی طرح ایک اور یُورپین نے اُردو الفاظ کی ایک مختصر فرہنگ لکھی اور ۱۷۷۸ء میں ایک اُردو گرامر انگریزی زبان میں لزبن سے شائع ہوئی۔

اس کے بعد یُورپین مُصنفوں کا دَور شروع ہوا۔ صرف و نحو سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اُنہوں نے دوسرے موضوعات پر بھی طبع آزمائی شروع کی۔ چنانچہ ۱۷۷۳ء میں فرگسن نے ہندوستانی زبان کی ایک لُغت لکھی۔ لیکن ان سب بدیشیوں کی ادبی خدمات گلکرائسٹ کی تصانیف کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ انہوں نے ۱۷۸۷ء کے بعد اُردو میں قابلِ قدر کتابیں لکھیں۔ ان کی انگریزی، ہندوستانی لُغت بہت مشہور ہے۔ گل کرائسٹ نے ۱۸۲۰ء میں ایک اُردو رسالہ "اُردو میگزین" کے نام سے جاری کیا۔ جس کے چند پرچے آج بھی نیشنل ریکارڈ آفس میں محفوظ ہیں۔

یُورپین باشندوں میں اُردو شاعری کا ذوق اُنیسویں صدی [illegible] سے بڑھنا شروع ہوا۔ اس زمانہ میں اُردو شاعری شباب پر تھی۔ [illegible] شعر و سخن کے چرچے تھے۔ جابجا مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یُورپین باشندوں اور ہندوستانیوں کے مجلسی تعلقات [illegible] ہونے لگے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ اُردو شعر و شاعری کا ذوق اہلِ [illegible] کے علاوہ فرنگی باشندوں میں بھی بڑھنے لگا۔ اور یہ ذوق صرف [illegible] تک ہی محدود نہ رہا۔ جب فرنگیوں نے اُردو شاعری کے نکات و رموز سمجھا تو اپنی تخلیق و تخیل سے انہوں نے اسے سینچنا شروع کر دیا۔ ایسے ممتاز فرنگی شعرا میں ایک نام جارج پیس شور ہے جو اُستاد داغ [illegible] کے معاصر تھے۔ شور ۱۸۲۳ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور [illegible] تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد خاص یُورپین تھے۔ شور میرٹھ [illegible] بہ عہدۂ پولیس مُلازم ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مُلازمت ترک کر کے اپنے نانا فراسو کوہن کے پاس آگرہ چلے گئے۔ نانا نے شور کی شاعری کی دُھوم دھام سے کی۔ چند برسوں کے بعد شور دہلی آگئے اور مرتے دم تک یہیں سکونت پذیر رہے۔

شور ادبی مشقِ سخن مرزا رحیم بیگ میرٹھی سے حاصل کرتے رہے۔ پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور اُن کے بیٹے غلام دستگیر سے اصلاح لے کر رتبہ ارشاد حاصل کیا۔ معاش کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ طبیعت [illegible] زندہ دِل، غفار اور خلیق منش تھے۔ شاعری کا شوق اس قدر تھا کہ شعر و سخن کی ہر محفل میں موجود رہتے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ ایک دو غزلیں لکھا کرتے تھے۔ منشی کریم الدین طبقات میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۴ء میں میرے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان

شاعروں میں پڑھنے کے لئے شورؔ برابر اپنی غزلیں بھجا کرتے تھے۔

شورؔ کے چار دیوان اور دو مثنویاں اُردو میں اور ایک دیوان فارسی میں ہے۔ فارسی دیوان جامِ بخششِ فرنگ ہے۔ پانچواں دیوان اُردو کا تمام شدہ مسوّدہ ہے۔ یہ دیوان "آفتابِ داغ" و "گلزارِ داغ" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اور اس کی بیشتر غزلیں داغؔ کی غزلوں کی ہم طرح ہیں۔ غزلوں کی زبان میٹھی، سُریلی اور رنگ عاشقانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عاشقانہ رنگ اُس دور کی دین ہے۔ کلام میں پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ کی بھرمار نہیں۔ تکلّف کو بھی شاذ و نادر ہی دخل حاصل ہوتا ہے۔ الفاظ نہایت سادہ، ترکیبیں سیدھی سادی اور بندش چست ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

ان کی مژگاں کا تصور دل میں ہائے
عمر بھر کانٹا سا اک کھٹکا کیا!

سنبھل کے باغِ محبت میں پاؤں رکھنا شورؔ
گلِ مراد سے یاں پہلے خار راہ میں ہے

یہ بڑا دل ہے کھلا پھر در سے خانہ
کہ نیا دَور، نیا شیشہ و پیمانہ ہے

غم ہیں اور ہم کو ہم کھاتے رہے
زندگی کا یہ مزا پاتے رہے

شورؔ نے معاملہ بندی میں بھی نیازِ عاشقانہ اور نازِ معشوقانہ کے بے مثل مرقعے اُتارے ہیں۔ کہیں ہجر کی محروم نصیبوں کا ذکر ہے، کہیں رقیب کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے۔ غرضیکہ اشعار کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں۔ ایسے کلام میں شوخی، حاضر جوابی، ظرافت، بذلہ سنجی اور ہلکی پھلکی چوٹیں سب شامل ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

بوسہ مانگا تو بگڑ کر بولے۔ منہ ترا اپنا ذرا بنوائیے گا

شرم و حجاب ہی میں شبِ وصل کٹ گئی
اُن کی زباں پہ تا سحر انکار ہی رہا

شورؔ کے کلام میں حقائق کم ہے۔ غزلیں روایتی طرز کی ہیں۔ فلسفۂ حیات کے بجائے فلسفۂ عشق پر معروف ہے۔ [illegible] ناز و ادا اور جذبات نگاری غضب ہے۔ کلام کی بے ساختگی اور صفائی غالب ہے۔ تغزل میں انھیں یہ ناز تھا کہ اُن کا درجہ داغؔ سے کسی درجہ کم نہیں۔

اگرچہ داغؔ بھی مشہور ہے شیریں کلامی میں
مگر تم شورؔ ہو کر شور ہو شیریں زبان پھر بھی

کچھ ملے جلے رنگوں کے اشعار یوں ہیں:

دیر و حرم میں ڈھونڈ دے ترجیح نہ ادا
ہر جس طرف جھکایا وہی سجدہ گاہ تھا

ہچکیاں آئیں، کیا یاد کسی نے مجھ کو
غیر سے ذکر میرا آج مکرّر آیا

دل میں الم ہے جان میں حسرت ہے تن میں ضعف
سب کچھ ہے تیرے عشق میں اللہ کا دیا

شورؔ کی مثنوی میں زبان و بیان کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جو اُردو زبان کی مستند مثنویوں میں پائی جاتی ہیں۔ کلام میں اُتم درجہ کی روانی اور سادگی ہے۔ تشبیہہ استعارے بچے تُلے اور ترکیبیں دلچسپ ہیں۔ مرقع نگاری ہر بیان سے عیاں ہوتی ہے اور سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ یہ مثنوی اُس دور کی عکاس ہے۔ تاریخ و شاعری کے دو حق یہ مثنوی ظاہر کرتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں دہلی کا حال ملاحظہ ہو:

ہوا حال دِلّی نہایت تباہ۔ لڑائی رہی رات دن پنج ماہ
نئی آفت اِک قلعہ پر آ گئی۔ جو کالوں نے بادشاہ کی بھی لی
کیا شاہ سے خوب سے یہ تم دو ہیں۔ فرنگی کا ہم قتل جائز رکھیں
لگا مورچہ جب کہ دِلّی کے پاس۔ اُڑے سب تلنگوں کے ہوش و حواس
گھسے گورے کشمیری دروازہ سے۔ کیا حملہ سب نے ایک انداز سے
بہا پھر تو وہ خون کا ہر کا والا
کہ بازار سب ہو گیا خون فشاں

اسی طرح شاہِ ہر دہلی کا حال یوں لکھتے ہیں:

بکھیرا تھرکے اب عشرت کا مال۔ کہ کنّیاں [illegible] بے مثال

تخلص تھا آگ اردو کے شعر انتخاب ۔ وہ دہلی میں شاعر بھی تھے لاجواب
اور اک تھے یہاں خواجہ میر درد ۔ کہ دل اُن کے قول سے ہوتا تھا سرد
بھرا درد سے ہے سراسر کلام ۔ دوا درد مندوں کی ہے وہ تمام
ظفر بھی وہ شاعر ہوئے بے مثال ۔ کسی بادشاہ کو نہ تھا یہ کمال
ہوئے اور دلّی میں اک میر سوز ۔ جلے اور بجھتے رہتے تھے شب و روز
وہ سوزِ نہاں اُن کا تھا لا بیاں ۔ زباں سے نکلتا تھا ہر دم دھواں
وہ غالب زمانے میں یکتا ہوئے ۔ کہ غالب ہر اک پہ ہمیشہ رہے
یہ مومن بھی شاعر وہ انسان تھے ۔ جنہیں مانتے سب مسلمان تھے
ہوئے ذوق ایسے کہ تھا اُن کو ذوق ۔ کلاموں سے اُن کے رہا سب کو شوق
غرض موت کا سب نے چکھا مزا ۔ خدا کو بقا اور آدم فنا

یورپین ہونے کے باوجود شور نے اُردو زبان میں صرف اشعار ہی کی گل کاریاں نہ کیں بلکہ جا بجا ہندوستان کی خوب صورتی اور اس کی فوقیت کے مضامین بھی باندھے۔ چکبست، سرور، اقبال ایسے قومی شعرا نے اس موضوع پر بہت خوب لکھا ہے۔ جس کا مقابلہ شور کے کلام سے کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان نمونہ کے لئے ایک شعر حاضر ہے۔

نمک ایسا نہ حسن ایسا، زباں ایسی نہ آنکھ ایسی
غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی

شور نے ستّر (۷۰) برس کی عمر میں ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ اُردو اور فارسی کلام کے علاوہ اُن کی کچھ ٹھمریاں، دوہے وغیرہ بھی مشہور ہیں جو ہندی زبان میں لکھی گئیں۔

وقار خلیل

آہ ڈاکٹر زور

ایک پیغام تھا اک نغمۂ سازِ ہستی ۔ جوش در خشید مگر شعلۂ مستعجل تھا
اے دکن! وادیٔ کشمیر میں سونے والا ۔ تیری تاریخ تمنا کا دھڑکتا دل تھا
حال و ماضی ہی نہیں بلکہ بہ شکلِ اُردو ۔ زور کے ہاتھ میں آئینۂ مستقبل تھا

وہ زور دکن کا وہ چمکتا ہوا سورج ۔ صد حیف کہ کشمیر کی بدلی میں چھپا ہے
تاریخ و تمدن کا جہاں تاب خزانہ ۔ افسوس بہت دور کی راہوں میں لٹا ہے

صدیوں کی تراشی ہوئی تہذیب کا پیکر ۔ وہ سانولا شہزادہ قطب شہ کے وطن کا
اے بھاگ متی! تیرا شناسا نہیں ہم ۔ کشمیر کی وادی میں چھپا چاند دکن کا

حیدر آباد تیرا چاہنے والا نہ رہا ۔ اک جہاں تاب اُجالا تھا اُجالا نہ رہا
تیز رو وقت بھی خود آج یہ کہتا ہے وقار ۔ زور اُردو کا ہمالہ تھا ہمالہ نہ رہا

ایک سازِ حیات کا نغمہ ۔ سرزمینِ دکن سے چھوٹ گیا
پھول کھلتے تھے جس کے سایے میں! ۔ وہ تناور درخت ٹوٹ گیا

ڈاکٹر زور! تیری یاد کے پھول ۔ سرزمینِ دکن میں مہکیں گے
رند پی پی کے جامِ اُردو کا ۔ اور بہکیں گے اور بہکیں گے

آسمانِ دکن کے سیارے ۔ زور کا انتظار کرتے ہیں
آرزوؤں کے نو دمیدہ گلاب ۔ جان اس پر نثار کرتے ہیں

تیسرا پنج سالہ منصوبہ

بہر پلان رکھ لیا زر جوڑ جوڑ کے
کردیں گے عروج نوشتہ تقدیر موڑ کے

جنت سے ملک بننے لگا ہاتھ جوڑ کے
بیٹھے نہ کاہلی سے کوئی منہ کو موڑ کے

واعظ نہ رکھ دے آپ کو کوئی جھنجھوڑ کے
جنت میں جائے کیوں کوئی کشمیر چھوڑ کے

ہم اس جگہ بنائیں گے جنت کا گلستاں
دامن میں رکھیں گے گلِ مقصد کو توڑ کے

لاتقنطوا کا فلسفہ کشمیر سیکھ لے
رکھے وہ اپنے پلے میں زر جوڑ جوڑ کے

کوشش سے اپنی ہم اسے جنت بنائیں گے
کشمیر والے کھائیں گے پھل توڑ توڑ کے

قوت بڑھاؤ صاحبِ تقدیر بن کے تم
بدقسمتی کے ہاتھوں کو رکھ دو مروڑ کے

کشمیر و جموں اس طرح جنت نشاں بنے
سب آئیں دیکھنے کے لئے دوڑ دوڑ کے

جو دیکھے، دیکھے عدل سے یہ تیسرا پلان
دیکھے نہ دشمنی سے کوئی آنکھ پھوڑ کے

کشمیر کے چمن میں یہ بخشی کا فیض ہے
چھڑکا گیا ہے عطرِ ترقی نچوڑ کے

اللہ رے ترقیٔ کشمیر کا پلان
دشمن بھی دیکھ لیتا ہے منہ موڑ موڑ کے

اسکیم جاری کی ہے زراعت کے واسطے
رکھ دیں گے قحط سالی کی قوت کو توڑ کے

غلہ یہاں یہ پیدا کریں گے ہم اس طرح
اغیارِ ملک مانگیں گے سب ہاتھ جوڑ کے

ہم ایسا اپنے ملک میں کرلیں گے انتظام
سیلاب بھاگ جائے گا منہ اپنا موڑ کے

علمی ترقی میں بھی وہ وسعت عیاں کریں
طلبا بھی آئیں غیر ممالک سے دوڑ کے

قائم کریں گے صنعت و حرفت بھی اس طرح
جائے نہ اہلِ فن کوئی کشمیر چھوڑ کے

اسکیم جاری ہوگی تجارت کی اس طرح
ہر شاہ بہرِ عید یہاں آئے دوڑ کے

اسکیم جو بچت کی بنائی وہ اس لئے
بن جائیں لکھ پتی یہاں زر جوڑ جوڑ کے

امن و اماں بھی اس طرح قائم یہاں پہ ہو
چھینے نہ مال کوئی کسی کو مروڑ کے

دامن میں ان کے رحمتِ ربِ جہاں ہے
جائیں کہاں غلامِ محمد کو چھوڑ کے

ٹوٹے ہوئے دلوں کی ھدایت صدا یہ ہے
بخشی نے رکھا شیشۂ دل جوڑ جوڑ کے

حدیثِ دیگراں

حبیبِ محترم! خلوص و محبت

"تعمیر" کو آپ بڑی صناعانہ حسن کاری سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ کشمیر کے اس ادبی جریدہ کی روایتوں میں ادھر آپ نے جو یہ حسین اضافے کئے ہیں وہ اربابِ ذوق کے لئے دعوتِ نظر ہیں۔ مواد و معیار کی جستجو بھی ایک سلیقہ چاہتی ہے اور یہ سلیقہ مندی اپنی پوری تابناکی سے موجود ہے بہترین مواد کی جستجو اور ایک خاص معیار کو آپ نے شیوہ بنا لیا تو اس روایت میں اور حسن پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسے مجلّے جو درجہ دوم و سوم کے ادبی میلانات کی پیداوار ہیں، بہت ہیں اور ہمارے لئے مضرت رساں۔ ضرورت ایسے رسالوں کی ہے جو ذوقِ صحیح کی آبیاری کر سکیں۔ زندگی کے گوشوں کو اُبھار سکیں اور ادب کے تازہ اور افادیت سے بھرپور رُجحانات کی ترجمانی کر سکیں۔

فضا ابنِ فیضی

پیارے بھائی! خلوص و محبت

"تعمیر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت خوب بلکہ خوب تر ہے۔ آپ نے "تعمیر" کو قابلِ رشک بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ خدا کرے "تعمیر" اسی طرح نکھرتا جائے، سنورتا جائے!

خلوص کیش: آسی رام نگری

محترم انصاری صاحب! گل ہائے عقیدت

میرا تعلق ۱۱-۱۲- ایڈیشن سے ہے۔ سبھی کے خطوط آتے رہتے ہیں لیکن آپ ایسے پہلے ایڈیٹر ہیں کہ آپ کے خط کی تحریر میں بے پناہ خلوص کارفرما ہے۔ بے حد یگانگت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے اس پہلے خط سے ایک عجیب محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ کسی ایڈیٹر کا نہیں بلکہ کسی عزیز کا خط ہے۔ بقولِ مرحوم مولوی عبدالحق: "خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔" آپ کے خط کی پُرخلوص تحریر نے آپ کی سیرت کو میرے سامنے بے نقاب کر کے مجھے آپ کا گرویدہ اور آپ کے اخلاق کا معترف کر دیا۔

آپ کا ہی:- غفور سہسوانی

محترمی! آداب

"تعمیر" کا تازہ شمارہ زیرِ نظر ہے۔ اس دور کے نشیب و فراز اور اُردو زبان کے کسی رسالے کے اجرا کی کئی دشواریوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے "تعمیر" کو کامیاب بنانے میں آپ کی کوششیں قابلِ صد مُبارکباد ہیں۔ کسی ماہنامہ کا باقاعدگی اور سلیقے سے ترتیب دینا اور اس کا معیار قائم رکھنا، یہ آپ کی محنت و کاوش اور ادب و تہذیب کی خدمت کے پُرخلوص جذبہ کا ثبوت ہے۔

خلوص آگیں: نجمہ پرویز۔ گوالٹولی

بھائی انصاری صاحب زاد عنایتہٗ

سلام مسنون — جولائی ۱۹۶۲ء کا "تعمیر" نظر نواز ہوا۔ آج کا سرورق خوب سے خوب تر ہے۔ جس طرح کشمیر اپنی صاف و شفاف جھیلوں، برف پوش پہاڑوں، حسین مرغزاروں اور ناچتی گاتی و تھرکتی لہروں کے کارن غیروں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے بعینہٖ آپ کا خوبرو "تعمیر" ریاست کشمیر کا ایک ایسا واحد جریدہ ہے جو قارئین کو اپنی طرف کشش کئے ہوئے ہے۔ اور جس کے دیکھنے کا ہر کسی کو وہی انتظار رہتا ہے جو "انتظار" ایک عاشق کو اپنے معشوق کے دیکھنے کا رہتا ہے۔۔۔۔

مخلص: نشاط انصاری

اختر محی الدین

آپن ہور جنگ

(۲)

یہ اوس دوٕنٛ بٮ۪ا کھ محاذ۔ اتھ بِٹھ تہٕ اوس دوٕنٛ واریاہ کالہٕ بِٹھ جنگ چلان۔ موختہ آیہٕ اُمس پانسی سیتو گرا ووہوان تہٕ گرا ووران آسان۔ سہ اُمس وٕنکیس تہٕ ژٕورمیس پورس منز دیوان خان دارہ بِٹھ چکہ ژھایہٕ ہیتھ پرانین وانٛسن ہُند سونچان۔ زمانہٕ کوٚنت وٕوٚت۔ تس کاژٕاہ بٮ۪وارٕی اُمس موج کران ژھورِی زورہ اسنس بِٹھ۔ تس کیتھہٕ کٔنٛز اوس ہشہ ستی اُچھو بوٚن کُن ژھنتھ تہٕ کاژٕ نومرآوِتھ بہن آسان تہٕ از کوٚس تیاٚرِ چھے۔ سہ کتہٕ ژٕوز پردہ دارِی۔ سہ کتہٕ ژٕوز شرم تہٕ سہ کوٚت گوو حیا۔ دُنیاہس یہ بٔنہٕ ہا تہٕ تہٕ گرتہٕندین شُرین گژھ تہٕ اشرآفی سٔتہٕ۔ تم چھہٕ خاندآنی۔ تہٕندین گھرن منز آسہ نستہ ژٕومبہ ژٕومبہ تتھ زمانس منز یتھ زمانس منز نہٕ منزہ بڈین گھرن منز ژانگین تیل آسان اوس —— موختہ آیہٕ اُمس وٕنکیس تہٕ اُندرو اُندرِی جنگس منز مصروف۔

اُتھو منز بجاو ٹیلی فونن گھنٹی۔ موختہ آیہٕ آیہٕ یتھ حالس بٕتس اوس ٹیلی فون دوٕن اُچھن کران۔ سہ اُمس نہٕ امہٕ منزٕ ژاہٕ نہٕ کانہہ کتھ بوزان تہٕ نہ اوسُس پورہ اُمس سمان کتھ کرنس۔ ٹیلہٕ نہٕ پرونٛٹھ کنہٕ آسہٕ، کتھہٕ کس سیتو کرِ انسان بٕتس اوس ٹیلی فونک ریورہسس تہٕ کنس کُن نیرٕت بدلی باسان۔ بٕتس اوس ٹیلی فون اٚن——

"بِتا رُدسلیا۔" موختہ آپن وِرٛ کٔرنِکھ۔ "رُدسلیا، کوتُو گوکھ؟"

"ہوو۔" رُدسُل لاژٕھن اُنِ وَو۔ "یکیاہ حضن چھُس۔ دیوان خان اُژِتھ ییلہٕ تمٕ ٹیلی فون گھنٹی بُوز، تس بِسٛوٚ کوٚٹھو بٕتس تورٛ فِکرہ زِہ شوٚہٕٹس چھہٕ ٹیلی فونس بِٹھ کتھہٕ کرنہٕ۔ سہٕ اوس اتھ مندچھان، سخت مندچھان۔

مندچھان مندچھان تہٕ دوٕ شلان دوٕ شلان تُلُن رُدسُل لاژٕھن رسیور تہٕ وٚوٚنُن تِتھہٕ کٔنٛز یتھہٕ کٔنٛز لانژِھ ونان چھہٕ—" ہلو— و۔" یہن اُمس تمٕ طوسی صاٚبس، مجید صاٚبس تہٕ جلیل صاٚبس نِشہ بُوزنہٕ مژ—

اورٕکھ بوزنہٕ رٕوستوٚی وٚوٚتھ رُدسُل لاژٕھ۔ "کُس چھُوہ؟"

تس گیہٕ کنن زنانہٕ کتھ۔ تمِ بُوٚژ کیاہ تام تہٕ توٚرے آیس پراٚژہ وہراوِنہٕ۔ موختہ آیہٕ گیہٕ آنتہٕ۔ "کُسو چھہٕ؟"

رُدسُل لاژٕھن ترٛود ٹیلی فون بیتر۔" یہ حضن اُمس طوط لالہٕ۔"

موختہ آپس گوو کورہ ہُند ناو بوزنہٕ کورِ سیتو جنگ مُشتھ۔

"کیاہ اُمس وٕنا؟"

"[illegible]!" رُدسُل لاژٕھن دِیُت خوش گژٕھت ییل گوٚو بہ چھے ٹیلی فون سوان زور چھہٕ۔ امہٕ منزو چھا حق کنہٕ [illegible]۔ یہ وٕنگس طوط لالس وٕنمِتھ تہٕجز ناآوِ ج آما، جشن بہ پرِ تہٕ تاتان—"

... کیاہ ... موختہ آپس ... کرِتھ تام ... — زیٚرٕ
ژھکُنٕہ آو ۔

"شیٚپھے حاٰم حعل ۔" رتُوشل لاٹرحمن وٕنٕن ٹیلی فونس کُن وُچھتھ ۔
"آدہ کیاہ چھِس وَنان زِ یہ حق چھُ ژٕ دَرٕ بتہ وُکن ہُندٕ ٹیلی فون
شیٚپھے بٕڈِ کتھہ چھِ کران تِہ ۔"

دِیُوہ آسن ـــ موختہ آپس ییٚتھ ۔ تیٚہ اوس اڈتام پُشوی،
پورٕ ٹیلی فون وُچھنس تہٕ اتھ منٛز تہٕ آسن نہ کنہہ کتھہ بُوزٕنہٕ یا
کرنہٕ ۔

موختہ آپ پٕٹھ یا بیٚیہ خبر کیاہ کیاہ سوچٕنہٕ ۔ ظاہر چھِ یمہ وَشتھ
ظاہر شد نش ہُند یا طوط لالن مگر رتُوشل لاٹرحمن ویشس
نہ کیٚنہہ سوچٕنہٕ ۔ شہ یوٗتُس آتی باقی اشرافن گرن ہُند اَنزرٕ
تہٕ گُزرٕ ۔ شہ اوس وانیاہن عمہ چھِ گرن الدان تَران تہٕ تو یہ
پیٚیر بوٗ موختہ آپس تہنٛد رژر وَنان یا واگیی وَنان یا نوشن
کوریٚن ہُندٕ معاملہ وَنان ۔ ڈکیٚس تہٕ یوٗتُس شہ خبر کیٚہ چھِ
گرُک وانَن پیٚنہٕ ۔ تہٕ موختہ آپ پیٚٹھ ڈیٚچھ موٗتس بتھس
ذکر تہٕ وِنہٕ برنہٕ تہٕ بُوزنہٕ فیصلہ دیٚنہٕ ۔

آگن ڈیٚڈِ گو وُمدا ۔ موختہ آپس گیہِ کُن کمرا ۔ تیٚہ وُز
پیٚک تُلنہٕ ۔ طوسی صاحب اوس آسہ ڈکوان ڈیٚڈِ الدان ۔ موختہ
آپ پیٚٹھ حیاسان ۔

ہیٚنوکُنٕمتہ روٗت طوسی صاحبن گوڈنے رتُوشل لاٹرحمن ۔" ژٕ
چھُکھ اوشکہ وٕندان ؟"

"شیٚپھے کر حق ؟" رتُوشل لاٹرحمن وَنن تہٕ تا [illegible] ساں تہٕ بیے
[illegible] موختہ [illegible] وُنعا فسِس ۔

"بتازٕ [illegible]" طوسی صاحبن وَنن تہٕ وُنیتہ کُن
[illegible] رومستی [illegible] تنگ کوٗز واس ۔

"شیٚپھے یہ اوشکہ ... ؟" موختہ آپن کُگھو کریان تہٕ للٰر [illegible]
رتُوشل لاٹرحمن کُن ۔

"شیٚپھے یہ حق چھُ شل [illegible] ۔" رتُوشل لاٹرحمن اوس وَنان
[illegible] ٹیلی فون چھِ کرِکھ دِیان ۔"

طوسی صاحبن بُوزٕ رتُوشل لاٹرحمن یہ [illegible] تا یہ [illegible] ۔
[illegible] وَنان ۔ [illegible] ۔ زٕ بے

دمہ کوٗرُن ۔

موختہ آپس تتہ بُکرِ ژرمیٚہ چھُ تا ہیوٗ روشن دان ۔ سہ ژہُس
ژٕ چھِکھ یہ کوٗرُن ؟"

"بہ اوس [illegible] نا ژوٗرکی چھُ [illegible] کُنہ تھت ۔" یمہ وَنن [illegible] طوسی
صاحبن گمرِ دَنان وَنٲنی پھیرِ ژِ زٕ موختہ آپس نِش [illegible] ۔
بہ گوٗس تہٕ تمِس نِش ۔ یمہ گیہِ خیال زِ طوط لالس نِش وِ یہ نظر
تہٕ آیہ [illegible] بہ ڈیٚڈِ شرامن " شہ اوس ادبہ نیران ۔ [illegible]
نظر چھِس اَچھ زِ ژھینِن بون کُن ۔ تَدان تہٕ معدان آمہ سلام
کرنم تہٕ [illegible] اتھس تھپ کرِتھ دیان خان ۔ اتھ [illegible] اوس
اڈکرتا وِ یہ تہنٛدِس حقس منٛز فیصلہ ۔ [illegible] کرہ چھِس ٹیلی فون ۔"

"بہ چھُس شرمندہ ۔ میٚنہ کرِم معافی دِنی ۔ آپ چھِ [illegible]
کرتھ چھِس گو زٕ کنڈِتھ سلام وَنیُو ۔ امہ پتہ واپن [illegible] ۔ ذکر [illegible]
تس وٕنن میون زِ یہ ژٲنن [illegible] تہٕ آسس کرِو [illegible] ۔
میٚجہن میٚنہ معافی تہٕ سلام اتھ واس کرِتھ دراو وَتہٕ ۔"

یہ وَنتھ طوسی صاحبن تھوٗو [illegible] ۔
کتھ آس یہ زِ طوسی صاحب اوس ڈاڈتھ [illegible]
گوشت ۔ تس اوس [illegible] سیٚنو [illegible] دٔلی بجہ مقدر ۔ اتھ [illegible]
سفارشہ ہُند ضرورت ۔ تہٕ خانداز اشرافن [illegible] طوسی
صاحب سیٚنو دُوی طوط لالن واریو ۔ اتہ اوس [illegible] تیاری دیان [illegible]
حق [illegible] تہٕ اَندو اَندو آسس داریاہ افسر ۔ طوسی صاحبن [illegible]
نیابہ سالن سیٚنو دُوی اڈن مگر [illegible] چھراسہ [illegible] —
"شیٚپھے بٕڈِ بیا ۔ کوتہ [illegible] سیٚنو دُوی پکان ؟"

طوسی صاحب گیہِ [illegible] تام ۔ چھراسہ [illegible] —" ژٕ [illegible]
[illegible] ایران اتہ ہیٚتھ صحب [illegible] چھِ کرانی ۔ طوسی صاحب [illegible]
زِ [illegible] چھُ صحبس [illegible] کرِکہ [illegible] ۔ اوتہ وَنن [illegible] —
[illegible] تیٚلہِ آدہ بہ محلہ خان ۔"

چھراسہ اوس [illegible] ۔ " [illegible] ۔ یہ [illegible]
[illegible] بیگم صاحبہ ۔ [illegible] اجازت [illegible] تیٚلہ [illegible] ۔"
طوسی صاحبن وَنن [illegible] تہٕ چھراسہ [illegible]
[illegible] طوسی صاحبس آسن پرُ [illegible] ۔ [illegible] تہٕ [illegible]
لاٹرحمن ۔ طوسی صاحب گیہِ [illegible] مگر [illegible] ساب آسہ [illegible]

[illegible] نالہٕ [illegible] پانہٕ - وولا اژھو !"

چھرٲسن [illegible] مقنہٕ ژیٖتہٕ- طوسی صابس گژھن نہایت اُدٕیہٕ سالن ٲنٕس شرکیبی تہٕ ژونن محلہٕ خانس منز- اتہٕ یاٗو طوسی صابن ژیٖنیاسے طوطہ لالس- طوطہ لالن کٔر گنٕتی- چھرٲسو ژراو- تس ژونن صحبس وَن [illegible]۔

کیوٗژھ کالاہ گوو تہٕ ادٕرہ ژراو طوطہ لالن خانہٕ دار- طوسی صابن نظر پیٖتہٕ ژونن تہٕ تتہٕ طوطہ لالہٕ تہٕ بیہہٕ — "تۄہہِ کیتھہ مصن کہو [illegible]۔"

طوسی صابس ژیو ماد تہٕ موجوب سلام پیٚرتھ سیٖتی دوقس کوڈر [illegible] گژھن نہٕ ادٕرہ سلام تہٕ ژیوٗن تہٕ ظاہر کرہٕ ہاتہٕ تہٕ ہیٚنہٕ [illegible] کتھہٕ تہٕ طوطہ لالہٕ سیٖتی آسہٕ ہا۔

طوطہ لالہٕ ژٕ وژھس — "ٲسہٕ چھیٚ مقدمہٕ کاشکارن سیٖتی تتھ [illegible] تہند ٹیٖلی فون کرُن ضرورت۔"

"اُدٕ تہند گژھ میٚہٕ یاد پاوُن۔" طوسی صابن نہٕ امیٚژ وۄتھ طوطہ لالس کُن — "بوٗ کرہٕ۔" امہِ پتہٕ اوٗسن تہٕ اسان اسان وۄنُن طوطہ لالس — "بیٚیہٕ چھا کینہہٕ حکم؟"

"بس شکریہ!" طوطہ لالن کوڈ نخرہ — "تہٕ بڑیوٗ۔"

"تۄہہِ اسم گوو کتھہٕ ونہہ یوٗرکُن۔" طوسی صابن نہٕ امیٚژ [illegible] گوو طوسی صاب نشتہٕ۔

"نہٕ وۄنکیس نہٕ" طوطہ لالہٕ وۄ شلیہ۔ "بیٚنہ نا۔"

اسان اسان وۄتھ طوسی صابن زٕ امیٚژ تہٕ گوو دیوان خانن۔

"آپہٕ چھا وانسہ۔" طوطہ لالن ووٗن تمیس۔ طوسی صاب گوو [illegible] کتھہٕ خوش۔ تس ٲس تہٕ طوطہ لالہٕ [illegible] سو طوطہ لالہٕ پیشہٕ یاسان [illegible] تس کورٕ ٲس تہٕ یوس تمیٚو رچھمژ ٲس۔ تہٕ اوس سپُن تہٕ طوطہ لالہٕ ٲس صحیح بیتر گوو لے — بیگم صاب۔ پتہٕ طوطہ لالن آپن [illegible] زایہ چیٖنٹہٕ بینہٕ تہٕ طوسی صاب گوو خوش تہٕ بیگم صابہٕ چھیٚ کیاہ [illegible] یاد — غیرا کی سبب کرہٕ سفارش۔ تہٕ وۄتھس۔ [illegible] وانسے چھیہ تہٕ۔ ویٚپ صحت چھُس نہٕ ٹھیک روزان۔"

پیٚہ وقتن طوسی صابن طوطہ لالس پیٚترس حالس پیٚنٹہٕ رحم اَنہٕ [illegible]۔ "کیاذہ؟" طوطہ لالہٕ وژھس۔

[illegible] پیٚہ کورٕ [illegible] — طوطہ لالن کاٚ [illegible] تمہِ [illegible] شیٖتہٕ گمنٕ چھس پیدا ٲسی وژھس — "اَدٕ کیاہ چھیٚنہ [illegible] صحبس- انسپیٚ بوٗ تہٕ آیس ژھتہٕ دٕ چھوٗ۔"

طوسی صاب گوو خوش۔ طوطہ لالس پیٚنہِ ظاہر کیٚو تورٕ وانتہٕ یاسیٚہ بوٗ چھس پیٚہ گھرہٕ گوٗر۔ بوٗ چھس پیٚہ گھرن تہٕ پاچھر تہٕ بوٗ چھس یپی گھرن صحبس یاگوٚ وژھ۔ تہٕ دراو جلدی رخصت [illegible] دتہٕ پیٚنٹہٕ اکہِ واتہٕ پیٚنٹہٕ کوٗرن گھرہٕ ٹیٖلی فون تہٕ طوطہ لالہٕ وانتہٕ وو۔ جان انتظام کٔرو تہٕ ژوس تس اوس وہم تہٕ طوطہ لالہٕ گژھہٕ چھیا نہٕ گھرہٕ وانتہٕ بدٕ ژیٖتی۔ تور پیٚنٹہٕ وانتھ تہٕ تتہٕ گژھ چھہٕ موتعتہٕ آپہٕ تمیس نوہ شرہٕ کینہہ کیتھہ پیٚنٹہٕ ژکھ کھایہٕ۔ ٹیٖلی فونس پیٚنٹہٕ پیٚہ رۄنشس لانژھن اوٚرک بٔرنک کیاہ تام وۄنس، تمۄ نونٕ مناسب مانگس کٔرن، تہٕ مانگس پیٚنٹہٕ جل جل گھرہٕ واتن۔

جنگ تہٕ گوو پۄرٕ وی۔ مگر طوطہ لالہٕ ٲس موتعتہٕ آپس کوٗر۔ انتہا مزٕن رۄوٗز اُدٕرہ یور روشہٕ روش مگر دۄہے تہٕ ما روزہٕ۔ بیٚیہٕ ٲسہٕ وو نو طوطہ لالن تہٕ نصیحت رٔٹمٕژ۔ پیٚہ شرییٚچ موتعتہٕ آپن تہٕ ستھان سوچایٖ پیٚنتس اولاد دود وتھ تن۔ سو ژھ خانہٕ دارس — "طوطہ دٕ چھتھ۔ وارسے چھا دۄندہٕ سہ زٕو۔ میٚون کیاہ وۄنُنے؟"

پیٚہ دنان ونان ووتھ موتعتہٕ آپس اوٚرش تہٕ سیٖتی سیٖتی میٚوٹھہٕ رۄنشس لانژھن تہٕ تراوُن۔ طوسی صاب گوو لتھ خوش۔ تہٕ وۄتھ "گھنٹس پۄر وژھہ تمن چھن خیر پاٹھہٕ۔ پیٚتہٕ پیٚہ پیٚنٹہٕ وۄنس وو یس تس منگ معافی۔ وۄن پاک وۄیس پیٚرتھ تہٕ دوہم — ادا ماٹیہ پکوٗ بوٗ تہٕ ہا واتے وۄنو۔"

پیٚہ کتھہٕ پیٚنہ موتعتہٕ آپس درادن وۄداہ۔ امہِ پتہٕ لوٗر تہٕ تمہِ کینہہ سو ٲس وۄدان۔ تس ٲس طوطہ لالہٕ پیٚرمژ ہا کتھہٕ تہٕ وۄپریچ کتھہٕ چھنہٕ۔ رۄنشس لانژھ تہٕ ادن وۄدان۔ تہٕ طوسی صابن [illegible] پیٚہ پیٚتر گوو دٕکار گرتمو پیٚنہت وۄنُن — "دود وۄتھرن [illegible] بیٚتھو۔"

"بوٗ چھس پیٚنہ یاز کھیٚون — [illegible] بوٗ ژٔن تالہٕ ہیٚتہٕ کرا ہم۔"

[illegible] — طوسی صاب ادس وِهان۔

پنڈو یا کھو آیہِ طوطہ لالہِ۔ موشِن کُرِ لیٹہِ پیٹھِ ژندا۔ رُدِ شِل لانژعس، موختہ آپن تہ طوسی صابن وانِج ژُوڑھہ پیوہ پیٹھہ دَو۔ رُدِ شِل لانژعس ادس اُوش وسان۔ موختہ آپن آسہ مقدِرہ پیہ بیٹھ تہ طوسی صاب ادس کاشکارن سیتو مقدمہ زیٹان۔ طوطہ لالہِ اَیہِ ژیٹھ۔ موختہ آپہ تہ رُدِ شِل لانژعس دوِیہ نہ نانہِ ژبس۔ مگر دوِ شُوسے گیِنہِ رودُ۔

طوطہ لالہ اُس کھوٗاب پیٹھ رُدِ ستوہی فرق لاگتھ۔ سو اُس قصہِ قصاپہ وناوِ بیٹھاوِ درج کرِتھ۔ تس اُس بجِس اناسہ نیتھ۔ سو اُس تہ موختہ آپہ تہ تسورِ طوطہ لالہِ موختہ آپہ ژکیہِ۔ سو گیِہ دُو ژیتس منز۔ مگر طوطہ لالہ آپہ اوِسے دوسان دوسان تہ ژُن موج تال متہِ بیٹس کَنڈس نانہِ موت کرِتھ ژامن پانے اعتَس تقب کرِتھ سو اہرہِ منز۔ تہ اتہِ لاجس زن عدالت۔ ژیہ اُسکھے داِرسے؟"

"اَمی داِرسے۔" موختہ آپہ اُس ژُواتہِ سندو یا کھو آنکار آنکار کران۔ سو اُس تُلوِ مایہ طوطہ لالہِ تیِن دوِ ژیِن نمن دُوچھان۔ تس اُسو کبرس تیرِ کنڈِو ہی پھٹان۔ تہ کیازہ تس پیٹھ کنہ اُسو ژیہ دوِیہ موہیوو بہیتھ — اکھ ڈیور تہ اکھ پیر اُسو — طوطہ لالس اُس کھو پیٹھ پُٹ پھٹیکس بیٹھ پیٹھ تہ تتھ کُن اکشس تہ ییچی۔ موختہ آپن شوکک، فراقہ منزِ ادس لینہِ پدان طوطہ لالہِ اُس بینیہِ ترُوو۔

دوسے اُس قہوہ کران تہ منزِ منزِ طوطہ لالس کُن اُچھ تلان زِ کرِتھ ناغہِ یاتھاہ۔ مگر طوطہ لالہ زنتہ تس تہ تہی ناتھ — رُدِ شِل لانژعہ ادس ہوو کُن پھتھ کھٹِرو لدِ ہرُ دُسندہ یا کھوٗلٹ گُوان ژیہ پیہِ ناوِیم نا — مگر طوطہ لالس آسہ ژِ تورکُن نظر سے دوِ وتھان۔ طوسی صاب ادس عمرہ منز اَز گو ڈیچھ لتہِ پانہِ انتظام کران تہ طوطہ لالہِ کھیٖن چینک سنتر کران۔

کھٹس کنڈس بیٹھ طوطہ لالہ۔ ژھٹو تُوی قہوہ پیالہِ اَکھ چوان۔

مگر بیٹھ موتی دِ بالکل تہ کیا تیہ تیلہِ لگیس زیر تہ پہاڑو پیٹھ کھاپہِ کیٖنہِ۔ کھیٖنہِ کھنشو وزیہِ طوطہ لالہ۔ دتھ پیٹھ موختہ آپہ اندو اندو کھتن پیٹھ پیٹھ ودِ — طوطہ لالس پھِر ساگری بیگم صاب وتان۔ طوطہ لالہ چھہ ریٹس عجب وتان تہ عجب کیٖنہِ طوطہ لالس وزاہِ کھانِ۔ ییو آپہ سارینے کتھ موختہ آپہ تہ غاطہ تووہ۔ یین ساری کھتن پیٹھ گھسے یا موختہ آپس ژکہ مگر پیٹھ اتہِ پھ۔ اذ اُس تمہ وا ریاہ کانہِ کوِر بیچھ تہ پیچھ۔ اذ اُس طوطہ لالہِ دُوچھان۔ اذ گوِ طوطہ لالس سورُی معاف۔

طوطہ لالہ اُس دُوچھان۔ موختہ آپس اُس اکھ شادی۔ وا رِیہ دہر و اُس تس محلہ چیٖن شہر بیٹن نوِ توپ لایو۔ اذکرِم سو پیٹھیس ژرِس ستہ ناو لیٖس سار وی نا وُ کھوِ تہ کھوو تہ دا ژوکی آسہ۔ واسے صدرۃ المنتہا پھنہ انسانن ناو آسان، تتہ کیاہ ذالہ اسو سندیٖن پیٹھ۔ تمہ ہیوت دوِ بیٹے ستھس وُچھتھ قران پڑان۔ تہ قرانہ منزہ ناو ژاپرِ۔ اگر طوطہ لالس نیچو ناو (تہ زِ نیچویُ تہ کیاہ) خدا صابس پیہ موختہ آپہ تہ بیچھ کُن عادتہ چیٹھ کرِ تس موختہ آپہ یتو منزہ کانہہ ناو۔ تتہ اگر کھوٗ ژینس (تیہ) عذرس چاوتن۔ میوہ چھ زِ لی، تہ تیہ نیشہ وینہ تتن خدا صابہ نجات اِم تیلہِ کرو تس یتو منزہ ناو۔

موختہ آپہ اُس دوِ بیٹے ستھس وُچھتھ ناو سوٗ پیرادان تہ یاد کھاوان۔ سوٗ دوِی دنیاہ ادس یتہِ کاروبار چلاوان۔ طوسی صاب تہ ادس کالہِ اکھ مقدمہ زیٹان تہ پگاہ بیاکھ مقدمہ ادان۔ تس اُسو کاشکار ژاپیو منزِ گرِن ہی ژلان۔ اکثر ادس ژالس اندہ پیٹھ سادِ تھ پزِ کھالان تہ اَکو آسس اَکھ پچھ کھوتھ ژلان۔ ژم دوان تہ دوِیہ گمِہ کران۔ اکھ دوِ پیٹھ ژعا منز ادس طوسی صابس منزِ منزو ژ امتر مسترِ ژیت کرِ تہ مُزو منزِ ستر ژیت۔

رُدِ شِل لانژعہ تہ ادس سخت آوز۔ ستہ ادس دوِ دوِ حسن

...س زِ پانژ ... ہیوان، روٹھِ کھنڈ تہٕ ھیوان تہٕ ... کوشن کرِتھ پُرِتھ مینژہ پھوٗل تہٕ سینی منتھان۔ کتھا یہ کران تہٕ ماسیٖ ... وٕنان۔ شہ اوس دوہ ڈوٗ ہو گل تہٕ کیا زِ تس اُس موخت آپن ... کام پیٚشر آوٕ مژ۔

موخت آپہٕ اُس دوہس دہن پیرن گمرہ اننا وان تہٕ تمن پُرِتھ بیریٖن ہیوان یا مینژہ پھوٗل ہیوان۔ سو اُس اتا گو پیٹھ روٹھِ کھنجہ انناوان۔ تمِہ اُسو از تام واریاہ لِٹہِ بھکو آب ڈیہ اُنہو۔ یم ساری چیز اُس سو رنٚوشل لانژھس اتہِ طوطہ لالس سوزان زِ تمہ وقتہ گژھس آسایش سپدٕنۍ۔ سو اُس خدا ماپس قسابہ واٗلی دا ٗلہ منگان زِ طوطہ لالہ چھہ، سہل کرٕ زٕ ٹیس۔ سو اُس طوطہ لالنِس منٛزِس کتھو دِنہٕ زِنگہِ تہٕ دیہہ قسمہ چیز سوٗمبران سو اُس پرٛنِتھ دوہہ رنٚوشل لانژھس پرٛژھان زِ طوطہ لالہ ماچھہ ہنو ہیرٕ؟ تمِس ما چھہٕ کانہہ غم؟ روٹھِ کھنجہ ہن کھنیہِ نہٕ؟ مینژہ پھوٗل منتہِ ناوو زِہن یدٕ — یہ دِتھو تعب جکٕ آب؟

"اِہن حقٕ۔" رنٚوشل لانژھ اوسُس ونان۔ "وارہ پاٹھو حق اُس۔ تو تام اُس کمن تام خوطن سیتو تہٕ بیتھوی یو وچھنس خواش گیہ۔ پرٛوژھنم یہ دِتیاہ آپن۔"

"ژہٕ کیاہ ونتھس؟" موخت آپہٕ اُس زن جنتس گژھان۔

"میہٕ حق ونٛوپُس اَوہ آپن دِتیم..." موخت آپس اوس اوش وسان۔ رنٚوشل لانژھ تہٕ اوس اوٗش ترٛاوان مگر ابڑوی نتہٕ اوس سہ طوطہ لالنٕ گژھان تہٕ نہٕ اُسس سو یم کتھہ پرٛژھان۔

سہ گیوٗدٕ گو ڈٕہ گوٕڈہ۔ بڈہ خوش ... ٹھو۔ روٹھِ کھنڈکہ گدس ڈٕلیتھ چندس منز ہیلتھ۔ و تہٕ پکان پکان گلہٕ دِوان تہٕ بٛاکھت ونان۔ ییلہِ طوطہ لالنٕ ووت اتہٕ پیٚو ڈٕلیہ پینٹھی اُکس پٛلہ واٗلس منز ییلہ۔ اُمو دیت نہٕ رنٚوشل لانژھس اندر اژنہٕ۔

"ہے میہٕ کیاہ کو رُدی ژٕہٕ —" رنٚوشل لانژھن دنیوس پینٛژ کھوتکن وژلیہ دِتھ۔

...

"ریوٚخ گژھ۔ پٛلہ واٗلس اُس ظاہر اہنٛدِس پیچہ ہندِس پیٹھ ژکہ کھٕژٕ ہیرٕ۔

"میہٕ چھے روٹھِ کھنڈ اندرٕ آپہٕ ماپس دِنیٛ۔" مگر پٛلہ واٗلی موٗس نہٕ کینہہ۔

"پرٛژھ نے چھے وٕچھتہٕ کیاہ چھیم چندس۔" رنٚوشل لانژھن کڈ چندہ منزہ روٹھِ کھنڈ تہٕ ہاوُن پٛلہ واٗلس۔ مگر پٛلہ وول آو وٕٹھنہٕ۔ دوہ ڈٕ کرٕنس رنٚوشل لانژھن پینژکھ رو پیہ داب۔ "یہ ونے منشر ماپس۔ یو چھسے تس ہش موج۔" مگر یہ ونس پیٹھ ہیژ پٛلہ واٗلی رنٚوشل لانژھس تعب کرٕنہٕ۔ رنٚوشل لانژھ کھوژ زِ دوہ ڈٕ لگہِ جیل۔ شہ ژول۔ پٛلہ وٕول دودیٛوس پتے۔ رنٚوشل لانژھن کڈ ڈکھ۔

شہ دوہ تہٕ یہ دوہ رنٚوشل لانژھ اوس نہٕ امنہ و تہٕ پکان۔ روٹھِ کھنڈ تھاوُن واریا ہن دوہن چندس۔ موخت آپس وٕنُن کھوژی کھوژی اُنہٕ زِ دِژم طوطہ لالس۔ کھوژان اوس زِ طوطہ لالس پرٛژھ کنہٕ پاٹھو آپہٕ تہٕ ییلہِ سو نکار کرِیس شوٹھس پینن پیزار۔

مگر طوطہ لالہ اُس خبر کمن ستہ سنگن ژھایہ۔ موخت آپن زون زانہہ ضرورت تس پرٛژھناوٕن زِ فلانہٕ چیز پھٕستانہِ چیز چھیہ وانان۔ رنٚوشل لانژھ اوس مژس منز۔ شہ اوس موخت آپس نِشہ شیٖرینو پھٕلو نِوان، تِم کھیوان پانس تہٕ دوہس کنہٕ یا غم ہنہٕ منز نینہ دراہ کران تہٕ شامس گمرہ اُژِتھ موخت آپس پرٛنِتھ کنہٕ سوالس رٕت جواب دِوان۔ شہ اوس موخت آپس لِشہ پرٛنِتھ مینژ نِوان تہٕ سو بیٛنہِ کانہِ خوچہ کوٗرہ یا نوشہِ سینس منتھان۔ چھمکس آبہ ڈبس اوس شہ بازرس اندر ترٛیٖہ ژور آنہٕ وٕٹھان۔

موخت آپس اُس نہٕ خبر زِ طوطہ لالس گژھیم رنیتھ چھہ۔ رنٚوشل لانژھن اوسنس گرا وونمت یانژم تہٕ گرا شیٖتیم۔ تس اوس نہٕ پانہٕ زانہہ تہٕ موقع آمت طوطہ لالس پرٛژھنس۔ تمِہ اوس اکہِ لٹہِ طوطستی صاحب تس رخصتس شوٗزمت۔ مگر سو اُس نہٕ

آڈر۔ دٔدیپت اوسنس زٕ گھرس کیاہ کرٕ۔ صحب چھُنہٕ میٚہ وراَے دفترٕ نیرنٕ خاطرٕ تہٕ تیار گژھان۔ یم نوکر بٔے چھِہ تِہِندِ لایق۔ یہٕ کتھ اٚسۍ موختہ آپن اسان اِسان شوٗرپاوٕ مژ۔ تس اٚس پڑھ زٕ از چھُ پگاہ طوطہ لالہ پیہ بلنٔے۔ یلہِ وکھتن ریٚتھ وائینس تیلہِ لگیس نہٕ چارہ کانہہ۔ گوڈنیوک ییِن ما ہیٚنوکُن وارٕیوس منز وٕت تہٕ بیہ تہٕ کرِتھ تتہٕ کٔس چھُس لیٚس پھُٹ کرِیس۔

یہٕ سوچِتھ اوس موختہ آپن دٔویمِس پورس منز اکھ کُنڈ آیہ تہٕ کوٗرمُت نیٚبرٕمُتس راے اٚس زٕ طوطہ لالہ پینیہ لوسہ۔ تمہ اوس تتہٕ نوٚو سَرٕ گِھہ کرنومُت۔ تمہ اٚسو تتہٕ رنگہ رنگہ چیز تھاو مِتۍ یِم پرٛیٚسن وِزِ یا لوسہ تانس منز اکار بکار لگان چھِہ۔ تمہ آسہ ساری تیارٕ کرِتھ تھاومژٕ۔

مگر اکِہ دوہہ زن پینیہ موختہ آپس ترٛٹھ ہِش۔ سو اٚس دیوان خانس منز دارِ پیٹھ چکہٕ ژھایہ بِہتھ کیاہ تام سوچان۔ اُتھو منز گوو موٹرک صداہ۔ تمہ کوڈ دوپٹہ زٕ طوطہ لالہ ما پینیہ وأتھ۔ سو گیہ خوشس تہٕ دورسے یہ یوان تس بُتھ۔ مگر سو اٚس نہٕ۔ ڈیڈہ ژاو اکھ دوہ پرمرد۔ موختہ آپن تھاو بُتھِس پُرژہ نُنہٕ دولہ۔

"یہ حعن آس تہٕ پہ نادس —" دوہ پرمردن وٚون۔ یہ اوس ڈیور۔

"کیاہ حعن زٕ؟" موختہ آپس گوو کیا تام تلواس ہیوٚ زٕ طوطہ لالس ما گوم کینٛہہ۔

"بیگم صاب حعن گیہ خلاص۔ کوٗر زالیس۔" ڈیورن دٚون۔

"کر؟" موختہ آپس پینیہ اَتھہ منزہ پُرژہ نُنہٕ وٚسی۔ سو پرٛژھہاڈیورس زٕ طوطہ لالہ کوٚر آیہ یور پرٛیسنہٕ مگر اکھ اٚس یہ مند چھُ تہٕ دٔویمِ دیٚشس نہٕ تمُ موقعے۔ "رات شامس حعن نوٚو بچہٕ۔ نرسنگ ہومس منز۔"

"اما تہٕ کیاہ گوو نرسنگ ہومس منز؟" موختہ آپن سوٗنچ۔ تمہ پرٛژھ ڈیورس — "کتہٕ؟"

"نرسنگ ہوم حعن۔" ڈیورن وٚون مگر سیٹھی نرونُن زٕ آپس توٚرنہٕ فکرہ تُوسے وٚنتھ وارٕ —" ہسپتالس منز حعن۔"

موختہ آپس گوو اچھن انہٕ گوٚٹ۔ تھٔنسہ طوطہ لالہ اٚس ژٕوہ بناوتن ہسپتال وانن لٲجہِ۔ خبر طوطہ لالس کیاہ آسہ بنیومُت۔ ڈُرہ بٔے سو

لوکٹ تہٕ مومُت اٚس تہٕ۔ موختہ آپس اٚس نہٕ خبری زٕ یہ کیاہ کیو دو ژ۔ مگر دٔوشل لانژھ اوس اُتی۔ سہ کھوٚت وَدان وَدان ہیٚور اوپرٕ ووٚلُن موختہ آپُن بُرقعہ۔ موختہ آپن رِٹ بُرقعہ وو ڈٕہ تہٕ دٔوشل لانژھ کھوٚت موٹرس تہٕ درٛاے۔

دتہٕ وتہٕ اٚس موختہ آپہ اولاد دٲدِس منز مُبتلا۔ موٹرٕ اوس نوٚن نوٚت پکان نتہٕ اٚس دَتھ نیٚبٕھان۔ طوطہ لالس اوس خبر کیاہ حال مگر دُنیاہکۍ لُوک کاتیاہ بے عار چھِہ۔ یِم چھِہ از تہٕ وانن پیٚٹھ بِہتھ یِم چھِہ از تہٕ پکان، اسان تہٕ اٚش کران۔ وُچھہ یہ ٹانگہ وٚڈِل زانہ گوو سیٛہ منز وتہٕ بند۔ وُچھہ ہٕہ باٹہ مازہ وٚڈل ما چھِہ لوٚت پہن کرٛکہ دِوان۔ موختہ آپس اوس دُنیاہ تاوٕن باسان۔ تمہ وِچھ اُچھہ۔ رٔوشل لانژھ نِس پھِٹکس پیٛٹھ تروٚوُن کلہ تہٕ اوٚش چھِس جویوٚ یچھہ یوٚ وسان۔

موٹر ژکیو وِزٕی یٲٹھو ہسپتالس منز۔ اتیتھ اٚسو داریاہ موٹرٕ ٹھیہ۔ موختہ آپہ درایہ موٹرٕ منزٕ تہٕ کلس منز ساپہ بنزٕ فکرہ ہیٚتھ ہیٚو تھٕ برونہہ پکُن۔ ژٕ جوراہ اٚسو کتھہ کران۔ اکھ اوس بیٚنِس وَنان —"یہ بیگم صابہِ ڈُیو دوہ لہٕ نیر صحب چھِہ تیار نیرنس۔"

موختہ آپہ سنہٕ ہانہٕ مگر یہ اٚس بیگم صابہٕ ہُنز تہٕ صحبہ ہنز کتھ۔ موختہ آپن دِژ کتھہ کرن والین کُن پوٚتھ نظر تہٕ اندری آس ہواہ گیٚنژٕ ہیوٚ خیال —"اما سو کتہٕ نیرٕ بیگم صاب، سو ۂے درپیسترٕ آسہ تہٕ۔" مگر سیٹھی گوس یہ خیال پینیہ ہیٚتھ کُن۔ سیٹھی پٔیوس طوطہ لالُن نوٚو سَرٕ غم۔

طوطہ لالہ اٚس دٔویمِس پورس منز۔ بوٚنِس پورس منز اٚسو مجید صابس تہٕ جلیل صابس ہی واریاہ ژٕ سگریٹ چِوان، کتھہ کران تہٕ اَسان۔ موختہ آپس گیہ اتیتھ کِتھہ رب تہٕ کیاژٕ پیٚو ترٛوُو ساردِی اشن تہٕ موختہ آپن بوٚز کیاہ تام — "میٚہ شوہٹہ ہنز ہش۔ سشٹہ بلاسے —" اِمہ پتہ بنیاکھ اٚسن کھنگالہ۔

موختہ آپہ نیلہ ہیٚور واتِتھ طوطہ لالہ نِس کرس منز ژایہٕ یہ ژانتہ ژایہ تُلرہ اٚلِس منز۔ اتہٕ اٚس طوطہ لالہ سیٛہ منز کٔٹھس بِشترٕ دوہ چار پایہ پیٚٹھ کھورہ شوٗر ووٗرن ہیٚتھ صرف اوشس سفید شیٖن ہیٚو

[illegible] وۄن تہٕ ڈیکس ہیٚیٹھ اوٚچھس مس۔ اکِس ورٲنس کٔن اوس الماروٚ
[illegible] کیاہ تام۔ باقی تریٚش طرفن آسہٕ کرسین ہیٚیٹھ۔ ہیٚتھ طوطہٕ لالہٕ سٕند
ہٕشہ وارِیاہ نرم۔ تیوٚ سارِوٕی کرسیہٕ ڈہ اکی ہیٚتہٕ موہٕ ختہٕ آپس دوٚیہ
سلام۔ "اسلام علیکم۔" زنانہٕ یِہ ہیٚٹھوٚن ٹھاہ کھاہ ژوتہ واریاہ تور شرینو
کانہٕ آکِس شرین۔ "دوٚپہ" کوٚرٕ۔ موہٕ ختہٕ آپن کٔڑ ووٚنہ تہٕ اگر تہٕ
طوطہٕ لالہٕ اوس ووٚہرتھ موہٕ ختہٕ ہیٚیہ دِنہ آوہ ہا تہٕ موہٕ ختہٕ آپس پڑھ گژھِہ ہا
زِ میانے بجہ طوطہٕ لالہٕ خبر سوما ژرِ ہا پڑتھ کھوری واپس۔
اکہِ سہ اوٚن کٔل تہٕ سہ تھوٚوٕن موہٕ ختہٕ آپس بیٚہنہٕ خاطرٕ طوطہٕ
لالہٕنس شانس نکھہ۔ موہٕ ختہٕ آپہٕ برژِھہ طوطہٕ لالس ووٚنی کتھ
پولِنہ۔ ووٚندمیہٕ ژٕ جاوِہ تکلیف ما گوٚی۔ ہسپتالس ہیٚیٹھ کیاہ زِ وٲژی
لوٚت؟ وارِیہ گوٚو افسوس؟ میہٕ سوزو زِ ہا شیچھ، بہ آسہ موہٕ حد۔
—— مگر تس ہیٚنیہ تہٕ کتھ تہٕ کرِ، تہٕ کیاہ زِ اتہٕ بہتھ زنانہٕ ترٲو
پکہٕ دِتھ اکی ہیٚتہٕ تھدہ اسن کھنگالہٕ۔ موہٕ ختہٕ آپہٕ موٗژیہ زِ مے ماگو
کینہہ۔ تمہٕ دِژ نظر۔ دروازس ہیٚیٹھ اوس رٕوتِسل لانژھ اوٚش ترٲوان
تہٕ نیل کران—— "ہتے ہنز کور بلیے۔ کور بیے۔ ہتے ہنز طوطہٕ لالائیے،
طوطہٕ لالائیے——"

زنانن ہٕندی اسن کھنگالن اوٚن رٕوتِسل لانژھ میٚتھ حالس۔
اوٚتام اوس تس راے زِ طوطہٕ لالہٕ آسہٕ مرنہٕ سرٕ۔ تمہٕ اوس موٗڑس منز
بہتھ وارِیاہ سٔنچمت تہٕ سوٚمبرومت زِ تیٚلہٕ بہ اڑہ بہ کتھ کٔنو
دِمہ پان دار رٕتھ۔ تمہٕ پتہٕ کتھ کٔنو دِ تہٕ ڈلہٕ کٔنو تہٕ کتھ کٔنو وٚدہ لہرہ۔
تمہٕ اوس لہرہ وٚدنہٕ خاطرٕ سوٗرٕوی مالہٕ تیار تھوٚومت۔ مگر ہسپتال
وٲتھ تیٚلہٕ تمہٕ بوز پیٚیٹھے اسن گِنٕدن ڈیچھ، تس گو سوٗرٕوی کینہہ پتھو
تس گو "ملواس زِ اما طوطہٕ لالہٕ ما چھہٕ وارہ کارہ۔ تس ہیٚوٚ تٔن
پیٚرن۔ مگر اتہٕ اسنس تہٕ گِندنس پزھہ نہٕ کرِتھ ژٲوسہ توتہٕ طوطہٕ
لالہٕ تس کرس منز ووٚدسان کران کران—— "ہتے کیاہ گرم۔ کیاہ
گرم!"
اتہٕ بہتھ زنانو ترٲو اسن کھنگالہٕ۔ اکھاہ وٚڈھ—— "ہتے یہ
کسی بلائے ژاو پیٚت۔" اکِس زُبہ مکھہ نیرِتھ۔ اکہِ دِژِن ٹاسس
[illegible] تہٕ ہیٚوٚتن بنہٕ کٔڈن۔ اکہِ ترٲو ساروٕی کھوٚتہٕ بڑہ اسن کھنگالہٕ
[illegible]

—— اتھ ہیٚیٹھ ژٕوٚد رٕوتِسل لانژھ۔ تہٕنٕدِ کھوٚ ٹیچاوہ موہٕ ختہٕ آپہٕ
تہٕ کیاہ زِ تمہٕ اوس تہٕ اوٚتام رٕوتِسل لانژھ زانہہ تہٕ پہوٚی دِلی
کیاہ تام بلا یاہ زونمت۔ تہٕنٕدی کنو اوس رٕوتِسل لانژھ رٕوتِسل
لانژھ۔
طوطہٕ لالہٕ وٚژھ—— "ہے بیگم صاحب ترٲوِن حعض۔ یِہ حعض
کرِس۔"
موہٕ ختہٕ آپس پیٚیہ بہ نہٕ کنکو کتھ کرن والی یاد زِ ییٚہے آسہ
تہٕنٕز بیگم صاحب۔
سہ بیگم صاحب وٚژھ ادہ—— "ہے چھک تا حعض وچھان، میر صاحبنز
بیگم صاحب ہے کھوٗژ۔" سارِوٕی ترژو اسن۔
"ہے بہ کیا حعض زِ کھوٗژ ہس۔" میر صاحبنز بیگم صاحب وٚژھ——
اتھیت چھنا چپراسی کانہہ—— "یہ بوز نیبرٕ گژھِہ چپراسی تہٕ تمی ژوٚن
اڑِہ دِتھ دروازہ کیٚنز کلہٕ——
"تلا یہ لانژھ ژھٹن بوٚن دالِتھ۔"
دروازہ گو بند۔ موہٕ ختہٕ آپن بوز دروازہ نیبرٕ گژھِہ برنژس
کھنڈس دبہ دب ہش۔ موہٕ ختہٕ آپس اوس داریچ بوٚڈان۔ تس اوس
منٕ پان کتھ تام ووٚپہ زاڈ منز باسان۔ سہ اوس اکہِ اکہِ ہِنٕز سارٕنی
بیگم صاحبن وچھان مگر تہٕ ٹارہ، ژوٚرہ ژوٚرہ۔ سارٕنی بیگم صاحبن
اسو فراق نالی۔ سارٕنی بیگم صاحبن اوس ہنجا دٕرخت، سارٕنی بیگم
صاحبن آسہ ہیجہ سیٚہ۔ سارٕنی بیگم صاحبن اسو کنن نکہ نکہ ڈور، سارٕنی
اوس اچھن لٔڈ دار سرمہ، ہتھین ابااسی، وندن ژندمن، پانن
اسپدی بار۔ سارِیے آسہ ژوٚرہ ژوٚرہ کھنگالہٕ ترٲوان۔ چپراسین
نادِ دوان، کھینہٕ چیز اتہٕ ناوان تہٕ کھیوان۔ سارِیے آسہ ہیٚنہٕ تیٚن
پنہٕ نین صحبن ہٕند وتان۔ سارِیے زانہ ہن اکہِ اکہِ سٕندین صحبن تہٕ
ہتن ہٕندی گونژھ وال تہٕ اچھ وال تام اسکہ گٔنز رٕتھ۔
موہٕ ختہٕ آپہٕ اوس تہٕ ہیٚتن ہش۔ تس اوس قسابہ تہٕ قسابس تعویذ
کنن بالہٕ، ڈیکس ٹکہٕ، ہٕٹس ہیٚتہٕ ہیچز اسینس جِگو، ترین
بانوٕ دِ بجرہ، اچھن دِتھ تہٕ نچھن منٹھ کرو۔ تس اوس پؤز نیرٕ
تہٕ پوٚرِتھ۔ سہ اوس [illegible]
[illegible]

[illegible] کمسان۔ سو اُس پیاٹھ تہ مُیدِرہ۔ سو ڈلہ ہا آیتھ سو گژھہا چین گمبرہ۔ چنہٕ دیوان خان دارِہ منبٹھ بیہیا چکہ ژعایہ تہٕ ژونہٕ اکتابس ہاوِہ ہا تہٕ نُیتھ۔ مگر تس اوس ڈینہٕ کورِہ ناو کرنے۔ سورِی گیژو ہیپی مگر ناو—— ناد ہوتچان تہٕ ژھانڈان تہٕ ژاران اوس موختہ آپس واریاہن رنگن ڈاکھہ گومت۔ تمہٕ ووٚن طوطہ لالس کنس تل تہٕ وتان ونان اینٛن محلہ چہ سارِیے شدرِنیہٕ تصورس منز۔ ازکیاہ ونٛکھہ اُڈجن ہنز وس تام۔ از وچھک بیتھ ناو کرِنی کانسہِ۔ تمہٕ ووٚن طوطہ لالس—"اُمِس بُجس بلایہِ۔ اُمس کرِو زِہ ناو..."

طوطہ لالن ترٛوو زورہ اسن کھنگالہ۔ موختہ آیہ نہٕ اُمسہ تلہٕ نیوکن کن ہوکمن تہٕ اسان اسان ووٚنن باقی بیگم صأبن—"یہِ میأنٛی موج گانڈاہ سینز چھہٕ——"

سارِوی بیگم صأبو ترأو موختہ آپس کن اسان اسان نظر تہٕ موختہ آپس گوٚژھ چاہ آسُن تہٕ تتھو منز وسہِ ہا۔

"دیان حصن چھیم—" طوطہ لالہ اُس ونان—" ناو کرِوس۔"

سارِوی بیگم صأبو ترٛوو تیوتہٕ اسُن زِہ زنتہ موختہ آین بُڈ چارِی کتھہ کرِہنز اُس۔

"ہوں زنانہِ ہیے گوڈ ووِد آپے!" یہِ ووٚن موختہ لالن [illegible] سان گمراتھ بیٹھ تہٕ ترٛوو بیگم صأبو زِیوٚٹھ کھنگالہ۔ موختہ آپس ہوٚش۔ تس باسیوو زنتہ پیو سارِیے بیگم صأبہ پکرِ ڈٹھ اکی ہیٹہ موختہ آپس ونان آسہِ——

"ڈینہٕ پیچھے دیوت ڈژھرش۔ زِہ چھک شیٹھہ لیتہ بیٹھیرِش۔ بوزتھ؟" موختہ آپن ژھینہٕ اُپھو زِہ بوٚلن کنی۔ تس چھوٚٹ زمن زمن عرق۔ گمرِہ وٲتتھ تہٕ ژورِس پورِتھ منز دیوان خان دارِہ بیٹھ چکہ ژھاکہ بہتھ اوس موختہ آپس بین چھوکن پھہان تہٕ سعادس موش تیا دان۔ بیٹھہ آسس ہمہ کھوپرِہ ہندہ پوتھ وُنیہ کنہ پھنہ پتھ برزِہ کھ کرِ ژھتھ خورِنہٕ پھیأر نوٚو نوٚو نیزہ پُھسان۔

"رفیقا—— ہتا شریف لالا—— اشفاق احمدن تہٕ ظہور احمدن کرِتا آلو۔ وولا یہا چھیوہ بنِہٕ جگر ژھانڈان—— ہتا حلیمہ تا [illegible]۔"

دیوان خانس منز اوس موختہ آپن تامہ کرِنس گکھ دِیو برج زِوٚتل لانژھ۔ تس اوس ڈینہٕ تتھہ کنس تُژ و وتان [illegible] چراسی فرسنگ ہو ہیہ نہٕ کوڈ۔ تس اوس موختہ آپسی پوز منز و کھوسہ بیچھ چونیو منزِ وُچھ ووڑھ ہیو اوٚش وَسان۔

——(باقی)

کشمیر میں صنعتی دور کا آغاز

پہلے دو منصوبوں کے دوران جہاں ریاست کی معیشت کو مضبوط اور صحت مند لائنوں پر اُستوار کرنے کے لئے خاصا کام انجام دیا گیا وہاں تیسرے منصوبے کے دوران زیادہ توجہ صنعتوں کے پھیلاؤ پر دی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ریاست میں تیزی سے نئے صنعتی ادارے قائم ہو رہے ہیں ریاست میں صنعتوں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں اب تک جو کام ہوا ہے اُس کی تفصیل یوں ہے:-

ریاست کو مرکزی انڈسٹریز ایکٹ کے دائرہ اختیار میں لایا گیا۔

ریاست کو صنعتی معاملات اور یہاں نئے کارخانے قائم کرنے کی نسبت مشورہ دینے کے لئے ملک کے سرکردہ کارخانہ داروں اور صنعتی ماہرین پر مشتمل دو بورڈ بنائے گئے۔

کارخانۂ تعمیرات، رفل کا دھاگہ تیار کرنے والی فیکٹری، چمڑے کا کارخانہ قائم کرنے کے علاوہ پانپور میں ویونگ اور جانی وڈا اور کٹھوعہ میں سینٹری فٹنگ کا سامان اور ویسن میں سیمنٹ تیار کرنے کے لئے کارخانہ قائم کیا گیا۔

جموں اور سرینگر کی سلک فیکٹریوں، روزن اور ٹرپنٹائن فیکٹری میراں صاحب، گورنمنٹ ووٚلن ملز سرینگر کو وسعت دی گئی اور ان میں نئی مشینیں لگائی گئیں۔ مقامی دستکاریوں کی بکری کو فروغ دینے کے لئے ملک میں ایمپوریم کی ۱۸ شاخیں قائم کی گئیں اور ریاست میں ایمپوریم کے تحت متعدد پیداواری مراکز قائم کئے گئے۔ ریاست میں معدنی دولت کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے ایک مائننگ و منرلز کارپوریشن قائم کی گئی۔

غزل

یِمِس وُچھِت ووٚد یِلا یہٕ نارس تتھ امارس وُنزِہ کیاہ
موش اتھ یِمِس گاٹہٕ جارس تتھ اِشارس وُنزِہ کیاہ

تارہٕ قِی شہکارِ عشقُن وُچھ تہٕ اوٚن نس اِنقلاب
گُل بنِتھ آسے شعلہ زارس تولِہ نارس وُنزِہ کیاہ

کیاہ مگر تتھ کاروانس، آسہِ یتھ حاصِل غُبار
پاوٕ گژھِہ یتہ رٕستاہ کانہہ، تتھ غُبارس وُنزِہ کیاہ

وُچھِ اَنَا الحق اکہ بہاناہ زِندگی ژھٕلہ ناوٕنک
زِندہ تھوٚو منصورِ دارن، وُنیتہ دارس وُنزِہ کیاہ

یارہٕ نٕوس انسان چھُ پرہ ژھینون یارہٕ نٕوس شُوبانہٕ کانہہ
کر سلاماہ ناوٕ یارس، جاۓ یارس وُنزِہ کیاہ

چھُم کراں اقرار اُتی، اِنکار اُتی، دِلی زٕیوٚ پھران
چھوٚری نگارن خوٚدی یتھوی آسان، نِگارس وُنزِہ کیاہ

کل بتن مس کھاسی چشمن ہنز خیالس مس بَران
اتھ خیالس نیتھ خُماراہ، اتھ خُمارس وُنزِہ کیاہ

ساقِیَن ہیتھو جام بٕرو بٕرو خاص وعامن باگرِ ذ
وُدرِہ دٕوپ یمو پُرری واتیم، نابکارس وُنزِہ کیاہ

پھیوٚو بہاراہ یتھ گُلشن منز پھوٚلٕہ گوٚو گِنناہ کرِتھ
یس دِلن فوٚلہ ناوِہ تنہاؔ، تتھ بہارس وُنزِہ کیاہ

تعمیر

رُباعیات

چھُ یِمِس یِمِہ کتھن چانین قندس چھا
چھُ کرِ پھر روشنس چانِس وندس چھا
بہٕ پھیوٚرس دوٚ فی دیوان آکاش وپاتال
ژٕ یِمِس سرمایہ چھوٚی سوٚنتس چندس چھا

تصوُرِ چوٚ کلایہ ہیٚتھو ڈُڈٕ کر
یِشنیاہ مانڈُن مُژر لوِہ عالکو بر
نظر محدود منٕہ کرتن برس تام
یہے دُل شیر چیران نیر سنگر

شعورِ چہ زِتنہ گژِھ عالم مُنوّر
ہمالہ وُنگہ ژوٚک ہاوَن سمندر
نہ زانن وُول کرِہ کیاہ آفتابس
اَنِس نِشہ گاش گوٚژھ دوٚہے شوبرابر

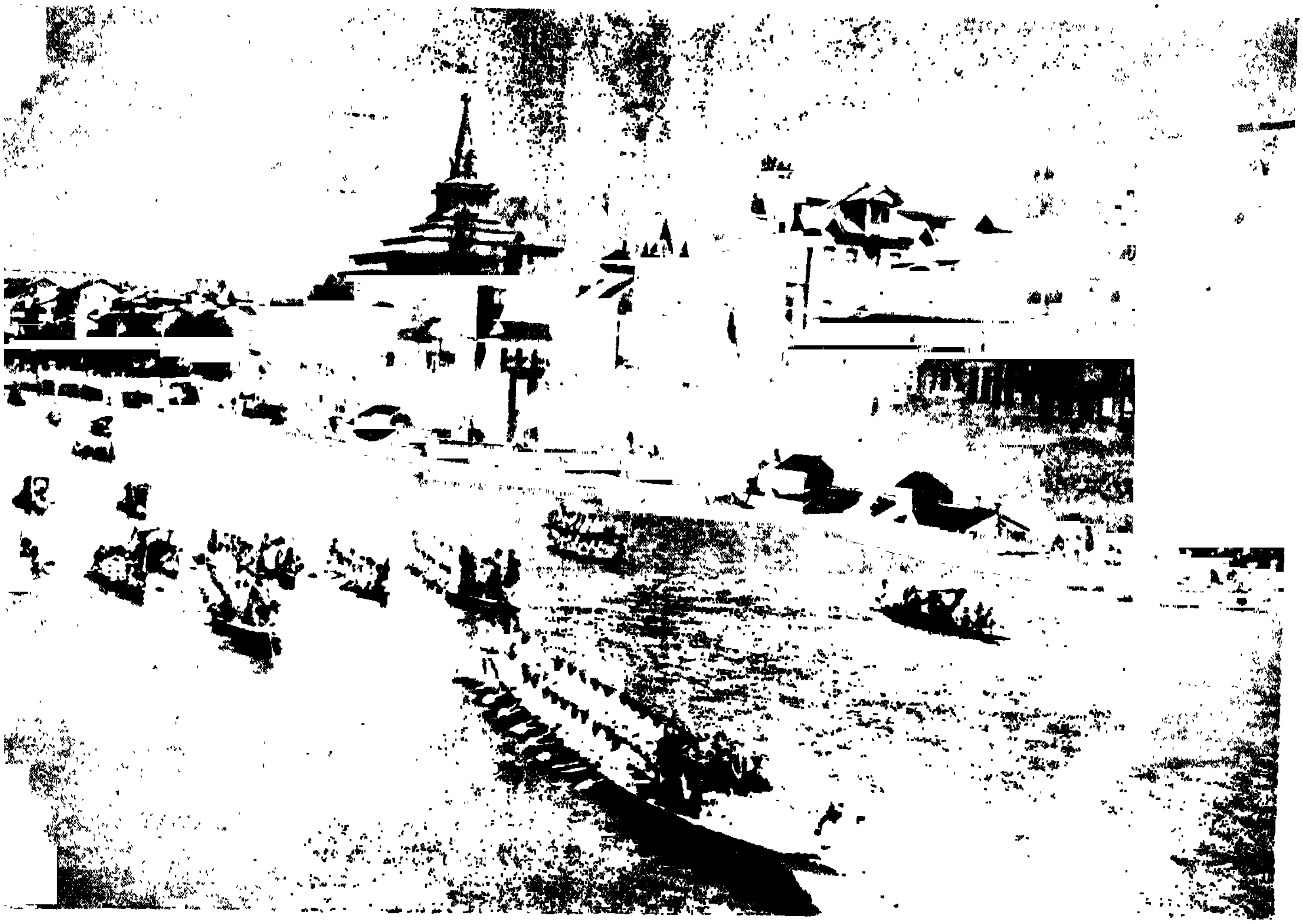
تصوُرٕ ہیٚتھِہ بلندی کُن نظر تراو
ژٕہ وَن اتھ کیاہ وَنو اَتھ کیاہ کرِوناو
میہٕ لاریوٚ گیوٚر نظرن اَتھ دیوان دوٚفی
عقل واتِھا اوٚتن کِنہٕ تراوِہ دِل ناو

موٚ وَد یہ اوٚش چون پساڑہٕ سنگہِ پیرِہ وسَن بال
موٚ وَد ژٕہ جِگر گوشِہ مدن وارِہ وندٕ سے لال
موٚ وَد ژٕہ وَدان گوٚو نہٕ زانہہ تاثیرِ زمانس
یِہہ بن تہٕ یتھ سنے مار کُنی ژھال کُنی ڈھال

بناوِن سٕۓ مِٹاوِن نقش وارِہ
اَمِس کاریگرس چھُنہٕ زانہہ قرارِہ
اَچھو ہینہٕ نیتھ وُچھم شہکار شیران
رٕوٚ چھُن ماکانہہ تقوِیَن ما یادگارِہ



صنعتی ترقی کی راہ پر — انڈسٹریل اسٹیٹ جموں



سری نگر میں نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے اعزاز میں دریائی جلوس